بیادگارِ علامۂ عصر آنریبل جسٹس میاں محمد شا

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: یوسف ظفر بی۔ اے

فہرستِ مضامین

جلد (۴۹) — نمبر (۲)

”ہمایوں“ بابت ماہ فروری ۱۹۴۶ء

سالانہ چندہ ۵ر معہ محصول — ششماہی سٹے ر — فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

مسلسل تین ماہ کی تگ ودو کے بعد سالگرہ نمبر شائع ہوا اور مقام شکر ہے کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ ہمایوں کے خیر خواہ اور مربی حضرات نے اپنے خطوط میں ہماری توصلہ افزائی فرمائی۔ ہم اُن کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے اس کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا۔

ہمارے محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور مبارکباد دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "بہت کامیاب کوشش ہے۔ تنوع، افادیت، علمی حیثیت، ادبی لطافت، سبھی کچھ ہے"

ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی سالگرہ نمبر کو قابلِ داد قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں "ترجم ہمایوں نے حیران کر دیا ــــ میاں صاحب دام فیضہ کا رنگ خوب اُٹھایا! چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملے، بعض کہیں الفاظ شگفتہ طنز ہیں۔ ... رصوت کی نظم کا ایک ٹکڑا "قہقہہ در قہقہہ" بھی بہت برمحل کھپایا"۔

ہم ان ارشادات سے آپ کے ذوقِ نظر کو رنگین بنانا نہیں چاہتے۔ البتہ اپنے اہلِ قلم معاونین کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی نگارشات ہمیں اس ضمن میں موصول ہوئیں۔ باوجودیکہ ہم نے سالگرہ نمبر کی ضخامت حتی الامکان بڑھائی، ہمیں افسوس ہے کہ ہم کئی مضامینِ نظم ونثر کو شامل نہیں کر سکے۔ ہم اپنے ان معاونین سے معذرت چاہتے ہیں۔

زیرِ نظر شمارہ ایک اعتبار سے افسانہ نمبر ہے۔ ابتدائی مضمون میں ہمارے مقبول افسانہ نگار جناب شیر محمد اختر صاحب نے کم وبیش دس سال کے افسانوی ادب کا جائزہ لیا ہے جو بعد کے افسانوں پر روشنی ڈال رہا ہے۔ یہ تمام افسانے سالگرہ نمبر کے لئے موصول ہوئے تھے۔ لیکن عدمِ گنجائش کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین اس نمبر کو سالگرہ نمبر کا جزو قرار دیں گے۔

نیا سال جہاں نئی سماجی، سیاسی، اور ادبی اُمیدیں ساتھ لایا ہے۔ وہاں ہمارے دو جلیل القدر شاعروں کی بھینٹ لے چکا ہے۔ حضرت امیر مینائی کے جانشین اور استاد السلطان حضرت جلیل مانکپوری اور مولانا عبدالباری آسی لکھنوی شارحِ دیوانِ غالب ومرتب دیوانِ میر (مطبوعہ نولکشور پریس) نے اوائل جنوری میں اردو ادب کو داغِ مفارقت دیا۔ ان حضرات کے ادبی کارناموں پر کسی تبصرے کا یہ مقام نہیں۔ اس سلسلے میں ہم اپنا ایک جملہ دہرا دیتے ہیں جو گذشتہ سالگرہ نمبر کے بزمِ ہمایوں میں آ چکا ہے۔ "نو واردوں سے ہمیں بہت سی توقعات ہیں لیکن ان بزرگوں کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں"

اگرچہ بقولِ علامہ اقبال رح ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

یوسف ظفر

جہاں نما

ہندوستان میں تعلیم کی تعمیر نو

جہالت کا سدِ باب ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے عزم اور ترقی کی تمام شاہراہیں جہالت کے صحرائے عظیم میں ختم ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ہندوستان میں تعلیم اور جہالت کا تناسب وہی ہے جو دوسرے متمدن ملک میں جہالت اور تعلیم کا ہے۔ ان قوموں نے جو نیک خلوص سے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتی تھیں، بیس تیس سال کے مختصر سے عرصے میں اپنے اپنے ملکوں میں جہالت کا قلع قمع کیا ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس مسئلے پر ضروری کماحقہ توجہ صرف نہیں کی گئی۔ اور اس ضمن میں بے شمار حیلوں اور بہانوں سے کام لیا گیا ہے۔ روپے، سرکاری اعانت اور دوسری مشکلات کے ساتھ ساتھ اس ملک کی ہندوستان گیر ذمہ داریوں کے پردے میں لوگوں نے اپنی کوتاہیوں کو چھپا رکھا ہے۔

ہندوستان میں تعلیم کی تعمیر نو کا مطمح نظر کیا ہونا چاہئے۔ یہ پرانا نظریہ کہ ابتدائی تعلیم ہائی سکولوں کے لئے تیار کرتی ہے اور ہائی سکول کالجوں کی پرورش گاہ ہیں اب بیکار اور غلط ثابت ہو چکا ہے۔ سر جان سارجنٹ (جن کی رپورٹ ہم اس سے قبل گئے سال کے جہاں نما بابت [illegible] میں دیکھ آئے ہیں) کے خیال میں سکول کی تعلیم کے ہر مرحلے کو فی نفسہٖ مکمل ہونا چاہئے۔ تاکہ طلبہ سکول سے کسی مرحلے پر نکل کر زندگی کے فرائض کو سنبھال سکیں۔ ہائی سکولوں میں ان کے نقطۂ نظر کے مطابق دو طرح کی تعلیم دی جانی چاہئے۔ پہلی کی غرض و غایت طلبہ کو کالجوں کے لئے تیار کرنا ہو اور دوسری ٹیکنیکل تعلیم جس کی سند حاصل کر کے طلبہ تعلیم یا ملازمتوں اور کارخانوں کی طرف رجوع کیا کریں۔ پرائمری اور دوسرے ابتدائی سکولوں کے طلبا کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ موجودہ طلبہ سے کہیں بہتر طریق پر کاروبار سنبھال سکیں۔

جہاں تک تعلیم کو عام کرنے کا سوال ہے یہ اصول کہ "خواص کو تعلیم دو، عوام اپنا خیال خود کر لیں گے" اب باطل ہو چکا ہے۔ آج کی دنیا کی سب سے زیادہ ذمہ داری عوام کے کندھوں پر ہے جنہیں تعلیم سے بہرہ ور کرنا ہی مدرسوں کا فریضہ ہے۔ خواص کو ہر زمانے میں تعلیم میسر آتی رہی ہے اور آئندہ بھی وہ اپنا خیال رکھ سکتے ہیں۔ جہالت کی تقویت کا باعث عوام ہیں جنہیں مناسب تربیت اور معقول تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔

معقول تعلیم کی غرض و غایت کتابی علم کے علاوہ ایک نظریہ، ایک سمجھ اور ایک عمل ودیعت کرنا ہے۔ ثقافتی، مادی، افادی اور تخلیقی پہلو تعلیم کے ظاہری پہلوؤں کے ساتھ منطبق ہونے چاہئیں تاکہ تعلیم صحیح طور پر تعلیم کہلانے کی مستحق ہو۔ قوم کی مردہ رگوں میں نیا خون دوڑانے کے لئے ادارۂ تعلیم کی تعمیر از حد ضروری ہے تاکہ اس کے وسیلے سے قومی بہبود اور نشو و نما کے وہ ذرائع مہیا ہو سکتے ہیں جو مابعد جنگ کے زمانہ میں ایک ملک کی زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم نے بروقت اس طرف توجہ نہ دی تو ملک کی تعمیر کا خواب بے تعبیر رہ جائے گا۔ اور قومی زندگی تعصبات اور جہالت کے پنجروں سے آزاد نہیں ہو سکے گی۔

جاپان کی عورتیں

جاپان کی عورتوں میں اندھی اطاعت اور فرمانبرداری ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ جاپانی عورتیں زیادہ منطقی ہوتی ہیں اور ان کے سوچنے کا طریقہ ان کے ارشادات سے متعلق مافوق الفطرت اعتقادات سے مجروح نہیں

ہوتا۔ لیکن وہ یہ جرأت نہیں کر سکتیں کہ سیاسی موضوعات پر عوام کے سامنے گفتگو کریں اگرچہ گھروں میں شوہروں سے نوک جھونک ایسی ہوتی ہیں جو جنگ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہیں۔ ہمیشہ سے وہ اس مادہ پرستی کے خلاف رہی ہیں جس نے اُن کے مردوں اور لڑکوں کو خود فریب اور لڑاکا بنا دیا ہے۔ جاپانی مردوں کی یہ خصوصیت ہر اُس شخص پر واضح ہے جو جاپان کے جنگی قواعد سے واقف ہے یا جاپان کے باشندوں کی فطرت کو جانتا ہے۔

جاپان کی عورتیں کبھی بغاوت نہیں کرتیں —— لیکن وہ اس قوّت برداشت کے باوجود ہر سختی اور ناجائز امر پر چیں بجبیں ہوتی ہیں۔ جب بھی انہیں کوئی ہمدرد اجنبی مل جاتا ہے تو وہ اپنا رونا لے بیٹھتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے وطن سے محبت لیکن اپنے مردوں سے نفرت ہے۔ جاپان کی وہ عورتیں جنہوں نے غیر ملکی مردوں سے شادیاں کی ہیں اپنے ملک کے مردوں میں حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں لیکن اُن کی ہمجولیوں اور بہنوں کو اُن پر حسد کی حد تک رشک آتا ہے۔ آج کے جاپان کی متمدن اور تعلیم یافتہ لڑکیاں ہر انسان سے مروّت اور شرافت سے پیش آتی ہیں —— بشرطیکہ وہ جاپانی نہ ہو۔ اس کا باعث جاپانیوں کی فطرتی تنگ نظری ہے جو ہر غیر ملکی باشندے سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ وہ لوگ عورتوں کے معاملے میں اخلاق زیادہ برتتے ہیں اور اُن کی دیکھا دیکھی جاپانی عورتیں بھی اپنے مردوں سے انسانیت کا تقاضا کرتی ہیں۔ جاپانیوں کے نزدیک ہر غیر ملکی ... گردن زدنی ہے کہ وہ جاپانی عورتوں کی ذہنیت کو "خراب" کرتا ہے۔

ایک جاپانی عورت اُس وقت تک شادی نہیں کر سکتی۔ جب تک وہ مناسب جہیز دینے کے قابل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی لڑکی نادار ہے تو اُس کا ہونے والا خاوند اُسے مجبور کرتا ہے کہ وہ فیکٹریوں میں ملازمت کرکے جہیز کی رقم کمائے ... مادی مشکلات کے زمانے میں خاندان کا سرپرست اپنی لڑکیوں کو غلام بنانے تک سے نہیں کتراتا۔ اس صورت میں اُسے بھاگنے تک کی اجازت نہیں ہوتی کیونکہ پھر اُس کی شادی کے امکانات ہی نہیں رہتے۔

جاپان مشرقی ممالک میں آزاد اور متمدن ہونے کا مدعی ہے۔ لیکن ان حقائق کے ہوتے ہوئے ہمیں تمدن کی تعریف .... از سرِ نو کرنا ہوگی۔ آج کی دنیا میں اگر سیاسی غلامی کو ناقابلِ برداشت قرار دیا جا سکتا ہے اور ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف انڈونیشیا آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے ہیں عورتوں کی یہ غلامی ہر تمدن کے لئے باعثِ شرم و ندامت ہے۔ ہندوستان کی عورتوں کی حالت اگرچہ اس سے کچھ بہتر نہیں لیکن اس کی ذمہ داری جہالت اور صدیوں کی غلامی پر عائد ہوتی ہے نہ کہ تمدن پر۔ ہندوستان کی عورتیں یقیناً اس مایوس کن تہذیب کی زد سے باہر ہیں اور ہمیں اُن کے مستقبل سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

ہندوستان کی عورتیں

انجمن خواتین شان حیدرآباد کا خطبۂ صدارت فرماتے ہوئے صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ نے کہا ہندوستان کی عورتیں اس کی متنوع تاریخ کے مختلف ادوار میں اس قدر غلامانہ زندگی بسر کر چکی ہیں کہ اب اُن کی حیثیت گھر کی ملازمہ سے زیادہ نہیں۔ جہاں ہماری بہنیں تمام دنیا میں خیال اور عمل کی وہ آزادی حاصل کر چکی ہیں جس کا تصور بھی ہمارے بس میں نہیں ہم اپنا بوجھ بدستور نہایت تحمل اور انکساری سے برداشت کئے جا رہی ہیں۔ حیدرآباد کی عورتوں کی حالت اس اعتبار سے ناگفتہ بہ ہے جس کے لئے دو وجوہ پیش کی جا سکتی ہیں پہلی یہ کہ مردوں کی ہوس خود مختاری اور مطلق العنانی کے ساتھ ہماری بہنوں نے ہمیشہ سر جھکائے رکھا اور اُسے اپنے مقدر سے تعبیر کرتی رہیں اس کا نتیجہ ہے کہ وہ استحقاق

کے نقطۂ نظر سے محض بیکار نہیں ہیں۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں کہی جا سکتی اور بیسویں صدی کے وسط میں جب دنیا تمدن کی طرف گامزن ہے اور تمام ممالک اس تگ و دو میں بازی لے جانے کی فکر میں ہیں۔ ہماری بہنوں کی پس ماندگی اس ملک کو آگے بڑھنے نہیں دے سکتی۔ بچے کی تربیت کے سلسلے میں ماں پہلی درس ہے اور اس کا اثر ہوتے والے شہری کی زندگی کو ناکام یا کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم خانہ داری کے بوجھ سے چُور عورت کو ثقافت اور علم کا زیور پہنائیں تاکہ آئندہ نسلیں سکولوں تک پہنچنے سے پہلے اپنی ابتدائی درسگاہ سے وہ کچھ حاصل کر سکیں جو زندگی بھر حاصل نہیں ہو سکتا۔

مردوں کے علاوہ ہماری جہالت کا باعث وہ نظر ہے جو ہمیشہ اپنے ماضی پر لگی رہتی ہیں اور آگے بڑھنے سے روکتی ہے اور اس طرح ہم ارتقا کی جانب چلنے سے قاصر رہتی ہیں حقائق کی طرف دیکھنے سے کتراتی ہیں اور اُس چار دیواری میں مقید رہنے کو باعثِ فخر سمجھتی ہیں جس میں ہمیں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ذہن جو صدیوں کی جہالت اور جمود سے پٹے پڑے ہیں جب دنیا کے انقلابات اور مسلسل تغیر سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ تنگ نظری کی جو جائیداد ہمیں ورثے میں ملی ہے اس سے تہی دست ہوں یا اُن اقدار کو اپنائیں جو فطرت کے ناقابلِ تردید اصولوں پر مبنی ہیں، ہمارے لئے نئی ہیں اور جن کو اپنائے بغیر ہم تمدن کی راہ پر دنیا کا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ لیکن شاعرانہ تصورات اور بے بنیاد تخیلات سے وابستگی اُس ٹھوس اور قطعی زندگی کا علاج نہیں جو آج ہمارے سامنے ہے اور جس میں آئندہ کے احتمالات پائے جاتے ہیں۔ زندگی بے مقصد نہیں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ کارآمد ثابت ہونا چاہئے۔ ہمارا بھی ایک مقصد ہے اور یہ مقصد ایک ایسی تکمیل پر مبنی ہے جس میں بلاشبہ حقیقی مسرت ہی مسرت ہے وہ مسرت نہیں جو اکثر لوگوں کے لئے غم واندوہ کا باعث ہو۔ اس تکمیل کے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اپنے ہمسائے کو مدد دی جائے — سچی مسرت وہ ہے جس میں دوسروں کی مسرت کا خیال بھی کیا جائے — یہی ہماری اس انجمن کا مقصد ہے"۔

محترمہ صاحبزادی صاحبہ نے جن پاکیزہ خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اُن کی رسائی ہر ذہن تک ہونی چاہئے۔ ہر تعلیم کی غرض وغایت یہی ہے لیکن اسے ہمیشہ فراموش کیا جاتا ہے۔ عالمگیر جنگوں، تفرقوں اور مناقشات کی تہہ میں یہی ایک حقیقت کارفرما ہوتی ہے۔ کہ خود غرضی دوسروں کے مفاد سے قطع نظر ذاتی اغراض کا ڈھول پیٹتی ہے۔ اگر ہمارے گہوارہ ہائے تمدن یعنی ہماری مائیں یہ درس دے سکیں تو ہمیں یقین ہے کہ دنیا کا مستقبل زیادہ روشن اور اُمید افزا ہو سکتا ہے۔

یوسف ظفر

انقلابات!

مضمون نویسی سے "ممبری" تک — انقلابات ہیں زمانے کے!

رُوپوشی سے خودنمائی تک — انقلابات ہیں زمانے کے!

المنظر سے زیرہ موگا تک، — انقلابات ہیں زمانے کے!

انقلاب زندہ باد!

د۔ ب

ایک جائزہ

گذشتہ دس برس اردو افسانے کی زندگی ایک ایسا دور ہے جب ہمارا افسانہ ایک نیا جنم لیتا ہے، جوان ہوتا ہے اور آج ہم اسے دنیا کے افسانوں میں صف اوّل میں جگہ دے سکتے ہیں۔ اس نئے افسانہ کی پیدائش کے وقت جب ہم حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس وقت ہمیں چند افسانہ نگار نظر آتے ہیں جو اس وقت کے افسانوی ادب کا سرمایہ ہیں۔

راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، یلدرم، نیاز فتح پوری، منشی پریم چند۔

راشد الخیری مسلمان گھرانوں میں عورتوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچ کر خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔ مسلم خاتون کی بے بسی کا یہ مصور، مصور فطرت کہلایا۔ خواجہ حسن نظامی مغلیہ دربار کی بربادی، غدر کے بعد شاہی گھرانے کی بربادی کے نقشے لکھ رہے تھے۔ عظمت رفتہ کی داستان اور خواجہ صاحب کا قلم ——— نیاز فتح پوری یونانی . . . . کو اپنا کر رنگین افسانے پیش کر رہے تھے۔ یلدرم ترکی کے افسانوں سے اردو کا دامن بھرنے میں مصروف تھے۔ اس وقت اردو ادب کے افق پر منشی پریم چند کا سورج طلوع ہوا۔ نئے افسانے نے جنم لیا۔

منشی پریم چند وطن پرست تھے۔ انہوں نے ترک موالات کے زمانے میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر قومی تحریک میں شمولیت فرمائی تھی۔ انہوں نے زندگی کو اس کے اندر رہ کر دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان کی زندگی چند شہروں کی زندگی نہیں۔ بلکہ ہندوستان دراصل دیہات کا نام ہے۔ انہوں نے افسانے کو نیا موضوع دیا۔ افسانے کو نیا جنم دیا۔ ان کے افسانے اردو ادب میں ایک خزانہ ثابت ہونے لگے . . . ہر کوئی دل سے لگانے کے لئے بیتاب تھا۔

یہ افسانے زندگی سے قریب تر تھے۔ حقیقت اور افسانے کا امتزاج تھا۔ اس زمانے میں سُدرشن بھی افسانے لکھ رہے تھے۔ ان کا شہرہ تھا۔ مگر ان کے افسا . . . زیادہ تر دوسری زبانوں سے مستعار پلاٹ ہوتے۔ نئے افسانے کی ابتدا ہم صرف منشی پریم چند کے افسانے سے ہی کر سکتے ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر موجودہ افسانے کی عمارت تیار کی گئی۔

چند ہندوستانی نوجوانوں نے جو مغربی تعلیم کے بعد اکٹھے ہو گئے تھے مل کر ادب میں نئی تحریک چلانے کے لئے ایک جماعت بنائی، یہ انگلستان میں رہ کر آزاد ممالک کے ادب اور زندگی کا مطالعہ کر چکے تھے۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی، فسطائیت کے خلاف عوام کی جنگ، یہ لوگ اس سے متاثر تھے۔ انہوں نے بھی چاہا کہ وہ بھی اپنے ادب میں انقلابی تحریک جاری کریں۔ چنانچہ اس گروپ نے ایک کتاب شائع کی جو چند افسانوں کا مجموعہ تھی جس کا نام تھا "شعلے"۔ اس کے خلاف علما نے شور مچایا اور کتاب ضبط کر دی تھی۔

یہ نیا گروپ ترقی پسند گروپ تھا۔ اس میں زیادہ تر اشتراکی ادیب تھے۔ یہ لوگ روسی ادب سے متاثر تھے۔ روس اور ہندوستان کے حالات بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ روس کے عوام نے متحدہ ہو کر آزادی حاصل کی تھی۔ اس لئے ہندوستانی وطن پرست جوان روس کے ادب سے زیادہ متاثر ہوتا تھا۔ ہندوستان پر ابھی تک مذہب کی گرفت کافی تھی۔ مذہب "روحانی" دنیا کی طرف راہ نمائی کرتا ہے، ایسی دنیا جسے آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا۔ اس کے بالمقابل کارل مارکس کے نظریہ مادی چیزوں سے بحث کرتے تھے۔ وہ نوجوان جو ہندوستان کی بدحالی کا باعث اقتصادی حالات کو سمجھتے تھے، جو جانتے تھے کہ غلامی کا ذمہ دار افلاس ہے، اس کو دور کرنے میں مست، وہ فوراً مارکس کی طرف

متوجہ ہوئے۔

ہندوستان میں عورت اور مرد کے تعلقات پر بھی قیود تھیں۔ مذہبی قیود، سماجی قیود، یہ قیود اپنی سختی کی وجہ سے نئی پود جو مغربی علوم کی گود میں پل رہی تھی۔ ایک الجھن تھی۔ یہ لوگ ان قیود سے بچنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر فرائیڈ کی تحقیقات کا ترجمہ ہو کر "تجزیہ نفسی" کا سارا لٹریچر ہندوستان آنے لگا۔ نوجوانوں نے اپنی الجھنوں کا سبب تلاش کر لیا۔ اور بے باکیاں پھیلنے لگیں۔

ترقی پسند ادب عوام کا ادب بننا چاہتا تھا لیکن ہوا یہ ہے کہ اشتراکی تحریک حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی گئی اور ترقی پسند اشتراکی نوجوان نظربند کر دیے گئے۔

اس دور کے لوگ سجاد ظہیر اور حیات اللہ انصاری ہیں۔

پنجاب میں نیا افسانہ بڑھ رہا تھا۔ یہاں کی صحت مندانہ آب و ہوا اُسے پروان چڑھانے میں مدد دینے لگی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چند افسانہ نگار ایک ساتھ سامنے آئے۔ کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک اور ممتاز مفتی — کرشن چندر کارل مارکس اور فرائیڈ دونوں کے نظریات کو اپنا کر حسین زبان میں بیان کرتے ہوئے بڑھا۔ اُسے اردو زبان پر کافی قدرت تھی۔ اس کا اسٹائل اتنا پیارا تھا کہ چاروں طرف اس کے افسانے مقبول ہونے لگے — راجندر سنگھ بیدی جزئیات کا بادشاہ تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کو دیکھتا پھر اس کے تانے بانے سے افسانہ بناتا — جنس اس کے ہاں بھی موجود تھی۔ مگر دبی دبی — اپندر ناتھ اشک کا موضوع سماجی تھا۔ وہ منشی پریم چند کے "جانشین" کے دعویدار تھے۔ انہوں نے سماجی مسائل پر قلم اٹھایا۔ جنسی موضوع پر انہوں ...نے لکھے ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانے ایک لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ فرائیڈ کے تجزیہ نفسی کے ایک طالب علم ہیں۔ اُنہوں نے اپنا سارا مواد فرائیڈ کے "مریضوں کی تحقیقات" سے لیا ہے۔ وہ لاشعور کی گہرائیوں سے پلاٹ لائے اور ان کہی باتیں کہتے رہے۔

سعادت حسن منٹو افسانوی دنیا میں ایک طوفان بن کر اٹھے۔ اس طوفان میں بلا کا زور تھا۔ یہ طوفان چاروں طرف چھا گیا — منٹو کا موضوع جنس تھا۔ وہ اس ممنوع موضوع میں وہ اچھوتے پہلو نکالتا اور پڑھنے والے حیران رہ جاتے۔ وہ زندگی کے اس پردوں کو چاک کرنے لگا۔ جن کا مستور رہنا ہی زیادہ اچھا ہے۔ مگر تجزیہ نفسی سے اُس نے بھی افسانے لکھنے میں امداد لی۔ اور تجزیہ نفسی کی اصطلاح میں وہ خود (Sexual Pervert) تھا — منٹو کے ساتھ ساتھ عصمت چغتائی سامنے آتی ہیں۔ اُن کا موضوع بھی جنس تھا۔ ایک عورت، کنواری عورت، یوں بے باکی سے جنس کے بارے میں باتیں کرے۔ بزرگوں نے اس پر ناک بھوں چڑھائی۔ نوجوان مزے لے کر افسانے پڑھنے لگے۔ حسن عسکری بھی اسی صف میں آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا موضوع بھی جنس تھا اور تجزیہ نفسی کی موشگافیاں —

اسی دور کی ایک یادگار اختر انصاری ہیں — اُن کے افسانے موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے اچھوتے تھے۔

جنگ شروع ہوئی — روس اتحادیوں میں شامل ہو گیا۔ فسطائیت، فاشزم ایک طرف اور باقی سب جمہوری طاقتیں ایک طرف ہو گئیں۔ ہندوستانی اشتراکی ادیب رہا کر دیے گئے۔ افسانہ اب نئے دور میں قدم رکھتا ہے۔ کمیونسٹ ادیب جنہوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک جاری کی تھی۔ اب آزاد تھے۔ انہوں نے اپنی ساری توجہ عوام کو متحد کرنے اور انہیں جگانے میں لگا دی۔ اُن میں سے افسانہ نگار سیاسی موضوع پر لکھنے لگے۔ اب وہ چاہتے تھے کہ اُن کی پارٹی سیاسی اقتدار حاصل کرے۔ چنانچہ وہ اُسی طرف لگ گئے۔ اُن میں سے جو لوگ افسانے لکھتے رہے۔ وہ محض پراپگنڈہ

کے طور پر لکھتے ہیں۔ مزدور۔ مزدور۔ مزدور کی رٹ سے ان لوگوں نے مزدور سے نفرت دلا دی ادب اور آرٹ اپنی جمالیاتی شان کھو بیٹھا۔ اب وہ محض پارٹی پراپاگنڈہ بن گیا ——— ادب برائے زندگی کی آڑ میں مزدور کے بارے میں کچھ۔ جانتے ہوئے بہت کچھ لکھا گیا ——— سرمایہ دار کے خلاف افسانے لکھتے وقت افسانہ نگار کے پیش نظر فن نہ تھا۔ بلکہ جذبات تھے۔

جنگ کے زمانہ میں اخلاق، مذہب اور سماجی قیود کی گرفت اتنی ڈھیلی ہو گئی کہ اکثر افسانے محض تسکین کے لئے لکھے جاتے زندگی کی اقدار بدل گئیں افسانوں کے موضوع بدل گئے۔ ہر نوجوان افسانہ نگار یا تو مزدور پہ لکھتا یا طوائف پر۔ جنسی موضوع اتنا عام ہو گیا کہ وہ اپنی ساری رعنائی کھو بیٹھا۔

بہت سے لکھنے والے جنگی ضروریات کی وجہ سے فوج اور ریڈیو میں کھپ گئے جو وہاں گیا اس کا سارا ادب اور فن ختم ہوا۔ چنانچہ گذشتہ چند سالوں سے افسانوی دنیا میں وہ لوگ نظر نہیں آرہے۔ جن کے نام سے اردو افسانہ ترقی کے بام پر پہنچا۔ ریڈیو کے بعد فلم نے اردو افسانہ نگاروں کو اپنے اندر لے لیا ہے۔ منشی پریم چند جی مرحوم بھی ایک بار فلم میں گئے مگر مایوس ہو کر لوٹے۔ مگر آج کل چوٹی کے افسانہ نگار کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ اپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، فلم میں ہیں ———

گذشتہ دس برس میں افسانہ کی رفتار کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ کا افسانہ نگار شاید ابھی تجزیہ نفسی کے چکر میں رہے ——— مارکس ہی اس کا نجات دہندہ ہو گا۔ کیونکہ یہی دو موضوع ہیں جن پر ہر افسانہ نگار پھر پھر کر لکھتا ہے اتنا ضرور ہو گیا ہے کہ اب "ترقی پسند" تحریک اور عریانیت الگ الگ کر دی گئی ہیں ——— اس سے مستقبل امید افزا ضرور ہو گیا ہے

آخر میں اتنی عرض کروں گا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی افسانہ نگار اب ماحول اور لیس منظر کی منظر کشی سے زیادہ انسان کو اجاگر کرے۔ انسان اس کا موضوع ہو اور وہ انسان کو انسانیت کا مقام حاصل کرنے کی راہ دکھائے۔ یہ حاصل ہو گیا تو ہمارا افسانہ "ادب عالیہ" کا بہترین نمونہ ہو گا۔

شیر محمد اختر

غزل

مدت کے بعد گذرے ہیں اس رہگذر سے ہم
بچھڑے تھے جس جگہ قدمِ راہبر سے ہم

جس نقطۂ سفر سے محبت کی منزلیں
طے کر رہے ہیں قوتِ خونِ جگر سے ہم

پابندِ مہر ہو نہ سکے بزمِ دہر میں
کہتے ہیں حالِ قلب لبِ چشمِ تر سے ہم

اب ہر نگاہ میں نظر آتے ہیں پیشتر
غمدیدہ اس قدر ہیں کسی کی نظر سے ہم

کوئی ملا نہ حیب لیس دیوار و در ہمیں
مل مل کے خوب روئے ہیں دیوار و در سے ہم

فطرت میں لطفِ تیرِ قفس رچ گیا ہو جب
صیاد اڑ سکیں گے کہاں بال و پر سے ہم

ہر چند ہے خلیقؔ کٹھن حریت کی راہ
منزل پہ جا ہی پہنچیں گے اک دن سفر سے ہم

خلیق قریشی

پگڈنڈیاں

تمام قصبہ سو رہا تھا۔ صرف پیپل کے پیڑ پر جاگتی چیلیں اپنے گھونسلوں میں "کیں۔ کیں" کر رہی تھیں۔ پرمود اپنے لحاف میں لیٹا ہوا سوئے قصبہ کی جاگتی آوازوں کو سن رہا تھا۔ میلوں تک پھیلے آلو کے سیاہی مائل سبز کھیتوں پر کہرا آٹے کی طرح برس رہا تھا اور ان میں ٹک ٹک کرتے رہٹ چلا رہے تھے۔ گھروں میں گھرڑ گھرڑ چکیاں چل رہی تھیں۔ اور کپڑا بننے کے کرگھے کھٹ کھٹ لہرا اٹھے رہے تھے۔

وہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی پر آ کھڑا ہوا۔ اس چھوٹے سے قصبہ میں ننھی زندگی کی کشمکش سانسوں کی طرح رات بھر چلتی رہتی ہے؛ وہ بہت دیر تک کھڑا رہ کر ان آوازوں کو سنتا رہا۔ آہستہ آہستہ روشنی پھیلنے لگی نیلے کہرے کی چادر ہلکی ہوتی گئی اور مشرقی افق پر روشنی کا ایک سنہری خواب چھانے لگا۔ اور پھر سرخ ــ بے نور۔ ایک بڑی سی تھالی آسمان پر ابھر آئی۔ سرخ تھالی کے کنارے ڈبڈبائی آنکھ کی طرح جھلک رہے تھے۔ اور کناروں کی وہ جھلک بار بار پگھلے ہوئے سونے کا رنگ دے کر دمک اٹھتی تھی —— جاڑوں کا سورج اُگ رہا تھا۔ اتنے میں اس کی بیوی شیلا چائے بنا کر کھڑکی پر لے آئی۔ وہ دونوں چائے پیتے ہوئے کھڑکی سے نیچے گلی میں جھانکنے لگے۔

گھروں کے دروازے کھل گئے تھے۔ مرد ہاتھوں میں پانی کے لوٹے لئے کھانستے ہوئے گھروں سے نکل کر کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ دھوپ کھانے کی غرض سے چھوٹے چھوٹے بچے گلی میں نکل آئے تھے۔ میل اور خشکی کی وجہ سے بچوں کے ہاتھ جانوروں کے پنجوں کی طرح خشک اور کھردرے ہو گئے تھے۔ وہ گاؤں کی مقروض جانیوں کے لائے ہوئے گنوں کو چوس کر اگالیوں کو دروازے سے سیدھی گلیا پر یونہی اچھال کر پھینک رہے تھے۔ جس کی پیٹھ پر ایک کوا اچک اچک کر چونچیں چگ رہا تھا۔ یکایک ایک لڑکا سسکی بھرتا ہوا مکان سے نکل کر باہر گلی کی نالی پر آ بیٹھا سامنے والے مکانوں کے دروازوں سے دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا اور کبھی کبھی چوڑیوں کی جھنکار اور جھاڑو کی سینکوں کے ساتھ ایک گوری سی کلائی نظر آ جاتی جو کوڑا باہر پھینک کر اندر غائب ہو جاتی۔ پرمود اور شیلا کو یہاں آئے ایک ہفتہ گذر گیا تھا۔ مگر وہ ان گوری کلائی والی لڑکیوں کے چہرے نہ دیکھ سکے تھے۔ وہ لڑکیاں دن بھر گھروں میں کام کرتی تھیں اور فرصت کے وقت پلنگ پوش اور تھیلیوں کے پھندنے بناتی رہتی تھیں —— جن سے ان کو دکانداروں سے کچھ مزدوری مل جاتی تھی۔

پرمود کو دس بجے اسکول جانا پڑتا تھا۔ وہ چائے پی کر کمرے سے نکلا ہی تھا کہ باہر سے چیخ و پکار کی آواز سنائی دی۔ شیلا کھڑکی سے پہلے ہی نیچے جھانک رہی تھی۔ پرمود نے جا کر دیکھا —— اسکول کے کئی لڑکوں نے ایک لڑکے کو ہاتھ پاؤں سے پکڑ کر اٹھا رکھا تھا اور اسے اسکول لے جانے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ ذبح ہوتے ہوئے جانور کی طرح بلبلا رہا تھا۔ یکایک برابر والے مکان سے ایک بھیانک قسم کی موٹی عورت نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ہلدی چھلنے کا میلا کپڑا تھا۔ اوڑھنی میں بے شمار پیوند لگے تھے۔

"اے مرو! کیا میرے بچوں کی جان لے کر ہی چھوڑو گے۔ دیکھو تو ذرا ایسا ماسٹر کون ہے جو میرے بچے کو پکڑ کر منگواتے۔ ستیاناسیو۔" اور اسی لمحہ تمام لڑکے اس بلبلاتے جانور کو زمین پر پٹک کر تتر بتر ہو گئے۔ اور اس موٹی عورت نے زمین پر کلبلاتے ہوئے لڑکے کو اٹھایا۔

"مراد کا ہیں مار رہا ہے جیسے مرگیا ہو۔ اگر کبھو کر پنساری کی دوکان پر جلدی دے آ۔ یا بازار میں سوت بیچ آ تو جان نکل جاتی ہے اور اسکول جانے کے نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اور تماچوں کی بارش میں وہ اپنے ڈکارتے ناخلف کو اندر گھسیٹ کرلے گئی۔

"اجی یہ کمیٹی والوں نے بھی پڑھائی اور اسکول کا خوب دھندہ نکالا ہے۔ لونڈوں کو دوکان پر بیٹھنے ہی نہیں دیتے زبردستی پکڑ کر اسکول لے جاتے ہیں۔ لڑکوں کو سدھاریں گے جی" بشیشر شاستری ایک کلبی انداز میں چلتے ہوئے بولے۔

"ارے مہاراج کیسی پڑھائی اور کس کا سدھار۔ یہ دو چار لکھ کے بیکار انگریزی پڑھے یہاں آ پڑے ہیں۔ فیشن کے بغیر گذارا نہیں۔ اب انھیں نئے بابو پرمود کمار کو دیکھ لو۔ طوفان مچا رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تعلیم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تعلیم ۔ ۔ ۔ ۔ سنا بھی ہے کمیٹی سے ساٹھ روپیہ ماہوار پاتے ہیں۔ ٹیکس دیں ہم اور گذارے ہوں کن کے ——"

خیر۔ اچھا بھئی اب چلیے دکان جاکر کھولنی ہے " اور امراؤ سنگھ حلوائی دانتن کرتے آگے بڑھ گئے۔

پرمود نے سب کچھ سنکر شیلا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرا سہما ہوا تھا۔

"ارے ڈر گئی۔ میری شاعرہ" شیلا کے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں دباتے ہوئے پرمود بولا" شروع شروع میں لوگ اسی طرح کہتے ہیں۔ یہ قصبہ ابھی تاریکی کی گود میں سویا پڑا ہے۔ نئی کرنیں اور نئے نظریے ان لوگوں کو چونکاتے ہیں۔ مگر آہستہ آہستہ اس قصبہ کی آنے والی نسل ایک نئے تخیل اور رجحان کی حامل ہوگی۔ اچھا اب مسکرا۔ دیکھ اسکول کو دیر ہو رہی ہے" اور شیلا مسکرا پڑی۔ پرمود اسکول چلا گیا۔

پرمود کے اسکول چلے جانے کے بعد شیلا عموماً اکیلی رہ جاتی۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ اسی کھڑکی میں آ بیٹھتی۔ آسمان کی نیلی گہرائیوں میں سورج دمکتا۔ اور دھوپ کے نرم اور گرم گالے اس کے اطراف پر گرتے رہتے۔ اس وقت اپنا ٹرنک کھول کر وہ ان خطوں کو پڑھنے لگتی جو پرمود نے اسے شادی سے پہلے لکھے تھے۔ شادی کے بعد پرمود ایک ساتھ کتنا بدل گیا ہے۔ پہلے وہ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو کر اس کے گھر سے چلا جاتا تھا۔ یہ تمام خطوط اسی غیظ و غضب کی حالت میں لکھے گئے تھے۔ اسی وجہ سے اس کی سہیلی ہمترا نے پرمود کے ساتھ اس رات بھاگ آنے سے پہلے کہا تھا۔ "شیلا تو جا رہی۔ چلی جا۔ مگر پرمود ایک جوئے کا پانسہ ہے" —— اس وقت شیلا لرز اٹھی تھی۔ کہیں پرمود مجھے چھوڑ نہ دے۔ مگر چاند پیڑوں کے پیچھے سے ابھر رہا تھا۔ اور اس کے خیالات ڈانواں ڈول تھے۔ مگر اس نے داؤ کھیل ہی لیا۔ لیکن اب ؟۔ اور سورج کی ایک ایک کرن پرمود کی محبت آمیز نگاہ۔ اس کی نشیلی سانس اس کا شہد آگیں بوسہ بن کر اس پر چھا جاتی۔ دھوپ میٹھے سپنوں کی طرح گرتی رہتی۔ ساری کا پلو جسم سے اڑتا رہتا اور شیلا کو محسوس ہوتا کہ وہ افق کے نیچے جھومتے ہوئے مخمور کھجور کے درختوں کی طرح رنگین اور نشہ آمیز ہے۔

کھڑکی میں بیٹھے ہوئے شیلا روزانہ دیکھتی کہ آنو کے کھیتوں سے پرے۔ کھجور کے جنگل سے گذر کر گھاس کے وسیع سبز میدان سے ہو تی ہوئی بہت سی پگڈنڈیاں قصبہ کی طرف آتی ہیں۔ دن چڑھتے ہی ان پگڈنڈیوں پر انسانوں کی قطاریں نظر آنے لگتیں۔ سر پر گھی کی مٹکیاں رکھے جاٹنیاں۔ کپاس اور سوت کے گٹھر بغل میں دبائے لڑکیاں اور پلنگ پوش اور تھیلوں کے گٹھر سر پر اٹھائے چھوٹے لڑکے —— یہ قافلہ رینگتا ہوا ان پگڈنڈیوں پر چلا آتا۔ اس قافلہ کو دور سے دیکھ کر شیلا کو محسوس ہوا کہ یہ لیلی میٹ کے باشندے ہیں جو اس قصبہ کے گلی کوچوں کی طرف بڑے شوق سے چلے آ رہے ہیں۔ مگر جب یہ قافلہ قصبہ میں داخل ہو کر اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزرتا تو وہ دیکھتی —— ان تندرست جاٹنیوں کے چہروں پر شفقت اور ظلم کی وجہ سے ایک کالونس جم کر رہ گئی ہے۔ لڑکیوں کے رنگ نے تو سے زخ کرلیا اور بدنما ہوگئے ہیں۔ گردنوں کے [illegible]

[illegible]

بوجھ اٹھانے کی وجہ سے سیاہ لکیریں پڑ گئی ہیں۔ اور وزن اٹھانے کی وجہ سے بچوں کے قد چھوٹے رہ گئے ہیں۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور اسے محسوس ہوتا یہ پگڈنڈیاں وہ باریک نالیاں ہیں جن کے ذریعے کھجور پار والے گاؤں کا خون بہہ کر قصبہ کی زندگی کو رودانیاں بخشنے کے لئے آتا رہتا ہے۔

پگڈنڈیوں سے ہٹ کر اس کی نگاہ پیارے چھینبی کی دوکان پر جا پڑتی۔ دوکان کے کچے چبوترے پر پھندنے بندھے ہوئے پلنگ پوش اور تھیلوں کا انبار لگا رہتا۔ اور گاؤں کی لڑکیاں مزدوری کے انتظار میں سامنے والے پتھر پر بیٹھی پاؤں اپنے تلوؤں سے کانٹے نکالتی رہتیں یا "لالہ جی ہمارے تھیلے گن لو ـــــ بازار سے سودا خریدنا ہے" اور وہ کانا منیم اپنی دوسری آنکھ دبا کر کہتا۔ "بالے نواب جادی گھر سے نکلی ہی کیوں تھی۔ تیرا ہی تو نوکر ہوں۔" شیلا کی نظر ایک لڑکی پر خصوصاً جا کر اکثر رک جاتی جو چھپر پر خاموش بیٹھی رہتی۔ اس لڑکی کو کسی سے مذاق کرتے یا لالہ سے سفارش اٹھاتے اس نے کبھی نہیں سنا۔ بلکہ بارہا اس نے پیارے چھینبی کو کہتے سنا۔ "اری ورگی۔ اندر تو آ۔ تجھے آج زیادہ پلنگ پوش دوں گا۔ تیرے پھندنے بہت عمدہ ہوتے ہیں" مگر وہ ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائی کو خطاب کر کے کہتی۔ "جا بھیا۔ اندر جا کر لالہ سے پلنگ پوش لے آ۔" اس خشک اور غیر رومانی جواب کو سن کر پیارے اس کے بنائے ہوئے پھندنوں کو ادھر ادھر دیکھ کر چلّا اٹھتا۔ "کیوں پھر یہاں بدماشی دکھا گئی۔ دیکھ تو کتنا چھوٹا پھندنا باندھا ہے ـــــ منیم جی آج اس کو صرف دس پلنگ پوش دینا۔"

شیلا نے ورگی کو اکثر اپنی کھڑکی کے پیچھے سے کسی گہرے خیال میں غرق گذرتے دیکھا تھا۔ اس کا جسم گداز تھا۔ رنگ سانولا تھا مگر سب سے زیادہ پُرکشش اس کی وہ موٹی پلکیں تھیں جو اس کی پتلیوں پر ڈھکی رہتی تھیں۔ اسے دیکھ کر شیلا کی زبردست خواہش ہوتی کہ اسے اپنے قریب بلائے چند باتیں کرے اور جب وہ چلنے لگے تو اس سے جھٹ کر کہے "دیکھ جب تو دوبارہ آئے تو مل کر جانا ـــــ ضرور۔"

ایک دن حسب معمول چبوترے پر تھیلے اور پلنگ پوش گنے جا رہے تھے۔ لڑکیاں مزدوری کے انتظار میں پتھر پر بیٹھی تھیں یکایک کانا منیم چلّایا۔ "اوری لونڈیا۔ او ورگی کی بچی۔ دو پلنگ پوش کہاں کھو آئی۔ یہ تو صرف آٹھ ہی ہیں ـــ ذرا لالہ کے پاس تو آ۔" ورگی ششدر رہ گئی۔ وہ خاموش رہی۔ صرف اس کی آنکھوں میں ایک حیران التجا ٹھٹھک کر رہ گئی۔ گویا کسی سنگ تراش نے پتھر پر کسی سہمی دوشیزہ کی آنکھیں تراش کر چھوڑ دیں۔

"پرمود اس قصبہ سے چلو۔" شیلا پرمود کو تمام حادثہ سنا کر بولی: "اگر رہنا ہی ہے تو کھجور پار والے گاؤں میں چل کر رہو جہاں سے لوگ اس قصبہ میں آتے ہیں۔ تم ان لوگوں کو یہاں آنے سے روک دو۔ اور ان پگڈنڈیوں کو بند کر دو۔"

"شیلا ان پگڈنڈیوں کو اب نہیں روکا جا سکتا" پرمود قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ پگڈنڈیاں اب بھوک اور روٹی۔ زندگی اور موت۔ دوشیزگی اور عصمت دری کے نقطوں کو ملاتی ہیں۔ حاجت اور مجبوری نے ہی گاؤں والوں کو اس سبزے کے موتیوں کو روند کر پہلی بار قصبہ میں جانے کے لیئے مجبور کیا ہوگا۔ آج یہاں یہ باریک ٹیمالی پگڈنڈیاں ہیں کل ان پر چھکڑے چلتے ہوں گے۔ اور پرسوں یہاں تارکول کی ایک پختہ سڑک بنتی ہوگی ـــ ٹھیک ان سڑکوں کی طرح جو ہماری آبادی کو منڈیوں، دفتروں، کارخانوں اور طوائفوں کی بستی سے ملاتی ہیں۔" پرمود خاموش ہو گیا اور شیلا مغموم سامنے بیٹھی ہوئی کسی خیال میں غرق ہو گئی۔

"شیلا جب تم گلی کی خالی گلیاں لئے جاتی ہوئی اور اس جاٹنیوں کو یہاں سے لوٹتے دیکھو۔ دوشیزاؤں کو آنچل میں چھپے

باندھ کر گاؤں جاتے دیکھو اور دیکھو کہ ان کے ہونٹوں کو زہر میں ڈبو دیا گیا ہے اور ان کے ارغوانی رخساروں کو نفسی سانسوں سے جھلسا دیا گیا ہے تو محض محسوس کرو کہ زندگی کی ایک شرط پوری ہو گئی ہے ان کا ایک خلا پُر ہو گیا ہے۔ روح اور جسم کے بندھن میں ایک گانٹھ اور لگ گئی ہے۔ ـــ یہ راستے اب نہیں روکے جا سکتے"۔

دن بھر پرمود اسکول میں لڑکوں میں گھرا رہتا جن کی کتابیں روشنائی آلود، کاپیاں بوسیدہ۔ لباس گندے آنکھیں سیاہی میں لتھڑی۔ پیشانی پر مٹی کے ٹیکے اور بار بار کھل جانے والی دھوتیاں ـــ ان کو سدھارنے کی ناکام کوشش کے بعد اکثر پرمود خاموش بیٹھتا اور لڑکے برساتی مینڈکوں کی طرح اس کے ارد گرد اچھلتے اور شور مچاتے پھرتے تو اسے یکایک محسوس ہوتا کہ اس کے اندر کسی چیز کو غش آ رہا ہے۔ اس کا کوئی اہم جذبہ اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ کیا اس قصبہ کی سوتی روح بیدار ہو گی؟ کیا وہ ان بچوں کے دلوں میں کوئی نئی جوت جگا سکے گا؟ ـــ یکایک وہ چونک پڑتا۔

"اجی ماسٹر صاحب ذرا اس اُلّو کے پٹھے کو تو دیکھو۔ دکان پر بٹھایا تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ماں نے کام بتایا تو کھسک بھاگا۔ گولی کھینچ کبڈی۔ اور آج تو سالے نے دکان سے پیسے بھی چرا لیئے۔ حرامزادے"۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا پرمود اس کا ٹھیک اندازہ نہ لگا سکتا۔ صرف اُسے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز تڑپ رہی ہے اور گالیوں کا ولیوسیس پھٹ رہا ہے" اجی ٹھہریئے تو سہی۔ آپ تو خواہ مخواہ بچے کو ..." وہ بچے کو چھڑانے کے لیئے اٹھتا۔

"اجی بس رہنے دو ماسٹر جی۔ اسی طرح تو بچے بگڑتے ہیں۔ اور آپ بھی تو بچانے چلے ہیں۔ یہ اس پڑھائی ہی کا تو اثر ہے خیر مگر آج تجھے بھی الٹا نہ لٹکایا تو ...." اور وہ اپنے ناخلف بیٹے کو اسی طرح گھسیٹتا ہوا لے جاتا جس طرح لایا تھا۔

اکثر اسکول کے وقت میں کسی لڑکے کا باپ آتا" اجی ماسٹر جی۔ ذرا لڑکے کو تو بھیج دو گھر سے مرچوں کی بوری اٹھوا کر لانا ہے۔ گاہک کھڑے ہیں اور دکان پہ کوئی نہیں ہے"۔ اور بغیر اس کی اجازت کا انتظار کیئے وہ اپنے لڑکے کو اٹھاتا۔ "دیکھ بے دکان کی دیکھ بھال کرنا۔ صندوقچی کھلی پڑی ہے اگر پیسے چرائے تو حلال ...." اور آنکھ جھپکنے میں باپ بیٹے دونوں غائب ہو جاتے۔

شروع شروع میں پرمود کو یہ چیزیں بہت شاق گذری تھیں۔ مگر وقت کے ساتھ وہ تمام چیزوں کا عادی ہو گیا۔ اس قصبہ کی ماہیت۔ یہاں کے باشندوں کی ذہنیت اور ان کی اقتصادی حالت اس پر عیاں ہوتی گئی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے درمیان یہ چھوٹا سا قصبہ ایک تجارتی مرکز کی اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں تجارتی شہروں کی افراتفری یا دھواں اُگلتی چمنیاں نہ تھیں۔ یہاں ہر سمت ایک پھیکی اداس ویرانی چھائی رہتی تھی۔ ہفتہ میں جمعہ کو بازار لگتا تھا۔ اور گاؤں والے ہلدی۔ مرچ مسالے مٹی کا تیل۔ تمباکو۔ کانسی کے زیورات اور گوٹا لیس خریدنے کے لیئے وہاں آتے تھے۔ جمعہ کے علاوہ اور دنوں میں اور خصوصاً گرمیوں میں ان گرد آلود کچی سڑکوں۔ اجڑے بازار اور بوسیدہ دکانوں کی وحشت بڑھ جاتی دکانوں میں موٹے موٹے بنیئے کولھوں پر میلی دھوتیاں لٹکائے اونگھتے اور مکھیاں اڑاتے رہتے۔ ان کے مرلکے سامنے بیٹھے ہندی منڈی کے پہاڑے لیئے حسابوں کے گُر رٹتے رہتے۔ ریہ آلود دیواروں اور ٹین کے سائبانوں سے خشک دھول اڑ کر بازاروں میں بھر جاتی۔ ہر طرف دھول خشکی۔ ویرانی۔ صرف پیاؤ کے نیچے تری پر بھڑیں اڑتی رہتیں بازار خالی پڑے رہتے صرف مولی کے سوکھے پتوں اور پیاز کے سڑے چھلکوں کو سونگھتا ہوا کوئی زخمی گدھا بازار سے گذر جاتا اور وہ لنگڑا بیمار سڑک کے چوراہے پر کھڑا ہوا اسی طرح چلنے

منہ سے کف اور رال گراتا رہتا۔ اس وقت موسّی پنساری دوکان سے نکل کر سڑک پر اپنی بوری بچھاتا اور ہمام دستہ میں مرچیں کوٹنے لگتا۔ خشک فضا میں مرچوں کی دھانس پھیل کر وحشت خیز بن جاتی۔ وکانوں کے اندر سے چھینکوں کی آوازیں آنے لگتیں مگر موسّی برابر مرچیں کوٹتا رہتا۔ لوہے کی موسلی ہمام دستہ سے ٹکراتی رہی۔ ٹن ٹلن ٹن ٹلن اور پرمود دوپہر ہی میں ان آوازوں کو سن کر اسکول میں اونگھنے لگتا۔ مرچوں کی دھانس اس کے کلیجے میں بھر جاتی۔ ایک ہلکی کھانسی کی خشکی کا اسے احساس ہونے لگتا۔ اوران آوازوں کے درمیان اسے محسوس ہوتا کہ اسے دق ہوگئی ہے پھیپھڑے کاغذوں کی طرح کھڑکھڑانے لگے ہیں اور بیماری کی بوجھل تکان اس کے اعضا پر چھا جاتی۔ اور ٹھن ٹھنن ٹھن ٹھنن ــــ کانسی کے کڑے بجاتی۔ ہاتھ میں تیل کی بوتل لٹکائے۔ سر پر گھٹری رکھے ایک چماری بازار سے گذرتی۔ موسّی مرچیں کوٹنا بند کر دیتا۔ "ٹھن ٹھنن" اوراری چھبیلی سن تو سہی۔ کیا آج بوتل خالی ہی لے جائے گی" موسلی اپنی میلی گلابی دھوتی سے توند پر رستے پسینوں کو پونچھتے ہوئے کہتا "مرے یہ تو تیری عمر ہوگئی مگر۔۔۔" چماری گالی دیتی چلی جاتی۔ اور موسلی اپنا چھاج نکال کر مرچیں پھٹکنے لگتا "چھج چھج" پرمود کو آتے دیکھ کر وہ پھٹکنا بند کر دیتا۔ آنکھ کے پھولے سے بہتے ہوئے پانی کو پونچھ کر وہ مسکراتا ہوا کہتا "کہو ماسٹر جی اسکول کیسا چل رہا ہے" پرمود اپنی ناک کی چھینکوں اور آنکھ کے پانی کو روک کر مجبوراً کھڑا ہو جاتا "لالہ جی آپ کی مہربانی ہے"۔ اور وہ مرچیں پھٹکنا پھر شروع کرتے ہوئے کہتا۔ "ماسٹر جی ہمارے لونڈے کو بھی تو کچھ پڑھایا کرو۔ سودا تک بیچنا نہیں آتا"۔

وہاں سے آگے بڑھ کر پرمود دہی لینے کے لیئے پرماحلوائی کی دوکان پر رک جاتا۔ "اجی ماسٹر جی تم نے بھی کیا نوکری کی ہے۔ پلنگ پوش اور تھیلے چھپواؤ۔ سوت کی گانٹھیں خریدو۔ نوکری میں کیا دھرا ہے" اور پھر رازدارانہ لہجہ میں مگر پورے احساس برتری کے ساتھ کہتا۔ "اب تم سے کیا چھپانا۔ پچھلے ہفتہ سوت کی دو گانٹھیں خریدی تھیں۔ اور کچھ کھدر بھرا تھا۔ دام کے دگنے ہوگئے" پرمود چونک پڑا۔ تو کیا آپ سوت اور کھدر کی بھی تجارت۔۔۔" "اجی ماسٹر جی پلکھوہ تو ہندوستان کا مانچسٹر ہے یہاں سب یہی کام کرتے ہیں۔ کولی اور جلاہوں کو جب اُدھار سوت دیتے ہیں تو نفع زیادہ کیوں نہ لیں اور صاحب لڑائی کا زمانہ ہے چاندی برس رہی ہے موسّی نے دو سو کمائے۔ لطیف رنگریز اور پیارے چھیپی نے ہزاروں کے وارے نیارے کر دیئے۔ ہاں بائکے پنساری کے لونڈے نے کھدر کی دکان کھولی تھی۔ بارانیکی کا مال بھی لایا۔ پر نقصان دے بیٹھا۔ اجی وہ دکان ہی منحوس ہے"۔ اور یکایک وہ بات بدل کر کہتا۔ "کیوں بابو جی تمہاری انکم ٹیکس کے دفتر میں بھی کسی سے جان پہچان ہے کسی نے شکایت کر دی تھی۔ بھرنے کے لیئے فارم آگئے۔ کیا کروں چوکیدارے کے بیس روپیہ ابھی دے مر چکا ہوں۔۔۔" اور پھر وہ تردد کا ایک گہرا سانس لے کر پنکھے سے مکھیوں کو اڑانے لگ جاتا۔

پرمود کے اسکول چلے جانے کے بعد شیلا کو وقت گذارنا مشکل ہو جاتا۔ وہ محلّے کے کسی گھر میں نہ جاتی تھی۔ گو محلّے کی عورتیں اس کی طرف کافی دلچسپی سے دیکھتی تھیں مگر اسے ان کے گھر جاتے ڈر لگتا اپنی اور پرمود کی شادی کے راز کو وہ ان عورتوں پر افشا کرنا نہیں چاہتی تھی اور اس پر یہ پوری طرح واضح تھا کہ ان عورتوں سے ملاقات کی پہلی کوشش میں اسے ان سوالوں کا جواب دینا پڑے گا جن کا تعلق اس کی شادی۔ ماں باپ اور پرمود کے گھرانے سے ہوگا۔ بہت دنوں تک وہ اس خوف کی وجہ سے مکان کی کھڑکی پر بیٹھی دن گزارتی رہی۔ اسے بعض اوقات محسوس ہوتا کہ [illegible] چلتے چلتے رک گیا۔ آسمان میں سورج کی حرکت بند ہوگئی ہے صرف مدھم ہوا چل رہی ہے اور پیپل کے پتے اس [illegible] جھنجھلا رہے ہیں۔ مگر آخر کار

باندھ کر گاؤں جاتے دیکھو، اور دیکھو کہ ان کے ہونٹوں کو زہر میں ڈبو دیا گیا ہے اور ان کے ارغوانی رخساروں کو نفسی سانسوں سے جھلسا دیا گیا ہے تو محض محسوس کرو کہ زندگی کی ایک شرط پوری ہو گئی ہے ان کا ایک خلا پُر ہو گیا ہے۔ روح اور جسم کے بندھن میں ایک گانٹھ اور لگ گئی ہے۔ ــــ یہ راستے اب نہیں رک سکتے"۔

دن بھر پرمود اسکول میں لڑکوں میں گھرا رہتا جن کی کتابیں روغناتی آلود، کاپیاں بوسیدہ۔ لباس گندے، آنکھیں سیاہی میں لتھڑی۔ پیشانی پر مٹی کے ٹیکے اور بار بار کھل جانے والی دھوتیاں ــــ ان کو سدھارنے کی ناکام کوشش کے بعد اکثر پرمود خاموش بیٹھتا اور لڑکے برساتی مینڈکوں کی طرح اس کے ارد گرد اچھلتے اور شور مچاتے پھرتے تو اسے یکایک محسوس ہوتا کہ اس کے اندر کسی چیز کو غش آ رہا ہے۔ اس کا کوئی اہم جذبہ اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ کیا اس قصبہ کی سوتی روح بیدار ہو گی؟ کیا وہ ان بچوں کے دلوں میں کوئی نئی جوت جگا سکے گا؟ ــــ یکایک وہ چونک پڑتا۔

"اجی ماسٹر صاحب ذرا اس الّو کے پٹھے کو تو دیکھو۔ دکان پر بٹھایا تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ماں نے کام بتایا تو کھسک بھاگا۔ گولی کھیلنے کبڈی۔ اور آج تو سالے نے دکان سے پیسے بھی چرا لیئے۔ حرامزادے"۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا پرمود اس کا ٹھیک اندازہ نہ لگا سکتا۔ صرف اُسے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز تڑپ رہی ہے اور گالیوں کا ولیسوئیس پھٹ رہا ہے" اجی ٹھہریئے تو سہی۔ آپ تو خواہ مخواہ بچے کو ...." وہ بچے کو چھڑانے کے لیئے اٹھتا۔

" اجی بس رہنے دو ماسٹر جی۔ اسی طرح تو بچے بگڑتے ہیں۔ اور آپ بھی تو بچانے چلے ہیں۔ یہ اس پڑھائی ہی کا تو اثر ہے خیر مگر آج تجھے بھی الٹا نہ لٹکایا تو ...." اور وہ اپنے ناخلف بیٹے کو اسی طرح گھسیٹتا ہوا لے جاتا جس طرح لایا تھا۔

اکثر اسکول کے وقت میں کسی لڑکے کا باپ آتا" اجی ماسٹر جی۔ ذرا لڑکے کو تو بھیج دو گھر سے مرچوں کی بوری اٹھوا کر لانا ہے۔ گاہک کھڑے ہیں اور دکان پر کوئی نہیں ہے"۔ اور بغیر اس کی اجازت کا انتظار کیئے وہ اپنے لڑکے کو اٹھاتا۔ "دیکھ بے دکان کی دیکھ بھال کرنا۔ صندوقچی کھلی پڑی ہے اگر پیسے چرائے تو حلال ...." آنکھ جھپکنے میں باپ بیٹے دونوں غائب ہو جاتے۔

شروع شروع میں پرمود کو یہ چیزیں بہت شاق گذری تھیں۔ مگر وقت کے ساتھ وہ تمام چیزوں کا عادی ہو گیا۔ اس قصبہ کی ماہیت۔ یہاں کے باشندوں کی ذہنیت اور ان کی اقتصادی حالت اس پر عیاں ہوتی گئی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے درمیان یہ چھوٹا سا قصبہ ایک تجارتی مرکز کی اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں تجارتی شہروں کی افراتفری یا دھواں اگلتی چمنیاں نہ تھیں۔ یہاں ہر سمت ایک پھیکی اداس ویرانی چھائی رہتی تھی۔ ہفتہ میں جمعہ کو بازار لگتا تھا۔ اور گاؤں والے ہلدی۔ مرچ مسالے مٹی کا تیل۔ تمباکو۔ کانسی کے زیورات اور گوٹا لیس خریدنے کے لیئے وہاں آتے تھے۔ جمعہ کے علاوہ اور دنوں میں اور خصوصاً گرمیوں میں ان گرد آلود کچی سڑکوں۔ اجڑے بازار اور بوسیدہ دکانوں کی دحشت بڑھ جاتی دوکانوں میں موٹے موٹے بنیئے کولھوں پر میلی دھوتیاں اٹکائے اونگھتے اور مکھیاں اڑاتے رہتے۔ ان کے لڑکے سامنے بیٹھے ہندی منڈی کے بہاتے لیے حسابوں کے گُر رٹتے رہتے۔ ریہ آلود دیواروں اور ٹین کے سائبانوں سے خشک دھول اڑ کر بازاروں میں بھر جاتی۔ ہر طرف دھول خشکی ویرانی۔ صرف پیاؤ کے نیچے تری پر بھڑیں اڑتی رہتیں بازار خالی پڑے رہتے صرف مولی کے سوکھے پتوں اور پیاز کے چھلکوں کو سونگھتا ہوا کوئی زخمی گدھا بازار سے گذر جاتا اور وہ لنگڑا بیمار سڑک کے چوراہے پر کھڑا ہوا اسی طرح اپنے

اور رال گراتا رہتا۔ اس وقت موسلی پنساری دوکان سے نکل کر سڑک پر اپنی بوری بچھاتا اور حمام دستہ میں مرچیں
شک فضا میں مرچوں کی دھانس پھیل کر وحشت خیز بن جاتی۔ وہ کانوں کے اندر سے چھینکوں کی آوازیں آنے لگتیں
برمرچیں کوٹتا رہتا۔ لوہے کی موسلی حمام دستہ سے ٹکراتی رہی۔ ٹن ٹھل ٹل ٹھل اور پرمود دوپہری میں ان آوازوں
ول میں اونگھنے لگتا۔ مرچوں کی دھانس اس کے کلیجے میں بھر جاتی۔ ایک ہلکی کھانسی کی خشکی کا اسے احساس ہونے
ن آوازوں کے درمیان اسے محسوس ہوتا کہ اسے دق ہو گئی ہے پھیپھڑے کاغذوں کی طرح کھڑکھڑانے لگے
اری کی بوجھل تکان اس کے اعضا پر چھا جاتی۔ اور ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن ـــ کانسی کے کٹورے بجاتی۔ ہاتھ میں تیل
لگائے۔ سر پہ گٹھڑی رکھے ایک چماری بازار سے گذرتی۔ موسلی مرچیں کوٹنا بند کر دیتا۔ "ٹھن ٹھن"۔ اور ارے چھبیلی
کیا آج بوتل خالی ہی لے جائے گی؟" موسلی اپنی میلی گلابی دھوتی سے توند پر رستے پسینوں کو پونچھتے ہوئے کہتا "مرے
عمر ہو گئی مگر . . ." چماری گالی دیتی چلی جاتی۔ اور موسلی اپنا چھاج نکال کر مرچیں پھٹکنے لگتا "چھج چھج" پرمود کو آتے
پھٹکنا بند کر دیتا۔ آنکھ کے پھولے سے بہتے ہوئے پانی کو پونچھ کر وہ مسکراتا ہوا کہتا "کہو ماسٹر جی اسکول کیسا چل رہا ہے"
ناک کی چھینکوں اور آنکھ کے پانی کو روک کر مجبوراً کھڑا ہو جاتا "لالہ جی آپ کی مہربانی ہے"۔ اور وہ مرچیں پھٹکنا
کرتے ہوئے کہتا "ماسٹر جی ہمارے لونڈے کو بھی تو کچھ پڑھایا کرو۔ سود تک بچنا نہیں آتا"
وہاں سے آگے بڑھ کر پرمود دہی لینے کے لیئے پرما حلوائی کی دوکان پر رک جاتا۔ "اجی ماسٹر جی تم نے بھی کیا نوکری کی
پوش اور تھیلے چھپواؤ۔ سوت کی گانٹھیں خریدو۔ نوکری میں کیا دھرا ہے" اور پھر رازدارانہ لہجہ میں مگر پورے احساس
کے ساتھ کہتا "اب تم سے کیا چھپانا۔ پچھلے ہفتہ سوت کی دو گانٹھیں خریدی تھیں۔ اور کچھ کھدر بھرا تھا۔ دام کے دگنے
پرمود چونک پڑا۔ "تو کیا آپ سوت اور کھدر کی بھی تجارت . . ." "اجی ماسٹر جی پلکھوہ تو ہندوستان کا مانچسٹر ہے یہاں
کام کرتے ہیں۔ کولی اور جلاہوں کو جب اُدھار سوت دیتے ہیں تو نفع زیادہ کیوں نہ لیں اور صاحب لڑائی کا زمانہ
دی برس رہی ہے موسلی نے دو سو کمائے۔ لطیف رنگریز اور پیارے چھیپی نے ہزاروں کے وارے نیارے کر دیئے۔
کے پنساری کے لونڈے نے کھدر کی دکان کھولی تھی۔ بارانیچی کا مال بھی لایا۔ پر نقصان دے بیٹھا۔ اجی وہ دکان ہی منحوس
ور یکایک وہ بات بدل کر کہتا "کیوں بابو جی تمہاری انکم ٹیکس کے دفتر میں بھی کسی سے جان پہچان ہے کسی نے شکایت
تھی۔ بھرنے کے لیئے فارم آ گئے۔ کیا کروں چوکیدارے کے بیس روپیہ ابھی دے کر چکا ہوں . . ." اور پھر وہ تردد
گہرا سانس لے کر پنکھے سے مکھیوں کو اڑانے لگ جاتا۔

پرمود کے اسکول چلے جانے کے بعد شیلا کو وقت گذارنا مشکل ہو جاتا۔ وہ محلے کے کسی گھر میں نہ جاتی تھی۔ گو محلے کی عورتیں
طرف کافی دلچسپی سے دیکھتی تھیں مگر اسے ان کے گھر جاتے ڈر لگتا اپنی اور پرمود کی شادی کے راز کو وہ ان عورتوں
کرنا نہیں چاہتی تھی اور اس پر یہ پوری طرح واضح تھا کہ ان عورتوں سے ملاقات کی پہلی کوشش میں اسے ان سوالوں
جواب دینا پڑے گا جن کا تعلق اس کی شادی۔ ماں باپ اور پرمود کے گھرانے سے ہوگا۔ بہت دنوں تک وہ اس خوف
وجہ سے مکان کی کھڑکی پر بیٹھی دن گذارتی رہی۔ اسے بعض اوقات محسوس ہوتا [illegible] چلتے چلتے رک گیا آسمان میں
سورج کی حرکت بند ہو گئی ہے صرف مدہم ہوا چل رہی ہے اور پیپل کے پتے اس [illegible] جھنجھلا رہے ہیں۔ مگر آخر کار

رگاؤں جاتے دیکھو، دیکھو کہ ان کے ہونٹوں کو زہر میں ڈبو دیا گیا ہے اور ان کے ارغوانی رخساروں کو نفسی سانسوں سے جھل
ہے تو محض محسوس کرو کہ زندگی کی ایک شرط پوری ہو گئی ہے ان کا ایک خلا پُر ہو گیا ہے۔ روح اور جسم کے بندھن میں ایک گا
ٹھ لگ گئی ہے۔ — یہ راستے اب نہیں روکے جا سکتے۔"

دن بھر پرمود اسکول میں لڑکوں میں گھرا رہتا جن کی کتابیں روشنائی آلود۔ کاپیاں بوسیدہ۔ لباس گندے آنکھیں
پتھری۔ پیشانی پر مٹی کے ٹیکے اور بار بار کھل جانے والی دھوتیاں — ان کو سدھارنے کی ناکام کوشش کے بعد اکثر پرم
وش بیٹھتا اور لڑکے برساتی مینڈکوں کی طرح اس کے ارد گرد اچھلتے اور شور مچاتے پھرتے تو اسے یکایک محسوس ہوتا کوئی
کیسی چیز کوشش آ رہا ہے۔ اس کا کوئی اہم جذبہ اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ کیا اس قصبہ کی سوتی روح بید
گی؟ کیا وہ ان بچوں کے دلوں میں کوئی نئی جوت جگا سکے گا؟ — یکایک وہ چونک پڑتا۔
"اجی ماسٹر صاحب ذرا اس اُلّو کے پٹھے کو تو دیکھو۔ دکان پر بٹھایا تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ماں نے کام بتایا
سنک بھاگا۔ گولی کھینچے کبڈی۔ اور آج تو سالے نے دکان سے پیسے بھی چرا لیئے حرامزادے۔" اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا
س کا ٹھیک اندازہ نہ لگا سکتا۔ صرف اُسے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز تڑپ رہی ہے اور گالیوں کا ویسوویس پھٹ رہا ہے۔" ا
ٹھہریئے تو سہی۔ آپ تو خواہ مخواہ بچے کو ....." وہ بچے کو چھڑانے کے لیئے اٹھتا۔
"اجی بس رہنے دو ماسٹر جی۔ اسی طرح تو بچے بگڑتے ہیں۔ اور آپ بھی تو بچانے چلے ہیں۔ یہ اس پڑھائی ہی کا تو اثر
ہر مگر آج تجھے بھی الٹا نہ لٹکا یا تو ....." اور وہ اپنے ناخلف بیٹے کو اسی طرح گھسیٹتا ہوا لے جاتا جس طرح لایا تھا۔
اکثر اسکول کے وقت میں کسی لڑکے کا باپ آتا" اجی ماسٹر جی۔ ذرا لڑکے کو تو بھیج دو گھر سے مرچوں کی بوری اٹھوا
لانا ہے۔ گاہک کھڑے ہیں اور دکان پر کوئی نہیں ہے۔" اور بغیر اس کی اجازت کا انتظار کیئے وہ اپنے لڑکے کو اٹھاتا۔
دیکھ بے دکان کی دیکھ بھال کرنا۔ صندوقچی کھلی پڑی ہے اگر پیسے چرائے تو حلال ....." اور آنکھ جھپکنے میں باپ بیٹے دونو
غائب ہو جاتے۔

شروع شروع میں پرمود کو یہ چیزیں بہت شاق گذری تھیں۔ مگر وقت کے ساتھ وہ تمام چیزوں کا عادی ہو گیا
اس قصبہ کی ماہیت یہاں کے باشندوں کی ذہنیت اور ان کی اقتصادی حالت اس پر عیاں ہوتی گئی۔ چھوٹے چھوٹے گا
ؤں کے درمیان یہ چھوٹا سا قصبہ ایک تجارتی مرکز کی اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں تجارتی شہروں کی افراتفری یا دھواں اگلتی چمنیاں
تھیں۔ یہاں ہر سمت ایک پھیکی اداس ویرانی چھائی رہتی تھی۔ ہفتہ میں جمعہ کو بازار لگتا تھا۔ اور گاؤں والے ہلدی۔ مرچ
مٹی کا تیل۔ تمباکو۔ کانسی کے زیورات اور کوڑیاں لیس خریدنے کے لیئے وہاں آتے تھے۔ جمعہ کے علاوہ اور دنوں میں اور خصو
گرمیوں میں ان گرد آلود کچی سڑکوں۔ اجڑے بازار اور بوسیدہ دکانوں کی دحشت بڑھ جاتی دوکانوں میں موٹے موٹے بنیئے کا
پر میلی دھوتیاں لٹکائے اونگھتے اور مکھیاں اڑاتے رہتے۔ ان کے مڑکے سامنے بیٹھے ہندی منڈی کے بہاتے سے لیے حسا
ب کے گُر رٹتے رہتے۔ ریہہ آلود دیواروں اور ٹین کے سائبانوں سے خشک دھول اڑ کر بازاروں میں بھر جاتی۔ ہر طرف د
خشکی۔ ویرانی۔ صرف پیڑوں کے نیچے تری پر بھیڑیں اڑتی رہتیں بازار خالی پڑے رہتے صرف مولی کے سوکھے پتوں اور پیاز
سڑے چھلکوں کو سونگھتا ہوا کوئی زخمی گدھا بازار سے گذر جاتا اور وہ لنگڑا بیمار سڑک کے چورا ہے پر کھڑا رہتا۔ اسی طر

ے کف اور رال گراتا رہتا۔ اس وقت موتی پنساری کی دکان سے نکل کر سڑک پر پانی چھڑکتا اور ہاون دستہ میں مرچیں
نے لگتا۔ خشک فضا میں مرچوں کی دھانس پھیل کر وحشت خیز بن جاتی۔ دکانوں کے اندر سے چھینکوں کی آوازیں آنے لگتیں
موسلی برابر مرچیں کوٹتا رہتا۔ لوہے کی موسلی ہاون دستہ سے ٹکراتی رہتی۔ ٹن ٹھن ٹن ٹن اور پرمود دوپہری میں ان آوازوں
ر اسکول میں اونگھنے لگتا مرچوں کی دھانس اس کے کلیجے میں بھر جاتی۔ ایک ہلکی کھانسی کی خشکی کا اسے احساس ہونے
۔ اور ان آوازوں کے درمیان اسے محسوس ہوتا کہ اسے دق ہو گئی ہے پھیپھڑے کا فندوں کی طرح کھڑکھڑانے لگے
اور بیماری کی بوجھل تکان اس کے اعضا پر چھا جاتی۔ اور ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن — کھانسی کے ٹکڑے بجاتی۔ ہاتھ میں تیل
بوتل لٹکائے۔ سر پر گٹھری رکھے ایک چماری بازار سے گذرتی۔ موسلی مرچیں کوٹنا بند کر دیتا۔ "ٹھن ٹھنن" او ری چھبیلی
توسہی کیا آج بوتل خالی ہی لے جائے گی۔" موسلی اپنی میلی گلابی دھوتی سے توند پر رستے پسینوں کو پونچھتے ہوئے کہتا "مرے
تو تیری عمر ہو گئی مگر۔۔۔۔" چماری گالی دیتی چلی جاتی اور موسلی اپنا چھاج نکال کر مرچیں پھٹکنے لگتا۔ چھج چھج پرمود کو نتھنے
ہ پھٹکنا بند کر دیتا۔ آنکھ کے پپوٹے سے بہتے ہوئے پانی کو پونچھ کر وہ مسکراتا ہوا کہتا "کہو ماسٹر جی اسکول کیسا چل رہا ہے"
مود اپنی ناک کی چھینکوں اور آنکھ کے پانی کو روک کر مجبوراً کھڑا ہو جاتا۔ "لالہ جی آپ کی مہربانی ہے۔" اور وہ مرچیں پھٹکنا
شروع کرتے ہوئے کہتا۔ "ماسٹر جی ہمارے لونڈے کو بھی تو کچھ پڑھایا کرو۔ سودا تک بیچنا نہیں آتا۔"

وہاں سے آگے بڑھ کر پرمود دہی لینے کے لیے پرما حلوائی کی دوکان پر رک جاتا۔ "اجی ماسٹر جی تم نے بھی کیا نوکری کی
ہے۔ پلنگ پوش اور تھیلے چھپواؤ۔ سوت کی گانٹھیں خریدو۔ نوکری میں کیا دھرا ہے؟" اور پھر راز دارانہ لہجہ میں ذرا پورے احساس
برتری کے ساتھ کہتا "اب تم سے کیا چھپانا۔ پچھلے ہفتہ سوت کی دو گانٹھیں خریدی تھیں۔ اور کچھ کھدر بھرا تھا۔ دام کے دگنے
ہو گئے۔" پرمود چونک پڑا۔ "تو کیا آپ سوت اور کھدر کی بھی تجارت۔۔۔" "اجی ماسٹر جی پلکھوہ تو ہندوستان کا مانچسٹر ہے یہاں
سب یہی کام کرتے ہیں۔ کولی اور جلاہوں کو جب ادھار سوت دیتے ہیں تو نفع زیادہ کیوں نہ لیں اور صاحب لڑائی کا زمانہ
ہے چاندی برس رہی ہے موسلی نے دس سو کمائے۔ لطیف رنگریز اور پیارے چھیپی نے ہزاروں کے وارے نیارے کر دیئے۔
ہاں بانکے پنساری کے لونڈے نے کھدر کی دکان کھولی تھی۔ بازار کی کا مال بھی لیا۔ پر نقصان دے بیٹھا۔ اجی یہ دکان ہی منحوس
ہے۔" اور یکایک وہ بات بدل کر کہتا "کیوں بابو جی تمہاری انکم ٹیکس کے دفتر میں بھی کسی سے جان پہچان ہے کسی نے شکایت
کر دی تھی۔ بھرنے کے لیے فارم آ گئے۔ کیا کروں چوکیدارے کے بیس روپیہ بھی دے مر چکا ہوں۔۔۔" اور پھر وہ تردد
کا ایک گہرا سانس لے کر پنکھے سے مکھیوں کو اڑانے لگ جاتا

پرمود کے اسکول چلے جانے کے بعد شیلا کو وقت گذارنا مشکل ہو جاتا۔ وہ محلے کے کسی گھر میں نہ جاتی تھی۔ گو محلے کی عورتیں
اس کی طرف کافی دلچسپی سے دیکھتی تھیں مگر اسے ان کے گھر جاتے ڈر لگتا اپنی اور پرمود کی شادی کے راز کو وہ ان عورتوں
پر افشا کرنا نہیں چاہتی تھی اور اس پر یہ پوری طرح واضح تھا کہ ان عورتوں سے ملاقات کی پہلی کوشش میں اسے ان سوالوں
کا جواب دینا پڑے گا جن کا تعلق اس کی شادی، ماں باپ اور پرمود کے گھرانے سے ہوگا۔ بہت دنوں تک وہ اس خوف
کی وجہ سے مکان کی کھڑکی پر بیٹھی دن گزارتی رہی۔ اسے بعض اوقات محسوس ہوتا کہ [illegible] چلتے چلتے رک گیا۔ آسمان میں
سورج کی حرکت بند ہو گئی ہے صرف مدہم ہوا چل رہی ہے اور پیپل کے پتے اس [illegible] جھلا رہے ہیں۔ مگر آخر کار

باندھ کر گاڑی چلاتے دیکھو اور دیکھو کہ ان کے ہونٹوں کو زہر میں ڈبو دیا گیا ہے اور ان کے ارغوانی رخساروں کو نفسی سانسوں سے جلسا دیا گیا ہے تو محض محسوس کرو کہ زندگی کی ایک شرط پوری ہو گئی ہے ان کا ایک خلا پُر ہو گیا ہے۔ روح اور جسم کے بندھن میں ایک گانٹھ اور لگ گئی ہے۔ — یہ راستے اب نہیں رو کے جا سکتے"۔

دن بھر پرمود اسکول میں لڑکوں میں گھرا رہتا جن کی کتابیں روشنائی آلود کاپیاں بوسیدہ۔ لباس گندے آنکھیں بیابی میں لتھڑی۔ پیشانی پر مٹی کے ٹیکے اور بار بار کھل جانے والی دھوتیاں — ان کو سدھارنے کی ناکام کوشش کے بعد اکثر پرمود خاموش بیٹھتا اور لڑکے برساتی مینڈکوں کی طرح اس کے ارد گرد اچھلتے اور شور مچاتے پھرتے تو اسے یکایک محسوس ہوتا اس کے اندر کسی چیز کو غش آ رہا ہے۔ اس کا کوئی اہم جذبہ اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ کیا اس قصبہ کی سوتی روح بیدار ہو گی؟ کیا وہ ان بچوں کے دلوں میں کوئی نئی جوت جگا سکے گا؟ — یکایک وہ چونک پڑتا۔

"اجی ماسٹر صاحب ذرا اس اُلّو کے پٹھے کو تو دیکھو۔ دکان پر بٹھایا تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ماں نے کام بتایا تو کھسک بھاگا۔ گولی کھیلے کبڈی۔ اور آج تو سالے نے دکان سے پیسے بھی چرا لیئے۔ حرامزادے"۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا پرمود اس کا ٹھیک اندازہ نہ لگا سکتا۔ صرف اُسے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز تڑپ رہی ہے اور گالیوں کا ولیسوئیس پھٹ رہا ہے" اجی ٹھہریئے تو سہی۔ آپ تو خواہ مخواہ بچے کو..." وہ بچے کو چھڑانے کے لیئے اٹھتا۔

"اجی بس رہنے دو ماسٹر جی۔ اسی طرح تو بچے بگڑتے ہیں۔ اور آپ بھی تو بچانے چلے ہیں۔ یہ اس پڑھائی ہی کا تو اثر ہے خیر مگر آج تجھے بھی الٹا نہ لٹکایا تو..." اور وہ اپنے ناخلف بیٹے کو اسی طرح گھسیٹتا ہوا لے جاتا جس طرح لایا تھا۔

اکثر اسکول کے وقت میں کسی لڑکے کا باپ آتا "اجی ماسٹر جی۔ ذرا لڑکے کو تو بھیج دو گھر سے مرچوں کی بوری اٹھوا کر لانا ہے۔ گاہک کھڑے ہیں اور دکان پر کوئی نہیں ہے"۔ اور بغیر اس کی اجازت کا انتظار کیئے وہ اپنے لڑکے کو اٹھاتا۔ "دیکھ بے دکان کی دیکھ بھال کرنا۔ صندوقچی کھلی پڑی ہے اگر پیسے چرائے تو حلال..." آنکھ جھپکنے میں باپ بیٹے دونوں غائب ہو جاتے۔

شروع شروع میں پرمود کو یہ چیزیں بہت شاق گذری تھیں۔ مگر وقت کے ساتھ وہ تمام چیزوں کا عادی ہو گیا۔ اس قصبہ کی ماہیت۔ یہاں کے باشندوں کی ذہنیت اور ان کی اقتصادی حالت اس پر عیاں ہوتی گئی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے درمیان یہ چھوٹا سا قصبہ ایک تجارتی مرکز کی اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں تجارتی شہروں کی افراتفری یا دھواں اگلتی چمنیاں نہ تھیں۔ یہاں ہر سمت ایک پھیکی اداس ویرانی چھائی رہتی تھی۔ ہفتہ میں جمعہ کو بازار لگتا تھا۔ اور گاؤں والے ہلدی۔ مرچ مسالے مٹی کا تیل۔ تمباکو۔ کانسی کے زیورات اور گوٹا لیس خریدنے کے لیئے وہاں آتے تھے۔ جمعہ کے علاوہ اور دنوں میں اور خصوصاً گرمیوں میں ان گرد آلود کچی سڑکوں۔ اجڑے بازار اور بوسیدہ دکانوں کی وحشت بڑھ جاتی دو کانوں میں موٹے موٹے بنیئے کولہوں پر میلی دھوتیاں لٹکائے اونگھتے اور مکھیاں اڑاتے رہتے۔ ان کے منہ کے سامنے بیٹھے ہندی منڈی کے بہاڑے لیے حسابوں کے گر رٹتے رہتے۔ ریت آلود دیواروں اور ٹین کے سائبانوں سے خشک دھول اڑ کر بازاروں میں بھر جاتی۔ ہر طرف دھول خشکی۔ ویرانی۔ صرف پیڑ کے نیچے تری پر چڑیاں اڑتی رہتیں بازار خالی پڑے رہتے صرف مولی کے سوکھے پتوں اور پیاز کے سڑے چھلکوں کو سونگھتا ہوا کوئی زخمی گدھا بازار سے گذر جاتا اور وہ لنگڑا بیمار سڑک کے چوراہے پر کھڑا ہوا اسی طرح پنے

ہی سے کف اور رال گراتا رہتا۔ اس وقت موتی پنساری دوکان سے نکل کر سڑک پر اپنی پیشاب کرتا اور حمام دستہ میں مرچیں ڈالنے لگتا۔ خشک فضا میں مرچوں کی دھانس پھیل کر وحشت خیز بن جاتی۔ دکانوں کے اندر سے چھینکوں کی آوازیں آنے لگتیں اور موتی برابر مرچیں کوٹتا رہتا۔ لوہے کی موسل حمام دستہ سے ٹکراتی رہی۔ ٹن ٹھل ٹل ٹل اور پرمود دوپہر ہی میں ان آوازوں کو سن کر اسکول میں اونگھنے لگتا مرچوں کی دھانس اس کے کلیجے میں بھر جاتی۔ ایک ہلکی کھانسی کی خشکی کا اسے احساس ہونے لگتا۔ اور ان آوازوں کے درمیان اسے محسوس ہوتا کہ اسے دق ہوگئی ہے پھیپھڑے کا فذوں کی طرح کھڑکھڑانے لگے ہیں اور بیماری کی بوجھل تکان اس کے اعضا پر چھا جاتی۔ اور کھن کھن کھن کھن — کانسی کے کڑے بجاتی۔ ہاتھ میں تیل کی بوتل لٹکائے۔ سر پر گٹھڑی رکھے ایک چماری بازار سے گذرتی۔ موتی مرچیں کوٹنا بند کر دیتا۔ "کھن کھن" اور اس کی چھبیلی سن تو سہی۔ کیا آج بوتل خالی ہی لے جائے گی"۔ موسل اپنی میلی گلابی دھوتی سے تو ند پر رستے پسینوں کو پونچھتے ہوئے کہتا "مرے تو تیری عمر ہو گئی مگر . . ." چماری گالی دیتی چلی جاتی اور موسل اپنا چھاج نکال کر مرچیں پھٹکنے لگتا "چھج چھج" پرمود کو آتے دیکھ کر وہ پھٹکنا بند کر دیتا آنکھ کے پھولے سے بہتے ہوئے پانی کو پونچھ کر وہ مسکراتا ہوا کہتا "کہو ماسٹر جی اسکول کیسا چل رہا ہے" پرمود اپنی ناک کی چھینکیں اور آنکھ کے پانی کو روک کر مجبوراً کھڑا ہو جاتا۔ "لالہ جی آپ کی مہربانی ہے۔" اور وہ چلنے لگتا
ماسٹر جی ہمارے لونڈے کو بھی تو کچھ پڑھایا کرو سودا تک بیچنا نہیں آتا"
پھر شروع کرتے ہوئے کہتا۔ "اجی ماسٹر جی تم نے بھی کیا نوکری کی
وہاں سے آگے بڑھ کر پرمود دہی لینے کے لیے پرما حلوائی کی دوکان پر رک جاتا۔
ہے۔ پلنگ پوش اور تھیلے چھپواؤ۔ سوت کی گانٹھیں خریدو۔ نوکری میں کیا دھرا ہے" اور پھر راز دارانہ لہجہ میں مگر پورے احساس برتری کے ساتھ کہتا "اب تم سے کیا چھپانا۔ پچھلے ہفتہ سوت کی دو گانٹھیں خریدی تھیں۔ اور کچھ کھدر بھرا تھا۔ دام کے دگنے ہو گئے"۔ پرمود چونک پڑا۔ "تو کیا آپ سوت اور کھدر کی بھی تجارت . . ." "اجی ماسٹر جی لکھنؤ تو ہندوستان کا مانچسٹر ہے یہاں سب یہی کام کرتے ہیں۔ کولی اور جلاہوں کو جب اُدھار سوت دیتے ہیں تو نفع زیادہ کیوں نہ لیں اور صاحب لڑائی کا زمانہ ہے چاندی برس رہی ہے موتی نے دو سو کمائے۔ لطیف رنگریز اور پیارے چھیپی نے ہزاروں کے وارے نیارے کر دیئے۔ ہاں بانکے پنساری کے لونڈے نے کھدر کی دکان کھولی تھی۔ بارابنکی کا مال بھی لایا۔ پر نقصان دے بیٹھا۔ اجی وہ دکان ہی منحوس ہے"۔ اور یکایک وہ بات بدل کر کہتا "کیوں بابو جی تمہاری انکم ٹیکس کے دفتر میں بھی کسی سے جان پہچان ہے کسی نے شکایت کر دی تھی۔ بھرنے کے لیے فارم آ گئے۔ کیا کروں چوکیدار کے بیس روپیہ ابھی دے مر چکا ہوں . . ." اور پھر وہ تردد کا ایک گہرا سانس لے کر پنکھے سے مکھیوں کو اڑانے لگ جاتا

پرمود کے اسکول چلے جانے کے بعد شیلا کو وقت گذارنا مشکل ہو جاتا۔ وہ محلے کے کسی گھر میں نہ جاتی تھی۔ گو محلے کی عورتیں اس کی طرف کافی دلچسپی سے دیکھتی تھیں مگر اسے ان کے گھر جاتے ڈر لگتا اپنی اور پرمود کی شادی کے راز کو وہ ان عورتوں پر افشا کرنا نہیں چاہتی تھی اور اس پر یہ پوری طرح واضح تھا کہ ان عورتوں سے ملاقات کی پہلی کوشش میں اسے ان سوالات کا جواب دینا پڑے گا جن کا تعلق اس کی شادی۔ ماں باپ اور پرمود کے گھرانے سے ہوگا۔ بہت دنوں تک وہ اس خوف کی وجہ سے مکان کی کھڑکی پر بیٹھی دن گذارتی رہی۔ اسے بعض اوقات محسوس ہوتا [illegible] چلتے چلتے رک گیا۔ آسمان میں سورج کی حرکت بند ہو گئی ہے صرف مدھم ہوا چل رہی ہے اور پیپل کے پتے اس [illegible] جھلملا رہے ہیں۔ مگر آخر کار

اس نے ان عورتوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔

شیلا ان عورتوں کی زندگی کا جتنا گہرا مشاہدہ کرتی گئی۔ اس کا تعجب ایک موہوم سے جذبۂ خوف میں تبدیل ہوتا گیا۔ بظاہر غیر تعلیم یافتہ۔ گندمی اور گنوار قصبہ کی یہ عورتیں اپنی گھریلو زندگی میں کس قدر الجھی رہتی تھیں وہ تمام رات چکیوں میں ہلدی اور اناج پیستی تھیں۔ ان کی لڑکیاں دیئے کی روشنی میں تھیلے اور پلنگ پوشوں کے پھندنے باندھتی تھیں۔ یہ لڑکیاں بالکل بے تعلیم یافتہ تھیں مگر سود اور بیاج کا حساب لگانے میں بڑی ہوشیار تھیں وہ گاؤں کی جاٹنیوں کو پیشگی روپیہ ادھار دیتی تھیں اور سود کے بجائے ان سے سال بھر تک سستے بھاؤ میں گھی خرید کر بازار میں فروخت کرتی رہتی تھیں۔ بازار میں گھی کا بھاؤ چار چھٹانک کا تھا مگر گاؤں کی مقروض جاٹنیاں ان کو آٹھ چھٹانک کے بھاؤ میں گھی دے جاتی تھیں قصبہ کی مہترانیاں یا دوسری چھوٹی ذات کی عورتیں اپنے چاندی کے زیورات ان کے یہاں گروی رکھ جاتی اور دو آنہ فی روپیہ کا سود ہر ماہ چکاتی رہتیں۔ شیلا اکیلی بیٹھی ہوئی جب ان گھروں میں بھڑکتی حرص و ہوس سود خواری اور مادہ پرستی پر غور کرنے لگتی تو اکثر یوں محسوس ہوتا یہ تمام قصبہ شراب کھینچنے کی ایک بھپاکا بھٹی ہے۔ ترب و جوار کے گاؤں کا تمام عصارہ اس آگ میں کھینچ کر قصبہ کی رگوں میں زندگی کی لہریں دوڑا رہا ہے۔ اور وہ کھجور کے درخت، چھوٹے گاؤں۔ غریب جاٹنیاں اور معصوم لڑکیاں سب بھٹی کے کنارے غلیظ مادہ کی طرح بیعطر ہو چکی ہیں۔

پرمود کو شیلا کے ذریعہ تمام باتوں کا پتا چلتا رہتا۔ اُسے وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر نہ صرف تعجب تا بلکہ کبھی کبھی اسے خوف سے لگتا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یہ قصبہ ایک اقتصادی دور سے گزر رہا ہے۔ لوگوں کی رگوں میں اور خود قصبہ کی رگوں میں مادہ کھول رہا ہے۔ حرص و طمع خود غرضی اور جہالت کے اُبال یہاں پڑے ہیں۔ لیکن انکم ٹیکس اور چندے کے خوف نے ایک مضبوط خول کی طرح اس مادہ کو اُبل کر نکلتے، چمنیوں اور مزدوروں کی قطاروں میں ظاہر ہونے سے روک رکھا ہے جس دن یہ لوگ افسروں کو رشوت دینا، شراب پلانا اور عورتیں پیش کرنا سیکھ جائیں گے یہاں کی زندگی میں انقلاب عظیم آ جائے گا سود خواری کی دبی ہوئی آگ سرمایہ داری اور استحصال کے شعلوں میں بھڑک اُٹھے گی۔ یہ قصبہ ابھی حمل کی حالت میں ہے۔ وہ مادہ نئی زندگی کا وہ ہیولیٰ ابھی پیکر کمالی نہیں بنا۔ اور پرمود کو زبردست خواہش ہوتی کہ قصبہ کی آنے والی نسل کا تخیل ایک افق ان کے سامنے پیش کر سکے تاکہ جب قصبہ کی اقتصادی زندگی ایک زبردست کروٹ لے تو یہاں کی نسل اپنی زندگی کی از سر نو تشکیل کر سکے۔

پرمود اسی خیال کو لے کر کمیٹی کے الیکشن میں کھڑا ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔

دُرگی اب شیلا کے گھر آنے جانے لگی تھی۔ ایک دن جب وہ سر پر بوجھ اُٹھائے۔ گردن جھکائے مٹی کے تیل کی بوتل ہاتھ میں لٹکائے خاموش سڑک پر جا رہی تھی۔ نہ جانے ٹھوکر لگی۔ وہ گر پڑی تیل کی بوتل ٹوٹ گئی۔ شیلا نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ اپنے گھر لائی اور ...... اور اسی وجہ سے گاؤں کی تقریباً تمام لڑکیاں اس کے گھر آنے لگی تھیں۔ وہ لڑکیوں کو سوئیٹر بننا سکھاتی۔ کشیدہ کاری کا سبق دیتی ان کے حساب لگا کر دیتی غرض اس کی زندگی کی بولناک تنہائی معصوم لڑکیوں کی پُر محبت نگاہوں اور پُر عقیدت الفاظ میں مبدل ہو گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ مگر درگی اب بھی اس طرح اُداس رہتی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ کی ایک لکیر کھنچ گئی تھی۔ اور اس کے قریب بیٹھے بیٹھے شیلا کو محسوس ہونے لگتا۔ درگی ایک زخم ہے زخم مجسم ...... جس کی سطح خشک ہو گئی ہے۔ جس کا انگور بندھ گیا ہے

وہ ایک کان ہے جس کا سونا لٹ گیا ہے۔ مگر اوپر سے تیج ابھی ہوا ہوا ہے۔ اور وہ دوڑ کر زندگی سے چمٹ جاتی اسے بری طرح چومنے لگتی۔ "تو اداس کیوں ہے پایل۔" اچانک مسکرا دو۔ مجھے نہیں چھوڑوں گی۔" زندگی دھیرے دھیرے مسکراتی۔ اور شیلا کو محسوس ہوتا کہ زخم کا منہ کھلنے لگا ہے۔ رانگور پھٹنے لگا ہے اور کان کی سطح میں دراڑیں پڑنے لگی ہے۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ جاتی۔ "جھوٹ ناراض ہو گئیں بی بی جی۔ میں مسکرا تو رہی ہوں۔ دیکھو" اور شیلا دیکھتی وہ مسکرا رہی ہے اس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں اور آنکھوں میں ایک آنسو مسکرا رہا ہے۔ وہ زندگی سے چمٹ جاتی اور اسے محسوس ہوتا دردا اور غم کا جو پتھر زندگی کی روح پر رکھ دیا گیا ہے پگھلنے لگا ہے۔ پتھر پگھلتا رہتا۔

اب پرمود کی مدد سے شیلا نے عورتوں کی ایک جماعت بنالی تھی۔ اس نے ایک ہفتے تک گاؤں کی کسی لڑکی کو تیلیے اور چک بیچنے والوں کی دکانوں پر نہ جانے دیا۔ قصبہ میں واویلا مچ گیا۔ آخر بنیوں نے بندھائی کی مزدوری دگنی ہو گئی۔ پیارے چھینپی کی دکان کا بائیکاٹ ہو گیا۔ سوال جا کر اب کوئی بھی نہ پھٹکتا۔ اب گاؤں کی لڑکیاں اس کے گھر آکر جمع ہو جاتیں اور دکانوں کے آدمی اپنے تھیلے اور چک پوش وہیں آ کر دے جاتے۔ قصبہ کی زندگی میں ایک بے چینی سی پھیل گئی تھی۔ مگر شیلا کے خلوص اور طمانیت نے اس کو ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ خود قصبہ کی عورتوں کی مزدوری بھی دگنی ہو گئی تھی۔ کسی کو شیلا سے شکایت کا موقع نہ تھا۔ اب خود عورتیں اپنی لڑکیوں کو بیکار پا کر کہہ دیتیں "ارے جا ری نی بی جی کے یہاں چلی جا۔ یہاں بیٹھی کیا پتھر پھوڑ رہی ہے۔ جانے گی تو کچھ سلیقہ کرنا آئے گی۔" آج کل شیلا کو محسوس ہوتا اس کی کھوئی زندگی اسے واپس مل گئی ہے۔ پرمود کے ساتھ گھر سے چلے آنے کے بعد اس کی زندگی کا خلا اب پُر ہو رہا تھا۔

لیکن جس دن سے ہیرا رنگریز کی لڑکی بانکے پنساری کے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی اس دن سے محلے پر ایک سہمی سہمی خاموشی اور منحوس سا سکوت چھا گیا گویا محلے کی تمام عورتیں کسی گہرے سوچ میں ڈوب گئیں۔ یہ سہمی منحوس خاموشی شیلا کا دم سا گھونٹنے لگی۔ اسے محسوس ہوتا فضا میں اس کے خلاف سازش کے مبہم تانے بانے بنے جا رہے ہیں۔ پرمود آج کل دیر سے لوٹتا تھا۔ الیکشن کے سلسلے میں وہ کافی مصروف رہتا تھا۔ ایک دن شام کو شیلا کھڑکی پر کھڑی ہوئی باہر دیکھ رہی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اور مغربی آسمان پر سرخی بکھر رہی تھی۔ اور پیپل کے پیڑ پر چڑیاں اور کوے بسیرا لے کر بیٹھنے لگے تھے۔ یکایک اسے محسوس ہوا اس کے اندر کوئی چیز دھم سے بیٹھ گئی۔ اس کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا۔

"بی بی مجھے تو شروع سے ہی اس کے لچھن برے لگتے تھے...... چوڑیا بندا۔ آڑی مانگ۔ چوڑی کنارے کی چھینٹ دھوتی۔ یہ تو بیسواؤں کے کام ہوتے ہیں۔ تیسری لڑکی کوئی ایسی تھوڑے تھی۔ اس کے پاس بیٹھ کر بگڑ گئی۔ ... اور بی بی مجھے تو یہ خود بدچلن معلوم ہوتی ہے...... اب تو ہی بتا۔ اسے یہاں آئے چھ مہینے ہو گئے کسی نے اسے گھر جاتے دیکھا! —— ارے آتا کوئی رشتہ دار تو شتے آتا۔ بی بی مجھے تو خود یہ گھر سے بھاگی......" گلی میں دیوار کے سہارے پیارے چھینپی کی بہو ہیرا رنگریز کی بیوی سے کہہ رہی تھی۔ شیلا فرش پر گر پڑی تھی۔

"شیلا۔ تجھے کیا ہوا ہے" پرمود نے گھر میں داخل ہوتے ہی بیہوش شیلا کو اٹھا لیا۔ اس نے اس کے گلے اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا اس کا رنگ کپاس کے پھولوں کی طرح پھیکا پڑ گیا تھا۔ اور دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح وہ پرمود کی گود میں پڑی کانپ رہی تھی۔ "شیلا او شیلا" پرمود نے اس کے منہ پر سرہانی کے چھینٹے دیے اس کی پلکوں اور ہونٹوں میں ہلکی جنبش ہوئی۔ "شیلا دیکھو میں پرمود ہوں تجھے

رہا ہوں۔ ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ شیلا نے آنکھیں بند کئے ہوئے اس کی گود میں کروٹ بدلی۔ پرمود نے اس سے سارا ماجرا سنا۔ بس اتنی سی بات پر گھبرا گئی تھی۔ پگلی کہیں کی۔ ارے میں تو تیرے ساتھ ہوں نا۔ اور رات کو جب پورنماشی کا چاند آسمان پر آیا تو بھی پرمود شیلا کے پاس تھا اور جب دو آدمی رات گئے ڈھلنے لگا تھا تب بھی وہ شیلا کے ساتھ تھا —— سوئی ہوئی شیلا کو گھیرے ہوئے بانس کے اونچے درختوں کی طرح۔ تمام رات کھڑکی کے راستے چاند اپنی کرنیں شیلا کے بالوں اور رخساروں میں پگھلاتا رہا اور وہ بندرگاہ میں محفوظ کشتی کی طرح سوتی رہی۔

پرمود کی وجہ سے قصبہ میں ہنگامہ سا بپا ہو گیا تھا۔ اب تک الیکشن کی راہیں ریلوے کے بیکار ٹکٹوں اور سگریٹ کے خالی ڈبوں کی طرح تھیں۔ جو پہلے آ تا وہ لوگ اس کو رائے دے دیتے۔ مگر اس بار چند نئی باتیں ان کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اسکول سے آ کر لڑکے اپنے والدین سے کہتے "ماسٹر جی کو رائے دینا۔ ماسٹر جی ہمارے قصبہ کی صفائی کرائیں گے۔ کہیں گندگی نہیں رہے گی۔ محلے میں لالٹینیں، گلیوں میں پانی کے نل، پکی سڑکیں اور پتھر کی نالیاں بنوائیں گے۔" اور یہ سب سن کر انہیں محسوس ہوتا۔ ہاں ان سب چیزوں کی ضرورت تو ہے۔ رات کو اندھیرے میں ٹھوکریں لگتی ہیں۔ بہو بیٹیاں پانی بھرنے کے لئے دور جاتی ہیں۔ گاڑیوں کے پہیے گڈھوں میں پڑ کر ٹوٹ جاتے ہیں اور ٹھیک بھی ہے۔ اگر کمیٹی یہ سب نہ کرائے گی تو کون کرائے گا۔ پرمود کو اپنی کامیابی کی پوری امید ہو گئی تھی۔ اس کا اخلاق ویسے بھی لوگوں کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ موسلی پنساری تو بیچ بازار میں مرچیں کوٹتے ہوئے کہتا "صاحب ایک بات تو ہے۔ گھمنڈ تو اس میں چھو کر نہیں گیا ہے۔ ہم تو جب کبھی ریل کی بلٹی یا ٹیکس کا فارم بھروانے گئے بیچارہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم سے تو گھنٹوں بات کرتا ہے۔ میری رائے تو اسے ہی جائے گی۔" اور پرمود کو اسکول سے لوٹتے دیکھ کر پکار اٹھتا "ماسٹر جی ممبر تو آپ ہو ہی جائیں گے۔ ایک لالٹین تو ہماری گلی میں بھی لگوا دینا۔"

پرمود کے حلقہ سے آج تک پیارے چھیپی ممبر ہوتا آیا تھا۔ مگر اس دفعہ پرمود اس کے موروثی حق میں دخل انداز ہوا تھا۔ شیلا کی وجہ سے کوئی لڑکی اس کی دکان پر نہ آتی تھی۔ پرمود کی اس حرکت نے اسے آگ بگولا کر دیا۔ جب رائے مانگنے کے لئے وہ بازار کے چوک میں پہنچا تو موسلی پنساری، لطیف رنگریز اور پرما حلوائی نے اعلانیہ کہدیا "ہم تو ڈنکے کی چوٹ پر مود ماسٹر کو رائے دیں گے۔" پیارے کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مگر وہ زمانہ ساز تھا۔ "خیر لالہ رائے کسی کو دو۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ روشنی، صفائی اور پانی کے انتظام کے لئے جب تم سے ٹیکس، چونگی دارا اور چندے لئے جائیں گے تب معلوم ہوگا۔ ان سب کاموں کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ تمہارے بچے کیا بھرنا لیوں پر بیٹھ کر فراغت پا سکیں گے؟ چالان ہوں گے جرمانے ادا کرنے پڑیں گے۔ لڑکے دکانوں سے اٹھوا اٹھوا کر اسکولوں میں بھرتی کرائے جائیں گے۔ تب تمہاری دکانوں پر کون بیٹھے گا؟ —— بتاؤ" بازار میں ایک ساتھ سنسنی پھیل گئی۔ ایک فوری جوش کے بعد جب لوگوں نے اقتصادی تعین کے ساتھ غور کیا تو معلوم ہوا کہ تمام خرچ ٹیکس کے ذریعہ وصول کیا جائے گا۔ چندے دینے پڑیں گے۔ لڑکوں کو اسکول میں داخل کرانا پڑے گا —— چالان۔ چندے، چوکیدارا۔ انکم ٹیکس . . . . اور تم کو معلوم ہے تمہارے بابو صاحب اس عورت کو بھگا کر لائے ہیں" پیارے چھیپی نے شیطانی مسکراہٹ لا کر کہا۔ موسلی پنساری کا چہرا آگ بگولا ہو گیا

"پیارے لال، ہوش میں آ کر بات کرو۔ بہو بیٹیوں پر انگلی نہ اٹھانا۔ ایسی بہو تمہارے شہر میں تو نکال دینا۔"

"ہاں ہاں لالہ سن لیا۔ ذرا ان بابو صاحب سے پوچھ کر تو دیکھو کہ ان کی سسرال کہاں ہیں" پیارے کا منہ نیم کو لے کر

رہ گیا۔ اندازہ سکتہ کا عالم چھا گیا بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر لطیف اور پر ماقریب آکر بولے "کیوں موسلی لال ماسٹر سے پوچھ کر آج ہی اس کا منہ کیوں نہ توڑا جائے"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" موسلی لال اپنی دھوتی کی لانگ میں لگے ہوئے پیسے سنوارتا ہوا بولا۔

الکیشن کو دو دن رہ گئے تھے پیارے چھینی منتوا افواہیں پھیلا رہا تھا۔

"ماسٹر جی آپ کی شادی کہاں ہوئی؟" ——— آپ کے خر ... ؟" پرمود بازو سے گذر رہا تھا۔ لطیف ٹھگر برتنگے اس سوال کو سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کے خواب میں بھی خیال نہ تھا ... سے کبھی پوچھ بھی ... یہ پرمود خاموش کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں کا نشیم پاس کی پیاسے پانی پی کر میلی دھوتی سے منہ پونچھتا ہوا آیا "ماسٹر جی کیا بتا ہیں گے۔ ایسے کاموں میں بھی کیا نام وام ہوتے ہیں۔"

"کیوں ماسٹر جی" موسلی قریب آکر ذرا سخت لہجے میں بولا۔

"آپ یہ خیال کریں۔ میں نے شیلا سے محبت کی شادی کی ہے ہیں کسی کا نام نہیں بتا سکتا"

پرمود گھر لوٹ آیا۔ اب اس کو کامیابی کی بہت کم امید رہ گئی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پرمود چونک پڑا۔ شیلا روتی ہوئی اس کے گلے میں آ چپٹی اور سامنے فرش پر پڑی ہوئی درگی سسک رہی تھی۔

"ارے کیا ہوا۔ بولو۔ گاؤں میں تو سب راضی خوشی ہیں" مگر شیلا برابر روئے جارہی تھی اور طاق میں رکھے ہوئے دیئے کی لو بھڑک بھڑک کر کمرے میں روشنی اور تاریکی کو ڈانواں ڈول کر رہی

"پرمود .... درگی"

اور پرمود نے اس دفعہ درگی کی طرف غور سے دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ فرش پر پڑی سسک رہی تھی۔ یکایک پرمود کی نگاہ درگی کے پیٹ پر جم کر رہ گئی۔

"شیلا میں نے دیکھ لیا"

"بھیا" یکایک درگی زور سے چیخ اٹھی۔ اس نے اپنا منہ کپڑوں میں چھپا لیا "بھیا مجھے تھوڑا سا زہر لا دو۔ بھیا تم کو میری قسم" درگی چیخ مار کر پھر زمین پر سر پھوڑنے لگی۔

"ارے تو ایسی بات منہ سے کیوں نکالتی ہے۔ تیرا بھیا تو ابھی زندہ ہے۔ وہ تو جانتا ہے کہ تو پاک ہے" مگر درگی طاق میں رکھے دیئے کی طرح روئے جارہی تھی۔ سسک رہی تھی۔ وہ اب گاؤں واپس جانا نہ چاہتی تھی۔ اس رات درگی پرمود کے یہاں ٹھہر گئی۔

شیلا اور درگی مکان کی چھت پر سو رہی تھیں۔ پرمود مکان کے باہر گلی میں لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں الگ سے چل رہے تھے۔ خیالات کے ہجوم نے اسے خالی الذہن بنا دیا تھا۔ وہ آسمان پر ایک بڑے ستارے کو دیکھ رہا تھا جو اسے بُری طرح گھور رہا تھا۔ اس وقت آسمان کے سیاہ پس منظر پر پیپل کی ننگی لانبی شاخیں کسی غیبی قوت کے پیچیدہ جال کی طرح تنی پڑی تھیں۔ اور چیلوں کے گھونسلے اس منحوس سیاہ جال کے مرکز معلوم ہوتے تھے۔ یکایک ایک لاٹھی اُس کے سر پر پڑی۔

"بدمعاش ہماری ماں بہنوں کی عزت لوٹتا ہے۔ سالے جان سے مار ڈالیں گے" اور ایک ساعت لاٹھیوں کا بوچھاڑ جھیلنے والے درگی کو اس کے مکان سے گھسیٹ کر لے گئے۔

پیارے چھینی نے جاکر گاؤں والوں کو بھڑکا دیا تھا۔ "ارے تم اُسے دیوتا کہتے ہو۔ اس نے تو تمہاری ماں بہنوں کی عزت لوٹ لی ہے۔ اور نہ جانے ان فولادی آنکھوں سے کس طرح وہ آنسوؤں کو ٹپکا کر بولا۔ "آج بھی تو کمبخت نے اسے گھر میں چھپا رکھا ہے۔" گاؤں والوں میں آگ بھڑک اُٹھی تھی۔

قصبہ سے جانے والی سڑک پر ایک تانگے میں شیلا زخمی پرمود کو سنبھالے قصبہ سے جا رہی تھی ...... خاموش۔ ہمیشہ کے لئے۔ سڑک کے اس پار پگڈنڈیوں والے خشک وسیع میدان میں خاکی بھوت ناچ رہے تھے اور پگڈنڈیوں کو روندتا ہوا ایک بھاری چھکڑا آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ ایک جگہ میدان میں سات آٹھ آدمی ٹوپ اور دھوپ کے چشمے لگائے فیتے اور دُوربینوں کے ذریعہ پگڈنڈیوں کی پیمائش کر رہے تھے۔

"یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے آدمی ہیں۔ پیمائش کر رہے ہیں۔ اب یہاں تارکول کی پکی سڑکیں بنیں گی نا"

شیلا کو ادھر متوجہ دیکھ کر تانگے والا زور سے کہہ رہا تھا۔

اور پیاسا گھوڑا زبان نکالے سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ کمہار کے بیٹے خاموش جینتوں کی طرح پیروں پھڑپھڑ سہہ رہے تھے۔

ریوتی سرن شرما

تپش[1] کی یاد میں

سُونا سونا نظر آتا ہے جہانِ اُردو	کہ تپش سے ہوئی محروم زبانِ اُردو
مشعلِ راہ سمجھتا تھا جسے ذوقِ سلیم	موت نے آہ مٹایا وہ نشانِ اُردو
غم ہے احباب کو محروم ہے انشائے عجم	اور پھر اس پہ اضافہ ہے زیانِ اُردو
شوخیاں داغ کی، غم میر کا، غالب کا خیال	تونے اشعار کی جالی تو اور وہ جانِ اُردو
فخرِ اسلاف تری خاک میں پہلے کم تھے؟	کاش ملتاں تو نہ کھاتا یہ جوانِ اُردو
غیرتِ لکھنؤ و دہلی تھا ملتاں تجھ سے	حلقۂ درس ترا، روح و روانِ اُردو
نگہیں سے بھی فزوں تیری نہایت شیراز	جانِ اُردو کی، ترا حسنِ بیانِ اُردو
ماضی و حال میں جو ربط تھا قائم نہ رہا	اب کہاں اور اس انداز کی شانِ اُردو

موت عالِم کی ہُوا کرتی ہے مرگِ عالَم

ہے ترا مرثیہ خواں، مرثیہ خوانِ اُردو

خضر تمیمی

[1] (وفات فروری ۱۹۴۲ء)

وہ شہر سے بہت دور نکل آیا تھا — دریا کے کنارے چلتے چلتے وہ یہ بھی نہ جان سکا کہ کتنا فاصلہ طے ہو گیا ہے۔ سردیوں
کی خوشگوار دھوپ میں وہ ایک کیف محسوس کر رہا تھا۔ ابھی دھوپ میں جلن نہیں تھی۔ ایک سکون تھا — ایک عالم دو
جا جیسے پورے چاند کی چاندنی۔ احساس کا دماغ خیالات کے تنکے اپنے تن سا تھا — خیالوں کے جال بچھا کر پُرسکون دماغ
ہو سکتا ہے۔ اضطراب کے تو خفیف سے جھٹکے بھی نازک تاروں کو توڑ دیتے ہیں — سکون ذہن کو ایک ہے جو بکھیر سکتا
جس کی طرح ایک ہی ہلے سے ستی بکھیرے جاتا ہے اور اضطراب ایک سلگتی ہوئی آگ ہے جس کا دھواں آہستہ آہستہ خیالات کا
گلا گھونٹ دیتا ہے — دریا کے بہاؤ کے خلاف چلتے ہوئے وہ چھوٹی چھوٹی لہروں کو ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے
ہوئے دیکھتا جا رہا تھا وہ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کھیلتی تھیں۔ رقص کرتی تھیں۔ کچھ گنگناتی تھیں — لہریں
کیسے نغمے گایا کرتی ہیں؟ کون ہے جو ان نغموں کی تخلیق کرتا ہے اور پھر ان لطیف نغموں کو سمجھتا کون ہے؟ کیا یہ سب انسان کے لئے ہے
— شکستوں۔ ناامیدیوں اور مایوسیوں کی آگ میں جلتا ہوا ہڈیوں کا ایک پنجر — اس کا جی بہلانے کے لئے ہیں یہ
نغمے۔ یہ رقص۔ یہ لہریں یہ تارے یہ پھول — اور کیا وہ ان کو کبھی سمجھا ہے — لہریں اسی طرح اپنے کھیل میں مصروف تھیں
ان کے یہ کھیل دریا کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال رہے تھے۔ جس طرح انسان کے کھیل زندگی کے بہاؤ میں روڑے اٹکایا کرتے
ہیں — انسان کے کھیل دراصل زندگی کے دریا کے بہاؤ کو باندھنے کی مختلف کوششوں کے نام ہیں — ہر کھیل دریا کو
کسی خاص سمت بہانے کی ادنیٰ سی سعی ہے — انسان کے ہر کام میں خودغرضی کی جھلک ہے۔ مشاغل میں بھی۔ کھیلوں
میں بھی لیکن لہروں کے کھیل کتنے معصوم تھے بہاؤ اور ہنگامے سے بے پرواہ تھے — شور کی تندی سے دلشکن تھی
ہوئی لہروں کے جال اس کے الجھے ہوئے خیالات کی ترجمانی کر رہے تھے — مگر ان میں سلجھاؤ بھی تھا اور وہ سلجھاؤ دریا کی
روانی کی تخلیق تھی لیکن اس کے الجھے ہوئے خیالات کو سلجھانے کی ہمت کسی میں بھی نہ تھی — اس کی زندگی کا دریا رواں ضرور تھا
لیکن اس سے لہریں سلجھنے کی بجائے اور الجھتی تھیں — اور وہ اپنی زندگی کے دریا میں لہروں کے بنتے اور بگڑتے ہوئے
خاکے دیکھ رہا تھا —

لہروں کے کھیل میں منہمک وہ کنارے پر کھڑا ہو گیا — کنارے کے قریب شاید پانی کم گہرا تھا۔ اس لئے چھوٹی چھوٹی
موجوں کا رقص وہاں دکھائی نہ دیا — وہ کنارے کے اور قریب ہو گیا — اسے معلوم ہوا کہ وہ پرانے گھاٹ پر کھڑا ہے چند
سال ادھر اس سے ذرا اوپر نیا گھاٹ بن گیا تھا۔ اور اب اس گھاٹ پر کوئی نہ آتا تھا — نہ جانے کتنی مدت یہ گھاٹ کہلاتا
— اب تو سیڑھیوں کے بہت سے پتھر اکھڑے پڑے تھے۔ دراڑوں میں گھاس اگ آئی تھی — پانی کی وجہ سے بہہ
گیا تھا — اب وہ گھاٹ ایک ایسی لاش کی طرح تھا جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ نزدیک نہیں آتے — اس گھاٹ کا نام
پتھر نامعلوم کتنے دنوں کے ... ان پتھروں سے نہ جانے کتنے ... کے پاؤں مس ہوئے تھے — کون کہہ

سکتا ہے پتھر کیسے دل بھی دھڑکتے ہوں — ان اُکھڑے ہوئے اور دریا میں گرے ہوئے پتھروں نے کس کس پائل کی جھنکار سُنی ہو گی — جذبات کے کھیلوں سے کتنے ہی نشان اُن کی ٹھوس سطح پر اب بھی دیکھے جا سکتے ہوں گے — دریا کا گھاٹ ایک مکمل تاریخ ہے مگر یہ انسان ان اوراق کو اُلٹنے کے قابل نہیں — اور اب یہ پتھر اپنے اپنے راز سینوں میں سنبھالے وقت کی ٹھوکروں کا مقابلہ کر رہے تھے — اب تو کوئی کشتی یہاں نہیں لگتی ـ کسی بھی افسانے کی ابتدا یہاں نہیں ہوتی — اب تو لہریں بھی اُس کے پاس ٹھہرنا نہیں چاہتیں ـ وہ گھاٹ گویا کوئی دقیانوسی خیالات کا بوڑھا ہے جس نے اپنے گرد ماضی کا آنچل لپیٹ رکھا ہے اور دریا کی ننھی ننھی لہریں جوان لڑکیاں اور اُن کے کھیل جوانی کی اُمنگیں — اور وہ الھڑ لڑکیاں اُس بڈھے کی کمزور اور مُندی آنکھوں سے دُور رقص کرتی ہیں ، گاتی ہیں ، ہنستی ہیں اور وہ بوڑھا کچھ نہ دیکھتے ہوئے بھی دل مسوس کر رہ جاتا ہے — اُس کے اپنے خیالات کی لہروں میں بھی اُلجھاؤ بڑھ گیا ـ دریا کی روانی کچھ رُکتی ہوئی سی معلوم ہوئی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خود بھی ایک گھاٹ ہے — دریائے زندگی کے کنارے بنایا گیا خوبصورت گھاٹ ـ کبھی وہاں بھی نئی نئی کشتیاں لہروں سے کھیل کر فارغ ہو جانے کے بعد سیڑھیوں سے لگی تھیں — اُس نے بھی جھانجنوں کی جھنکار سُنی تھی ـ وہاں بھی حسن و عشق کے افسانوں کی ابتدا ہوئی تھی — مگر اب دریا نے رُخ بدل لیا ہے ـ اب اُس گھاٹ کی ضرورت نہیں — اب وہاں کوئی بھی نہیں آتا ـ اب وہ تھکے ہوئے مسافر کی طرح کنارے پر پڑا دریا کے بہاؤ کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتا رہتا ہے — اب وہ گھاٹ ٹوٹ گیا ہے — اور اُسے پُرانے گھاٹ کے اُکھڑے ہوئے پتھروں سے کچھ مناسبت سی محسوس ہوئی ـ اُس نے چاہا وہ ان پتھروں سے لپٹ کر خوب روئے —

دُور اُفق پہ سورج کی جو تما کشتی بھی اپنے نا جانے کب کے بنے ہوئے ایک ہی گھاٹ پہ لگنے کی کوشش میں تھی — یہ گھاٹ کیا کبھی پُرانا نہ ہوگا ـ اس پر کیا ہمیشہ رونق ، چہل پہل ، نغمے اور رقص ہی نظر آئیں گے ؟ یہاں ہمیشہ ہولی ہی کھیلی جائے گی ؟ اس گھاٹ کے پتھر کبھی نہ اُکھڑیں گے ـ اور کیا اس گھاٹ کا دریا کبھی اپنا رُخ نہ بدلے گا — اب تو اُسے رُخ بدل دینا چاہئے — وہ کچھ یوں ہی سی باتیں کر رہا تھا ـ اُس کی گفتگو کا مخاطب شاید وہی پُرانا گھاٹ تھا جس میں اُسے بہت کچھ مطابقت دکھائی دیتی تھی — اور اُس نے ذرا اوپر نئے گھاٹ پر لگی ہوئی خوبصورت چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی طرف دیکھا جو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں کسی دُور کے دیس کی جل پریاں معلوم ہوتی تھیں — اُس نے بھی بہت سی جل پریوں کے کھیل دیکھے تھے ـ اور پُرانا گھاٹ پھر ایک دفعہ زندہ ہونے لگا — اُس کے خیالات نے ایکدفعہ پھر انگڑائی لی — ریحانہ ، زہرہ ، ثریا ، سلمیٰ ، بلقیس — جانے کتنی ہی جل پریاں وقت کے غیر مرئی پردے سے جھانکنے لگیں ـ وہ پھر اُن کے رقص اور نغموں میں کھو گیا — کئی چاندنی راتیں — پھولوں سے بھرے ہوئے کئی باغ — آبِ حیات اُگلتے ہوئے کئی چشمے ـ کنول پھولوں سے بھری ہوئی کئی جھیلیں — سائے کی گود میں سوئے ہوئے کئی دریا — اور سیماب کی طرح مچلتے ہوئے کئی آبشار اُس کے تصوّر کی دُنیا آباد کرنے کو آ گئے — اُس نے ہر افسانے کو بغور پڑھنا شروع کیا — دیر تک وہ اُن کہانیوں میں مصروف رہا — آخر دنیا کی ہر شے کی طرح ماضی کے وہ افسانے بھی ختم ہو گئے — جل پریاں جیسے دریا کی تہ میں غوطہ لگا گئی تھیں — نئے گھاٹ کے ساتھ لگی ہوئی کشتیاں تاریکی کے ہلکے سے غلاف میں چھپ گئی تھیں اور یہ پُرانا گھاٹ عابد کے پاگل پن پر جیسے قہقہے لگا رہا تھا ـ پاؤں کو ہلاتے وقت ایک پتھر لڑھکتا ہوا دریا کے پانی میں جا گرا تھا ـ یہی تھا اُس بوڑھے گھاٹ کا کھوکھلا سا قہقہہ —

عابد کی عُمر چالیس سے کچھ اوپر تھی اور ابھی تک وہ شادی نہ کر سکا تھا ـ اُس کا گھر ابھی تک آباد نہ ہو سکا تھا — وہ رات گئے دو بجے گھر پہنچے یا سرِ شام ہی چراغ گُل کر کے چارپائی پر پڑا رہے کوئی پوچھنے والا نہ تھا ـ وہ پیٹ بھر کر کھائے یا بالکل بھوکا رہے

ں میں مسرت کے گیت پڑھیں یا وہ زہر غم اگلے ـــ وہ پھولوں کی طرح برستے یا انگاروں کی طرح کھیلے۔ اس کے لبوں پر تبسم رقص کرے
سلوں میں اشکوں کی دھند بھر جائے ـــ کسی کو اس سے کیا غرض! وہ بے سہارا تھا ـــ بالکل بے سہارا ـــ اس گھاٹ کی
رح جیسے دھوپ سے بچنے کے لئے کسی درخت کی چھاؤں بھی میسر نہ تھی ـــ آج اسے پہلی دفعہ اپنے اکیلے پن کا اتنی شدت
احساس ہوا اور اس کی آنکھیں افق کے قریب ٹمٹماتے ستاروں کو بجھتے ہوئے دیکھنے لگیں ـــ اس نے اپنے آپ کو کوسنا
وع کیا۔ اس نے صرف اپنی انفرادی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے شادی نہیں کی۔ اس نے زندگی میں ایک کا ہو کر رہنا نہیں سیکھا۔
ہمیشہ دھندلی چیزوں کے پیچھے بھاگا۔ بہتی چیزوں کی اس نے کبھی قدر نہ کی۔ ٹھکرایا۔ توڑا اور پھینک دیا ـــ اور آج وہ ان ٹوٹی
ی۔ پھینکی ہوئی اور ٹھکرائی ہوئی چیزوں کے ٹکڑوں سے بھی محروم تھا اسی گھاٹ کی طرح جس پر وہ بیٹھا تھا ـــ اس نے ان کے
ماٹ کی طرح صرف ایک ہی کشتی کو نہیں اپنایا ـــ اس نے ہر کشتی کو اپنے قریب آنے دیا اور اب اس کے نزدیک کوئی بھی
تی نہیں پھٹکتی ـــ اب وہ زندگی سے بھی بیزار ہے ـــ اور عابد نے محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک اکیلا نہ رہ سکے گا
اس کی آنکھیں خلا میں چکر کاٹتی ہوئی کچھ ڈھونڈ رہی تھیں ـــ آخر جس چیز کی کھوج تھی وہ ہاتھ آ گئی ـــ تاریکی
کے پردے پر بھی ایک تصویر آہستہ آہستہ ابھرنے لگی ـــ نجمہ۔ اس کی ایک دور کی قرابت دار ملیک اور بھولی بھالی جیسے
اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ـــ اسے اپنے تنہائی کے بوجھ کو اٹھا کر گرا دینے والی ہستی نظر آ گئی ـــ اور وہ سوچنے لگا ان
چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کو جن پر اس نے کبھی دھیان نہ دیا تھا۔ لیکن جو ایک معصوم دل کے جذبات کے عکس تھے ـــ عکس
ہمیشہ مدھم ہوتا ہے ـــ ابھی چند ماہ پہلے وہ کسی شادی کے سلسلے میں نجمہ کے ہاں گیا تھا ـــ کس لطف سے دن کٹے تھے
وہاں ـــ سو کر اٹھنے سے پہلے اسے نجمہ نظر آتی۔ اس کا منہ ہاتھ دھلاتی۔ ناشتہ کراتی اور پھر دوپہر کو کوئی اچھی سی کتاب پڑھ کر
سناتی ـــ اس کی آنکھیں زبان سے زیادہ باتیں کر سکتی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک سکون تھا جھیل کے ساکن گہرے پانی کی
طرح ـــ ان میں چنچل پن نہیں تھا ـــ وہ دھندلی چیزوں کے پیچھے بھاگنے کی حسرت سے بے نیاز تھیں ـــ وہ زمین کی طرح
ایک ہی مرکز کے گرد گھوم سکتی تھی۔ ایک ہی محور کے گرد گھومنے میں ہی تو زمین کی زندگی کا راز ہے ـــ کاش وہ بھی ایک
ہی محیط پر چکر کاٹ سکتا ـــ لیکن اس کی عمر تو بیس سال سے بھی شاید کچھ کم تھی اور وہ پھر چالیس سال کے ایک نیم بوڑھے انسان
سے اتنا لگاؤ اور پیار کیوں ـــ؟ وہ شاید عابد کی مجرد اور بے سہارا زندگی پر ترس کھاتی تھی ـــ وہ پیار شاید رحم کی کچھ
بدلی سی حالت ہو ـــ اگر رحم کے رنگ میں ہی کسی کا پیار پا لیا جائے تو کیا برا ہے! آخر وہ عورت کی ہمدردی ہے۔ جگنو
کی روشنی کی طرح کبھی کبھی کی چمک نہیں بلکہ ہیرے کی ازلی اور ابدی ضیا ـــ اور عابد کو محسوس ہوا کہ یاس کی گہری تیرگی
جو اس کی حیات کو گھیرے ہوئے ہے ہلکی ہو جائے گی ـــ

اچانک ہی چند دن پہلے کا واقعہ اس کے دماغ میں گھوم گیا۔ نجمہ نے ایک متمول نوجوان سے شادی کرنے سے انکار کر دیا
تھا ـــ کیوں؟ اس کا جواب اسے نہ سوجھ پایا۔ عابد نے یہ سن کر اس وقت اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی۔ اس نے سوچا
تھا کہ کوئی بھی کشتی نئے گھاٹ کو چھوڑ کر پرانے ٹوٹے ہوئے گھاٹ سے نہیں لگتی۔ محل کو چھوڑ کر کھنڈر سے پیار نہیں کیا جا سکتا ـــ
لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ حوادث کے ٹھکرائے ہوئے ایک پرندے کو محل میں نہیں کھنڈر میں ہی پناہ ملتی ہے ـــ ایک ٹوٹی
ہوئی کشتی کی جا نئے گھاٹ پر نہیں پرانے گھاٹ پر ہے ـــ زندگی کے کھیل میں ہارا ہوا انسان شہر کے شور و شغب سے دور
دیہات کی ہیبتناک خاموشی سے پیار کرتا ہے ـــ جسے اس وقت اس نے ایک وقتی جذبہ کہہ کر ٹال دیا تھا اب وہ اسے اپنی

زندگی کا سہارا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں رحم اور محبت کے درمیان کشمکش جاری تھی ــــ لیکن رحم اور محبت کبھی محبت سے زیادہ قربانی دیتے ہیں؛ عابد بڑبڑایا ــــ اُسے اپنے اکیلے پن سے بے حد نفرت تھی ــــ اُس نے ہر طرح سے اپنا نفسیاتی تجزیہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے متعلق دلوق سے سب کچھ کہہ سکتا تھا۔ لیکن نجمہ کے متعلق ــــ ! ہر دو سرا انسان ایک اُلجھا ہوا راز ہے۔ کسی کے متعلق کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا ــــ جسے تم نفسے سمجھتے ہو شاید جیون کے سلیقے سے تم تک پہنچنے کی ایک صورت ہو۔ جسے تم آنسو سمجھتے ہو شاید وہ شدتِ مسرت سے ڈھلکے ہوئے چند قطرے ہوں جسے تم ہمدردی خیال کرو ہو شاید وہ کسی جلے دل کی تپش ہو ــــ جسے تم احسان سمجھتے ہو کوئی دوسرا اُسے شاید اپنی ایک اشد ضرورت کا نام دیتا ہو ــــ وہ نجمہ کے متعلق کچھ بھی نہ جانتا تھا ــــ اور اب وہ بڑے سے بڑا احسان اُٹھانے کو بھی تیار تھا ــــ جیسے میٹھے چشموں کے قریب سے آنکھیں بند کر کے گذر جانے والا عابد اب ایک بوند کے لئے گڑگڑا سکتا تھا۔ کلیوں کے تازہ پھولوں سے ہمیشہ کترا کر نکل جانے والا انسان اب ایک ٹوٹتے ہوئے غنچے کو بھی مانگنے کے لئے تیار تھا ــــ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے نجمہ کا وہ چہرہ آ گیا جس پر درد اور یاس کے مدھم سے نشان تھے۔ لیکن اُس کی ساکن۔ خاموش اور بھری ہوئی آنکھیں! اُس نے چاہا کہ وہ ان ٹھنڈے جھرنوں کے قریب رک جائے ــــ "میں آپ کے بہت نزدیک ہو جانا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ کو سمجھنے کی زبردست خواہش ہے ــــ" نجمہ کے کئی مہینے پہلے کے کہے ہوئے الفاظ اُس نے دہرائے اور اُسے ہر لفظ اُس زنجیر کی ایک کڑی ہوئی جو اُس کو غائبانہ طور پر نجمہ کی طرف کھینچے لے جا رہی تھی ــــ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اگلی صبح ہی اُس شہر کو چھوڑ دے گا ــــ تاریکی کے پردے پر کچھ دیر پہلے اُبھری ہوئی تصویر بہت قریب آ گئی تھی ــــ نئے گھاٹ سے لگی کشتیوں میں سے ایک کشتی کھل کر چند لمحے دریا کی لہروں کے جال سے اُلجھی اور اچانک پرانے گھاٹ کی سیڑھیوں سے آ ٹکرائی ــــ وہ چونک پڑا۔ اُسے اپنے جسم میں ایک ہلکے سے ارتعاش کا احساس ہوا ــــ اُس نے دُور گھٹنے سے اُفق کی طرف دیکھا ــــ شکر تارے کے علاوہ آسمان میں چاند کا کچھ حصہ بھی روشن تھا ــــ

کشمیری لال ذاکر

شہابِ ثاقب

اے مرے مطرب مرے مطرب یہ نغمہ بند کر
کانپتا ہے تیری نے میں سازِ غم کا زیر و بم

پھینک دے یہ جام مے، مینا اٹھا، مینا اُٹھا
ڈگمگاتی ہیں نگاہیں، لڑکھڑاتے ہیں قدم

ایک سناٹا دیارِ روح میں پاتا ہوں میں
سر پہ ہے خاکسترِ حسرت دلِ صد چاک میں

لب پہ بجھتا سا تبسم، قہقہے کھوئے ہوئے
جھلملاتے ہیں ستارے دیدۂ نمناک میں

چاند تھراتا ہے پہلے بادلوں کے پاس ــ دیکھ
صبح کے تاروں سے لپٹی رو رہی ہے چاندنی

سن رہا ہوں اس طرح دل کے دھڑکنے کی صدا
سسکیاں خاموشیوں میں جیسے لیتا ہو کوئی

دیکھ ــــ وہ پھر آسماں سے ٹوٹ کر تارا گرا
موت کے طوفان میں ہستی کا انگارا گرا

نازش پرتاب گڑھی

بیوفا عورت

حوالدار خیراتی رام سے میری پہلی ملاقات جہاز پر ہوئی تھی۔ میں ۶۰ یوم کی مختصر رخصت کے بعد اراکان کے محاذ کی طرف لیے جا رہا تھا۔ جہاز کی رفتار اتنی سست کہ بنگال سے نکلنے میں ہی پورا دن لگا دیا تھا۔ درجہ اول میں صرف پندرہ مسافر تھے۔ جو واتے میرے سب کے سب انگریز تھے۔ اُن کی گفتگو دیگر فوجی افسروں کی طرح غیر سنجیدہ۔ فحش اور بے معنی تھی۔ اور میرے لیے کوئی دلچسپی کا سامان نہ رکھتی تھی۔ کنارے کا منظر خوبصورت تھا لیکن اس کو کب تک کوئی دیکھے۔ میں اکتا گیا تھا۔ نیچا درجہ ہندوستانی سپاہیوں سے بھرا پڑا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ان میں بنگالی مدراسی، پنجابی، گورکھے، مرہٹے وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ پنجابیوں کے مختصر گروہ نے ایک کونے میں علیحدہ ڈیرا لگا رکھا تھا۔ ایک گورے رنگ دراز قد۔ طرے دار پگڑی والے سپاہی جس نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا مرلیوں کی جوڑی بجا رہا تھا۔ پاس ہی ایک دیوہیکل سانولے رنگ والا لیس نائیک اپنے میس ٹن سے طبلے کا کام لے رہا تھا۔ ایک حوالدار بڑی سریلی مگر مردانہ آواز میں مرلیوں سے سُر ملاتے ہوئے گا رہا تھا۔

"کڑئیے نی پنجاب دی اے۔ کلیئے نی گلاب دی اے۔ اڈیئے تینوں ڈرکس گل دا۔"

کھانے کا بگل بجا۔ حوالدار اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈیک سے نیچے جانے لگا۔ میں نے آواز دی "حوالدار" اس نے رُک کر میری طرف دیکھا پھر اشارہ پاتے ہوئے درجہ اول کے ڈیک پر پہنچا۔ اور تختۂ جہاز کو پاؤں کی ضرب سے ہلاتے ہوئے سلیوٹ کیا۔ مضبوط جسم۔ پیشانی پر بل۔ بازو میں گویا سپرنگ لگا ہوا ہے۔ کون فوجی افسر ہے جو حوالدار کو اس حالت میں دیکھے اور داد نہ دے۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

خیراتی رام۔

خوب۔ جاٹ ہو۔

ہاں صاحب۔

"تم کو مل کر بہت خوشی ہوئی۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ "میں اکیلا بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ اس جگہ ہوا خوب آ رہی ہے۔" میں نے کہا کہ تم کو ہاں وطن کی باتیں کریں گے:

ہندوستانی سپاہی کے دل کو اختیار لینا تھی آسان بات ہے اس سے ہنس کر بات کرو اس کو معلوم ہو کہ تم اس سے نفرت نہیں کرتے بلکہ انس رکھتے ہو لیکن وہ تمہارا غلام ہے وقت پر جان نثار کر دے گا وہ پہروں میرے پاس بیٹھا اپنا آپ بیتی سناتا۔ کوئی راز نہ تھا جو اس نے مجھ سے مخفی رکھا ہو کوئی ایسی بات نہ تھی جو اس نے مجھ سے پوشیدہ رکھی ہو کوئی خیال ایسا نہ تھا جو اس کے دل کو دکھ دے رہا تھا جس کا اس نے اظہار نہ کیا ہو کوئی اس کا رشتہ دار عزیز نہ تھا جس کا اس نے ذکر نہ کیا ہو۔ اس کے تین اور بھائی تھے تینوں فوج میں ملازم تھے اور بال بچوں والے تھے۔ اس کی شادی کو تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ بیوی کو [illegible] اس نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ کاش اس کا کوئی بچہ ہوتا تو بیوی کا دل لگا رہتا۔

"مانگڈو" پہنچنے کے بعد بھی مجھ کو وہ ملنے کے لئے آتا رہتا تھا۔ اور یہاں تک میرے ساتھ اس کا اُنس ہو گیا کہ میری غیر حاضری میں "میرا صاحب" کے خطاب سے مجھ کو یاد کرتا۔ آخری بار میں نے اس کو اگست ۱۹۴۴ء کے "۴۱۸۵" فلیپ میں دیکھا تھا۔ جب آدھی رات کے وقت اس کی پلٹن دروگوپی میں سے گذر کر تنگ بازار کی طرف جاپانیوں کا محاصرہ توڑنے کے لئے بڑی سرعت سے بڑھ رہی تھی۔ اس معرکہ میں ہزاروں کھیت رہے۔ واپس آنے والوں میں حوالدار خیرائتی رام نہ تھا۔

دن گذرتے گئے۔ جرمنی کچلا گیا۔ جاپان نے ہتھیار ڈالدیے۔ لڑائی ختم ہو گئی۔ میں فوج سے واپس اپنی سابقہ ملازمت پر بحال ہوا لیکن حوالدار خیرائتی رام کی یاد دل میں تازہ تھی۔ جس نے ایک بار اس ہنس مکھ بانکے سپاہی کی باتیں سنی ہوں وہ کبھی اس کو بھول نہیں سکتا۔ بار بار یہ خیال آتا معلوم نہیں کیوں کہ خدا جانے اس کی دلہن اس کی غیر حاضری میں کیسے دن کاٹتی ہو گی۔

چند دن ہوئے میں اپنی کچہری میں بیٹھا فیصلہ تحریر کروانے کی نیت سے گردن جھکائے ایک مثل کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ فوجی بوٹ ٹھک سے زمین پر پڑا۔ نظر اٹھا کر جو دیکھا تو حوالدار خیرائتی رام تھا۔ میں خوشی خوشی اٹھا اور اس کو اپنے ریٹائرنگ روم میں لے آیا۔ پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا کہ سناؤ بیوی راضی خوشی ہے۔ پہلے وہ ہنسا پھر سنجیدہ صورت بنا کر بولا "عورت تھی بیوفا نکلی"۔ میں حیران تھا کہ اتنی بُری خبر سنا رہا ہے۔ لیکن چہرے سے غم و غصہ کا اظہار نہیں ہوتا کیا بات ہے؟ جاٹ سپاہی سے بیاہتا بیوی کی بیوفائی کا اس لاپرواہی سے ذکر کچھ غیر معمولی طور پر عجیب معلوم ہوا۔ میں نے کہا کہو کیا قصہ ہے۔

کہنے لگا جب گورہ پلٹن کو "تنگ بازار" میں گھیرا پڑ گیا تو ہماری پلٹن ان کی مدد کو گئی۔ جاپانی ہماری انتظار میں بیٹھے تھے ہم لڑتے مرتے گورہ فوج سے ملاپ کرنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن نقصان بہت ہوا۔ میں بُری طرح زخمی ہو کر جاپانیوں کی قید میں پڑ گیا اور گھر بار سے تو کجا دنیا سے تعلق ہی نہ رہا۔ نہ گھر سے کوئی خیریت کا خط ملا۔ نہ میں اپنے متعلق ان کو اطلاع دے سکا۔ پندرہ دن ہوئے قید سے خلاصی پائی اور پورے پونے تین سال بعد گھر پہنچا۔ کلکتہ سے خط لکھا تھا۔ لیکن خدا دیہاتی چٹھی رسانی کا بھلا کرے ابھی تک اسی کے تھیلے میں پڑا ہے۔ غرضیکہ میرے قید سے چھوٹنے اور آمد کی کسی کو اطلاع نہ تھی۔ دروازے کے کواڑ بند تھے مگر زنجیر نہ لگی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کواڑ کھول کر اندر دیکھا تو صحن میں چار پائی پر ایک نووارد اجنبی کو لیٹے ہوئے پایا۔ میری بیاہتا اس کی پائینتی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی اور تالیاں بجا بجا کر گا رہی تھی۔ اس کی چوڑیوں سے سریلی جھنکار نکل رہی تھی۔ غضب کی بات یہ ہے کہ یہ چوڑیاں وہ تھیں جو میں نے اپنی محبت کے اظہار میں کلکتہ سے بذریعہ پارسل روانہ کی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں آپ کے ہمراہ رخصت سے واپس گیا تھا آپ کو شاید یاد ہو گا۔ میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ کہ پورے دس روپے میں نے چوڑیوں پر خرچ کئے ہیں۔ میری بیوی کی دروازے کی طرف پیٹھ تھی اور وہ اجنبی کو خوش کرنے میں اتنی مشغول تھی کہ میری موجودگی کی اس کو خبر ہی نہ ہوئی۔ گانا بند کیا تو اجنبی کو گدگدی کرنے لگ پڑی جس پر وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ غرضیکہ عورت ہزاروں چونچلے کر رہی تھی کبھی ہاتھوں کو بوسے دیتی کبھی پاؤں کو چومتی کبھی اُس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتی۔ کبھی اُس کی ناک سے ناک لگا کر میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ میرے دل میں کئی قسم کے خیال آ رہے تھے۔ اور سوچ رہا تھا کہ یہ میرے من مندر کی مورتی ہے۔ جس کی یاد کی بدولت میں جاپانیوں کی قید میں زندہ رہا۔ جس کی وفا پر مجھ کو پورا اعتبار تھا اور جو سیتا رانی کی سوگند اٹھا کر کہا کرتی تھی کہ پیتم اگر تم لام سے واپس نہ آئے تو میں ستی ہو کر جان ہار دوں گی۔ اور حال یہ ہے کہ اجنبی کے پریم میں غرق ہے اور اس جگ کی خبر ہی نہیں۔ اس کی بلا سے میں زندہ ہوں یا مر چکا ہوں۔ من کو خوب سمجھایا کہ استری ذات پر اعتبار کرنا مورکھ پن تھا۔ مجھ کو وہ زمانہ یاد آیا جب پہلی بار اُس کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ چودہ برس کی سولہ سال کی ہوگی۔ اس

بیٹھ کر اس کی خوبصورت گچھے دار مونچھوں سے کھیل رہی تھی کبھی اس کے گلے میں بازو ڈال کر پریم کی باتیں کرتی اور کبھی خود ہی روٹھ جاتی تھی وقت گذرتا گیا اور میں موقع کی تاک میں رہا۔ آخر ایک دن آیا کہ وہ سورج مل جیسے باوقار اور دھنی چوہدری کے گھر کو تیاگ کر میرے گھر اُٹھ آئی میرے سیاہ خانے میں پریم کا دیپک جگ مگ کرنے لگا۔ لیکن سورج مل کا گھر بے رونق ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا کہ چوہدری سورج مل کی محبت کو وہ فراموش کر چکی ہے اور میرے عشق میں جل رہی ہے۔ اب جب میں نے اس کو اجنبی کی محبت میں گرفتار پایا تو دل کو سمجھایا کہ جس نے سورج مل جیسے دھرماتما اور دھنی انسان سے وفا نہ کی اس سے وفا کی امید کرنی فضول تھی۔ یہ فیلسوفی خیالات چند منٹوں کے لئے میرے دل پر قابو پا سکے میں اس قوم میں سے ہوں جو جذبات کو دبانے کی عادی نہیں ہے۔ بے اختیار ان دونوں کی طرف لپکا۔ بیوی نے ہٹ کر میری طرف دیکھا۔ ایک بے معنی چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ میرے پاؤں کی طرف جھکی۔ میں اجنبی کی طرف بڑھا اس نے بچنے کی کوشش کی لیکن صاحب ان ہاتھوں کو بارہا آزمایا جا چکا ہے یہ پنجے فولادی ہیں۔ میں نے اس کو پکڑا اور سیدھے اوپر کی طرف گیند کی مانند اچھال دیا۔ پھر اس خوف سے کہ مبادا گر کر مر نہ جائے اور قتل عمد کا الزام لگے۔ بیچ ہی میں پکڑ لیا اور کہا او۔ ڈاکو تو میری غیر حاضری میں میرے گھر میں گھس آیا اور میری بیوی کی محبت کو چھین لیا بتا تیری کیا سزا ہے؟ جواب میں اس نے معصومانہ انداز سے ہنس دیا۔ میری بیوی نے کہا پریم سندر پتا کو جواب کیوں نہیں دیتے۔ پھر کہنے لگی آج کا دن کتنا مبارک اور مسعود ہے ہمارے لال کی آج دوسری سالگرہ ہے۔ اس کے پتا کو ایشور خیریت سے واپس لایا میرے پتا بھی آ رہے ہوں گے۔ ابھی اس نے بات ختم کرنے پائی تھی کہ چوہدری سورج مل آ کر میرے گلے سے لپٹ گئے۔ ہم تینوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

(مرکزی خیال ماخوذ ہے)

عزیز احمد

راہی

دل کی آواز نہ سن — اُلجھنیں، دھڑکنیں ہیں تیز خرام — تیز کر اپنے قدم

دیکھ دیکھ تری راہیں ہیں — کہ عزائم ہیں جواں — موڑنا ہے رُخِ ہستی تجھ کو

جو امیدیں ہیں وہی آہیں ہیں — ہے لگا ہول میں تری — کھینچتی رہ گئی پستی تجھ کو

فکر کے جال نہ بُن — عکس دھندلا سا نئی دنیا کا — کُھل گیا غم کا بھرم

پاؤں آگے ہی بڑھا — ظلم کا نام بھی مٹ جائے گا — نغمۂ ساز نہ سن

ٹھوکروں میں ہے تری جام و سبو — عشرت و کیف و خوشی — دیکھتی، وہیں اُڑی جاتی ہیں

مڑ کے پیچھے کی طرف دیکھ نہ تو — دیکھ سکتا ہے تو دیکھ — یہ کہیں چھپ بھی کیا پاتی ہیں

تو کہاں سے تھا چلا — پیٹھ سمٹے ہوئے آنکھیں نہ موند — دل کی آواز نہ سن

تری منزل ہے کہاں — تو تھا، شدتِ غم سے مجبور

منزلیں تیری آتی ہیں دام — یہ نہیں بھاگ کے دیکھ

ضیا فتح آبادی

آدم

وہ سب ایک ریڈنگ پلاٹی میں تھے اور ابھی ابھی ایک ریڈ سے تھکے ہارے واپس آئے تھے اور اب بیٹھے ایک دوسرے کو اپنے آپ بیتی سُنا رہے تھے۔ ان آپ بیتیوں میں ان ساتھیوں کا ذکر بھی آجاتا۔ جو ریڈ سے واپس نہ آسکے تھے۔ جو کبھی واپس نہ ہو سکتے تھے۔ اسوقت بھی ایک ایسے ہی آدمی کا ذکر ہو رہا تھا۔ جو بہت بہادری سے لڑا تھا اور میدان جنگ نے اسے اپنے پاس ہی رکھنے میں عزت محسوس کی تھی جسنے کپتان کا حکم پورا کرنے کیلئے اپنی جان لڑا دی تھی۔

کپتان کا نام سنتے ہی رحمو بےطرح ہنسنے لگا۔ انہیں رحمو کی یہ مداخلت بہت ناگوار گزری۔

"حماقت، لوگ بھی کیسی کیسی حماقتیں کرتے ہیں۔ یہی ہمارے کپتان ہیں نا۔ وہ اس لئے یہاں آئے ہیں کہ ان کے خاندان کی پرانی روایات قائم رہیں۔ کیسی نامعقول وجہ ہے جبھی تو۔"

یہ بے سر و پا باتیں اور پھر یہ پاگلوں کی سی ہنسی، بے موقعہ، بے محل، یہ گویا انکی بہادری کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ اور یہ سپاہی کی برداشت سے باہر ہے۔

"اِبے تو کونسی معقول وجہ سے آیا تھا"۔ رجو نے غصے میں کہا۔

"معقول۔ گھر میں روٹی ختم ہوگئی تھی، سوچا بھوکوں کیوں مریں، کھا پی کے مریں گے۔ زندگی سے بھرپور ہوکر، فاقوں سے گھل گھل کے کیوں مریں چوہوں کیطرح!"

"چپ رہ، بڑا آیا شیر ببر کہیں کا؟"

"اور نہیں تو ——— دیکھا تھا نا، کیا پچھاڑا تھا بڑوں بڑوں کو، چوکی پہ دھاوے میں سب سے آگے کون تھا اور وہ دمدمہ کس نے خاموش کیا تھا، کس ماں کے لال نے موت سے آنکھیں ملائیں؟"

"جیسے کپتان نے حکم دیا ہوگا۔"

"ہو ہو" وہ پھر ہنسنے لگا۔" وہ تو بھاگنے کا خیال کر رہا تھا۔" اور پھر چھاتی ٹھونکتے ہوئے جوش میں کہا۔" ارے ہم تھے ہم ——— ہمارا کیا ہے، کونسا بال بچہ ہے، مرگئے تو کیا کوئی رونے والا نہیں اور جیتے رہے تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

اور سب خاموش ہوگئے، شاید سب سوچ رہے تھے۔ کہ وہ وہاں کیوں آئے تھے۔

کپتان نے ہیڈ کوارٹرز سے آمدہ احکام کی روشنی میں ان کو ہدایات دیں، اور وہ یونہی چپکے سے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے انہیں گھر سے آئے دو سال ہو چکے تھے اور ان دو سال کے عرصے میں ان کے درمیان کافی تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔ وہ سب ساتھیوں کیطرح، بھائیوں کیطرح ایک دوسرے کے دکھ میں شریک ہوتے۔ اب وہ ایک دوسرے کے رازوں سے بخوبی واقف تھے ——— رجو اور رحمو بھی جب وہ بھرتی ہوئے۔ تو ایک دوسرے کیلئے اجنبی تھے۔ لیکن جب وہ عجیب عجیب جگہوں پہ گئے تو انہوں نے بیگانا جگہوں میں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کیا۔ اور جیسے ڈوبتا آدمی ہر تنکے کیطرف سہارے کیلئے لپکتا ہے۔ یونہی پردیس میں انسان ہر جانی پہچا

اپنے سفر کے دوران ہی میں وہ ایک دوسرے کے کافی نزدیک آچکے تھے۔ جہاز میں بٹھا کر
یطرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے ———
ماذ کیطرف لے جایا جارہا تھا۔ جہاں انہیں آگ اگلتی توپوں سے کھیلنا تھا۔ وہ سمندر کی وسعتوں کو دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ کتنے ہی دن
ں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ انہیں یوں معلوم دیتا تھا۔ کہ یہ پانی کبھی ختم نہ ہوگا۔ ساری دنیا پانی میں ڈوب چکی تھی۔ وہ پانچ شخص
زندہ رہ سکے تھے، وہی ایک جہاز تھا جو ابھی ان لہروں سے لڑ رہا تھا۔ اسے بھی لہریں اپنی آغوش میں لینے کیلئے مضطرب نظر آتی تھیں،
کچھ ناراض نظر آتا تھا۔ رجّو اور رحمو اسکا نظارہ کر رہے تھے۔

"سمندر غضبناک ہو رہا ہے، اب کیا ہوگا۔" رجّو نے کہا۔

"زیادہ سے زیادہ یہی کہ جہاز ڈوب جائیگا۔" رحمو نے بے نیازی سے کہدیا۔

"ایسا نہ کہو رحمو ——— میری بیوی، میرا ننھا۔"

"دنیا میں ہر جگہ یہی ہے۔ ہر شخص مشکلوں، مصیبتوں اور ایسے ہی حوادث کے بھنور میں ہے۔ وہ عمر بھر ان سے لڑتا ہے۔ جب ایک
لہریں منڈلاتی ہیں۔ اور اس کے سر سے گذر جاتی ہیں۔ یہ جہاز ڈوب جائیگا۔ تو یہ روزمرہ کی بات ہوگی، کوئی نیا حادثہ نہ ہوگا۔"

"رحمو، میری بسنتی اور میرا سروش انہی لہروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے چاروں طرف سے لہریں انہیں ڈبونے کو بیقرار ہیں۔ میں ہی
جہاز ہوں۔ جن سے انکی امیدیں وابستہ ہیں، اگر یہ ڈوب گیا ———"

انکی دوستی روز بروز بڑھتی گئی اور اب وہ گہرے دوست تھے۔ ایک دوسرے کے ہر راز سے واقف!
ساتھیوں کی موت نے رجّو کے دل پہ بہت اثر کیا تھا۔ رحمو نے گھربار، بیوی بچوں کا ذکر کیا تو اُسے بھی پرانی یادوں نے گھیر لیا۔ وہ
نے گھر کو خیالوں میں بسا رہا تھا۔ گرم ریت اور طوفانوں والے صحرا میں بھی ہرے بھرے کھیتوں، لہلہاتے پودوں اور زمین پہ مسرت بچھانے
ے کوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر ہنستے ہوئے چہرے اس کے خیالوں پہ چھا گئے۔

ارے سچ مچ مجھے بسنتی یاد آنے لگی۔ میں نے تو یونہی بال بچوں کا ذکر کر دیا تھا اور پھر اور بھی تو ہیں یہاں بیوی بچوں والے۔

"لیکن بسنتی اور سروش تو کسی کے پاس نہیں۔" اس نے واماندہ سے لہجے میں کہا۔

اُسکا خیال پانچ سال پیچھے کیطرف لوٹ گیا۔ اُسے وہ دن یاد آیا۔ جب وہ بسنتی سے پہلے پہل ملا تھا۔ کھیت میں کام کر رہا تھا۔ کہ
پودوں کی سرسراہٹ نے اُسے بتایا کہ کسی کی بکریاں اُس کے کھیت میں گھس آئی تھیں۔ وہ گالی ہی دینے کو تھا۔ کہ بسنتی اُس کے سامنے آگئی۔
اُسکا چہرہ شرم سے کھل سا رہا تھا۔ اس کے سانولے چہرے سے خون جھلک رہا تھا۔ وہ ایک منٹ کیلئے سب کچھ بھول گیا اور اُس کی طرف
دیکھتا رہا۔

"اگر اس لڑکی کا رنگ ذرا سفید ہوتا تو اُس کے گال کشمیری سیب کیطرح دہکتے!" اُس نے سوچا۔ "مگر اب بھی اُس کے چہرے پہ
کھیلنے والی شرارت اور مدھ بھری آنکھوں کے ہوتے ہوئے وہ کسی سے کم نہ تھی ———"

"بکریاں پیاسی تھیں، یونہی ادھر چلی آئیں معاف کرنا۔"

رجّو خاموش رہا۔ اس نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا، صرف اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ بسنتی نے اس کی خواہشات کی حدت کو محسوس کیا۔
اسکا چہرہ سُرخ ہوتا گیا۔ اس کی آنکھیں محجوب ہوتی گئیں۔

رجّو کی آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں۔ "اچھا ہی ہوا تم چلی آئیں۔"
بسنتی نے بکریوں کو اکٹھا کیا اور کھیت سے باہر ہانکنے لگی، رجّو نے ایک بچے کو گود میں اٹھایا اور اُس کے ساتھ ہو لیا۔ بسنتی نے پھر مڑکر

کے انداز میں کہا :-

"جانور تھے ، غلطی ہو گئی ۔"

رحو بچے کو پیار کرتے ہوئے بولا ۔ "میں تو انسان کو چھوڑنے جا رہا ہوں ، کھیت سے باہر کہیں پھر نہ آ جائے ، انسان تو سمجھ جاتے ہیں ———"

وہ خاموش رہی ———

بچے کو ویسے ہی تھامے اُس نے کہا ۔ "کیسا پیارا ہے یہ ۔ کیا نام ہے ؟"

"کچھ بھی نہیں ——— جانوروں کے بھی نام ہوتے ہیں کہیں ؟"

"اچھا چلو نہ سہی" ۔ اس نے بچہ اُسے تھماتے ہوئے کہا ۔ "انسانوں کے تو ہوتے ہیں ۔ اب بتاؤ کیا نام ہے ———"

"بسنتی !"

"میرا نام راجیشور ہے ——— راجو"

وہ بے ارادہ سوچ رہا تھا ۔ اس طوفان میں بہہ رہا تھا ۔ یوں معلوم دیتا تھا ۔ جیسے یہ سب اسپہ پھر بیت رہا تھا ۔ وہ خود ہی مسکرا دیتا اور کبھی خود ہی اُداس ہو جاتا ، رحو پاس بیٹھا اس کے چہرے کے یہ اُتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا ———

"اور رحو ——— راجو ، راجکمار صاحب خواب دیکھ رہے ہیں شاید ، ایسی ہی بات ہے تو چلو خط لکھدو ، مجھ سے لکھوا لو ، تمہاری قسم وہی لکھوں گا جو کہوگے ۔ پڑھوائے گی کہیں نہ کہیں سے اپنے پریتم کا خط ———"

"تم لکھو خط اسے جسے حاصل کرنے کیلئے تم یہاں چلے آئے ۔ موت کے منہ میں ۔"

"اتنا غصہ ، ارے وہ تو گپ تھی ، جی بہلا لیتے ہیں یونہی ، یہی ذکر تو نخلستان ہیں ، صحرا کی زندگی میں ، تم نخلستان میں بیٹھے صحرا کیطرح خشک ہو ۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بھی صحرا کا ہی حصہ ہے ۔ مگر اس کی وسعت سے بہت مختلف ، تم اس کو وسعت میں کیوں سمو رہے ہو ۔"

"کیا بڑی بڑی باتیں شروع کر دیں ، ہماری تو سمجھ سے باہر ہیں ، کہاں سے سیکھیں کہاں پڑھے تھے ———"

ان کے سب ساتھی بھی گروہوں میں تقسیم بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے ، قہقہے اور ہنسی تھی ——— سب کچھ وقت کے لئے اپنے ارد گرد کی حقیقتوں کو بھول چکے تھے یا بھولنے کی کوشش کر رہے تھے ———

گل زمان اور اس کے دوسرے جو گجراتی اور جہلمی بیٹے تڑنگے جوان سر سے پگڑیاں اتارے اور کٹ اپنے پاس رکھے اپنی بندوقیں صاف کر رہے تھے ، گل زمان اپنی سنگین پہ جمے ہوئے خون کو صاف کر رہا تھا ۔ کچھ دوسرے پنجابی اُن سے پرے بیٹھے تھے ۔ انہیں سے کوئی شخص گا رہا تھا ۔ اپنے دیس کے گیت اور اُسے داد دے رہے تھے ۔

گل زمان ویسے ہی سنگین کو چمکاتے ہوئے کہا ۔ "اور رحو کیا گہری باتیں ہو رہی ہیں ، پرائیویٹ ہیں جو یوں علیحدہ چلے گئے ہو ———"

"نہیں بھئی یہاں کیا پرائیویٹ باتیں ہونگی ، تم کس بات سے واقف نہیں ۔"

اور گل زمان یونہی ننگے سر اور ننگے پاؤں اپنی بندوق لئے ان کے پاس آ بیٹھا ۔

"ہاں بھئی اب کہو ——— کیا مسئلہ ہے ———"

"کچھ خاص نہیں ، اپنی باتیں ہیں ، گھر کی ، دیس کی ، اس نے کچھ بڑی بڑی کتابوں والی باتیں شروع کر دی تھیں ۔ میں نے کہا ، ہم تو زمین پہ بسنے والے آدمی ہیں ، سیدھی سادی باتیں سمجھتے ہیں ———"

"اس کا بھی قصور نہیں —— " گل نے مسکراتے ہوئے کہا۔" یہ بے بھی تو کوتا جو جنس کے پر لگا بیٹھا تھا۔ دیہاتیوں کو یہ اسکولوں کی بیاں جب گاؤں میں آیا تو بری ہوئی —— جھوٹ نہیں، خود اس سے پوچھ لو —— "

" پیچ، دسویں میں تین سال فیل ہونے کے بعد کھیت کیطرف لوٹا تو جیسے کسی اور سکول کی پہلی جماعت میں پھر سے داخل ہوگیا۔ زمین کا اور ساتھ ایسا ہی تھا، جیسا دو شخص اکٹھے ہو جائیں جو ایک دوسرے کی زبان نہ جانیں —— زمین نے مجھے دھتکار دیا۔ مجھے پناہ نہ دی۔ مجھے یہاں پھینک دیا —— "

" اور یہاں سے اگر کسی نے اٹھا کے پھینک دیا " گل زماں نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

" کس مائی کے لال ہمت ہے۔ " رحمو نے چھاتی پھلاتے ہوئے۔ جواب دیا۔

زماں نے بندوق کی نالی میں ایک آنکھ بند کرکے دوسری آنکھ سے دیکھتے ہوئے کہا —— " یہ جسے میں صاف کر رہا ہوں۔ بہت سول صفایا کرنیکی ہمت رکھتی ہے اور اسکا دوسری طرف بھی کوئی کال نہیں "۔

" پھر کیا، جھگڑا ختم، واپس جاکے بھی کیا کریں گے۔ ہمارا کیے وہاں انتظار ہے " رحمو نے انتہائی بے پرواہی سے کہہ دیا۔

شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ فضا میں ہوائی جہازوں کی گونج جو کچھ عرصہ پہلے چھائی ہوئی تھی اب نہیں تھی۔ ان کے ہوائی جہاز دشمن کیطرف اڑان کیلئے گئے تھے۔ یہ ان کیلئے روزمرہ کی بات تھی، انہوں نے اسکا کوئی خیال بھی نہ کیا اور باتوں میں مصروف رہے۔

—— دور کہیں افق کے پاس دفعتہً کئی روشن لکیریں آسمان پہ پھیل گئیں، انہوں نے فضا میں اپنا ہی ایک روشن سا جال ن دیا۔ کئی شیطانی آنکھیں جگمگا اٹھیں ——

پنجابی جوان گا رہا تھا —— " نہ مینوں اڈیک کڑیے، ساڈوں کم ہزاراں نیں "

اُدھر لڑکی کی طرف سے —— " او رب تینوں سنے خیر اں، کی تیرے باجھ ساڈیں بہاریں نیں "۔

" اڈیک —— انتظار " رحمو پھر سوچ میں پڑ گیا —— " رحمو کا کسی کو انتظار نہیں۔ وہ آرام سے جی رہا ہے۔ اور چین سے مر سکیگا —— لیکن بسنتی اور سرتش اسکی راہ تک رہے ہونگے۔ وہ کھیت سے واپسی کے وقت بھی اسکا انتظار کرتے تھے "۔

" شیر، یہ کم بخت جب دیکھو گاتا ہی رہتا ہے " گل زماں نے کہا۔

" اچھا بھئی۔ میں چلا اپنے ساتھیوں میں، میرا انتظار ہو رہا ہے —— "

" کاش میرے لئے بھی کوئی یہ کہتا کہ خدا تجھے سلامتی سے لوٹا لائے۔ " رحمو نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ اسمیں کہیں کہیں شرارت کا شک بھی ہوتا تھا۔

" لیکن بھائی، یہاں دعائیں کیا کریں گی، ہم تو محض تنکے ہیں، جو جنگ کے اس بھنور میں پھنس گئے ہیں۔ کوئی توپ، کوئی گولہ، کوئی ہوائی جہاز کسی بھی وقت ہماری زندگی کو موت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ آندھیاں کسی بھی وقت ہماری زندگی کی شمع کو گل کر سکتی ہیں۔ دعاؤں کا نحیف دامن اس کی کب تک حفاظت کر سکتا ہے "۔

" حفاظت تو کوئی بھی کسی کی نہیں کر سکتا۔ فوجوں کی حفاظت میں جو جہاز جاتے ہیں۔ وہ بھی بیکار ہی ہوتے ہیں۔ جو گولی لگنی ہوتی ہے لگ کے ہی رہتی ہے —— خدا پہ بھروسہ رکھو —— اسی کی حفاظت مانگو —— "

" میں انہیں اسی کی حفاظت میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی میرا دل کچھ سوچ کے ڈول سا جاتا ہے —— "

" کیا بات ہے وہ ایسی —— "

"بلدیو ابھی وہیں ہے۔ چودھری کا لڑکا جو ہوا، ہمارے ہوتے ہی اُس نے گاؤں میں طوفان اُٹھا رکھا تھا۔ اب تو اُس کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے ہونگے۔ کبھی وہ بھی بسنتی پہ نظر رکھتا تھا۔ مگر بسنتی اس کمینہ کی باتوں میں نہ آئی ——— وہ ابھی وہیں ہے، میں یہاں بسنتی سے اتنی دور۔ بسنتی جواب بس بسنتی ہو کے رہ گئی ہے سُوکھے پتوں کیطرح زرد۔

"ہماری چھٹی کھل رہی ہے، کچھ دنوں تک، سالے کا پیٹ پھاڑ دونگا۔ اگر کوئی مرچ مرچ گیا، یہ کام تو اب آ ہی گیا ہے خوب سے ہے نا؟ ابھی چار کو ختم کر کے آیا ہوں، ابھی سنگین پہ لہو باقی ہے ———"

رحمتو کے دماغ میں آخری فقرہ پھنس کے رہ گیا۔ "چار ——— لہو ——— چُپ رہو رحمتو، یہ داستان، مجھے اسمیں کوئی فخر محسوس نہیں ہوتا۔ میں تو کبھی بکری کے بچے کو بھی تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے تو ہرے پودے اُکھاڑتے ہوئے دکھ محسوس ہوتا تھا۔ اب یہ انسانی خون! رحمتو ہم انسان نہیں رہے، ہم کچھ اور ہو گئے ہیں، جانور بھی نہیں۔ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ مجھے اپنے لئے کوئی لفظ نہیں سوجھتا۔ اب ہمیں بھی کسی کو ختم کر دینا چاہیئے۔ ہم انسانیت پہ اپنا حق کھو بیٹھے ہیں۔"

"تو پھر تم یہاں چلے کیوں آئے، ایسے انسان کے بچے"۔

"بسنتی کی زندگی میں ایک خوشگوار بسنت لانے کیلئے ———"

"اس کے منہ پہ تو اب بھی بسنت کھل رہا ہے۔ خود ہی تو کہہ رہے تھے۔ جیسے سرسوں پھول رہی ہو ———"

"ہے بھی تو آخر بسنتی، وہ زرد ہی رہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کے چہرے کی مُردنی تو دُور ہو جائے، اس کے سانولے گالوں کے پیچھے سے کسی شرارتی بچے کی طرح جھانکتا ہوا خون واپس نہیں آ سکتا تو اس کی ایک جھلک ہی آ جائے۔ پرانی تازگی نہ آ سکے۔ اُسکا عکس تو رہے، زرد سہی، تازہ گیندے کے پھول کی مانند تو ہو۔"

اس کے خیالات اُلجھ گئے۔ وہ کچھ دیر کیلئے چپ ہو گیا ——— اُفق پہ شیطان کی آنکھیں اپنی بھینٹ لے چکی تھیں، جہازوں کی گونج بتا رہی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ اُنکی طرف واپس آ رہے تھے۔

"رحمتو تم نے پوچھا تھا۔ میں یہاں کیوں آیا؟ ——— آؤ تمہیں بتاؤں۔"

"اور ابھی تک کیا سنا رہے تھے۔ تم بھی نرے بدھو ہو ———"

"وہ بھی اسی کا ایک حصہ تھا ———"

"کہیے بھی آخر کچھ، عجیب آدمی ہو ———"

"دیہات کی زندگی ایک سورگ تھا جسطرح پہلا آدمی سورگ سے نکال کر نرک میں ڈال دیا گیا تھا۔ اُسی طرح اب بھی آدمی سورگ سے نرک میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ جنگ شروع ہوئی تو ایک جگہ نہیں سب جگہ یہ کرے۔ ہماری جنت پر بھی، ہماری دیہاتی زندگی تباہ ہو گئی روز کام ختم کرنے سے پہلے ہی مسکراتی ہوئی بیوی اور ہنستے ہوئے بچوں والے گھر کی بجائے غضبیلی نظروں سے بھرے ہوئے جلسوں میں پڑتا۔ کیونکہ یہ نمبردار کا حکم تھا ———"

رحمتو نے دیکھا اس کے دوست کا چہرہ اُتر چکا تھا۔ غم اس سے صاف ظاہر تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ ان آنسوؤں کے اُس شفاف دَرپن سے کچھ اور دیکھ رہا تھا۔ وہ واپس اپنے گاؤں میں تھا، اپنی جنت میں ———

کھیت میں پانی دے رہا تھا کہ نمبردار نے اُسے جلسے کیلئے کہا۔

"آج مجھے پانی دینا ہے نمبردار جی ———"

"چاہے کچھ بھی ہو تمہیں جانا ہوگا سنا ——؟"

"میرا کھیت خراب ہو جائیگا ——"

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا کھیت —— باتیں نہ بناؤ، لاٹ صاحب کہیں کے۔"

آنسو پونچھتے ہوئے اُس نے کہا۔ "رحمو تم نے اس دن مجھے جنت کی کہانی سنائی تھی لیکن یہ تو بتایا ہی نہیں۔ وہاں پہلا آدمی کون تھا جس نے پہلے آدمی کو جنت سے نکل جانے کا حکم دیا —— !

ہم کس نے گرایا، ذمہ دار کون تھا جس نے پہلے آدمی کو جنت سے نکل جانے کا حکم دیا، سختیوں اور مصیبتوں کے طوفان آئے اور ہم نہیں ہمیں بہر نکلے۔ سوکھے ہوئے پتے ہر جلسے میں ہمیں بھرتی ہونے کو کہا جاتا، سختیوں اور مصیبتوں کے طوفان آئے اور ہم نہیں ہمیں بہر نکلے

اور تنکے آخر طوفانوں کا کیسے مقابلہ کر سکتے ——"

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے راج"۔ رحمو نے پہلی بار تشویش کے لہجے میں کہا۔

Desperate راجو کے دل میں آج کسی باغی نے جنم لے لیا تھا، اپنوں کی محبت نے اُسے نڈر اور بیباک

کر دیا تھا۔

"راجو آج سب راجوں کے خلاف ہے۔ دنیا میں کیوں لوگ اپنا اپنا راج قائم کر لیتے ہیں۔ کیوں لوگ اپنا تخت بنا کے کچھ لوگ اوپر بن بیٹھتے ہیں اور پھر اپنا راج قائم رکھنے اور اس کو بڑھانے کیلئے اپنی پرجا کا خون بہاتے ہیں، درندے، انسانی

خون پیتے ہیں،

اسی کپتان کے باپ نے ہمیں بھرتی پہ اکسایا، باتیں بنا بنا کے، اُس نے کہا، دیکھو میں نے اپنا بیٹا بھی بھیجا ہے۔ خون بہانے ہی سے واقعات کا رُخ پلٹا جا سکتا ہے۔ نئی زندگی پیدا کی جا سکتی ہے —— " اور مجھے بستی کی زندگی میں بستلا تھا، مجھے تیسے سرکش کیلئے نئی زندگی پیدا کرنی تھی۔

"کپتان —— بزدل —— تبھی یہ بزدل یہاں آ گیا، سالے باپ نے زبردستی بھیجا ہے۔ اپنی ساکھ قائم رکھنے

اور نام بلند کرنے کو ——"

اور بڑی دیر تک وہ کپتان کے متعلق، اپنے متعلق اور دوسرے ساتھیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

اس فرنٹ پہ جنگ کی حالت دن بدن بہتر سے بہتر ہو رہی تھی، جانے کیا وجہ تھی۔ شاید اپنی زندگی سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کا جذبۂ خودکشی تھا جو اس سب کا ذمہ دار تھا۔ دشمن پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ دیر تک بڑھا ہوا دشمن ہر روز پسپا ہو رہا تھا اور مخالف فوجیں اُسکا پیچھا کرتی ہوئی اس کی پسپائی بھی مشکل بنا رہی تھیں، انہی میں ہندوستانی فوجیں بھی تھیں۔ راجو اور رحمو اسی فوج کے اگلے

دستوں میں سے تھے۔

دنیا میں ہر طرف انکی بہادری کے چرچے تھے۔ اسی لئے کچھ دنوں تک انہیں چھٹی ملنے والی تھی۔ ان کے کام سے خوش ہو کے ہندوستانی دستے بہت تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ بندوقیں بیکار ہو گئیں، ہتھ گولے اور پھر سنگینیں چلنے لگیں۔ دو آمنے سامنے آتے اور آن کی آن میں اُن میں سے ایک یا کبھی کبھی دونوں زمین پہ آ رہتے۔ سُرخ گرم خون ریت میں آہستہ آہستہ جذب ہوتا رہتا۔ ان کے چہرے زرد ہوتے جاتے۔ اُن کی آنکھوں کی روشنی ختم ہو جاتی اور آخر یہ شمعیں بجھ جاتیں۔ اور سپاہی کا وقتیں ہو کر رہ جاتے —— پیاسی ریت یہ خون سرمایہ داروں کی طرح نہایت اطمینان سے چوستی اور انسان سپاہی ہو کر بے پرواہی یہ خون بہائے جاتے۔ بغیر کسی سوچ کے سنگینیں چل جاتیں۔ فضا میں ایک چمک پیدا ہوتی۔ اور تھوڑی بعد سنگین کا چمکتا ہوا پھل سُرخ سُرخ

دیتا اور ایک کراہ کیساتھ ایک سپاہی زمین پہ گر جاتا۔

رحمو اپنا کام بڑی تندہی سے کر رہا تھا۔ وہ دشمن کیلئے ایک پیام موت بن گیا تھا ——— رجّو اس سے سست تھا۔ کبھی کبھی وہ رُک جاتا جیسے وہ کسی سوچ میں ہو۔ اور واقعی آج وہاں بھی اُسکا دماغ خاموش نہیں تھا۔

"یہ سُرخ سُرخ خون زمین میں کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ بسنتی کے چہرے سے جھانکتا ہوا خون کہاں غائب ہو گیا۔ نہ معلوم کس نے چوس لیا۔ بسنتی کا دمکتا ہوا چہرہ ان لاشوں کیطرح زرد کیوں ہوتا جا رہا ہے ——— یہ خون کیسے واپس ہو سکتا ہے کسطرح اُسے بچایا جا سکتا ہے۔" لیکن یہ صرف ایک لمحے کیلئے، ارد گرد کی سنگین حقیقت اسے جلدی اس خواب سے چونکا دیتی،

وہ چونک اُٹھا۔ اُس کے سامنے سنگین تانے ایک دشمن کھڑا تھا، سانولے سے رنگ کا، خوبصورت سا جوان شخص، اس نے اپنی آنکھیں ایک منٹ کیلئے بھی اوپر نہ اُٹھائیں اور بغیر دیکھے سنگین چلا دی، رجّو کراہتا ہوا زمین پہ آ رہا۔ رحمو کی سنگین نے دشمن کو بھی زمین پہ لیٹنے پہ مجبور کر دیا ——— دشمن کی فوج پچھلی چوکیوں کیطرف ہٹ گئی۔ ہندوستانی فوج نے نئے مورچے سنبھال لئے۔

رحمو رجّو کے پاس بیٹھا تھا ——— رحمو تم رُک کیوں گئے تھے۔"

"رحمو میری آنکھیں کھلی تھیں۔ تم نے اُسے دیکھا نہیں، سانولا سا خوبصورت آنکھوں والا نوجوان سا شخص جس کے چہرے سے خون جھلک رہا تھا۔ اجنبی، رحمو میں یہاں اجنبیوں کا خون بہانے تو نہیں آیا۔ میں تو گیا ہوا خون واپس لینے آیا تھا۔

رحمو تم نے کیا کر دیا، اس کی طرف دیکھو، اس کے رُخسار زرد ہوتے جا رہے ہیں۔ اسکا سانس اُکھڑ رہا ہے۔ زمین اُسکا خون چوس رہی ہے۔ جنت سے نکلنے کے بعد آدم کے ایک بیٹے نے دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ رحمو وہ تمہارا بھائی ہے ———"

اور رحمو نے دوسرے انسان کیطرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔ اس کے چہرے پر بل تھے۔ اسکا ایک ہاتھ لڑکھڑاتا ہوا جیب کیطرف جا رہا تھا۔ وہ اپنی رہی سہی طاقت جمع کر رہا تھا۔ وہ اپنی قوت ارادی پہ زور دے رہا تھا ——— شاید اسے کوئی آخری کام کرنا تھا۔ رحمو نے اپنی سنگین کیطرف دیکھا ——— دشمن نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ آنکھوں کی بجھتی ہوئی شمعوں سے اُسے دیکھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لبوں تک لے گیا اور ایک طویل بوسہ دیا۔

بجھتی ہوئی شمعیں بجھ گئیں، کانپتے ہوئے ہاتھ ساکن ہو گئے۔ اور وہ بے حرکت ہو گیا۔

رحمو نے رجّو کیطرف نظر کی۔ وہ بھی دم توڑ رہا تھا۔

"رحمو بسنتی سے کہنا...... اُس کی...... زندگی میں بسنت آئیگا۔ ساری دنیا کو اسی کی خواہش ہے۔ یہ زمین بھی زرد تھی میں نے اپنا خون اسے دیدیا۔ اُس زمین کو بھی خون کی ضرورت ہے۔ بسنت ضرور آئیگا ———"

ہوائی جہازوں کی گونج ابھی باقی تھی۔ فرنٹ پہ اب بھی کبھی کوئی گولی چیخ اُٹھتی، کوئی ٹینک دھاڑ پڑتا ———!

دو انسان خاموش ہو گئے۔ تیسرا انسان ان دو انسانوں کے درمیان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسکا دماغ خالی تھا۔ مگر وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ وہ یوں بیٹھا تھا۔ جیسے خدا آدم کو جنت سے نکالنے کے بعد اُس کی واپسی پہ غور کر رہا ہو۔

(حلقۂ ارباب ذوق میں پڑھا گیا) اکبر

چونہ پان کے پتوں پر لگانے لگتا۔ اُس سفید اور سرخ رنگ کے امتزاج میں نہ جانے اُسے کیا کچھ نظر آنے لگ جاتا کہ وہ پیک نگلنے کے ساتھ ساتھ چسکیاں لینی شروع کر دیتا۔ شاید وہ اپنی دکان کے آدھے سے زیادہ پان خود ہی کھا جاتا تھا۔

بائیں ہاتھ ایک حکیم کا دواخانہ تھا جس میں مٹیالی سی چادر بچھی رہتی تھی شیشے کی الماریوں میں گرد سے اٹی ہوئی طرح طرح کی چھوٹی بڑی شیشیاں اس بات کی گواہی دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں کہ مہینوں سے انہیں چھونے تک کی ضرورت نہیں محسوس نہیں کی گئی۔ ایک بڑے تکیے کے سہارے حکیم بیٹھا دن بھر بیکار لوگوں سے گپیں ہانکتا رہتا۔

سامنے ایک بزازی اور آٹے والے کی اکٹھی دکان تھی۔ جس میں ایک طرف کھدر خاصہ لٹھا اور چھینٹ کے تھان ادھر اُدھر لڑھکتے رہتے۔ اور دوسری طرف آٹے دانے گڑ تیل پر مکھیاں بھنبھناتیں۔ ایسی ہی دوسری دکانیں تھیں جن میں منہار۔ رنگساز۔ بڑھئی۔ لوہار۔ سنار وغیرہ شامل تھے۔

قصبے میں عورتیں بہت ہی کم دکھائی دیتیں۔ کبھی کبھار لانبے لانبے گھونگھٹوں میں چہرا چھپائے کسی تتلی کی صورت نظر بھی آتی تو اُس کے جوان یا ادھیڑ ہونے کی تمیز کر سکنا ناممکن ہو جاتا۔ جو بھی دلہن اس قصبے میں بیاہ کر لائی جاتی یہاں کی روایات کے سامنے سر جھکا دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاوندوں نے اپنی بیویوں تک کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھا ہو۔ جیسے بیویاں بھی اُن کے حقیقی خدوخال سے ناآشنا ہوں۔ ہر کسی کی روح بھوکی تھی۔ اور جسم نڈھال ہوتا چلا جا رہا تھا شاید اُن میں اتنی اہلیت بھی نہ تھی کہ اپنی پیاسی بھوک کو پہچان سکیں۔

لیکن اب اُس عیسائی اُستانی کے آجانے پر جیسے ہر کسی نے آبِ حیات پی لیا تھا۔ اُن کی روح کا ہر ذرہ صدیوں کی نیند سے ایکدم جاگ اٹھا اور جیسے اُن کے دلوں کے کواڑ کسی غیر معمولی طاقت نے ایکدم چوپٹ کھول دیئے۔ اُن کی دنیا خوبصورت رنگوں سے معمور ہو گئی۔ جب بھی وہ اپنی رنگ برنگی پوشاک میں ملبوس ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکائے اُن کے سامنے سے گذر جاتی تو ہر کوئی محسوس کرنے لگتا جیسے آسمان پر قوس و قزح کے ساتوں رنگ نکھر آئے ہوں۔ اب وہ اوپر آسمان کی طرف بھی دیکھنے لگ گئے تھے اور نیچے کی زمین کے وجود کا بھی انہیں یقین ہونے لگا تھا۔

اس غیر معمولی ردِعمل کی تہہ میں تو شاید وہ نہ پہنچ سکے لیکن ہر شخص کسی نامعلوم طاقت کے تحت بشاش نظر آنے لگا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا۔ ہر دکاندار اپنی دکان چمکانے لگا۔

سبزی فروش نے اعلیٰ قسم کی ترکاریاں شہر سے منگوانی شروع کیں۔ حلوائی نے زندگی میں پہلی بار تیل کے پکوڑے اور جلیبیوں کی بجائے بناسپتی گھی کے شکر پارے۔ بیسن۔ قلاقند۔ بوندی کے لڈو وغیرہ لذیذ مٹھائیاں تیار کرنی شروع کیں اور وہ اُن پر چاندی کے ورق چپکا کر اور تھالوں میں چن کر قطار در قطار اوپر نیچے ترتیب سے سجاتا اور جب اترا کر جو کی پر بیٹھتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اُس کی زندگی بھی ان مٹھائیوں کی طرح خوش رنگ اور شیریں ہو گئی ہے۔

حجام کے انداز صاف ستھرے اور تیز ہو گئے اب وہ لوگوں کے سر مونڈنے کی بجائے ولایتی بال بنانے لگا۔ داڑھیاں مونڈتے وقت پہلے وہ محض چہرے پر پانی ہی چھڑتا تھا اب صابن گھسنے لگا۔ ملگجے شیشے میں بھی نئی چمک آ گئی

عرائض نویس اب خلا میں گھورنے کی بجائے اسکول ماسٹر یا حجام سے اُس استانی کے بارے میں پوچھا کرتا حالانکہ حجام خود اُس سے زیادہ واقفیت بہم نہ پہنچا سکتا تھا۔ اب وہ اُس کی موٹی موٹی مونچھوں کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتا ہوا یوں مسکرا اٹھتا گویا کہہ رہا ہو ——

میں سب بیہودگی ہے۔ بھلا محض ہنسنے ہی سے مردانگی کی صحیح علامت کیونکر ہوسکتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تم اب ہر قسم سے جوتے اپنے گھر والی پر چلنے نہ جاتے۔"

پان فروش شہر سے دو بڑے بڑے کیلنڈر لے آیا تھا۔ جن میں چینی عورتوں کے کھلے ہوئے چہرے کسی بہت بڑی فتح کے امانت دار معلوم ہوتے تھے۔ مگر الکھن لوئیں اکثر ان کیلنڈروں کی طرف دیکھ کر کہہ اٹھتا۔ "ہش، یہ عورتیں بھلا ہماری استانی کا کیا مقابلہ کریں گی۔ ہونہہ، کیا دانت نکال رہی ہیں۔" دکان کے سامنے کا چھپر اب غائب ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ لکڑی کے ایک بنچ نے لے لی تھی۔ پہر رات تک لوگ اس بنچ پر بیٹھے ادھر ادھر کی گپیں ہانکتے۔ اکثر استانی کے متعلق بھی کئی قسم کی قیاس آرائیاں کی جاتیں۔ اب پان بھی خوب بکنے لگے تھے اور بسا اوقات اسے اپنے لئے لا کر علیحدہ رکھا ہوا کرارا پان بھی گاہک کے اصرار پر اسے دینا پڑتا۔

حکیم صاحب کے دواخانہ پر بھی کوری چادر بچھ گئی۔ تکیئے پر نیا غلاف چڑھ گیا۔ ادھر شیشیوں پر کا گرد و غبار بھی جھڑ چکا تھا۔ اب سر درد اور پیٹ درد کے مریض بھی دوا دارو کی غرض سے آنے لگے۔ حالانکہ پہلے بڑی بڑی بیماریوں کے روگی بھی ادھر کا رخ نہ کرتے تھے۔ جیسے اب وہاں کا ہر شخص نازک مزاج ہو گیا ہو اور پیٹ درد کے لئے گھر میں اجوائن پھانک لینا اسے بیہودہ معلوم ہوتا ہو۔

بوڑھے بزاز کی دکان پر اب کھدر خاصے کے ساتھ لٹھے ململ کی جھلک بھی دکھائی دینے لگی اور گڑ شکر کو مکھیوں سے بچانے کی خاطر وہ کہیں سے لوہے کی جالی بھی لے آیا تھا۔ اس میں بھی ایک غیر معمولی تبدیلی آ گئی تھی۔ پھٹی پرانی کانٹے کی کرتی کی جگہ اب وہ پوری آستینوں والا صاف ستھرا کرتا پہننے لگ گیا تھا اور ٹخنوں سے اوپر کی کچھ نے ادھیا دھوتی کا روپ بدل لیا تھا۔ نہ جانے کیوں اب وہ اپنی آنکھوں میں کاجل بھی ڈال آتا اور کیکر یا پیلو کی داتن کرنے کی بجائے ہونٹوں پر مسی گھس لاتا حالانکہ اس کی عمر کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ اپنے بچے کھچے دانت بھی نکلوا دے

ہر شخص کے چہرے پر کچھ اس طرح کی بشاشت نظر آنے لگی گویا ان کی بیویاں صبح ہنس ہنس کر اور ناکتے ہوئے شام کو جلدی گھر لوٹ آنے پر زور دے چکی ہوں اور اب وہ شام کی ملاقات کے خیال ہی سے عجب قسم کی مسرت محسوس کر رہے ہوں جیسے ان کی دلہنوں کی بانہوں میں ہاتھی دانت کا جوڑا ابھی تک موجود ہو اور ماتھے پر وہ ٹیکا بھی۔

جہاں کبھی یہ سوال تھا کہ سارے دن کا پہاڑ کاٹے نہ کٹتا اب معلوم ہی نہ ہوتا کہ دن کب اور کہاں سے نکل گئے ہیں۔ دیئے جلتے ہی وہ گھر کی تیاری کرتے۔ اور ساتھ طرح طرح کی چیزیں یا آم خربوزے دہی کے بڑے وغیرہ جو اب بکثرت ملنے لگے تھے لے جاتے۔ ان کی زندگی کا سنہری دور شروع ہوا۔ کئی منچلے تو شام کو دھنک کے کھیتوں میں ٹہلنے کی غرض سے اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے جانے لگے۔ وہاں کھلی ہوا کھلانے کے بہانے وہ ان کے گھونگھٹ بھی اٹھوا دیتے اور ان کے چلنے کے ڈھنگ کو یوں غور سے دیکھتے گویا وہ اس استانی کے ساتھ ان کا موازنہ کر رہے ہوں۔

ان کی دکانوں پر گاہکوں کا تانتا بندھنے لگا۔ جیسے اس سے پیشتر تو وہاں کسی کو کسی بھی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ دھنکا نئے نئے ڈیزائن کے کرتے شلواریں سینے لگا۔ منیاری والے نے آنولے کا تیل اور خوشبودار صابن بھی شہر سے منگوانا شروع کر دیا۔ استانی بعض اوقات اس کی دکان پر اپنی ضرورت کی چیزیں لینے آتی۔ پہلے پہل جو وہ مانگتی تھی۔ پاؤڈر یا اسی قسم کا صابن وغیرہ تو وہ اس کی فرمائش پر شہر سے منگواتا تھا۔ لیکن اب تو دوسرے لوگ بھی ان چیزوں کو استعمال کرنے لگے تھے۔ خریدتے وقت

بڑی شان سے کہتے کہ جو صابن میم صاحبہ خریدتی ہیں وہی انہیں دیا جائے بھلا اُن کی بیوی کس میم صاحب سے کم ہے
پھر کبھی کبھی وہ پان والے کی دکان پر بھی چند لمحوں کے لئے رک جاتی اور سوڈے کی بوتلوں کو گھر بھجوانے کے لئے
کہتی۔ اس کے چلے جانے یا پان فروش کے اُس کے گھر سے لوٹ آنے پر وہاں چوکڑی جم جاتی اور اُسے کہا جاتا کہ تفصیل
سے ساتھ اُس کی ہر بات انہیں سنائی جائے۔

دوسری کسی دکان پر وہ شاذ ہی کبھی رکتی تھی لیکن ہر کوئی شاید محض اسی خیال سے اپنی دکان کو صاف ستھرا
رکھنے پر تلا ہوا تھا کہ ضرور کبھی نہ کبھی کسی دن کوئی نہ کوئی شے خریدنے کی غرض سے وہ اس کے ہاں بھی چلی آئے گی۔

قصبے میں لڑکوں کے لئے تو برسوں سے ایک پرائمری سکول چلا آتا تھا۔ لیکن اب لڑکیوں کے لئے عیسائیوں نے نیا نیا
سکول کھولنے کا انتظام کیا تھا۔ اور اُسی نئے سکول کی استانی کی حیثیت سے ہی وہ یہاں آئی تھی۔ شروع شروع میں مائیکروسکوپ
کے ذریعے اُس کے ساتھی ایک بوڑھے مشنری نے لڑکیوں کی تعلیم کے فوائد سمجھائے۔ اس نے بھی اس کے متعلق بہت کچھ
کہا چنانچہ چند لوگوں نے اپنی لڑکیوں کو سکول میں بھرتی کروا دیا۔

ننھی ننھی لڑکیاں جب گھر آ کر استانی کی سکھائی ہوئی ہمیشہ سچ بولنے صاف ستھرا رہنے اور بڑوں کی عزت کرنے کی نصیحتیں
اپنی ماؤں کو سناتیں تو اُن کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اس سے پہلے تو انہیں کبھی اپنی اولاد کو صاف ستھرا رکھنے کا خیال ہی نہ
آتا تھا لیکن اب جیسے انہیں اپنے بچوں کے میلے کچیلے کپڑوں سے گھن آنے لگی۔ بہرحال یہی چاہتی کہ اس کے بچے دوسروں کی
نسبت زیادہ جاذبِ نظر اور پیارے دکھائی دیں۔ وہ بڑے فخر سے انہیں نہلا دھلا کر اجلے کپڑے پہناتیں اور کنگھی چوٹی کر کے
سکول روانہ کرتیں۔ پھر جب کبھی بچیاں بڑوں کی سی باتیں کرنے لگتیں تو مائیں اس شان سے سر اونچا اٹھا کر اپنے خاوندوں
کی طرف دیکھتیں گویا کہہ رہی ہوں ـــــ یہ سب ہماری ذات ہی کے کرشمے ہیں۔ بھلا آپ لوگوں سے تو دکان میں آسن
جما کر گاہکوں کی انتظار کرنے کے سوا اور کوئی کیا سیکھ سکتا ہے ـــــ لیکن جب خاوند اس استانی کا تذکرہ کرتے ہوئے
اس کی ہر بات دہرانے میں مسرت محسوس کرتے تو ان عورتوں کے دل میں استانی کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پیدا
ہونے شروع ہو جاتے اور وہ اپنے خاوندوں کی طرف شکوک بھری نظروں سے دیکھنے لگ جاتیں۔ حلوائی کی بیوی نے تو
ایک دن یہ کہہ کر اپنی لڑکی کا سکول جانا چھڑوا لیا کہ اُسے اپنی بچی کو میم صاحب نہیں بنانا۔ وہ جیسی بھی ہے اچھی ہے۔ کسی
بھی عورت کی طرح وہ یہ کبھی گوارا نہ کر سکتی تھی کہ اُس کا خاوند کسی دوسری عورت میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ اپنی پہلی سلطنت
بھی زندگی میں پلٹ آنا پسند کر سکتی تھیں لیکن یہ بات اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ آہستہ آہستہ اسی طرح دوسری عورتوں
نے بھی کسی نہ کسی بہانے اپنی لڑکیوں کو سکول بھیجنا بند کر دیا۔ اپنے دل میں سلگنے والی آگ کو وہ اس کے سوا اور کسی طرح
ظاہر نہ کر سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکول میں لڑکیوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی گئی اور ایک دن سکول بالکل ہی سونا ہو گیا۔
بوڑھے مشنری نے بائیبل کو سب کے ذریعے اور دلیلیں ذہن کی بہتیرا سمجھایا لیکن سب تو جیسے لوگ اس کی بات
گونگوں کی طرح سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ حرفِ آخر لوگوں کا خیال تھا کہ اگر اس بوڑھے کے بجائے استانی ایک بار سمجھاتی
اگر یہی باتیں دہرا جاتی تو یقیناً ہر چیز کو نظر انداز کر کے سب کے سب اس کی باتوں پر ایمان لے آتے۔ مگر اس
تو کوئی امید نہ تھی لیکن اگر وہ اس کی طرف بھی اس مطلب کے لئے اپنی مسکراہٹ بھری آنکھوں سے دیکھ لے تو وہ
بھی کر اس کا شاگرد بن جائے گا۔ حکیم کا کہنا تھا کہ یہ عیسائی میم کسی کے دکھ میں کوئی کمی کرتی ہے۔

ہے کہ ایک بار جو سکول کھل گیا ہے اب ہمیشہ کھلا رہنا ہے گا۔ پال خورشی کو اس بات پر اعتراض تھا۔ وہ اکثر یہی کہتا ——— "یہ کیوں کر ممکن ہے، بھلا پال کے پیچھے ہیں چھپا لیا الاؤ کچھ نہ ہو تو محض پتہ ہی کوئی کب سمجھتا ہے؟" ——— شاید اُس سے استانی نے کبھی فقط اس قسم کی کوئی بات کہی ہو گی۔ کیونکہ یہی ہوا ——— تھے پہنچے کمک تو جیسے تیسے سکول کے دروازے پر بورڈ لٹکتا رہا۔ لیکن اس کے بعد ایک دن یکایک ایک لاری شہر سے آئی اور سکول کے بنچوں اور میز کرسیوں کے ساتھ بوڑھے مشنری اور استانی کو بھی لاد کر لے گئی۔

قصبے کے رنگ دن بدن مدھم پڑتے چلے گئے اور ہر چہرے نے گزشتہ لمحہ بھلا دیا۔

(حلقۂ اربابِ ذوق میں پڑھا گیا)

پرکاش پنڈت

ایک میزبان

قحط سالی کا زمانہ اور ہم
ایک صاحب کے ہوئے تھے میہماں
سب سمجھتے تھے انہیں ذی اقتدار
گھر میں تھے تحفے نئے
اور بندوقیں بھی تھیں
ذوقِ ٹینس کا بھی تھا
اُن کی کوٹھی تھی وسیع
اُس پہ اُن کو ناز تھا
مجھ کو دکھلانے لگے:۔
"یہ ڈرائنگ رُوم ہے
یہ ہے ڈیننگ روم، اور یہ باتھ روم
یہ کتب بینی کا کمرہ ہے، یہ آفس رُوم ہے
تیلی کمرے میں یہ وُڈ
ہے یہ گیرج موٹروں کے واسطے
گھوڑوں کا ہے ورانڈے سے ملا
بیٹھنے کا اُٹھنے کا دو رہا

سامنے یہ لان ہے اُس پر یہ ٹینس کورٹ ہے"
الغرض ہر چیز تھی جاذبِ نظر
تھک گیا تھا پھرتے پھرتے میں غریب
جی یہ چاہتا تھا کہ دم بھر لیٹئے
پیٹ میں تھی بار بار
قُل ہو اللہ کی پکار
میزباں کی گفتگو کا سلسلہ
ٹوٹتا ہی نہ تھا
میں نے آخر جی کڑا کر کے کہا:۔
"کیوں جناب!
ڈائننگ ہال اور سلیپنگ رُوم بھی
ہیں یہاں پر، یا نہیں"
مُسکرائے ——— اور ہٹا کے آستیں
وقت دیکھا اور فرمایا کہ ——— "اِن
ہی کا ٹائم آ گیا"

(ماخوذ)

سید مقبول حسین احمد

"پھول اور کانٹا ـــــ!"

فریدہ نے ریکٹ ایک طرف پھینک دیا۔ اور تھکن سے چُور، صوفے پر گر گئی۔ اُس کا سانس پھول رہا تھا۔ اور پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے آہستہ آہستہ پیشانی پر سے ڈھلک رہے تھے۔

"بڑی تکلیف ہو رہی ہے راشد!" اُس نے بلبلا کے، اپنا ننھا سا سفید ہاتھ، اپنی مٹھی میں دبا لیا، "اُف!"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ بعض اوقات پھولوں میں چھپے ہوئے کانٹے بے پناہ خلش پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر تمہیں تو عادت ہے کہ ہاتھ بڑھا کر ہر پھول توڑ لیتی ہو ـــــ" اُس نے پیار سے شکایت کی۔

"اونہہ ـــــ اب تو، ہائے ـــــ" وہ پھر بلبلا اُٹھی۔

"ایں ـــــ" میں اپنا البم دیکھنے کے بعد ہجومِ خیال میں گم گئی بے خیالی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ فریدہ کی بلبلاہٹ پہ چونک پڑی۔

"کیا ہوا فریدہ" میں نے پوچھا،

"ہاتھ میں کانٹا چُبھ گیا ہے باجی!" اُس نے شدتِ تکلیف سے کسمسا کر کہا، "کھیلنے کے بعد ہم لوگ، وہاں پر سے لان میں ٹہل رہے تھے۔ واپسی پر میں نے پھولوں کی کیاری میں سے ایک پھول توڑنا چاہا کہ ـــــ"

"کہ راشد کی نذر کر دوں اور وہ رات بھر میرے خیال میں تڑپتا ہے کیوں" میں ہنس پڑی۔

"ہاں، مگر اوہ ـــــ اُف، ہائے اللہ، جیسے اندر ہی رہ گیا ہے کانٹا" وہ اپنا ہاتھ جھٹک کر رہ گئی۔

"پگلی ـــــ ایک ذرا سے کانٹے پہ روئے دے رہی ہے ـــــ لا میں نکال دوں ابھی ـــــ" میں نے البم کو ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ڈالتے ہوئے۔ ایک پِن نکال کے پیار سے اُس کا ہاتھ تھام لیا،

"کہاں ہے ـــــ یہ، اچھا، ذرا اِدھر کو ہو جا، ہاں بس ـــــ" میں بہت آہستہ آہستہ اُس کی انگلی کو پن سے کریدنے لگی۔

"اوئی اللہ ـــــ بڑی دُکھن ہو رہی ہے باجی ـــــ چھوڑ دو میرا ہاتھ!" اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے ـــــ!" میں نے ذرا خفگی سے کہا۔ "نکلوائے گی نہیں کانٹا، تو تمام ہاتھ پک جائیگا، اور ـــــ"

"تو لو ـــــ" وہ ہاتھ پک جانے کے تصور ہی سے سہم گئی۔ "نکال دو جلدی سے ـــــ" اور اُس نے ہاتھ بڑھا دیا۔

تھوڑی سی محنت کے بعد، کانٹا نکل گیا۔ اور متین نے درد ہوئی جگہ پر ٹٹول ٹٹول کر ہوئے پوچھا۔

"اب تو تکلیف نہیں ہے؟"

"نہیں ـــــ بالکل ٹھیک ہے۔ میری باجی!" پگلی نے جوش میں آ کے اپنے ہونٹ میرے رخسار پر رکھ دیئے۔

"ہٹ ـــــ" میں جھینپ گئی۔

"میں کہتی ہوں، تم اسے چاہنے کیلئے اپنا آپ گنوا دو گی" میں نے غصے سے کہا "اور پھر یہ کوئی طریقہ بھی ہو کسی چیز کے حاصل کرنے کا، تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے ——"

"ارے تم تو سمجھتی ہی نہیں باجی —— رقابت کی آگ ——"

"پاگل ہو تم —— اچھا خیر ہوئی رقابت کی آگ —— مگر یہ جو تم ہر روز اسکا ایک نیا رقیب پیدا کر رہی ہو۔ اِس سے وہ تو لوٹ کر آنے سے رہا، خود بھی بدنام ہو جاؤ گی ——"

"بدنام —— لیکن باجی بدنامی کا ڈر تو اسے ہو۔ جسکے پاس بدنام کرنے والوں کا منہ بند کرنے کیلئے الفاظ کا فقدان ہو۔ یہاں تو —— اور پھر میں کیا کروں، یہ اجمل، ناصر، افتخار، رقیب ہی تو ہیں ایک دوسرے کے۔ شاید کسی طرح وہ بھی کبھی لوٹ آئے!"

"تم جانو" میں نے ذرا جذباتی ہو کر کہا، "تم تو سمجھتی ہو کہ میں کُتیا ہوں۔ بھونک بھونک کر خاموش ہو جاؤ گی اور تم پہ کوئی اثر نہ ہوگا —— بڑی آپا سمجھو تو ——" میں نے منہ پھیر کے کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔

"نہیں باجی —— خدا کی قسم، دیکھو نا، میں تو —— مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اسے اعتراض کی نظر سے دیکھتی ہو —— اجمل تو ——"

"نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم عمر، بکر، زید جسکے ساتھ چاہو پھر سکتی ہو ——" میں نے مڑ کے کٹی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم تو —— بگڑ رہی ہو باجی —— یہ بھی ——" اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ لیکن میں دوبارہ سے کھڑکی میں کھڑی، دُور آسمان کی گہرائیوں میں، ایک سُرخ سے رنگ کی کٹی ہوئی پتنگ کو، بڑی ہی بے بسی سے نیچے اُترتا ہوا دیکھتی رہی ——،

اور نہ جانے کہاں سے گھومتے گھامتے بھائی جان آ گئے۔ ہمیں یوں روٹھا روٹھا سا دیکھ کر بولے "کیا بات ہے، لڑائی ہو گئی کیا؟"

"نہیں تو —— واہ!" میں نے بات ٹال دی۔

"اور ہاں بھئی فرزانہ" اُنہوں نے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"راشد کا کوئی خط آیا —— ؟"

"جی نہیں ——" فرزانہ اپنے ٹوٹے ہوئے آئینے کو پرودتے ہوئے آہستہ سے بولی "کتنے ہی خط لکھ چکی ہوں!"

"کیا ہو گیا اُسے —— ابھی پچھلے ماہ تک تو اُس کا خط ہر روز آیا کرتا تھا ——"

"جانے —— اور میں نے تو اُسے مبارکباد کا تار بھی دیا تھا۔ لے، ٹی، ایس ہو کر بگڑ گیا شاید!"

"ہوں ——"

"پگلی ——" اور یکلخت بھائی جان نے اُسے بھینچ لیا۔ "بھئی یہ رومت دیا کرو۔ . . . نے پہ، لاحول ولا، تم رونے ہر چھوٹے کیوں لگ جاتی ہو؟"

"جی اچھا —— یہ تو بے وقوف ہے"

اور سچ مچ اس کی آنکھیں موتی بکھیرنے لگیں۔

اس دن کے بعد سے، فریدہ نے زیادہ تر پڑھائی میں مصروف رہنا شروع کر دیا۔ مگر بھائی جان سے تو اس نے بولنا بالکل ترک سا کر دیا تھا۔ دو سال سے ایف اے میں فیل ہو رہی تھی۔ "جاہل رہ جاؤ گی" ایک دن میں نے اسے ڈانٹا بھی تھا، ہٹ دھرمی سے ٹال دی تھی۔ "تم نے پڑھ لکھ کر کون سا معرکہ مار لیا ہے؟"

"یہ کج بحثی ہی تو تمہاری جہالت کا ثبوت ہے!" میں نے گرج کر کہا۔ وہ تلملا اٹھی ——

پھر ہوتے ہوتے وہ بالکل ہی بے زبان سی لڑکی بن گئی۔ چپ چپ رہا کرتی۔ کبھی تو مجھے افسوس ہوتا اپنے رویے پر۔ ایک دن جو میں اس کے کمرے میں گئی، تو کارنس پر سے، افتخار اور ناصر کی تصویریں غائب تھیں۔ میرے پوچھنے پر اس نے سر جھکا کے کہا،

"تم ہی نے تو کہا تھا ——"

شام کو، وہ اور میں برآمدے میں بیٹھے تھے۔ وہ پڑھ رہی تھی۔ اور میں یونہی بھائی جان کے لکھے ہوئے مقالے کے صفحے الٹ رہی تھی۔ جو انہوں نے ایم اے میں لکھا تھا۔ کہ ڈرائنگ روم میں سے بھائی جان نے فریدہ کو پکارا۔

"یہ بھائی جان بھی تو مارے ڈالتے ہیں۔ ہونگے بھی ان کے دوست، ہم کیا کریں۔ جب دیکھو گھسیٹے لئے جا رہے ہیں" "یہ کیا ہر وقت کونے میں پڑی سڑتی رہتی ہو۔ چلو اجمل بلا رہا ہے۔ اور ہاں، آج ہم تمہاری ملاقات ایک بہت ہی دلچسپ شخص سے کروا دینگے، لو آؤ ——" اس نے منہ بنا کر کہا،

"تو کیا ہے، ذرا دیر کو چلی جاؤ نا؟ تمہاری تو ہر بات الٹی ہے۔ پڑھنے پہ آؤ گی تو پڑھے جاؤ گی۔ ورنہ کتاب کھول کر دیکھنا بھی تمہارے مذہب میں گناہ بن جائیگا۔"

"اجمل ہے —— اور جانے کون؟"

"تو اجمل تمہیں کھا تو نہیں لیگا۔" وہیں سے بھائی جان چلائے، "عجیب بے وقوف لڑکی ہے ——"

میں بڑے انہماک سے خط لکھنے میں مصروف تھی کہ پپٹ گھسیٹتا ہوا اظہر آن ٹپکا۔ "دل لگی کی تھی۔ مگر سچ مچ محبت ہو گئی —— سنو باجی —— آہا کتنا اچھا گانا ہے۔ سنو نا، دل لگی کی تھی۔ آں، تم تو سنتی ہی نہیں ہو —— پھینک دو قلم یہ سیاہی پھر ——"

"مار دو گی جی تجھے، ہٹ لکھنے دے۔" "نہیں تو گانا سنو پہلے میرا ——" وہ ضد کرنے لگا۔ "سنا بھئی" میں نے ذرا متوجہ ہوتے کہا۔ "دل لگی کی تھی، مگر محبت —— آں نہیں، دل لگی کی تھی۔ مگر سچ مچ محبت ہو گئی ——" وہ بڑی لے میں گانے لگا۔ اور میں اسے دبوچا

"کہاں سے سیکھا یہ گانا تو نے —— شیطان!"

"اوں —— تو میں نے تھوڑا ہی —— وہ تو فریدہ باجی گا رہی تھیں شام، میں نے بھی سیکھ لیا۔ اچھا ہے نا؟"

"بہت اچھا —— لے بھاگ اب۔"

اور وہ چیخ چیخ کر، "دل لگی کی تھی۔ مگر سچ مچ محبت ہو گئی۔" گاتا باہر بھاگ گیا۔

اور جب میں خط لکھ کر انہیں ڈلوانے جا رہی تھی۔ تو مجھے خیال آیا۔ کہ لاؤ فریدہ سے بھی پوچھ لوں۔ شاید اسے بھی کوئی خط ڈلوانا ہو۔ مگر وہ غسل خانے میں تھی۔ میں انتظار میں بیٹھ گئی۔ اچانک میری نظر انگیٹھی پر پڑی۔ راشد کی تصویر بھی غائب تھی۔ اور اس کی جگہ بکھرے ہوئے انگلا بنی فریم میں اجمل کی تصویر مسکرا رہی تھی ——

"سچ ہے ——" وہ مسکرا دی۔ تو میں نے بامعنی انداز میں اجمل کی تصویر کو گھورتے ہوئے کہا۔
"اس کے لئے تو باجی ——" اس نے شکایت بھری گہری نظروں سے مجھے دیکھ کر آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا: "تم مجھے معاف بھی کر دو۔"
"میری گڑیا ——" میں نے وفورِ جذبات سے بے قابو ہوتے ہوئے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ "تم ——"
"میں جانتی ہوں باجی —— تم کتنی اچھی ہو!" وہ مجھ سے لپٹ گئی ——
بہت دن گزر گئے —— بھائی جان کو مالوے میں اچھی سی جگہ مل گئی تھی اور وہ وہاں جا چکے تھے۔ ایک دن مجھے ان کا خط ملا کہ "یہاں کی برسات کتنی دلکش ہے —— کتنی دلفریب —— تم شاید اس کا اندازہ بھی نہ لگا سکو۔ جب یہ کالی گھٹائیں گھر گھر کے جمع ہوتی ہیں جب کوئل کا سینہ دردِ غم سے پھٹنے لگتا ہے۔ جب پپیہے 'پی' کی تلاش میں ناکام لوٹ کر دہی آم کے پیڑوں پہ اکٹھے ہوتے ہیں اور مور جھنکارتے جھنکارتے پاگل ہو جاتے ہیں۔ تو تم مجھے بے حد یاد آتی ہو —— تمہیں وہیں کی برسات پسند ہے یہاں آؤ۔ تو معلوم ہو کہ برسات کسے کہتے ہیں۔ کتنا کیف، کتنی مستی، اور کتنے نغمے بکھیرتا ہوا آتا ہے یہ موسم۔ شاید جنتے بھر تک میں وہاں آؤں۔ تو تمہیں بھی اپنے ساتھ لے آؤں گا۔ تیار رہنا۔ فریدہ غریب کی تو برا حال کا برا ہوگا۔ بہت —— اسے دعا کہہ دینا۔"
مالوے کی برسات —— میں تو وہاں جا کر ایسی مست ہوئی گویا ڈھیروں نشہ چڑھا لیا ہو۔ خود کو فطرت سے اس قدر نزدیک محسوس کرکے میں بے خودی سے جھومنے لگتی ——
"ارے کہاں کھو گئیں صغرا تو ——" بھائی جان مجھے چھیڑا کرتے۔
اور میں کہتی۔ "ڈھونڈ لیجئے نا؟"
"کہاں ڈھونڈوں؟" وہ بناوٹی بے بسی سے کہتے۔ "اس درختوں کے جھنڈ میں —— شفق کی لالیوں میں —— جھومتے ہوئے مست بادلوں میں، رنگین دھنک میں —— مور کے رقص میں ——"
"اوہو ——" میں ہنس پڑتی۔ "جب یہ فضائیں آپ کو شاعر بنا سکتی ہیں تو ——"
"تو پاگل دیوانہ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں —— ہے نا؟"
دن ہنستے ہنستے گزر رہے تھے —— لیکن برسات کے ختم ہوتے ہی میرے دل و دماغ پہ اداسی سی چھانے لگی۔ کبھی تو فریدہ اتنی یاد آتی کہ میں بے چین ہو اٹھتی۔ جنگ کی وجہ سے بھائی جان کے پاس کام اتنا زیادہ آ گیا تھا۔ کہ چھٹی ملنا محال تھی۔ اس لئے واپس جانا ٹلتا رہا۔
ادھر چچا جان اور چچی وغیرہ کے خطوط سے یہ معلوم کرکے کہ فریدہ کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا ہے۔ ہر وقت جان نکلتی رہتی مگر بھائی جان بار بار تسلی دے دیتے کہ کوئی بات نہیں، ملیریا ہوگا، موسم خراب ہے نا؟
لیکن دو تین مہینے کے بعد، چچا جان کے تار نے تو ہمیں بالکل ہی گھبرا دیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ فریدہ کو سینے ٹوریم میں داخل کروا دیا ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔ جلدی پہنچو۔" اب کے بھی بھائی جان نے بہتیرا زور لگایا۔ مگر چھٹی نہ مل سکی۔ میں اکیلی ہی چل پڑی اسٹیشن پر وہ غریب بولے "میں استعفیٰ دے دوں گا۔ لعنت ہے اس نوکری پر!" غم و غصہ سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ "پہنچتے ہی تار دے دینا فریدہ کی خیریت کا۔ سمجھیں!" چلتے چلتے انہوں نے مجھ سے کہا۔
شام کو ۴ بجے گاڑی منزلِ مقصود پہ پہنچی تھی —— اور سینے ٹوریم وہاں سے بارہ تیرہ میل کے فاصلے پہ تھا۔ میں نے سوچا

رمل پہ کے اسکی خیریت کا پتہ لگا لوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ وہاں پہنچ گئی تو اسیں سمجھ جائیگا۔ بس سے بہ [illegible]

) ——"

در جس وقت میں وہاں پہنچی، تو فریدہ سو رہی تھی۔ سرہانے بیٹھی ہوئی چچی تسبیح پھیر رہی تھیں۔ انکی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں تیں، رو، رو اور جاگ جاگ کر کالی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ فریدہ کے دونوں پھیپھڑے بالکل کھوکھلے ہو چکے ہیں، سلئے، پلی دی جاتی ہے۔

یں نے چچی کی خوشامد درآمد کر کے انہیں گھر بھیج دیا کہ آپ آج آرام کیجئے، میں جو آگئی ہوں اب، انہوں نے [illegible] ہی تھا کہ فریدہ کسمسا کر اُٹھ بیٹھی،

ارے باجی تم!" اُس نے حیرت سے مجھے دیکھا،

ہاں —— مگر یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے فریدہ!" میں نے بھرے ہوئے گلے سے پوچھا،

کچھ بھی نہیں باجی —— بس کانٹا چبھ گیا تھا۔" جیسے رگوں میں دوڑتا ہوا خون یکدم سرد پڑ گیا ہو، وہ پھر بولی "اُسے کیلئے، میں خود کو دھوکا دے دے کر، پھولوں کے ساتھ کھیلتی رہی —— لیکن میری روح کی گہرائیوں میں [illegible] نہیں لیا گی —— پھر میں نے ایک کا انتخاب کر لیا، اجمل —— اور رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہوا گویا میری تمام محبت، پرستش اُسی کیلئے ہے۔ انسان کی زندگی بغیر کسی مرکز پرستش کے، بالکل بیکار رہتی ہے نا؟" اُس کی آنکھیں جلدی جلدی یں ——

ہاں —— لیکن ——"

اور ایک دن اجمل نے نسرین سے شادی کر لی —— پھول کے نیچے چھپا ہوا کانٹا چبھ گیا میرے ——، تم نہیں، اور ہوتیں بھی، تو یہ کانٹا نکالنا تمہیں بھی مشکل ہو جاتا ——" وہ گہری نظروں سے مجھے تکنے لگی،

اور باجی اب تو، اندر ہی اندر سڑ کے، اُس نے گرد و نواح میں زہر ہی زہر بھر دیا ہے۔" اُس نے مضطرب ہو کر کروٹ لے کے کہا۔

نہ جانے کب تمام جسم میں پھیل جائے —— راشد کہتا تھا کہ پھولوں کے نیچے چھپے ہوئے کانٹے بے پناہ کٹھن ہوتے ہیں۔ بے جانے بوجھے پھولوں میں ہاتھ ڈالنا نادانی ہے —— غریب راشد —— ! جانے کہاں ہوگا؟" آنکھیں بند کر لیں،

" مجھے مالوے میں ملا تھا وہ ——" اُس نے بے صبری سے آنکھیں کھول دیں،

ہاں —— میں نے کہا کہ عجیب احمق ہو —— کم از کم فرد کو خط تو لکھ دیا کرو، وہ تم سے بڑی خفا ہے کہ اُس کے جواب کے تو تم اُسے خط ہی لکھتے ہو، اور نہ وہاں جاتے ہی ہو ——" اُداس سا ہو کر کہنے لگا، کہ تم ہی تو نیا دتی کر لی ہو صغرا، لے کر چلا جاؤں اُس کے پاس، اُس کے جذبات کو کتنی ٹھیس لگے گی، کتنا صدمہ ہوگا اُسے ——"

یں —— تو کیا، جانے کیا کہہ رہی ہو باجی، میں نہیں سمجھ سکی!"

س کے چہرے پہ چیچک کے بیشمار بدنما داغ پڑ گئے ہیں نا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے ایسے کہا، جیسے کوئی انتہائی سنسنی خیز مہ ہی بول ——

"اوہ ——" اس نے سلیٹی کمبل کو چہرے پر ڈھک لیا، اور تھوڑی دیر کے بعد گھٹی ہوئی آواز میں بولی "جی گھبرا رہا ہے ابھی ——"

"سو جاؤ ——" میں نے تھپک کر کہا "کوئی بات نہیں"
"تم بھی تو سو جاؤ، اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہو، تھک گئی ہو گی"
"اچھا ——" اور میں اس کے سرہانے آرام کرسی پر نیم دراز سی ہو کر اونگھنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن وحشتناک خواب ہر بار مجھے چونکا دیتے۔

......، فریدہ سوئی پڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کے دونوں پٹوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی روشنی کی پتلی سی لکیر کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ دن نکل آیا ہے، پر سانس تھا کہ جیسے کوئی اندر ہی اندر گھونٹے دے رہا ہو، سخت سردی کی پروا نہ کرتے ہوئے میں دبے پاؤں برآمدے میں آ گئی۔

برفیلی ہوائیں سنسناتی ہوئی، برف پوش درختوں میں جھکتی پھر رہی تھیں —— اور جب کوئی اکیلا دکیلا جھونکا، رک کر ادھر ادھر پناہ لینے لگتا، تو ایسا محسوس ہوتا، گویا کسی نے برف کی ڈلی لیکر تمام جسم پر پھیر دی ہے۔ سامنے ——، پھولوں کی کیاریوں پر بھی برف جمی ہوئی تھی۔ اور آہستہ آہستہ ابھرتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی میں، پتوں کے سہرے، انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔

مجھے ایک عجیب سا خیال آیا، اور میں نظریں بچا کر جلدی سے اندر چلی آئی۔
فریدہ ابھی اسی طرح سو رہی تھی، آرام کی نیند،
"کھٹ، کھٹ، کھٹ" مڑ کے چلنے برآمدے میں، اونچی ایڑی کے جوتے کی اداس سی آواز سنکر، میں نے فریدہ کا لحاف الٹ دیا، نرس ٹمپریچر لینے آ رہی تھی ——،
لیکن اوہ! لحاف کا کونا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فریدہ کی بڑی بڑی آنکھیں، چھ مہینے کی حد تک کھلی ہوئی تھیں۔ اور ٹھہری ہوئی پتلیاں، اوپر کی طرف سرک گئی تھیں، مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ نرس ٹمپریچر لینے کیلئے جھکی تو میں ایک قدم پیچھے کھڑی۔ کھینچ سکی دی اور جب وہ اٹھی تو ——،

"ختم ہو چکی غریب —— !" اس نے میری دیوانگی کو سمجھتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔
میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، کیا دیتی؟ اور مرے مرے قدم اٹھاتی ہوئی، چچا جان کو ٹیلیفون کرنے کیلئے باہر نکل آئی۔
پتوں پر سے برف آہستہ آہستہ بھاپ بن کر فضا میں پرواز کر رہی تھی، اور پھولوں کے پیچھے، نوکیلے کانٹے، کسی کی راہ دیکھنے کیلئے جھانک رہے تھے ——!

ناہید عالم

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ اتنا عرصہ
آج تک تیری جدائی کا یہ کیونکر گذرا
حسرت موہانی

آئینہ

ساری سلطنت میں ایک آئینہ بھی نہ تھا۔ وہ آئینہ جو آپ دیواروں پر لٹکاتے ہیں جو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھے جاتے ہیں
اور وہ جو واسکٹ پر لٹکتی ہوئی زنجیر کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں ملکہ کے حکم سے پارہ پارہ کر دیئے گئے تھے۔ اگر آئینے کا ایک
چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا کسی مکان سے ملتا تو یہ سوچے بغیر کہ وہ مکان کس کا ہے مکینوں کو سخت دردناک اذیتیں پہنچا کر موت
کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ اس غضب ناک رویہ کی وجہ یہ تھی کہ ملکہ ہیبتناک حد تک بدصورت تھی۔ یہاں تک کہ ایک نہایت کریہہ الشکل
ڈائن بھی اس کے مقابلہ میں خوبصورت معلوم ہوتی۔ ملکہ کو اپنی بدصورتی کا شدید احساس تھا اس لئے وہ اپنا عکس دیکھنے کے تمام تعلقات
سے اجتناب کرتی تھی۔ جب وہ شہر میں جاتی تو اُسے اس خیال سے تسکین رہتی کہ باقی دوسرے لوگ اپنی شکل دیکھنے کے قابل نہیں۔
آنکھیں اگر دنیا بھر سے رسیلی ہوں چہرہ اگر گلاب سے زیادہ خوبصورت ہو تو کیا حاصل۔ اپنے باریک ہونٹوں میں پھول لٹکنے
سے کیا فائدہ جبکہ آپ کو اپنی آنکھیں، اپنے لب اور اپنی صورت دیکھنے کی اجازت نہیں۔

آپ ندیوں اور جھیلوں میں بھی اپنا عکس نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ اُس ملک میں تمام دریا اور جوہڑ پتھر کی ایسی سلوں کے نیچے
چھپا دیئے گئے تھے۔ جو نہایت حکمت اور استادی سے ایک دوسری سے جوڑ دی گئی تھیں۔ وہ کنوئیں جن میں سے پانی نکالا جاتا
تھا اتنے گہرے تھے کہ آپ ان کی سطح نہیں دیکھ سکتے تھے اور بجائے پیالوں کے طنبوری کی شکل کے گہرے برتن استعمال کئے جاتے
جن میں عکس دیکھ سکنا ناممکن تھا۔ اس ملک میں بھی باقی ملکوں کی طرح رنگین مزاج نازنین لڑکیاں موجود تھیں اور وہ بہت زیادہ تر ناخوش
کو شاک گزر رہی تھی۔ لیکن ایک نوجوان لڑکی جے کنتھ جو اس شہر کے مضافات میں رہتی تھی باقی لڑکیوں جتنی پژمردہ اور ناخوش نہیں تھی۔
کیونکہ ایک شخص اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور وہ ہمیشہ اُسے یہ بتلانے کے لئے کہ وہ کتنی خوبصورت ہے کسی حد تک آئینہ کا کام
دیتا۔ جے کنتھ شرما جاتی اس لئے نہیں کہ اُسے خوف تھا بلکہ جب اس کے چاہنے والے نے اُس سے شادی کی درخواست
کی اور وہ مسکرائی تو اس کے مسکرانے میں "نہیں" کہنے کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ مگر بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان کی منگنی کی
خبر بے رحم ملکہ کو پہنچ چکی تھی اور ملکہ دوسرے لوگوں کی خوشی کو تباہ و برباد کر کے خوش ہوتی تھی اور پھر طرہ یہ کہ ملکہ کو جے کنتھ
سے باقی لڑکیوں کی نسبت سخت نفرت تھی۔ کیونکہ تمام سلطنت میں وہی ایک خوبصورت ترین لڑکی تھی۔

شادی سے چند روز قبل جب جے کنتھ ایک باغیچہ میں سیر کر رہی تھی تو ایک بڑھیا عورت بھیک مانگنے کے لئے
اس کی طرف آئی مگر وہ بڑھیا اچانک ایک خوفناک چیخ مار کر پیچھے گری جیسے اس کا پاؤں کسی سانپ پر پڑنے ہی
والا تھا۔ بولی "او خدا۔ کیا دیکھ رہی ہوں میں!"

جے کنتھ نے پوچھا "اماں کیا بات ہے؟ کیا دیکھ رہی ہو [illegible]"

"دنیا کی بدصورت ترین چیز۔"

جے کنتھ نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے کہ وہ بدصورت [illegible]"

"ہاں یہ لڑکی ٹھیک کہتی ہے وہ۔ دیکھو میں نے بڑی عمر پائی ہے لیکن میں نے ساری عمر میں تم سے جیسی لڑکی بدصورت نہیں دیکھی"
"تمہارا مطلب ہے کہ میں بدصورت ہوں؟"
"الفاظ بدصورتی کا جتنا اظہار کر سکتے ہیں تم اُن سے بھی زیادہ بدصورت ہو"
بڑھیا عورت جو کوئی چالاک جادوگرنی بے رحم ملکہ کی کارندہ تھی ایک کراہت اور تمسخر آمیز طریقے سے ہنستے ہوئے گم ہو گئی۔
بے کنتھر زار زار رونے لگی اور سیب کے درخت کے نیچے ایک چبوترے پر بیٹھ گئی۔ اس پریشان کن خیال سے اس کی توجہ ہٹا کر کسی اور طرف لگانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔
"میں بدصورت ہوں ——— میں بدصورت ہوں" وہ بار بار کہتی رہی۔ ہر چند اس کے چاہنے والے نے طرح طرح کی قسمیں کھا کر اُسے یقین دلانا چاہا کہ وہ حسین ہے مگر بے فائدہ۔ اس کی اس محبوب درخواست پر کہ شادی کا دن مقرر ہونا چاہیے۔ بے کنتھر بولی "کیا کہا؟ میں تمہاری بیوی بنوں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ مجھے تم سے اس قدر محبت ہے کہ میں ایسی لڑکی کو تمہاری بیوی بنانا نہیں چاہتی جو مجھ جیسی کریہہ صورت ہو"
کیا ہو سکتا تھا؟ ——— بڑھیا کو جھٹلانے اور بے کنتھر کو صداقت کا یقین دلانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ اُسے آئینے میں اپنا آپ دکھا دیا جاتا لیکن ساری سلطنت میں ایک آئینہ بھی نہ تھا اور ملکہ کے خوف سے کسی کاریگر کو صرف ایک عدد آئینہ بنانے کی بھی جرأت نہ پڑتی تھی۔
آخر کار بے کنتھر کے چاہنے والے نے کہا "مجھے عدالت میں جانا ہی پڑے گا۔ ملکہ خواہ کتنی ہی وحشی اور سخت دل ہے مگر مجھے یقین ہے کہ میرے آنسوؤں اور بے کنتھر کے حسن معصوم کو دیکھ کر اُسے نرم ہونا ہی پڑے گا"

. . . .

"کیا معاملہ ہے" بے رحم ملکہ نے کہا "یہ کون لوگ ہیں۔ کیوں آئے ہیں یہاں؟"
"ملکہ معظمہ! آپ کے سامنے دنیا کا ناشاد ترین عاشق زار کھڑا ہے"
"مجھے تنگ کرنے کا اچھا طریقہ ہے یہ"۔
"ملکہ معظمہ ہم پر رحم کیجیے"
"مگر تم عاشقوں کے جھگڑوں سے مجھے کیا واسطہ؟"
"اگر آپ آئینہ کی اجازت دے دیں . . . . . . "
ملکہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہیں آئینہ کا ذکر کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی"
وہ غصے سے کانپ رہی تھی اور دانت بج رہے تھے۔
"ملکہ معظمہ مجھے معاف کر دیجیے۔ حضور غلام پرور میری عرض سنیے ——— اس لڑکی کو جسے آپ دیکھ رہی ہیں سخت غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ وہ بدصورت ہے"
ملکہ نے بدمزاجی سے ہنستے ہوئے کہا "آہ یہ ٹھیک تو ہے۔ ٹھیک کہتی ہے وہ۔ میرا خود یہ خیال ہے کہ میں نے آج

آئینہ

ساری سلطنت میں ایک آئینہ بھی نہ تھا۔ وہ آئینہ جو آپ دیواروں پر لٹکاتے ہیں جو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھے جاتے ہیں اور وہ جو واسکٹ پر لٹکتی ہوئی زنجیر کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں ملکہ کے حکم سے پارہ پارہ کر دیئے گئے تھے۔ اگر آئینے کا ایک چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا کسی مکان سے ملتا تو یہ سوچے بغیر کہ وہ مکان کس کا ہے مکینوں کو سخت دردناک اذیتیں پہنچا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ اس غضب ناک رویہ کی وجہ یہ تھی کہ ملکہ ہیبت ناک حد تک بدصورت تھی۔ یہاں تک کہ ایک نہایت کریہہ المنظر دیو بھی اس کے مقابلے میں خوبصورت معلوم ہوتا۔ ملکہ کو اپنی بدصورتی کا شدید احساس تھا اس لئے وہ اپنا عکس دیکھنے کے تمام امکانات سے اجتناب کرتی تھی۔ جب وہ شہر میں جاتی تو اسے اس خیال سے تسکین رہتی کہ باقی دوسرے لوگ اپنی شکل دیکھنے کے نااہل ہیں۔ آنکھیں اگر دنیا بھر سے رسیلی ہوں چہرہ اگر گلاب سے زیادہ خوبصورت ہو تو کیا حاصل۔ اپنے باریک بالوں میں پھول اٹکانے سے کیا فائدہ جبکہ آپ کو اپنی آنکھیں، اپنے لب اور اپنی صورت دیکھنے کی اجازت نہیں!

آپ ندیوں اور جھیلوں میں بھی اپنا عکس نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ اس ملک میں تمام دریا اور جوہڑ پتھر کی ایسی سلوں کے نیچے چھپا دیئے گئے تھے۔ جو نہایت حکمت اور استادی سے ایک دوسری سے جوڑ دی گئی تھیں۔ وہ کنوئیں جن میں سے پانی نکالا جاتا تھا اتنے گہرے تھے کہ آپ ان کی سطح نہیں دیکھ سکتے تھے اور بجائے ڈولوں کے لمبوتری شکل کے گہرے برتن استعمال کئے جاتے جن میں عکس دیکھ سکنا ناممکن تھا۔ اس ملک میں بھی باقی ملکوں کی طرح رنگیلی مزاج نازنین لڑکیاں موجود تھیں اور یہ پابندی زیادہ تر انہیں کو شاق گزر رہی تھی۔ لیکن ایک نوجوان لڑکی جے کنتھ جو اس شہر کے مضافات میں رہتی تھی باقی لڑکیوں جتنی پژمردہ اور ناخوش نہیں تھی کیونکہ ایک شخص اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور وہ ہمیشہ اسے یہ بتلانے کے لئے کہ وہ کتنی خوبصورت ہے کسی حد تک آئینہ کا کام دیتا۔ جے کنتھ شرما جاتی اس لئے نہیں کہ اسے خوف تھا بلکہ جب اس کے چاہنے والے نے اس سے شادی کی درخواست کی اور وہ مسکرائی تو اس کے مسکرانے میں "نہیں" کہنے کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ مگر بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان کی منگنی کی خبر بے رحم ملکہ کو پہنچ چکی تھی اور ملکہ دوسرے لوگوں کی خوشی کو تباہ و برباد کر کے خوش ہوتی تھی اور پھر طرہ یہ کہ ملکہ کو جے کنتھ سے باقی لڑکیوں کی نسبت سخت نفرت تھی۔ کیونکہ تمام سلطنت میں وہی ایک خوبصورت ترین لڑکی تھی۔

شادی سے چند روز قبل جب جے کنتھ ایک باغیچہ میں سیر کر رہی تھی تو ایک بڑھیا عورت بھیک مانگنے کے لئے اس کی طرف آئی مگر وہ بڑھیا اچانک ایک خوفناک چیخ مار کر پیچھے گری جیسے اس کا پاؤں کسی سانپ پر پڑنے ہی والا تھا۔ بولی "او خدا۔ کیا دیکھ رہی ہوں میں!"

جے کنتھ نے پوچھا "مائی کیا بات ہے؟ کیا دیکھ رہی ہو تم مجھے بھی بتاؤ تو"

"دنیا کی بدصورت ترین چیز"

جے کنتھ نے مسکراتے ہوئے کہا "خیر مجھے یقین ہے کہ وہ بدصورت ترین چیز میں نہیں ہوں"

"ناسمجھ لڑکی تو یہی ہے وہ۔ دیکھو میں نے بڑی عمر پائی ہے لیکن میں نے ساری عمر میں تمہارے جیسی بدصورت عورت نہیں دیکھی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں بدصورت ہوں؟"

"الفاظ بدصورتی کا جتنا اظہار کر سکتے ہیں تم اُن سے بھی زیادہ بدصورت ہو۔"

بڑھیا عورت جو کوئی چالاک جادوگرنی یا بے رحم ملکہ کی سہیلی تھی ایک کراہت اور تمسخر آمیز طریقے سے ہنستے ہوئے گم ہو گئی۔

جے کنتھ زار زار رونے لگی اور سیب کے درخت کے نیچے ایک چبوترے پر بیٹھ گئی۔ اس پریشانی کی خیال سے اس کی توجہ ہٹا کر کسی اور طرف لگانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

"میں بدصورت ہوں ——— میں بدصورت ہوں"۔ وہ بار بار کہتی رہی۔ ہر چند اُس کے چاہنے والے نے طرح طرح کی قسمیں کھا کر اُسے یقین دلانا چاہا کہ وہ حسین ہے مگر بے فائدہ۔ اس کی اس محبوب درخواست پر کہ شادی کا دن مقرر ہونا چاہئے۔ جے کنتھ بولی "کیا کہا؟ میں تمہاری بیوی بنوں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ مجھے تم سے اس قدر محبت ہے کہ میں ایسی لڑکی کو تمہاری بیوی بنانا نہیں چاہتی جو مجھ جیسی کریہہ صورت ہو۔"

کیا ہو سکتا تھا ——— بڑھیا کو جھٹلانے اور جے کنتھ کو صداقت کا یقین دلانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ اُسے آئینے میں اپنا آپ دکھا دیا جاتا لیکن ساری سلطنت میں ایک آئینہ بھی نہ تھا اور ملکہ کے خوف سے کسی کاریگر کو صرف ایک عدد آئینہ بنانے کی بھی جرأت نہ پڑتی تھی۔

آخر کار جے کنتھ کے چاہنے والے نے کہا "مجھے عدالت میں جانا ہی پڑے گا۔ ملکہ خواہ کتنی ہی وحشی اور سخت دل ہے مگر مجھے یقین ہے کہ میرے آنسوؤں اور جے کنتھ کے حسن معصوم کو دیکھ کر اُسے نرم ہونا ہی پڑے گا۔"

. . . .

"کیا معاملہ ہے" بے رحم ملکہ نے کہا "یہ کون لوگ ہیں۔ کیوں آئے ہیں یہاں؟"

"ملکہ معظمہ! آپ کے سامنے دنیا کا ناشادترین عاشق زار کھڑا ہے۔"

"مجھے تنگ کرنے کا اچھا طریقہ ہے یہ۔"

"ملکہ معظمہ ہم پر رحم کیجئے۔"

"مگر تم عاشقوں کے جھگڑوں سے مجھے کیا واسطہ؟"

"اگر آپ آئینہ کی اجازت دے دیں . . . ."

ملکہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "تمہیں آئینہ کا ذکر کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی۔"

وہ غصے سے کانپ رہی تھی اور دانت بج رہے تھے۔

"ملکہ معظمہ مجھے معاف کر دیجئے۔ حضور خفا نہ ہوں میری عرض سنئے ——— اس لڑکی کو جسے آپ دیکھ رہی ہیں۔ سخت غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ وہ بدصورت ہے۔"

ملکہ نے بدمزاجی سے ہنستے ہوئے کہا "تو یہ ٹھیک تو ہے۔ ٹھیک کہتی ہے وہ۔ میرا خود یہ خیال ہے کہ میں نے آج

[illegible]

ـے انتہا کریہہ اور نفرت انگیز صورت نہیں دیکھی۔

یہ الفاظ سن کر جے کو محسوس ہوا کہ وہ غم سے مر جائے گی۔ اپنی شکل و صورت کے متعلق اب کسی شک و شبہ کی گنجائش ناممکن تھی۔ کیونکہ نہ صرف ملکہ بلکہ بھیک مانگنے والی بڑھیا نے بھی اُسے بدصورت کہا تھا —— اُس کا ردِ عمل آہستہ آہستہ آنے لگا۔ چہرے پر موت کی زردی پھیل گئی۔ سر چکرایا اور وہ تخت کے پاس بیہوش ہو کر گر پڑی لیکن اس کا عاشق ملکہ کے سخت الفاظ سن کر بھی مایوس نہ ہوا۔ وہ زور سے چلایا کہ یا تو ملکہ پاگل ہے یا اُس نے مصلحتاً دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ اتنا کہنا تھا کہ محافظوں نے جھپٹ اُسے پکڑ لیا۔ ملکہ نے اشارہ کیا اور جلاد جو ہمیشہ تخت کے پاس ایستادہ کھڑا رہتا کہ نہ جانے اس کی کس وقت ضرورت پڑ جائے آگے بڑھا۔

ملکہ نے اُس شخص کی طرف جس نے اس کی شان میں توہین آمیز کلمات کہے تھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اپنا فرض انجام دو۔

جلاد نے آہستہ سے بے فکرانہ انداز میں تلوار نیام سے نکالی۔ دفعتاً دو بے ربط چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ بے کس نے اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولتے ہوئے چمکتی برہنہ تلوار میں اپنا دلفریب خوبصورت چہرہ دیکھ لیا تھا۔ یہ نعرۂ مستانہ اُسی کا تھا۔ دوسری چیخ ملکہ کی تھی۔ ایک دردناک چیخ۔ موت کا نوحہ کیونکہ بدصورت اور بدروش ملکہ بھی اس غیر متوقع آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر عرقِ شرم میں غرق ہو گئی اور غیظ و غضب کی آگ اُس کے دماغ پر مستولی ہو گئی ——

نوجوان کی نعش تخت کے قریب تڑپی اور ملکہ کی آنکھیں اور سرخ ہو گئیں۔

(کیٹول مینڈے)

آغا بابر

غزل

غم ہوتا ہے دل میں اگر ارماں نہیں ہوتا
یعنی میں کبھی بے سروساماں نہیں ہوتا

ہوتا نہیں حل عقدۂ محرومیٔ قسمت
آساں جسے سمجھے ہیں وہ آساں نہیں ہوتا

کیوں دعوتِ وحشت ہے ہر اک ذرۂ منزل
ہر ذرۂ منزل تو بیاباں نہیں ہوتا

ہونے کو تو ہوتے ہیں بہت دشمنِ دیں اور
تجھ سا کوئی غارتگرِ ایماں نہیں ہوتا

اے ذوقِ اذیت مجھے منجدھار میں لے چل
ساحل سے کچھ اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

انور سے بھی ہو ہی گئی عشق کی تقصیر
سچ ہے کہ مکمل کوئی انساں نہیں ہوتا

انور شروانی

مطبوعات

بکھرے اوراق از خیری۔

بعض مسئلوں پر عورتیں یقیناً مردوں سے بہتر بات چیت کر سکتی ہیں۔ عصمت چغتائی کا نام اسی ضمن میں نمونۃً گنوایا جا سکتا ہے۔ لیکن تمام کہانی لکھنے والیاں ایک ہی ڈھب پر نہیں چلتیں۔ محترمہ خیری اس دوسری شق میں آتی ہیں۔ وہ نام نہاد ترقی پسندی سے دور تھیں۔ اپنے افسانوں میں خلوص اور حقیقت سے بالکل قریب ہیں۔ افسانے بیان کے اور تخیل کے اعتبار سے بہت پاکیزہ ہیں۔

کتاب میں گیارہ افسانے ہیں جو تقریباً دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کتاب کی قیمت ۲ ہے پتہ کتب خانہ علم و ادب دلی۔

پریشان جلوے۔ مرتبہ حیات ترین

اُردو کی ادبی حیثیت کا لوہا منوانے کے لئے ہندوستان کے ہر حصے نے اپنا اپنا پیشکش دی۔ بہاولپور کے ادیبوں کی ترجمانی کے لئے پریشان جلوے ایک مفید مجموعہ ہے۔ اس میں ۱۲ افسانے اور ۱۹ نظمیں ہیں۔ تعارف میں سر شیخ عبد القادر فرماتے ہیں: "اس کتاب کو دیکھنے سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنے ہونہار لکھنے والے اس ریاستِ ابد دولت میں موجود ہیں۔" شعرا اور افسانہ نگار حضرات میں جناب احمد ندیم قاسمی اور الیف ایم شجاع ناموس کے اسامی اعلیٰ حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قاسمی صاحب کی ادبی زندگی اس ریاست کو مفتخر کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ مجموعہ ایک اچھے ذوق کا نمونہ ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

پتہ:۔ عباسیہ اکادمی بغداد الجدید۔ بہاولپور۔

دھوپ چھاؤں از فضل الرحمٰن۔

حیدرآباد نے اُردو ادب کو جہاں ٹھوس تصانیف سے مالامال کر دیا ہے۔ وہاں اُس کے شعرا و ادیب بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ یوں تو کئی مسلم الثبوت شاعر حیدرآباد سے منسوب ہیں لیکن نوجوانوں میں ایک دو کو چھوڑ کر بہت کم شاعر اپنی انفرادیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ دھوپ چھاؤں کا شاعر بھی روایات اور روایاتی انداز کا قائل ہے۔ اس مجموعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد کے شعری ادب میں ابھی فکر و نظر کی نئی جولانیوں کی ضرورت ہے۔ فضل الرحمٰن صاحب کا نام اس امر کا متقاضی تھا کہ وہ ہمیں اپنی ذات سے متعارف کراتے۔ لیکن انہوں نے نہ جانے کیوں اسے جائز نہیں سمجھا۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت ایک روپیہ بارہ آنے پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

تجلیات از مہر عثمانی جوناگڑھی۔

اس کتاب کے شائع کرنے کو منظرِ عام پر لانے کی اس کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں کہ اس کا مصنف ایک ایسی دور افتادہ سرزمین کا باشندہ ہے جہاں اردو شعر و ادب ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ کتاب میں بیشتر انیسویں صدی کے انداز کی

زلیں اور نظمیں ہیں اور بس۔

کتاب کی قیمت عه ضخامت ۱۶۴ صفحے اور ملنے کا پتہ قیصر مہر بکراسٹریٹ ریاست جوناگڑھ (کاٹھیاواڑ) ہے

لہو ترنگ از میر سکندر علی وجد

حیدرآباد اسکول کا جدید شاعر سکندر علی وجد ابھی اپنے دور کے ان نئے شاعروں سے جنہوں نے اپنا جنم شمالی ہندوستان میں لیا ہے بہت پیچھے ہے۔ وہ جوش اور اقبال کی تقلید تو کرتا ہے لیکن اس طرح کہ ان کی خوبیوں کو کم اور برائیوں کو زیادہ اپناتا ہے خیال کے اعتبار سے اسے بانگ درا کا اقبال اور الفاظ کے اعتبار سے جوش کا اسلوب زیادہ مرغوب ہے۔ بحیثیت مجموعی حیدرآباد سے جدید ادب کی ترجمانی کے اعتبار سے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں کتاب مصنف کی تصویر سے مزین ہے نام کی رعایت سے سرورق نہایت عمدہ ہے۔ قیمت قسم دوم تین روپے ضخامت ۱۶۰ صفحات قیمت مجموعے کو دیکھتے ہوئے یقیناً بہت زیادہ ہے۔

موت و حیات از شاطر حکیمی

نظموں کے اس مجموعے میں سی۔ پی کے ایک نوجوان شاعر کے جواں جذبات کا عکس ہے۔ جواں جذبات اس لئے کہ اس میں کسی پختہ فکری کے آثار کم ہیں۔ ان نظموں میں بھی جن میں اپنے ماحول کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے شاعرانہ انداز نظر کا عالم ہے جو جوش ملیح آبادی کی پیروی میں اختیار کیا گیا ہے اور جس میں مزدور کی زبوں حالی کے نقشے کھینچ کھینچ کر احساسات سے کھیلا جاتا تھا غزلوں میں البتہ پختگی ملتی ہے۔ بعض نظمیں زور بیان کی اچھی مثالیں ہیں۔ کتابت و طباعت کے اعتبار سے بھی کتاب خوب ہے قیمت دو روپے چار آنے پتہ ۔ سی۔ پی اردو اکاڈمی کراڈک روڈ ناگپور سٹی۔

ہمارا قائد از محمد احمد خاں ایم اے (عثمانیہ) ایل ایل بی (علیگ) ہندوستان کی سیاسی بیداری کی تاریخ میں ۱۹۰۶ء کا سال بہت اہم ہے جب مسلمانوں نے مسلم لیگ کے نام سے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک سیاسی جماعت قائم کی۔ اس جماعت میں ہر جماعت کی طرح کارآمد و بیکار عناصر شامل ہوتے رہے اور بالآخر اس نے ہندوستان بھر میں اپنی انفرادیت اور مقبولیت کا ڈنکا بجا دیا۔ اس بلندی تک پہنچنے کے لئے اس کو بہت سے مراحل طے کرنے پڑے اور ان مراحل کے لئے عزم و ہمت کی دعوت دینے والے رہنما آتے رہے اور مسلمانان ہند اپنے جمود و مستقبل سے گھبرا کر جاگتے رہے۔ ہمارا قائد میں مسلمانوں کے اس محبوب اور عظیم المرتبت رہنما کی زندگی پیش کی گئی ہے جو سیاسی طور پر پاکستان کا نقیب اور مدیح خواں تھا اور ذاتی طور پر علامہ اقبال کے مرد مومن کی تمام صفات کا حامل تھا اور جسے قائد ملت مولوی محمد بہادر خاں کے نام ہی سے یاد کیا جاتا ہے۔ دکنی حلقوں کے لئے اس کتاب کی اشد ضرورت تھی اور ہمیں امید ہے کہ مسلمانان ہند اس عالی مرتبہ رہنما کی زندگی سے درس لیں گے جو مرحوم کی بے وقت وفات کے باعث تشنۂ تکمیل رہ گیا ہے قیمت دو روپے۔ کتابت طباعت عمدہ۔ پتہ قائد ملت اکاڈمی حیدرآباد دکن)

ادب پارے از ضیاء الاسلام پی۔ سی۔ ایس

۳۴ مضامین کا یہ مجموعہ ریڈیائی تقاریر پر مشتمل ہے۔ بہ وجہ بندش وقت کے یہ مضامین اپنے موضوعات کا مکمل احاطہ کرنے سے قاصر ہیں یہ ضرور ہے کہ ان سے عالیشان تعمیریں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ اقبال کے کلام اور حضرت اصغر گونڈوی اچھے مضامین ہیں۔ ہماری شاعری کے تحت ۱۹۲۲ء کی انتخابی نظموں کا جائزہ بہت سرسری ہے اور اسی طرح کوئی مضمون بھی فی الواقع مکمل ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک مصنف کی نظر کا تعلق ہے ان مضامین سے آپ مائل بقدامت نظر آتے ہیں اور جدید اسالیب سے بدظن۔ انداز نگارش بہت اچھا اور سلیس ہے۔ ضخامت ۱۰۸ صفحات قیمت دو روپے جو یقیناً زیادہ ہے ملنے کا پتہ ۱۳ اسٹینلی روڈ، الہ آباد۔

سید منظور حسین بخاری پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۳۲ ریس کورس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

صرف سرورق ہاف ٹون پریس [illegible] لاہور میں چھپا

رجسٹرڈ ایل نمبر

قواعد

- "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۱ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۲ - مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے۔

۳ - دل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۴ - جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے بصورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے۔

۵ - "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتاً مل سکتا ہے۔

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پرچے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنے۔

مینیجر "ہمایوں"

۳۰ - لارنس روڈ - لاہور

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(غالب)

بیادگار علامہ فقیہ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
ماتحت ایڈیٹر: یوسف ظفر، بی۔ اے

فہرست مضامین

نمبر (۳)

ہمایوں بابت ماہ مارچ ۱۹۴۶ء

سالانہ چندہ ۸ معہ محصول | ششماہی ۴ | فی پرچہ ۸

بزمِ ہمایوں

آج کی محفل میں ہم ایک ایسی خبر لائے ہیں جو ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو کے لئے پنجاب گیر نعمت کی حامل ہے۔ اور اسی لئے بزمِ ہمایوں میں ہم آپ کو اس مسرت انگیز خبر پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ ہمارے محترم مدیر ہمایوں جناب میاں بشیر احمد صاحب پنجاب اسمبلی کے انتخابات کے سلسلے میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر حلقہ فیروزپور مشرقی سے کھڑے ہوئے تھے۔ آج کے اعلانات مظہر ہیں کہ وہ اپنے حریف کے مقابلے پر بھاری اکثریت سے منتخب ہو گئے ہیں۔ میاں صاحب قبلہ کی خدماتِ ادب کسی سے مخفی نہیں لیکن یہ موقعہ اُن کی گوناگون صفات اور "نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو" والی شخصیت سے متعلق باتیں کرنے کا نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اسمبلی کے ارکان اعزازات کے ساتھ ساتھ ایک کڑی ذمہ داری سے سرفراز کئے جاتے ہیں اور وہ ذمہ داری ملک اور قوم کی خدمت چاہتی ہے۔

جہاں تک اُردو کا تعلق ہے پنجاب یونیورسٹی اور دوسرے علمی ادارے ہوتے ہوتے اس سے رو گردانی کرتے جا رہے ہیں۔ اور پنجاب میں جو اہمیت اس کُل ہند زبان کو حاصل ہونی چاہئے تھی وہ بدقسمتی سے بعض اربابِ بست و کشاد کے ہاتھوں نہیں ہو سکی۔ مزید بدقسمتی یہ تھی کہ گذشتہ اسمبلی کا سرکردہ اور معتمد گروہ اُردو کُشی کر کے اپنے سیاسی اغراض کو پورا پورا کرتا رہا ہے۔ اور خدامِ اُردو کی آواز تک اُن کے کانوں میں نہیں پڑی۔ اب جبکہ ہمارے مجاہدِ ادب اور انجمن ترقیٔ اُردو پنجاب کے صدر جناب میاں صاحب رکن اسمبلی منتخب ہوئے ہیں ہمیں یقین ہے کہ اُردو کے حقوق کا تحفظ ہو گا۔ اور ہم حکومت کی اُردو فروشی کا شکوہ نہیں کریں گے۔ اُردو کا مسئلہ ہمارے لئے نہایت اہم ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ میاں صاحب کے لئے زیادہ ذاتی ہے اس لئے کہ اُن کی ع

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

۲۰ر فروری ۱۹۴۶ء

جہاں نما

ہمارا جدید تمدن

سر رلوسن جی سے واڈیا وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں : تمدن زندگی کی ایک ایسی شرط ہے جسے صرف انسان ہی پیدا کر سکا ہے۔ وہ انسان جو پروں کے بغیر اڑتا ہے، سمندروں پر تیرتا ہے، گنجہائے گراں مایہ کے حصول یا محض تجسس کی غرض سے زمین کے چاروں کھونٹ چھان مارتا ہے اور ایک ثانیے میں اپنا پیغام سرد مہر تک پہنچا دیتا ہے۔ حیوانوں کو ذہن سے کوئی خاص واسطہ نہیں اور وہ فقط حفظِ ذات کے نام پر زندگی کی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں۔ اُن کی حیات آج بھی اپنے اُنہیں محوروں کے گرد گھومتی ہے جن کے گرد اُن کے آب و جدِ حیاتِ انسانی سے پہلے گھوم چکے ہیں۔ تمدن ایک ایسا عمل ہے جو انسان کے ذہن سے وابستہ ہے۔ انسان کی سوچ حصول سے پہلے تجربے کی آرزو لئے تلاش کی وادیوں میں سرگرداں رہتی ہے۔ لیکن اس کے لئے صرف چابکدستی اور جستجو کی ضرورت نہیں۔ ان کے علاوہ اُس اضطراب کی ضرورت بھی ہے جو انسانی ذہن میں سلگتا رہتا ہے۔ ہماری آنکھیں اس خام مواد کی تلاش میں رہتی ہیں جو علم کی صورت میں ہمیں خارجی دنیا سے ملتا ہے اور جسے بعد میں ہمارا تجسس ذہنی تمدن کی پرورش کے لئے نئے قالب میں ڈھالتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تمدن کا مادی حصہ بیشتر صاحبِ ثروت لوگوں کو میسر آسکتا ہے۔ یہ قید بھی اب ہوتے ہوتے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سستے ذرائع آمد و رفت سستے ٹکٹوں اور خطوں اور سستی تعلیم نے روز بروز تمدن کی پیداوار کو ———— غریبوں کے لئے قابلِ حصول بنا دیا ہے آج ہر شخص اخبارات سے بیرونی دنیا سے متعلق رہ سکتا ہے۔ اس سے بھی ہم مطمئن نہیں اگرچہ ہم اپنے ماضی کے اُن مایوس کن ادوار کا جائزہ لے سکتے ہیں جنہوں نے زندگی کو ایک گورکھ دھندا بنا رکھا تھا۔ اور اس طرح اپنی بہتر حالت پر ناز کر سکتے ہیں۔

تمدن انسانی ترقی کی غیر مسلسل لیکن تدریجی تاریخ کا نام ہے اس لئے کہ یہ اس کشمکش کا نتیجہ ہے جو انسان کو اپنے ماحول سے کرنی پڑی ہے۔ اس کشمکش کے بعض ادوار ایسے ہیں جن میں انسان نے بہت سے احوال پر قابو پا لیا لیکن بعض ادوار میں پھر اپنی فطری کمزوریوں کے باعث عالمِ جمود میں جکڑا رہا۔ یونانیوں نے اگرچہ بجلی کے پنکھے اور ریڈیو ایجاد نہیں کئے لیکن زندگی ان چیزوں کے بغیر بھی ممکن ہے۔ انھوں نے ہمارے تمدن کے راستے پر ایسے خیالوں کے چراغ جلائے ہیں جو آج بھی سرد نہیں پڑے۔ یونانیوں نے فی الحقیقت ہمارے موجودہ تمدن کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اور اس طرح تمدن نے رومیوں، چینیوں اور عربوں کے ہاتھوں سے نکل کر یورپ کی سرزمین میں قدم رکھا۔ امریکہ میں پہنچ کر اس نے بردہ فروشی کی رسم کو ختم کیا۔ انگلستان میں پارلیمنٹری طرزِ حکومت کی بنیاد رکھی۔ فرانس کے انقلاب نے

عوام کی اہمیت کا اعتراف کرایا اور پھر مارکس کی تعلیمات کا سرچشمہ بنا۔ نئی دریافتوں نے کلوں اور مشینوں کی مدد سے ایک مشینی دَور کا آغاز کیا۔ یورپی انسان نے محنت و مشقت سے رہائی پاتے ہی دنیا پر حکومت کرنے کی ٹھانی اور مشرق و مغرب کی تمیز کو بالائے طاق رکھکر حکومتیں قائم کیں۔ وقت اور فاصلے کی پرانی اقداریں بے معنی ہو گئیں اور دنیا کے ممالک ایک مضبوط کڑی میں منسلک ہو گئے۔ بیسویں صدی کے آغاز نے ایک عالمگیر بیداری کا پیام دیا۔ پہلی جنگِ عظیم سے جرمنی، جاپان، ترکی، فرانس اور روس میں زندگی کی ایک برقی رَو دوڑ گئی اور اس کا نتیجہ ایک دوسری عالمگیر جنگ کا حامل ہوا۔ جوہری بم نے اس ہلاکت کے طوفان کو روکا۔ لیکن وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ جہاں اس بم میں موت کو روکنے کی صلاحیت ہے وہاں ایک ہی سانس میں حیاتِ کائنات کا ختم کرنے کا دَم خم بھی ہے۔ ہمارے سامنے یہی سوال ہے کہ کیا تمدّن کا یہ کارنامہ اُس کی موت کا باعث ہوگا یا اُسے ایک حیاتِ نو سے دوچار کرے گا۔

یہ اقدام ہلاکت خیز ہو یا سکون انگیز یہ حقیقت بہرصورت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ تمدّن کا مقصد سماجی امن ہے اور سماجی امن سے فنونِ لطیفہ، ادب اور سائنس کو ترویج حاصل ہوتی ہے۔ امن کی بدولت ہمیں فطرت کے بے شمار راز معلوم ہوئے ہیں لیکن ہم نے اِن رازوں کو امن کی تخریب کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہم نے آزادی اور امن کا مذاق اُڑایا ہے اور ہماری نفرت اور ذاتی عناد نے دنیا کو بے شمار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے جس کی بدولت دو قیامت خیز جنگیں یکے بعد دیگرے ظہور میں آئی ہیں اور تیسری کی اُبھرتی ہوئی آواز دُور سے سنائی دے رہی ہے۔ یہ بات آج کی دریافت نہیں کہ امن جنگ سے بہتر ہوتا ہے۔ لیکن نظر یہ آ رہا ہے کہ خود غرضی اور خون بہانے کی خواہش انسان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی اور انسان کی عقل اُس کی حرص کے تابع دنیا کو ایک مستقل میدانِ جنگ بنانا چاہتی ہے۔ ہماری تمام معلومات کا مقصد امن کو فروغ دینا ہے لیکن یہ فروغ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم برتری کو اخلاقی معیار پر جانچیں۔ ترقی کا مطلب یہ نہیں کہ ہمدردی اور اخلاقی فرائض کو پسِ پشت ڈال دیا جائے۔ یہ ہمارے بس میں ہے کہ ہم تمدّن کا رخ ہلاکت کی بجائے امن و سکون کی طرف موڑ دیں ــــ لیکن مروجہ رفتار سے اس کے امکانات کی اُمید فضول سی نظر آتی ہے۔

سر لومن جی سے۔ واڈیا کا یہ جائزہ بہت دُور رس حقائق پر مبنی ہے۔ جوہری بم کی دریافت آج ہوئی ہے لیکن علامہ اقبال رح کی برسوں پہلے کی پیشگوئی حیرت انگیز حد تک درست معلوم ہوتی ہے ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔

عورتوں کی تعلیم کا مستقبل

انسانی ذہن اپنی ہلاکت آفرینیوں کے باوجود مایوس نہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کو ختم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن اس نے تھکن کا احساس کئے بغیر تعمیراتِ نو کی طرف رُخ کر لیا ہے۔

کوئی ملک اُس وقت تک شاہراہِ تمدن پر نہیں چل سکتا جب تک اُس کی عورتیں مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں ہوتیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستان اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اس پر عمل پیرا نہیں ہو سکا۔ اس کا باعث کچھ سیاسی اور کچھ سماجی ہے لیکن اب ہمارا مستقبل اس ضمن میں کچھ زیادہ تاریک نہیں۔ آج ہم سے یہی تقاضا کیا جا رہا ہے کہ ہم اپنی بچیوں کو بھی تعلیم دیں۔

۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۳ء تک کے دس سال کا جائزہ اس امر کا شاہد ہے کہ ہندوستانی لڑکیوں نے دو فیصدی تعلیم حاصل کی ہے

آج بھی ساڑھے چار لاکھ شہریوں میں صرف چالیس ہزار لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ یہ تعداد بھی اپنی جگہ کم ہے۔ اور ہمیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مقصد ملازمت نہیں۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ہمارا قومی معیار بلند کیا جائے۔ آج کی بچیاں کل کی مائیں ہوں گی اور ان کی گود کو قسمت دنیا کی صف میں لانے کے لئے ہمیں لڑکیوں کو تعلیم دینے کی ضرورت کا احساس ہونا چاہیئے۔ قابل اور مناسب تعلیم یافتہ استانیوں کی کمی آج بھی بُری طرح کھٹکتی ہے اسی طرح طبی اداروں میں بھی عورتیں بہت کم ہیں۔ ہندوستان کی جہالت اور غربت کے باعث بے شمار امراض نے ہمیں گھیر رکھا ہے جن کے تدارک کے لئے عورتوں ہی کی مدد لازمی ہے۔

آج کی تعلیم یقیناً ناقص ہے اسے بہتر بنانے کی طرف متوجہ ہونا بھی اسی قدر ضروری ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کی تعلیم سے مختلف ہونی چاہیئے اس لئے کہ ان دونوں کے مقاصد جداگانہ ہیں۔ لڑکیوں کو جہاں معاشری اور خانگی تعلیم چاہیئے وہاں انہیں دکھاوے کی گرہ یا ضبط سے روکنا چاہیئے انہیں خانگی علوم سے بھی بہرہ ور کرنا لازمی ہے۔ خالص فنی تعلیم بیروزگاری اور مایوسی پیدا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی۔ محض کتابی علم سے اُن کو ذہنی قلابازیاں لگانے کی ترغیب دینا غیر فطری ہے جس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

بدقسمتی سے لڑکیوں کے لئے مناسب نصاب مقرر کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس پر غور کرنا ان حکومتوں کا کام ہے جن پر اس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے افادی پہلو لڑکیوں کی انفرادیت اور ذاتی ذوق کے پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ البتہ میٹرک تک حسب ذیل مضامین پر تعلیم کے سلسلے ضروری ہیں:-

۱- لسانیات۔ ۲- تاریخ و جغرافیہ۔ ۳- شہریت۔ ۴- خانہ داری۔ ۵- صحت عامہ۔ ۶- فرسٹ ایڈ۔
۷- بچوں کی نفسیات۔ ۸-

کالج کی تعلیم کے لئے ذیل کے مضامین کا اضافہ کیا جا سکتا ہے:-
۱- سائنس۔ ۲- جمالیات و اخلاقیات۔ ۳- مصوری۔ ۴- راگ۔ ۵- نفسیات۔ ۶- لسانیات۔ ۷- طبی تعلیم۔

یوسف ظفر

پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم

یہ اندوہناک خبر علمی اور ادبی حلقوں کے لئے انتہائی یاس انگیز ہے کہ ملک کے نامور اور مقتدر ادیب اور علامہ حافظ محمود شیرانی ۱۶ فروری کو کچھ مدت علیل رہ کر انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

حافظ صاحب کی علمی اور ادبی قابلیت کے اعتراف کا یہ موقعہ نہیں آپ کے ہزاروں تلامذہ اور بلند پایہ تصانیف اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ ہمیں آپ کے صاحبزادے حضرت اختر شیرانی اور دیگر متعلقین سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو اپنی جوار رحمت میں لے۔

ایک خط

جناب اڈیٹر صاحب "ہمایوں" لاہور

سالنامہ ہمایوں ۱۹۴۶ء میں ادیس احمد صاحب کا ایک مضمون چھپا ہے جو میرے اُس مضمون سے متعلق ہے جس کا عنوان تھا "اُردو کا جنم" اور جو ادب لطیف میں شائع ہوا تھا۔ پھر ادبی دُنیا اور کچھ دیگر رسائل و جرائد نے بھی اُسے شائع کیا۔ میں ادیس احمد صاحب کے منہ نہیں لگنا چاہتا نہ اُنہیں منہ لگانا چاہتا ہوں لیکن چونکہ اُن کی تحریر سے کچھ قارئین ہمایوں ممکن ہے دھوکے میں پڑ جائیں چند باتیں مختصراً عرض کئے دیتا ہوں۔

میں تاریخ اور جغرافیہ کا مولوی نہیں ہوں۔ میرا مضمون صرف اتنی بات بتلانے کے لئے لکھا گیا تھا کہ صوبہ بہار صوبہ متحدہ و دہلی کمشنری سے لے کر آدھا سی پی اور راجپوتانہ جسے بجا طور پر صوبہ ہندستان کہا جاتا ہے اور جہاں کے بسنے والوں کو ہمارے دیس کے اور خطوں کے رہنے والے ہندستانی کہتے ہیں ملک کے اس تمام حصہ میں مسلمانوں کے آنے کے پہلے سے ایک زبان بولی جاتی تھی جو بہ خفیف تغیر دس دس یا پانچ پانچ میل کے چھوٹے چھوٹے خطوں میں رائج تھی۔ سورداس کی برج بھاشا، ملک محمد جائسی کی اودھی میرا بائی کی راجستھانی۔ آلہا کے مصنف کی زبان بھوج پوری بولنے والوں کی زبان اور ایسی ہی کئی اور بولیاں ایک ہی زبان کی تھوڑی بہت مختلف شکلیں تھیں۔ آج اُردو کی جتنی لغتیں شائع ہوئی ہیں اُن کے پچاس ساٹھ ہزار الفاظ کی فہرست میں لگ بھگ اسی فیصدی ایسے الفاظ درج ہیں جن کے بعد قریب قریب ہر اُردو لغت میں توسین کے اندر حرف ہ لکھ دیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اُردو کے وہ اسی فیصدی الفاظ جو دیسی ہیں اُنہیں ہندی کا نام دیا گیا ہے۔ تو صوبہ ہندوستان کی زبان کو لسانی حقائق کی بنا پر اور تاریخی حقائق کی بنا پر آج اگر اُردو لغت نویسوں کے بیان کے مطابق ہندی کہا جائے تو کون بڑی بدعت ہوئی البتہ میں نے خود اپنے مضمون میں اس کا اعتراف کیا تھا کہ صوبہ ہندستان کی ایک زبان کی مختلف شکلوں میں سے ایک شکل جو دِلّی کے اطراف میں رائج تھی اُسے چُن کر اُردو ادیبوں نے جو اُردو ادب تیار کیا اور فارسی، عربی الفاظ کا بیشبہا اضافہ کرکے جو رچی ہوئی اُردو زبان بنائی وہ کئی لحاظ سے نہایت شیریں اور خوبصورت زبان ہے۔ اس زبان کا نام اُردو ہو ہندی ہو یا ہندستانی ہو میں اس بحث میں پڑا ہی نہیں۔ اُردو بنام ہندی یا سنسکرت بنام عربی فارسی میرے مضمون کا موضوع ہی نہ تھا۔ اب اگر کوئی چاہے تو بجائے میری اصلاح کرنے کے تمام رائج اُردو لغتوں کی اصلاح کرے جن کے چالیس ہزار الفاظ یا [illegible] فیصدی الفاظ کے سامنے حرف ہ لکھا ہوا ہے جس کے معنی ہیں ہندی۔ ایسے الفاظ کے آگے میری اصلاح کرنے والے یا تو لفظ "پالی یا پراکرت یا راجستھانی یا برج بھاشا یا مگدھی یا بھوج پوری یا اودھی یا بہاری" جو لفظ مناسب سمجھیں اُردو کی لغتوں میں شائع کرائیں۔ ایسے حضرات کو مجھ سے اُلجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۲۔ میرے مضمون میں اُردو دشمنی کوئی دور سے بھی دریافت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کے رسالے مثلاً ادب لطیف ادبی دُنیا اور دیگر رسائل و جرائد نہ تو اُسے چھاپتے اور نہ اُس پر اعتراض کرنے سے باز آتے۔ ہندستان کے

ں کروڑ مسلمان اور اُن کے رسالے اتنے بھی نہیں ہیں کہ تُم اُردو پر کھلی ہوئی یا چھپی ہوئی چوٹ کرنے والا کو احساس نہ ہو

۴۔ میں نے اپنے مضمون میں ایک بہت کھلی ہوئی یا چھپی ہوئی حقیقت کا ذکر کیا تھا وہ یہ کہ ہندوستان کے نو دس کروڑ مسلمانوں میں آٹھ نو کا
ر چھوڑ کر سب کے ماں باپ پہلے ہندو ہی تھے اور انہیں اپنے خطے کی زبانیں بولتے تھے مسلمان ہونے کے بعد بھی بولتے ہیں۔ اس ملک پر مسلمانوں کے کتنے ہی حملے ہوئے
ہوں اور مسلمانوں کی کتنی ہی قومیں آئی ہوں لیکن شروع سے آج تک باہر سے آنے والے مسلمانوں کی کل تعداد چند لاکھ سے زیادہ منوائی نہیں جا سکتی۔ عورتیں
ان میں بھی عورتیں نہ ہونے کے برابر تھیں اس لئے مٹھی بھر باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کی اوری زبان عربی یا فارسی، ترکی یا پشتو رہی ہو لیکن یہاں کے
مسلمانوں کی بڑی اکثریت نہ تو بیرونی مسلمانوں کی نسل سے ہے اور نہ اُن کی زبان کوئی بیرونی زبان ہے۔ آج بھی ہمارے وطن مسلمانوں کی اکثریت
کی زبان یا بولی اُردو نہیں ہے بلکہ بنگالی یا پنجابی ہے یا سندھی ہے۔ لیکن ان باتوں کو کہہ کر میں نے مسلمانوں یا اُردو زبان کے متعلق کون سا مخالفانہ
کام کیا یا اُردو کے مفاد کو صدمہ پہنچایا۔ اسے صرف وہ آدمی مانے گا جس کا دماغ پھر گیا ہو یا جسے میں اپنی اصطلاح میں گھامڑ کہتا ہوں۔ دُنیا بھر کے
مسلمانوں کے باپ دادا آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کافر تھے یا غیر مسلم تھے ایسا کہنے میں تو اسلام کی شان ظاہر ہوتی ہے نہ کہ اسلام کی توہین
اچھا مسلمان ہونے کے لئے یہ کب ضروری ہے کہ اپنی ولدیت سے انکار کیا جائے۔ اور نہ اُردو کی حمایت کیلئے یہ ضروری ہے کہ اُردو کو حرف
یا اُردو کی ولدیت سے انکار کیا جائے۔

یہ میرے مضمون میں میری بے خیالی کی وجہ سے ایک غلطی ضرور آ گئی تھی کہ سندھ سے پنجاب کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اسلامی فوج کے راستے
میں بہاولنگر اور گجرات کو بھی بتا دیا تھا۔ میں جغرافیہ میں ہمیشہ کمزور رہا ہوں جس طرح کئی اور کاموں سے بھی نابلد ہوں۔ اچھے ہوتے کہ نشاندہی کر کے
کی آپ درستی لکھنا۔

۵۔ ایک بات اور تہذیب اور کلچر، علوم و فنون، زبان و ادب کے معاملات میں بھی ہمیں جمہوریت کے اصول کی پابندی لازم ہے اس
ملک میں ہر خیال کے افراد و جماعتوں کو رہنے کا حق ہے۔ رایوں کے اختلاف و تصادم سے قومیں بنتی ہیں اس لئے اُردو کے حامی ہندی کے
حامیوں کی باتیں سُن لیا کریں اور دونوں مل کر کبھی کبھی ہندستانی کے حامیوں کی باتیں سُن لیا کریں تو اس سے ہر ایک کا فائدہ ہوگا۔ میرا ذاتی
خیال تو یہ ہے کہ ملکی اور قومی زبان میں لغت تو وہی استعمال ہوگی جس کے اسی فیصدی الفاظ کو اُردو لغت والے حرف ہ کہہ
دیتے ہیں اور جنہیں ٹھیٹھ، تدبھو اور دیگر کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک فقروں کی ساخت کا تعلق ہے یا
اسالیبِ بیان کے سانچوں کا تعلق ہے یہ ملکی زبان کھڑی بولی یا اطراف دِلّی کی بولی یا پچھائیں ہندی ہوگی جس کی سب
سے ترقی یافتہ اُردو ادب میں نظر آتی ہے۔ البتہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس قومی زبان میں جس کی لغت چالیس ہزار ہندی
الفاظ اور دس بارہ ہزار عربی فارسی الفاظ اور کچھ دیگر زبانوں کے الفاظ سے مرتب ہوئی ہے اس میں دو ڈھائی ہزار ایسے
سنسکرت الفاظ بھی ضرور آ جائیں گے جو اس قومی زبان کے موجودہ الفاظ سے ہم آہنگ ہوں اور جو اس کی صوتیات
میں خوش آہنگی کا اضافہ کریں گے۔ لیکن اگر کسی کو میری اس رائے سے اختلاف ہے تو طرفین کو اس کی ضرورت نہیں
کہ ایک دوسرے کے سر اُردو دشمنی یا تعصب کے الفاظ منڈھیں ایسا صرف ایک جاہل آدمی کر سکتا ہے۔ اختلاف
رائے کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں کہ لہجہ میں گندگی یا بدتمیزی پیدا کی جائے۔

فراق گورکھپوری

رباعیات

(۱)

ہر چند کہ اک عمر کا آزاری تھا
دکھ درد کے سہنے سے نہیں عاری تھا
دل بیٹھ گیا تو یوں سمجھ لو کہ یہ بوجھ
مزدور کی طاقت سے بہت بھاری تھا

(۲)

جس وقت کا ڈر تھا وہ شتاب آپہنچا
ہنگام رحیل دو پاترا اب آپہونچا
جاگو! جاگو! کہ حشر تک سونا ہے
چونکو چونکو کہ وقت خواب آپہونچا

(۳)

یہ شرک ہے خود شرک کی تردید کیا
واحد ہے وہ ذات اس کی تائید کہا
مایا کے علاوہ روح پھر ذاتِ احد
تینوں ہی قدیم ہیں تو توحید کہا

(۴)

کیا لطفِ تخاطب نہ تکلم نکلا
بیکار تلطّف و تبسم نکلا
عشاق پھر اے شاد کہیں کے نہ رہے
اندھیر ہے گر صرف توہم نکلا

(۵)

لا کر مجھے دنیا میں جو مہمان کیا
کیا کچھ نہیں میرے لئے سامان کیا
طاعت پہ نہ بخشا کہ وہ مزدوری تھی
یوں بخش دیا تو اور احسان کیا

(۶)

بھولا نہیں رنج و غم کے کھانے کا مزا
پوچھے کوئی مجھ سے اس فسانے کا مزا
کھلوا نہ زباں اپنی اے ذوقِ سلیم
چکھا ہے بہت دل نے زمانے کا مزا

(۷)

تھی جس کی تلاش وہ صلا کچھ نہ ملا
اس کام میں حسرت کے سوا کچھ نہ ملا
چالیس برس بعد ریاضت کا ثمر
چکھا تو بھی مگر مزہ کچھ نہ ملا

(۸)

کیونکر نہ رہے غمِ جوانی تیرا
دنیا میں بتا کون ہے ثانی تیرا
ہم لے کے عصا دور تلک ڈھونڈ آئے
کوسوں نہیں نام اے جوانی تیرا

(۹)

گھر قبر بنے اب وہ محل آ پہونچا
ہوشیار کہ پیغامِ اجل آ پہونچا
لے کر خطِ شوق چل چکا ہے قاصد
پہونچا نہ اگر آج تو کل آ پہونچا

(۱۰)

بیہوش تھے ہر وقت کہ ہوش آیا تھا
یا ذوقِ بقا نے خواب دکھلایا تھا
کل پھر تو سلا دے گی اسی نیند اے عمر
جس نیند سے تو نے آج چونکایا تھا

(۱۱)

جب تک ہے یہ جسم ایک گرفتاری ہے
جب روح جدا ہوئی سبکساری ہے
جینا کہتے ہیں جس کو ہے خوابِ گراں
مرنا کیا شے ہے عینِ بیداری ہے

شاد عظیم آبادی (مرحوم)

کلکتہ

جو لغزش ساری عمر کبھی نہ ہوئی تھی۔ آخر کلکتہ میں ہوئی ہے۔ ہر روز باقاعدہ دو چار میل پا پیادہ پھر لیتا ہوں۔ کلکتے کی شاہراہیں کشادہ ہیں مگر دلفریب نہیں۔ سڑک کے کنارے کی پٹڑیوں پر ہجوم در ہجوم پاؤں پاؤں چلنے والے اور سڑک پر موٹریں، لاریاں، ٹریم نتیجہ شور، پٹرول کی بُو، دھکے، جیب سے بٹوے کے غائب ہونے کا ڈر اور اگر سڑک پار کرنی ہو تو یہ خوف کہ کسی فوجی لاری سے ملاقات نہ ہو جائے۔

غالب مرحوم نے لکھا تھا ع

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

کسے معلوم نہیں کہ کلکتہ سے انہیں دیسی دلبستگی تھی۔ جس کی جھلک مرزا داغ کی فریاد داغ میں ہے۔ دلی کے یہ دونوں استاد اگر آج کل کے امریکی فوجیوں کو دیکھتے تو دل سے داد دیتے۔ امریکی فوجی بڑے حضرت ہیں اور اگر انہیں کوئی یہ بتادے کہ وہ غالب مرحوم اور مرزا داغ مرحوم کے نقش قدم چل رہے ہیں تو اترا تے نہ سمائیں۔

سڑک نوردی کا پہلا بُرا اثر تو یہ ہے کہ واقعات کو زمین کی نگاہ سے دیکھنے لگ گیا ہوں۔ چار دن کا واقعہ ہے کہ مسلم لیگ نے کلکتہ کے وسیع میدان میں انتخابات میں شاندار کامیابی کے متعلق ایک جلسہ کیا۔ لاکھوں مسلمان جمع تھے۔ میلوں لمبے جلوس گھنٹوں سڑکوں پر سے گذرے۔ جس فوجی کو جلدی سے گذرنا ہو وہ پاکستان پاکستان کا نعرہ لگا دیتا۔ رستہ مل جاتا۔ جوش خروش کی انتہا نہ تھی۔ اسی دن خبر آئی تھی کہ جناب جی ایم سید نے مرکزی لیگ حکومت سے بغاوت کی ٹھان لی ہے۔ مگر بنگالی جوش کی یہ کیفیت ہے کہ لیگ کی خاطر سینکڑوں جی ایم سید قربان کردیں۔ یہاں تو سر علیم غزنوی جیسوں کی ضمانتیں ضبط ہو رہی ہیں۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ قائداعظم اگر حکم دیں تو کاٹھ کے اُلو کو ووٹ دے دیں مگر لیگ کے مخالف کا مُنہ نہ دیکھیں۔ یہ ذکر صرف اس لئے کیا ہے کہ مسلمان دلی اور کلکتہ کا فرق سمجھ لیں۔ وہاں جناب آصف کا زور ہنومان جی کی فوج کے بھروسے پر ہے۔ یہاں صرف اللہ کا نام ہے۔

وہ بڑی بڑی پختہ کشادہ قبریں اور تنگ تاریک کچی قبریں جنہیں غلط العام میں محل اور جھونپڑے کہا جاتا ہے۔ کلکتہ میں عام ہیں۔ دونوں ہی لوگ دفن ہیں۔ امیر غریب ایک جیسے دفن ہیں۔ انہیں محض مغالطہ

ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ کھاتے پیتے ضرور ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں مگر جہاں تک

زندگی

کا تعلق ہے اکثر محروم ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ ناچتے کودتے نہیں۔ بہت کچھ کرتے ہیں یعنی جلسے کرتے ہیں تقریریں سنتے ہیں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کو لاکھوں نقد پیش کرتے ہیں مگر یہ سب کچھ کر کرا کے کورے کے کورے ہیں۔ کیا مارواڑی کیا پنجابی اور کیا بنگالی ننانوے کے پھیر میں گرفتار ہیں۔ ان کی جبین نیاز میں لاکھوں سجدے ہیں مگر معبود صرف ایک ہے اور وہ ہے۔

روپیہ

امریکہ یونہی بدنام ہے کہ (Almighty) ڈالر کا پرستار ہے۔ کلکتہ اس معنے میں New York سے ہرگز پیچھے نہیں۔ گویا ترقی کے آثار یہاں بھی نمایاں ہیں۔ بالخصوص اس معنے میں کہ سب کا مذہب یہ ہے انسانیت ہو نہ ہو روپیہ ضرور ہے۔

غالباً اخلاق جلالی میں پڑھا تھا کہ نماز کی عبادت صرف انسانوں تک محدود نہیں درخت دائمی قیام میں ہیں، چوپائے دائمی رکوع میں ہیں۔ یہ نظریہ غالباً صحیح ہے گو چوپاؤں اور درختوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے معلوم کرنا مشکل ہے۔ کلکتہ میں بعض درخت بہت خوبصورت ہیں۔ ایک قسم جو یہاں کے گرجے کے میدان میں ہے، بہت دلکش ہے۔ عیسائی گرجے کے اندر خدا کی تلاش میں سراسیمہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ درخت گرجے کے باہر خدائی بخشش کا اشتہار ہیں۔ صاف کہہ رہے ہیں کہ خدا چھت کے نیچے نہیں چھپتا۔ غالباً ان درختوں کی طفیل کلکتہ بم باری سے بچ گیا۔ قدرت نے کلکتہ کے درختوں کو انسانوں پر ترجیح دی۔

فلک پیما

اُس کی ماں

کردار

پرمیشوری — کرپی
بلدیو — سرجیت

مقام :- مالوہ کا ایک گاؤں

منظر

بہت معمولی قسم کا ایک باورچی خانہ۔ پرمیشوری کھانے پکانے میں لگی ہے ساٹھ سال کی بوڑھی ٹھگنی ہے چہرے پر جھریاں ہیں گوشت لٹک گیا ہے۔ کانوں کے پاس دونوں طرف سفید بال ہیں مٹھی بھر لکڑیاں لے کر چولھے میں جھونکتی ہے۔

اس کے پاس ہی اس کی لڑکی کرپی بیٹھی گوار کی پھلیاں کتر رہی ہے۔ ڈیل ڈول پتلا دبلا ہے چہرہ فکرمند۔ عمر کے لحاظ سے نہ جوان ہے نہ بوڑھی۔

بائیں طرف مٹی کی دو ٹھلیاں پڑی ہیں۔ پرمیشوری کے پاس کانسی کا ایک پیالہ اور پرات پڑے ہیں پرات میں گندھا ہوا آٹا ہے ایک چمٹا بھی پاس دھرا ہے۔ ایک گول پیالی میں گھی رکھا ہے۔

پچھلی دیوار کے ساتھ لکڑی کے ایک تختے پر کانسی پیتل کے برتن سجے ہیں۔ دائیں ہاتھ ایک دروازہ ہے جس کے کواڑ موٹی کھردری لکڑی کے ہیں۔ دیواروں پر گائے کے گوبر کا لیپ ہے۔ چولھے کے اوپر دیوار پر دھوئیں کی کلونس جمی ہے۔

پرمیشوری۔ (روٹی کا پیڑا بناتے ہوئے) اب جلدی کر پھلیاں کتر بنا کر۔ کہ دو نوالے کھا لے۔ اندھیرا ہوا چاہتا ہے۔

کرپی۔ اچھا ماں۔

(کرپی پھرتی سے پھلیاں کاٹنے لگتی ہے۔ پرمیشوری چپاتیاں پکاتی ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے

بلدیو داخل ہوتا ہے)

پرمیشوری۔ (گردن اٹھا کر ہاتھ سے پسینہ پونچھتے ہوئے) میں صدقے گئی میرے لال تو کب آیا؟

بلدیو۔ کل رات ہی آیا ہوں جی۔

پرمیشوری۔ لاہور سے؟

بلدیو۔ ہاں

پرمیشوری۔ کہیں پکی نوکری ملی؟

بلدیو۔ آپ کی دعا سے اب تو بنک میں پکا نوکر ہوں۔

پرمیشوری۔ بھاگوان نے بڑی کرپا کی۔ تیری محنت ٹھکانے لگی۔ دس سال دن رات ایک کئے تھے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا۔ نہ سونے کی فکر جب دیکھو کتابوں سے لپٹا رہتا تھا۔ آخر بھگوان نے تیری سن لی۔

پرماتما انہیں عمر دے سدا ٹھنڈے رہیں۔

پرمیشوری۔ ہاں بیٹی سدا سکھی رہیں (نوے پر چپاتی ڈالتے ہوئے) لیکن ابھی کل ہی کی بات ہے جب بیرو کا لڑکا لاٹھی لے کر تیرے باپ پر چڑھ دوڑا۔ اجمیر پاس بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔ لیکن ٹس سے مس نہ ہوا ——— میں کہتی ہوں میرے لڑکوں کا خون ایسا سفید کیوں ہو گیا ۔

بلدیو۔ نہ ایسا نہیں چچی۔ وہ تو ایسا نہیں ———

پرمیشوری ۔ نہ پوچھ بیٹا۔ کس کو روؤں اور کس کو نہ روؤں ۔ سبھی لڑکے گئے گذرے ہوئے۔ بوڑھے ماں باپ کی بات پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اس چولہے میں اُپلے جلا جلا کر میری آنکھیں ابل آئیں ——— ایک دن میں نے اجمیر سے کہا بیٹا میری آنکھیں خراب رہتی ہیں ذرا تو ساتھ ہو کر گاؤں کے ڈاکٹر کو دکھا لا۔ لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی اور بھسکڑا مار کر بیٹھا رہا۔

بلدیو۔ چچی اب تمہاری آنکھیں کیسی ہیں ؟

پرمیشوری۔ کیسی ہوں گی بیٹا۔ دوا دارو کے بغیر بھی کہیں روگ جاتا ہے ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھوں تو دھوئیں سے کھوپری ہوا میں اڑنے لگتی ہے ——— پچھلے مہینے ایک سرکاری ڈاکٹر گاؤں میں آیا تھا۔ بڑے تالاب کے کنارے اس کا تنبو تھا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے، مرد عورتیں سبھی اس کے علاج سے ٹھیک ہو گئے۔ ایک میں جنم جلی ایسی ہوں۔ کہ وہاں نہ گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں تک جاتے میرے لڑکوں کی مہندی گھستی تھی ——— میں بوڑھی بے سہارا لاچار ابھی کو چولہے میں اپنا مردہ کہاں خراب کرتی ——— میری سدھ بدھ کون لیتا ہے۔

بلدیو۔ چنتا نہ کرو چچی۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا ۔

پرمیشوری۔ آہ بیٹا ۔ اندھے کنوئیں میں ڈول پھینکنے سے کیا حاصل ——— اب تو ڈاکٹر کب کا جا چکا۔

بلدیو ——— تو پھر؟

پرمیشوری۔ ایک دفعہ میں ساتھ کے قصبے گئی۔ وہاں کے ڈاکٹر نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ دیا۔ صندوق میں رکھا ہے ان آنکھوں میں لگانا (کرپی سے) ذری لا تو وہ کاغذ اور شیشی۔

کرپی۔ کاغذ تو اندر صندوق میں رکھا ہے ماں۔

پرمیشوری۔ میں لائی بیٹا۔ دیکھنا تو شیشی میں ذرا بھی پانی ہے۔ یا سب بہہ گیا (دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتی ہے) اُف مر گیا۔

(جاتی ہے)

کرپی۔ بھیا جب تم یہاں آتے ہو تو ہماری سڑیل گلیاں میں رونق آ جاتی ہے۔ مجھے سر ہیت اتنا پیارا نہیں۔ جتنے تم ہو۔

بلدیو۔ میں بچپن کے دن کیسے بھول سکتا ہوں۔ ان کی یاد ہے۔ ہم اسی گن میں کنکر کنڈیاں سے کھیلا کرتے تھے۔ میں اور اجمیر ——— تم بھی کھیلنے کو گول گول پتھر دیتیں۔ کھانے کو طرح طرح کی چیزیں ——— کبھی آلو کا بھرتا اور کبھی باجرے کی روٹیوں کا حلوا۔

کرپی ۔ ہاں وہ دن بڑے سہانے تھے۔ اب لوٹ کر نہیں آئیں گے ——— اب تو ہر کوئی اپنے اپنے دھندوں میں لگا ہے میں اپنے گھر بار کی کیچڑ میں پھنسی ہوئی ہوں۔ بھائی الگ گھر بسائے ہوئے ہیں ——— ماں باپ یہاں بیٹھے ہیں وہ پرانی باتیں اب کہاں۔ یہاں آنے کو جی تو بہت چاہتا ہے۔ لیکن کس کے بستے پر آؤں۔

پرمیشوری۔ (اندر سے) وہ کاغذ کہاں رکھا ہے مجھے تو اس میں ملتا نہیں۔

کرپی ۔ اماں پیلے ٹرنک کے اوپر جو ٹھلیا رکھی ہے اس میں ———

بلدیو۔ اجمیر تو سمجھدار حوصلے والا آدمی تھا۔ وہ کیوں کر لڑ پڑا

کرپی۔ بھائی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ ایسی باتیں جھگڑتے ہیں۔ میرا اب تو پہلے ہی تنگ ہو چکا تھا۔ اب کے کئی تو دیکھا کر سنبھالا گیا غائب ہے۔

(پرمیشوری آتی ہے)

کرپی۔ (ایک دروازے سے جھانکتے ہوئے) ماں۔ آندھی پھر گئی۔ برگد کا درخت ملکورے کھا رہا ہے۔ سندر کا چھپر تنکا تنکا ہو کر اڑ گیا۔ ہوا بہت تیز ہے!

پرمیشوری۔ لیکن سرجیت ابھی تک نہیں آیا۔ پرماتما خیر کرے ایک دفعہ باہر نکل جائے تو پہر رات گئے سے ادھر نہیں لوٹتا۔

کرپی۔ ماں سرجیت ابھی آیا کہ آیا ——— آخر بچہ نہیں۔

پرمیشوری۔ یہی تو مشکل ہے۔ وہ بچہ نہیں۔ سانڈ کی طرح پلا ہوا ہٹا کٹا مسٹنڈا ہے۔ دن رات مجھے دق کرنے کے سوا اُسے کام ہی نہیں۔

(کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے)

کرپی۔ لے وہ آگیا۔

(کتے کی آواز قریب ہو جاتی ہے۔ دروازے پر دستک)

پرمیشوری۔ وہی ہے کھٹکا اٹھا دو۔

(کرپی دروازہ کھولتی ہے۔ کتا اندر آتا ہے۔ اُس کے پیچھے سرجیت داخل ہوتا ہے۔ ہوا سر لٹے سے وہی ہے سرجیت بارش سے بھیگا ہوا اور دلدل سے لت پت ہے)

سرجیت۔ (سانس پھولی ہوئی ہے) ایک بھینس ادھر تو نہیں آئی؟

کرپی۔ نہیں تو ——— کیوں

سرجیت۔ جب میں تالاب میں بھینسوں کو نہلا رہا تھا۔ ایکا ایک مینہ آندھی کا طوفان اُٹھا۔ زمین کی ریت ہوا میں اڑنے لگی۔ اور چاروں طرف ایسا اندھیرا ہوا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جب طوفان تھما اور میں تالاب میں سے باہر آیا۔ تو دیکھا کہ ایک بھینس غائب ہے بس اب دو ہی ہانکے آرہا ہوں۔

کرپی۔ اور تیسری؟

سرجیت۔ ہاں تیسری سفید کھروں والی نہ جانے کہاں ہے بہت تلاش کی۔ لیکن نہیں ملی۔

پرمیشوری۔ (بھڑک کر) میں نہ کہتی تھی۔ کہ بھینس چھوڑ کے کہیں جوئے میں لگا ہوگا۔ میں تو اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔

سرجیت۔ جوا کیسا؟ سارا تالاب تو بھائیں بھائیں کر رہا ہے نہ آدم نہ آدم زاد۔ میں جی جان سے اپنے کام میں لگا تھا۔ خوب مل مل کر بھینسوں کو نہلا رہا تھا۔ کہ اتنے میں طوفان اٹھا ———

پرمیشوری۔ کلموہے جھوٹ کیوں بولتا ہے؟ کام کی ایسی لگی تھی (کتے کی طرف اشارہ کرکے) تو اس کو کیوں لے گیا تھا اپنے ساتھ؟

کرپی۔ جانے بھی دے ماں۔ آخر وہ آگیا ہے (سرجیت سے) بھیا وقت سے گھر آجایا کر۔ ماں پریشان تھی۔

سرجیت۔ ماں تو ہر وقت پریشان رہتی ہے۔ میں کہیں مرا تو نہیں جاتا۔ دو ہاتھ پر تالاب ہے۔ وہیں گیا تھا۔

پرمیشوری۔ منہ کو لگام دے ملیچھ۔ جب سُنو کھپنے کی باتیں کرتا ہے ——— ڈراتا ہے مجھے ———

کرپی۔ آہ۔ ماں بھیا بھوکا ہے۔ اسے کھانا دو۔

پرمیشوری۔ ہونہہ بھوکا ہے۔ اسے بھوک کہاں سے آئی۔ کھیتوں میں سے بہت کچھ کھا مُلس آیا ہوگا۔

سرجیت۔ (سسک کر) ہاں بہت کچھ کھا آیا ہوں۔

پرمیشوری۔ اگر کچھ ہوش ہوتی تو میری بھینس کیوں گم کر آتے۔ کیسی اچھی تھی میری بھینس۔ اس کے سینگ کے کنڈل میں سے ایک پیسہ بھی نہ گزر سکتا تھا۔ تھن ایسے بڑے بڑے اور دودھ سے بھرے ہوئے کہ زمین پر کھچے جاتے تھے۔ یہ جنگلی نہ جانے اُسے کہاں چھوڑ

سرجیت۔ تیرا کیا خیال ہے کہ میں جان بوجھ کر اُسے کھو آیا

پرمیشوری۔ اور نہیں تو کیا ——— اچھا اب ٹرٹر نہ کر ایک تو قصور کیا اوپر سے آنکھیں دکھاتا ہے۔ آہ

دن ایک نہ ایک چیز کھوتا ہے۔ جیسے گھر کی چیز دل سے بَیر ہو ــــ بس ایک کتا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ساتھ رکھتا ہے۔ پر تو کم نہیں ہوتا۔

سرجیت۔ ماں تُو تو ہر وقت کاٹنے کو آتی ہے ــــ جب دیکھو آنکھیں لال پیلی۔ تیوری چڑھی ہوئی۔ سیدھے بھاؤ سے بات کرنا آتا ہی نہیں ــــ میں پوچھتا ہوں۔ یہ کتا تجھے کیا کہتا ہے؟ لاکھ سو سو کام کرتا ہے۔ سارا سال کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ تو اسے کیا کھلاتی ہے۔ ایک سوکھے سڑے ٹکڑے کی بھی کوئی اصل ہے۔ تجھے تو وہ بھی بھاری ہے۔

پرمیشوری۔ اور وہ جو بھرا کٹورا دودھ سڑپ جاتا ہے۔

سرجیت۔ وہ میرے حصّے کا پیتا ہے۔

پرمیشوری۔ (دونوں ہاتھ اٹھا کر) پرماتما کی پھٹکار تجھ پر۔ تیری زبان ہے کہ کترنی۔ دوسرے لڑکے تو ایسے نہ تھے۔ وہ کیسے بھی تھے۔ کہے سُنے کی سہار ضرور رکھتے تھے۔ لیکن تُو تو بات بات پر منہ نوچتا ہے۔

سرجیت۔ اب ہم تیرے جیسی سڑن اور دیوانی ماں کا کیا کروں جو بات بات پر کپڑے سے باہر ہوتی ہے

پرمیشوری۔ مجھے دیوانی کہتے۔ منہ کھولتے تجھے شرم نہیں آتی ــــ میں تیری ماں ہوں ماں ــــ

سرجیت۔ تجھے سڑن اور دیوانی نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ میں صبح سے جی ہلکان کر رہا ہوں۔ پہلے دوپہر کی جلتی دھوپ میں باپو کا کھانا لے کر گیا۔ پھر بڑھئی سے ہل کی مرمت کروائی۔ پھر ــــ

پرمیشوری۔ سارے تو کسی کام کے اہل ہے بھی؟ ــــ آج ایک بھینس گم کر دی کل دوسری چلتی کرے گا کیسی کڑیل بھینس تھی۔ ہاتھی سا ڈول۔ نہ جانے کسی کو دے آیا۔

سرجیت۔ ہاں میں اُسے دے آیا۔ جان بوجھ کر دے آیا۔

پرمیشوری۔ اور کیا! گھر کے تیرے ہی جیسا نرم ہو۔ تو ایسی بھینس پالنی کرے ــــ تیرے ایسوں کا یہی علاج ہے۔

سرجیت۔ اب کون سی کسر چھوڑی ہے۔ تو نے!

کرنی۔ چھوڑ ماں، ابھی آندھی تھم جائے گی، پھر ہم بھینس ڈھونڈ لیں گے۔

پرمیشوری۔ میں کہتی ہوں آندھی میں کتا کیوں نہ کھو آیا۔ بھینس ہی کیوں گئی۔ یہ سب اس کی کارستانی ہے۔ کام چور۔ ہٹا کٹا ہو گیا۔ لیکن کہیں کود کا تنکا نہیں گیا۔ میں بھی دو چار روز اور دیکھوں گی۔ پھر اس کتے کو نہ گھر سے باہر گھسیٹ پھینکوں۔

سرجیت۔ (کتے کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے) تو اسے ہاتھ تو لگا دیکھ کیا کرتا ہوں۔

کرنی۔ (منت سماجت سے) بھائی، مرے لال، جانے دے ماں تو یوں ہی کہتی ہے۔ اُس کی باتوں پر نہ جا۔ کتے کو چھوڑ اور ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا ــــ یہ چپاتیاں دھری ہیں۔ اور یہ تلی ہوئی پھلیاں۔

سرجیت۔ نہیں کرنی، میں اس گھر میں نہیں رہوں گا ــــ جب دیکھو اس کا مزاج ٹھکانے نہیں۔ اٹھتے بیٹھتے پھنکارتی ہے۔ زندگی اجیرن کر دی۔

کرنی۔ کیا کہہ رہا ہے۔ بھیا۔ میں پانی لائی تو ہاتھ منہ دھو دیکھ تو آندھی مینہ سے کیا حال ہو رہا ہے۔

(سرجیت بیٹھ جاتا ہے)

پرمیشوری۔ (کرنی سے) بس اسی لاڈ چونچلوں نے تو اسے لگاڑ دیا۔ جاتا ہے تو جائے میری بلا سے۔ میں ان سانڈوں کو چمکارتی رہی ــــ میرے جنے مجھ پر ہی آنکھیں نکالتے ہیں۔ ہے ہے کل جگ ــــ میں سمجھی تھی۔ یہ لڑکا ڈھب کا ہے۔ لیکن یہ تو ان سے بھی گیا گزرا۔ تینوں لڑکے ایک ہی پڑاوے کی اینٹیں ہیں۔ سب کو ایک سی آنچ لگی ہے۔ ایک تو قصور کیا

اوپر سے لال پیلے دیئے دکھاتا ہے

سرجیت۔ (رُوٹھتے ہوئے) اگر تو یوں سمجھتی ہے تو یوں ہی سہی آج کے بعد میں اِس گھر کی چوکھٹ نہ دیکھوں گا

کرپی۔ تو سچ مچ پاگل ہے (ماں سے) ماں اسے روک تیری زبان تو زہر اگلتی ہے۔ پہلے دو لڑکے گئے۔ اب تیسرا بھی جاتا ہے۔ ماں اسے روک، اسے روک۔

پرمیشوری (ناک بھوں چڑھا کر) جہاں دو گئے۔ وہاں تیسرا بھی جائے یہ تو بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔ آج نہ گیا کل جائیگا۔ میں تو اس کے ارادے پہلے سے جانتی تھی جب ایک لڑکا جوا کھیلنے اور شراب پینے لگ جائے تو پھر گھر کا نہیں رہتا۔

سرجیت (لال پیلا ہو کر) ہاں میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ میں سو بار کہتا ہوں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ نہیں رہوں گا — بھلا اس گھر میں کون رہ سکتا ہے۔ جہاں ایک سڑیل اور دیوانی ماں ہر وقت گردن پر سوار ہو۔

(سرجیت دروازہ کے پٹ کھول دیتا ہے۔ کتا بھونکتا ہے ہوا کے تیز جھونکے اندر آتے ہیں)

کرپی۔ (سرجیت کا ہاتھ پکڑ) کہاں چلا۔ میرا چاند سا دیر تو کہاں چلا! رات سر پہ کھڑی ہے اور آندھی مینہ کا زور ہے۔ نہ جا ہمیں چھوڑ کر نہ جا ہم تیرے بنا کیسے رہیں گے۔ (پرمیشوری کھڑی ہے)

سرجیت۔ مجھے جانے دے کرپی۔ میرا ہاتھ چھوڑ۔ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا

پرمیشوری۔ ماں باپ اس کے نخرے سہتے ہیں۔ دو وقت بھر پیٹ کھانے کو دیتے ہیں۔ اسی لئے سؤر کی طرح غراتا ہے۔

سرجیت۔ کچھ بھی ہو اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گا ——

کرپی۔ (منت سماجت سے) تُو نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ تیرا کتا بھی بھوکا ہے۔ تیرے لیے میں نے جوار کی روٹی رکھی ہے اور مکھن میں تلی ہوئی مچھلیاں۔ کھانا ابھی تک آنچ پہ ہے۔

سرجیت۔ (ہاتھ کھینچ کر) مجھے جانے دے (کتے کو پچکارتے ہوئے) چل میرے شیرو

(سرجیت کتے کو لے باہر چلا جاتا ہے۔ ہوا چیختی چلاتی سر ٹکرا رہی ہے۔ کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے)

کرپی۔ ماں!

پرمیشوری (بڑبڑاتے ہوئے) تیسرا بھی چلا گیا!

کرپی۔ سرجیت! (سسکیاں لیتے ہوئے) وہ بھی چلا گیا۔ ماں تو نے اسے بھی نکال دیا۔

پرمیشوری۔ (اٹھتی ہے اور دروازہ بند کر دیتی ہے) میں نے اسے کیا کہا جو وہ گھر چھوڑ کر یوں چلا گیا۔ اس نے بھینس گم کر دی۔ میں نے پوچھا تو کونسی برائی کی۔ لیکن اسے دیکھو مجھے گھرکیاں دینے لگا — اچھا ہوا وہ چلا گیا۔ میرے سر سے بوجھ اتر گیا — پہلے ہر وقت جی کو لگی رہتی تھی۔ دو منٹ اوجھل ہو تو سو دفعہ دروازے پر جا کر اسے دیکھتی تھی اب آیا کہ آیا۔ اس کے سہارے آس امید کے قلعے بھی بناتی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہو گا۔ نہ آس نہ امید نہ انتظار۔

کرپی۔ میرا تیسرا بھائی۔ آہ وہ بھی چلا گیا۔ ماں اسے بلا وہ ابھی دور نہیں گیا سن ابھی تک کتے کی آواز آ رہی ہے۔

(دور سے کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے)

پرمیشوری۔ (سوچتے ہوئے) کیا کہا! وہ ابھی تک دور نہیں گیا۔ نہیں گیا دور ہم آواز میں لیکن وہ چلا گیا۔ دوسرے بھائیوں کی طرح وہ بھی چلا گیا ——

کرپی۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) چولہے پر اس کا کھانا ابھی تک گرم ہے۔ کتے کی آواز پہلے سے دھیمی (سن ماں وہ — کیا تو سنتی نہیں۔ ؟

پرمیشوری۔ کیا —؟ ہاں — ہاں سنتی ہوں — لیکن — لیکن وہ چلا گیا۔

کرپی۔ اور تو نے ایک دفعہ بھی اسے نہ روکا۔

پرمیشوری۔ (چنگاریوں سے آگ لپک رہی ہے چولہے کا خیال رکھنا طوفان تھمتے ہی میں تیرے باپو کے پاس کھیت میں جاؤں گی تاکہ وہ کسی کو ساتھ لے کر بھینس کو ڈھونڈے۔

(کرپی گم سم کھڑی ہے۔ پرمیشوری بڑبڑاتی ہے برتنوں پر ادھر اُدھر نظر دوڑاتی ہے۔ پھر جھاڑو لے چولہے کے آس پاس بکھری ہوئی آگ کو سمیٹتی ہے)

پردہ گرتا ہے

بلونت گارگی

غزل

ہاتھ اُس نے دمِ آخر سینے پہ دھرا ہوگا — جینا بھی بلا ہوگا مرنا بھی بلا ہوگا

عاشق نے محبت میں کیا کیا نہ کیا ہوگا — گر گر کے اٹھا ہوگا مر مر کے جیا ہوگا

معلوم نہ تھا ہم کو یہ عشق بلا ہوگا — آلام ربا ہو کر، اندوہ فزا ہوگا

ہیں سرخ مرے خوں سے اک عمر سے ہاتھ اُس کے — ہر کوئی سمجھتا ہے یہ رنگ حنا ہوگا

طے کرتے ہیں سر کے بل ہم آج وہی جنگل — مجنوں نے کبھی جن میں پاؤں نہ دھرا ہوگا

اب تو دمِ آخر ہے بیمار مسافر ہے — دم بھر کے لئے تم بھی آجاؤ تو کیا ہوگا

لو آ گئے ہم در پہ دل لے کے جگر لے کر — یہ کس کی خطا ہوگی گر تیر خطا ہوگا

اے چارہ گرو بیٹھو، بس چارہ گری چھوڑو — اک روز مرا عقدہ خود عقدہ کشا ہوگا

اس دردِ محبت کا اے دوست مداوا کیا — یہ درد تو بالآخر آپ اپنی دوا ہوگا

گلگشت کو وہ نکلا ہر نقشِ قدم گویا — ہر گام پہ رستے میں اک پھول دھرا ہوگا

کیا دیکھیں درخشانی ہم صبح کے اختر کی — شب کو تری بالی سے آویزہ گرا ہوگا

دنیا کی لگن چھوڑو، معلوم یہ تھا کس کو — ہر در پہ جھکیں گے ہم، ہر ذرہ خدا ہوگا

کیا اُس کو کہیں اے جاں، ہے طرفہ نظیر انساں
سو بار مٹا ہوگا، سو بار بنا ہوگا

اصغر حسین نظیر

سیاسی سوچ بچار کا آغاز

عمرانیات میں وُہ سب علوم شامل ہیں۔ جو انسانی زندگی، اُس کے نظام اور اُس کی تدریجی رفتار سے بحث کرتے ہیں۔ عمرانی علوم کی ایک شاخ سیاسیات ہے، سیاسیات کو دوسرے عمرانی علوم سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن سیاسیات کے مطالعہ کو آسان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی حد بندی کی جائے۔ سیاسیات میں معاشرتی نظام کے ہر پہلو کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سیاسیات کا خاص موضوع معاشرتی نظام کے اُس پہلو پر بحث کرنا ہے جسے ریاست کہتے ہیں کہ ریاست کی آج تک کوئی ایسی تعریف نہیں کی جاسکی۔ جس پر سب سوچ بچار کرنے والے متفق ہوں۔ ریاست کے مفہوم کی وضاحت کے لئے اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وُہ افراد کی ایک بڑی تعداد ہے جو کسی خاص علاقے میں آباد ہو۔ منظم ہو۔ اور جو اس منظم زندگی کو قائم رکھنے کے لئے حکومت کا کوئی دستور رکھتی ہو۔

یونان کی شہری ریاستوں میں سیاسیات کا دائرہ اتنا بڑا تھا۔ کہ کوئی یونانی اس کی حدوں کو پار نہیں کرسکتا تھا۔ یونانیوں کی صدہا زندگی کا مقصد فرد اور سوسائٹی کے ملاپ کو بڑھانا ہوتا تھا۔ یونان کی شہری ریاستوں میں یونانی شہری کو اس امر کا اندیشہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔ کہ اس کی انفرادیت جماعت میں مدغم ہو جائے گی۔ جب یونان کی ان شہری ریاستوں میں مذہبی اور خاندانی اصولوں کا دائرہ عمل وسیع ہوا۔ تو اس سے سیاسی زندگی کے اصول پیدا ہونے لگے۔ ان ریاستوں کے سیاسی مسائل میں صرف آزاد گروہ حصہ لے سکتے تھے غلاموں کو سیاسی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔ یونان کی بیشتر شہری ریاستوں کی بنیاد چھٹی صدی ق۔م میں پڑی پانچویں صدی ق م کی آخری چوتھائی میں ایتھنز میں ذہنی سرگرمیوں کا زور تھا۔ اُسی زمانہ میں فلسفیانہ مسائل کے علاوہ اُن سیاسی مسائل پر بحث چھڑی جس کا نتیجہ افلاطون اور ارسطو کی سیاسی تحریریں ہیں۔ پانچویں صدی ق۔م کی آخری چوتھائی میں ایتھنز میں علم حاصل کرنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ لکھنے پڑھنے والوں کی ایک جماعت (سوفسطائی) پیدا ہو چکی تھی۔ چونکہ یہ جماعت پیشہ ور معلموں کی تھی۔ اس لئے تمام سوفسطائی کسی خاص مسئلہ کے متعلق ایک ہی رائے نہیں رکھتے تھے۔ سوفسطائیوں نے جہاں دوسرے علوم پر اظہارِ خیال کیا۔ وہاں انہوں نے سیاسیات پر بھی طبع آزمائی کی اُن میں ایک کا یہ عقیدہ تھا۔ کہ ساری سیاسی مشکلوں کی بنیاد معاشی بدنظمی ہے۔ لہٰذا دولت کی تقسیم میں توازن قائم رکھنا چاہیئے۔

سقراط نے ایتھنز کے سیاسی اور اخلاقی فلسفوں کی مخالفت کی۔ آخری عمر میں اس پر نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا الزام لگایا گیا۔ جس کی پاداش میں اُسے زہر کا پیالہ پی کر اپنی زندگی کو ختم کرنا پڑا۔ اس سزا سے سقراط کے ایک شاگرد افلاطون نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ جمہوریت۔ ریاست کے تمام فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ افلاطون نے اپنا سیاسی فلسفہ "ریاست" "تدبر" اور "قوانین" میں بیان کیا۔ ان تینوں کتابوں میں وُہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ صرف ایسے لوگوں کو جن کا علم اور عمل کامل ہو۔ ریاست میں حاکمیت کا اختیار ہونا چاہیئے۔ "ریاست" میں وہ جس آئیڈیل سوسائٹی کا خاکہ پیش کرتا ہے اُس کا اہم ترین ادارہ تعلیمی ہے۔ کہ افلاطون کے تعلیمی نصاب کی بنیاد ورزش اور موسیقی ہے کہ وہ ان دونوں سے انسان کی سیرت کو بلند کرنے کا کام لینا چاہتا ہے، وہ ورزش کے ذریعہ انسان کو اپنے جسم پر اتنا قابو پانے کی تعلیم دیتا ہے،

ر انسان کا جسم اُس کی روح کے لئے موزوں مقام بن جائے۔ موسیقی کی تعلیم وہ انسان کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ تعلیم سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک کے لئے ہے۔ اس کے بعد مخصوص علمی تڑپ رکھنے والے نوجوانوں کے لئے افلاطون دس سال کا مزید نصاب پیش کرتا ہے۔ اس نصاب کا مقصد طلباء کو فلسفے کی تعلیم کے لئے تیار کرنا ہے۔ فلسفے کی تعلیم کے لئے افلاطون نے پانچ سال مقرر کئے ہیں۔

افلاطون اپنی ریاست میں آبادی کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ کاشتکار دستکار وغیرہ۔ سپاہی اور کا منتظ۔ وہ ان میں سے ہر ایک جماعت کے فرائض اور حقوق مقرر کرتا ہے۔ افلاطون کی یہ تقسیم ذات پات کی کڑی پابندیاں پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اگر ایک شخص ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ تو اُسے دوسرے طبقے میں جانے کی اجازت ہے۔ افلاطون طبقہ وار کشمکش روکنے کے لئے ہر جماعت سے اجتماعی خیر کی توقع رکھتا ہے۔ وہ اگر کاشتکاروں کو بعض حقوق سے محروم کرتا ہے۔ تو اُسی طرح سپاہیوں اور منتظموں کا طبقہ بھی کئی ایک حقوق سے محروم دکھائی دیتا ہے۔ ریاست میں مردوں اور عورتوں کو برابر برابر سیاسی حقوق دیئے گئے ہیں۔ سیاسی غور و فکر کی تاریخ میں افلاطون کے بعد ارسطو کا نام آتا ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ افلاطون آسمانوں کی باتیں کرتا ہے اور ارسطو زمین کی۔ افلاطون علم کو تصوف کی راہ دکھاتا ہے۔ اور ارسطو عقل کے دیئے کو روشن کرتا ہے۔ افلاطون سیاسی آئیڈیل ازم کا بانی ہے۔ لیکن ارسطو نے سیاسیات کے علم کی بنیاد رکھی۔

ارسطو اپنی سیاسیات میں ریاست کو ایک نامی جسم سے تشبیہہ دیتا ہوا اسے اجزا میں تقسیم کرتا ہے۔ اس نے معاشی زندگی کو سیاسی غور و فکر کا ایک مستقل موضوع بنا دیا۔ سیاسی زندگی پر قومی خصوصیت اور جغرافیائی حالات کا جو اثر پڑتا ہے۔ اُسے بھی ارسطو نظر انداز نہیں کرتا۔ "تاریخ فلسفہ" سیاسیات کے مصنف کے الفاظ میں ارسطو کے نزدیک ریاست ایک جماعت ہے۔ جو زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اور زندگی کو بہتر بنانے کے لئے قائم رکھی جاتی ہے۔ وہ بالکل انسان کی بنائی ہوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کا آغاز اور اس کے ارتقاء کا سلسلہ فطری یا طبعی ہوتا ہے اور وہ ایک بالکل طبعی مظہر بھی نہیں ہے کیونکہ انسان خیر و شر کا شعور رکھتا ہے اور اپنے اخلاقی معیار کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے نظام میں بھی طبعی اور انسانی عنصر کی آمیزش ہوتی ہے۔ حکومت ایک فطری اصول ہے اور وہ لوگ جو حکومت کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ اُن لوگوں پر جن میں اس کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ حکمرانی کرتے ہیں۔ ریاست کے نظام کا انحصار اس قاعدے پر ہے۔ کہ اس کے بعض ارکین حاکم ہوں۔ اور بعض محکوم۔ لیکن سیاسی حکومت خاندان کے بزرگ کے اقتدار یا آقا کے اختیارات سے بالکل جدا چیز ہے۔ خاندان کا بزرگ اور غلاموں کا آقا اپنے ماتحتوں سے برتر ہوتا ہے۔ سیاسی حکومت ریاست کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہے لیکن حاکم اور محکوم کی تفریق کے باوجود شہری مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کا مقصد عام مفاد ہوتا ہے۔ دستور ایک آئینہ ہے جس میں شہریوں کی نیت، مقاصد سیرت اخلاقی معیار۔ اور خصوصاً عدل کے تصور کا عکس نظر آتا ہے۔ اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ شہریوں کے خیالات عادات یا ارادوں میں کوئی تغیر نہ ہو۔ ارسطو کا ذہن وسعت نظر اور باریک بینی کا ایک بے مثل نمونہ ہے اُس نے کسی خاص عقیدے کی تبلیغ نہیں کی۔ اس وجہ سے وہ مبالغے سے بچا رہا۔ اور اُس کے خیالات میں ایک قابل رشک توازن اور اعتدال پسندی ہے وہ ایک سچا یونانی تھا۔ اپنے زمانے کے مسائل میں بالکل ڈوبا ہوا۔ مگر اس کے باوجود سیاسیات کا کوئی نقطہ اس کی نظر سے

پوشیدہ نہیں رہا۔ اور اس کے زمانے سے آج تک کا کوئی مستند نظریہ ایسا نہیں ہے، جو کسی نہ کسی شکل میں اس کی تصنیف میں موجود نہ ہو۔ قرونِ وسطیٰ کے سیاسی افکار میں اس کی سیاسیات نے جان ڈال دی۔ دورِ جدید کے سیاسی فلسفی اس سے سبق لیتے رہے ہیں۔ اور اس وقت بھی شاید ہی کوئی تصنیف ہو۔ جو ارسطو کی سیاسیات سے زیادہ مستند قرار دی جاسکے۔ اس نے جو بحث چھیڑی وہ اب تک جاری ہے۔ بہت سے سیاسی عقیدے قبول کئے گئے۔ اور رد کئے گئے۔ لیکن ارسطو کے خیالات کا مرتبہ گھٹنے کے بجائے بڑھتا رہا۔ اس لئے وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم مانا جاتا تھا۔ اب وہ علم سیاسیات میں ہر زمانے کا رہنما مانا جاتا ہے، اس کے خیالات میں وہ شاعرانہ انداز۔ اس کے بیان میں وہ جادو۔ اس کے فلسفے میں وہ الہامی شان نہیں ہے۔ جو افلاطون کو فلسفیوں کے درجے سے بڑھا کر ہادیوں میں شامل کر دیتی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ علوم، وخصوصاً سیاسیات کے میدان میں اس سے برابری کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں "۔ اسکندر کی موت کے چند سال بعد یونان میں ادب۔ آرٹ اور فلسفے کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ اس چراغ کے بجھتے ہی اسکندر ہی کے بسائے ہوئے شہر اسکندریہ میں علم و حکمت کا دیا جلنے لگا۔

باری علیگ

دامانِ تصوّر

میرے دھندلائے سے بے رنگ تصور کی قسم
اُس کے بکھرے ہوئے گیسو کی ہوا آہی گئی

میری آوارہ نگاہی نے بھی کروٹ بدلی
جیسے کھوئی ہوئی منزل کا پتہ پا ہی گئی

اُس کی دزدیدہ نگاہی تھی کہ بیگانہ روی
پھول دامانِ تخیل پہ جو برسا ہی گئی

جھینپی جھینپی ہوئی سی کم نگہی کا عالم
اک حسینہ جو کسی بات پہ شرما ہی گئی

تیری نیندوں کا شباب آ ہی گیا آنکھوں میں
ہائے اک ناگ مرے سینے پہ بل کھا ہی گیا

تیرے آنچل کے وہ بل ہوں کہ تری زلف کے پیچ
جانے یہ کس کا تصور تھا کہ تڑپا ہی گیا

تیری آنکھوں تری نظروں سے برستا ہوا کیف
بیٹھے بیٹھے یونہی کچھ سوچ کے لہرا ہی گیا

اب یہ عالم ہے کہ انگڑائی بنا جاتا ہوں
جانیے کس کا مجھے آج خیال آ ہی گیا

دور بجتی ہوئی چھاگل کی صدا سنتا ہوں
اور یہ لطفِ تصور ہے کہ سر دھنتا ہوں

نازش پرتاب گڑھی

دو نظمیں

سپاہیوں کا گیت

ہمیں نے لڑیں بادشاہوں کی جنگیں

ہمیں لڑ رہے تھے ہمیں لڑ رہے ہیں
ہمیں کٹ رہے ہیں ہمیں مر رہے ہیں
ہمیں جان دے کر نئے مسئلوں پہ
نئے عہد کا فیصلہ کر رہے ہیں

ہمیں فوج تھے نازیت فاشیت کی

ہمیں جنگ لڑتے تھے جمہوریت کی
اگر حکم ہو تو ابھی چھیڑ دیں ہم
نئی جنگِ خونیں کسی ادرمت کی
ہمیں لڑ رہے تھے ہمیں پھر لڑیں گے

اُتر آئیں گے پھر سے میدان میں ہم

ہمیں قتل و غارت سے پھر ہیت ہوگی
کوئی بال بیکا نہ دنیا کا ہوگا
ہمیں ہار ہوگی - ہمیں جیت ہوگی
ہماری ہزیمت پہ اُتریں گے جھنڈے
ہماری ہی نصرت کے جھنڈے گڑینگے
ہمیں لڑ رہے تھے، ہمیں پھر لڑینگے

سانول

کتنا اچھا لگتا ہے
کتنا پیارا لگتا ہے

سانول صبح سویرے آتا — آ کے دکان میں جھاڑو دیتا
بٹے اور ترازو دھوتا — تھک کر کے انگڑائی لیتا
جھاڑو دے کر لونگ جلاتا — پوجا کرتا، سیس نواتا
کُند چھری سے قلم بناتا — پھر کھاتے میں قلم چلاتا

کتنا اچھا لگتا ہے
کتنا پیارا لگتا ہے

سانول پیسے دو پیسے کی — ننھی منھی پُڑیا بنتا
آنکھ بچا کر تول چُراتا — پائی پائی لکھتا جاتا
ہشیاری سے باقی دیتا — اپنے کھوٹے پیسے چلاتا
سب کے بعد دکان بڑھاتا — تھیلی لے کر گھر کو جاتا

کتنا اچھا لگتا ہے
کتنا پیارا لگتا ہے

مخمور جالندھری

مٹّی

کچی سوکھی مٹی کے ڈھیلوں کو پھوڑنا اور ڈھول سے کھیلنا میرا پیارا مشغلہ ہے۔ اور یہ شغل میرے بچپن سے شروع ہو کر اب جوانی میں میری ایک مستقل عادت بن چکا ہے۔ مجھے دُنیا بھر کے کاموں اور خوبصورت چیزوں حتٰے کہ دوستوں سے بھی یہ شغل زیادہ پیارا ہے۔ جب لکھنا پڑھنا میرے دماغ کو تھکا دیتا ہے۔ تو میں مٹی سے رجوع کرتا ہوں۔ جب ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی میری پیشانی اور ہاتھوں سے چھوتی ہے۔ تو میری ساری کلفتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا رُوح سکون اور شانتی کے لمبے چوڑے سمندر میں تیر رہی ہے۔ اور ذہن میں پیارے پیارے اور اونچے اونچے چمکیلے خیالات آکر میرے تصوّر کو جگمگا دیتے ہیں۔ اُس وقت مجھے فطرت اپنے بہت قریب سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ اور دھرتی کے دل کی دھڑکن صاف سُنائی دینے لگتی ہے۔ اُس وقت دنیا سے میری توجہ ہٹ کر کسی اور ہی طرف لگ جاتی ہے۔

اور اب یہ حالت یا عادت ہر مقام سے گزر کر میری فطرت اور روزانہ ضرورتوں کا ایک اہم جزو بن چکی ہے۔ اور میں اِس شغل کو بلا جھجک جہاں اور جس وقت مجھ سے تحریک ہو۔ سرانجام دے لیتا ہوں۔ لوگوں کو عام طور پر یہ بات ناگوار گزرتی ہے۔ جو اُن کے ذہنوں سے لگّا نہ کھائے۔ کچھ میری اپنے ظاہر سے بے پروائی۔ نیم برہنگی اور بڑھی ہوئی داڑھی بھی عام ذہنوں میں خارش پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ میری ذات بھی اِس شغل کے ساتھ لوگوں کیلئے تضحیک اور پھبتیوں کا تختۂ مشق بن گئی ہے۔ لیکن میں اپنے اِس فطرتی عمل کو کیوں چھوڑ دوں۔ لوگ اِس کو بدتہذیبی کہتے ہیں تو کہنے دو ــــــ دراصل تہذیب نام ہے رُوح اور ذہن کی غلامی کا۔ اور جب رُوح اور ذہن غلام ہو گئے۔ تو انسانیت کہاں۔ میں اِن دلائل پر غور کر کے اپنے شغل اور روزمرّہ کو نبھائے جاتا ہوں۔

میرے اِس شغل سے سب سے زیادہ خطرہ یہاں کے ٹھاکر دوارے کے پنڈت جی کو محسُوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کے مرد بھگت تو تقریباً سبھی منفت خورے اور چرکٹے ہیں۔ البتہ عورتوں کی خوش اعتقادی اُن کی دُکان کو چلائے ہوئے ہے اور عورتوں کا رجوع ایک مرتبہ جدھر ملیٹ پڑے۔ سبھی اُدھر متوجہ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ خوش قسمتی کہیئے یا بدقسمتی مجھے اور میرے شغل کو بچے اور عورتیں زیادہ دلچسپی اور احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھیں۔ ایک صبح مندر سے لوٹتے ہوئے ایک گروہ میرے پاس آکر رُک گیا اور مجھے محویت میں دیکھ کر آپس میں باتیں ہونے لگیں۔

ایک بولی ــــــ "یہ تو کوئی سادھو طبیعت کا آدمی معلوم ہوتا ہے ــــــ"

دوسری نے کہا ــــــ "میں اپنے بچپن سے جانتی ہوں۔ مٹّی سے اِسے بہت پیار ہے۔ کسی سے بیر دودھ نہیں رکھتا بیچارا۔"

پہلی نے ذرا ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "مٹّی سے پریم پرماتما سے پریم کرنا ہے۔ آخر کو جو مٹّی ہونا ہے ــــــ"

اب ایک دیوی جی مجھ سے مخاطب ہوتی ہیں "اے تم بھلا مٹّی سے کیوں کھیلتے رہتے ہو۔ کیا سودائی ہو گئے ہو!"

میں خاموش رہا . . . .

دوسری بولی ــــــ "آخر تمہیں اِس سے کیا لابھ ہوتا ہے:"

میں نے اب زبان کھولنا مناسب سمجھی کہ کہیں پانسہ ہی نہ پلٹ جائے۔ جواب دیا۔ مٹّی دراصل شانتی دینے والی ہے۔ اور دنیا میں سب سے ضروری اور پیاری چیز شانتی ہے۔ اِس لئے میں مٹّی سے لگاؤ رکھتا ہوں۔ یہ سُن کر وہ سادہ لوح عورتیں مجھے نمسکار کر کے چلی گئیں۔ اُنکا یہ احترام اب میری ذات سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ پجاری جی کو جو خطرہ تھا کہ کہیں میری دکان ماند نہ پڑ جائے۔ وہ اَب ظاہر ہو رہا تھا۔ جس کی روک تھام کیا

کوشش کرتے۔ مگر یہ اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ ہر روز کتھا وارتا میں بھی جگہ جگہ پر ہوشیاری سے میرے جادو کو توڑنے کی کوشش میں میری حقارت سے ذکر کرتے۔ مگر عورتیں میری ذات پر مکمل اعتماد رکھے ہوئے تھیں۔ اس لئے اُن کی تعداد میں دھیرے دھیرے کمی ہونی شروع ہوئی۔ پجاری جی کچھ نہ تھے۔ ناچار موقع کے انتظار میں سٹپٹا کر رہ گئے۔ یہ بیچارے پڑھے لکھے بھی کچھ یونہی سے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے ہفتہ بھر کاشی رہ آئے۔ بس یہی بات وہ اپنی عظمت کی سند میں پیش کرتے تھے —— مندر میں پہلے لال بجھکڑ اور ٹھاکر جی کی مورتی کی طرح دل کے بالکل سیاہ اور سخت جیسے ہی انوکھے اور بدرنگ بھی تھے۔ ٹھاکر جی کے پیارے بھگت۔ یہ دراصل ایک مشہور جوئے باز تھے۔ بیسیوں مرتبہ کے سزا یافتہ۔ مگر باوجود ان آزمائشوں کے انہوں ان کے قدم نہ چھوڑے تھے۔ جب بھی جیل سے لوٹتے۔ پہلے بھگوان کے درشن کرتے اور منت مانتے کہ اگر کہیں سے مایا ہاتھ لگ جائے۔ تو تیری راہ میں سدا برت لگا دوں۔ مگر ہوتا یہ کہ ہر مرتبہ پولیس چھاپہ مار کر اُس کے جواری دوستوں کے ساتھ اُسے بھی دھر لے جاتی۔

یہ رات بھر تو جوئے خانوں میں گھومتے اور صبح پانچ بجے آکر مندر کے دروازے کھٹکھٹاتے۔ مندر کے نوکر کو کوستے گالیاں دیتے اور زور زور سے پکار کے لئے بلاتے۔ غرض اُن کی بھگتی سے وہ ہو حق مچتی۔ کہ گلی محلے میں سونے والے بھی نیند سے جاگ کر انہیں کوسنے لگتے۔ مگر یہ اُن کا معمول تھا۔ اور لوگ تھے۔ کیوں کہ وہ بھگت بھی تھے۔ اُن سے بھگوان کا نزدیک کا رشتہ تھا۔ البتہ اُس وقت سارا محلہ اطمینان کی سانس لیتا۔ جب کہ وہ پولیس والوں حوالے سے بڑے گھر کے مہمان ہوتے۔

اُن کے ماتھے پر ایک بڑا سا سفید چندن کا ٹیکا لگا ہوتا۔ جس سے اُن کے من کے گہرے بھاؤ اور چہرے پر کے جرائم کے آثار کے اظہار میں اور بھی ...انہ ہو جاتا۔ اور اکثر اُن کے درشن سے روح کانپ اٹھتی۔ اُن کی آنکھیں اِس قدر بھیریلی اور چمکیلی تھیں۔ کہ کسی کو اُن سے آنکھیں چار کرنیکا حوصلہ نہ پڑتا۔

جب محلے والے اُن کے روزانہ کے برتاؤ سے تنگ آگئے۔ تو ایک مرتبہ انہیں گھر لوٹتے ہوئے گلی میں ہی پکڑ لیا اور لگے اُن سے باز پرس کرنے ...ری بدقسمتی کہ میں نے بھی اُن کے رویے کی مذمت کی۔ اُس وقت تو خاموش رہے اور جلدی سے گلو خلاصی کرکے چلتے بنے۔

ایک مرتبہ انہوں نے ہنومان جی کے چڑھاوے سے تھوڑی سی نقدی چرا لی۔ میں نے دیکھ لیا۔ اُن سے پوچھا تو وہ کہنے لگے "رات کو سپنے میں میں نے بھگوان سے اپنے کاروبار کیلئے مدد مانگی تھی۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ صبح میرے سیوک ہنومان جی سے آکر مانگنا۔ چنانچہ اب جو میں یہاں آیا۔ تو مہابیر جی نے آنکھ کے اشارے سے مجھے بلا کر یہ روپیہ بخش دیا ——"

میں اُن کی یہ تاویل سن کر ہنس پڑا۔ اور وہ چڑ گئے۔ نہ جانے کس خوف سے انہوں نے روپے پھر ہنومان جی کے چرنوں میں رکھ دیئے اور اس ڈر سے کہ کہیں میں ...ہی مہنت جی سے نہ لگا دوں۔ خود ہی جا کر شکایت کی۔ یہ مجھ پر مندر کے چڑھاوے کی چوری کا الزام لگاتا ہے۔
—— محض اِسلئے کہ آپ کی نظروں سے گرا کر مجھے مندر سے نکلوا دے۔ انہوں نے کچھ اس طرح رو رو کر التجا کی۔ کہ مہنت جی پسیج گئے اور کہا "تم فکر نہ کرو۔ وہ لونڈا بہت بڑھ گیا۔ بھگوان اُسے ضرور ایک دن اُس کی بدنیتی اور ناستکتا کی سزا دیں گے۔ تم بے فکر رہو۔ مجھے تمہاری بھگتی اور نیک نیتی پر وشواش ہے۔"

اب بھگت جی مجھ سے شیر ہو گئے۔ اور اکثر جب میں گلی میں بیٹھا مٹی سے کھیلتا تو یہ بھی مجھے تلخ نظروں سے گھورتے ہوئے نکل جاتے۔

تیسرے صاحب جنہیں میری ذات سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ ہمارے محلے کے ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔ گلی کی نکڑ پر اُن کی دکان تھی۔ دن بھر مکھیاں مارتے یا بے فکروں سے گپیں ہانکتے۔ گاہک کبھی ادھر جھکتا دیکھا ہی نہیں گیا۔ وہ دکان یوں تو خاصی سجا رکھی تھی۔ اور ایک بڑا سا بورڈ جس پر برسوں کا تجربہ کار ڈاکٹر اور پوشیدہ امراض کا ماہر لکھا ہوا تھا۔ ہر چلنے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچتا۔ مگر گاہک عام طور پر سامنے کے ڈاکٹر کے ہاں ہی جانا پسند کرتے۔ یہ جب اپنے حواریوں میں بیٹھتے تو اپنی عظمت کے قصے سناتے اور مقابل کے ڈاکٹر کے متعلق کئی قسم کی باتیں کہتے۔ جن کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ کہ وہ تو دراصل نقلی ڈگریاں لئے ہوئے ہے۔ آتا جاتا اسے کچھ ہے نہیں۔ جانے لوگ کیوں ایک قابل معالج کو چھوڑ کر اس نقلی ڈاکٹر کے

پاس جاکر اپنا روپیہ اور وقت ضائع کرتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ پراپیگنڈا ہمیشہ کوئی نتیجہ برآمد کئے بغیر اپنی موت آپ مر جاتا۔ انہوں نے اپنی شہرت کیلئے اشتہار بھی نکلوائے اور سینما میں سلائیڈیں بھی چلوائیں۔ مُنادیاں کروائیں۔ مگر لوگ اِدھر نہ جھکے۔ البتہ ناکارہ ڈاکٹر صاحب کے نام سے اِن کی شہرت ضرور ہوگئی۔ تاہم یہ ہمارے محلے کی رونق تھے۔

یہ صاحب نسلاً اصل ذات کے چمبور تھے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں بھرتی ہو کر بصرے چلے گئے۔ دیر تک ان کا پتہ نہ چلا۔ ماں باپ اُن کے انتظار میں ہی مر گئے۔ لوگ باگ بھی انہیں بھول چکے تھے۔ کہ اچانک یہ صاحب ایک ڈن پیڑے کالے انگریز بنے یہاں آدھمکے۔ اور ڈاکٹری کی دکان نکال کر جم گئے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں۔ جنگِ عظیم اُس طوفان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو کہ آکر زمین کو سمندر اور سمندر کو صحرا اور پہاڑوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ چنانچہ جنگِ عظیم کا جیتا جاگتا معجزہ یہ ڈاکٹر صاحب کی ذات تھی۔ میں اُن سے ایک پھنسی پر نشتر لگوا بیٹھا پھنسی گھٹنے کی بجائے بڑھ گئی۔ میں چڑ گیا۔

ایک دن مجھ سے فرمانے لگے "میاں! سُنا ہے کہ تمہاری اخبارات میں خوب چلتی ہے۔ ذرا میرے متعلق بھی کچھ لکھوا دو"

میں نے جواب دیا "ضرور لکھواؤں گا۔ ایک مرتبہ تو سب جان جائیں گے۔ کہ ابھی دنیا نیم حکیموں اور جان کے دشمنوں سے خالی نہیں ہوئی"

وہ یہ سُن کر بھڑک اُٹھے اور مجھے لگے صلواتیں سنانے۔ میں انہیں بکتا چھوڑ کر چلا آیا۔ اُس دن سے وہ میرے جانی دشمن بن گئے۔ اتفاق پجاری سے کسی ملاقات میں میرا ذکر آیا۔ بھگت جی نے بھی نمک مرچ لگایا۔ تینوں اتحادی بن گئے اور اب محلے میں میرے خلاف باقاعدہ ایک اچھا خاصا محاذ قائم ہوگیا۔ میں اپنے سابقہ رنّیے پر قائم تھا۔ گلی محلے کے چھوٹے چھوٹے بچے اکثر میرے گرد رہتے۔ بلکہ اب تک مجھے اور میرے اِن بچوں کے شغل کو حیرت اور دلچسپی کی نظروں سے دیکھتے۔ میں اکثر اُن کی معصوم آنکھوں میں صاف طور پر یہ لکھا ہوا پڑھتا ہوں۔ کہ یہ شخص بچہ بھی نہیں۔ مگر بچوں کی سی عادت رکھتا ہے۔ مگر نہ جانے وہ کس جھجک کے باعث مجھ سے پوچھتے نہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے۔ کہ اُن بچوں میں زیادہ تعداد شوخ اور شرارتیوں کی ہے۔ مگر سب نزدیک آکر غیر معمولی حیرانی اور خاموشی کے مجسمے بن جاتے ہیں۔ نہ جانے میں اُن کیلئے کیا ہوں۔ انہیں میرے شغل میں کیا نظر آتا ہے۔ گو میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ میری رُوح بھی اُن بچوں کیطرح معصوم ہے۔ مگر یہ بات کسی خوشی سے کم نہیں۔ کہ صرف مٹی کے قُرب کی وجہ سے میں جیتی جاگتی معصومیت درمیان چند لمحے گزار لیتا ہوں۔

مئی کی ایک شام کو میں اپنے شغل میں محو تھا۔ کہ اچانک کسی نے پیچھے سے آکر میری آنکھیں میچ لیں۔ یہ محلے کے حلوائی کا لڑکا تھا۔ پانچ سال کا مگر غیر معمولی حد تک ذہین۔ یہ بہت حد تک مجھ سے بے تکلف اور مانوس تھا۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کھینچ لیا۔ وہ مُسکرا رہا تھا۔ میں نے ناراضی ظاہر کرتے ہوئے کہا "آ گئے نا آخر اپنی بات پر شیطان کہیں کے"۔ وہ تھوڑی دیر تک مُسکراتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"تم اسی طرح مٹی سے کیوں کھیلتے ہو! کیا بچے ہو ہماری طرح؟"

میں اُس کے سوال پر بھونچکا رہ گیا۔ اُس نے پھر سوال کیا "داڑھی مونچھ رکھتے ہوئے بھی بچہ بنتے ہو۔ لوگ سودائی کہتے ہونگے"

میں اب بھی لاجواب تھا۔ آخر میں نے کہا "میرا کوئی دوست نہیں۔ بڑی عمر کے دوست مجھے ناپسند ہیں۔ اور تم جیسے بچے مجھے ساتھ نہیں کھلاتے۔ مٹی سے نہ کھیلوں۔ تو اور کیا کروں"

یہ سُن کر اُس نے ہمدردی کی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اور تھوڑی دیر سوچ میں کھویا رہا۔ پھر کہنے لگا "تم میرے ساتھ کھیلا کرو۔ آؤ میں دوست بنتا ہوں۔ لو وہ میرے ساتھی بھی آ پہنچے۔ کھیلو گے ہمارے ساتھ" میں نے مُسکرا کر رضا ظاہر کی۔ اور اُس نے بطور ساتھی میرا سب سے کرایا۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے ابھی دنیا میں میرے زندہ رہنے کی گنجائش ہے۔

دیر تک ہم آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ آنے جانے والے لوگ مجھے بچوں سے کھیلتا ہوا دیکھ کر تعجب سے مسکراتے۔ یا ایک آدھ پھبتی کس کر آگے چل
دیتے۔ مگر میں اپنے شغل اور ساتھیوں کی صحبت میں مشغول رہا۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے ایران کے فلسفی شیخ بہلول کی روح مجھ میں آ گئی ہے۔ مٹی نے
ان میری طبیعت میں ایک قسم کی انکساری اور خیال آفرینی پیدا کی ہے۔ وہاں اس نے ایک نرالی قسم کی قوت برداشت اور تنہائی پسندی کی نعمت بھی
عطا کی ہے۔ لوگ مجھے مختلف قسم کے طعنوں اور طنزوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ مگر میں ہر طرف سے بے پروا رہتا ہوں۔ بعض شاید میرے اس رویے کو
بزدلی اور شکست خوردہ ذہنیت کا نام دیں۔ مگر میں اپنی اس عادت پر نازاں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ دل اور اس کے قریب بسنے والے غصے اور حسد
پر فتح حاصل کرنا اور دنیا کی برائیوں میں رہ کر اپنے آپ میں مگن رہنا انتہا درجے کی ریاضت ہے۔ سوسائٹی سے غصے اور حسد کی آنچ ہوتی ہے۔ اور یہ
دونوں روح اور ذہن سے اس کی طاقت پرواز چھین لیتے ہیں۔ جو حقیقت میں انسان کی موت ہے۔ مگر شکر ہے مٹی کی مہربانی سے میں اپنی زندگی کے
سب لوازمات رکھتا ہوں ◆

ایک شام کو جب کہ میں اپنے ننھے منے ساتھیوں میں کھیل رہا تھا۔ میرے پرانے مہربان۔ یا کہیے۔ میری مخالف محاذ کی بائی کمانڈ۔ گرد بال
سنجیدگی سے ذرا رک گئی۔ نہ جانے ان کا یہ اس طرح آنا اتفاقی امر تھا۔ یا کسی طرح طے شدہ پروگرام کے مطابق۔ لیکن وہ آئے اس طرح جیسے کسی کام کو جا
رہے ہوں۔ اور راہ میں عجیب تماشہ دیکھ کر رک گئے ہوں۔ ہم کھیل رہے تھے۔ اور لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔

پجاری جی بولے۔ "دیکھتے ہو۔ یہ کلجگی کنہیا ہیں۔"

بھگت جی نے کہا۔ "مگر وہ تو ماکھن کھاتے تھے۔ اور گوال بالوں کے ساتھ راس رچاتے تھے۔"

پجاری —— "تو یہ مٹی سے کھیلتے ہیں۔ گوال بالوں کی جگہ محلے بھر کے لڑکے بدلے دیکھ لو ——" اس پر سب ہنس پڑے۔

بھگت جی کہنے لگے۔ اس شخص کا انتظام کیجئے پنڈت جی۔ یہ دن بدن خطرناک ہو رہا ہے۔ بچے بھی اس کی صحبت سے خراب ہو جائیں گے۔
پرسوں کل مجھے پتھر مارنے دوڑا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب ایک نظر سارے حاضرین پر ڈال کر بولے۔ "یہ شخص واقعی پاگل ہے۔ میرے پاس سینکڑوں ایسے مریض آتے ہیں۔ جن کی علامتیں
اس سے ملتی جلتی ہیں۔"

یہ بات کہتے ہوئے وہ اپنے بوٹ کی نوک سے مٹی کے ڈھیلے کچل رہے تھے۔ پنڈت جی اور بھگت جی کے ساتھ چند اور بزرگ بھی غیر ارادی طور پر یہی
شغل فرما رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکچر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ "اور جب اس قسم کے مریض کا مرض حد سے بڑھ جاتا ہے۔ تو وہ مٹی سے کھیلنے لگتا
ہے۔ پھر یہی مٹی پتھروں کی شکل اختیار کر کے سب کی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔" میں نے ان کی یہ بات سن کر ان کی طرف دیکھا۔ اچانک جیسے وہ اپنی غلطی
بھانپ گئے۔ اور مٹی کا شغل چھوڑ کر سنبھل گئے۔ لڑکوں نے میری حمایت میں خوشی کا نعرہ لگایا۔ پنڈت جی اور ڈاکٹر صاحب جھینپ گئے۔ بھگت جی لال پیلی
آنکھیں نکال کر بولے۔ "دیکھ لو ابھی سے اس آنے والی برائی کا تھوڑا سا نمونہ لڑکے ابھی سے اس سودائی کے ساتھ سودائی ہو رہے ہیں۔" مگر معلوم ہوتا
تھا۔ حاضرین میں زیادہ تعداد محض تماشائیوں کی تھی۔ اس لئے کسی اور نے میری مخالفت میں حصہ نہیں لیا۔ پنڈت جی نے پھر ایک تیر چھوڑتے ہوئے
فرمایا —— "آخر تم نے مٹی میں کونسی بات پائی ہے۔ جس سے تم نے دنیا بھر کو چھوڑ کر اس سے لو لگائی ہے؟"

ڈاکٹر —— "اجی یہ اپنے وقت کے لقمان ہیں لقمان۔ خواہ مخواہ زبان کھولنے کی تکلیف دیتے ہو حضرت کو۔ ابھی وہ فلسفہ جھاڑنے لگیں گے۔
کہ بھاگتے ہی بنے گی۔" اس پر انہوں نے قہقہہ لگایا۔ ان کا خیال تھا۔ کہ لوگ ساتھ دیں گے۔ مگر سب چپکے رہے۔ اور یہ کھسیا کر پنڈت جی سے بولے۔
"پنڈت جی ان کو گورو دھارن کر لیجئے۔ یہ بہت کام کے آدمی ہیں۔"

پاس جا کر اپنا روپیہ اور وقت ضائع کرتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ پراپیگنڈا ہمیشہ کوئی نتیجہ برآمد کئے بغیر اپنی موت آپ مر جاتا۔ انہوں نے اپنی شہرت کیلئے اشتہار بھی نکلوائے اور سینما میں سلائیڈیں بھی چلوائیں۔ نمائشیں کروائیں۔ مگر لوگ اِدھر نہ جھکے۔ البتہ ناکارہ ڈاکٹر صاحب کے نام سے اِن کی شہرت ضرور ہو گئی۔ تاہم یہ ہمارے محلے کی رونق تھے۔

یہ صاحب دراصل ذات کے جھیور تھے۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں بھرتی ہو کر بصرے چلے گئے۔ دیر تک اِن کا پتہ نہ چلا۔ ماں باپ اُن کے انتظار میں ہی مر گئے۔ لوگ باگ بھی انہیں بھول چکے تھے۔ کہ اچانک یہ صاحب ایک ان پڑھے کالے انگریز بنے یہاں آ دھمکے۔ اور ڈاکٹری کی دکان نکال کر جم گئے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں۔ جنگِ عظیم اُس طوفان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو کہ زمین کو سمندر اور سمندر کو صحرا اور پہاڑوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ چنانچہ جنگِ عظیم کا جیتا جاگتا معجزہ یہ ڈاکٹر صاحب کی ذات تھی۔ میں اُن سے ایک پھنسی پر ٹنکچر آیوڈین لگوا بیٹھا۔ پھنسی گھٹنے کی بجائے بڑھ گئی۔ میں چڑ گیا۔

ایک دن مجھ سے فرمانے لگے "میاں! سنا ہے کہ تمہاری اخبارات میں خوب چلتی ہے۔ ذرا میرے متعلق بھی کچھ لکھوا دو۔"

میں نے جواب دیا "ضرور لکھواؤں گا۔ ایک مرتبہ تو سب جان جائیں گے۔ کہ ابھی دنیا نیم حکیموں اور جان کے دشمنوں سے خالی نہیں ہوئی۔"

وہ یہ سن کر بھڑک اٹھے اور مجھے لگے صلواتیں سنانے۔ میں انہیں بکتا چھوڑ کر چلا آیا۔ اُس دن سے وہ میرے جانی دشمن بن گئے۔ اتفاق سے پجاری سے کسی ملاقات میں میرا ذکر آیا۔ بھگت جی نے بھی نمک مرچ لگایا۔ تینوں اتحادی بن گئے اور اب محلے میں میرے خلاف باقاعدہ ایک اچھا خاصا محاذ قائم ہو گیا۔ میں اپنے سابقہ رویے پر قائم تھا۔ گلی محلے کے چھوٹے چھوٹے بچے اکثر میرے گرد رہتے۔ بچھا ب تک مجھے اور میرے اِن بچوں کے شغل کو حیرت اور دلچسپی کی نظروں سے دیکھتے۔ میں اکثر اُن کی معصوم آنکھوں میں صاف طور پر یہ لکھا ہوا پڑھتا ہوں۔ کہ یہ شخص بچہ بھی نہیں۔ مگر بچوں کی سی عادتیں رکھتا ہے۔ مگر نہ جانے وہ کس جھجک کے باعث مجھ سے پوچھتے نہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے۔ کہ اُن بچوں میں زیادہ تعداد شوخ اور شرارتیوں کی ہے۔ مگر سب کے نزدیک آ کر غیر معمولی حیرانی اور خاموشی کے مجسمے بن جاتے ہیں۔ نہ جانے میں اُن کیلئے کیا ہوں۔ انہیں میرے شغل میں کیا نظر آتا ہے۔ گو میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ میری روح بھی اُن بچوں کی طرح معصوم ہے۔ مگر یہ بات کسی خوشی سے کم نہیں۔ کہ صرف مٹی کے قرب کی وجہ سے میں جیتی جاگتی معصومیت کے درمیان چند لمحے گزار لیتا ہوں۔

مئی کی ایک شام کو میں اپنے شغل میں محو تھا۔ کہ اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر میری آنکھیں بھینچ لیں۔ یہ محلے کے حلوائی کا لڑکا تھا۔ پانچ سال کی عمر مگر غیر معمولی حد تک ذہین۔ یہ بہت حد تک مجھ سے بے تکلف اور مانوس تھا۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کھینچ لیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے مصنوعی ناراضی ظاہر کرتے ہوئے کہا "آ گئے نا آخر اپنی بات پر شیطان کہیں کے"۔ وہ تھوڑی دیر تک مسکراتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"تم اِسی طرح مٹی سے کیوں کھیلتے ہو! کیا بچے ہو ہماری طرح؟"

میں اُس کے سوال پر بھونچکا رہ گیا۔ اُس نے پھر سوال کیا "داڑھی مونچھ رکھتے ہوئے بھی بچہ بنتے ہو۔ لوگ سودائی کہتے ہونگے۔"

میں اب بھی لاجواب تھا۔ آخر میں نے کہا "میرا کوئی دوست نہیں۔ بڑی عمر کے دوست مجھے ناپسند ہیں۔ اور تم جیسے بچے مجھے ساتھ نہیں کھلاتے۔ مٹی سے نہ کھیلوں۔ تو اور کیا کروں۔"

یہ سن کر اُس نے ہمدردی کی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اور تھوڑی دیر سوچ میں کھویا رہا۔ پھر کہنے لگا "تم میرے ساتھ کھیلا کرو۔ آؤ میں تمہارا دوست بنتا ہوں۔ لو وہ میرے ساتھی بھی آ پہنچے۔ کھیلو گے ہمارے ساتھ"۔ میں نے مسکرا کر رضا ظاہر کی۔ اور اُس نے بطور ساتھی میرا سب سے تعارف کرایا۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے ابھی دنیا میں میرے زندہ رہنے کی گنجائش ہے۔

دیر تک ہم آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ آنے جانے والے لوگ مجھے بچوں سے کھیلتا ہوا دیکھ کر تعجب سے مسکراتے۔ یا ایک آدھ پھبتی کس کر آگے چل دیتے۔ مگر میں اپنے شغل اور ساتھیوں کی صحبت میں مشغول رہا۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے ایران کے فلسفی شیخ بہلول کی روح مجھ میں آگئی ہے۔ مٹی نے جہاں میری طبیعت میں ایک قسم کی انکساری اور خیال آفرینی پیدا کی ہے۔ وہاں اس نے ایک نرالی قسم کی قوت برداشت اور تنہائی پسندی کی نعمت بھی عطا کی ہے۔ لوگ مجھے مختلف قسم کے طعنوں اور طنزوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ مگر میں ہر طرف سے بے پروا رہتا ہوں۔ بعض شاید میرے اس رویے کو بزدلی اور شکست خوردہ ذہنیت کا نام دیں۔ مگر میں اپنی اس عادت پر نازاں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ دل اور اس کے قریب رہنے والے غصے اور حسد پر فتح حاصل کرنا اور دنیا کی برائیوں میں رہ کر اپنے آپ میں گم رہنا انتہا درجے کی ریاضت ہے۔ سوسائٹی سے غصے اور حسد کی آنچ ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں روح اور ذہن سے اس کی طاقتِ پرواز چھین لیتے ہیں۔ جو حقیقت میں انسان کی موت ہے۔ مگر شکر ہے مٹی کی مہربانی سے میں اپنی زندگی کے یہ سب لوازمات رکھتا ہوں۔

ایک شام کو جب کہ میں اپنے ننھے منے ساتھیوں میں کھیل رہا تھا۔ میرے پرانے مہربان۔ یا کہیے۔ میری مخالف محاذ کی ہائی کمانڈ۔ گرتہ وال سنجیدگی سے دڑک گئی۔ نہ جانے ان کا یہ اس طرح آنا اتفاقی امر تھا۔ یا کسی طرح طے شدہ پروگرام کے مطابق۔ لیکن وہ آئے اس طرح جیسے کسی کام کو جا رہے ہوں۔ اور راہ میں عجیب تماشہ دیکھ کر رک گئے ہوں۔ ہم کھیل رہے تھے۔ اور لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔

پجاری جی بولے "دیکھتے ہو۔ یہ کلجگی کنہیا ہیں"

بھگت جی نے کہا "مگر وہ تو ماکھن کھاتے تھے۔ اور گوال بالوں کے ساتھ راس رچاتے تھے۔"

پجاری — "تو یہ مٹی سے کھیلتے ہیں۔ گوال بالوں کی جگہ محلے بھر کے لڑکے بدلے دیکھ لو —" اس پر سب ہنس پڑے۔

بھگت جی کہنے لگے۔ "اس شخص کا انتظام کیجئے پنڈت جی۔ یہ دن بدن خطرناک ہو رہا ہے۔ بچے بھی اس کی صحبت سے خراب ہو جائیں گے۔ پرسوں کل مجھے پتھر مارنے دوڑا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب ایک نظر سارے حاضرین پر ڈال کر بولے "یہ شخص واقعی پاگل ہے۔ میرے پاس سینکڑوں ایسے مریض آتے ہیں۔ جن کی علامتیں اس سے ملتی جلتی ہیں۔"

یہ بات کہتے ہوئے وہ اپنے بوٹ کی نوک سے مٹی کے ڈھیلے کچل رہے تھے۔ پنڈت جی اور بھگت جی کے ساتھ چند اور بزرگ بھی غیر ارادی طور پر یہی شغل فرما رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکچر جاری رکھتے ہوئے فرمایا "اور جب اس قسم کے مریض کا مرض حد سے بڑھ جاتا ہے۔ تو وہ مٹی سے کھیلنے لگتا ہے۔ پھر یہی مٹی پتھروں کی شکل اختیار کر کے سب کی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔" میں نے ان کی یہ بات سن کر ان کی طرف دیکھا۔ اچانک جیسے وہ اپنی غلطی بھانپ گئے۔ اور مٹی کا شغل چھوڑ کر سنبھل گئے۔ لڑکوں نے میری حمایت میں خوشی کا نعرہ لگایا۔ پنڈت جی اور ڈاکٹر صاحب جھنجلا گئے۔ بھگت جی لال پیلی آنکھیں نکال کر بولے "دیکھ لو ابھی سے اس آنے والی برائی کا تھوڑا سا نمونہ لڑکے ابھی سے اس سودائی کے ساتھ سودائی ہو رہے ہیں" مگر معلوم ہوتا تھا۔ حاضرین میں زیادہ تعداد محض تماشائیوں کی تھی۔ اس لئے کسی اور نے میری مخالفت میں حصہ نہیں لیا۔ پنڈت جی نے پھر ایک تیر چھوڑتے ہوئے فرمایا — "آخر تم نے مٹی میں کونسی بات پائی ہے۔ جس سے تم نے دنیا بھر کو چھوڑ کر اس سے لو لگائی ہے؟"

ڈاکٹر — "اجی یہ اپنے وقت کے لقمان ہیں لقمان۔ خواہ مخواہ زبان کھولنے کی تکلیف دیتے ہو حضرت کو۔ ابھی وہ فلسفہ جھاڑنے لگیں گے۔ کہ بھاگتے ہی بنے گی۔" اس پر انہوں نے قہقہہ لگایا۔ ان کا خیال تھا۔ کہ لوگ ساتھ دیں گے۔ مگر سب چپکے رہے۔ تو وہ کھسیا کر پنڈت جی سے بولے۔ "پنڈت جی ان کو گورو دھارن کر لیجئے۔ یہ بہت کام کے آدمی ہیں۔"

پنڈت جی جھلا کر بولے "یہ احمق میرا گورو بننے لائق ہے ۔ چھی چھی ۔ میں خود کاشی ہو کے آیا ہوں ۔ یہ بھلا مجھے کیا سکھلائے گا ۔ بیکار کی کتابیں پڑھ پڑھ کے اسکا دماغ چل گیا ہے ۔ پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے ——— "کیوں کچھ بتاؤ ۔ اپنے گروجو ہم کو بھی ۔ شاید ہم بھی تمہارا سیدھا سادا کچھ عالم ہو" میں نے کہا "یہ ضروری نہیں میری باتیں آپ کے مطلب کی ہوں ۔ اور مجھے اس کی بھی پتا نہیں کہ ان کا آپ پر اثر ہوتا ہے کہ نہیں ۔ مگر اپنے خیالات آپ ظاہر کرتا ہوں" یہ کہہ کر اور سب کو متوجہ دیکھ کر میں نے فلسفیانہ انداز میں تقریر شروع کی "مٹی ——— ظاہر میں کتنا مختصر لفظ ہے ۔ مگر اس میں جگیوں پر اور صدیوں کی داستان چھپی ہے ۔ آج سے بہت زمانہ پہلے انسان جب ابھی مٹی سے قریب تھا ۔ تو آسمان کی اونچائیوں نے بارہا اس کے قدم لینے کی کوشش کی ۔ تاریخ کے پرانے ورق ابھی تک اس امر کے گواہ ہیں ۔ کہ اکثر آسمان اس پستی نشیں کے آگے جھکا بھی ۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ۔ انسان نے روح سے دامن چھڑا کر دماغ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ۔ جب تک وہ روح اور فطرت کے قریب تھا ۔ ساری دنیا اس کی تھی ۔ مگر دماغ کی غلامی اختیار کرنے کے بعد اس کی ضرورتیں بڑھ گئیں ۔ دنیا اسے تنگ نظر آنے لگی ۔ اور روح کی تلوار کند ہونے لگی ۔ آج مادی طاقت کا زمانہ ہے ۔ انسانی غرور نے پستی کی وسعتوں کو چھوڑ کر آسمان کی پہنائیوں کو چھونے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے ۔ مگر نتیجہ کیا ۔ جسقدر اس نے اٹھنا چاہا ۔ اسقدر بلندیاں نے اسے نیچے کو دھکیلا ——— ہاں تو میں اپنے موضوع سے ذرا دور نکل گیا ہوں ۔ ذکر تھا مٹی کا ۔ مٹی کی فطرت سکون ۔ طمانیت اور انکساری ہے ۔ جو اس کے قریب آتا ہے ۔ یہ اسے اپنے ہی رنگ میں رنگ دیتی ہے ——— میں روز دیکھتا ہوں ۔ آسمانوں کی بلندیوں کو ناپنے والے باز عقاب اور تیتر جب اونچائیوں کے تھپیڑوں سے گھبرا جاتے ہیں ۔ تو وہ اپنی تھکاوٹ اور کوفت مٹی میں کھیل کر مٹاتے ہیں ۔ ان پرندوں نے اس مادی ترقی کے زمانے میں بھی اپنی ازلی عادات اور اصلی سرشت نہیں چھوڑی ۔ یہی وجہ ہے ۔ مٹی نے ان کے مزاج اور عادات میں درشتی اور غیر یقینی پن نہیں آنے دیا ۔ انکساری کی روشنی نے ان کی روح کو اجاگر رکھا ۔ اور وہ آج بھی آسمان کی خبر لاتے ہیں ——— دور کیوں جایئے ۔ انسان نے سادگی کے دور میں اس مٹی کے گڑھوں اور جھونپڑوں میں رہ کر اپنی روح کو اونچا اٹھایا ۔ اور بارہا اس روشنی کو دیکھا ۔ جسے آج کی زبان میں خدا کہتے ہیں ۔ مگر جیسے ہی اس کی روح سو گئی ۔ مٹی کے قریب جانا اس کی ذہنی شخصیت نے زیانِ اوقات سمجھا ۔ تو وہ روشنی جو انکساری اور سادگی نے اس کو دکھائی تھی ۔ انسانی دسترس سے ہٹنی شروع ہوئی ۔ انسان نے اس کو قبضے میں رکھنے کیلئے پتھر اور اینٹوں کے عبادت خانے نما مکان تعمیر کئے ۔ اس روشنی کے خیالی مجسمے بنائے ۔ مگر بات نہ بنی اس جوت نے زمین کو چھوڑ کر آسمان کو اٹھنا شروع کیا ۔ انسانی حرص اور طاقت نے پیچھا کیا ۔ مگر جوں جوں وہ اسے گرفت میں لانے کی کوشش میں اوپر اٹھتی ۔ خدا اس سے دور ہوتا گیا ۔ آخر کسی نامعلوم وسعت میں گم ہو گیا ۔ انسانی طاقت اور پیچ و تاب میں ہار کر رہ گئی ——— گو عالیشان عمارتیں اور عبادت گاہیں ظاہر میں فخر سے سر اٹھائے کھڑی ہیں ۔ مگر خدا کی روشنی سے محروم ۔ صرف اینٹ اور پتھر کے بے جان بت اور آسمان کو تکتے ہوئے بے مقصد کلس اور مینار ۔ انسانی پندار کی شکست کے آئینہ دار کھڑے ہیں ———

اور سچی بات یہ ہے ۔ کہ کچی اور چکنی مٹی کے ڈھیلے میرے سچے اور ہمدرد دوست ہیں ۔ انسان کی دوستی نے مجھے ہمیشہ تکلیف دی ۔ مگر مٹی کی دوستی نے ایک ابدی سکون کا احساس ۔ یہی وجہ ہے ۔ جب میں مٹی سے کھیلتا ہوں ۔ تو دنیا والوں کے طعنوں اور تمسخر کی پرواہ نہیں کرتا ۔ لوگ باگ مجھ پر پھبتیاں کستے ہوئے میرے پاس سے گزر جاتے ہیں ۔ مگر میں ان کی حالت کو رحم کے قابل سمجھتا ہوا اپنے پیارے دوست کے قرب کو نہیں چھوڑتا ۔ آخر کیوں ! انسانی دوست کی طبیعت کہاں تک ایک دوست کی جائز و ناجائز خواہشات کا بار اٹھا سکتی ہے ۔ اس کیلئے کہاں تک اپنے قیمتی وقتوں کو قربان کرنے کی ہمت ہے ۔ مگر میری یہ مدت کی دوست مٹی میری خواہشوں اور مرضی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہر وقت میرے انتظار میں رہتی ہے ——— "

لوگ میری خشک اور بے معنی سی تقریر سے مرعوب ہو کر چلے گئے ۔ اور میرے یہ مہربان ناکام ہو کر اچانک میرا لیکچر اور سودا چھوڑ کر کھسکنے لگے ۔ اور ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر چل دیئے ۔ "اس کا مرض لاعلاج ہے ۔"

اور پجاری جی میرے حق میں یہ پرارتھنا کرتے ہوئے کہ "ٹھاکر جی تمہاری سمجھ کی رکھشا کریں تم ناستک ہو رہے ہو" اور وہ پجاری بھگت ہم

مجھ پر ایک غصے کی نظر ڈال کر بازار کو راہی ہوئے ——— اس دوران میں میرے ننھے منے ساتھی خاموشی سے بیٹھے ہوئے یہ عجیب و غریب باتیں سُن رہے تھے۔ تنہائی پا کر ایک بچہ بولا "تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ مگر لنگڑوں سے ایسی باتیں کہنے کا فائدہ کوئی سمجھا بھی؟"

اس پر کئی ننھے منے خوش ہو کر بول اُٹھے "میں سمجھا ہوں ——— میں سمجھ گیا ہوں"

میں سوچنے لگا "یہ روحیں زندہ ہیں۔ ان پر دنیاوی ملوث ابھی نہیں چھایا۔ میری رُوح کی گفتگو فوراً ان کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ مگر افسوس کب تک؟ جب تک یہ مٹی کے قریب رہیں گے۔ مٹی کی طینت اور فطرت کس قدر خیال آفرین اور فطانت ہے۔ تعجب تو یہ ہے۔ کہ انسانی بناوٹ میں سب سے زیادہ حصہ مٹی کا ہے۔ مگر حیرت ہے۔ زندہ ہو کر اس نے مُردے کی خصلت کیوں اختیار کر لی۔ کیا مجسم ہونے پر اس نے اپنی فطرت بدل لی۔ بس یہ سوچتا ہوا مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھ جھاڑتا ہوا گھر سے چلا آیا۔ میرے ننھے ساتھی حیران ہو رہے تھے۔ کہ آج اس نے خلافِ معمول ہم سے کھیلنا کیوں چھوڑ دیا؟"

تاجور سامری

مری زیست کا افسانہ

مختصر سا یہ مری زیست کا افسانہ ہے

ایک احساس ——— کہ جو مجھ سے بیاں ہو نہ سکے
ایک آنسو ——— کہ جو آنکھوں سے رواں ہو نہ سکے
ایک نغمہ ——— کہ جو خوابیدہ ابھی ساز میں ہے
ایک شعلہ ——— جو نہاں روح کی آواز میں ہے
ایک حسرت ——— کہ جو محرومِ تکلم ہی رہے
گلِ افسردہ ——— کہ بے رنگِ تبسم ہی رہے
خواب ——— جو رُو کشِ تعبیر نہیں ہو سکتا
اک تصور ——— کہ جو تصویر نہیں ہو سکتا
ایک طوفان ——— کہ جو قطرۂ شبنم میں رہے
ایک سیلاب ——— کہ جو دیدۂ پُر نم میں رہے
موج ——— ساحل کے قریں رہ کے بھی طوفاں نہ بنے
اک قدم ——— جو سرِ منزل ہو یہ منزل نہ بنے

مختصر سا یہ مری زیست کا افسانہ ہے

مجید لاہوری

غزل

کیوں خوش ہیں عدو ہم ابھی ہارے نہیں جاتے
جو زندہ ہوں مرجاتے ہیں مارے نہیں جاتے

آزادئ احساس کو پابند کرو گے؟
افلاک سے یہ تارے اُتارے نہیں جاتے

احسان کرو بخش دو احسان سب اپنے
احسان تمہارے تو اُتارے نہیں جاتے

بس ایک نگاہِ کرم اے محسنِ رندان
مجھ سے مرے حالات سنوارے نہیں جاتے

زیبا ہے کہ ہوں ورطۂ امواج ہی کی نذر
طوفاں سے سفینے جو گذارے نہیں جاتے

مدت سے محبت کی تپش سرد ہے فطرت
آہوں سے مگر اب بھی شرارے نہیں جاتے

اعجازِ سخن

باتوں کے حسین فانوسوں میں
ہر لفظ اچھوتا موتی ہے
ہر اک موتی کی لرزش سے
معنی کی تراوش ہوتی ہے
اندازِ سخن کی داد ملے

خاموشی تکلّم پر قادر
سرشار نگاہوں کی صور[illegible]
مانوس سی دُنیائے معنی
بھولی ہوئی راہوں کی ص[illegible]
اعجازِ سخن کی داد ملے

نغمات کے پردوں میں بس کر
اشعار فضاؤں میں کھ[illegible]
اک قصرِ منوّر کے باسی
ان شعروں کو سُن سُن کر
پروازِ سخن کی داد ملے

عبدالعزیز فطرت

ڈاکٹر گلکرائسٹ اور نواب شمس الامرا کی اُردو خدمات کا جائزہ

یعنی

اُردو میں علم سائنس کی ابتدائی کتابیں

فورٹ ولیم کالج یا ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے اُردو کارناموں کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ چنانچہ سید محمد صاحب ایم۔ اے ریڈر عثمانیہ نے اپنی کتاب "ارباب نثر اُردو" میں تفصیل کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کے اردو کارنامے اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کی اردو نوازیوں کو اُجاگر کیا ہے، دوسرے ارباب قلم نے بھی مدح اور ستائش کی تحسین اور آفرین کے تحفے دیئے ہیں، ابھی حال میں جناب اطہر دہلوی نے رسالہ "آج کل" میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی مدح سرائی کرتے ہوئے ان کے کارناموں کو سراہا ہے۔

مگر بعض حقیقت شناس اور صداقت پسند اہل قلم ڈاکٹر صاحب موصوف کی اردو خدمات کو حقیقت کے آئینہ میں دیکھنے اور صداقت کے ترازو میں تولنے کی پہل کر چکے ہیں، چنانچہ نومبر ۱۹۴۲ء کے رسالہ ہمایوں میں پروفیسر ادریس احمد ادیب نے ایک عالمانہ اور جامع مضمون میں ڈاکٹر صاحب کی اُردو خدمات کا جائزہ لیا ہے اور اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر اردو کی ترقی مدنظر نہیں تھی بلکہ اپنے ہم وطن انگریزوں کو اردو سکھانا اور پھر اردو اور ہندی کو جدا جدا صورت میں پرورش کرنے کا بیج بونا ان کا اصلی مقصد تھا۔ اس میں ان کو پوری کامیابی ہو گئی، اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے جو قصہ کہانیوں کی کتابیں سلیس اردو میں لکھوائیں یا خود لغت، صرف و نحو گرامر کی کتابیں مرتب کیں اس کی وجہ یہی تھی کہ انگریز عہدہ دار اور کمپنی کے ملازم جلد سے جلد اُردو سے واقف ہو جائیں، اور پھر سیاسی مصلحت کے تحت مسلمانوں اور ہندوؤں کو جدا جدا زبانوں کی پرورش دینے میں تفریق کر دینا بھی مدنظر تھا، اس کوشش نے آج جو صورت اختیار کر لی ہے وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں ہے۔

اگر ہم فورٹ ولیم کالج کی تیار کردہ کتابوں پر نظر ڈالیں تو یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ گو یہ کتابیں اس زمانہ کے عام رجحان کے خلاف عام فہم اور سلیس زبان میں مرتب ہوئی ہیں، مگر جس قدر کتابیں تیار ہوئیں ان میں زیادہ تر قصے اور کہانیوں کی کتابیں تھیں تاکہ ایک اجنبی غیر زبان دان شخص دلچسپی سے پڑھ سکے، اور اُس کو جلد سے جلد زبان پر عبور حاصل ہو جائے، سائنس اور دیگر فنون کی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے کارناموں کا آغاز سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے ہوتا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اس سے پہلے صرف نحو اور لغت کی چند کتابیں بطور خود مرتب کر دی تھیں، مگر باقاعدہ طور پر کمپنی کی حکومت کی نگرانی میں اس کام کا آغاز ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو ہوا جبکہ کالج کا افتتاح کیا گیا تھا، ان مطبوعات کو اگر فن کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو اس کی تقسیم حسب ذیل فنون پر کی جا سکتی ہے۔

(۱) قصے کہانیاں (۲) لغت (۳) صرف و نحو (۴) تاریخ (۵) منظومات۔ (۶) اخلاق۔

غزل

کیوں خوش ہیں عدو ہم ابھی ہارے نہیں جاتے
جو زندہ ہوں مرجاتے ہیں مارے نہیں جاتے

آزادئ احساس کو پابند کرو گے؟
افلاک سے یہ تارے اُتارے نہیں جاتے

احسان کرو بخش دو احسان سب اپنے
احسان تمہارے تو اُتارے نہیں جاتے

بس ایک نگاہِ کرم اے محسنِ رندان
مجھ سے مرے حالات سنوارے نہیں جاتے

زیبا ہے کہ ہوں ورطۂ امواج ہی کی نذر
طوفاں سے سفینے جو گذارے نہیں جاتے

مدت سے محبت کی تپش سرد ہے فطرت
آہوں سے مگر اب بھی شرارے نہیں جاتے

اعجازِ سخن

باتوں کے حسین فانوسوں میں
ہر لفظ اچھوتا موتی ہے
ہر اک موتی کی لرزش سے
معنی کی تراوش ہوتی ہے
اندازِ سخن کی داد ملے

خاموشی تکلّم پر قادر
سرشار نگاہوں کی صورت
مانُوس سی دُنیائے معنی
بُھولی ہوئی راہوں کی صورت
اعجازِ سخن کی داد ملے

نغمات کے پردوں میں بس کر
اشعار فضاؤں میں کھوئے
اک قصرِ منوّر کے باسی
ان شعروں کو سُن سُن کر روئے
پروازِ سخن کی داد ملے

عبدالعزیز فطرت

ڈاکٹر گلکرائسٹ اور نواب شمس الامراء کی اردو خدمات کا جائزہ

یعنی

اردو میں علم سائنس کی ابتدائی کتابیں

فورٹ ولیم کالج یا ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے اردو کارناموں کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، چنانچہ سید محمد صاحب ایم۔ اے رشتہ نیہ نے اپنی کتاب "ارباب نثر اردو" میں تفصیل کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کے اردو کارنامے اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کی اردو نوازیوں کو اجاگر کیا ہے۔ دوسرے ارباب قلم نے بھی مدح اور ستائش کی تحسین اور آفرین کے تمغے دیے ہیں۔ ابھی حال میں جناب اطہر دہلوی نے رسالہ "آج کل" میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی مدح سرائی کرتے ہوئے ان کے کارناموں کو سراہا ہے۔

مگر بعض حقیقت شناس اور صداقت پسند اہل قلم ڈاکٹر صاحب موصوف کی اردو خدمات کو حقیقت کے آئینہ میں دیکھنے اور صداقت کے ترازو میں تولنے کی پہل کر چکے ہیں، چنانچہ نومبر ۱۹۶۲ء کے رسالہ ہماری زبان میں پروفیسر ادریس احمد ادیب نے ایک ناقدانہ اور جامع مضمون میں ڈاکٹر صاحب کی اردو خدمات کا جائزہ لیا ہے اور اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر اردو کی ترقی مدنظر نہیں تھی بلکہ اپنے ہم وطن انگریزوں کو اردو سکھانا اور پھر اردو اور ہندی کو جدا جدا صورت میں پیش کرنے کا بیج بونا ان کا اصلی مقصد تھا۔ اس میں ان کو پوری کامیابی ہو گئی، اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے جو قصہ کہانیوں کی کتابیں سلیس اردو میں لکھوائیں یا خود لغت، صرف و نحو گرامر کی کتابیں مرتب کیں اس کی وجہ یہی تھی کہ انگریز عہدہ دار اور کمپنی کے ملازم جلد سے جلد اردو سے واقف ہو جائیں، اور پھر سیاسی مصلحت کے تحت مسلمانوں اور ہندوؤں کو جدا جدا زبانوں کی پرورش دینے میں تفریق کر دینا بھی مدنظر تھا، اس کوشش نے آج جو صورت اختیار کر لی ہے وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں ہے۔

اگر ہم فورٹ ولیم کالج کی تیار کردہ کتابوں پر نظر ڈالیں تو یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ گو یہ کتابیں اس زمانہ کے عام رجحان کے خلاف عام فہم اور سلیس زبان میں مرتب ہوئی ہیں، مگر جس قدر کتابیں تیار ہوئیں ان میں زیادہ تر قصے اور کہانیوں کی کتابیں تھیں تاکہ ایک اجنبی غیر زبان داں شخص دلچسپی سے پڑھ سکے، اور اس کو جلد سے جلد زبان پر عبور حاصل ہو جائے، سائنس اور دیگر فنون کی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے کارناموں کا آغاز ۱۸۰۰ء کے بعد سے ہوتا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اس سے پہلے صرف و نحو اور لغت کی چند کتابیں بطور خود مرتب کر دی تھیں، مگر باقاعدہ طور پر کمپنی کی حکومت کی نگرانی میں اس کام کا آغاز ۱۸۰۰ء کو ہوا، جبکہ کالج کا افتتاح کیا گیا تھا، ان مطبوعات کو اگر فن کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو اس کی تقسیم حسب ذیل فنون پر کی جا سکتی ہے۔

(۱) قصے کہانیاں (۲) لغت (۳) صرف و نحو (۴) تاریخ (۵) منظومات۔ (۶) اخلاق۔

ان میں زیادہ تر قصے کہانیوں کے متعلق کتابیں ملتی ہیں، اگرچہ تاریخ اور اخلاق کے عنوان بھی نظر آتے ہیں، مگر ان فنون میں ایک ایک دو دو سے زیادہ کتابیں نہیں ملتیں، اور پھر ان میں بھی زیادہ تر کتابیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں یا تصنیف ہوئی ہے۔ مغربی زبانوں سے کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ یہ امر ظاہر تھا کہ ان کتابوں کو یورپین اشخاص کے استفادہ کے لئے تیار کیا گیا تھا، اور ان کو مغربی زبانوں کی کتابوں کی ضرورت نہیں تھی، اگر اردو زبان کی ترقی مدنظر ہوتی تو سائنس اور دیگر فنون کی کتابوں کا ترجمہ مغربی زبانوں سے کیا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اُردو کو آسان اور سلیس زبان میں لکھنے کا رواج دیا اور آئندہ مصنفین کے لئے ایک نئی راہ بتائی اس حیثیت سے ان کی خدمات ضرور قابل قدر ہیں۔ گو اس کارنامے میں ان کی خود غرضی کیوں نہ شامل ہو، لیکن پھر بھی اس کے مفید اور سودمند ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے مقابل جب ہم نواب شمس الامرا کے کارناموں پر نظر کریں تو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نواب صاحب کا کارنامہ ڈاکٹر صاحب کے کارنامہ سے ہر طرح ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اس موقع پر اولاً نواب شمس الامرا کا مختصر طور پر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نواب شمس الامرا کے خاندان کے مورث اعلیٰ ابوالخیر خاں حضرت بابا فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں سے ہیں، اور آصف جاہ اول کے ہمراہ دہلی سے دکن آئے، ان کی نمایاں خدمات کے مدنظر آصفجاہ نے جاگیرات اور اعلیٰ مراتب سے سرفراز کیا۔ ان کے بعد ان کی اولاد دکن میں ممتاز حیثیت حاصل کرلی، آصفجاہیوں نے جاگیرات اور نوازشات بہر اندوز فرمایا۔ اس وقت بھی اس خاندان کی جاگیرات تین اسیر دل پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک نواب ظفر یار جنگ بہادر امور مذہبی وغیرہ کے صدر المہام ہیں، ان جاگیرات کا رقبہ کئی ہزار مربع میل ہے۔ اور ان کی آمدنی تقریباً ایک کروڑ روپیہ ہے، اس طرح یہ خاندان جو پائگاہ سے موسوم ہے برٹش انڈیا کے کئی دیسی رؤسا اور اسٹیٹوں سے بڑا ہے۔

ابوالخیر کے پوتے نواب فخر الدین خاں تھے جن کو شمس الامرا امیر کبیر کا خطاب ملا تھا۔ آپ کی ولادت ۱۱۹۵ھ اور انتقال ۱۲۷۰ھ میں ہوا۔ چہتر اسی سال کی طویل عمر پائی، شمس الامرا، آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں کے داماد بھی تھے۔ صاحب سیف و قلم کی حیثیت سے آپ کا تعارف کرایا جا سکتا ہے آپ کو کئی لاکھ روپیہ کی جاگیر اس غرض سے مرحمت ہوئی تھی کہ ایک خاص فوج ترتیب دی جائے۔ یہ فوج آصفجاہ کے باڈی گارڈ کی حیثیت رکھتی تھی، اور دن رات شاہی جلوخانہ میں تیار اور مستعد رہا کرتی۔ عمدہ ساز و سامان سے آراستہ اور انعام خوار ماہوار کے ملازمین ہوتے تھے۔

شمس الامرا اپنے وقت کے صاحب علم و فضل تھے، مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی زبانوں سے بخوبی آگاہی تھی۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان پر اچھا عبور تھا۔ علم ریاضی، ہیئت، طبیعیات اور کیمیا سے زیادہ دلچسپی تھی۔ علم دوستی علم پروری کے لحاظ سے آپ کا نام زندگی جاوید کا مستحق ہے، کئی مدرسے قائم کئے، طلبہ کو وظائف عطا کئے، شعراء اور مصنفین کو صلہ دے کر ان کی ہمت افزائی فرمائی، آپ کے سرپرستی میں بیسیوں ارباب قلم نے اپنے افکار اور خیالات کو کتابوں کی صورت

---

[1] شمس الامرا کے بعد ان کی اولاد کو آج تک یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کو شاہی دامادی کا فخر ملتا ہے۔

میں منظر عام پر پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔

نواب شمس الامرا کا سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آج سے سو سال پہلے آپ نے مغربی زبانوں سے علم طبعیات، کیمیا، ریاضی، ہیئت اور طب کی کئی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کر کے شائع فرمایا اور پھر ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شمس الامرا کا یہ کارنامہ ایسا درخشاں اور ممتاز ہے کہ جس کو زمانہ مٹا سکتا ہے اور نہ حوادثات اس کو محو کر سکتے ہیں۔

۱۲۳۰ھ میں آپ نے ایک دارالترجمہ قائم فرمایا جس میں میر امان علی دہلوی، غلام محی الدین حیدرآبادی، مسٹر جونس اور مونسی ندستی کا کام کرتے تھے۔ نواب صاحب خود بھی ترجمہ اور تصنیف میں بہ نفس نفیس حصہ لیا کرتے تھے۔ بہرحال آپ کے علمی کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے[1]۔ یہاں اس کی صراحت طوالت کا موجب ہوگی۔ آپ کے جانب سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ستہ شمسیہ (۲) رسالہ جرثقیل، (۳) رسالہ اصول علم حساب (۴) رسالہ علم کیمسٹری (۵) رسالہ کسورات اعشاریہ (۶) رسالہ اسطرلاب کروی۔ (۷) رسالہ علم حیوانات (۸) رسالہ موتی کے چونکلنے کے متعلق (۹) خلاصۃ الادویہ (۱۰) نافع الامراض (۱۱) ترکیب ادویہ

(۲)

یہ موقع نہیں ہے کہ ہم مندرجہ بالا کتابوں کے متعلق تفصیلی صراحت کریں اس لئے صرف ایک کتاب یعنی ستہ شمسیہ کا کس قدر صراحت سے تعارف کرایا جاتا ہے۔

ستہ شمسیہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ چھ کتابوں کا مجموعہ ہے یا یہ کہ یہ چھ حصوں پر مشتمل ہے اس کا حجم (۲۰۸۰) صفحات پر حاوی ہے پہلی جلد میں جر ثقیل، ہیولا اور اس کے انفعالات، کشش اتحاد، کشش ثقل، مرکز جر ثقیل کی دیگر قوتوں کا تذکرہ ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے فنی حیثیت سے جو معلومات تھیں وہ قابل قدر تھیں۔ مثلاً کثافت، جسامت، وزن وغیرہ کے متعلق جو معلومات تھیں وہ اس زمانہ میں تقریباً یقینی اب بالکل صحت کے ساتھ ان کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ پیچ، ترازو، حرکت سے متعلق کلیات وغیرہ کو پیش کر دیا گیا ہے۔

دوسری جلد میں علم ہیئت کا بیان ہے۔ اس میں ثوابت، نظام شمسی، حرکت زمین، چاند اور دوسرے ستارے، موسم، مد و جزر، ایام کے اعتدال حقیقی اور کبیسہ وغیرہ کا بیان ہے۔ سو برس پہلے جبکہ یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس وقت عام طور سے سیاروں کو دیمی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مریخ کو جلاد، مشتری کو سعد تصور کرتے تھے۔ شمس الامرا کے ان ترجموں کے باعث توہم پرستی کے دائرہ سے باہر ہو کر اردو کی علمی دنیا میں صحیح معلومات پیش ہوئیں، ستاروں کے مختلف مداروں کی گردش اور ان کے محوروں کا میلان۔ ان میں تناسب، موسمی تبدیلیاں اور ان کی حرارت وغیرہ کا صحیح خیال ہمارے سامنے پیش ہوا۔ اس میں چاند گرہن اور سورج گرہن کے متعلق بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسری جلد کو علم آب سے موسوم کیا گیا ہے۔ لیکن دراصل مائیات ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں مائیات سے ہی بحث کی گئی ہے، ارشمیدس کے اصول کو ایک سو سال پہلے اردو میں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا قابل تعریف ہے، آب پیما ہائیڈرومیٹر کے بیان کے علاوہ سیفن کے اصول کو بھی سمجھایا گیا ہے، پانی میں تیرنے والے اجسام کے متعلق بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھی جلد علم ہوا سے متعلق ہے، اس میں ہوا کے وزن، دباؤ، ہلکی ہوائی پمپ، آگ وغیرہ کا تذکرہ ہے، کلیہ بائل کو آج سے سو سال پہلے بہت اہم خیال کیا جاتا تھا۔ اور اب تک اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایف اے کے نصاب میں شامل ہے

---

[1] شمس الامرا کے علمی کارناموں کے متعلق اہم مواد جمع کیا ہے ہم انشاء اللہ کتابی صورت میں ان کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ان میں زیادہ تر قصے کہانیوں کے متعلق کتابیں ملتی ہیں، اگرچہ تاریخ اور اخلاق کے عنوان بھی نظر آتے ہیں، مگر ان فنوں میں ایک ایک دو دو سے زیادہ کتابیں نہیں ملتیں، اور پھر ان میں بھی زیادہ تر کتابیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں یا تصنیف ہوئی ہیں، مغربی زبانوں سے کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ یہ امر ظاہر تھا کہ ان کتابوں کو یورپین اشخاص کے استفادہ کے لئے تیار کیا گیا تھا، اور ان کو مغربی زبانوں کی کتابوں کی ضرورت نہیں تھی، اگر اردو زبان کی ترقی مد نظر ہوتی تو سائنس اور دیگر فنون کی کتابوں کا ترجمہ مغربی زبانوں سے کیا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اردو کو آسان اور سلیس زبان میں لکھنے کا رواج دیا اور آئندہ مصنفین کے لیے ایک نئی راہ بتائی اس حیثیت سے ان کی خدمات ضرور قابل قدر ہیں۔ گو اس کارنامے میں ان کی خود غرضی کیوں نہ شامل ہو لیکن پھر بھی اس کے مفید اور سودمند ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے مقابل جب ہم نواب شمس الامرا کے کارناموں پر نظر کریں تو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نواب صاحب کا کارنامہ ڈاکٹر صاحب کے کارنامہ سے ہر طرح ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اس موقع پر اولاً نواب شمس الامرا کا مختصر طور پر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نواب شمس الامرا کے خاندان کے مورث اعلیٰ ابوالخیر خاں حضرت بابا فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں سے ہیں، اور آصف جاہ اول کے ہمراہ دہلی سے دکن آئے، ان کی نمایاں خدمات کے مد نظر آصفجاہ نے جاگیرات اور اعلیٰ مراتب سے سرفراز کیا۔ ان کے بعد ان کی اولاد نے دکن میں ممتاز حیثیت حاصل کرلی، آصفجاہوں نے جاگیرات اور نوازشات بہرا اندوز فرمایا۔ اس وقت بھی اس خاندان کی جاگیرات تین امیروں پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک نواب ظہیر یار جنگ بہادر امور مذہبی وغیرہ کے صدر المہام ہیں، ان جاگیرات کا رقبہ کئی ہزار مربع میل ہے۔ اور ان کی آمدنی تقریباً ایک کروڑ روپیہ ہے، اس طرح یہ خاندان جو پائیگاہ سے موسوم ہے برٹش انڈیا کے کئی دیسی رؤسا اور اسٹیٹوں سے بڑا ہے۔

ابوالخیر کے پوتے نواب فخر الدین خاں تھے جن کو شمس الامرا امیر کبیر کا خطاب ملا تھا، آپ کی ولادت ۱۱۹۵ھ اور انتقال ۱۲۷۹ھ میں ہوا۔ چوراسی سال کی طویل عمر پائی، شمس الامرا، آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں کے داماد بھی تھے۔ صاحب سیف و قلم کی حیثیت سے آپ کا تعارف کرایا جا سکتا ہے آپ کو کئی لاکھ روپیہ کی جاگیر اس غرض سے مرحمت ہوئی تھی کہ ایک خاص فوج ترتیب دی جائے۔ یہ فوج آصفجاہ کے باڈی گارڈ کی حیثیت رکھتی تھی، اور دن رات شاہی جلوخانہ میں تیار اور مستعد رہا کرتی، عمدہ ساز و سامان سے آراستہ اور انعام خوار ماہوار کے ملازمین ہوتے تھے۔

شمس الامرا اپنے وقت کے صاحب علم و فضل تھے، مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی زبانوں سے بخوبی آگاہی تھی۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان پر اچھا عبور تھا۔ علم ریاضی، ہیئت، طبیعات اور کیمیا سے زیادہ دلچسپی تھی۔ علم دوستی علم پروری کے لحاظ سے آپ کا نام زندگی جاوید کا مستحق ہے، کئی مدرسے قائم کئے، طلبہ کو وظائف عطا کئے، شعراء اور مصنفین کو صلہ دے کر ان کی ہمت افزائی فرمائی، آپ کے سرپرستی میں بیسیوں ارباب قلم نے اپنے افکار اور خیالات کو کتابوں کی صورت

---

[۱] شمس الامرا کے بعد ان کی اولاد کو آج تک یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کو شاہی دامادی کا فخر ملتا ہے۔

میں نظرِ عام پر پیش کر کے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

نواب شمس الامرا کا سب سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر کارنامہ یہ ہے کہ آج سے سو سال پہلے آپ نے مغربی زبانوں سے طبیعیات، کیمیا، ریاضی، ہیئت اور طب کی کئی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کر کے شائع فرمایا اور پھر ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شمس الامرا کا یہ کارنامہ ایسی درخشاں اور منور تاریخ ہے کہ جس کو زمانہ مٹا نہیں سکتا ہے اور نہ حوادثات اس کو محو کر سکتے ہیں۔

۱۲۵۰ھ میں آپ نے ایک دار الترجمہ قائم فرمایا جس میں میر زمان علی دہلوی، غلام محی الدین حیدرآبادی، مسٹر جونس وغیرہ ترجمہ کا کام کرتے تھے۔ نواب صاحب خود بھی ترجمہ اور تصنیف میں بہ نفسِ نفیس حصہ لیا کرتے تھے۔ یوں تو آپ کے علمی کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے[1]۔ یہاں اس کی صراحت طوالت کا موجب ہوگی۔ آپ کے جانب سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ستہ شمسیہ (۲) رسالہ جر ثقیل (۳) رسالہ اصول علم حساب (۴) رسالہ علم کیمسٹری (۵) رسالہ کسورات اعشاریہ (۶) رسالہ سطرلاب کروی (۷) رسالہ علم حیوانات (۸) رسالہ موتی کے جو نکلنے کے متعلق (۹) خلاصۃ الادویہ (۱۰) نافع الامراض (۱۱) ترکیب ادویہ

(۳)

یہ موقع نہیں ہے کہ ہم مندرجہ صدر کتابوں کے متعلق تفصیلی صراحت کریں اس لئے صرف ایک کتاب یعنی ستہ شمسیہ کا کس قدر وضاحت سے تعارف کرایا جاتا ہے۔

ستہ شمسیہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے چھ کتابوں کا مجموعہ ہے یا یہ کہ یہ چھ حصوں پر مشتمل ہے اس کا حجم ۲۰۸۴ صفحات پر حاوی ہے پہلی جلد میں جر ثقیل، نیوٹن اور اس کے انقلابات، کشش اتحاد، کشش ثقل، مرکز جر ثقیل کی دیگر قوتوں کا تذکرہ ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے فنی حیثیت سے جو معلومات تھیں وہ قابل قدر تھیں، مثلاً کثافت، حجامت، وزن وغیرہ کے متعلق جو معلومات تھیں وہ اس دور میں تقریباً ٹھیک اب بالکل صحت کے ساتھ ان کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ پیچ، ترازو، حرکت سے متعلق کلیات وغیرہ کو پیش کر دیا گیا ہے۔

دوسری جلد میں علم ہیئت کا بیان ہے۔ اس میں ثوابت، نظام شمسی، حرکت زمین، چاند اور دوسرے سیارے، موسم، مدوجزر، ایام کے اعتدال حقیقی اور کبیسہ وغیرہ کا بیان ہے۔ سو برس پہلے جبکہ یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس وقت عام طور سے سیاروں کو دیوی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مریخ کو جلاد، مشتری کو سعد تصور کرتے تھے، شمس الامرا کے ان ترجموں کے باعث توہم پرستی کے دائرہ سے باہر ہو کر اردو کی علمی دنیا میں صحیح معلومات پیش ہوئیں، ستاروں کے مختلف مداروں کی گردش اور ان کے محوروں کا میلان۔ ان میں تناسب، موسمی تبدیلیاں اور ان کی حرارت وغیرہ کا صحیح خیال ہمارے سامنے پیش ہوا۔ اس میں چاند گرہن اور سورج گرہن کے متعلق بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسری جلد کو علم آب سے موسوم کیا گیا ہے لیکن دراصل مائیات ہونا چاہئے کیونکہ اس میں مائیات سے ہی بحث کی گئی ہے، ارشمیدس کے اصول کو ایک سو سال پہلے اردو میں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا قابل تعریف ہے، آب پیما ہائیڈرومیٹر کے بیان کے علاوہ سیفن کے اصول کو بھی سمجھایا گیا ہے، پانی میں تیرنے والے اجسام کے متعلق بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھی جلد علم ہوا سے متعلق ہے، اس میں ہوا کے دباؤ، دھار، ہلکی ہوائی پمپ، گرمی وغیرہ کا تذکرہ ہے، کلیہ بائل کو آج سے سو سال پہلے بہت اہم خیال کیا جاتا تھا۔ اور اب تک اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایف اے کے نصاب میں شامل ہے

---

[1] شمس الامرا کے علمی کارناموں کے متعلق بہم مواد جمع کر رہا ہوں، انشاء اللہ کتابی صورت میں ان کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ان میں زیادہ تر قصے کہانیوں کے متعلق کتابیں ملتی ہیں، اگرچہ تاریخ اور اخلاق کے عنوان بھی نظر آتے ہیں، مگر ان فنوں میں ایک ایک دو دو سے زیادہ کتابیں نہیں ملتیں، اور پھر ان میں بھی زیادہ تر کتابیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں یا تصنیف ہوئی ہے، مغربی زبانوں سے کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ یہ امر ظاہر تھا کہ ان کتابوں کو یورپین اشخاص کے استفادہ کے لئے تیار کیا گیا تھا، اور ان کو مغربی زبانوں کی کتابوں کی ضرورت نہیں تھی، اگر اردو زبان کی ترقی مدنظر ہوتی تو سائنس اور دیگر فنون کی کتابوں کا ترجمہ مغربی زبانوں سے کیا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اردو کو آسان اور سلیس زبان میں لکھنے کا رواج دیا اور آئندہ مصنفین کے لیے ایک نئی راہ بتائی اس حیثیت سے ان کی خدمات ضرور قابل قدر ہیں۔ گو اس کارنامے میں ان کی خود غرضی کیوں نہ شامل ہو لیکن پھر بھی اس کے مفید اور سودمند ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے مقابل جب ہم نواب شمس الامرا کے کارناموں پر نظر کریں تو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نواب صاحب کا کارنامہ ڈاکٹر صاحب کے کارنامہ سے ہر طرح ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اس موقع پر اولاً نواب شمس الامرا کا مختصر طور پر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نواب شمس الامرا کے خاندان کے مورث اعلیٰ ابوالخیر خاں حضرت بابا فریدالدین شکر گنج کی اولاد میں سے ہیں، اور آصف جاہ اول کے ہمراہ دہلی سے دکن آئے، ان کی نمایاں خدمات کے مدنظر آصفجاہ نے جاگیرات اور اعلیٰ مراتب سے سرفراز کیا۔ ان کے بعد ان کی اولاد دکن میں ممتاز حیثیت حاصل کرلی، آصفجاہوں نے جاگیرات اور نوازشات بہرا اندوز فرمایا۔ اس وقت بھی اس خاندان کی جاگیرات تین امیروں پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک نواب ظہیر یار جنگ بہادر امور مذہبی وغیرہ کے صدرالمہام ہیں، ان جاگیرات کا رقبہ کئی ہزار مربع میل ہے۔ اور ان کی آمدنی تقریباً ایک کروڑ روپیہ ہے، اس طرح یہ خاندان جو پائگاہ سے موسوم ہے برٹش انڈیا کے کئی دیسی رؤسا اور اسٹیٹوں سے بڑا ہے۔

ابوالخیر کے پوتے نواب فخرالدین خاں تھے جن کو شمس الامرا امیر کبیر کا خطاب ملا تھا، آپ کی ولادت ۱۱۹۵ھ اور انتقال ۱۲۷۹ھ میں ہوا۔ چوراسی سال کی طویل عمر پائی، شمس الامرا، آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں کے داماد بھی تھے۔[1] صاحب سیف و قلم کی حیثیت سے آپ کا تعارف کرایا جا سکتا ہے آپ کو کئی لاکھ روپیہ کی جاگیر اس غرض سے مرحمت ہوئی تھی کہ ایک خاص فوج ترتیب دی جائے۔ یہ فوج آصفجاہ کے باڈی گارڈ کی حیثیت رکھتی تھی، اور دن رات شاہی جلو خانہ میں تیار اور مستعد رہا کرتی۔ عمدہ ساز و سامان سے آراستہ اور انعام خوار ماہوار کے ملازمین ہوتے تھے۔

شمس الامرا اپنے وقت کے صاحب علم و فضل تھے، مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی زبانوں سے بخوبی آگاہی تھی۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان پر اچھا عبور تھا۔ علم ریاضی، ہیئت، طبیعات اور کیمیا سے زیادہ دلچسپی تھی۔ علم دوستی علم پروری کے لحاظ سے آپ کا نام زندگی جاوید کا مستحق ہے، کئی مدرسے قائم کئے، طلبہ کو وظائف عطا کئے، شعراء اور مصنفین کو صلہ دے کر ان کی ہمت افزائی فرمائی، آپ کے سرپرستی میں بیسیوں ارباب قلم نے اپنے افکار اور خیالات کو کتابوں کی صورت

---

[1] شمس الامرا کے بعد ان کی اولاد کو آج تک یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کو شاہی دامادی کا فخر ملتا ہے۔

س نظر عام پر پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔
نواب شمس الامرا کا سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آج سے سو سال پہلے آپ نے مغربی زبانوں سے علم طبیعیات، کیمیا، ریاضی ہیئت اور طب کی کئی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کر کے شائع فرمایا اور پھر ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شمس الامرا کا یہ کارنامہ ایسا درخشاں اور متاثر کن ہے کہ جس کو زمانہ شناسی کے اور حوادثات اس کو محو کر سکتے ہیں۔
۱۲۴۳ھ میں آپ نے ایک دارالترجمہ قائم فرمایا جس میں میر امان علی دہلوی، غلام محی الدین حیدرآبادی، مسٹر جونس وغیرہ ترجمے کا کام کرتے تھے، نواب صاحب خود بھی ترجمہ اور تصنیف میں بہ نفس نفیس حصہ لیا کرتے تھے۔ بہرحال آپ کے علمی کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ یہاں اس کی صراحت طوالت کا موجب ہوگی، آپ کے جانب سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-
(۱) ستہ شمسیہ (۲) رسالہ جر ثقیل، (۳) رسالہ اصول علم حساب (۴) رسالہ علم کیمسٹری (۵) رسالہ کسورات اعشاریہ (۶) رسالہ اصطرلاب کروی، (۷) رسالہ علم حیوانات (۸) رسالہ موتی کے چونکانے کے متعلق (۹) خلاصۃ الادویہ (۱۰) نافع الامراض (۱۱) ترکیب الدوا

(۲)

یہ موقع نہیں ہے کہ ہم مندرجہ صدر کتابوں کے متعلق تفصیلی صراحت کریں اس لئے صرف ایک کتاب یعنی ستہ شمسیہ کا کسی قدر صراحت سے تعارف کرایا جاتا ہے۔
ستہ شمسیہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ چھ کتابوں کا مجموعہ ہے یا یہ کہ یہ چھ حصوں پر مشتمل ہے اس کا حجم (۲۰۸۶) صفحات پر حاوی ہے پہلی جلد میں جر ثقیل، ہیولا اور اس کے انفعالات، کشش اتحاد، کشش ثقل، مرکز جر ثقیل کی دیگر قوتوں کا تذکرہ ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے فنی حیثیت سے جو معلومات تھیں وہ قابل قدر تھیں۔ مثلاً کثافت، حرارت، وزن وغیرہ کے متعلق جو معلومات تھیں وہ اس زمانہ میں تقریباً یقینی اب بالکل صحت کے ساتھ ان کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ پیچ، ترازو، حرکت سے متعلق کلیات وغیرہ کو پیش کر دیا گیا ہے۔
دوسری جلد میں علم ہیئت کا بیان ہے۔ اس میں ثوابت، نظام شمسی، حرکت زمین، چاند اور دوسرے ستارے، موسم، مدوجزر، ایام کے اعتدال حقیقی اور کبیسہ وغیرہ کا بیان ہے، سو برس پہلے جبکہ یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس وقت عام طور سے لوگ ستاروں کو وہمی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مریخ کو جلاد، مشتری کو سعد تصور کرتے تھے، شمس الامرا کے ان ترجموں کے باعث توہم پرستی کے دائرہ سے باہر ہو کر اردو کی علمی دنیا میں صحیح معلومات پیش ہوئیں، ستاروں کے مختلف مداروں کی گردش اور ان کے محوروں کا میلان، ان میں تناسب، موسمی تبدیلیاں اور ان کی حرارت وغیرہ کا صحیح خیال ہمارے سامنے پیش ہوا۔ اس میں چاند گرہن اور سورج گرہن کے متعلق بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔
تیسری جلد کو علم آب سے موسوم کیا گیا ہے، لیکن دراصل مائیات ہونا چاہئے کیونکہ اس میں مائیات سے ہی بحث کی گئی ہے، ارشمیدس کے اصول کو ایک سو سال پہلے اردو میں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا قابل تعریف ہے، آب پیما ہائیڈرومیٹر کے بیان کے علاوہ سیفن کے اصول کو بھی سمجھایا گیا ہے، پانی میں تیرنے والے اجسام کے متعلق بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔
چوتھی جلد علم ہوا سے متعلق ہے، اس میں ہوا کے وزن، دباؤ، لچک ہوائی پمپ، اگو مچ وغیرہ کا تذکرہ ہے، کلیہ بائل کو آج سے سو سال پہلے بہت اہم خیال کیا جاتا تھا اور اب تک اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایف اے کے نصاب میں شامل ہے۔

۱؎ شمس الامرا کے علمی کارناموں کے متعلق اہم مواد جمع کیا جا رہا ہے انشاء اللہ کتابی صورت میں ان کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ہوا اور گیسوں پر دباؤ کی وجہ سے جو حجمی تبدیلی ہوتی ہے اس کو اسی کلیہ کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے، اس کتاب میں بارنماتی اور طیش پیمائی کے متعلق بھی بہت کچھ معلومات ہیں۔[1]

پانچویں جلد میں انعکاس، نور، اور نور کے اجزا محدب عدسے، قوس قزح وغیرہ کا بیان ہے، آج سے سو سال پہلے اس کو "علم المناظر" سے موسوم کیا گیا ہے مگر اب اس کو علم مناظر کہتے ہیں، عصر حاضر میں علم مناظر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو ہندسی مناظر اور دوسرے کو طبعی مناظر کہتے ہیں، اس پانچویں جلد میں ہندسی مناظر کا بیان ہوا ہے، اس میں انعکاس، انعطاف نور کو وضاحت سے سمجھایا گیا ہے۔ سفید نور کی ساخت یعنی یہ کہ رنگوں کا آمیزہ ہے ثابت کر دیا گیا ہے، "عدسے" اور کروی آئینوں کے ضابطوں کو بھی واضح کیا گیا ہے، دوربین اور خوردبین کی اہمیت کو اشکال کے ذریعہ سے دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

چھٹی جلد میں برق اور مقناطیس کا بیان ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ مقناطیس کس طرح بنتا ہے، اصلی مقناطیس کیا ہے۔ دوسرے دھاتی اجسام پر اس کا کیا اثر رونما ہوتا ہے، اس میں مقناطیسیت کے مختلف نظریوں کا تذکرہ نہیں ہے، کیونکہ سو سال پہلے اس کے متعلق کافی معلومات نہیں تھیں،

موجودہ زمانہ میں برق کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یعنی سکونی برقیات، رواں برقیات، اور جدید برقیات، زیر بحث کتاب میں زیادہ تر سکونی برق سے بحث کی گئی ہے، برقی بار کے اقسام اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں، برقی باروں میں دفع اور کشش کے کلیہ کو بھی وضاحت سے سمجھایا گیا ہے، سکونی برقیات کے متعلق بعض مشینوں کو بھی نقشوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ مثلاً لیڈن کا مرتبان، مزرست شن وغیرہ۔

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ رسالہ شمسیہ کے ذریعہ آج سے سو سال پہلے کس طرح سائنس کے مضامین کو دنیائے اردو کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول تھی کیونکہ کئی مرتبہ اس کی طباعت ہوئی ہے، چنانچہ پہلی مرتبہ تو سنہ ۱۲۵۷ھ میں اور اس کے بعد دوسری مرتبہ سنہ ۱۲۶۲ھ میں طبع ہوئی، ان دونوں مرتبہ یہ خط نسخ میں ٹائپ ہوئی ہے اور یہ ٹائپ کا مطبع خود شمس الامرا کا ذاتی پریس تھا، جس میں آپ کی کتابیں طبع ہوتی تھیں، تیسری بار سنہ ۱۲۷۳ھ میں مدراس کے مطبع اسلامیہ میں طبع ہوئی ہے، نستعلیق خط ہے چوتھی بار سنہ ۱۳۱۶ھ ۹۸-۱۸۹۸ء میں دہلی میں منشی امیر احمد صاحب کے مطبع میں طبع ہوئی ہے۔ سنہ ۱۲۵۷ھ سے سنہ ۱۳۱۶ھ تک اس کتاب کا شائع ہونا اس کی مقبولیت کی کافی دلیل ہے۔

(۴)

اگر اس موقع پر رسالہ شمسیہ کے دیباچہ اور کچھ نفس مضمون کی عبارت کا نمونہ پیش کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس سے اس وقت کی علمی زبان کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے، دیباچہ کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"بعد حمد و نعت کے بندہ نیازمند درگاہ ایزدی کا محمد فخرالدین خاں المخاطب بہ شمس الامرا اس طور سے گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہے، بسبب میلان طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا، میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل ان کے ازبر تھے، اور اگرچہ بعضے فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں، چنانچہ علم جر ثقیل اور علم انظار وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں

---

[1] ان معلومات کے لئے میں اپنے عزیز دوست سید محمد علی خاں بی ایس سی آنرز (لندن) پروفیسر طبیعات نظام کالج حیدر آباد کا ممنون ہوں۔

کہ جیسا کہ اب اہلِ فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے۔ بلکہ بعضے علوم اہلِ فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنے۔ چنانچہ علمِ آب اور ہوا اور برق اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ۔ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبانِ فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصتِ قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ مزہ میسر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا۔ اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے۔ چنانچہ ان دنوں میں حسبِ مدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریورنڈ جے جائس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۹ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے ہم پہنچے . . . .

. . . . بفضلِ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے یہ چھے رسالے ترجمہ ہوئے اگر بعضے اسمائے انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے۔ ان کو اسی زبان اصلی پر بحال رکھنے میں . . . اور یہ چھے رسالے جو ترجمہ کئے گئے چھے علم پر مشتمل ہیں، اس واسطے ان کا نام ستہ شمسیہ رکھا گیا . . . . اور . . .

تاریخ اس رسالہ کا گذرانا ہوا حافظ مولوی شمس الدین فیض کا یہ ہے "شمس الامراکی ہے یہ تالیف نو"

۵۳ ۱۲ م

اس اقتباس سے واضح ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ۱۲۵۳ھ میں ہوا۔ تین سال کے بعد یعنی ۱۲۵۶ھ میں ان کو پہلی مرتبہ شائع کیا گیا۔

اس کے بعد اب ہم مختصر طور پر نفسِ مضمون کا اقتباس بھی پیش کرتے ہیں،

تلمیذ کلاں: ۔جس طرح یہ امتحان دکھلا کے آپ نے سیال کے بازوؤں کے دباؤ کو بخوبی ثابت فرما کے ہم کو سمجھایا اسی طرح کوئی قاعدہ قاعدے کے دباؤ کے معلوم کرنے کا فرمائیے۔

استاد: ۔بہت بہتر سنو، جب کسی ظرف کے بازو اس کے قاعدے پر عمود دار ہوں اور قاعدہ موازی افق رہے، تو دباؤ سیال کے قاعدے پر موافق وزن سیال کے ہوتا ہے۔

تلمیذ خرد: ۔مثلاً ظرف ط زیں کے موافق مذکور کے ہے، پانچ سیر پانی بھرا جاوے، بشرطیکہ قاعدہ بازو کے مانند مسطح ہے، تو کیا بمقدار پانی پانچ سیر وزن کے ثقالے سے اس ظرف میں مقید رہے گا۔

استاد: ۔ہاں پانی کا اور ثقالے کا وزن معادل رہے گا، اور یہ بھی یاد رکھو کہ دباؤ کسی بازو پر کا نصف ہوتا ہے، قاعدے پر کے دباؤ سے بشرطیکہ بازو اور قاعدہ متساوی ہوں، یعنی وہ ظرف مکعب ہو،

تلمیذ کلاں: ۔حضرت یہ کس طرح؟

استاد: ۔میں نے ابھی کہا کہ دباؤ سیال کا قاعدے پر موافق وزن سیال کے ہوتا ہے، یعنی جتنا وزن ہوگا اس کے برابر دباؤ ہے گا اور سمجھا چکا ہوں قاعدے سے اوپر کی سطح تک دباؤ بازوؤں پر کا گھٹتا جاتا ہے یہاں تک کہ اوپر کی سطح آپ پر کچھ دباؤ نہیں رہتا، اور یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ دباؤ قاعدے پر کا موافق ہوتا ہے حاصل ضرب سطح قاعدے کو ارتفاع ظرف میں۔ پس دباؤ بازو پر کا برابر ہوگا۔ حاصل ضرب کو سطح قاعدے کے نصف ارتفاع ظرف میں۔

تلمیذ خرد:۔ اس صورت میں دباؤ چاروں بازوؤں پر کا قاعدے کے دباؤ کے دو چند ہوگا۔ کیونکہ دباؤ مکعب کے چاروں بازو اور قاعدے پر سیال کے وزن کے سہ چند ہوگا۔

استاد:۔ البتہ ہوگا۔ اور تم سیال کا وزن اور دباؤ کا تفاوت بیان کر سکتے ہو۔ جو ظرف مخروط قائم میں ہے۔

تلمیذ کلاں:۔ بندہ عرض کرتا ہے۔

کسی ظرف مخروط کے قاعدے کے مساحت کو ثلث ارتفاع میں ضرب دینے سے اس ظرف کے سیال کا وزن معلوم ہوتا ہے، لیکن دباؤ معلوم ہو سکتا ہے قاعدے کی مساحت کو سالم ارتفاع میں ضرب دینے سے، کیونکہ یہ دباؤ قاعدے پر سیال کے وزن کے سہ چند ہوگا۔" (جلد سوم)

صفحات گزشتہ میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اور نواب شمس الامراء کے اردو کارناموں کی مختصر صراحت کر دی گئی ہے، اگرچہ ڈاکٹر صاحب کو اس امر کا تفوق حاصل ہے کہ انہوں نے اردو زبان میں سلیس اور عام فہم اسلوب بیان کی بنا ڈالی اور ایک جدید راستہ کی بنیاد قائم کی، لیکن یہ امر خاص طور سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کہ ڈاکٹر صاحب کی راہ نمائی کے باوجود چالیس پچاس سال تک شمالی ہند میں جو اردو زبان کی کتابیں مرتب ہوئیں وہ سلیس اردو میں نہیں ہوتی تھیں بلکہ علمی کتابوں کی زبان بدستور مقفّیٰ ہوتی تھی، چنانچہ سر سید احمد خاں نے جب ۱۸۴۵ء میں "آثار الصنادید" شائع فرمائی ہے تو اس کی زبان مقفّیٰ ہی ہے اور اس کے دس سال کے بعد ۱۸۵۵ء میں تاریخ افغانستان لکھی گئی ہے۔ اس کی عبارت بھی اسی طرز پر ہے۔

اس کے برخلاف نواب شمس الامرا کا کارنامہ یعنی اردو زبان میں سائنس کے مسائل کو عام فہم اور سلیس زبان میں پیش کرنا بہت زیادہ قابل قدر اور لائق ستائش معلوم ہوتا ہے۔ آج سے ایک سو سال پہلے اردو زبان میں طبیعیات، کیمیا، ریاضی، ہیئت اور طب کے مسائل کا پیش ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا جا سکے، اور پھر ساتھ ساتھ تعلیم بھی دینا نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اردو زبان شمس الامرا کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ جب تک زبان اردو صفحہ ہستی پر باقی رہے گی شمس الامرا کا کارنامہ بھی درخشاں رہے گا۔

نصیر الدین ہاشمی

غزل

آجائیں مری راہ میں کچھ سنگ گراں اور — ہوجائیں مرے عزم کے جوہر بھی عیاں اور

قید حرم و دیر سے ممکن ہے رہائی — لیکن یہ بڑی سوچ ہے جائیں گے کہاں اور

واعظ کی فصاحت مجھے تسلیم ہے ساقی — لیکن ترے مستوں کا ہے انداز بیاں اور

رہرو! جو قدم اٹھتا ہے منزل کی طلب میں — کر دیتا ہے نزدیک وہ منزل کا نشاں اور

ہاں یوم قیامت سے تو انکار نہیں ہے — رفتار تری کہتی ہے کچھ سرو رواں اور

اے پردہ نشیں! تو ہی بتا اب کوئی تدبیر — ہوتا ہے چھپانے سے عیاں، راز نہاں اور

ہم لاکھ چھپائیں اثر درد محبت — آنسو جو چھلک آتے ہیں ہوتا ہے گماں اور

رفتار طلب میں نہ کوئی فرق ہو عزمی
منزل کا نشاں اور ہے منزل کا گماں اور

عزمی خیرآبادی

عدمِ تشدّد

ایک نازک سی کرن اور اندھیرے کا غرور ـــــ!

یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ اجالا ہو جائے
شاید اب کے بھی کرن تیرہ شبی میں کھو جائے

میں نے تاریخ کے اوراق کو شاہد پایا
ہر زمانے کی نظر میں یہ کرن جاگی تھی
وہ کرن ـ جس میں تشدد کا خونی دریا
موج در موج تلاطم کا سہارا لے کر
ایک بے نام سی وادی میں نکل جاتا تھا
لیکن انجام کے بے ربط فسانوں کا نچوڑ
ایک اڑتے ہوئے بادل میں سمٹ آتا تھا

نامکمل ہی سہی عہدِ رواں کی تاریخ !
لیکن اک روز یہ تاریخ مکمل ہو کر
چند کرنوں کے چمکنے کی گواہی دے گی
جن میں حدت نہ رہی تیرہ شبی میں کھو کر

چار جانب وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا
جیسے پربت کوئی میداں میں لڑھک آیا ہو
جیسے بھونچال زمانے کی پلٹ دے کایا
ـــ یہ اندھیرا ہے کہ تاریخ کے گنجان حروف
جن پہ لہراتا ہے ماضی کا پرافشاں سایا
اے مورخ! اسی سائے میں چھپی ہے وہ کرن
جس نے آفاق کے ہر نقش کو دھندلا پایا

شاید اب بھی یہ کرن تیرہ شبی میں کھو جائے
یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ اجالا ہو جائے

ایک نازک سی کرن اور اندھیرے کا غرور ـــــ؟

قتیل شفائی

اقبالؒ کا فلسفۂ عشق

حضرت علامہ نے رینالڈ نکلسن ؒ کے نام ایک خط میں لفظ عشق کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

"خودی کی تعمیر عشق سے ہوتی ہے۔ یہ لفظ نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ضم کر لینے کی آرزو .... اپنی بلند ترین صورت میں عشق کے معنی ...... تخیلات اور اقدار کی تخلیق اور اُن کے حصول کی جدوجہد ...... ہوتے ہیں"

حضرت علامہ نے "عشق" کے لئے جذبِ اندروں، جذب سلمانی، طغیانی مشتاقی اور جذب قلندرانہ وغیرہ الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں۔ عشق سے مراد محبت کا وہ اتھاہ اور متموج سمندر ہے۔ وہ بے پناہ والہانہ اور آتشیں جذبہ ہے جو کسی سچے آدرش یا بلند اور پاکیزہ تخیلہ کے لئے کسی فرد یا قوم کے دل میں پیدا ہو۔ عشق ایک مستقل تڑپ۔ ایک پیہم خلش، ایک بڑھتا ہوا ذوق و شوق اور ایک نہ فنا ہونے والا سوز و درد ہے۔ اقبالؒ کے فلسفۂ عشق کو مسلمانوں کے سامنے چند الفاظ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے:۔

"مسلم قوم بزم عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام بھی حاصل کر سکتی ہے۔ جبکہ اُس کے سینے میں اپنے تخیلہ دینِ اسلام کے عشق کی آگ آتش فروزاں کی طرح روشن ہو جائے۔ مسلمان جبھی زندہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ اسلام کی عظمت و سطوت اور اسلام کے حاکمانہ اقتدار کو قائم کرنے کے لئے کٹ مرنے کا جذبہ کر مصروف جہد و عمل ہو"

عشق ایک زبردست قوّتِ محرّکہ ہے

حضرت علامہ عشق کو زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد قرار دیتے ہیں۔ اور اُسے تمام کائنات کی روحِ رواں مانتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے:۔

"عشق زندگی کا راز اور سرمایۂ حیات ہے۔ اس میں بے پناہ قوتیں ہیں۔ وہ قوائے عملیہ کا سرچشمہ ہے۔ عشق اقوام و ملل میں عمل و نقل کی قوت پیدا کرتا ہے اور عروقِ مُردہ میں خونِ حیات دوڑا دیتا ہے عشق اُس جوش کا خالق ہے جس سے انسان نوامیس قدرت پر قابو پا لینے کا حوصلہ کرنے لگتا ہے۔ عشق کے سامنے ہر ممکن و موجود است ہے ؂

عشق سلطان است و برہانِ مبیں — ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں

محفلِ دنیا کا ہنگامہ جامِ عشق ہی کی گردش سے ہے۔ عشق کے بغیر زندگی ایک ماتم ہے۔ اور اُس کے کاروبار زشت و ناتمام ہیں۔ جب تک دل آتشِ عشق سے شعلہ زار نہ بنے۔ زندگی میں کیف و رنگ پیدا نہیں ہوتا۔ اور دل ذوق و شوق کی لذت سے محروم رہتا ہے۔ عشق زندگی کا جوہر ہے۔ اُس سے حیات بلند ہوتے ہیں۔ اور ادنیٰ اعلیٰ بنتا ہے۔ وہ مٹی کو کیمیا بناتا ہے۔ سوتے کو جگاتا ہے۔ اور مُردے کو زندہ کرتا ہے عشق ہنر مندوں کو یدِ بیضا اور اہلِ دل کو سینۂ سینا [illegible] وہ ہر شے کا خلاصہ

صلاحیتوں کو عالمِ شہود میں لاتا ہے۔ عشق ہی سے کردار میں سوزِ مشتاقی اور گفتار میں نورِ آفاقی پیدا ہوتا ہے ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانہ کی رو — عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکاں و مکیں! عشق زماں و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب

عشق و عقل

حضرت علامہ جو جذبۂ عشق کو یہ غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور اس کو اقوام و ملل کی زندگی کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ تو یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان کے افعال کی محرک اُس کی عقل نہیں ہے۔ بلکہ جذبۂ دروں اور ولولۂ جبلی ہیں۔ شدتِ جذبہ انسان سے جو کام کرا سکتا ہے۔ وہ عقل کے بس کا نہیں۔ عشق اپنے عزم و استقلال میں نہایت پختہ ہوتا ہے۔ عقل وہم و گمان میں کھو جاتی ہے اور اس کا جوشِ کردار سرد پڑ جاتا ہے ؎

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ تاریخِ عالم میں جتنی عظیم مہمیں سر ہوئی ہیں۔ عقل کا اُن میں بہت کم حصہ ہے۔ عقل کی فطرت بہانہ تراش واقع ہوئی ہے۔ لیکن عشق مصائب و مشکلات کے جنگلوں میں مردانہ وار جا گھستا ہے۔ عقل کو کم و بیش کی سوچ اور پس و پیش کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن عشق و جنون کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کسی نشیب و فراز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اُسے صرف ایک دُھن ہوتی ہے۔ اپنے متخیلہ کے مقاصد کی تکمیل۔ وہ نڈر اور بے غم ہو کر ہر اُس قوت سے ٹکرا جاتا ہے۔ جو اُس کے اور اُس کے مقصود کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ عشق انسانی خودی کی پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرتا اور اُس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے ؎

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرہ میں سمندر ہے، ذرہ میں بیاباں ہے

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست — قوتش از سختیِ اعصاب نیست
عشق با نانِ جویں خیبر گشاد — عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد
کلۂ نمرود بے ضربے شکست — لشکرِ فرعون بے حربے شکست

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقلیت زندگی کی نشو و ارتقا کے لئے ہر جگہ رکاوٹ ہے ہرگز نہیں۔ مقصدِ اصلی یہ ہے۔ کہ عقل عشق کے تابع ہو۔ اور اس کے عمل میں اُس کی مؤید۔ نہ کہ اُس کی مقابل ؎

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من

اقبال اور دوسرے صاحب الرائے اکابر

میں عصرِ جدید کے تمام صاحب الرائے اکابر کو اس نظریہ میں حکیم مشرق کا ہمنوا پاتا ہوں۔ مشہور فرانسیسی محقق ڈاکٹر جی بی بان جس نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ تمدنِ عرب میں تحریر کرتا ہے۔

"علمی نظر سے دیکھا جائے۔ تو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شمار مجذوب اور وارستہ حال اشخاص میں ہونا چاہئے۔ مذاہب کے موجد اور خلائق کے پیشوا اور رہنما فلسفی اور حکیم نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ وہی ہوا کرتے ہیں۔ جن میں جذبہ قلبی اور ولولہ جنونی ہے۔ ان اشخاص کے افعال پر نظر ڈالیں۔ تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے مذاہب ایجاد کئے ہیں۔ سلطنتوں کو خاک میں ملایا ہے ہزارہا خلائق کو اپنا تابع بنایا ہے نوعِ انسان کی اس درجہ ترقی انہی کے ہاتھوں ہوئی ہے . . . . اگر دنیا میں نقطہ عقل و فہم سے ہی کام لیا جاتا۔ اور جذبہ و ولولہ سے کام نہ لیا جاتا۔ تو اس وقت دنیا کی کچھ اور ہی صورت ہوتی۔"

جرمنی کے سابق ڈکٹیٹر ہٹلر نے اپنی تزک "مین کمف" میں قوموں کے عروج و زوال پر بحث کرتے ہوئے عشق کے سامنے ادراک کی کم مائیگی کو جا بجا نشر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے:۔

"کسی زمانے اور کسی حالت میں بھی فلسفہ و ادراک کے کسی پیرو نے دنیا کی کوئی بڑی تحریک پیدا نہیں کی . . . . دنیا کی تمام بڑی بڑی تحریکیں انسانی جوش و جذبات اور عشق و جنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ اور اس کی مثال ایک آتش فشاں پہاڑ کے پھٹ پڑنے کی ہے۔"

عشق ہی متخیلہ قوموں کی زندگی کا ذمہ دار ہے

حقیقت یہ ہے۔ کہ اقوام و ملل کے لئے جذبۂ عشق عینِ حیات اور فقدانِ عشق عینِ ممات ہے۔ جب تک کسی قوم کے دل میں اپنے متخیلہ کے عشق کی آگ روشن رہتی ہے۔ وہ عروج و کمال کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ متخیلہ کا عشق و جنون ہی وہ قوت ہے جو کسی قوم کو قعرِ تنزل میں گرنے سے بچا سکتی ہے۔ حکیم مشرق اپنے خطبۂ صدارت میں جو اُنہوں نے مسلم لیگ کے اجلاسِ الٰہ آباد میں پڑھا۔ فرماتے ہیں۔

"میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام کے مطالعہ پر صرف کیا ہے۔ تاریخِ اسلامیہ کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ مسلم قوم کبھی اسلام کو بچانے کا باعث نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر نازک موقع پر اسلام نے مسلم قوم کو بچایا ہے۔"

ڈاکٹر جی۔ بی۔ بان قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:۔

"کسی قوم کی ترقی اور سرفرازی میں متخیلہ کی پرستش کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے۔ کہ کسی قوم کے اشخاص میں حب الوطنی کی پرستش۔ مذہبی اعتقادات۔ آزادی کا شغف۔ نام آوری کا ولولہ محض تخیلات ہیں۔ اگر فلسفی نظر سے

دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ چیزیں تخیلات سے متعلق ہیں۔ لیکن یہ اس قسم کے تخیلات ہیں۔ جو ہمیشہ افعالِ انسانی کے محرک رہے ہیں۔ اور انہیں تخیلات کی بدولت دنیا کی تمام تمدنی ترقی کی وہ عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ جس کے سایہ میں ہم آج بس رہے ہیں قدیم رومیوں کی عظمت محض شہر روم کی پرستش سے تھی۔ اور جب تک کسی رومی نے روم پر سے جان تصدق کرنے میں تامل نہیں کیا۔ اُن کی حکومت تمام عالم پر قائم رہی۔ ان کا زوال اُس وقت ہوا۔ جبکہ اُن کے دلوں پر حب الوطنی کے تخیل کا اصنام یعنی قومی دیوتاؤں کی پرستش کا کوئی اثر باقی رہا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں ایک ایسا زبردست تخیل پیدا کر دیا۔ جو پہلے نہیں تھا۔ اور اسی تخیل کی وجہ سے مسلم قوم کی ساری ترقی ہوئی۔ یہ دینی ولولہ ایک ایسا تخیلہ تھا۔ جس کے آگے دنیا کی بڑی بڑی سچائی بھی گرد تھی۔ پیروانِ اسلام نے کبھی اپنے دین کے لئے جان دینے میں تامل نہیں کیا۔ کیونکہ اُن کی نظر میں دنیا کی نعمت اس قدر بیش بہا نہ تھی۔ جتنی کہ وہ نعمتِ حقیقی بیش بہا تھی۔ جس کا وعدہ اُن سے کیا گیا تھا۔ اُن کے لئے دینِ اسلام وہ تخیل اور محرک بن گیا۔ جو رومیوں کے لئے شہر روم کی پرستش تھی۔ دینِ اسلام کی وجہ سے تمام مسلمانوں میں خیالات اغراض۔ مقاصد اور امیدوں کا ایک زبردست اتحاد پیدا ہو گیا۔ جس نے اُن کی ساری کوششوں کو ایک ہی طرف متوجہ کر دیا۔

غیر مسلم اقوام کی تخیل پرستی

جاپانیوں کے اوج و عروج کا نکتہ آغاز یہی انقلاب ہے۔ جس نے میکاڈو یعنی شاہ پرستی کے تخیل کو زندہ کیا۔ اور بادشاہ کو تعبیر گنامی سے نکال کر ایک ایسا زبردست اور مقدس تخیلہ بنا دیا۔ کہ جس کی معمولی سی خوشی کے لئے ہر جاپانی مرد، عورت اور بچہ اپنی جان قربان کر دینے کو ایسا سمجھنے لگا۔ گویا اُسے ایسا کرنے سے ایک متاعِ لازوال حاصل ہو جائے گا۔ اطالویوں کے عشق و جنون کا کچھ اندازہ کرنے کے لئے ان کا یہ گیت پڑھیئے۔ جو وہ جنگ طرابلس میں گاتے تھے۔

ؔمیں ایک بیس سالہ نوجوان کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے۔ کہ وہ اپنے وطن کی راہ میں نہ لڑے جبکہ طرابلس میں جنگ کا میدان گرم ہے۔ اور اٹلی کا سہ رنگا جھنڈا اور اٹلی کا ترانہ دلیر سپاہیوں کو گرما رہے ہیں۔ اے میری ماں! تو اپنی دعا کو جلد پورا کر۔ روست، خوش ہو۔ ہنوز تو کیا تو نہیں جانتی۔ کہ اٹلی مجھے بلا رہا ہے۔ اور میں طرابلس کو خوشی کے ساتھ جا رہا ہوں۔ تاکہ میں اپنے خون کو اُس ملعون اُمت کے تباہ کرنے میں بہادوں۔ میں اپنی تمام قوت سے قرآن کو مٹانے کے لئے لڑوں گا۔

وہ کبھی شان کا مستحق نہ ہو گا۔ جو آج اٹلی کے لئے قربان نہ ہو۔ اے ماں! دلیر ہو جا۔ اور کاروبی کو یاد کر۔ جس نے اپنے وطن کی راہ میں تمام اولاد کو قربان کر دیا تھا۔

اے ماں! الوداع اوہ الوداع جو تمہیں کبھی بھی تمہارے جگر کے ٹکڑے پر ماتم نہ کرنے دے گا۔ اور اگر تم سے کوئی پوچھے کہ تم ماتم کیوں نہیں کرتیں۔ تو تم اُسے یہ جواب دینا۔ کہ میرا بچہ اسلام سے لڑتا ہوا مارا گیا ہے۔"

جاپان اور اٹلی پر ہی کیا منحصر ہے۔ آج دنیا کی ہر زندہ اور غالب قوم نے اپنے لئے تخیلات کے ایسے بت تراش رکھے ہیں جس کے عشق و محبت میں وہ دیوانی ہوئی جاتی ہے۔ کمیونزم، نازی ازم اور جمہوریت کے نام میں ایک روسی، ایک جرمن اور ایک برطانوی کے لئے خدا جانے کیا جادو بھرا ہوا ہے۔ کہ اس جنگ میں وہ ایک ہی پکار پر اُس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اپنے قومی نظام کے وقار، اُس کی عظمت اور اُس کے حاکمانہ اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لئے شدید و شنائع کے خونیں دریا میں جس آمادگی اور خندہ پیشانی سے وہ کود رہے ہیں۔ اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ یہی اُن کی

زندگی کا راز ہے۔ یہی اُن کی عظمت کا باعث ہے۔

مرد مسلمان کا جذبۂ عشق

یہ غیر مسلم اقوام کی تحمل پرستی کا ذکر تھا۔ لیکن اُس لمحہ سے کہ جبکہ نُورِ آفتاب کی پہلی کرن افلاک کی رفعتوں سے اُتر کر اس جہانِ خاکی کی پستیوں سے ہمکنار ہوئی ہے۔ آج کے دن تک کوئی قوم۔ کوئی جمعیت۔ کوئی ملت عشق کی اُن بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتی۔ جہاں پہنچکر مسلم قوم نے سرت خرامی کی ہے۔ قرونِ اولیٰ کا ہر مسلمان عشق و اخلاص کی تصویر تھا۔ وہ اللہ کے دین کا دیوانہ تھا۔ وہ اسلام کے نام پر کٹ مرنے کو فلاحِ دارین سمجھتا تھا۔ اُس کے لئے موت جو اسلام کی راہ میں آئے ہزار زندگی سے بہتر تھی۔ اُس کا وقت اور اُس کی دولت۔ اُس کا مال اور اُس کی جان، اسلامی نظام کی عظمت اور اُس کا حاکمانہ تسلط قائم کرنے کے لئے وقف تھے۔ اُس کی ہر چیز اسی راہ میں قربان تھی۔ اُس کا اٹھنا اور اُس کا بیٹھنا۔ اُس کا سونا اور اُس کا جاگنا۔ غرضیکہ اُس کی ہر حرکت اور ہر جنبش مقاصدِ اسلام کی تکمیل کے لئے تھی۔ اُس کی شمشیر نیام سے باہر آتی تھی۔ تو اسی لئے اور زینتِ نیام ہوتی تھی تو اسی لئے۔ صحابہ کرام شہید ہونے کے لئے موت کو خود تلاش کیا کرتے تھے۔ جب وہ شہید ہوتے تھے تو اُن کے منہ سے نکلتا تھا: "آج خوشی کا دن ہے"

اگر جامِ شہادت میسّر نہ تھا۔ تو وہ اپنی قوم میں افسردہ اور غم زدہ ہو کر لوٹا کرتے تھے۔ غزوۂ بدر میں بیٹا باپ کے اور بھائی بھائی کے سامنے تھا۔ اُس دن باپ بیٹے سے الجھ گیا۔ بھائی بھائی سے ٹکرا گیا۔ اور جگر گوشے تلواروں سے کٹ کٹ کر گر گئے۔ اُن مسلمانوں میں سعد بن عبادہؓ بھی تھے۔ جو غزوۂ بدر سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے تھے: "یا رسول اللہ! خدا کی قسم اگر آپ فرمائیں۔ تو ہم سمندر میں کود پڑیں"

اُن میں حضرت خبیبؓ بھی تھے۔ جن کو صلیب پر لٹکا کر چالیس نیزہ بازوں نے تختۂ مشق ستم بنایا۔ جب ستمگروں کے واروں سے اُن کا جسم چھلنی ہو رہا تھا۔ وہ اطمینان سے یہی کہتے تھے۔ کہ "جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں۔ تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ کہ یہ چھا دائیں لگ رہا ہے یا بائیں" اُن میں بنو دینار کی وہ صاحبِ ایمان عورت بھی تھی جس کو اپنے باپ۔ اپنے خاوند اور اپنے بھائی کی شہادت کا غم نہ تھا۔ بلکہ آنحضرت صلعم کے زندہ ہونے کی خوشی تھی۔

عشقِ اسلام کا اعجاز

مردِ مسلمان کے اس آتشیں عشق کی کارگزاری کو چرخ پیر نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ عرب کے ویران اور بنجر بیابانوں سے چند ہزار نفوس فاقہ کشی اور بے سروسامانی کی شان سے اُٹھے۔ اور قیصر و کسریٰ کی وسیع و عظیم اور قوی و قدیم شہنشاہوں پر باد صرصر کے طوفان کی طرح چھا گئے۔ اُن کے سیلِ عشق کی روانی کے سامنے مشرق و مغرب کی وسعتیں تنگ تھیں۔ ایک صدی کے اندر اندر کنارِ سندھ سے اسپین اور جنوبی فرانس تک اور کوہ قاف کی بلندیوں سے لے کر افریقہ کے صحراؤں تک ایک ہی پرچم لہرا رہا تھا۔ اور وہ پرچم اسلام کا پرچم تھا۔ مسلمان کاروانِ عالم کے امیر اور بزمِ گیتی کے صدر نشین تھے۔ اقوامِ دولِ عالم کی تقدیریں فرزندانِ اسلام کی جنبش ابرو سے پیوستہ تھیں۔ اور انجم اُس کے اوج و عروج سے سہمے جاتے تھے۔

مسلمانوں کی تمام ملکی اور تمدنی فتوحات کا واحد ذمہ دار عشقِ اسلام کا جذبہ تھا۔ آج یورپ کے مستشرقین اور محققین

ان محیر العقول کارناموں کو چشمِ حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اور مُدتوں تحقیق کرنے کے بعد کہتے ہیں تو یہ کہ مسلمانوں کی تمام علمی۔ تمدنی اور سیاسی فتوحات کا واحد محرک ان کا مذہبی جنون تھا۔ اے کاش وہ مذہبی جنون مسلمانوں میں آج پھر زندہ ہو جائے ؎

احتیاجِ زندگی جذب و دروں — کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد — بے جنونِ ذوفنوں کارے نکرد

زوالِ مسلم

مسلمانوں کا زوال عشقِ اسلام کی آگ سرد ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ جب تک مسلمانوں کا عشق زندہ رہا۔ اور وہ عشق ان کو مقاصدِ اسلام کی خاطر غیر منقطع سعی و عمل اور لامتناہی جد و جہد جاری رکھنے اور وقت۔ مال اور جان کی قربانی دینے کے لئے آمادہ کرتا رہا۔ اُن کی عظمت قائم رہی۔ زوال جب شروع ہوا۔ جب اُن کی لوحِ دل سے تپیدگی کی محبت کے درخشندہ نقوش مٹنے شروع ہوئے۔ وہ بے پناہ محبت۔ وہ جوش۔ وہ جنوں۔ وہ والہانہ عشق جو اُن کو دینِ اسلام سے تھا۔ سرد ہو گیا۔ تو اقبال کو ادبار کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی۔

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات — مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

اقبالؒ کس تاسف سے اس المناک واقعہ کا ذکر کرتا ہے ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

جب وہ روحِ مسلمانی۔ وہ جذبہ۔ وہ ولولہ جس کی وجہ سے مسلمان مقاصدِ اسلام کی خاطر آگ کے دریاؤں میں کودنے سے نہیں جھجکتے تھے۔ اور مصائب و آفات کے پہاڑوں سے ٹکرانے سے نہیں گھبراتے تھے۔ باقی نہ رہا۔ تو اس کی جگہ نفسی خود غرضی نے لے لی۔ خود غرضی نے مسلمانوں کو اُس جنون سے بیگانہ کر دیا۔ جو عقل کی تن آسانی اور بہانہ تراشی کے لئے پیغامِ موت تھا۔ سوزِ عشق سے خالی ہو کر دل موت کی لذت سے بیگانہ ہو گئے۔ تو جہاد جو مسلمانوں کے تمام محیر العقول کارناموں کی محرک تھی فقط ایک مسئلہ علم کلام بن کر رہ گئی۔ جب قوم کے افعال و اعمال کی محرک جذبۂ عشق کی بجائے نفسی خود غرضی ہو جائے۔ تو وہ اپنے عروج پر کس طرح قائم رہ سکتی تھی۔ حکیمِ اسلام نے ہمارے زوال کی کس قدر صحیح توجیہ کی ہے ؎

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

سینے میں عشق کی حرارت کے سرد ہوتے ہی مسلمان کی قوت و شوکت، عظمت و سطوت، ہیبت و جبروت سب جاتی رہی۔ اور اُسے ذلت و نکبت۔ غلامی و ناکامی اور افلاس و احتیاج نے آ شکار کیا ؎

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں — گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے — کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

دنیا کا سب داناؤں کا سب سے بڑا اور اُمّی دانشمند صلی اللہ علیہ وسلم مسلم قوم کے عروج و زوال کے اس بنیادی فلسفہ کا آج سے ایک ہزار اور ساڑھے تین سو برس پہلے ہی اعلان فرما چکا تھا۔

"مسلمانوں کا زوال اُس وقت ہو گا۔ جب اُن میں حُبِّ دنیا اور ترسِ مرگ پیدا ہو جائیں گے۔"

خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فلسفیانہ قول کو دوسرے الفاظ میں یُوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ مسلمان عروج سے جب گِریں گے۔ جب حبِ دین یعنی اپنے متخیلہ کا عشق اُن کے دل میں باقی نہ رہے گا۔ اور وہ اپنے متخیلہ کی عظمت کے لئے کام کرنے اور قربانی دینے سے گریز کرنے لگیں گے۔

درمانِ زوال

علامہ فرماتے ہیں ؎

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

ہٹلر نے "مین کمف" میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں دُہرایا ہے :۔

"کسی قوم کے زوال کو صرف جوش و ولولہ اور عشق و جنون کے آتشیں طوفان سے ہی روکا جا سکتا ہے اور صرف وہی لوگ دوسروں میں جوش و ولولہ پیدا کر سکتے ہیں۔ جن کے اپنے سینے جوش و ولولہ سے لبریز ہوں "

مسلمانوں کے سینے میں اسلام کا عشق و جنون اور اسلام کا جوش و جذبہ پیدا کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے۔ شاید پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ اقبال اپنی قوم کو پستی میں گھرا ہوا دیکھتا ہے تو اُس کا دل خُون ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُس کی بیتاب تمنا ہے۔ کہ اپنی قوم کو اپنے معیا پر متمکن دیکھے۔ وہ قوم کے درد کے درماں کے لئے جستجو کرتا ہے۔ جویندہ یابندہ۔ اوراقِ قرآنی سے اُسے وہ آبِ حیات مل جاتا ہے جو مسلماں کی حالتِ نزع کو حیاتِ رواں دواں میں بدل سکتا ہے۔ اقبال پورے وثوق کے ساتھ مسلم قوم کو تلقین کرتا ہے کہ تمہارے دردِ زوال کا دار دلیس ایک ہے۔ اور وہ ہے عشقِ اسلام ؎

اک شرعِ مسلمانی، اک جذبِ مسلمانی ہے جذبِ مسلمانی سِرِّ فلک الافلاک
اے رہروِ فرزانہ بے جذبِ مسلمانی نے راہِ عمل پیدا نے شاخِ یقیں نمناک
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

نواب ذوالقدر جنگ بہادر ناظم اوّل حیدرآباد دکن مسلم قوم کے عروج کی وجوہ پر بحث کرتے ہوئے "خلافت اندلس" میں تحریر کرتے ہیں۔ یورپ کے مہذب اور تعلیم یافتہ مؤرخین اور استدلال سے بال کی کھال نکالنے والے صاحبِ تجربہ و صاحبِ دلیل فیلسوفین۔ ہرقل کو قید کرنے والے اور دُخان کو غلام کار گزار بنانے والے حکمران بادیہ نشینوں کی برق رفتار کامیابی پر حیرت ظاہر کرتے ہیں۔ اور دُور ازکار توجیہیں گھڑتے ہیں۔ توحید کے مزے سے واقف نہ تھے۔ اس معمّے کو حل نہ کر سکے ؎

قبلۂ عشق یکے باشد و بس

مسلمان ولولہ اور جوشِ عشقِ اسلام میں کفن بسر اور تیغ بکف سرفروشی کے لئے تیار گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور مشرق سے مغرب تک ایک عالم کو نعرۂ اللہ اکبر سے زیر و زبر کر دیا۔ لا الٰہ الا اللہ کی صدا سے دشت و کوہ گونج اٹھا"

اسلام اور عشقِ اسلام

سوال یہ ہے۔ کہ اسلام کیا شے ہے؟ اور اسلام کا عشق کیا چیز ہے؟ اگر مسلمان یہ سمجھ کر کہ اسلام صرف محض اور فقط چند عقائد و عبادت ہی کا نام ہے۔ اس پر قانع ہے۔ تو اُس کی بھُول اور نادانی ہے ؎

وائے صد پیشے کہ بُت ہائے آفرید — باز لب بربست و دم در خود کشید
حکمِ حق را در جہاں جاری کند — نانے از جو خورد و کراری کند
غافلے جُست از خیبر رسید — راہی و سنید و سلطانی ندید

اسلام ایک دین ہے۔ ایک مکمل ہمہ گیر اور اٹل نظامِ حیات۔ صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ اسلام کی بنیادیں ہیں۔ اور ان بنیادوں پر اسلام کے سیاسی، معاشی، سماجی اور اخلاقی نظام اسلام کی ایک وسیع و عظیم عمارت ہیں ؎

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس — ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و ملک و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

مردِ مسلمان کا کام صرف بنیادیں رکھ دینے سے ہی پورا نہیں ہو جاتا۔ اُس پوری عمارت کی تعمیر کرنا جس کی وہ بنیادیں رکھتا ہے اُس کا ایک ایسا اہم اور مقدس مذہبی فریضہ ہے جس کی ادائگی کے بغیر وہ کبھی اپنے اللہ اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سُرخرو نہیں ہو سکتا۔ صوم و صلوٰۃ اسلام کی تربیات (Training Courses) ہیں۔ جو مردِ مسلمان کو زندگی کے ہر معاملہ میں خواہ وہ سیاست سے تعلق رکھتا ہو۔ خواہ سماج سے۔ خواہ معاش سے متعلق ہو خواہ معاشرت سے، انتظام۔ ذاتی کی بندگی کرنے۔ قانونِ الٰہی اور صرف قانونِ الٰہی کے سامنے گردن جھکانے کی تربیت کرتی رہتی ہیں ؎

ماسوی اللہ مسلماں بندہ نیست — پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

مسلم قوم کسی نسلی۔ لسانی۔ ملکی یا جغرافیائی بناء پر مسلمان نہیں ہے۔ وہ صرف ایک بناء پر مسلمان ہے اور وہ یہ کہ خلقِ خدا کو غیر خدا کے بندِ غلامی سے آزاد کرانے۔ اللہ کے بندوں پر اللہ کے قانون کی حکومت قائم کرنے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کا حاکمانہ غلبہ و اقتدار قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لئے سعیٔ مسلسل اور عملِ پیہم کا عہد باندھ کر راہِ عمل پر گامزن رہنا۔

افسوس کہ مسلم قوم آج اپنے اس اہم اور مقدس مذہبی فریضہ سے غفلت برت رہی ہے اقبال اُس کو غفلت و تساہل اور جمود و سکون کے حجرہ سے نکال کر میدانِ عمل میں لا کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ وہ پکارتا ہے۔

حلقہ می نازی بہ قرآنِ عظیم — تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن — نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن
کارِ اقوام دِگر ناید درست — از گلِ ما کارِ حق در دستِ تُست

اسی کا نام عشق ہے ؎

عاشق آں نیست کہ لب گرم فغانے دارد — عاشق آں است کہ بر کف دو جہانے دارد
عاشق آں است کہ تعمیر کند عالمِ خویش — در نسازد بہ جہانے کہ کرانے دارد

عشق اسلام پیغامِ قرآن ہے

اگرچہ عصرِ حاضر کے تمام صاحب الرائے اکابر فلسفۂ عشق میں اقبال کے ہمنوا ہیں۔ لیکن اقبال کا فلسفہ مغرب کا شرمندۂ احسان نہیں اقبال کا فکر براہِ راست قرآن سے فیضیاب ہے۔ وہ چشمۂ قرآن سے سیراب ہوا ہے۔ اقبال کا ہر ترانہ تعلیماتِ اسلام میں ڈوبا ہوا ہے اُس کا کلام تو قرآن کا ایک لباسِ اسلام ہے اقبال کے ہر پیغام میں عربی آتش کی تمازت اور عربی خون کی حرارت ہے۔ اس کے ہر شعر میں نئی روح

کی سربلندی نخلستانِ عرب کی شادابی ہے جس طرح اقبال کی ہر تعلیم قرآنی ہے۔ اسی طرح اس کا پیغامِ عشق بھی قرآنِ حکیم ہی کا پیغام ہے قرآنِ پاک نے دین کی بنیاد ہی عشق کی چٹان پر رکھی ہے ارشاد ہے۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والوں کے نزدیک اُن کی جانوں سے زیادہ عزیز ہیں اور اُن کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں (سورہ احزاب آیت)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

(۲) اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانوں کو اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے۔ کہ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں پس وہ قتل کریں۔ اور خود قتل ہوں۔ اس پر خدا کا تورات اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے اور تم میں سے جس نے اپنے عہد کو پورا کر دیا۔ تو اس خرید و فروخت میں تم کو نفع کی خوشخبری ہے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ملقین فرماتے ہیں: "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ میں اس کو اس کے مورثوں، ا... وارثوں اور تمام بنی نوع انسان سے زیادہ پیارا نہ ہوں"۔ (متفق علیہ)

میں سے مُراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہی نہیں۔ بلکہ آنحضرتؐ کا فرمان، آنحضرتؐ کا پیغام۔ آنحضرتؐ کے احکام، آنحضرتؐ کا پیش کردہ وہ آئین و قانون اور دستور و نظام ہے جس کے لئے آنحضرتؐ مبعوث ہوئے۔ اور جس کے حاکمانہ تسلط کے لئے آنحضرتؐ نے زندگی بھر شدید و ضیق مصائب برداشت کئے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھئے۔ اور بتائیے۔ اگر اقبال یہ کہتا ہے تو کیا غلط کہتا ہے:

ز رسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق
جز ایں کہ منکرِ عشق است کافرِ زندیق

عشق کے بغیر دین کا تکملہ ناممکن ہے۔

زندگی را شرع و آئیں است عشق
اصلِ تہذیب است دیں، دیں است عشق

نی ندانی عشق و مستی از کجا است
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفےٰ است

مولٰنا ظفر علی کیا خوب فرماتے ہیں:-

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا، اور زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ یثرب کی حُرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

یہ عشق اسلام ہی تھا۔ کہ بدر و حُنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمشیر بے نیام ہوئی۔ یہ عشق ہی کی تحریک تھی۔ جو پیروِ رسولؐ نے شجرِ اسلام کی آبیاری کے لئے اپنا مقدس خون دیا ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق

جذبۂ عشق مسلم قوم کا فخر ہے۔ اسلامی جوش مسلم قوم کے لئے سرمایۂ صد ناز ہے مسلماں اسی سے مسلمان ہے اُس کی عزت اور اُس کا وقار اُس کی عظمت اور اُس کی سطوت کا دار و مدار ہی عشقِ اسلام پر ہے یہی عشق ہے جو اُس کو انسانیت کے سب سے بڑے نصب العین یعنی اخوت، مساوات اور انصاف کے حامل اسلامی نظام کے حاکمانہ اقتدار اور حاکمانہ تسلط کی خاطر ایک لامتناہی جدوجہد کرنے کے لئے اُٹھا کرتا ہے یہ جذبۂ عشق ہی جس کی طفیل مردِ مسلمان اپنے آپ کو حُجرۂ سکون و عافیت سے نکال کر کارزارِ حق و باطل کی آگ میں جھونک دیتا ہے اقبال کا پیغام اُس کے لئے یہی ہے کہ ؎

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

شیخ حسین صابر

غزل

ودداریٔ احساس کو ٹھکرا نہیں سکتے — ہم طور پہ جلووں کے لئے جا نہیں سکتے

ینچا ہے محبت کا چمن دل کے لہو سے — غنچے مری اُمید کے مُرجھا نہیں سکتے

جو درد کے ہاتھوں دلِ مضطر کا ہے عالم — الفاظ کا جامہ اُسے پہنا نہیں سکتے

اے دوست محبت ہے وہ نازک سی حقیقت — محسوس جسے کرتے ہیں سمجھا نہیں سکتے

زاہد کو مبارک رہے جنت کی تمنا — رندوں کو یہ بے کیف خیال آ نہیں سکتے

اے عقل نہ احسان اُٹھا دیر و حرم کا — منزل پہ یہ رستے تجھے پہنچا نہیں سکتے

ل جائے جنہیں دولتِ بیدار جنوں کی — وہ عقل کے دھوکے میں کبھی آ نہیں سکتے

آئینہ طفیل اُن کو بناتی نہیں فطرت
دل درد کے جوہر کو جو اپنا نہیں سکتے

طفیل ہوشیارپوری

مطبوعات

مضراب از راجہ مہدی علی خاں۔ یہ نظموں کا مجموعہ ہے اور میرا جی دیباچہ لکھ رہا ہو تو از خود معلوم ہونے لگتا ہے کہ شاعر جدید رجحانات کا قائل ہے لیکن مضراب کا شاعر بذاتِ خود کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ نثر نگار کی حیثیت سے راجہ صاحب کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور نظمیں گذشتہ چھ سات سال سے مختلف ماہناموں میں شائع ہو رہی ہیں۔ ان نظموں میں طنز ہے، ہلکی گہری ۔۔۔ ہلکی اتنی کہ آپ ہنس پڑیں گہری ایسی کہ آپ محسوس کرنے لگیں۔ لیکن اِن نظموں کے لطیف انداز اور حسین اشاریت پر آپ داد دیئے بغیر نہیں رہ سکیں گے لیکن اس مجموعے میں طنزیہ طرز نہیں رومان بھی ہے۔ جز دوسرا رنگ "کے عنوان کے تحت آتا ہے یہ رنگ پائیدار نہیں اور کچی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ شاعر کا یہی رنگ زیادہ واضح ہے اگرچہ اس میں جنس کے بعض غیر حسین پہلوؤں پر نظر جاتی دکھائی دیتی ہے "مضراب" کی نظموں کا اسلوب نہایت دلکش اور جاذبِ توجہ ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اہلِ نظر اس مضراب سے ابھرتے نغمے پا سکیں گے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

نادراتِ شاہی ۔ از شاہ عالم ثانی بادشاہِ ہند۔ کتب خانہ ریاست رامپور سے اب تک کچھ ایسی مفید کتابیں اس حسین اہتمام سے شائع ہوئی ہیں کہ ہر کہ و مہ نے بے اختیار داد دی ہے نادراتِ شاہی بھی اسی قبیل کا ایک مجموعہ ہے جو ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ عالم کے ذوق کی صحیح داد ہے۔ شاہ عالم اُردو ہندی اور فارسی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور ان کا مجموعہ ۱۷۹۷ء میں مرتب ہوا جو اب شائع کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف ایک تاریخی کلام کا نمونہ ہے بلکہ اُس سرپرستی کا پتہ بھی دیتا ہے جو مغلیہ دربار میں اُردو کو حاصل تھی۔

اُردو غزل میں قلعۂ معلّے کی ستھری ستھری زبان استعمال ہوئی ہے۔ ایک شعر سنئے اور داد دیجئے۔

سالہا اشکِ ندم کے مرے آہ و فغاں ہے جو قافلہ جاتا ہے سو بے گرد نہیں ہے

بحیثیت مجموعی اس قابلِ قدر کلام کو ہم تاریخی حیثیت دینے پر مجبور ہیں۔ شاہ عالم کے بعد غزل نے جو ادوار دیکھے ہیں وہ ہمیں آج کے زمانے میں اس سے زیادہ اہمیت دینے کی اجازت نہیں دیتے۔ کتاب کے آغاز میں جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا ایک بیش قیمت مقدمہ بھی ہے۔ کتاب ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ہے اور طباعت نہایت پاکیزہ ہے قیمت درج نہیں۔ پتہ ناظم کتب خانہ عالیہ ریاست رامپور۔

ماہنامہ معاشیات ۔ ۴۸ صفحات کا یہ ماہنامہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کے زیرِ اہتمام جاری کیا گیا ہے پہلے دو شمارے ہمارے سامنے ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اداریے میں فرماتے ہیں "انجمن ترقی اُردو کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اُردو ادب کی کمی پوری کرے۔ کوئی زبان شائستہ اور ادبی زبان ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتی جو علمی خیالات ادا کرنے سے قاصر ہے"۔ اس ماہنامے کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے جنوری کے شمارے کے چند مضامین کے عنوانات ملاحظہ فرمائیے "نئے سال کی غذائی صورتِ حال" "خطوطِ منصوبہ بندی" "سوویت معاشی نظام پر جنگ کی تباہ کاریاں"۔ وغیرہ وغیرہ ہمیں اس ماہنامے کے اغراض و مقاصد سے پوری ہمدردی ہے اور ہماری تمام تر دعائیں اس کے ساتھ ہیں ہمیں امید ہے کہ معاشیات کے طالب علم اور اس مضمون سے دلچسپی لینے والے حضرات اس کا باقاعدہ مطالعہ کریں گے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت سالانہ پانچ روپے

سید منظور حسین بخاری مینجر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۴۷ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔
صرف سرورق اتحاد لون پریس رام گلی لاہور میں چھپا

رجسٹرڈ ایل نمبر (ل ر ۷)

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲ - علمی وادبی، تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں ۔
مسوّدے کا نہایت صاف اور خُوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ۔

۳ - دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۴ - جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع
یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے بصُورتِ دیگر دفتر "ہمایُوں"
خط وکتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ۔

۵ - "ہمایُوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ
جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتہً مِل سکتا ہے ۔

۶ - منی آرڈر اور خط وکتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے
اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصُورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصُول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

مینیجر "ہمایوں"

۳۶ - لارنس روڈ - لاہور

اُٹھو وگرد حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگار علامہ عصر آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: یوسف ظفر بی۔ اے

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہِ اپریل ۱۹۴۶ء

جلد (۴۹) — نمبر (۴)

سالانہ چندہ

فی پرچہ

جہاں نما

ہندی — اُردو — ہندوستانی

"کوئی ہندوستان کا رہنے والا حقیقی معنوں میں ہندوستانی زبان سے کیسے منہ موڑ سکتا ہے؟" یہ سوال گاندھی جی نے اپنے ہفتہ وار اخبار "ہریجن" میں کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کے جواب پر غور کریں ہمیں اُن کے جواب کو سُن لینا چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں "سنسکرت نما ہندی کے پجاری اس ڈر کے مارے ہندوستانی کے قریب نہیں پھٹکتے کہ اس سے اُن کی ہندی کو نقصان پہنچے گا۔ اور اسی طرح فارسی اُردو کے قائل اُردو کے بگڑنے کا احتمال لئے اس کو منہ نہیں لگاتے۔ لیکن یہ خطرے بے معنی ہیں۔ کوئی زبان محض پروپیگنڈے کے بل بوتے پر پنپ نہیں سکتی۔ اگر یوں ہو سکتا تو مغربی لوگوں میں "ایسپرانٹو" ضرور جگہ پالیتی۔ اس کی ناکامی کا باعث یہ ہے کہ محدودے چند لوگوں کی سرگرمی ایسے سلسلے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی قوموں کی زبان ہی پھلتی پھولتی ہے جو مزدور، فن کار، ادیب، تاجر اور دیگر پیشہ وروں کو اپنے احاطے میں رکھتی ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس طرف جدوجہد کریں"

"صرف وہ زبان قومی بن سکتی ہے جسے ایک ملک کے باشندے خود اختیار کریں۔ انگریزی زبان کتنی ہی شستہ کیوں نہ ہو ہندوستان کے عوام کی زبان کبھی نہیں بن سکتی۔ انگریزی اقتدار اگر پائیدار اور ابدی بھی ہوتا تو بھی انگریزی زبان دفاتر کے ہندوستانی افسروں کی سرکاری زبان ہی رہتی اور چونکہ تعلیم کا سلسلہ اُن کے ہاتھوں میں ہے اس لئے صوبائی زبانوں کو اس سے نقصان پہنچا۔

"آنجہانی لوکمانیہ تلک نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ انگریزوں نے صوبائی زبان پر ایک احسان کیا ہے۔ یہ کسی حد تک درست ہے۔ لیکن یہ فرض انگریزوں کا نہیں تھا۔ کہ وہ ان زبانوں کو تقویت دیتے اور اس کی ذمہ داری بھی ان پر عاید نہیں ہوتی۔ یہ فرض قوم کے باشندوں کے اور اُن کے رہنماؤں کا ہے۔ اگر انگریزی تعلیم پاکر لوگ اپنی مادری زبان کو فراموش کر دیں۔ جیسا کہ آج کے کچھ نوجوان کرتے ہیں۔ تو ہماری زبانوں کی فاقہ کشی جاری رہے گی"

"آج ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ برطانوی حکومت ہمیشہ نہیں رہے گی۔ انگریز کہتے ہیں اور ہم مانتے ہیں کہ یہ حکومت اسی سال ختم ہو جائیگی اس کے بعد ہمارے لئے "ہندوستانی" کے علاوہ کوئی زبان نہیں رہے گی۔

آج اس زبان کی دو صورتیں ہیں ہندی اور اُردو۔ اول الذکر ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور مؤخر الذکر اُردو رسم الخط میں۔ ایک سنسکرت کے خون پر پرورش پاتی ہے اور دوسری عربی اور فارسی پر۔ اس لئے آج دونوں صورتوں کا قائم رہنا چاہیے لیکن ہندوستانی ان کی آمیزش کا نام ہوگا۔ کل یہ زبان کیا صورت اختیار کرے گی اس پر آج غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تیس کروڑ میں سے تیئیس کروڑ لوگ ہندوستانی بولتے ہیں۔ یہ تعداد باشندوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہی زبان ہماری قومی زبان ہے۔

ہندی اور اُردو دو بہنیں ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کی خانہ جنگی نہیں ہونی چاہیے۔ رقابت انگریزی کے ساتھ ہے اس جنگ کے لئے ابھی بہت کد و کاوش کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستانی کے طلوع کے ساتھ صوبائی زبانوں کو بہت [illegible]

۴۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں کی رائے:

• اس قومی زبان کے پروپیگنڈے کے ضمن میں حال ہی میں جنوبی ہند میں گیا تھا۔ اب تک جس زبان کو وہ ہندی کا نام دیتے تھے اُس کو ہندستانی سے بدل دیا گیا ہے۔ گذشتہ چند مہینوں میں بہت سے لوگوں نے دونوں رسم الخطوں کا درس لیا ہے اور امتحان پاس کئے ہیں۔ جنوب میں بھی مسئلہ رسم الخطوں کا نہیں بلکہ انگریزی کا ہے۔ وہیں اس کے لئے سرکاری لوگوں کو تو کون زبان چاہئے قصور ہمارا ہے۔ ہم ہمیشہ انگریزی پر فدا ہوتے رہے ہیں۔ میں نے یہ رحجان ہندستانی میں بھی دیکھا لیکن مجھے امید ہے کہ یہ خوش فہمی بہت جلد رخصت ہو جائے گی جب یہیں بہت کچھ کیا جا چکا ہے اور بہت کچھ کرنے کو باقی ہے اگر ہمیں اپنی منزل مقصود کو پہنچنا ہے۔

اب ہم دوبارہ گاندھی جی کے سوال کو دہراتے ہیں "کوئی ہندستان کا تنہا اور بلا تحقیق معنوں میں 'ہندستانی' زبان سے کیسے منہ موڑ سکتا ہے؟" اس استفسار کا جواب دینے سے خود گاندھی جی کترا گئے ہیں۔ ہمیں مسرت ہوگی اگر تمام ہندوستان دونوں رسم الخطوں کو درس لے اور دونوں زبانوں کا مطالعہ کرے لیکن یہ امر غیر فطری ہے کہ ہوتے ہوتے دونوں کی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور محض ایک زبان 'ہندستانی' باقی رہ جائے گی جس کے رسم الخط پر غور کرنے کی آج ہمیں ضرورت نہیں۔ گاندھی جی نے ایک زبان پر زور دیا ہے۔ ہم بھی یہاں تک اُن سے اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن یہ وہ زبان ہے کہ جو ہندو مسلم اتحاد کی پیداوار ہے ایک قومی زبان بن سکتی ہے ——— نہیں ——— ایک قومی زبان ہے لیکن گاندھی جی اور اُن کے ساتھ دوسرے لوگ جو ہر مسئلے کو مذہب کی عینک سے دیکھتے ہیں اس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مہر ثبت کرتے ہیں۔ اور حقیقت تک پہنچنے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ زبانیں جو ہمارے خون میں سرایت کر چکی ہیں، گاندھی جی کے ارشاد اور پروپیگنڈے سے اپنی گرفت نہیں چھوڑ سکتیں ہیں ڈر ہے کہ کہیں ہوتے ہوتے ہندی اُردو کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہ ہو جائے۔ بول چال کی زبان آج بھی نہایت سادہ ہے اور یہی سادہ زبان ہماری قومی زبان ہے۔ اس کو کسی نام سے یاد کر لیا جائے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ رہا رسم الخط کا مسئلہ تو ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ رسم الخط جو ایک مردہ زبان سے اخذ کیا گیا ہے زیادہ دیر تک مقبول ہونے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ سنسکرت کی موت کا ایک باعث اس کا رسم الخط اور اگر امر ہے جو ہندی کو زیادہ دیر تک تندرست نہیں رہنے دے گا۔

اب ہندستانی کی تحریک کے اغراض و مقاصد کے بارے میں پرنسپل ایس۔ ایس۔ اگروال جنرل سیکرٹری ہندستانی پرچار سبھا وردھا کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے "مہاتما گاندھی کے ہندی ساہتیہ سمیلن سے مستعفی ہونے کے بعد سے اب تک ہندی اور ہندستانی کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور سمیلن کے ارکان اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فقط ہندی کو قومی زبان اور ناگری کو قومی رسم الخط قرار دینا چاہئے۔ مہاتما گاندھی اور ہندستانی پرچار سبھا کے ارکان مُصر ہیں کہ ہندستانی کا جو اُردو اور ہندی کی سادہ صورت ہے دونوں رسم الخطوں میں مطالعہ کرنا چاہئے۔ سمیلن والے کہتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کا دیا ہوا نام ہے اس زبان کا جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے۔ اس میں سنسکرت کے خود کئی الفاظ ہیں جو ہندوستان کے دور دراز صوبوں میں بخوبی سمجھے جاتے ہیں اور فارسی اور عربی الفاظ سے زیادہ آسان اور موزوں ہیں۔ اس لئے سمیلن کا تقاضا ہے کہ ہندی اور ناگری کو سرپرستی میں لیا جائے۔

• مہاتما گاندھی ہندستانی کے حق میں ہیں اس لئے کہ ۱۹۲۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے کانپور کے مقام پر اس کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ بدقسمتی سے ہندی اور اُردو دونوں کے ساتھ مذہبی تعصبات وابستہ ہو گئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندی کو زیادہ سنسکرت آمیز اور اُردو کو زیادہ فارسی آمیز بنایا جا رہا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ایک ایسی آسان زبان کو ترقی دی جائے جس میں ہندی اور اُردو دونوں کی آمیزش ہو یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ قومی زبان کا مقصد ہندستانی قوم کے مختلف عناصر کو تقسیم کرنا ہے۔ فقط ہندی یا فقط اُردو اس مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ ہندستانی بہت جلد اُردو اور ہندی کے حامیوں میں گھر کر لے گی۔ علاوہ ازیں ہندی اور اُردو کے اسالیب زیادہ مذہبی اور ناقابل استعمال ہو گئے ہیں۔ وہ عوام جن کے لئے قومی زبان کی ضرورت ہے صرف ہندستانی ہی کی آغوش میں آ سکتے ہیں۔"

[illegible] ہندستانی کا مقصد اُردو اور ہندی کو ذک پہنچانا نہیں۔ یہ دونوں زبانیں اپنے اپنے ادب کو آزادانہ طور پر جاری رکھ سکتی ہیں بشرطیکہ

ان دونوں کے درمیان پل باندھ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرنا چاہتی ہے۔ سادگی، پاکیزگی اور شگفتگی کے باعث یہ زبان ملک کی قومی زبان بن جائے گی۔ ہندستانی اب بھی ہندی اور اردو میں مستعمل ہے لیکن اب اس کو زیادہ تقویت دینے کی ضرورت ہے۔"

"اس بات کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم آل انڈیا ریڈیو کی زبان کو ہندستانی قرار نہیں دیتے۔ یہ خالص اردو زبان ہے۔"

آداب عرض ہے — لیجئے بات از خود صاف ہو گئی۔ اب تک جس ہندستانی کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے اور جس کی ضرورت کا احساس اس لئے دلایا جا رہا ہے کہ عوام کے لئے ایک سیدھی سادی زبان کی ضرورت ہے وہ ہمارے نزدیک چھ سات سو الفاظ کی ایک مختصر اور معمولی سی زبان تھی جسے ادبی زبان بننے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی اور جو اردو اور ہندی کی آسان ترین صورت تھی۔ یہ صورت ہمارے خیال میں آل انڈیا ریڈیو کی خبروں سے ابھرتی تھی جسے ہم اردو کا نام دینے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے۔ ہندستانی پرچار سبھا کے جنرل سیکرٹری صاحب کا یہ ارشاد کہ یہ زبان خالص اور سادہ اردو ہے ہمارے لئے غور و فکر کی ایک نئی راہ پیش کرتا ہے۔ اگر ایک لمحے کے لئے یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ریڈیو کی زبان سادہ ترین اردو ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو اپنی انتہائی سادگی میں بھی ہندستانی کا مصداق نہیں بن سکتی؟ — جنرل سیکرٹری صاحب فرماتے ہیں نہیں۔ بلکہ ہندستانی کے لباس میں انہیں خالص ہندی کی تعلیم و ترویج مقصود ہے — اگر ان کے نزدیک ہندستان کی فلاح و بہبود کا یہی ایک راستہ ہے کہ مذہبی تعصبات کے ہاتھوں اردو کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اردو کی پیدا کردہ تہذیب کو چوٹی اور لنگوٹی سے آراستہ کیا جائے تو ہم اس کے لئے آج بھی تیار نہیں اور آئندہ بھی نہیں۔ اس پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تالیف کے ان جملوں میں نہ ڈھانے کی صلاحیت ہے اور نہ بگاڑنے کی۔

پھر ارشاد ہوتا ہے "گاندھی جی اردو اور ہندی دونوں کے رسم الخط پر زور دیتے ہیں۔ اس کی وجہ تلاش کرنے کے لئے ہمیں زیادہ دور جانا نہیں پڑتا۔ ہندستانی کے لئے اگر ایک قدرتی اسلوب پیدا ہونا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ہم وطنوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ان دونوں اسالیب کی حامل ہو۔ ان دو دریاؤں کو قریب تر کرنے اور ان پر پل باندھنے کی یہی ایک سبیل ہے۔ کوئی شخص یا ادارہ — وہ کتنا ہی ہمہ گیر اور نمائندہ کیوں نہ ہو — ایک نئی زبان پیدا کرنے کا مجاز نہیں — صحیح ہندستانی ایک قدرتی ذریعۂ اظہار ہوگا ان قوم پرست حضرات کا جو ان دونوں زبانوں کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔"

ہمارے بیان میں ایک ہی بات کام کی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی شخص یا ادارہ ایک نئی زبان پیدا کرنے کا مجاز نہیں — لیکن ہندستان دنیا کا حصہ نہیں — یہاں ایک ہی شخص ملک بھر پر ایک نئی زبان کی قید لگاتا ہے اور اس کے لئے دو زبانوں کا مطالعہ چاہتا ہے۔ اگر ہندستانی اردو اور ہندی کے اتحاد کا نام ہے تو گاندھی جی کے ارشاد اور توجہ کے باوجود یہ اتحاد ہو کر رہے گا لیکن گزشتہ سوا سو سال کے دوران میں ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ گلکرائسٹ کا لگایا ہوا یہ پودا اردو کے نام ہی سے مرجھا جاتا ہے اور اسی فضا میں پنپ نہیں سکتا جس فضا میں اردو کی معاشرت مسکراتی ہوتی ہے۔

اور اب آخری ارشاد "ایک لمحے کے لئے بھی اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہندستانی کی تحریک محبت، خیر خواہی اور وداد کی تحریک ہے — یہ ایک وسیلہ ہے مقصد تک پہنچنے کا — اور وہ مقصد قومی اتحاد و یگانگت ہے۔"

قومی اتحاد و یگانگت کا وسیلہ یہ نہیں کہ آپ لوگوں کی زبان کو بگاڑ کر ایک لغو اور بے سروپا سی زبان ان پر ٹھونسیں اور اپنے دلوں میں بغض و عناد کے شعلوں کو بدستور بھڑکنے دیں۔ یہ طریقے صد درجہ بے معنی اور بیکار ثابت ہوں گے۔ اگر بات یونہی بڑھتی گئی تو ہمیں اندیشہ ہے کہ قومی اتحاد کے یہ طالب کل مذہبی اتحاد کے لئے اکبر کی طرح "دین الٰہی" کی قسم کی کوئی مصیبت نازل کریں گے اور ہم سے مطالبہ ہوگا کہ ہم اس کے لئے اپنے مذاہب میں مناسب رد و بدل کریں۔ ان حضرات کے لئے ہمارا مشورہ یہی ہے کہ وہ اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور یہ مذاق چھوڑیں۔ یوں زبانوں کی توڑ موڑ سے آخر کیا حاصل؟

یوسف ظفر

اشتہاری ستارے

اردو رسالے عام طور پر شاندار ناموں سے مزین ہیں مثلاً ہمایوں، کارواں، کہکشاں، ادب لطیف، عالمگیر، ساقی، خیال وغیرہ وغیرہ۔

ایک معروف رسالہ کا نام مووی لینڈ ہے دونوں لفظ انگریزی، ترکیب انگریزی (MOVIE) بجائے خود ایک نیا لفظ ہے۔ انگریزی لفظ Fairy کی یاد دلاتا ہے (FAIRY LAND) تو پریوں کے لئے مخصوص ہے۔ مووی لینڈ فلم سٹارز کی دنیا ہے۔

خدا کا آسمان ایک ہے اس میں ستارے لاکھوں ہیں مووی آسمان کئی ہیں مثلاً ہالی وڈ، لندن، پیرس، ماسکو، بمبئی وغیرہ مگر ان آسمانوں میں ستارے خال خال ہیں۔ جو خوش رو ہیں وہ خوش گلو کم ہیں۔ جو خوش کلام ہیں وہ خوش خرام نہیں۔ نامکمل سے ستارے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ کوئی کسی کا تو کوئی کسی اور کی۔

ان ستاروں کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ خواتین ہند کو (Figure) یعنی جسمانی تناسب اور رعنائی کا خیال پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا کا سب سے بڑا فلم سٹار مہاتما گاندھی ہے جو لنگوٹی پوش ہو کر روحانی تناسب اور شانتی کا مبلغ ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو مگر نستعلیق مزاج ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ نا ممکن ہے کہ جو شخص کھدر پہنے اُس کی روح معطر نہ ہو۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جو گل اندام جسموں پر ولایتی ریشمی ساڑھیاں نہ دیکھ سکے وہ ضرور کسی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے اور اس قسم کے مریض کی روح تعصب کے کیچڑ میں لتھڑی رہتی ہے۔ فلک پیما کو ہر قسم کے ذہنی تعصب سے نفرت ہے اور اس کی رائے تو یہی ہے کہ کسب کمال میں مہاتما گاندھی کا نمبر اول ہے فلم سٹار ایک ایک تصویر سے لاکھوں کماتے ہیں تو مہاتما گاندھی بھی اپنی تقریروں کی کشش سے لاکھوں کی تھیلیاں وصول کرتے ہیں یہ صحیح ہے کہ روپیہ نہ مہاتما گاندھی کے پاس رہتا ہے نہ چارلی چپلن کے پاس۔ مگر آتا تو ہے۔

خدائی ستارے اپنی شعاعیں واپس نہیں لیتے۔ ان کی کشش عام ہے۔ فلم سٹارز کی نگہ کرم صرف زر داروں کے لئے ہے۔ زمین کے ستارے زر ساختہ ہیں۔ ترجیح کا قائل نہیں ہوں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آج کل کے اشتہاری ستاروں کے مقابلہ میں خدائی ستارے کیا خود خدا کی پرستش کم ہے۔

فلک پیما

غزل

وصل کی رات جب بھی آئی ہے — صبحِ غم اپنے ساتھ لائی ہے

کیا قیامت ہے اُن کے ہوتے بھی — ہر نفس محشرِ جدائی ہے

مجھ سے ملتے ہی مُسکرا اُٹھے — کوئی تو بات یاد آئی ہے

دوستی سے ہے دشمنی مقصود — آشنائی غمِ آشنائی ہے

کوئی لمحہ نہ آ سکا واپس — عمرِ رفتہ تری دُہائی ہے

کوششِ ضبط راس آ نہ سکی — لب پہ رُک رُک کے بات آئی ہے

زندگی انتظار ہے تیرا — غمِ ہستی، غمِ جدائی ہے

بے وفا! اک ترے نہ ہونے سے — جانے کس کس کی یاد آئی ہے

کوئی محروم ہے، کوئی مجبور — پارسائی ہے، نارسائی ہے

فکرِ منزل رہا نہ ذکرِ سفر — یوں بھی منزل قریب آئی ہے

اُن کے ذوقِ سخن کا شرمندہ — میرا حُسنِ غزل سرائی ہے

نقش ہے دل پہ قولِ میرؔ، حفیظؔ
"کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے"

حفیظ ہوشیارپوری

عظیم آباد کی تاریخی ادبی اہمیت

ارضِ ہند میں صوبۂ بہار اور خصوصاً عظیم آباد تاریخی اور ادبی اہمیتوں کے باعث امتیاز رکھتا ہے۔ مختلف ہندو مذاہب نے خطۂ بہار میں اور خصوصاً نواحِ عظیم آباد میں نشو و نما پائی۔ مذہبی تحریکوں کا اثر عام طور پر زبان و ادب پر گہرا پڑا۔ اکثر قدیم ہندو سلاطین صرف بہادر ہی نہیں تھے۔ بلکہ صاحبِ سیف و قلم بھی تھے۔ دار العلوم نالندہ کی شہرت راجہ ہرش وردھن کی ادب نوازی و علم پروری کا کافی ثبوت رکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں معلموں اور پروفیسروں کی تعداد ایک ہزار سے بالا تھی۔ دور دور سے طلباء تکمیلِ فن کے لئے آتے تھے۔ لیکن راجہ ہرش وردھن کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں نے دار العلوم کی طرف توجہ کم کر دی۔ چونکہ اس دار العلوم کا تعلق بودھ مذہب سے تھا اور بودھی تحریکیں اور علوم یہاں سے نشر ہوتے تھے اس لئے بعد کے ہندو راجاؤں نے تعصب سے کام لے کر اس دار العلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ملکی زبان کے زوال اور مذاہب کے تکرار و انحطاط کے ساتھ ہی ساتھ پٹھانوں کے حملے اور مغلوں کی حکومت نے یہاں کی زبان میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا۔ اور یہی انقلاب زبانِ اردو کی پیدائش کا سبب ہوا۔ زبانِ اردو جس کی داغ بیل ہندو اور مسلمانوں کی ملاپ سے ڈالی گئی اسی انقلاب کا اثر تھا۔

سچ کہا گیا ہے کہ اردو نے دکن میں نشو و نما پائی، دلی میں برگ و بار لائی اور متقدمین شعرا کے زیرِ تربیت ایک زندۂ جاوید زبان بن گئی۔ عظیم آباد نے بھی حتی المقدور دکن و دلی کا ساتھ اردو کی خدمت میں ہمیشہ دیا۔ چنانچہ عظیم آباد کے قدیم شعراء میں تحقیق اور ناجی ہیں جو ولی دکنی کے قریب العصر ہیں۔ ولی دکنی اور ناجی چونکہ قریب العصر ہیں اس لئے زبان میں سرِ مو فرق نہیں۔ اس دور کے اکثر الفاظ و محاورے جو اب متروک ہیں عظیم آباد میں اب تک عورتوں کی زبان پر ہیں۔ مثلاً بیتنا بمعنی گزرنا، موا بمعنی مرنا۔

ناجی کے مندرجہ ذیل اشعار میں یہ دونوں لفظ موجود ہیں ؎

لڑتے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے ‏ ‏ ‏ ‏ دعا کے زور سے وائی دوا سے جیتے تھے

اکڑ علی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی ‏ ‏ ‏ ‏ جنہوں کی آن پہنچی موئے وہ ایک چھلے پر

عظیم آباد کی ادبی اہمیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہاں ہر دور میں صاحبِ کمال پیدا ہوئے۔ پہلے دور میں تحقیق و ناجی اور دوسرے میں فغاں کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ آپ نے دلی ترکِ وطن کر کے عظیم آباد میں توطن اختیار کیا۔ فغاں کے کمال کی سند اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ مرزا رفیع جیسے صاحبِ کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھتے تھے اور بہت تعریف کرتے تھے۔ دو شعر بطورِ نمونہ پیش ہیں ؎

اس کے وصال و ہجر میں یوں ہی گزر گئی
دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

مت قصد کر صبا تو دلِ داغدار کا
ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا — فغاں

لکھنؤ میں جب مصحفی اور انشا کا دور آیا تو عظیم آباد میں شیخ محمد روشن جوشش اور شیخ غلام علی راسخ اپنی اپنی لسانی شمعیں جلائے ہوئے تھے۔ راسخ نے ٹھیک چالیس سال تک شاعری کی اُس کی شاعری کا پایہ میر و سودا سے کسی طرح کم نہیں۔
مصحفی کے شاگردوں میں جعفر حسین خاں فیضی اور اُن کے بعد الفت حسین صاحب فریاد کا زمانہ استادی آتا ہے جدید شعرا میں شاد مرحوم کا پایہ بہت ہی بلند ہے۔
بارہویں صدی ہجری زبان اور شاعری کے لحاظ سے عظیم آباد کا عہد زریں ہے۔ اس کے رُبع آخر میں بڑے بڑے شعرا دہلی چھوڑ کر یہاں آئے اور توطن اختیار کیا۔ دہلی کی بربادی کے بعد شعرا کے ممتاز حصہ نے عظیم آباد کی طرف رُخ کیا جن میں خاص طور پر مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں :۔
شاہ رکن الدین عشق متوفی سنہ ۱۲۰۳ھ، اشرف علی فغاں متوفی سنہ ۱۱۸۶ھ۔ نقیر صاحب درد مند سنہ ۱۱۷۶ھ۔ میر باقر حزیں، ضیاء الدین ضیا، غلام حسین شورش متوفی سنہ ۱۱۷۶ھ اور ہیبت قلی خاں حسرت سنہ ۱۲۱۰ھ۔ راجہ شتاب رائے، دولت رام موزوں، خواجہ محمدی خاں اور سید احمد خاں کی سخن نوازی عظیم آباد میں ادبی تحریک پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی۔
دہلوی شعرا کی آمد سے پہلے ہی عظیم آباد میں جوشش اور دل جیسے باکمال شعرا موجود تھے۔ دہلوی شعرا کے علاوہ عظیم آباد کی خاک نے راسخ، حضور، سلیم، شورش، موزوں، جعفر، بیدل، حسرت، فریاد اور شاد جیسے صاحب کمال شعرا پیدا کئے۔ لیکن اس میں شک نہیں دہلوی شعرا کی آمد نے عظیم آباد کی شاعری میں چار چاند لگادیئے خصوصیت کے ساتھ عظیم آبادی شعرا میں راسخ و جوشش ؛ دہلوی شعرا جنہوں نے عظیم آباد میں توطن اختیار کرلیا عشق و حیا کے نام آتے ہیں ۔ فغاں کا تذکرہ قبل ہو چکا ہے۔ نمونہ چند اشعار پیش ہیں جن سے کلام کی ہمسری ظاہر ہوگی ؎

آج ہے جاں بہ لب ترا جوشش
جی میں آوے تو آج آ جانا

ہزار ۔ ۔ کرے گا ہزار چاہے گا
مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا — جوشش عظیم آبادی
نازاں ہوں اپنے قلبِ شکستہ کے شان پہ
ہو عرش کو حسد ایسے ٹوٹے مکان پہ

تھا یہی ہم کہ دشوار ہی تھا پھر اس سے کہیں گے
پر جیسے کچھ سخن دشمن یاد نہ آیا — راسخ عظیم آبادی

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگ خلق — اس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے — ضیا

آگے یہاں نصیب ہے سرسبز ہو نہ ہو — دل کی زمیں میں تخم محبت تو بو دیا

ہمیں خاک و خوں میں لٹا کر چلے — سلامت رہو تم دغا کر چلے — عشق

بارہویں صدی میں اردو کے صرف ایک یا دو تذکرے دہلی میں موجود تھے لیکن اہل عظیم آباد نے چار چار تذکرے لکھے۔

(۱) تذکرہ عشقی مؤلفہ رحمت علی عشقی عظیم آبادی۔ یہ تذکرہ ۱۱۷۵ھ میں مرتب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اردو کا سب سے قدیم تذکرہ یہی ہے۔ اس میں ۲۳۹ شعرائے ریختہ کے تذکرے موجود تھے۔

(۲) تذکرہ میر غلام حسینی شورش متوفی ۱۱۹۵ھ۔ یہ تذکرہ ۱۱۹۳ھ کے لگ بھگ لکھا گیا۔

(۳) تذکرہ جوشش عظیم آبادی۔ یہ تذکرہ نایاب ہے لیکن اس کی ایک نقل جناب شیخ ظہیر احسن شوق مرحوم کے پاس تھی۔

(۴) تذکرہ گلزار ابراہیم۔ مؤلفہ نواب علی ابراہیم خاں۔ اس کی تکمیل غالباً ۱۱۹۲ھ میں ہوئی۔ یہ تذکرہ خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانہ (پٹنہ) میں موجود ہے۔

خطۂ بہار خصوصاً عظیم آباد اردو نثر میں بھی اتنا پیچھے نہیں ہے۔ جتنا تذکرہ نویسوں کی عدم واقفیت کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ صوبۂ بہار کی اردو نثر میں سب سے پہلی کتاب جو میری نظر سے گزری ہے وہ فیض عام ہے۔ یہ کتاب ۱۲۲۵ھ میں مرتب ہوئی۔ یہ نسخہ ابھی تک کتب خانہ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کے مؤلف جناب مولانا سید شاہ محمد ظہور الحق صاحبؒ ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اس پہلے سال ہجرت کے کتنے واقعے درپیش ہوئے۔ پہلا تو مسلمان ہونا عبداللہ ابن سلام یہودی کا کہ مدینہ میں رہتے تھے اور عالم اپنی قوم میں تھے۔ بہ مجرد مشاہدہ کرنے شواہد کے خود اور چند یار ان کے دولت اسلام سے مشرف ہوئے۔ دوسرا عقد مواخات یعنی بھائی چارہ حضرت نبینا صلے اللہ علیہ وسلم کا درمیان ایک ایک مہاجر اور ایک انصاری کے۔"

جناب سید شاہ ظہور الحق صاحبؒ کی دوسری کتاب کسب النبی بھی اسی کے لگ بھگ کی ہے۔ سنہ تالیف ۱۲۳۳ھ۔ ان کتابوں کے علاوہ اسی صدی ہجری میں بعد کو دوسروں نے بھی لکھی ہیں جن کا تذکرہ طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ متاخرین میں نواب نصیر حسین صاحب خیال عظیم آبادی کی مشہور تصنیف مغل اور اردو اور شاد مرحوم کی حیات فریاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سید رضی الدین احمد

تابع مُہمل

سیدھا سادا دیس ہماری، سیدھے سادے بول — من کا مندر کھول

ہاں اے گیانی! ہیں یہ سیدھے سادے بول انمول — رول اب موتی رول

چاندی، سونا، مونگا، موتی، جھوٹا سب سنسار — پاپی ہے دہار

مورکھ اس اندھیاری میں یہ چمکیلا پرچار! — وہ بھی سو سو بار

برچھی بھالا جمدھر خنجر اوچھے سب ہتھیار — رکھ دے یہ تلوار

تو ان ہتھیاروں کا اب کیوں کرتا ہے بیوپار — مدھم ہے بازار

سانڈ وکیا، کس کی کشتی "دنگل ونگل" جھوٹ — دیکھا اس کا سوٹ!

بلوانوں میں یہ پردیسی ڈالے گا اب پھوٹ — بستی میں ہے لوٹ!!

پورب پچھم دکھن اُتر چاروں کھونٹ اپنے — ہم آئے تپنے

آجا اپنے درشن کرنے نام اپنا جپنے — دیکھ اچھے سپنے

نیند اُچٹ جاتی ہے جس سے کب تک اس کا دھیان — ٹھیک نہیں اوسان

گیان اپنا کر دھیان اپنا رکھ آپ اپنے کو جان — کہتا میرا مان

تیری نگری تیرا راجا، ناتا اس سے جوڑ — اوروں سے منہ موڑ

من کا مندر پھبنے والے دیول دیول چھوڑ — توڑ ایسے بت توڑ

علی منظور

رجنی

آدھی رات کے قریب وہ تھک ٹوٹ کر دھم سے اپنے بستر پر گری۔ اس کی آنکھوں میں بے خوابی سے ہلکی ہلکی سوزش تھی۔ اس
جسم کے بند بند میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں ایک لطیف خنکی تھی۔ دور شفاف آسمان پر تارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ اس خنکی
کو پینے کے لئے اس نے ایک گہری سانس لی۔ اور کروٹ بدل کر اپنا گال ٹھنڈے ٹھنڈے سرہانے پر رکھ دیا۔ مونج کی اس چھوٹی
سی چارپائی پر جب اس کا بڑھا ہوا جسم مشکل سے سما سکتا تھا اور کچھ عرصے سے تو اس کے پاؤں پائنتی سے آگے نکل پڑتے تھے۔ اس نے
آنکھیں بند کر لیں۔ اور لیٹے لیٹے یوں کراہنے لگی۔ جیسے اس کی روح دکھ درماندگی سے فریاد کر رہی ہو۔

آج وہ کافی رات گئے تک کام کرتی رہی تھی۔ لیکن صبح عید تھی۔ اور اسے بہت سویرے اٹھنا تھا۔ جب سے اس نے ہوش
سنبھالا تھا۔ وہ اسی ڈگر پر چلی جا رہی تھی۔ زندگی کے سفر میں وہ کسی موڑ یا دوراہے سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اس نے محنت مشقت
کے سوا اور کوئی راستہ نہیں دیکھا تھا۔ ہر صبح وہ نیند بھری آنکھیں لے کر اٹھتی۔ اور شام کو تھک ہار کر اپنے کھٹولے بستر پر جا پڑتی۔

اس گھر میں اس کے ساتھ برا سلوک نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے دل میں ایک مبہم بے اطمینانی اور دنیا کے خلاف
ایک ان کہی شکایت کا نشان کو چبھتی رہتی۔ زندگی میں کوئی چیز اس کی اپنی نہیں تھی۔ کوئی چیز وہ اپنے لئے کرنے پر قادر نہیں
تھی گویا سب کچھ دوسروں کے لئے کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی ہنسی بھی دوسروں کے قہقہوں کی صدائے بازگشت ہوتی۔ وہ
جب گھر والوں کو ہنستے دیکھتی۔ تو خدا جانے کیوں اپنے آپ کو بھی دانت دکھانے پر مجبور پاتی۔ اس دنیا میں صرف ایک
چیز اس کی اپنی تھی۔ اور یہ تھا اس کا غم۔ اس غم کی بظاہر اسے کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اس غم اور اپنی مبہم بے اطمینانی
میں اسے کوئی گہرا تعلق ضرور محسوس ہوتا۔ رات کو جب وہ کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر لیٹتی۔ تو اپنے آپ کو بے حد مغموم
پاتی۔ غم کا یہ احساس کبھی ایک زہر آلود نشتر کے ساتھ اس کے حلق میں اٹک جاتا۔ اور کبھی چند آنسو بہہ کر اس کے سینے کے
غبار کو ہلکا کر دیتے۔ اس کی ماں دنیا کو میلے سے تشبیہ دیا کرتی تھی۔ لیکن اس میلے کے کھیل تماشوں اور گہما گہمی میں اس کا کوئی
حصہ نہیں تھا۔ وہ تو صرف دہلیز پر آنے جانے والوں کی چیزوں کی حفاظت پر مامور کی گئی تھی۔

بچپن میں جب کبھی اس کی مالکہ کی لڑکیاں گڑیوں کا بیاہ رچاتیں۔ تو اسے نائن بنا کر بٹھا دیتیں۔ لیکن
اسے کبھی مہمان یا سمدھن کا رتبہ نصیب نہیں ہو سکا تھا۔ نسیمہ، فرحت اور شفیق کو سکول پہنچانے کے لئے وہ کئی بار ان
کے بستے اٹھا کر ان کے ساتھ سکول گئی تھی۔ لیکن سکول کی چار دیواری میں داخل ہو کر اسے اپنی ہم سن لڑکیوں سے ملنے جلنے کا موقع
نہیں مل سکا تھا۔ سکول کے پھاٹک پر پہنچ کر لڑکیاں اس کے ہاتھ سے بستے لے کر اندر چلی جاتیں۔ اور وہ باہر کھڑی رہ جاتی۔
رنگ برنگ لباسوں والی لڑکیاں اس کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر اس کے پاس سے ہنستی بولتی۔ قہقہے لگاتی گزر جاتیں۔ گویا
وہ بھی کوئی سڑک پر گڑا ہوا میل کا نشان تھی۔ وہ یہ سوچا کرتی کہ امیر لوگ کن حیلوں سے اپنے بچوں کو امیر اور غریب
لڑکی کے فرق سے آشنا کر دیتے ہیں۔ وہ پانچ سال کی چھ رخ طاہرہ جو کم از کم اس سے بارہ سال چھوٹی تھی کیسا جھڑکا تھا

[illegible] اس کا نام [illegible] نے پڑا! اصاب [illegible]

[illegible] اس کی [illegible]

تھیں اس کی اجب کوئی تحفہ لیتا۔ تو یہ اُس کے ہاتھ اپنے ہم زادوں [illegible] سے چھپا چھپا کر تحفے بھیجتی۔ وہاں سے [illegible] کے خط آتے اور جوابی تحفے! بی بی ہمیشہ یہ جاننے کے لئے ترستی رہی۔ کہ ان خطوں میں کیا لکھا ہوتا۔ لیکن کیا مجال جو انہوں نے کبھی ایک فقرے کی بھنک بھی اُس کے کان میں پڑنے دی ہو۔ ادھر اُس نے خط لاکر دیا ادھر تھوڑی دیر میں انگیٹھی جل گئی اور اُسے حکم ہوا۔ "اچھا شفاعت! اماں تمہیں دیر سے بلا رہی ہیں۔ پوچھیں تو کہہ دینا۔" بی بی شفیق کی حویلی سے کتاب [illegible] وقتوں میں اُسے وہ مشین یاد آجاتی۔ جو اُس نے لاہور کے ریلوے سٹیشن پر دیکھی تھی۔ اور جس میں انگلی ڈالنے سے ایک ٹکٹ نکل آتا تھا۔ اس وقت اس نے بی بی شفیق سے پوچھا تھا۔

"بی بی! یہ انگنیاں کہاں جاتی ہیں!"

"مالک لے جاتے ہیں۔"

"ٹکٹ لوگ لے جاتے ہیں۔ انگنیاں مالک لے جاتے ہیں۔ اور مشین؟"

"اور کیا کرے گی مشین! بس اپنے وقت پر انگنیاں اور ٹکٹ اگلتی رہتی ہے۔"

بعض اوقات وہ اپنے تنگ، روح کش ماحول سے کہیں دور چلے جانے کا خیال کرتی۔ اُس کی نگاہوں میں ابھی تک اپنے گاؤں کے ہرے ہرے کھیت کھنچے ہوئے تھے۔ نہر کے کنارے شیشم کے تناور درخت اور اُن کی چھاؤں میں گائیں بھینسیں۔ بھیڑیں۔ بکریاں! کچھ چرتی ہوئی۔ کچھ بیٹھی ہوئی۔ اور کچھ چپ چاپ کھڑی اپنے سایوں پر غور کرتی ہوئی۔ سوچتی وہ گاؤں میں [illegible] جاکر اپنی زندگی کہاں سے [illegible] پھول چننے اور اپنی ہمجولیوں کے ساتھ [illegible] اور گیت گانے میں صرف کر سکتی لیکن [illegible] کہاں کے پھول چننے اور گیت گانے سے نہیں مل جاتی۔ اور میری ہمجولیوں سے [illegible]

پڑوس میں اس نے پیارے پیارے رنگوں والے پالتو کبوتروں کو بانس کی چھتری پر کلیلیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ سوچا کرتی کہ ان کبوتروں کو اپنے مالک کی پچکار اور اپنے ٹاپک میں کیا جادو نظر آتا ہے۔ کہ وہ دور اُفق کی وسعتوں میں غائب ہو جانے کی بجائے اپنی ننھی سیروں سے خودبخود واپس آجاتے ہیں۔

اور پھر کبھی کبھی جب وہ باورچی خانے میں بیٹھی ایسی ہی کسی سوچ میں غرق ہوتی۔ تو پیاز۔ لہسن اور گھی کے بگھار کی ملی جلی بوؤں کے درمیان اُسے چنبیلی کے تیل کی جادو بھری خوشبو کا احساس ہوتا۔ اور اُسے معلوم ہو جاتا۔ کہ اظہر میاں کہیں پاس ہی کھڑے ہیں۔ نہ جانے اظہر میاں کی ہر وقت ہنستی ہوئی آنکھوں اور لمبی لمبی زلفوں کو دیکھ کر جیجی کا دل کیوں دھڑکنے لگتا۔ اس گھر میں صرف اظہر میاں ہی کبھی کبھی اُس کے درد کو ٹٹولنے کی کوشش کرتے اور اس وقت جیجی کا دل احساس تشکر سے اُن کے قدموں سے لپٹ جاتا۔ آج سے دو تین سال پہلے تک جیجی سے اُن کی بہت چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ آتے جاتے کبھی اُس کے چٹکی لے لیتے۔ کبھی چٹیا پکڑ کر کھینچتے اور کبھی کبھی اُس کی کمر پر ایک ہاتھ سا لگا کر [illegible] اور جیجی ایک مصنوعی خشونت کے ساتھ کہتی "کیا کرتے ہو اظہر میاں" لیکن اب کچھ عرصے سے [illegible] اظہر میاں کو کچھ متین بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ جیجی کا خیال ضرور رکھتے تھے۔ "اماں! جیجی کو بھی [illegible] اسے کوئی موٹا سا کرتہ سلوا دیجئے۔" "یہ لڑکیاں تمام دن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں۔ [illegible]

اور جب کبھی جینی رات کو بتی بجھانے سے پہلے صاف کرنے میں مشغول ہوتی۔ تو وہ پوچھتے "جینی تم نے روٹی کھالی؟" اور جینی ہم کنے کو کہتے جی ہاں "جی" اس وقت وہ یہ بھی کہنا چاہتی تھی۔ کہ آپ مجھ سے کبھی کبھار اس طرح پوچھ لیا کریں۔ تو میں اس گھر میں بھوکی رہ کر بھی گذارہ کر لوں گی۔ ہمدردی کے یہ چھوٹے چھوٹے بول ہی اس دل کو جو سوز اور کدورت جس سے داغ داغ ہو گیا تھا تسکین تو پہنچاتے۔ لیکن جینی کی بے برگ و گیاہ دنیا میں مہربانی کی یہ ہلکی ہلکی پھوار شادابی پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ محبت کی گھنگھور گھٹا کی منتظر تھی۔ جو کھل کر برسے اور جل تھل کر دے۔ اُس نے دیکھا تھا۔ کہ گھر کی مالکن اس پر ترس کھا کر کبھی کبھی کوئی سکہ اس کی طرف پھینک دیتی تھی۔ اور وہ اس سکے کو اس طرح اٹھا لیتی تھی۔ جیسے کتا زمین سے ہڈی کا ٹکڑا اٹھا لیتا ہے۔ اس نے آج تک ہاتھ بڑھا کر اُن کے ہاتھ سے کوئی چیز پکڑنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ جینی سوچا کرتی۔ کہ کیا اظہر میاں بھی اس پر ترس کھا کر کبھی کبھی کوئی مہربانی کا لفظ پھینک دیا کرتے ہیں۔ اور وہ بس اُسے اُٹھا لیتی ہے۔ جینی اظہر میاں سے کچھ مانگنا چاہتی تھی۔ کچھ طلب کرنا چاہتی تھی لیکن اس میں کبھی ہاتھ بڑھا کر مانگنے کی جرأت پیدا نہیں ہو سکے گی؟ کیا کمتری کا ایک احساس اس کے راستے میں حائل ہوتا رہے گا؟ اس نے عہد کر لیا۔ کہ وہ اس تذبذب اس احساس کمتری سے نجات حاصل کر کے رہے گی۔

کل عید ہے شام کو جب اظہر میاں پھر پھرا کر اپنے کمرے میں آئیں گے۔ تو وہ چپکے سے پیچھے سے آ کر اُن کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دے گی۔ پھولوں سے بڑھ کر محبت کی کوئی زبان نہیں۔ ایک محبت کرنے والے ہاتھ کا لمس اُن کی سوئی ہوئی گویائی کو بیدار کر دیتا ہے۔ اور ہر پتی کی زبان عشق در دماں کی مفسر بن جاتی ہے۔ پھولوں کی پتیاں اظہر میاں کے کان میں کچھ کہیں گی۔ اور وہ سب کچھ سمجھ کر اپنی شریر جھپکتی ہوئی آنکھوں سے جینی کی طرف مسرت اور تعجب کے ملے جلے احساس کے ساتھ دیکھنے لگیں گے۔ یہ خیال اُسے سنہرے خوابوں کی وادی میں لے گیا۔ جہاں نیند کی پریاں اُسے جھولا جھولانے لگیں۔

اگلی شام جب عید کی ملاقاتوں کے بعد اظہر میاں گھر لوٹے۔ تو جینی چپکے سے اُن کے کمرے میں داخل ہوئی وہ آنکھیں بند کئے ایک آرام کرسی پر دراز تھے جینی کے پاؤں کی آہٹ سن کر چونکے۔

"او جینی! بڑے ٹھاٹھ ہیں آج تو" جینی ذرا کسمائی۔ اور اس نے بغل سے ایک پوٹلی نکالی۔ یہ رومال میں بندھے ہوئے دو ہار تھے۔ اس گھر میں اگر وہ کھلے بندوں ہار ہاتھوں میں ڈال کر چلتی۔ تو یہ ایک اچنبھا بن جاتا۔ اور طعن بھری نظریں اس پر گڑ جاتیں۔ گویا کہہ رہی ہوں۔ "تم بھی ہار خریدنے لگیں۔ تم کو بھی یہ دن لگے۔ اپنا رتبہ تو پہچانو۔" قدرت نے پھول اس لئے پیدا نہیں کئے تھے۔ کہ وہ بازار کی جنس بنا دیئے جائیں۔ ستاروں کی طرح پھول بھی قدرت کی مسکراہٹیں ہیں جن کا رنگ و بو دنیا کے مفلس انسانوں کے لئے عام ہے لیکن شیطان صفت نے ایجاد کر کے ان مسکراہٹوں کو بھی سوداگری کی سطح پر لا دیا۔ دنیا کی بدمذاقی اور جہالت کے کرشمے دیکھئے چند سکوں کے عوض ان تنگ دلوں سے بھرپور پھول بک جاتے ہیں۔

جینی نے رومال سے ہار نکالے۔ تو اظہر میاں نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔ "ہار کس لئے؟"

جینی کہنا چاہتی تھی۔ "اظہر میاں آپ یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ایک دوشیزہ کسی نوجوان کے کمرے میں تنہا ہاروں کا تحفہ لے کر کیوں جاتی ہے؟" لیکن اس کی زبان نے بولنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کل رات جو منصوبے باندھے تھے۔ وہ بہت کچھ گھروندے کی طرح اس کے سامنے ڈھے رہے تھے۔ وہ حالات کو کوسنے لگی۔ اس نے خیال کیا اگر اظہر میاں میری طرف پشت کئے

بیٹھے ہوتے۔ تو میں پیچھے سے اُن کی گردن میں بار ڈال دیتی۔ اور پھر وہ آپ ہی آپ سب کچھ جان جاتے۔

اچانک اظہر میاں ہنسے "اچھا سمجھا۔ تو گویا یہ ہار اس بات کی یاد دہانی ہے کہ ہم نے تمہیں عیدی نہیں دی۔" یہ کہکر انہوں نے ایک روپے کا نوٹ جینی کی طرف بڑھا دیا۔ جینی کے کان تمتما اُٹھے۔ وہ اپنی روح کی ساری قوت کے ساتھ اس الزام کی تردید کرنا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی "اظہر میاں! ایک خادمہ نوٹوں سے پرے بھی دیکھ سکتی ہے۔ اُس کے کان سکوں کی جھنکار سے زیادہ دلکش نغموں کے مشتاق بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس حالت اضطرار میں وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے منہ سے صرف یہ نکلا "نہیں نہیں۔ اظہر میاں میں عیدی کیا کروں گی!" یہ کہکر وہ کمرے سے اس طرح بھاگی۔ گویا اُسے خطرہ تھا۔ کہ اگر وہ ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہری۔ تو چھت اس پر آگرے گی۔

جینی باہر نکلی۔ تو اُس کے دماغ میں مختلف خیالات کا لاوا اُبل رہا تھا۔ اُس کے ارد گرد کی چیزیں۔ نیچے صحن میں فرحت اور شفیق کے قہقہے اور دور مسجد کا گنبد جس کا سنہری کلس ایک التجا کرنے والے ہاتھ کی طرح اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس لاوے میں پگھل کر رہ گئے۔ اس کی زندگی کے سنہرے سپنے کا تانا بانا بکھر چکا تھا۔ اور رومان کی مکڑجالی غائب ہو چکی تھی۔ اب شاید عمر بھر وہ کوئی سپنا نہیں دیکھ سکے گی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے میلے برتنوں کے انبار۔ پتیلیوں میں جمے ہوئے سالن۔ بچے کچھے ٹکڑے اور آلودہ دسترخوان آگئے۔ وہ شاید انہیں چیزوں کے لئے بنائی گئی تھی۔ جب وہ خود ان سے اوپر اُبھرنے کی ہمت نہ کر سکے تو کسی کا کیا قصور۔ اس کی عمر دوسروں کی طرف تکتے گزری تھی۔ اپنی ہر خواہش کی تکمیل کے لئے وہ دوسروں کی محتاج تھی۔ اُس میں تقاضے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ احساس کی چنگاری سلگ رہی تھی۔ لیکن ہمت کا ایندھن کہاں تھا۔ جو اس چنگاری کو شعلہ جوالہ بنا دیتا؟

پروں کی پھڑپھڑاہٹ نے جینی کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ ساتھ کے مکان میں ایک کبوتر اپنی ننھی سیر سے واپس آکر بانس کی چھتری پر بیٹھا تھا۔ اور اُس کا مالک اُسے چمکار چمکار کر کابک میں بلا رہا تھا۔

جینی نے آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اُترنا شروع کیا۔ نیچے بہت سے میلے برتن اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

عطاء اللہ سجاد

دیہات

دیہات دھرتی کی ماتا ہیں اور کھیت اس دھرتی ماتا کا سینہ ہیں۔ اور ان کھیتوں میں جو کنوئیں ہیں وہ اس سینہ کی چھاتیاں ہیں۔ کنوؤں کا پانی ان چھاتیوں کا دودھ ہے جس سے ماتا ان نونہالوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ جو اسی کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی کی کھلی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔

مرا دل چاہتا ہے کہ اسی آغوش میں جاکر پناہ لوں شہروں کی مسموم فضاؤں سے نکل بھاگوں، دبی دبی گھٹی گھٹی زندگی کو خیرباد کہہ دوں اور کھلے کھلے میدانوں میں آزادانہ پھروں۔ اس اخلاص و محبت کے موتیوں کو رولوں جن پر "تہذیب" کا ملمع نہیں کیا گیا۔ اور جن کو فریب و ریاکاری کی گرد چھو نہیں پائی!!

حیات

بُحران

اب کیا بتائیں کیونکر اپنی بہار گزری
مجبوریوں میں گزری ناخوشگوار گزری

معلوم ہے سبھی کو جو زیرِ دار گزری
مردوں نے منہ نہ پھیرا سختی ہزار گزری

نظارہ دیدنی تھا جس سمت سے وہ گزرے
حسرت بھری نگاہِ امیدوار گزری

کترا کے جانے والے کیوں جلنے لگ گئے تھے
مجھ پر جو کچھ قیامت زیرِ مزار گزری

محسوس ہو رہا ہے ہم بھی وہیں ہیں شاید
اک خلق جس جگہ سے بے اختیار گزری

کچھ نیک و بد یہاں کا ہم دیکھنے نہ پائے
آندھی کی طرح عمرِ ناپائدار گزری

میری جگہ جو اُس کے ہمراز ہو گئے تھے
اُن پر بھی وہ ہی نوبت انجامِ کار گزری

پہنچا کے رفتگاں کو اس جا سے پہلی منزل
پسماندگاں کی دنیا زار و نزار گزری

بیکار شے تھی اُس کی کیا کوئی قدر کرتا
ہستی فہیم اپنی خود ہم پہ بار گزری

مرزا فہیم چغتائی

مسافر

کردار:- مسافر ——— آدمی
عورت ——— لڑکی

مسافر:- مہرباں تھے میرے احباب میرے پہلے
اور وفادار تھے دوست!
پھر نہ معلوم میرے جذبوں نے
کس تمنا کو ابھارا کہ پریشانی میری
اس کہستان کی ٹھٹھرتی ہوئی تنہائی میں
جان دینے کے لئے لے آئی
آہ میں اور میری تنہائی
(چند لمحوں کا وقفہ)
اجنبی: دوستو دم بھر کے لئے
اس دریچے کو ذرا وا کر دو
جو کسی دیدۂ مشتاق کی مانند
کہیں دور بہت دور کہیں
دیکھتا ہے میرے شاداب وطن کی جانب
آدمی:- یہ تو بتلاؤ مسافر میرے دوست
کس طرف ہے تیرا محبوب وطن
مسافر:- میرا وطن!
اسی کہسار کے اس پار پھیلتے ہوئے دھارے کی طرح
وہ لہراتی ہوئی باقی ہے اک مرغزار
میرے محبوب خیابانِ وطن کی جانب
آہ وہ رہگذر میری تمنا کا سراغ
میں اسی سمت بڑھا جاتا تھا لیکن افسوس
بجھ گیا روح کا تابندہ چراغ
اور میں سرد اندھیرے میں گرا چکرا کر
جیسے آغازِ بہاراں میں کوئی مرغابی
نیلگوں جھیل کو پرواز کرے
اور دم توڑ کے رہ جائے کہیں
کسی جنگل کسی ویرانے میں
(وقفہ)
آہ کل رات کا ویران تصور اب تک
ذہن میں بڑھتا چلا آتا ہے
شام کے پھیلتے سائے کی طرح
(ایک لمحے کا وقفہ)
ہاں مگر یہ تو بتاؤ میرے دوست
کس طرح تم نے مجھے پایا وہاں
کیسے نشاں ڈھونڈ لیا! ———
آدمی:- کل سرِ شام تھی لہروں پہ ہوا
تند طوفان کے آثار نظر آتے تھے
اور ہم بند کئے دھانے
ہانک کر اپنے [illegible] کر
گرم بستر میں مروت کے لئے لیٹ گئے
یک بیک چیختی چنگھاڑتی آندھی آئی
اور پھر [illegible] ادل [illegible]

کس قدر سرد ہوا آتی ہے
اور ندی کی مسلسل آواز
تمہیں بےچین سے کئے دیتی ہے

مسافر۔ اور کچھ دیر توقف ابھی کرنا ہوگا
تمکو معلوم نہیں۔
جب کبھی شام کی تنہائی میں
دور مشرق سے ہوا آتی ہے
مجھکو گائے ہوئے نغموں کی صدا آتی ہے
قلبِ ناکام کی تنہائی میں
آرزو بن کے بکھر جاتا ہے پیغام میرے پیاروں کا،
گونج بن کر میرے سینے میں اتر جاتی ہے
بازگشت اپنے کئی گیتوں کی
جو کبھی گائے تھے راہوں میں چراگاہوں میں۔
یہ فسوں رنگ دریچہ اس وقت
آئینہ ہے میرے ماضی کا مرے خوابوں کا
اپنی گذری ہوئی ایامِ حیات
اس دریچے سے گذرتی نظر آتی ہے مجھے
آہ یہ میرے تصور کا فریب!
شام کے سایوں میں لپٹا ہوا دیہات مرا
کھیتیاں چھوڑ کے دہقان چلے
دور جامن کے تلے
بے قراری سے کوئی راہ میری دیکھتا ہے
آہ وہ نیم نگاہی اُس کی
میرے شانوں سے پھسلتی ہوئی نازک باہیں
اور وہ گاؤں کی مسجد کا شکستہ مینار
جس پہ اک فاختہ منڈلاتی ہوئی
ظلمت آثار فضاؤں میں اُڑی
رین بسیرے کو مُڑی
کھیت کے پاس کھڑا ہے مرا باپ
اس کی نظروں میں ہے پردیس کو جاتی ہوئی راہ
دل میں یہ آس کہ شاید یکمند
کسی کھوئی ہوئی امید کی مانند نظر آؤں گے
کھیت کے پار اُدھر!
آم کے گنجان درختوں سے پرے
دیدہ برراہ میری ماں کی شکستہ تربت
میں جہاں گرمی کی تپتی ہوئی دوپہروں میں
بہرِ تسکین چلا جاتا تھا
آہ اے شامِ غریباں تری تنہائی میں
کتنی یادوں نے مجھے گھیر لیا!

آدمی۔ رات بھیگی ہے مسافر سو جا!
اجنبی دیس میں گذرے ہوئے دن یاد نہ کر
یاد سے تلخیٔ احساس فزوں ہوتی ہے
یادِ ایام سے ہے تلخیٔ دوراں کو دوام
وقت کی یاد اگر مٹ جائے
غم کے بادل بھی گذر جائیں گذرتے ہوئے لمحات کے ساتھ
اور پھر یہ بھی کہیں ممکن ہے
زندگی تیرے اشارے پہ چلے
میرے محبوب ترا شانہ پہ ٹکے
یہ بھی کہیں ممکن ہے
ایک رستے پہ سفر کرتے ہیں لاکھوں ہی!
آخر کار بدل جاتی ہیں راہیں اُن کی —
آخری بار
جدا ہونے کو ملتی ہیں نگاہیں اُن کی
ظلمتِ خواب میں ہو جاتا ہے گم کوئی کہیں کوئی کہیں
کوئی یک رنگ تسلسل یہاں ممکن ہی نہیں
رات بھیگی ہے مسافر سو جا

مسافر۔ کتنے گہرے ہیں ہرے کھیت [illegible]

اب کسی یاد پہ فریاد پہ قابو ہی نہیں
آہ کیا حال ہے غربت میں مرا
پر شکستہ کوئی طائر جیسے!
موت کی آغوش میں گر اور غریباں دیکھے
اپنے محبوب گلستاں دیکھے
ہمسفیروں کی صدا آنے تک
آرزو دیکھے بہنے راستے دکھلائے اُسے
ناگہاں دیدۂ ناکام جھپکے جو اگر
موت اک حادثۂ خاموش میں لپیٹے اُسے

عورت۔ مجھکو یہ غم ہے مسافر کہ ترے پاس نہیں تیرے رفیق
وہ جو رہتے تھے ترے دل سے قریب
اُن سے محروم ہے۔ مجبور ہے تو
دل اُڑا جاتا ہے منزل کی طرف
راہ میں سینکڑوں راتوں کا سفر حائل ہے
تجھ کو یہ بات رُلاتی ہے مگر
ہم بھی آباد ہیں دنیا میں ہمیں بھی دیکھو
دور بستی سے الگ سب سے جدا بیٹھے ہیں
اپنے بیگانے کا جھگڑا ہی چکا بیٹھے ہیں
اتفاق ایسا گذرتا ہے مہینوں میں کبھی
راہ گم کردہ مسافر کوئی آجاتا ہے
یا سر راہ کوئی دم لینے
چند لمحے یہاں رکتا ہے۔ چلا جاتا ہے
اک زمانے سے سفینہ اپنا
ایک خاموش سے دھارے پہ بہا جاتا ہے
غم ہے ماضی کا نہ فردا کی امید
آدمی اور حقیقت میں اُمیدوں کی حقیقت کیا ہے
طفل نادان مچلتا ہے کھلونوں کے لئے
دل کو بہلا لے جو کسی طور تو انجام شکست
لوٹ جاتے ہیں بہر حال کھلونے ہی تو ہیں
سیر ہو جاتی ہے پانی طبیعت خود ہی
نئے اصنام بنا لیتی ہے اُمید پرست

عورت۔ غم ہے ماضی کا نہ فردا کی امید
کائنات اپنی یہی کھیت ہے جو پکے ہیں
مطمئن بیٹھے ہیں اشجار کے سائے میں یہاں
تھک کے بیٹھے ہی رہتے ہیں
آنے والوں کے لیے چشم براہ
جانے والوں کے لیے لطف و محبت کی نگاہ

مسافر۔ آہ میں کس طرح سمجھاؤں تمہیں
تم سمجھتے نہیں جذبات میرے
میری پرواز ستاروں کی خبر لاتی تھی
اصطبل کے مہر کو کہکشاں ایسے دوں
لب مہر سے چھوا ہے میں نے
میں نے تند و تیز ہواؤں میں بھی پر تولے ہیں
پستیٔ خاک میں ہوں آج مگر زخم سہا
خون رُلاتی ہے مجھے میرے ارادوں کی شکست
میں تمنا سے جدا رہ کے نہیں جی سکتا!
تند طوفانوں میں رہتی سفینے پہ میری اُڑان
ڈال کر دھارے امواج میں کشتی میں نے
بادباں پھٹتے ہوئے کھولے ہیں
اک تمنا سی رہتی تھی مجھے
راہ آغوش تلاطم میں کٹاتی تھی مجھے
ابھی گمنام جزیروں کے اچھوتے ساحل
بحر کے سینۂ ویراں پہ نمایاں ہوں گے
جنت آباد گلستاں بکنار
ناگہاں پردۂ ظلمت سے ہوا ایسی چلی
لوٹ کر لے گئی رقاص طبیعت پتوار

تند امواج نے غراتے ہوئے
دور ویران کناروں پہ مجھے پھینک دیا
اب نہ منزل ہے نہ ساحل نہ جزیروں کا نشاں
بادباں سینۂ صد چاک لئے
اور ٹوٹی ہوئی کشتی کے شکستہ تختے
دور بہتی ہوئی موجوں کی طرف تکتے ہیں
سوچتے ہیں کبھی طوفاں پہ حکومت کی ہے

لڑکی۔ کتنے اندیشے مسافر ہیں ترے دل میں نہاں
ایک ہی رنگِ شکستہ ہے تری نظروں میں
تجھکو معلوم نہیں!
شب کی تاریک خموشی میں کبھی
چاندنی بند دریچوں پہ کئی بار آ کر
دستکیں دے کے چلی جاتی ہے
کل کے ماتم کے لئے آج کا دن خوب نہیں

مسافر۔ آہ وہ دوست وہ احباب میرے
آج کی رات انہیں کیا معلوم
ڈوبتے چاند نے کس حال میں دیکھا ہے مجھے

لڑکی۔ چند راتوں میں گذر جائے گی یہ تیرہ شبی
اور وادی پہ شباب آئے گا۔
جا بجا برف کی باریک تہوں کے نیچے
کروٹیں لے کے پھسلتا ہوا آب!
جگمگا اٹھے گا انگور کی لہریں بن کر!
اور غلطاں بہتے گرداب
ناچتے ناچتے نظروں سے گذر جائیں گے
پھر نئے رنگ سے لہرائیں گے
جنگلی پھول شگفتہ رقصاں
شاخساروں پہ لٹکتی ہوئی بیلیں جن کی
چشمِ نظارہ کو مسرور کیا کرتی ہیں۔
دھوپ میں کھیلتے چوپائے کلیلیں جن کی
جسم کو رقص پہ مجبور کیا کرتی ہیں

مسافر۔ رات جب موت کی آندھی بن کر
ایک بے رحم ارادے سے چلے
آہ موہوم تسلی کا دیا کیسے جلے، کیسے جلے
مرگ آلود ہواؤں کے مسلسل جھونکے
آخرِ کار بجھا دیں گے اسے
چھین لیجائیں گے ننھا سا دھڑکتا ہوا نور

آدمی۔ دیکھنا بیٹی دیا بجھنے لگا۔

(ایک مبہم آہٹ)

مسافر۔ کس نے دروازے پہ دستک دی ہے
کون! یہ کس نے پکارا مجھکو
کس کی آواز لرزتی ہوئی آتی ہے میرے کانوں میں
کوئی مہمان ہے کیا؟

عورت۔ کوئی نہیں!

لڑکی۔ کوئی نہیں!

مسافر۔ پھر یہ کیسی، یہ مدھم آواز!
سازشی گونج میرے کانوں میں
جانے کیا پھونک رہی ہے دیکھو
کیا اذیت کی گھڑی آپہنچی؟

(وقفہ)

شمع بے نور ہوئی جاتی ہے۔
کس قدر دور ہوئی جاتی ہے۔
میری آواز، میری اپنی صدا
جیسے ہونٹوں سے میرے کانوں تک
ایک ویران زمانے کا خلا حائل ہے۔
جیسے کہسار کے اس پار سے کچھ بولتا ہوں

(خاموشی مسافر کے سانس لینے کی آواز)

مسافر۔ کچھ سنا تم نے؟

عورت۔ نہیں تو

آدمی۔ کیا ہے؟

مسافر۔ ایک لمحے کو یہ محسوس ہوا۔

جیسے اکتارا بجاتا ہوا گذرا ہے کوئی۔

(آدمی اٹھ کر ایک طرف جاتا ہے)

آدمی۔ اس طرف آنا شکیلہ، سلمہ

(دونوں جاتی ہیں)

لڑکی۔ اب کوئی دم کا ہے۔ یہاں ہمارا مہمان،

آدمی۔ (دبی آواز سے) زیست کی آخری منزل کے لئے

آخری بار مسافر نے کمر باندھی ہے۔

عورت۔ لیکن افسوس ہماری اُمید

ایک کمزور سہارے کی طرح ٹوٹ گئی

لڑکی۔ (غیر متاثر آواز سے) ٹوٹ گئی

(تینوں آہستہ آہستہ اپنی جگہوں کو لوٹتے ہیں)

مسافر۔ کوئی آواز نہیں۔

آہ سنسان فضا اور ظلمت

کوئی آواز نہیں!

آہ سنسان فضا

میرے سینے پہ خموشی کی چٹان

اُف یہ سنگین سکوت۔

مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔

کوئی دم توڑتی آواز کہیں سے آئے۔ کسی فریاد کی آہ،

یا کسی آہ کی گونج۔

دل دھڑکنے کی صدا

اشک ڈھلکنے کی صدا

اپنی معدومیٔ احساس کی آہٹ

کچھ ہو

کچھ تو ہو

کچھ بھی نہیں

کہ تنہائی کھلتی ہے مجھے۔

اور کھلتا ہے سکوت

(لڑکی دھیرے دھیرے گنگنانے لگتی ہے)

کاش چھو لے مری پیشانی کو

کسی بھولے ہوئے نغمے کا آوارہ جھونکا

یا کسی کھوئے ہوئے گیت کی سانس

لڑکی۔ گیت

مسافر۔ گیت جو موت کی لوری بن کر

ابدی نیند سلا دے مجھ کو

لڑکی۔ اک مانندِ صبح و شام راہی

مانندِ نسیمِ صبح گاہی!

گذرا میری جھونپڑی سے اک دن

اک میری زندگی سے اک دن

پھولوں کی زمیں سے آنے والا

مانندِ نسیمِ صبح گاہی

اک مانندِ صبح و شام راہی

مہتاب کی لوٹتی کرن میں

کلیوں کے لطیف پیرہن میں

خوشبو کی طرح سما رہا ہے

تاروں کے دلوں کو جلا رہا ہے

پھولوں کی زمیں سے آنے والا

(وقفہ)

مسافر۔ وہ کوئی شمع کی جانب آیا

عورت۔ کیا ہے مسافر؟

مسافر۔ روکو!

شمع کی لو کو نگل جائے گا

عورت۔ کون مسافر

مسافر۔ سایہ! روکو

(آخری الفاظ غیر مربوط انداز میں)

آہ وہ دوست وہ احباب میرے

اور وہ گاؤں کا مسجد کا شکستہ مینار

ازلی استفہام

جب کبھی موسمِ گل عطر فشاں ہوتا ہے
مجھ کو دنیا پہ جہنّم کا گماں ہوتا ہے

نئی تعمیر کے گنبد پہ بصد ناز و غرور
دیوِ تخریب بہر سو نگراں ہوتا ہے

زرد لاشوں کے پرے ذہن پہ منڈلاتے ہیں
جب کہیں ذکرِ مسیحا نفساں ہوتا ہے

ہر چکا چوند میں لرزاں ہیں اندھیری راتیں
خال کیوں زینتِ رخسارِ بتاں ہوتا ہے

جس کی تخلیق ہو در اصل عناصر کا فریب
وہ کرم باعثِ آشوبِ جہاں ہوتا ہے

جب نئے لہجے میں مروّت ہو نہ وعدوں میں خلوص
تجربہ ہے کہ تبھی حُسن جواں ہوتا ہے

زلف و رُخ سے جو نہ بہلا وہ پراگندہ شباب
نکہت و رنگ سے سرشار کہاں ہوتا ہے

ابدیت بھی تو یا رب ترے بس میں ہو گی
آخر اس دین سے کیا ترا زیاں ہوتا ہے

احمد ندیم قاسمی

نظامِ نو

بیسویں صدی کا پینتالیسواں سال دنیا کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال کے دوران میں موجودہ زمانے کی عظیم ترین ہستیاں صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئیں۔ ان کے کارنامے محض افسانے بن کر رہ گئے۔ اس سال جنگ کا وہ دور ختم ہوا جس کا آغاز ۱۹۳۹ء کے ستمبر میں ہوا تھا۔ اس قلیل عرصے میں دنیا نے حیرت انگیز نشیب و فراز دیکھے۔ کمال اور زوال کا خوفناک تصادم۔ جنگی دلچسپی کا برہنہ ناچ۔ توپ اور بم کا باہمی میل۔ مشین گن اور ٹینک کا ملاپ اور ایٹم بم کی تباہ کاریاں۔ انسان کے بنائے ہوئے ہتھیار انسان کو مٹانے کے لیے اس کی ہستی ملیامیٹ کرنے کے لیے۔ باہمی جنگ و جدل اور خون خرابہ انسانی فطرت کا لازمی جزو بن چکے ہیں اور وہ اس پر نازاں ہیں۔ فرانس کے مؤرخ اپنے جرنیلوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے۔ جرمنوں کو فخر ہے کہ مثلاً طور خون بہانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ اپنے ہمسائیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہی جاپانیوں کے نزدیک اعلیٰ ترین فلسفہ ہے۔ جرنیلوں کی تعریف کا مطلب ہے کہ ہم انسانی قاتلوں کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں۔

دنیا کے بہترین دماغ اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ اگر ہم نے اپنے نظام کو نہ بدلا تو انسان کا وجود صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے گا۔ دنیا کا موجودہ نظام بوسیدگی کی آخری حد تک پہنچ چکا ہے۔ آج ہم اپنی آنکھوں کے سامنے موجودہ تہذیب کی عُریانی کا نظارہ کر رہے ہیں۔ ایک دور آخری لمحات پر بیٹھا سسکیاں بھر رہا ہے۔ اس خوفناک جنگ کی مہیب آگ میں بے بس اور لاچار آدمی بھی لپیٹے گئے۔ نہتے آدمی اور عورتیں اور معصوم بچے اپنے گھروں کی چار دیواری کے اندر بھی آرام سے نہ سو سکتے تھے۔ دشمن کے بم ان کے امن کے خرمن میں آگ لگا کر اس کو جھلس دیتے تھے۔ ایٹم بم کے استعمال سے انسان نے اپنی بربریت کا آخری نمونہ بھی پیش کر دیا۔ موجودہ جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ انسانی دماغ کا دیوالہ نکل چکا ہے۔ اخلاق ہمارا ساتھ چھوڑ بیٹھا ہے۔ سائنس کی کامیابی اس کی شکست فاش ہے۔ مادہ پرستی روحانیت پر غلبہ حاصل کر چکی ہے۔ ہوس نے انسان کو اندھا بنا دیا ہے۔ انسانی دماغ کی کرامات نے سکھ، شانتی اور پریم کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ دنیا کی حالت جوسف کانرڈ (Joseph Conrad) کے بیان کئے ہوئے اس جہاز کے قلیوں کی مانند ہے جو ایک خطرناک طوفان کے دوران میں، ایک ساتھی قلی کے پیسے گم ہو جانے پر اندھا دھند ایک دوسرے پر پل پڑتے ہیں۔ آج کا سماج ایک غارت کدہ بن چکا ہے۔ موجودہ تہذیب ایک جسم ہے روح کے بغیر، دماغ ہے لیکن دل لاپتہ۔

یورپ کی تاریخ میں ویسٹ فیلیا کا عہد نامہ (Treaty of Westphalia) خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد نامے کے بعد کم از کم مذہب کے نام پر اس براعظم میں کوئی خاص لڑائی نہیں ہوئی۔ لیکن اس سے پیشتر مذہب کے نام پر خون بہانا ایک معمولی سی بات تھی۔ عیسائیت کے مختلف مت آپس میں برسرِ پیکار رہے۔ انگلستان میں ایڈورڈ ششم نے سارے گرجوں سے رومن کیتھولک مورتیوں کو نکال کر باہر پھینک دیا اور ان کو پروٹسٹنٹ گرجوں میں تبدیل کر دیا۔ ملکہ میری کے عہد میں پروٹسٹنٹ مذہب کے پیروؤں کو زندہ ہی آگ میں جھونک دیا گیا۔ فرانس میں کیتھولک مذہب کے پیرو چارلس نہم (۱۵۷۲ء) نے مخالف مت کے لوگوں کے خلاف قتلِ عام کا حکم جاری کر دیا۔ کچھ گھنٹوں کے اندر ایک لاکھ کے قریب انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بھائی بہن، عورت اور مرد، بچے اور بوڑھے کسی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔

دنیا کے آغاز سے لے کر اب تک انسان کا مشغلہ خونریزی رہا ہے۔ اس جذبے کے بیدار ہونے پر ایک وحشیانہ قوت اس پر غالب آ جاتی ہے۔ جو اس کے اوصاف حمیدہ کو سلب کر دیتی ہے۔ اس جذبے کے ماتحت وہ ایک خونخوار درندے سے بھی زیادہ ظالم بن جاتا ہے۔ مذہب نے بھی اپنا شیوہ بنا لیتا ہے۔ کبھی تو یہ جذبہ نسلی امتیاز کی آگ سلگا دیتا ہے اور آریوں اور دراوڑوں کو باہمی جنگ و جدل میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کبھی یہ مذہب کی چنگاری کو بھڑکا کر عیسائیوں اور یہودیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں، یا ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہمی فساد کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے اور کبھی ایک مذہب کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتا ہے۔

اگر فی زمانہ مذہب کو لڑائی کا ذمہ دار نہیں گردانا جا سکتا تو اس کی جگہ اقتصادیات اور سیاسیات نے لے لی ہے۔ ملک گیری کی ہوس اور منڈیوں کے سودے نے "بڑی" طاقتوں کو پاگل بنا رکھا ہے۔ آج لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ نجات کی راہ دریافت نہ کرنے سے دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آنے والے سالوں میں ایٹم بم ایک معمولی ہتھیار بن کر رہ جائے گا۔ اگر مکمل طور پر سمجھوتے کی راہ نہ نکالی گئی۔ تو انسانی نسل خطرے میں پڑ جائے گی۔

سائنس کی ایجادات نے دنیا کو ایک ملک میں تبدیل کر دیا ہے یا مختلف ممالک کو ایک دوسرے کے بہت نزدیک لا کھڑا کیا ہے۔ ریلوے اور سٹیم شپ، ٹیلیگراف اور وائرلیس نے فاصلے کم کر دیے ہیں۔ "ایٹمی انرجی اور کاسمک ریز" فاصلوں کو شاید بالکل ہی تباہ کر دے۔ آج یورپ کے حالات ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نفرت کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکنا صرف دنیا کی تین "بڑی" طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کی سلامتی ان کی نیک نیتی، خلوص دلی اور ایمانداری پر مبنی ہے۔ اگر سیاسیات اور اقتصادیات ہی آج کی یا آئندہ لڑائی کی وجوہ ہیں تو ایک بین الاقوامی بورڈ ان مسئلوں کو سلجھا سکتا ہے۔ دنیا کی ریاستوں کی فیڈریشن اسے آئندہ بربادی سے بچا سکتی ہے۔

اس بیماری کا ایک علاج اور ہے اور وہ ہے دنیا کا ایک اور سچا مذہب۔ شاید دیکھنے میں یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہو لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے مذاہب کے اصول اور بنیادی اصولوں میں کوئی بھی فرق نہیں۔ تمام مذاہب روحانیت کے مسئلے پر مبنی ہیں۔ اگر خدا ایک ہے تو اس کا پیغام بھی ایک ہوگا۔ اور ایسے پیغام کی موجودگی میں فساد اور دنگہ، قتل اور خون انسان کی نااہلیت کا سب سے بھاری ثبوت ہیں۔ مذہب کا اصل نام ہے ڈر سے نجات اور اہنسا۔ مذہب کی تبلیغ میں تشدد کو جائز قرار دینا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے کیونکہ ناانصافی، ظلم اور تشدد انحراف مذہب کے مترادف ہیں۔

ہندوستان قدیم زمانے سے رواداری کا دم بھرتا رہا ہے۔ اشوک سے پہلے اور بعد کے ہندو راجاؤں نے تمام مذاہب کے پیروؤں کو پوری پوری مذہبی آزادی دی۔ اکبر نے اشوک کی پالیسی کو نہیں چھوڑا۔ جہانگیر اور شاہجہان نے اکبر کی پالیسی کو جاری رکھا۔ داراشکوہ نے اپنی ایک کتاب میں یہ ثابت کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تفرقات صرف زبان اور اظہار خیالات کے تفرقات ہیں۔ آج بھی مسلمانوں کی اکثریت ہندو راجاؤں کے لیے باعث ... ہل رہی ہیں۔ اور ہندو اکثریت والی ریاستوں پر مسلمان فرمانروا حکومت کر رہے ہیں۔

اگر ہندوستان جیسے وسیع ملک میں رواداری کے جذبے کو کامیابی کی شکل دی جا سکتی ہے تو ساری دنیا میں کیوں نہیں؟ (موجودہ زمانے کے ہندو مسلم فسادات کی وجوہ اور اصلیت کو کون نہیں جانتا!) اگر روحانیت کے بارے میں ہمارا یقین راسخ ہے تو دنیا کے ہر کونے میں ہمیں اپنے جیسے انسان ملیں گے۔ پھر جھگڑا کیسا! اور جھگڑا ہونے کی صورت میں ہم تلوار اور توپ، ٹینک اور بم کی جگہ دماغ اور دل اور روح کو استعمال کر سکتے ہیں۔ رواداری کا جذبہ ہمارے دلوں میں موجزن ہے اور ملوکیت پرستی اور منڈیوں کی ہوس گیری ہمیں دیوانہ نہیں بنائی تو بین الاقوامی حکومت اس کے دور کو وجود میں لا سکتی ہے جس میں غربت، جہالت اور جنگ زمانہ ماضی کی یادگاریں ہی بن کر رہ جائیں گی۔

ست پرکاش سنگر

نیا اُفق

وہ ابر اُٹھا وہ آئیں بوندیں وہ دل ہوا نغمہ بار ساقی
اُٹھا بھی مینا کہ جامِ مے سے پئیں غمِ روزگار ساقی

یہ دورِ فصلِ بہار ساقی نہ آئیگا بار بار ساقی
جو ہو کے مایوس جا چکے ہیں انہیں خدارا پکار ساقی

یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے یہ چاندنی کی [illegible]
پُرانے بادہ کشوں کو یوں تو نہ دیکھ بیگانہ وار ساقی

کلی کلی کھلکھلا اُٹھی ہے روش روش مسکرا اُٹھی ہے
گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے وہ نو عروسِ بہار ساقی

مجھے خبر ہے گلوں کے پردے میں پل رہے ہیں ہزاروں کانٹے
تری نگاہوں کو جانتا ہوں نہ دے فریبِ بہار ساقی

جہاں کی رفتار کہہ رہی ہے پُرانے شیشے نہ ساتھ دینگے
بجائے مے کے اُفق سے پھوٹی ہے خون کی آبشار ساقی

بدل چکا ہے نظامِ عالم اُلٹ چکی ہے بساطِ ہستی
اگر یہی رنگِ انجمن ہے تو کیا ترا اعتبار ساقی

نہ کیوں ستاروں ہی کی رگوں سے کشید کر لیں شراب ہم خود
کہ صبح تو ہو چلی ہے، کون اب کرے ترا انتظار ساقی

ہٹا لے مینا بڑھا لے ساغر کہ تیرے خُم میں مئے کہن ہے
نئے زمانے کا دل کا اُس سے نہ مٹ سکے گا غبار ساقی

چمن میں جو پھول کھل رہے ہیں یہی تو اختر بنیں گے اک دن
انہی سے منزل دکھائی دیگی یہی ہیں جانِ بہار ساقی

—— اختر ہوشیارپوری

"کہاں ہیں دیوتا؟"

پنڈت رام ناتھ نے اپنے گھر میں بہت بڑے پیمانے پر ہَوَن رچایا۔ گذشتہ منگل کو ہَون کی مہُورت تھی۔ اور اُس دن سے آج تک برابر ہَون کُنڈ روشن رہا۔ وید منتروں اور اشلوکوں کا اُچارن ہوتا رہا۔ اور آج سنیچر کی شام کو خاتمے کی آرتی اُترنی تھی۔ دیوتاؤں کو بھوگ چڑھانا تھا۔ اور اُس کے بعد براہمنوں کو مہاں بھوجن دینا تھا۔

باغیچے میں ایک طرف عالیشان شامیانہ نصب کیا گیا تھا۔ جس کے نیچے ہَون منڈپ بنایا گیا تھا۔ دوسری طرف صحن کے ایک حصّے کو کاٹ کر لنگر کھولا گیا تھا۔ جہاں قسم قسم کے پکوان پک رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ دیوتاؤں کے لئے ہو رہا تھا۔ جنہوں نے کچھ عرصے سے پنڈت جی کے کارخانے پر سونا برسانا شروع کیا تھا۔

زندگی کے شروع شروع میں رام ناتھ مذہب کا زیادہ معتقد نہ تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ دن اُس کے لئے زندگی میں شامل نہیں تھے۔ صرف ایک ناکام سی جدوجہد زندہ رہنے کے لئے یا زیادہ سے زیادہ کارخانے کو چالو رکھنے کی خواہش —— یہ ہے ان دونوں کی داستان۔ جہاں تیس دن کے بعد مشکل سے دو تھان ریشم کے بُنے جاتے تھے۔ وہ بھی ایسے چار کاریگروں کے ہاتھوں سے جن کی آنکھوں میں ہر وقت زندگی بجھی بجھی سی نظر آتی تھی۔ رام ناتھ سارا سارا دن انہیں کے پاس بیٹھا رہتا۔ جب کاریگر حُقّہ پینے بیٹھتے۔ تو دوسرے دَور کے بعد چلم رام ناتھ کے ہاتھ میں پہنچ جاتی۔ وہ اپنے مستقبل کی رجائیت کا تصوّر کرتے ہوئے ہوا میں دھوئیں کے مرغولے پھینک دیتا۔ جو چھوٹے بڑے دائروں کی شکل میں اُڑ جاتے اور رام ناتھ کی نظریں ہوا میں تحلیل ہونے تک اُن کا تعاقب کرتی رہتیں۔ انہی دائروں میں اُسے اپنی اور اپنے چار کاریگروں کی زندگی پھیکی پھیکی سی نظر آتی۔ جو بالآخر غائب ہو جاتی —— کہاں! یہ وہ سمجھ نہ سکتا۔

لیکن یہ قیاس خود اُس کے حق میں صحیح ثابت نہیں ہوا۔ اُس کی زندگی کا دائرہ تحلیل ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ حتےٰ کہ وہ ایک اچھے کارخانے کا مالک بن گیا۔ جہاں اب چار کے بدلے پورے چالیس کاریگر جدید قسم کی مشینوں پر ریشم بُنتے تھے۔ اور جنگ کی وجہ سے پیرا شوٹ کلاتھ کی اس قدر مانگ بڑھ گئی تھی۔ کہ کارخانہ ہمیشہ کبھی بند نہیں رہتا تھا۔

اوستا کریم اور اُس کے ساتھی جنہوں نے رام ناتھ کے ابتدائی دن بے کیفی سے کارخانے میں خاموش طریقے سے گزارتے تھے۔ اپنی اور اپنے مالک کی اس حیرت انگیز ترقی پر وہ ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں اس ترقی کا واحد سبب رام ناتھ کی نیت تھی۔ جو اُنہیں ہمیشہ بلور کی طرح صاف اور چاندنی کی طرح پاکیزہ دکھائی دیتی تھی۔ اپنی نیت اُنہیں شاید ہمیشہ کوئلے کی کان کی طرح کالی اور بدصورت نظر آتی تھی۔ جبھی وہ چوبین نشستوں سے اُٹھ کر سنہرنگ والی نشستوں پر نہ بیٹھ سکے۔ لیکن پھر بھی اُنہیں مطلق افسوس نہ تھا۔ وہ دیوتاؤں کے قایل نہ تھے البتہ دعاؤں پر بھروسہ کئے ہوئے تھے۔ جو کبھی کبھی بے اختیاری کے عالم میں اُن کے مُنہ سے نکلتی تھیں" یا اللہ، ساگ

بیٹا دے ـــــــ "یا اللہ دین ایمان دے ـــــــ "یا اللہ گھر میں بچے دے ـــــــ " اور پردہ نشیں گداگر انہیں یہ دیتا رہا۔ سہاگ، بیٹا، دین ایمان اور بے شمار بچے ـــــــ ، اُن کے برعکس رام ناتھ کی زندگی کے دائرے بڑھتے رہے اور اتنے بڑھے کہ اُسے مذہب سے عشق سا ہونے لگا۔ وہ دیوتا جو آج تک صرف آسمانوں پر رہا کرتے تھے اور اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اب اُسے ہر جگہ ناچتے کودتے، مسکراتے اور سونا برساتے ہوئے نظر آنے لگے۔ شبدوں کے شور میں بھی اُسے اَن دیکھے دیوتاؤں کی آوازیں، اُن کے اشارے، اُن کے فیاض ہاتھ دکھائی دینے لگے ـــــــ دو اور لو کھلاؤ اور کھاؤ ـــــــ مذہب ایک طرح کی تجارت ہے۔ جو آسمانوں پر رہنے والا خدا اپنے بندوں سے کرتا ہے جو اس بھید کو نہیں سمجھ سکتا ـــــــ وہ زندگی بھر ذلیل ہوتا ہے۔ اور ساری عمر جوتیں گھسیٹتوں پر بیٹھ کر گزارتا ہے۔ تم پنڈت ہو۔ مگر اندرلش پنڈت ـــــــ ایسے سستے سودے کو ہاتھ سے نہ جانے دو ـــــــ "

جب کسی سال ہون رچانے میں کچھ دنوں کا فرق پڑتا۔ تو اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے دیوتا ناراض ہو گئے ہوں۔ اور نفع نقصان کی زبان میں کہہ رہے ہوں "یہ تمہارا اپنا قصور ہے۔ آسمانی بنیئے کی تھیلیوں پر گرد کی تہیں چڑھ گئی ہیں تم اپنا مال بھیجدو۔ ہم اپنا مال بھیجدیں گے ـــــــ " اور یونہی ہوتا تھا۔ ہون رچایا جاتا تھا۔ روحانی تجارت کے دلال منتر پڑھتے تھے۔ اور دُور اندرلش پنڈت سونے سے لدجاتا تھا۔

اور آج بھی شامیانے کے نیچے ہون جاری تھا۔ گھی اور شکر کی مہک سے ہوا معطر تھی ـــــــ اور آگ کے شعلے دیوتاؤں کے بھیس میں ناچ ناچ کر آہوتیاں لے رہے تھے۔ چندن، اگر اور چنار کی لکڑیاں چٹخ چٹخ کر جل رہی تھیں۔ اور رام ناتھ کے چہرے پر ایک غیر مرئی سا جلال پھیلتا جاتا تھا۔ تجارت چل رہی تھی۔ ترازو کا ایک پلڑا ہلکا تھا۔ اور دوسرا بھاری ہلکا پلڑا گھی شکر اور منتروں کا مال لئے ہوئے تھا۔ اور بھاری پلڑا پیراشوٹ کلاتھ کے بھاری آرڈر لئے ہوئے ـــــــ جو رام ناتھ جیسے دُور اندرلش سوداگر کے اعتقاد کے مطابق صرف آسمان پر رہنے والے بنیئے کی رضامندی کا ثبوت تھے۔ وہ کبھی کبھی منڈپ سے اُٹھ کر صحن میں چلا آتا۔ اطمینان بھری نظروں سے لنگر کی طرف دیکھتا۔ پھر اُن مزدوروں کی طرف جو صحن میں برتن مانجھنے کو دُور رکھنے اور صفائی کرنے کے لئے مامور ہوئے ہوتے۔ جو نہ تو دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے اور نہ تجارت کے بھید کو سمجھ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد وہ واپس اندر چلا جاتا۔ اور آگ میں گھی اور شکر کی آہوتیاں دینے لگتا۔

صبح کو ہلکی سی بارش ہوئی تھی۔ اور براہمنوں کے کہنے کے مطابق ہون کے لئے یہ بہت اچھا شگون تھا۔ تپتی ہوئی دھرتی کی حرارت کو کم کر کے آہوتی قبول کرنا اِس بات کا ثبوت تھا۔ کہ دیوتا ہون سے خوش ہو گئے ہیں۔ اور یہ احساس صبح ہی سے رام ناتھ کو دِلایا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دیوتاؤں کی ساری عقیدت سمٹ کر جمع ہوتی وہ ہون کُنڈ کی طرف مسرت بھری نظروں سے دیکھتا۔ جہاں آگ کی لپٹیں ایک سالم قند کے گرد طواف کرتی نظر آتیں جو اپنی تمام مٹھاس آگ کے حوالے کر کے آہستہ آہستہ راکھ ہو جاتا۔ اور رام ناتھ کے لئے آسمانوں سے دیوتاؤں کی خوشنودی لے آتا۔ اِس منظر کو دیکھکر رام ناتھ کے دل میں جلتے ہوئے قند کے لئے تھوڑی دیر کے لئے ہمدردی پیدا ہو جاتی۔ اور آگ سے نفرت سی۔ جس کی لپٹیں بڑی بے دردی سے قند کی زندگی چوس لیتیں۔ لیکن فوراً ہی اُسے اپنے دیوتا یاد آتے۔ اور پھر آگ مقدس بھی تو ہے ایک براہمن کی طرح اور پھر وہ خود بھی تو ایک براہمن ہی ہے ـــــــ جس نے آج تک کسی کی زندگی کی مٹھاس نہیں چھینی [illegible] دیوتاؤں نے اس کی زندگی میں خود بخود مٹھاس بھر دی ـــــــ لعل کے

چار کا بیگ ——— راکھ کے راکھ ہی رہے۔

شامیانے کے نیچے تیوہن ہو رہا تھا۔ اور باہر صحن میں ایک لڑکا اندھے بھک منگے کا ہاتھ پکڑے داخل ہوا۔ اور صحن کے ایک طرف اُسے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا۔ لڑکے کی نظریں سادہ سامان اور کبھا کبھی دیکھ کر آوارہ ہونے لگیں۔ اور اندھے کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ معطر ہوا نے شاید اس کے جذبات کو جگا دیا۔

برتن مانجھنے والے ایک مزدور نے اُنہیں دیکھا۔ تو اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ "حرامی ——— عنفت خورے سونگھ سونگھ کر عین موقع پر پہنچ جاتے ہیں ———"

وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ جھپٹ کر لڑکے سے بولا ——— "کیوں اس بے چارے کو ذلیل کر رہے ہو؟ مزدوری کیوں نہیں کرتے ———؟"

لڑکے نے مزدور کا غصہ دیکھ کر اندھے کا ہاتھ زور سے پکڑا۔ اور مزدور پھر بولا "جاؤ جاؤ یہاں شام کو چاول ملیں گے ———"

اندھے نے اپنا سر اُسی طرف اونچا کر کے کہا۔ "بابا ہم تھوڑی دیر ٹھہریں گے۔ کچھ ملے گا تو لیں گے۔ نہیں تو چل دیں گے۔"

"شام تک ٹھہرو گے؟" مزدور نے دوسرا سوال کیا۔

"لڑکے نے سر سے اثبات کا اشارہ کیا۔ لیکن اندھے نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں بادشاہ! دُور ٹھکانہ ہے۔"

"دُور ——— ؟ کہاں ؟"

"عید گاہ کے پاس، علم صاحب کی مسجد میں ———"

اتنے میں ایک نوجوان بھکارن اپنی گود میں نیم برہنہ بچہ اُٹھائے ہوئے صحن میں داخل ہو گئی۔ مزدور نے اُسے دیکھا تو حقارت سے ہنسنے لگا۔

بھکارن لڑکے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور استعجاب بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کا نیم برہنہ بچہ کیچڑ سے کھیلنے لگا ———

"کب بھات ملے گا؟" اُس نے دفعتاً بھک منگے لڑکے سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا معلوم ——— کہتے ہیں شام کو ———" لڑکے نے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"شام کو ——— ؟"

"کیوں تمہیں بھوک لگی ہے ؟"

"مجھے نہیں ——— اس بچے کو ———!"

"تو جا کر مانگ ——— لانگری سے ——— شاید دے دے ———"

نوجوان بھکارن خاموش ہو گئی۔ مانگنے کے لفظ نے اُسے چپ کرا دیا۔ شاید وہ جانتی تھی۔ کہ عورت خدا کی وہ تخلیق نہیں۔ جو اپنا ہاتھ پھیلا کر کسی سے کچھ مانگے۔

اور اسی بھک منگے نے اُسے الگ ٹھہرتے کہا: جا مانگ لے ــــ تمہیں دے دیں گے "
نوجوان بھکارن نے بچے کو گود میں اٹھایا ـ اور لنگر کی طرف چل دی ـ بیسیوں پکوان اُس کی نظر کے سامنے آ گئے ــ پوریاں ــــ کھیر ــــ بھات ، پکوڑیاں ، لڈو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
بچے نے اتنی چیزیں دیکھ کر کپڑے سے بھرا ہوا اپنا ہاتھ پھیلا دیا ـ اور مچل کر گود سے اُترنے کی کوشش کرنے لگا اور ماں خاموش مگر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اندر دیکھنے لگی ـ
ایک لانگری نے اُسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر پوچھا: " کیا چاہتی ہے ؟"
" تھوڑا سا بھات اس بچے کے لئے ــــ " اُس نے کہا ـ
" بھات ! "
" ہاں صبح سے بھوکا ہے ــــ "
لانگری نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا ـ ایک خاموش مگر شکست خوردہ حُسن جو غلیظ پوست اور کپڑوں کے اوپر لاوارث مال کی طرح بکھرا ہوا ہے ـ ایک البیلی جوانی جو ممتا کے سبب ہاتھ پھیلا رہی ہے ایک شرمیلی عورت جو بیگانگیت سی محسوس کرتی ہے ـ اور آپ ہی آپ لرز رہی ہے ـ
" یہ بچہ تمہارا ہی ہے ؟ " لانگری نے ہمدردی کے لہجے میں پوچھا ـ
" ہاں ــ " بھکارن نے شرما کر جواب دیا ـ اور خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی ـ شاید دل میں سوچنے لگی ـ بھات کی ایک رکابی کے لئے رشتے دریافت کرنے کیا ضروری ہیں ــــ کیا اس دُنیا میں بھکاریوں کو خیرات بھی پوچھ گچھ کے بغیر نہیں مل سکتی ؟
تھوڑی دیر بعد لانگری نے کہا: " تم بیٹھ جاؤ ـ جب دیوتاؤں کا بھوگ پڑے گا ـ میں تمہیں سب سے پہلے پیٹ بھر کر بھات کھلاؤں گا "
ابھی وُہ وہیں کھڑی تھی ـ کہ منڈپ سے رام ناتھ باہر نکلے ـ لنگر کے دروازے پر بھکارن کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے ــــ " ستیاناس ہو گیا ـ ملیچھ عورت ــــ "
بھکارن تھر تھرانے لگی ـ اُس کا بچہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھات اور پوریوں کی طرف اشارے کرتا رہا اور ایک مزدور نے ڈانٹ کر اُسے صحن میں بٹھا دیا ـ " چڑیل ــــ مالزادی ــــ حرامی بچے کو لے کر سر پر چڑھی جا رہی ہے "
عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ــــ رام ناتھ لانگری سے کہہ رہے تھے " دیوتاؤں کے پکوان پر ملیچھ عورت کی نظر تو نہیں پڑ گئی ــــ ؟ "
لانگری لاکھ لاکھ قسمیں اُٹھا کر یقین دلا رہے تھے ـ کہ اُس کی نظر کسی چیز پر نہیں پڑی ــــ اور تمام پکوان کی تقدیس بدستور قائم ہے ــــ "
رام ناتھ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے ــــ اور بھکارن سرنگوں ہو کر بیٹھ گئی ـ تھوڑی دیر بعد بھک منگے لڑکے نے آہستہ سے پوچھا " کیا کہا لانگری نے ؟ "
" تم نے نہیں سُنا ؟ " بھکارن نے پوچھا ـ

"نہیں اللہ قسم ۔۔"

"نہیں دیتے ۔۔ بولا ۔۔ پہلے دیوتا کھائیں گے ۔۔ ان کے بعد تمہیں ملیں گے ۔۔"

"دیوتا ۔۔ ؟"

"وہ کون ہوتے ؟" لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم ۔۔"

اندھا بھکاری ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا "میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ شام کو آتے ہیں۔"

"شام کو ۔۔ ؟" بھکارن نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں ۔۔ شام کو ۔۔ وہ دن کو نہیں آتے ۔۔" اندھے نے خود اعتمادی کے لہجے میں کہا جیسے فی الحقیقت اس نے دیوتاؤں کو دیکھا تھا۔ یا انہیں جانتا ہو۔

اور جوں جوں تاریکی پھیلنے لگی۔ وہ ہر آنے والے کو غور سے دیکھنے لگے۔ شاید یہی دیوتا ہو۔ لیکن جو آتا تھا۔ وہ تو بھیک منگا تھا ۔۔ یا انسان ۔۔ مانوس سا انسان!

اندھیرا چھا جانے کے بعد بھی جب لنگر میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی دی۔ تو لڑکے نے اندھے سے پوچھا "ابا۔ دیوتا کیوں نہیں آتے ۔۔ ؟"

اندھے نے سنجیدگی سے کہا "آئیں گے بیٹا۔ ضرور آئیں گے۔ پنڈت کے ہر بڑے دن پر دیوتا آتے ہیں۔"

نوجوان بھکارن کا بچہ روتے روتے سو گیا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر کیچڑ کے داغ سوکھ گئے تھے۔ جو دھرتی کی مٹھاس محسوس کر کے اس نے کھالی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک مزدور ان کے پاس سے گزرا۔ اندھے نے پوچھا "کیوں بھائی۔ بھات کب ملیں گے؟ اب تو شام بھی ہو گئی ۔۔"

مزدور نے قدم روک کر کہا "اوہو۔ بڑے نازک مزاج ہو ۔۔"

بھکارن اس جواب سے بہت مایوس ہو گئی ۔۔ کاش وہ ماں نہ ہوتی۔

اس کا بچہ بھوک کی وجہ سے زیادہ دیر تک نہ سو سکا۔ وہ جاگ کر رونے لگا۔ اور بار بار لنگر کی طرف اشارے کرنے لگا۔

اندھے نے اپنے بیٹے سے با دلِ ناخواستہ کہا "میرا ہاتھ پکڑ لو۔ چلو چلتے ہیں ۔۔"

لڑکے نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اور دونوں صحن سے نکلے۔

بھکارن مضطرب ہو کر صحن میں ٹہلنے لگی۔ اور جب اسے بھات تقسیم ہونے کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ اور نہ دیوتا آتے ہوئے نظر آئے۔ تو وہ بھی دروازے کی طرف بڑھی۔

اندر شامیانے کے نیچے اونچی آواز میں شانتی پاٹھ ہو رہا تھا۔ اور باہر ایک مضطرب اور مجبور ماں اپنے بھوکے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی صحن سے نکل رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر رک رک کر مڑ مڑ کر یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ دیوتا نہیں آئے۔ جو اتنی بڑی تقریبوں پر سب سے پہلے بھات اور پکوان کھاتے ہیں حتیٰ کہ ایک بے زبان بھوکے بچے سے بھی پہلے ۔۔!

وہ گویا ہر آنے جانے والے سے پوچھ رہی تھی۔ دیوتا کہاں ہیں؟ دیوتا کہاں ہیں؟

پریم ناتھ پردیسی

غزل

حقیقتِ غمِ دل در خور بیاں تھی کبھی
یہ داستاں بڑی دلچسپ داستاں تھی کبھی

ترے طفیل ہر امید کامراں تھی کبھی
تجھے بھی یاد ہے دنیا مری جواں تھی کبھی

یہ اور بات کہ اب بے تعلقی ہے مگر
نظر نظر ترے جلووں کی رازداں تھی کبھی

تجلیوں سے محبت کی جگمگا اُٹھی
یہ کائنات وگرنہ دھواں دھواں تھی کبھی

یہ اور بات کہ محدود ہے نظر ورنہ
وہی ہے اب بھی محبت جو بیکراں تھی کبھی

تجھے وہ دردِ محبت بھی یاد ہے کہ نہیں
تری نظر مرے دل کی مزاج داں تھی کبھی

یہ ایک وقت کہ منزل ہے خود شریکِ سفر
وہ ایک وقت تھا منزل کشاں کشاں تھی کبھی

نہ جانے صدیوں سے کس کی ہے منتظر دنیا
کہ آج تک اُسی مرکز پہ ہے جہاں تھی کبھی

کسی کے نقشِ قدم کے طفیل اے مضطرؔ
جبینِ شوق بلندی میں آسماں تھی کبھی

ـ مضطر اکبرآبادی

رومان پسند

کردار :۔ رجس ترتیب سے ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۔ انور :۔ ثروت کا شوہر۔ عمر چھتیس سال کے لگ بھگ۔ بات بات پر چڑ جانے والا۔

۲۔ ثروت :۔ عمر تقریباً پچیس سال۔ کھوئی کھوئی سی دکھائی دینے والی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہیں جو چہرے کے سفید رنگ کی مناسبت سے بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ رخساروں پر چھائیوں کے سُرخ داغ جن کی وجہ سے اُس کے حسن میں وہ تازگی نہیں رہی .... جو اس شکل وصورت کی عورت میں ہونی چاہئے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُسے خوبصورت کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ فرخ :۔ سترہ سال کی ایک نوعمر لڑکی تیکھے نقش۔ سفید رنگ۔ آواز میں مٹھاس اور لباس سے نہایت خوش ذوق دکھائی دیتی ہے۔

۴۔ انیس :۔ فرخ کے چچا زاد بھائی۔ عمر تقریباً بیس اکیس برس۔ خوش پوش اور خوش رو نوجوان۔ گفتگو کا انداز بہت شستہ۔

سین

(ایک کمرہ جس میں دائیں بائیں دو دروازے ہیں ایک طرف جدید طرز کا ایک نیا صوفہ پڑا ہے اس کے سامنے ایک تپائی پر ایک آدھا بنا ہوا سویٹر اُون کا ایک گولا اور سلائیاں پڑی ہیں دری پر ریشمیں کپڑوں کا ایک ڈھیر سا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بیاہ کے سلسلے میں کپڑے تیار ہو رہے ہیں۔ ثروت صوفے کے ایک طرف بیٹھی ایک ریشمیں دوپٹے کو گوٹا لگا رہی ہے۔ انور داخل ہوتا ہے)

انور :۔ چڑ کر بس جب بھی آؤ۔ جس وقت بھی آؤ یہ کپڑے ہوں گے اور تم ہو گی۔ سزّبت کا بیاہ کیا آیا مصیبت ہی جان کو آگئی۔

ثروت :۔ میرا کیا ہے۔ بھانجی آپ کی ہے۔

انور :۔ پر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ دن رات کے چوبیس گھنٹے اسی بیاہ کی نذر ہو جائیں۔ آخر گھر کے دوسرے کام بھی تو ہیں!

ثروت :۔ میں تو۔ پر آپ کچھ کرنے بھی دیں؟ گھر کی صفائی کی طرف توجہ دوں گی تو کہیں گے گرم کپڑوں کو دھوپ کیوں نہیں دکھائی؟ یہ کروں گی تو کہیں گے۔ گرم کپڑے کہیں بھاگے جاتے ہیں۔ سودی خانے کو تو دیکھو، اُدھر آئی۔ تو کہیں گے کبھی باورچی خانے میں بھی بیٹھا کرو۔ اب بتایئے کوئی کرے تو کیا کرے؟

انور :۔ کرے وہی جو ضروری ہو۔ اور دیکھو ثروت میں اس وقت تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں آج رات اکرم صاحب کو کھانے پہ بلا رہا ہوں۔ ان کی دعوت کا انتظام کرنا ہے۔

ثروت:۔ آپ کی تو ہر بات بے نرالی ہے۔ اب میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔ کہ مجھے ان دنوں کسی کھانے دانے کا انتظام کرنے کی فرصت نہیں۔ دیکھتے بھی ہیں کہ میں نزہت کی شادی کے سلسلے میں کس قدر مصروف ہوں۔

انور:۔ مصروف ہو تو پھر کیا ہوا۔ جو کام کرنا ہے وہ کرنا ہے

ثروت:۔ پھر بھی اپنی ہی کہے جائیں گے۔

انور:۔ تو کیا مطلب تمہارا؟ اکرم صاحب کی دعوت نہیں کرو گی؟

ثروت:۔ مجھے کب انکار ہے۔ لیکن سوچئے تو سہی نزہت کی شادی میں کل چھ دن رہ گئے ہیں۔ اور ابھی آدھا کام بھی ختم نہیں ہوا۔ اگر کام زیادہ نہ ہوتا تو میں فرخ ہی کو کیوں یہاں بلواتی؟ وہ بے چاری بھی برابر میرا ہاتھ بٹا رہی ہے۔

(فرخ داخل ہوتی ہے)

فرخ:۔ بھائی جان ڈیوڑھی میں کوئی آیا ہے۔ سائیکل رکھنے کی آواز آئی تھی۔

انور:۔ کون ہو سکتا ہے؟ وحید صاحب تو نہیں؟

(چلا جاتا ہے)

ثروت:۔ فرخ ذرا یہ سویٹر پکڑا دینا۔

فرخ:۔ (سویٹر اور سلائیاں دیتے ہوئے) یہ لو۔ بھائی جان کیوں اس طرح اونچی آواز میں بول رہے تھے؟

ثروت:۔ اونچی آواز میں بولنا تو ان کی عادت میں داخل ہے۔

فرخ:۔ میرا تو خیال ہے بھائی جان کچھ چڑچڑے سے ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ لیکن آپا انور بھائی شادی سے پہلے تو ایسے نہ تھے۔ ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتے تھے۔ رشتہ داروں سے ملنے جلنے میں بھی بہت خوشی محسوس کیا کرتے تھے اور آپا آپ کے تو گھر میں بھی آئے دن کا آنا جانا تھا؟

ثروت:۔ فرخ شادی سے پہلے آدمی جو ہوتا ہے ضروری نہیں کہ شادی کے بعد بھی وہی ہو۔ نزہت کو اپنی پسند کی شادی پر بہت خوشی ہے۔ اور سچ بات بھی ہے۔ خوش کیوں نہ ہو۔ ارشد سے اچھا شوہر اور کون ہو سکے گا؟ شائستہ، ہنس مکھ، باذوق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ خدا کرے شادی کے بعد بھی اپنے شوہر کے متعلق اس کے یہی رنگین تصورات قائم رہیں!

فرخ:۔ تو آپا تمہارا کیا خیال ہے ارشد بھائی شادی کے بعد کچھ اور ہو جائیں گے؟

ثروت:۔ نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ (بات بدل کر) دیکھنا یہ کون آیا ہے۔ تمہارے بھائی جان کس سے باتیں کر رہے ہیں؟

فرخ:۔ انیس بھائی ہیں آپا۔ میرا خیال ہے وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔

ثروت:۔ تو فرخ تم کہاں چل دیں؟

فرخ:۔ کہیں بھی نہیں آپا۔

ثروت:۔ جا تو رہی ہو۔

فرخ:۔ (کچھ گھبرا کر) نہیں تو۔ لیکن نہیں آپا میں اس طرح انیس بھائی کے سامنے نہ آؤں گی!

ثروت:۔ (حیرت سے) اس طرح کیا؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟

فرخ:۔ بھئی آپا تمہیں نہیں معلوم انیس بھائی کپڑوں کے بارے میں کس قدر نکتہ چینی کیا کرتے ہیں۔

ثروت:۔ اس کے سوا اسے اور کام بھی کیا ہے۔

فرخ:۔ تمہیں نہیں معلوم آپا پچھلے اتوار جب ہمارے ہاں آئے تو میں گہرے سبز رنگ کی مورو کین کی قمیض پہنے تھی۔ سبز رنگ سے تو گویا انہیں چڑ ہے سب

کے سامنے پہن کر ... ایک بھی سلیقہ
جانا ہو گا تو بیں وہ بھی دل ہی دل میں کہتی ہوں گی
کہ واقعی اس لڑکی کو کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں ۔

ثروت :۔ میں تو نہیں سمجھتی کہ گہرے سبز رنگ میں کیا برائی ہے۔ اچھا خاصا رنگ ہے۔

فرخ :۔ پر نہ جانے انہیں کیوں پسند نہیں !

ثروت :۔ یہ سب محض باتیں ہی ہیں۔ لیکن تمہاری بات بھی تو خوب ہے نا۔ اب محض اس لئے کہ فلاں رنگ کے کپڑے انیس کو پسند نہیں تم اس کے سامنے ہی نہ آؤ گی ؟

فرخ :۔ نہیں ثروت آپا۔ کم از کم یہ دوپٹہ اوڑھ کر تو میں ان کے سامنے نہیں آؤں گی۔ اس میں بھی تو سبز دھاریاں ہیں۔ تمہیں کیا آپا۔ مذاق وہ میرا اڑائیں گے۔ ہر ایک سے کہتے پھریں گے۔ کہ فرخ نے فلاں وقت فلاں رنگ کا دوپٹہ فلاں رنگ کی قمیص کے ساتھ سر پر رکھا تھا۔ حالانکہ اس وقت اس رنگ کا دوپٹہ اوڑھنا چاہئے تھا۔

ثروت :۔ انیس کو تو ایسی باتوں کا خبط ہے۔ لیکن تم بھی تو اس سے کم نہیں ۔

فرخ :۔ (گھبرا کر) بھئی آپا مجھے جانے دو۔ وہ آ رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ہیں (بھاگ جاتی ہے۔)

ثروت :۔ ارے فرخ بات تو سنتی جاؤ۔ بھاگ کیوں گئی ؟ (انیس داخل ہوتا ہے)

انیس :۔ فرخ ! بھاگ کیوں گئی؟

ثروت :۔ عجیب لڑکی ہے۔ تم کہو آج یہاں کیسے آ نکلے ؟

انیس :۔ کالج سے سیدھا یہیں آ رہا ہوں۔ چھوڑو بھی آپا ان کم بخت سلائیوں کا پیچھا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ سیتی بنتی رہتی ہو۔ اب یہ کیا لے رکھا ہے۔

ثروت :۔ سویٹر ہے منی کا۔

فرخ :۔ آداب ! خوبصورت رنگ کا ہے۔ کس کا انتخاب ہے ؟

ثروت :۔ فرخ کی پسند ہے۔

انیس :۔ فرخ کی پسند! فرخ کو بھلا اچھے رنگ کی پہچان ہے ؟

ثروت :۔ تو کیوں تمہارے سوا اللہ کسی کو ذوق ہو ہی نہیں سکتا ؟

انیس :۔ کیوں نہیں ؟

ثروت :۔ تو پھر فرخ کے ذوق پر کیوں نام دھرتے ہو!

انیس :۔ نام تو نہیں دھرتا۔ ذرا وہ چڑتی ہے ہمارے اور جو چڑے اُسے چڑانے میں مزا آتا ہے۔ حالانکہ آپا میرا خیال ہے۔ خاندان کی لڑکیوں میں اگر کپڑے پہننے کا سلیقہ کسی کو ہے تو بھابی بجمہ کے بعد فرخ ہی کا نام لینا پڑے گا۔ تم تو آپا اب ہر بات میں پیچھے ہی رہتی جا رہی ہو۔ معلوم نہیں شادی کے بعد بعض لڑکیوں کو کیا ہو جاتا ہے۔

ثروت :۔ (پھیکی سی ہنسی سے) شادی راس نہیں آتی!

انیس :۔ (ہنس کر) جی ہاں دُرست ہے۔ یاد ہے شادی سے پہلے تمہاری کیا حالت تھی۔ ٹائیلٹ کا سامان بنانے والی دُنیا کی شاید ہی کوئی ایسی فرم ہو گی جس کی چیزیں تمہاری ڈریسنگ ٹیبل پر موجود نہ ہوں بھئی آپا خوشبوئیں استعمال کرنے میں اگر کسی کا ذوق دیکھا تو وہ تم ہی تھیں آپا۔ لیکن معلوم نہیں اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ نہ تمہارے رنگ روپ میں وہ پہلی سی تازگی رہ گئی نہ بالوں میں وہ چمک۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہو۔ آخر آپا تم اس قدر کیوں بدل گئی ہو ؟

ثروت :۔ (سنجیدگی سے) کیا میں بدل گئی ہوں ؟

انیس :- اور نہیں تو کیا! شادی سے پہلے جو تم تھیں
شادی کے بعد وہ نہیں رہیں۔

ثروت :- شادی نام ہی تبدیلی کا ہے۔

انیس :- لیکن آپا تبدیلی کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ تم تو
بالکل ہی بدل گئی ہو۔ وہ کپڑے پہننے کا ذوق۔
نہ وہ کسی سے ملنے جلنے کی امنگ۔ کپڑے اگر میلے ہو
گئے ہیں تو کوئی پروا نہیں۔ دوپٹہ پھٹ گیا ہے
تو تمہارے لئے معمولی بات ہے۔ اسی طرح سر پر دوپٹہ
رکھا ہے (لباس کی تو بات ہی چھوڑو —

ثروت :- یہ آج تم نے کیسی باتیں چھیڑ دی ہیں کوئی
اور بات کرو۔ کہا آج چچی جان کے یہاں گئے تھے؟

انیس :- آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟

ثروت :- یونہی۔ میرا مطلب تھا آخر تمہیں کیسے معلوم
ہوا کہ فرخ یہاں ہے؟

انیس :- مجھے کب معلوم تھا کہ فرخ یہاں ہے۔ میں
نہیں سمجھا آپا تمہارا مطلب!

ثروت :- میں سمجھی تمہیں معلوم ہوگا۔ جبھی آج —

انیس :- (چڑ کر اور ثروت کی بات کاٹ کر) بھئی ثروت
آپا دیکھو۔ یہ مذاق کی باتیں اچھی نہیں۔

ثروت :- بھئی میں نے کوئی مذاق کی بات تو نہیں کی۔
میرا خیال تھا شاید تم پہلے چچی جان کے یہاں گئے
ہو گے۔ وہاں سے معلوم ہوا ہو گا۔ کہ فرخ گھر پر
نہیں ہے۔ ..... تو تم .....

انیس :- (چڑ کر) میں نہیں سمجھتا کہ درمیان میں فرخ
کا ذکر لانے کی کیا ضرورت ہے؟

ثروت :- اے میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔ اور اگر
میں نے کہہ بھی دیا تو اس میں چڑنے کی کیا بات ہے
گویا وہ تمہاری عزیز نہیں! اور پھر کیا تمہاری چچی
جان تمہیں پسند نہیں کرتیں!

انیس :- لیکن آپا تم کبھی ایک سی ہو!

ثروت :- ایمان سے فرخ کہہ رہی تھی کہ تم پہلے تو چچی جان
کے ہاں گئے تو —

انیس :- لاحول! بات کا بتنگڑ۔ جی ہاں گیا تھا! کوئی جرم ہے
وہاں جانا؟

ثروت :- اے میں کب کہتی ہوں جرم ہے۔ پر تم چڑتے
کیوں ہو۔ یہ لڑکیاں ہی ایسی باتیں کیا کرتی ہیں۔ وہی
کہا کرتی ہیں۔ انیس بھائی ہر اتوار نہایت اہتمام کے
ساتھ چچی جان کے ہاں جایا کرتے ہیں۔

انیس :- جھوٹ۔ بکواس۔ میں ان باتوں کو خوب سمجھتا ہوں! —
انہیں میرے متعلق ایسی باتیں کرنے کا کیا حق ہے؟

ثروت :- (ہلکی سی ہنسی کے ساتھ) خواہ مخواہ جوش میں نہ آؤ
بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟

انیس :- خاک بیٹھے یہاں کوئی۔ ذرا کوئی رشتہ دار
سے ملا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ہر وقت امی جان کے
کان بھرتی رہتی ہے! انیس بھائی فلاں سے کیوں
ملتے ہیں۔ فلاں کے گھر زیادہ کیوں جاتے ہیں؟
دوسرے دن چچی جان کے کیوں بھاگے جاتے ہیں۔
یا اللہ خدا جانے کیا کیا بکواس کرتی رہتی ہے۔

ثروت :- ارے تم تو یونہی بے چاری پر بدگمانی کر
رہے ہو۔

انیس :- بدگمانی کیسی ٹھیک تو کہہ رہا ہوں! خود تو نصیب
میں نہیں کہ رشتہ داروں سے ملے دوسروں کو بھی
منع کرتی ہے۔ آخر میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں کہ میرے
سر پر سنسر بٹھا دیا جائے۔ جس سے چاہوں گا
ملوں گا۔ جس سے چاہوں گا نہیں ملوں گا۔

(کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے اور کمرے میں لگی ہوئی
تصویروں کو بے معنی طور پر دیکھنے لگتا ہے۔)

(باقی)

ثروت :- یہ تو ٹھیک ہے۔ پر تمہیں یہ جو ساری باتوں پہ خواہ مخواہ کا شک ہے۔

انیس :- نہیں آپا شک کیا مجھے یقین ہے ایسی باتیں وہی کیا کرتی ہے۔

ثروت :- (شرارت سے) بھئی آخر گھر کے لوگوں کو پتہ نہیں چلتا کہ آج کوئی خاص بات ہے۔ کہ انیس کپڑوں کی الماری کے سامنے کھڑا سوٹ چھانٹ رہا ہے کوئی خاص بات ہے کہ گھنٹہ گھنٹہ بھر سے آئینہ کے سامنے کھڑے ٹائی کی گرہ درست ہو رہی ہے۔ کوئی خاص بات ہے کہ نوکر کو بوٹ پر اچھی طرح سے پالش کرنے کی تاکید ہو رہی ہے؟

انیس :- (چڑ کر) میں نہیں سمجھتا کہ آج کل کے زمانے میں وہ کون لڑکا ہوگا جس میں کپڑے پہننے کی تمیز ہو اور وہ یہ باتیں نہ کرے! اپنے لباس کے بارے میں یہ سوچنا کہ آج کون سا سوٹ پہنا جائے کوئی انوکھی بات ہے! یا ٹائی کی گرہ اگر ٹھیک نہ بیٹھتی ہو اور اُسے دُرست کرنے میں کچھ وقت لگ جائے۔ تو یہ کوئی غیر معمولی بات ہے! نوکر سے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ذرا بوٹ کو اچھی طرح سے چمکا دے تو یہ کوئی نرالی بات ہے؟

ثروت :- نہیں تو۔ لیکن ہر لڑکے پر تقریباً ایک وقت ایسا آتا ہے جب اُسے ایسی باتوں پر معمول سے زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے! (ہنستی ہے)

انیس :- (جیسے اُسے فوراً ہی جواب سوجھ گیا ہے) اور میں سمجھتا ہوں کہ لڑکیوں پر بھی ایک وقت ایسا آتا ہے جب انہیں ایسی باتوں پر معمول سے زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے۔ تم اپنی ہی طرف دیکھو۔ شادی سے پہلے آپا تمہاری یہ حالت ہوا کرتی تھی کہ ذرا بھی پتہ چلا کہ انور بھائی آپ کے یہاں آئے ہیں تو جناب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے۔ کبھی بال دیکھے جا رہے ہیں۔ مانگ تو درست ہے نا۔ کبھی بال تو نہیں اُلجھے ہیں۔ کبھی دوپٹہ سر پر خاص انداز سے ڈھلکایا جا رہا ہے۔ کبھی شلوار کی سلوٹیں درست کی جا رہی ہیں اور کبھی......

(ہنستا ہے اور خود ہی فقرہ نامکمل چھوڑ دیتا ہے)

ثروت :- (جیسے اس سے کوئی بات نہیں بن سکی) پھر بھی جان سچ کہتی تھیں کہ تمہیں لڑکیوں میں بیٹھنے سے روکا جائے۔ ہر وقت لڑکیوں ہی میں گھسے رہتے تھے۔

(اُون کا گولا پلنگ کے نیچے گر پڑتا ہے)

انیس :- (ہنس کر) اچھا تو تمہیں کھلا! میں نے کوئی بات کہی ہے!

ثروت :- نہیں تو۔ ذرا یہ اون کا گولا پکڑا دو۔

انیس :- (ثروت کو اون کا گولا پکڑاتے ہوئے) یہ لو۔ اور پھر آپا یاد ہے جب آپ بھی انور بھائی کی بڑی خالہ کے ہاں رہتی تھیں۔ اور انور بھائی نے گرمیوں کی چھٹیاں اپنی خالہ کے ہاں گزاری تھیں؟

ثروت :- (اشتیاق سے آہ بھرتے ہوئے) وہ بھی کیا دن تھے! زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ زندگی ایک سہانا خواب دکھائی دیتی ہے۔

انیس :- سہانا خواب کیوں! میں نہیں سمجھا!

ثروت :- چھوڑو ان باتوں کو۔ بلاؤ فرخ کو! خدا جانے کہاں چلی گئی۔ اسے معلوم بھی ہے کہ تم آئے ہوئے ہو زاہدہ کے پاس بیٹھی ہو گی۔

انیس :- بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ آنا ہو گا تو خود ہی آجائے گی۔ زاہدہ کب سے یہاں ہے! (فرخ

ثروت :- لو وہ خود ہی آگئی۔

(فرخ آتی ہے۔ اس کے سر پر [illegible] ٹکا ہوا ہے)

فرخ :- انیس بھائی آداب عرض!

انیس :۔ کیسے مزاج کیسے ہیں۔
فرخ :۔ آپا ثروت تھیں، بھائی جان بلا رہے ہیں۔
ثروت :۔ تمہارے بھائی جان کسی کو آرام سے بیٹھنے بھی دیں گے؟ کیوں بلا رہے ہیں فرخ؟
فرخ :۔ یہ تو معلوم نہیں۔ بیٹھے ہاتھ کل صاف کر رہے ہیں۔ شاید کچھ پوچھنا ہے۔
ثروت :۔ دعوت ہی کے بارے میں کہہ رہے ہوں گے!

(جاتی ہے)

انیس :۔ سنئے ناہید بھی آپا ثروت کے ہاں آئی ہوئی ہیں!
فرخ :۔ جی ہاں۔ آپ سے ملنا نہیں ہوا!
انیس :۔ مجھ سے ملنا کوئی ضروری ہے! آپ کی تو ہیں سہیلی۔ آپ کو بہت پسند ہیں؟
فرخ :۔ ایک میں کیا سب اسے بہت چاہتے ہیں۔ آپا سعیدہ تو اس پر جان چھڑکتی ہیں۔
انیس :۔ چھڑکتی ہوں گی جان۔
فرخ :۔ (چڑ کر) خدا جانے آپ کو کیوں بے چاری سے بیر ہے!
انیس :۔ یہ تو آپ کی سراسر غلط فہمی ہے۔
فرخ :۔ اگر بیر نہیں تو پھر آپ بے چاری کا مذاق کیوں اڑاتے ہیں؟
انیس :۔ میں نے تو کبھی اس کا مذاق نہیں اڑایا۔ نہ جانے میرے متعلق آپ لوگوں کو کیوں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ کہ مجھے لوگوں کا مذاق اڑانے میں لطف آتا ہے۔
فرخ :۔ (ہنس کر) یہ تو میں بھی کہوں گی۔ مذاق تو آپ اڑایا کرتے ہیں۔ اب اس دن پچھلے اتوار آپ نے میرا سب کے سامنے مذاق نہیں اڑایا تھا، صرف اس لئے کہ میں نے سبز رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی (معصومیت سے) میرا تو کیا جاتا تھا کہ [illegible]۔

انیس :۔ (مسکرا کر) ہوں مجھے افسوس ہے۔ لیکن دیکھئے جس شخص میں لباس پہننے کا ذوق ہو اگر وہ کبھی لباس پہننے کے بارے میں خوش ذوقی کا ثبوت نہ دے تو بتایئے آخر اسے سمجھانا تو چاہئے!
فرخ :۔ ہم نے تو کبھی کسی کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو پسند نہیں آتیں پر کچھ نہیں کہتے۔
انیس :۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ کو فوراً کہہ دینی چاہئے۔
فرخ :۔ کہہ دینی چاہئے! اچھا تو لیجئے! آپ کبھی کبھی جو ٹائی لگاتے ہیں مجھے وہ کبھی پسند نہیں آئی۔ معلوم ہے کونسی؟ وہی بالکل چھینٹ کی ایک کترن سی جو جھولتی ہے
انیس :۔ (مسکرا کر) اوہو۔ اچھا آپ اس ٹائی کو کہہ رہی ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ وہ آپ کو پسند نہیں۔ معلوم بھی ہے اس ٹائی کے بدلے نسیمہ مجھے دو ٹائیاں دے رہی ہیں۔ تو آئندہ سے ہم نہیں لگائیں گے اسے لیکن آپ نے پہلے کیوں نہ کہا؟
فرخ :۔ میں کیوں کہتی۔ آپ بھی کہتے ہوں گے عجیب لڑکی ہے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی ہے!
انیس :۔ تو پھر کیا ہوا! ہم بھی تو اس طرح بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً مہندی رنگ کا جارجٹ کا وہ دوپٹہ جو آپ نے عید کے روز پہنا ہوا تھا بہت پسند ہے۔
فرخ :۔ (خوش ہو کر) اچھا! وہ دوپٹہ مجھے بھابی نجمہ نے دیا تھا۔
انیس :۔ بھئی لباس کے بارے میں نجمہ بھابی کے ذوق کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔ لباس کے بارے میں تو کبھی ثروت آپا بھی کسی سے کم نہ تھیں۔ پر نہ جانے اب آپا کو کیا ہو گیا ہے۔ جیسے کسی کا جی ہی مردہ ہو گیا ہو!۔
فرخ :۔ جی ہاں آپ نے ٹھیک کہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا

کہ ثروت آپا میں وہ وضع داری کیوں نہیں رہی ۔

انیس :۔ کہاں وہ آپا جسے ہر وقت بناؤ سنگھار ہی سے فرصت نہیں۔ نئے سے نئے ڈیزائن کا کپڑا پہنا جا رہا ہے۔ اچھے سے اچھا سینٹ استعمال کیا جاتا ہے اور کہاں اب آپا!

فرخ :۔ اصل میں انور بھائی کا مزاج کچھ چڑچڑا ہو گیا ہے۔ اُدھر آپا کے مزاج میں بھی گرمی ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں کل سے یہاں آئی ہوئی ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے چار پانچ بار انور بھائی اور ثروت آپا میں خاصی جھڑپ ہو چکی ہے۔ اور پھر جھگڑے بھی اس قدر بے بنیاد ہوتے ہیں کہ ہنسی آتی ہے۔

انیس :۔ یہ تو میں نے بھی سنا ہے۔ مامی جان ہی کئی بار امی سے اس کا ذکر کر چکی ہیں۔ کہ انور بھائی ثروت آپا سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ مجھے تو یہ سن کر بہت رنج ہوا۔ یاد نہیں انور بھائی نے ثروت آپا سے شادی کرنے کے لئے کیا کیا جتن کئے تھے؟ کس قدر جھگڑے اُٹھے تھے؟

فرخ :۔ اور پھر اگر آپا جرأت سے کام لے کر ماموں جان سے صاف صاف نہ کہہ دیتیں تو کبھی یہ شادی ہو سکتی تھی؟ وہ تو یوں کہئے کہ ماموں جان آزاد خیال تھے اور مان گئے ۔

انیس :۔ ان باتوں کے باوجود اگر انور بھائی آپا سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ تو کچھ عجیب سی بات ہے (بات بدل کر) اچھا آپ تو آج کل خوب پڑھ رہی ہوں گی۔ دسمبر کے پہلے ہفتے ہی غالباً آپ کا امتحان ہو رہا ہے۔

فرخ :۔ جی ہاں۔ لیکن پڑھنے لکھنے کو تو مطلق جی نہیں چاہتا۔

انیس :۔ میں تو جب کبھی آپ کے یہاں گیا ہوں۔ آپ کو اپنے کمرے ہی میں بیٹھے پایا۔ بلکہ بعض دفعہ تو کافی عرصہ آپ کے یہاں بیٹھا بھی رہا۔ امی جان سے باتیں بھی ہوئیں۔ اور میرا خیال ہے آپ کو بھی معلوم ہوتا ہوگا کہ میں آیا ہوا ہوں۔ لیکن پھر بھی آپ اپنے کمرے ہی میں رہتی ہیں۔ پچھلے اتوار کو چھوڑ کر ہر بار یہی اتفاق ہوا ہے

فرخ :۔ جی نہیں بعض اوقات آدمی کی طبیعت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ ملنے جلنے سے کتراتا ہے۔

انیس :۔ لیکن آپ نے تو کترانا ہی کیا ہے معاف کیجئے گا۔ بعض اوقات تو آپ ہم سے خوب باتیں کرتی ہیں کافی عرصہ پاس بیٹھی رہتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی تو آپ کی طرف سے ایسی بے رخی کا اظہار ہوتا ہے۔ کہ کیا کہوں!

(فرخ کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ فرخ کچھ شرمندہ سی ہو جاتی ہے)

فرخ :۔ آپ کی غلط فہمی ہے۔ میں نے تو ہمیشہ آپ کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے ابھی پچھلے اتوار ہی آپ سے حساب کا نیا قاعدہ سمجھا تھا!

انیس :۔ (ذرا ہنستے ہوئے) ہم بھلا کہاں اتنی لیاقت کہ کچھ سمجھا سکیں!

فرخ :۔ خیر یہ تو میں نہیں مانتی۔ جس آسانی سے آپ سمجھاتے ہیں کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ صفدر بھائی سے بھی کبھی کبھی کوئی چیز پوچھ بیٹھتی ہوں۔ کیا مجال جو اُن کا بتایا ہوا کوئی قاعدہ سمجھ میں آ جائے۔ اچھا تو اب آپ جب ہمارے گھر آئیے گا۔ تو میں آپ سے ایک سوال سمجھوں گی۔ کوئی خاص مشکل نہیں۔ لیکن نہ جانے حل کیوں نہیں ہوتا۔

انیس :۔ تو ابھی دیکھتے ہیں ——

فرخ :۔ نہیں اس وقت نہیں مجھے اس کی عبارت بھی تو یاد نہیں۔

(دوسرے ثروت اور انور کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آتی ہیں) لیجئے پھر انور بھائی اور آپا میں کوئی جھگڑا ہو رہا ہے۔!

انیس :۔ توبہ۔ عجیب لوگ ہیں یہ۔ انہیں یہ بھی خیال نہیں کہ گھر میں ایک چھوڑ تین مہمان موجود ہیں۔

فرخ :۔ یہاں آئے دن یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔

(ثروت سسکیاں بھرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔)

انیس :۔ ارے! آپا کو کیا ہوا۔ رو رہی ہیں۔

فرخ :۔ (پریشان ہو کر) آپا آپا کیا ہوا۔ رو کیوں رہی ہو۔ آپا بات کیا ہوئی؟

انیس :۔ (رنجیدہ ہو کر) ہاں آپا آخر ہوا کیا ہے: رو کیوں رہی ہو؟

فرخ :۔ بھائی جان نے کچھ کہا ہے؟

انیس :۔ بس آپا خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔

ثروت :۔ (روتے ہوئے) کمبخت موت بھی تو نہیں آتی!

فرخ :۔ خدا نہ کرے۔ آپا ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔

ثروت :۔ (سسکیاں بھرتی ہوئی) معمولی معمولی باتوں پہ بے عزتی کر دیتے ہیں۔!

فرخ :۔ آپا انور بھائی کی تو عادت ہی ایسی ہے تم ان کی باتوں کا خیال نہ کیا کرو۔

ثروت :۔ خیال کیوں نہ کروں؟ ہر وقت ایسی باتیں کرتے ہیں۔ کہ جی جل اٹھتا ہے۔

انیس :۔ لیکن اب کیا بات ہوئی ہے!

ثروت :۔ تمہارے آنے سے پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ آج شام اکرم صاحب کی دعوت ہے۔ میں نے کہا زہرہ کی شادی ہو جانے دیجئے۔ فرصت ہوگی تو کر لیں گے یہاں آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہی تو ہوتی رہتی ہیں۔ بس میرا یہ کہنا تھا۔ کہ جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ بگڑ جانے لگے۔ کہ تمہیں میری عزت کی کوئی پروا نہیں۔ ہمیشہ مجھے ذلیل کرتی ہو۔

انیس :۔ بس اتنی ہی بات ہوئی ہے؟

ثروت :۔ ہاں!

انیس :۔ (ہنس کر) یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس پر کوئی جھگڑا کیا جاتا۔

ثروت :۔ اسی بات کو تو میں بھی سوچتی ہوں۔ کہ بات کچھ بھی نہیں ہوتی اور لڑائی مچا دیتے ہیں۔

(انور داخل ہوتا ہے۔ ماتھے پر غصے کی وجہ سے شکنیں پڑی ہوئی ہیں)

انور :۔ (ثروت کے الفاظ دہرا کر) لڑائی مچا دیتے ہیں! گویا میں لڑاکا ہوں؟

ثروت :۔ نہیں جی میں لڑتی ہوں۔

انیس :۔ بس بس آپا خاموش۔

انور :۔ دیکھنا بھئی انیس، بات کیا تھی۔ میں کئی دنوں سے کہہ رہا ہوں۔ اکرم صاحب کی دعوت کرنی ہے لیکن ایک کان سنتی دوسرے کان اڑا دیتی ہے۔ آج میں نے کہا۔ وہ کل صبح فرنٹیر میل سے واپس جا رہے ہیں۔ اس لئے آج رات دعوت کر دو۔ بس پر کہنے لگی۔ مجھ سے آپ کے دوستوں کی یہ دعوتیں وغیرہ نہیں ہوتیں۔

انیس :۔ واقعی آپا جواب کی یہ صورت تو نہیں ہونی چاہئے تھی۔

ثروت :۔ کون کہتا ہے۔ میں نے یہ جواب دیا تھا۔ جھوٹ بولتے شرم بھی نہیں آتی۔

انور :۔ دیکھ لو شوہر کی شان میں کیا مہذب الفاظ کہے جا رہے ہیں؟

انیس :۔ بھئی آپا یہ تو تمہاری زیادتی ہے۔ ایسا تو نہیں کہنا چاہئے۔

ثروت :- حوصلہ کروانے کا اتنا ہی شوق ہے تو اچھا سلوک کرنا بھی سیکھیے۔

انیس :- آپ لوگ بھی کس قدر عجیب ہیں کہاں شادی سے پہلے ایک دوسرے کے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے اور کہاں اب بات بات پر لڑائی بات بات پر جھگڑا

ثروت :- مجھے کیا ضرورت تھی کسی کے آگے پیچھے پھرنے کی۔

انور :- نہیں تو مجھے ہی ضرورت تھی۔ دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی لڑکی جو نہیں تھی۔

ثروت :- جبھی ہمارے گھر دن رات گھسے رہتے تھے!

انور :- ماموں کے گھر جانا کوئی جرم نہیں۔

ثروت :- لیکن بیٹھے تو جناب میرے پاس ہی رہا کرتے تھے۔ اور جو ذرا دیر ہو گئی۔ موقع نہ ملا۔ تو جھٹ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیا۔ کوئی کتاب لینے کے بہانے ہی سے میرے کمرے میں آموجود ہوئے۔ اور نہیں تو وقت دیکھنے کی ہی خاطر۔ گویا کلاک صرف میرے کمرے ہی میں تو رہ گیا تھا ——

انور :- (طنز سے) درست۔ لیکن حساب کے سوال سمجھنے کے لیے بھی یہی بہانے بنایا کرتا تھا۔ حالانکہ سب کو معلوم تھا کہ ماموں جان سے زیادہ حساب مجھے نہیں آتا تھا ——

ثروت :- ابا جان کے ہوتے مجھے آپ سے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ابا جان مجھے سمجھا رہے ہوتے تو آپ ہی خود بیچ میں بول اٹھتے تھے "ثروت کو یہ سوال اس طرح سمجھ میں نہ آئے گا۔ لائیے ماموں جان میں اسے سمجھا دیتا ہوں" وہ بے چارے ان باتوں کو کیا جانیں۔ کاپی پنسل اٹھا آپ کے حوالے کر دیتے۔!

انیس :- اوہو تو پھر کیا ہوا۔ ثروت آپا دیکھئے نا ماموں جان سے سمجھا۔ انور بھائی نے سمجھا تو سوال سمجھنے کا ہے۔

فرخ :- چھوڑو بھی آپا ان باتوں کو آپ جانے بھی دو۔

(ثروت غصے کی حالت میں جانے لگتی ہے)

ثروت :- ہٹو مجھے جانے دو۔

انیس :- کہاں چل دیں آپ!

ثروت :- کہیں نہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں (چلی جاتی ہے)

انیس :- آپا۔ آپا۔ دیکھو بات تو سنتی جاؤ

ثروت :- آپا اس وقت غصے میں ہیں۔ اب اپنے کمرے میں جا کر روئیں گی!

انور :- مجھے کوئی پروا نہیں۔

فرخ :- بھائی جان یہ آپ کی زیادتی ہے۔

انیس :- اگر گستاخی نہ سمجھئے۔ تو یہ میں بھی کہوں گا کہ آپ بھی آپا سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ پڑتے ہیں۔

فرخ :- اب بھائی جان پرسوں کہ بھی کوئی لڑنے کی بات تھی؟

انور :- کونسی بات!

فرخ :- وہی رفعت آپا کے برقعے والی بات!

انیس :- وہ کیا بات تھی؟

فرخ :- رفعت آپا کے نئے برقعے کا رنگ آسمانی ہے یا کاسنی۔ آپا آسمانی بتاتی تھیں اور بھائی جان کاسنی۔

انیس :- لاحول ولا قوۃ۔ اب بھلا یہ بھی کوئی جھگڑنے کی بات ہے۔ ویسے رفعت آپا کے برقعے کا رنگ اصل میں ہے کیا؟

فرخ :- اصل میں تو آسمانی ہے!

انور :- تم بھی فرخ اس رنگ کو آسمانی کہتی ہو!

فرخ :- یقین مانئے بھائی جان وہ رنگ ہے ہی آسمانی کاسنی ادھ ہوتا ہے۔ ٹھہرئیے میں آپ کو کاسنی رنگ کی مثال دیتی ہوں۔ ہاں ثروت آپا کے پہلو میں جو

دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ کاسنی رنگ کا تھا۔

نور :۔ جہنم میں جائیں یہ رنگ ڈھنگ۔ میری تو زندگی ایک عذاب میں ہے۔

انیس :۔ وہ دعوت والی بات بھی ہے نا ؟ دیکھئے میں ابھی جا کر آپا کو مناتا ہوں!

(چلا جاتا ہے)

فرخ :۔ تو چلئے بھائی جان دعوت کا میں انتظام کر دیتی ہوں کیا ضروری ہے کہ آپا بھی اس دھندے میں پڑیں۔

انور :۔ نہیں فرخ تم کیوں یہ تکلیف اٹھاؤ۔

فرخ :۔ نہیں بھائی جان اس میں تکلیف کی کیا بات آخر گھر پر بھی تو یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اصل میں آپا بھی تھکی ہیں۔ نزہت باجی کی شادی کے سلسلے میں انہیں اس قدر مصروفیت ہے کہ سچ مانئے سر اٹھانے کی فرصت نہیں میں بھی برابر آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ لیکن کام ہے کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔ ابھی قمیصوں کے ڈیزائن میں نے بنا کر دیے ہیں۔ پھر کریپ کے چار دوپٹوں کو گوٹا لگانا باقی ہے بیچ میں کچھ ہی تو دن ہیں۔

انور :۔ یہ نزہت کی شادی کونسی تاریخ ہو رہی ہے؟

فرخ :۔ لیکن بھائی جان کام بھی تو کم نہیں ہے نا ؟

(انیس داخل ہوتا ہے)

انیس :۔ ابھی آپا نہیں مانتیں۔ میرے پاس وقت نہیں ورنہ آپا کو منت کر ہی جاتا مجھے ایک جگہ ضروری پہنچنا ہے۔

فرخ :۔ میں آپا کو مناؤں گی۔ انہیں غصہ آتا ہے لیکن زیادہ دیر نہیں رہتا۔

انیس :۔ فرخ تم، اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اور ہاں میں اتوار کو آپ کے یہاں آرہا ہوں۔

فرخ :۔ فرخ یاد ہے مجھے آپ سے وہ سوال سمجھنا ہے؟

انیس :۔ تو آپ گھر پر ہی ہوں گی نا ؟

فرخ :۔ جی ہاں میں کل یہاں سے جا رہی ہوں (انور سے مخاطب ہو کر) آئیے بھائی جان چل کر آپا کو منائیں۔

(پردہ)

راجہ امین الرحمٰن

بازگشت

بسیط جادوں عمیق غاروں، طویل راہوں پہ چل چکا ہوں
جھمکتی لہروں سے آسماں کی بلندیاں تک مرے لیئے تھیں

مرے ملاحل میں وہ تصور کی وادیاں بھی ہیں، وسعتیں بھی
جنہیں حقیقت کی ٹھوس نظریں نہ پا سکی ہیں، نہ پاسکیں گی
ہر ایک منظر کھلا ہوا ہے مری نگاہوں کی حیرتوں میں

کہ اب بھی ہر راہ اجنبی ہے
کہ اب بھی ہر راہ اجنبی اجنبی نگاہوں سے دیکھتی ہے
یہ جانی پہچانی میری راہیں مری صداؤں پہ چونکتی ہیں
اگرچہ اِن کے لبوں پہ اب بھی مرے تبسّم کی لرزشیں ہیں
اگرچہ ان کی ہوا کے سینے میں میرے نغمے مچل رہے ہیں
اگرچہ ان کے سرکتے خوابوں میں عکس ہے میری آرزو کا
قدم قدم پر مگر یہ راہیں مجھے صدا دے کے روکتی ہیں
وہ اک صدا دے کے ٹوکتی ہیں کہ جس کا مفہوم اجنبی ہے ——

بلندیوں پر وہی چٹانیں ہیں اب بھی جو اس سے پیشتر تھیں
وہی چٹانیں کہ جن کی سنگینیوں پہ سر رکھ کے سو گئی تھی
مرے لڑکپن کی مسکراتی ہوئی نگاہوں کی جاذبیت ——
یہیں مرے بے خبر تصوّر نے ایک دنیا تراش لی تھی
جہاں کئی کاسۂ بہاروں کے رقص کرنے کو آ گئے تھے
یہ دنیا اب میرے تجربوں کی حرارتوں سے پگھل گئی ہے

اب اس کی یادیں یہیں انہیں سرمئی چٹانوں تک کھیلتی ہیں
جو مجھ کو پہچانتی نہیں ہیں
یہی چٹانیں مرے تصوّر کو آسرا دے چکی ہیں اب تک
یہی چٹانیں کئی نشیبوں میں مجھ کو آواز دے چکی ہیں
خیال پرواز دے چکی ہیں ـــــ

طویل راہوں کی سرد بانہوں نے مجھ کو خاموش کر دیا تھا
مجھے گماں تھا کہ اب کسی موڑ پر کسی آشنا کو پا کر
میں اپنی تنہائیوں کی، ویرانیوں کی باتیں سنا سکوں گا
کسی سے میں داد پا سکوں گا
مرے لئے بیقرار ہوں گے مرے خیالوں میں بسنے والے
مجھے گماں تھا کہ میری آمد پہ اُن کی نظریں چمک اُٹھیں گی
مگر یہ بے نُور سرد آنکھیں، مگر یہ بے آب زرد چہرے
مجھے صدا دے کے روکتے ہیں کہ جس کا مفہوم اجنبی ہے ـــــ

بسیط جادوں، عمیق غاروں، طویل راہوں پہ چل چکا ہوں
کہ آج تک میری گرم نظروں کو ایک منزل کی آرزو تھی
اُسے بھی میری شکستِ اُمید نے ہوا میں اُڑا دیا ہے
ہوا کی منزل کہاں ہے! ـــــ کوئی ہوا کی منزل کو پا سکا ہے!

اگر سفر سے مفر نہیں ہے تو قیدِ منزل کا ذکر کیا ہے
کوئی بہار و خزاں مری راہ میں نہ آئیگی ـــــ چل رہا ہوں
عمیق غاروں میں ڈھل رہا ہوں ـــــ

یوسف ظفر

(حلقۂ اربابِ ذوق)

محفلِ ادب

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ جلیل رحمۃ اللہ

یکم صفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۶ جنوری ۱۹۴۶ء کو مشہور شاعر استاد حضرت جلیل نے پچاسی برس کی عمر میں حیدر آباد دکن میں داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالیٰ اس درویش شاعر کو اپنی داد رحمت سے شاد فرمائے،

اللہ اللہ! زمانہ کی نیرنگیاں کیا کیا انقلاب دکھاتی ہیں، ہم جوان، جوان بڈھا، اور بڈھا راہ عدم کا مسافر ہوتا ہے، انگریزی کی بیسویں صدی کا پہلا سال تھا جب میری عمر ۱۲، ۱۳ برس کی ہوگی، کہ میں دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں داخل ہوا، شعر و سخن کا چسکا کتنی بیت بازی کے سبب پہلے سے تھا اب لکھنؤ آیا جہاں کے ذرہ ذرہ کے خمیر میں شعر و سخن کا عنصر ہے، مدرسہ میں بھی اس وقت طالب علم شاعری کرتے تھے، اور غزلیں پڑھتے تھے، تجمل شاہجہانپوری، سید ظہور احمد ناصل خاں شاہجہانپوری (جو بعد کو وحشی شاہجہانپوری ہو گئے تھے) دانا سہسرامی (حکیم رکن الدین دانا) مصطفےٰ ملیح آبادی، صدیق حسن اثر مانکپوری، شہر بہاری (مولوی عبد الصمد شرر) اور یہ خاکسار اس میں پوری دلچسپی لیتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب امیر و داغ کے زمزموں سے ہندوستان پرشور تھا، اور خاکسار کا میلان امیر مرحوم کی طرف تھا، اور ان کا دیوان مراۃ الغیب پیش نظر رہتا تھا۔

صدیق حسن صاحب اثر مانکپوری حضرت جلیل کے فرزند تھے، اور ان سے اور مجھ سے شعر و اشعار کی دلچسپی کے رشتہ سے یارانہ تھا، اس تعلق میں ان کے والد ماجد کی حضرت امیر مرحوم کے ساتھ شاگردی کی نسبت نے محبت کی گرہ کو اور زیادہ استوار بنا دیا تھا، مولوی صدیق حسن صاحب (حال وظیفہ یاب سرکار نظام) کے پاس ان کے والد کی غزلوں کا سفینہ تھا، میں اس کو اکثر دیکھتا، اور اس کے اچھے اشعار یاد کرتا، چنانچہ ان کی ایک غزل کے یہ چند شعر اسی وقت سے یاد ہیں،

کھول کر جوڑا نکلنا اس ہوا میں قہر ہے	منہ تمہارا چوم لے زلف پریشاں تو سہی
گیسو و رخ کا اگر دو دن یہی عالم رہا	یار کا کلمہ پڑھیں ہندو مسلماں تو سہی
شعر کیا رنگین کہے ہیں وصف لب میں اے جلیل	خون ہو کے رشک سے لعل بدخشاں تو سہی

دربار امیری سے مزید وابستگی کا باعث یہ تھا کہ مدرسہ میں ہمارے استاذ و مہتمم شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سے پہلے جنرل اعظم الدین خاں کے زمانۂ تولیت میں رامپور کے مدرسہ عالیہ میں مدرس اول رہے تھے، اور ان سے امیر مینائی مرحوم اور ان کے تلامذہ اور فرزندان عزیز و اختر مینائی وغیرہ سے تعلقات تھے، امیر اللغات کی مجلس شوریٰ کے وہ ایک ممبر تھے، ہمارے اوقات درس میں کبھی کبھی ان کا تذکرہ کرتے بھی کرتے تھے اور ہم لوگ ان کو بڑے شوق سے سنتے تھے، یہ گوناگوں اسباب تھے، جن کی بنا پر اختر مینائی مرحوم اور حضرت جلیل سے شاعرانہ عقیدت تھی، اور اس وقت ان سطروں کے لکھنے میں بھی یہی نسبتیں اثر انداز ہیں۔

حضرت جلیل کا پورا نام جلیل حسن تھا، مانکپور ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے، حفظ قرآن سے مشرف، فارسی کی اعلیٰ استعداد اور عربی کی معمولی واقفیت تھی، لیکن شعر و سخن کے اصول و فروع، اور لغت اردو کی تحقیق میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور یہ فیض ان کو اپنے استاد حضرت امیر مینائی سے پہنچا ہوا تھا کہ استاد کے قدموں سے لگ گئے، استاد نے بھی جوہر قابل پا کر پوری تربیت کی، امیر اللغات کی ترتیب کا کام انجام پا رہا تھا جو ۱۳۰۶ھ سے شروع تھا،

استاذ نے اس کام کا سررشتہ شاگرد کے سپرد کیا۔ پہلی جلد الف ممدودہ کی شائع ہوئی، اور دوسری جلد دال کے مسودے تیار ہونے لگے تھے کہ تقدیر
میں ریاستی انقلاب کا دھکا پایا، اتفاق وقت کہ اسی زمانہ میں حضور نواب میر محبوب علی خاں نظام سابق کشور دکن ہندوستان آگئے، اس سفر میں
داغ بھی ہمرکاب تھے، داغ پہلے رامپور میں رہ چکے تھے، اور امیر مرحوم سے ان کا دوستانہ تھا، اس بنا پر داغ کے سلسلے سے امیر مرحوم
نے حضور نظام کی خدمت میں باریابی پائی، اور حضور نظام نے ان کو دکن آنے کا ایما فرمایا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد اس بڑھاپے میں
(۱۳۱۸ھ میں) وہ دکن کو سدھارے دکن کو کیا سدھارے تھے اصلی وطن کو سدھارے، یعنی دکن پہنچے، ایک مہینہ اور کچھ دن ہوئے تھے
کہ وہیں وفات پائی، اور مشہور عام شعر بالکل صادق آیا،

دو چیز آدمی را کشد زور زور ... یکے آب ودانہ دگر خاک گور

آب ودانہ تو میسر نہ آیا، خاک گور میسر آئی، شاہ خاموش کے احاطۂ مزار میں اس شعر وسخن کے مرقد پر عمر بھر دو دفعہ حاضری میسر آئی
دعائے مغفرت کے پھول نچھاور کئے۔

اس سفر میں شاگردوں میں حضرت جلیل اور صاحبزادوں میں سے حضرت اختر مینائی ساتھ تھے۔ اس غربت اور مسافرت کے عہد میں
مہاراجہ کشن پرشاد نے جو شعر وسخن کے شائق اور علوم مشرقی کے بڑے قدردان تھے، امیر کے ان دونوں عزیزوں کی بڑی دستگیری کی، دونوں کو فوراً
اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا، اس وقت سے ان دونوں صاحبوں نے حیدرآباد کو اپنا وطن بنا لیا، اور تقریباً پانچ چھ برس تک صرف مہاراجہ
کی سرپرستی میں زندگی بسر کرتے رہے، اس زمانہ میں ایک گلدستہ اور ایک نثر کا ماہوار رسالہ دبدبۂ آصفی کے نام سے ان کے اہتمام میں نکلنے لگا، حضرت
جلیل نے اسی زمانہ میں تذکیر وتانیث پر ایک محققانہ کتاب لکھی، جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر وتانیث کا فیصلہ درج کیا، پھر اردو کے فن
عروض پر ایک رسالہ لکھا جس میں اردو کے مستعمل اوزان وبحور کی تشریح کی، اس کے بعد اور بھی کتابیں لکھیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۹۰۵ء میں استاد داغ نے جو حضور نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس کے استاذ تھے، وفات پائی، تو اعلیٰ حضرت کی نگاہ
انتخاب حضرت جلیل پر پڑی، اور ان سے مشورہ کلام فرمانے لگے، ۱۹۱۱ء میں جب حضور میر عثمان علی خاں بہادر تخت نشین ہوئے تو وہ مزید
قدردانیوں سے سرفراز ہوئے اور اب وہ وقت آیا، جو اس ماہر کامل الفن کی قدرشناسی کے لئے مقدر تھا، چنانچہ اس وقت سے مرحوم نے اپنی عمر
تک پورے چھتیس برس اس شاہ عالی جاہ کے ظل عاطفت میں کمال اطمینان وفارغ البالی بسر کئے، اور بہت سے القاب وانعامات سے
سرفراز ہوتے رہے،

خاکسار کو سب سے پہلی دفعہ مارچ ۱۹۱۱ء میں نواب عماد الملک مرحوم کے کتب خانہ کو ندوہ میں لانے کے سلسلے حضرت الاستاذ مرحوم
کے حسب ایما حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا، وہ عقیدت جو حضرت جلیل سے مجھے تھی، کشاں کشاں ان کے آستانہ تک لے گئی، بڑی محبت اور شفقت
سے ملے، اس کے بعد جب کبھی حیدرآباد جانا ہوا، ان کے ہاں ضرور حاضری دی، پرانی وضعداری، اور استقامت کی یہ مثال آج تعجب سے سنی
جائے گی، کہ ان سے پہلی ملاقات جس مکان، مکان کے جس سائبان، اور سائبان کی جس سمت میں جس کرسی پر جس ہیئت کذائی سے ہوئی تھی اخیر
ملاقات بھی اسی مکان میں اسی سائبان میں اسی کرسی پر اور اسی صورت میں ہوئی، میانہ قد دبلا بدن، رنگ گندمی، قریب نوے، داڑھی میں شانہ
آنکھوں میں سرمہ، ہاتھوں میں تسبیح، ابھی آخری زمانہ کی حاضری کے موقع پر جو جنوری ۱۹۴۵ء میں ہوئی دیدار نہ ہو سکا، ایسے بیمار تھے کہ ذرا خراش
تھے، نقل وحرکت کی ممانعت تھی، یہی علالت کم وبیش قائم رہی اور مرض الموت ثابت ہوئی، محلہ سلطانپورہ کے جس کرایہ کے مکان میں رخت
اقامت ڈالا، اخیر تک اسی میں گزار دیا،

مرحوم نہایت دیندار، تہجد گزار، تسبیح خواں، ذکر الٰہی میں تر زبان، متین، سنجیدہ، کم سخن، متواضع، خاکسار اور بڑے پابند وضع تھے، پنجوقتہ نما

یا جماعت کا اہتمام تھا عشق رسول میں سرمست تھے، مرحوم کے یادگار شاگردوں سے علاوہ جناب حضور نظام کی خدمت میں ۔۔۔ پہونچ گئے تھے،

"مجھے بھی جلیل سے سخت انفصال ہے اور ان کی کامیابی کا نہایت خیال ہے، آدمی بہ ایسے اچھے ہیں کہ جہاں جائیں وہاں اسامی بڑھا

ہمیں، میں اُن کی علیحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں مگر بہبودی گوارا کرتا ہوں"

یہ مجبورانہ علیحدگی بغرض طلب معاش یوں پوری ہوئی کہ استاد شاگرد ایک قدر شناس کی تلاش میں راہی دکن ہوئے اور استاد شاگرد کو چھوڑ کر قضا و قدر کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود اس دار المحن سے علیحدہ ہو گیا، اور یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔

تیری ہی وادی غربت میں بنے گی اک دن　　اور کوئی نظر آتی نہیں گھر کی صورت　　(امیر)

تقدیر نے کہا شاگرد اسی وادی غربت کو اپنا گھر بنائے گا، اور یہاں اس کی ظاہری و باطنی ترقی کا ایوان رفیع تعمیر پائے گا،

حضرت جلیل نے ۱۹۰۰ء سے لے کر جنوری ۱۹۴۶ء تک (دھیر عمر سے زندگی کے آخر لمحہ تک حیدرآباد میں گذارا، اور اس کو اپنا ایسا وطن بنا لیا جس کو مرنے کے بعد بھی نہ چھوڑا اور وہیں آسودہ خاک ہیں،

مرحوم نے اپنے بعد بہت سے فرزندان معنوی و ظاہری یادگار چھوڑے، فرزندان ظاہری میں بہت سی لائق اور برسر روزگار داعزاز لڑکے ہیں، اور فرزندان معنوی ان کی منظوم و منثور حسب ذیل تصنیفات ہیں،

۱۔ تاج سخن (دیوان اول غزلیات)۔ ۲۔ جانِ سخن (دیوان دوم غزلیات)۔ ۳۔ معراج سخن (نعتیہ دیوان)، (۴) سرتاج سخن۔ (مجموعۂ قصائد)۔ ۵۔ گل صد برگ (سو رباعیوں کا مجموعہ)۔ ۶۔ عطر سخن (مثنوی)، چند کتب رسائل نثر میں بھی ہیں۔ ۷۔ سوانح امیر مینائی ۸۔ تعلیم الصلوٰۃ۔ ۹۔ معیار اردو (محاورات)۔ ۱۰۔ تذکیر و تانیث (اردو الفاظ کی تذکیر و تانیث میں)۔ ۱۱۔ اردو کا عروض (اردو شعر کے مستقل اوزان)۔ ۱۲۔ روح سخن تیسرا دیوان جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے،

حضرت جلیل کو دنیا نے جانشین امیر کہہ کر پکارا، یہ جانشینی حقیقت میں پوری پوری تھی، ظاہری و باطنی دونوں اوصاف کے لحاظ سے وہ جانشین تھے، جزو زہد و تقویٰ، پابندی دین، اور ذکر و فکر و مراقبہ اور خدا رسی استاد نے جیسے دی شاگرد کو دی تھی اسی طرح شاعری کے جو اوصاف اور خصوصیات امیر میں تھے، وہی جلیل میں تھے، بلکہ امیر میں قدیم و جدید کے جو دو رنگ تھے، وہی جلیل میں تھے مرآۃ الغیب کا پرانا رنگ، اور صنم خانۂ عشق کا نیا رنگ جلیل کے قدیم و جدید کلام میں نمایاں ہیں، استاد کا اتنا صحیح تتبع امیر کے تلامذہ میں کم کسی کو نصیب ہوا

جلیل کی شاعری کے خاص خصوصیات کلام کی فصاحت، زبان کی صحت، محاورات کی پیروی، بندش کی چستی، فن کے اصول و فروع کی پوری پابندی اور جملہ کلام کا حشو و زوائد سے یکسر پاک ہونا ہے جس کا اندازہ ان کے ہر شعر سے ہوتا ہے،

موج ہوا حباب کو سنگ گراں ہوئی　　تھے ہی سانس شیشۂ دل چور چور تھا

ہائے اُس عالم آشنا کی نظر　　ہر نظر میں جہان ہے گویا

ہجوم اشک میں ملتا نہیں دل　　مرا یوسف ہے گم اس کارواں میں

غم تو ہے ساقیا شراب نہیں　　آسماں ہے اور آفتاب نہیں

ہمراہ ساتھیوں کے ہمارا یہ حال ہے　　جیسے غبار پس کارواں چلے

بحر جہاں کی سیر بھی ہوتا ضرور ہے　　آہستہ اپنی کشتیٔ عمر رواں چلے

ہے آباد میرے تخیل کی دنیا　　حسیں آ رہے ہیں حسیں جا رہے ہیں

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا　　یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

وہ ذرا مسکرا کر ناز سے / ہاں مری جان پھر اسی انداز سے

فغاں میں درد، دعا میں اثر نہیں آتا / جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں / وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

عاشقانہ کلام کے ساتھ ساتھ صوفیانہ رنگ بھی ان کے کلام میں فراوانی کے ساتھ موجود ہے،

کر چکی ہے آپ کے باہر مجھے اس کی تلاش / یہ سفر اپنا سفر اندر وطن ہو جائے گا

حرم کیا میکدہ کیا سب سے گھبرا گیا / یہی اب جی میں آتا ہے کہ دستک دوں کسی دل پر

ہستی ہے عدم مری نظر میں / سوجھی ہے یہ ایک عمر بھر میں

جانتے ہیں تجھے ہم روزِ ازل سے لیکن / یہ نہیں جانتے کیونکر تجھے ہم جانتے ہیں

راہِ طلب میں ایسا وارفتہ کون ہوگا / منزل پہ ہم پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

کریم کے جو کرم کا ظہور ہوتا ہے / خطا سے پہلے ہی عفوِ قصور ہوتا ہے

حبِ نبوی کا ظہور اُن کے نعتیہ کلام سے ہوتا ہے، ان کی ایک نعتیہ غزل جو ہمیں حیدرآباد دکن کے ایک اخبار میں نظر سے گزری درج ذیل ہے۔

لب پہ جس دم مرے نامِ شہِ بطحیٰ آیا / عمرِ رفتہ پلٹ آئی کہ مسیحا آیا

فرش پر بارشِ انوار تھی معراج کی رات / عرش پر دھوم تھی وہ شبِ اسریٰ آیا

جس قدر وادیِ غربت میں چبھے تھے کانٹے / پھول سب ہو گئے جس وقت مدینہ آیا

یا نبی کہہ کے جو کشتی کا اٹھایا لنگر / وعدہ جو رب نے کیا جوش پہ دریا آیا

ہو گئی بے خودیِ شوق میں طے راہِ دراز / آنکھ کھولی تو نظر گنبدِ خضرا آیا

صرف حبِ نبوی حشر میں کام آئی جمیل / کام بس آئی نہ زہد آیا نہ تقویٰ آیا

آج شاعر بہت ہیں، مگر استاد کم ہیں، جو فن کے مسائل پر کامل عبور رکھتے ہوں، جو تمام اصنافِ سخن پر برابر کی قدرت رکھتے ہوں، جو لفظوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں بلکہ لفظ ان کے ہاتھ میں ہوں، جن کے کلام سے زبان کے الفاظ، محاورات اور امثال کی تصدیق ہو، جن کا دیوان زبان کے سکوں کی ٹکسال ہو، حضرت جمیل اس دور کے جو تیرہ دموزا سے شروع ہوا تھا، بظاہر خاتم معلوم ہوتے ہیں۔ "یہ نیا زمانہ ہے نئی شاعری ہے، نیا دور ہے اور نئے خیالات ہیں، پرانے قاعدے توڑے جا رہے ہیں، پرانے اصول مٹتے ہیں، تشبیہوں اور استعاروں کا کم ہی بے اصولی ہی ہے اوزان میں بھی کمی بیشی ہو رہی ہے، لوحِ دور کے دریا میں بھی تلاطم ہے، ہنرور شعرا اور ہنر پرور بادشاہ میں بھی جو نظام عہدِ عباسیہ سے شروع ہوا تھا اس کو بھی حضرت جمیل اور میر عثمان علی خاں پر اب ختم سمجھئے۔" (بس) "معارف"

سماج

میں چاہتا ہوں ان قدردانوں کے لئے خصوصاً جن کے متعدد تقاضے مجھ پر قرض ہیں اور ایسے احباب کیلئے لازماً جو میرے کلام کے اشد مشتاق رہتے ہیں غیر معمولی طور پر اس خوشخبری کو اہمیت سے دوں کہ حضرت [illegible] بزم ہائے ادب زمرہ [illegible] نہیں بلکہ اپنا قیمتی وقت صرف کرکے میری نظموں کا پہلا مجموعہ "سماج" [illegible] کے آخری [illegible] کی ضخامت کے ساتھ [illegible] شائع کرنے لگے ہیں۔ [illegible] جلد رائج الوقت [illegible] ہے اس لئے خریداروں کے تقدم و تاخر کو ملحوظ رکھا جائیگا [illegible] جہاں تک جلد [illegible] رجوع فرمائیں۔

نیازمند شاد عارفی

مطبوعات

نقش و نقاش از سلطان حیدر جوش۔ مختصر افسانوں کی ابتدا کرنے والے جن فن کاروں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں اُن میں پریم چند کے بعد ہمیں سلطان حیدر جوش اور یلدرم ملتے ہیں۔ پریم چند نے جہاں عوام کی ذہنی کیفیات کی عکاسی کو اپنا مطمح نظر بنایا اور اُن کے رنج و غم میں شرکت کی وہاں جوش اور یلدرم نے درمیانے طبقے اور اس کے ساتھ شباب و نغمہ کی ترجمانی کی۔ آج اگر ہمیں پریم چند اور یلدرم کی سرپرستی حاصل نہیں تو ہمیں مسرت ہے کہ سلطان حیدر جوش آج بھی ہمارے درمیان ہیں اور اپنے مخصوص انداز بیان سے افسانوی ادب کیلئے کوشاں ہیں۔ ہمارے ادیبوں نے ناول کو ایک مشکل صنفِ ادب قرار دے کر پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ گذشتہ سو دو سال کے دوران میں ہمارے بعض ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ناول کی طرف توجہ کی لیکن اُن کی کاوشوں کو ہمارے بعض نقادوں نے طویل افسانے سے منسوب کیا۔ جناب جوش اس سے پہلے ایک ناول "ہوائی" پیش کر چکے ہیں۔ "نقش و نقاش" ان کی دوسری پیشکش ہے ہمیں اُمید ہے کہ ملک اس فن پارے کو قدر کی نظروں سے دیکھے گا۔ زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ ناول اپنے خالق کا بہترین آئینہ ہے پیش لفظ میں جناب جوش فرماتے ہیں میں اس ناول کا نام "ناحشہ" رکھنا چاہتا تھا ـــــ موجودہ صورت میں بھی نام کی تبدیلی سے ناول کی روح میں کوئی فرق نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب جوش عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ضخامت ۱۵۴ صفحات۔ کتابت طباعت نہایت عمدہ۔ مجلد قیمت دو روپے۔ پتہ نظامی پریس بدایوں۔

تار و پود از بلونت سنگھ۔ مختصر افسانے کی دنیا میں آئے دن انقلابات آتے رہتے ہیں۔ کوئی فن کار رینگتا رینگتا بڑھتا ہے تو کوئی ایک ہی جست میں ہماری تمام تر توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ بلونت سنگھ اس دوسری صنف سے تعلق رکھتے ہیں بلونت سنگھ کا پہلا مجموعہ "جگا" شائع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی لیکن ہمارے نقاد اُنہیں صفِ اوّل میں جگہ دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ پنجاب کے اکثر افسانہ نویسوں کی زبان پر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں ہمیں مسرت ہے کہ تار و پود کے مصنف پر یہ اعتراض صادق نہیں آتا۔ زبان کی سلاست اور محاورے کی پابندی کے ساتھ بڑھتے ہوئے تکنیک اور اسلوب کی الجھنوں کو سلجھاتے ہوئے یہ فن کار ہمیں زندگی کی مختلف کیفیتوں کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پندرہ مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ ہر اعتبار سے قابل قدر ہے۔ لطیف طنز اور مزاح سے اکثر و بیشتر افسانے رنگین ہیں۔ بلونت سنگھ کے افسانوں میں پلاٹ کے ساتھ ساتھ جذبات کی نمائش اور پنجاب کے دیہات کا مطالعہ ایک خاص چیز ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ تار و پود کا مصنف اس مقام کا مستحق ثابت ہوگا جو اُسے ہمارے نقاد دے رہے ہیں۔ اور جس پر وہ ایک ہی جست میں پہنچ چکا ہے۔

کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ ضخامت ۲۸۴ صفحات۔ مجلد قیمت تین روپے۔ پتہ مکتبہ جدید لاہور۔

سید منظور حسین بخاری مینجر و پبلشرز نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا
صرف سرورق یونین پریس رام نگر لاہور میں چھپا

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲ - علمی وادبی، تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں -
مسودے کا نہایت صاف اور خُوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ۔

۳ - دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۴ - جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع
یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے بصُورتِ دیگر دفترِ "ہمایوں"
خط وکتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ۔

۵ - "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ
جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتہً مِل سکتا ہے ۔

۶ - منی آرڈر اور خط وکتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے
اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصُورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصُول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۔

مینیجر "ہمایوں"

۳۰ - لارنس روڈ - لاہور

آخر وہ رازِ عشق نہیں ہو گا پھر بھی
وہ ڈھونڈو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگار علامہ مرحوم آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: یوسف ظفر بی۔ اے

فہرستِ مضامین

جلد ۴۹ — نمبر ۵

ہمایوں بابت ماہ مئی ۱۹۴۶ء

سالانہ چندہ	ششماہی	فی پرچہ
عہ (مع محصول)	۳ر	۸ر

بزمِ ہمایوں

آج مدّت کے بعد یہاں آتا ہوں۔ سیاست کا بھوت جو سر پر سوار ہوا ـــــ نہیں یہ غلط ہے، اچھا تو سیاست کا کمبل جو مجھ سے لپٹا۔ اب میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میں بھی شاید کمبل کو پوری طرح اور قطعی طور پر چھوڑنے کو تیار نہیں، کیوں؟ کمبل خوبصورت ہے؟ نرم ہے؟ یا گرم ہے؟ ـــــ نہیں، مجھے یاد آ گیا کہ نپولین کے زمانے میں جب فرانسیسی جرمنی پر چڑھ آئے اور جرمن لگے اپنے وطن کے لئے سینہ سپر ہونے تو صرف لڑنے والوں اور سیاست دانوں نے نہیں بلکہ لکھنے والوں اور پروفیسروں اور طالب علموں تک نے اپنا کام کاج چھوڑ کر میدانِ جنگ میں اُترنا ضروری سمجھا۔ کیا اس وقت ہمارا بھی یہی کچھ حال نہیں۔ آج ہمارے ملک پر اور ہماری قوم پر (کون سا ملک؟ اور کون سی قوم؟) ایک عجیب وقت آ کر پڑا ہے ــ آج اس کی آزادی اور زندگی اور موت کا سوال درپیش ہے۔ آج وہ لوگ جنھیں اپنی روٹی کی فکر نہیں اور کسی فکر والے محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں لڑنا آئے نہ آئے قوم و ملک ہمیں میدانِ جنگ کی طرف بلا رہے ہیں اسی سلسلے میں میں بھی اپنا قلم پکڑے ہوئے اس کارزار میں آ گھسا۔ قلم سے آدمی لڑ نہیں سکتا۔ نہ زیادہ بول سکتا ہے۔ لیکن آخر کچھ تو کرے گا!

آج میں نئی دہلی میں بیٹھا یہ لکھ رہا ہوں۔ ہُوا یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے جلسے اور نئے مسلم ممبران اسمبلی کے اجتماع کے سلسلے میں میں بھی کشاں کشاں یہاں آیا۔ یہ اجتماع ہو کر منتشر ہو گیا۔ لیکن ورکنگ کمیٹی کا جلسہ سنتے ہیں پھر ہونے والا ہے ــ جس میں مجھے بھی شرکت کرنی ہے سو ارادہ تھا کہ میں اس فرصت کے وقت میں لاہور ہو آؤں۔ لیکن اتنے میں ایک دعوت کے اثرات سے متاثر ہو کر بیمار پڑ گیا اور یہاں ٹھہر گیا۔ یہ اس بیماری ہی کا صدقہ ہے کہ آج میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ ورنہ کہاں سیاست کی اہم گو عموماً بے معنی مصروفیات اور کہاں ادب کی یہ نام نہاد خرافات!

مدّتوں کے بعد کل اپنی نیم بیماری کے طفیل مجھے اتنی فرصت ملی کہ اس بنگلے کے خوبصورت چمن میں ایک سایہ دار پہاڑی درخت کے نیچے پہلے بانگِ درا اور پھر بالِ جبریل کی ورق گردانی کروں۔ کیا یہ محض میرے حافظے کی کمزوری کی وجہ تھی کہ میں نے بانگِ درا میں اور خصوصاً بالِ جبریل میں بعض ایسے شعر بلکہ نظمیں پڑھیں جو میرے لئے گویا نئی چیزیں تھیں۔ یا جنھوں نے مجھ پر وہ اثر کیا جو صرف نیا نہ سنا ہوا کلام کر سکتا ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ ہے کہ ہم عموماً ایک مشہور شاعر کی زیادہ مشہور نظموں کی طرف ہی توجہ کرتے ہیں۔ دُوسری وجہ یہ ہے کہ ایک اچھے شاعر کا کلام کبھی پُرانا نہیں ہوتا۔ اس کی عالمگیر سچائی میں ہمیشہ ایک جدّت چھپی ہوتی ہے تیسرے یہ کہ صداقت خصوصاً اس حال میں کہ ہم اسے سمجھنے کو تیار ہوں۔ اور اُسے اپنے دل میں جگہ دینے کے خواہشمند ہوں ہمیشہ دل انگیز ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ سا مہا سبھائی اور بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں سا مسلم لیگی دونوں اقبال کا کلام پڑھتے ہوئے عالمِ بے خودی میں کھو جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ وہ کون سی سیاسی جماعت کے ڈھنڈورچی ہیں ـــــ یہ ہے اقبال کی محبت فاتحِ عالم!

بشیر احمد

جہاں نما

پنجاب یونیورسٹی میں زبان کا مسئلہ

ایک عرصے سے ہماری نظریں ہندوستان کے اُن زعماء پر لگی ہوئی ہیں جو ہندی نوازی کی خاطر کھلم کھلا یا ہندوستانی کے پردے میں اُردو کی مقبولیت پر دانت جمائے بیٹھے ہیں اور اسے مذہبی یا سیاسی عینک سے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ آج ہم اندرونِ خانہ کے اس ادارے پر نظر ڈالتے ہیں جو پنجاب ہی نہیں بیرونِ پنجاب کے کئی علاقوں اور صوبوں کی تعلیمی اور تدریسی صحت کا بھی اجارہ دار ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ تعلیمی نقطۂ نظر سے ملکی زبانوں کی اہمیت کا قرار واقعی لحاظ رکھنا چاہیے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مستقبل قریب میں ان زبانوں سے تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پنجاب میں ان زبانوں کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اس سے پہلے کہ کوئی قدم اٹھایا جائے اس گتھی کا سلجھا لینا قرینِ دانش ہوگا۔

اس مسئلے پر غور کرنے سے پیشتر ہمیں پنجاب میں ان زبانوں کے پس منظر یا ماضی پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم نے تین ورنیکلر زبانوں کو تسلیم کیا ہے یعنی اُردو۔ ہندی اور پنجابی کو۔ لیکن سرکاری اور بورڈ کے مڈل سکولوں میں اُردو ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ جس کی بدولت حکومت کی ذمہ داریاں زیادہ ہلکی اور اقتصادی طور پر کم خرچ ہو گئی ہیں۔ یہ صورتِ حال جس وقتے (جب پنجاب کا محکمہ تعلیم وجود میں آیا) اب تک بدستور قائم ہے۔ حالانکہ اس کے خلاف اس صوبے کی بعض قوموں نے مستقلاً آواز اٹھائی۔ اس سرکار سرپرستی اور ترجیح کی وجہ سے آج پنجاب میں اُردو زندہ ہے اور بعض نامساعد عناصر کے باوجود پروان چڑھ رہی ہے اس کے لئے حکومتِ پنجاب کے محکمہ تعلیم کو داد دینا پڑتی ہے جس نے اردو۔ ہندی اور پنجابی میں مساوات کے دعویٰ کو تسلیم کرنے سے کھلے بندوں انکار کیا۔

پنجاب یونیورسٹی ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی۔ اس سے قبل اُردو اور ہندی ہی دو ایسی زبانیں تھیں جن کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا تھا۔ حالانکہ اردو کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ ۱۸۸۲ء میں یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ایک نیا تعلیمی دستور وجود میں آیا اور انگریزی کو واحد ذریعہ تعلیم قرار دیتے ہوئے پنجاب میں زبانوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ خداوندانِ یونیورسٹی نے پنجابی کو جسے ۱۸۸۲ء میں محض بول چال کی ناپختہ زبان سمجھا جاتا تھا اردو کے مساوی حقوق مرحمت فرمائے۔ کچھ عرصے کے بعد پشتو اور بنگالی کو بھی ان میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح آج اُردو، ہندی، بنگالی، پنجابی اور پشتو پنجاب یونیورسٹی کی تسلیم کردہ جدید ہندوستانی زبانیں ہیں اور سب کو مساوات کا درجہ حاصل ہے۔ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں کوئی فیصلہ باقی زبانوں پر بلا تخصیص و امتیاز اثر انداز ہوتا ہے۔ اور ان کی انفرادی اہلیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

غور کرنے سے یہ امر حیرت انگیز معلوم ہوگا کہ جو مساوات ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں محکمہ تعلیم پنجاب کے نزدیک ناجائز ہے وہ پنجاب یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کے لئے عینِ ایمان ہے۔ جس کا نتیجہ مستقبل کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا پنجاب یونیورسٹی ہمیشہ اس مساوات کے اصول پر کاربند رہے گی یا نہیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو کیا ایک صوبے میں ہر اس مضمون کے لئے جو ملکی زبانوں میں پڑھایا جائے گا چار زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جایا کرے گا کیا ایک تعلیمی ادارے کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایک مضمون کی تدریس کے لئے چار معلم رکھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی اپنے صوبہ کو چار زبانوں کا اکھاڑہ بنانا چاہتی ہے۔ اس صورت میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ محض ایک یا زیادہ سے زیادہ دو کل ہند زبانوں کے بارے میں فیصلہ کیوں نہیں کیا جاتا تاکہ اس قسم کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔ ہر صاحب نظر اس حقیقت کو بلا چون و چرا تسلیم کرے گا کہ معمولی بول چال کی زبانوں کو جو اپنے ادبی سرمائے سے قطعی طور پر محروم ہیں اور ملنگے کے اُجالے کے باوجود اندھیرے میں ہیں کسی یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم نہیں ہونا چاہئے۔ ہم سمجھتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو تعصب کے ہاتھوں مجبور ہیں جانتے ہیں کہ اُردو ہی کو پنجاب یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پنجابی اور پشتو کو مٹا دیا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ انھیں اختیاری زبانیں قرار دے کر اپنے مناسب مقام پر لایا جائے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد اُردو کی فوقیت کو تسلیم کریں اور اس کی حیثیت کے مطابق اسے واحد ذریعہ تعلیم قرار دیں۔ پنجاب یونیورسٹی کا یہ اقدام نہ صرف اُردو کی اس حق تلفی کا ازالہ کرے گا جو اس کے ساتھ گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے روا رکھی جارہی ہے بلکہ اسے ہندوستان کے مستقبل کے سلسلے میں ایسی اہمیت دے گا جو پنجاب بھر کے لئے باعث فخر ہوگی۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری یہ تنبیہ صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی اور اہل یونیورسٹی اس باب میں نظر ثانی کر کے وقت کی ایک شدید ضرورت کو پورا کریں گے۔

یوسف ظفر

رزمِ خیر و شر

رومی اور اقبال کی نگاہ سے

داستانِ میلادِ آدم بہت دلچسپ ہے شاعر اور فلسفی دونوں کے نقطۂ نگاہ سے۔ مگر یہ داستان سادہ ہی رہتی۔ اگر یزدان و اہرمن کی آویزشیں اس میں رنگ نہ بھرتیں۔ قصۂ آدم کو جس چیز نے رنگین بنایا وہ اہرمن کا لہو ہے۔

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

یوں تو رزمِ خیر و شر کوئی نئی چیز نہیں۔ قدیم انسان کی آنکھوں نے بھی یہ ہوشربا مناظر دیکھے ہیں۔ مدتوں اس کا دماغ اس کے لئے ایک حشر آفریں رزم گاہ رہا ہے۔ سابق الفلسفہ نے اس داستان کو ایک نیا رنگ دیا۔ زرتشت، مانی اور مزدک تو اہرمن کو یزدان کا حریف سمجھتے ہی تھے مگر انہوں نے خیر و شر کے جدا جدا دو سلسلے بنا دیئے تھے اور لطف یہ ہے کہ دونوں کو ہم آہنگ بنا کر انہوں نے رزمِ پیکار سے ہی کا سرے سے خاتمہ کر دیا تھا جو اس داستان کی جان ہے۔

حیات خود رزم و پیکار سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب تک خیر و شر کی آویزش ہے۔ حیات بھی ہے۔ ادھر ان کی راہیں الگ ہوئیں ادھر نہ وہ ہما ہمی رہتی ہے اور نہ گرماگرمی۔ قدیم انسان زیادہ عرصہ تک یہ ذہنی آویزش قائم نہ رکھ سکا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اہرمن و یزدان میں سے کسی ایک کو شکست دلا دی جائے۔ اس طرح ذہنی کشاکش بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی تھی۔ اس کی آسان صورت یہی تھی کہ دونوں کو جدا جدا رکھا جائے اور ان میں مصالحت کرا دی جائے۔ کم سے کم دو مخالف قوتیں تو نظر آتی تھیں۔

سامی تصور کا آغاز خیر سے ہوا۔ جب تک اس میں شر کی آمیزش نہ ہوئی۔ خیر میں سکونی کیفیت رہی۔ دریا کی سطح طوفان نا آشنا تھی۔ اور تلاطم خیز موجیں اس کی آغوش میں سو رہی تھیں۔ یہی عالمِ ملکوت ہے جو خیرِ مطلق کی تجلیات کا پرتو ہے۔ حالت یہ ہے

بل عباد مکرمون، لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون۔ (سورۂ انبیا)	وفا شعار اور اطاعت گزار بندے ہیں جو بے چون و چرا فرمانِ الٰہی کے سامنے گردنیں خم کر دیتے ہیں اور جو کچھ امر فرمایا جاتا ہے بجا لاتے ہیں۔

فرشتوں کی دنیا بھی کیسی خاموش دنیا ہے۔ نہ اس میں حرکت ہے اور نہ ارتقا۔ پرامن اور سکون آفریں۔ ہر فرشتہ کا ایک معین فرض ہے۔ ہر ایک کا ایک خاص مقام ہے۔ ما منا الا لہ مقام معلوم۔ سنگی مجسموں کی طرح سب اپنی اپنی جگہ نصب ہیں۔ اور مشینوں کی طرح اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنی فرصت کہاں کہ نظر اٹھا کر دیکھیں برابر ہی ہمدم دیرینہ کیا کر رہے ہیں۔ اقبال نے ابلیس کی زبانی اس عالمِ بے کاخ و کو کی خاموشی کا ذکر بھی کیا ہے تو کس قدر دلفریب۔

اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو

منبع خیر وجود بھی اس موت کے سے سکوت اور مشین کی سی بے بسی سے کچھ اکتا سا گیا۔ فقط اللہ ہو، اللہ ہو کی نغمہ بار صدائیں بے مزہ ہوگئیں۔ اس سکون پرور دنیا میں طوفان لانے کی فکر ہوئی۔ تو ملاءِ اعلیٰ سے مشورہ کیا گیا۔ کہ ہم ایک جہان رنگ و بُو پیدا کرنا چاہتے ہیں ؎

ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو
سوز و ساز و درد و داغ و آرزو و جستجو

لیکن کیا یہ جہان رنگین اسی سالے سے تعمیر ہو سکتا تھا جو پہلے سے موجود تھا۔ سکون سے فتنے بیدار کرنا ممکن نہ تھا۔ دریا کی ساکن سطح میں ہوا ہی سے طوفانی موجیں لائی جاتی ہیں۔ یہیں سے شر کا آغاز ہوا۔ فتنہ کی تاریخ کا باب اول یہی ہے۔ فلسفی کہتا ہے کہ عقل و خرد کو جو اس سے پہلے صرف 'نعم' کہنا ہی جانتی تھی 'لا' سے بھی آشنا کیا گیا۔ اس طرح جرأتِ رندانہ کا ہیولیٰ تیار ہوا۔ باغیانہ جراثیم نے اس طاعت کوش جماعت میں پرورش پائی جو سر تسلیم خم کرنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ طاعت و معصیت کے خمیر سے آدم کا پیکر تیار ہوا۔ تو اس میں عقل و ہوش کے ساتھ ساتھ عشق و بیخودی کے عناصر بھی سمو دیئے گئے ؎

چشمِ آدم کو بنورِ پاک دید   جان و سر ہا جہاں گشتش پدید

خیر و شر دو مفہوم ہیں اور نرے مفہوم ہیں۔ ان میں باہمی تعلق سے پیکار کا آغاز ہوا۔ نور و ظلمت شاید ان دو نو مفہوموں کا اولیں مظہر ہیں۔ ان میں بھی آویزش کا فقدان ہے جب تک چولی اور دامن کی طرح انھیں ساتھ ساتھ فرض نہ کیا جائے نور و ظلمت کی دست و گریبانی ان کے باہمی ملاپ کا نتیجہ ہے۔ زہر سانپ کے لئے وہ جوہر ہے جس سے اس کی ذات کمال پاتی ہے لیکن یہی زہر اگر انسان کے رگ و پے میں دوڑا دیا جائے تو وہ اس کی جسمانی ساخت کو شکست کر کے رکھ دے ؎

پس بدِ مطلق نباشد در جہاں   بد بہ نسبت باشد ایں را ہم بداں
در زمانہ ہیچ زہر و قند نیست   کاں یکے را پا دگر را بند نیست
زہر مار آں مار را باشد حیات   نسبتش با آدمی باشد ممات

زہر سے زیادہ اور قاتل چیز کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی حقیقت بھی اپنی جگہ شر نہیں۔ معصیت بدترین گناہ ہے۔ شیطان اسی معصیت کی وجہ سے بارگاہ خداوندی سے نکالا گیا۔ لیکن ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہے۔ معصیت ایک طرح کا انکار ہے۔ یہ 'لا' کی ایک صورت ہے۔ جس کی ترکیب میں انانیت کے اجزا بھی ملے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں معصیت "لا" نہیں بلکہ 'نعم' ہے۔ ابلیس نے کہا تھا۔

من 'بلیٰ' در صورتِ 'لا' گفتہ ام   گفتۂ من خوشتر از نا گفتہ ام

اس سے عاصی اپنی ذات کا اثبات کرتا ہے۔ طاعت نفی ذات ہے۔ خودی کے باطنی جوش کا اظہار معصیت ہے۔ بغاوت معصیت کی ایک بدترین قسم ہے۔ جس میں ہولناکی معصیت کے مقابلہ میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ مگر اس کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ قہرمانی طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ پستی سے بلندی کی طرف ابھرنے کا ایک بے پناہ ارادہ۔ طلب آزادی کے لئے ایک سچی تڑپ۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک جذبہ بھی ایسا نہیں جسے شر کہا جا سکے۔ شر دراصل حقیقت نہیں بلکہ کسی حقیقت کا غلط اور بے محل استعمال ہے۔ حقائق سب خیر ہیں جن میں خیر مطلق کی پرتو افگنی نے وجود کے سرمایہ سے سرفراز کیا ہے۔ معصیت جیسا بدترین گناہ بھی کہیں کہیں طاعت ہے۔ صورت کے اعتبار سے وہ معصیت ہی ہے۔ یہ

دوسری بات ہے کہ اہل علم اسے معصیت نہ کہیں۔

وان جاہداک لتشرک بہ مالیس لک بہ علم فلا تطعہما۔ — والدین اگر مجبور کریں کہ خدا کا شریک وانباز نہ بناؤ تو تم ہرگز ان کا کہنا نہ مانو۔

دراصل مقامات اور احوال کے اختلاف ہی سے کفر و ایمان اور سود و زیاں کا اختلاف رونما ہوا۔ اگر حالات میں اختلاف اور رنگا رنگی نہ ہو تو کفر و ایمان کی آویزش بھی نہ رہے۔ حکیم سنائی کا شعر ہے ؎

کفر و دین ہست در رہت پویاں — وحدہ لاشریک لہ گویاں

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

نکتۂ دیگر تو بشنو اے رفیق — ہمچو جاں او سخت پیدا و دقیق

در مقامے ہست ایں ہم زہر مار — از تصاریف خدائی خوشگوار

در مقامے زہر و در جائے دوا — در مقامے کفر و در جائے روا

مقامات کی دریافت اور ان کے اختلافات کا درک تنہا عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ دشوار منزل ہے جہاں پائے زیرکی بھی لنگ ہے۔ اس راہ میں رہنما کی ضرورت ہے۔ وہ رہنما ذوق، وجدان یا عشق ہے۔ عشق و زیرکی کا امتزاج ان تمام خطرات سے بچا لیتا ہے جو اس راہ میں پیش آتے ہیں۔ ہر آزادی کے لئے یک گونہ پابندی درکار ہے۔ نری آزادی جسے پابند آئین نہ بنایا گیا ہو آزادی نہیں بلکہ تباہی و بربادی ہے۔ بے شبہ خودی کی تربیت آزادی سے ہے۔ لیکن اس آزادی کے لئے آئین اور اخلاق کی پابندی بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود آزادی۔ محض آزادی جس سے تمام پابندیاں اور قیود کی حد بندیاں اٹھالی گئی ہوں ایک طرح کا اخلاقی یا مابعد الطبیعاتی مزاج ہے۔ زیرکی جسے آئین عشق کی قید سے بھی آزاد کر دیا گیا ہو مذہب کی اصطلاح میں شیطان ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

لیک میداند ہر آں کو محرم است — زیرکی ابلیس و عشق از آدم است

یہ اس نری زیرکی ہی کا اثر ہے کہ شیطان ان مصالح کی تہ تک نہ پہنچ سکا جو خلق آدم کی مقتضی تھیں ؎

علم بودش چوں نبودش عشق دیں — او نہ دید از آدم الا نقش طیں

گرچہ دانی دقت علم اے امیں — زانت نکشاید دو دیدۂ غیب بیں

زیرکی دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جو آزادی سے محروم ہے۔ جس نے اپنی ہستی کو بالاتر ہستی میں فنا کر دیا ہے۔ اور جو کسی منفرد خودی کی حامل نہیں۔ یہ زیرکی فرشتہ ہے جو صوفیا کی اصطلاح میں 'لا' کا مظہر اتم ہے۔ دوسری زیرکی آزاد اور با اختیار ہے۔ اور اس نے اپنی انفرادی ہستی اور ذات سے الگ قائم بھی رکھی ہے۔ یہ ابلیس یا شیطان ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عقل جزوی عشق را منکر بود — گرچہ بنماید کہ صاحب سر بود

زیرک و دانا ست اما نیست نیست — تا فرشتہ لا نشد اہرمنی ست

او بقول و فعل یار ما بود — چوں بحکم حال آید 'لا' بود

مولانا نظیری نیشاپوری کا ایک شعر ہے ؎

کہ و انانیت از سجود ابا — ہست ابلیس نیست بود ایں جا

یہ امر بھی کچھ کم دل چسپ نہیں کہ شیطان ہر چند آزاد ہے اور اس کی بے راہ روی بھی آزادی ہی کی وجہ سے ہے۔ لیکن وہ خود یہی سمجھا کیا کہ چونکہ اس کی قسمت میں آدم کو سجدہ کرنا نہ تھا اس لئے وہ بے راہ اور امر یزداں سے باغی ہوا۔ شاید قرآن شریف کی اس آیت میں بھی شیطان کے اس عذر لنگ کی طرف ایک اشارہ سا کیا گیا ہے۔

بما اغویتنی لاقعدن لھم صراطک المستقیم (سورۂ اعراف) — (اے ایزد توانا) تو نے مجھے بے راہ کیا ہے اس لئے میں تیری راہ راست سے تیری مخلوق کو بھی گمراہ کروں گا۔

ضرب کلیم میں علامہ اقبال نے تقدیر کے عنوان سے شیطان کے اس غلط تصور کو پیش کیا ہے۔ اور پھر بارگاہ خداوندی سے اس کا یہ جواب ملا ہے ؎

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے — کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام — ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

شیطان کے باب میں رومی اور اقبال کے تصور میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ دراصل شیطان علم اور آزادی کا جامع ایک آتشیں پیکر ہے۔ نقاش ازل نے اس کے نقش کو انہی دو رنگوں سے تیار کیا ہے۔ یہ دو صفات گویا تانا بانا ہیں اس کی ہستی کا۔ ان میں سے ایک رنگ یعنی زیرکی کو رومی نے ذرا زیادہ چمکا کر پیش کیا ہے۔ اور اقبال نے حریت فکر یا آزادی کو کسی قدر گہرا کر دیا ہے۔ یہ فرق و امتیاز فن کار کے رجحان طبع کا غماز ہے۔ ورنہ نقش وہی ہے اور رنگ بھی قریب قریب وہی ہیں۔ پیام مشرق کی ایک نظم میں ابلیس نے اپنی فطرت کے یہ جوہر بتائے ہیں ؎

نوریٔ ناداں نیم سجدہ بآدم برم — او بہ نہاد است خاک من بنہاد آذرم
می تپد از سوز من خون رگ کائنات — من بہ دو صرصرم من بہ غو تندرم
از زد من موجۂ چرخ سکوں ناپذیر — نقش گر روزگار تاب دہیت جوہرم
پیکر انجم ز تو گردش انجم ز من — جاں بجہاں اندرم زندگیٔ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم — تو بہ سکوں رہزنی من بہ تپش رہبرم

بظاہر یہ ایک نعرۂ پندار ہے۔ لیکن حقیقت بیں جانتے ہیں کہ یہ حقیقت کا اظہار بھی ہے اور اظہار حقیقت کبھی معیوب نہیں سمجھا گیا۔ ہمارے ادبی سرمائے میں بیشمار الفاظ ہیں جنھیں ذرا سی بے باکی کے باعث باغی قرار دے دیا گیا ہے۔ ان میں سے پندار اور اس کے ہم معنی الفاظ انانیت، خودی اور خودبینی بھی ہیں۔ ان الفاظ کے معنی اپنی جگہ نازیبا نہیں اور نہ ان میں بدی یا ناپسندیدگی کا شائبہ ہی ہے۔ نطشے وغیرہ حکما کا خیال ہے کہ منفی فلسفہ کے چلن نے اس قسم کے بہت سے الفاظ پر کچھ سیاہ دھبے ڈال کر ان کو بدنما بنا دیا ہے۔ ان الفاظ کی آپ بیتی بہت دل چسپ ہے جس میں قوموں کی ذہنی پستی اور ان کی ثقافتی زبوں حالی کی داستانیں پنہاں ہیں۔ پندار کے سیدھے سادھے معنی ہیں اظہار نفس اور اثبات خود۔ ان میں سے کوئی ایک مفہوم بھی ایسا نہیں جسے بھدا یا بدنما کہا جائے۔ اظہار ذات ہی تو ہے جو اس وسیع کائنات کی آفرینش کا سبب ہے۔ ایک روایت مشہور ہے کہ خدا نے اس عالم کو خلق ہی اس لئے فرمایا کہ اس کے گوناگوں امکانات کا اظہار ہو اور اس اظہار و بیان سے اس کا عرفان حاصل کیا جائے۔

لہ الکبریاء فی السمٰوٰت والارض — زمین و آسمان کی پہنائیوں میں اسی ذات واحد کے لئے شکوہ و جلال کا ظہور ہے

البتہ امر الٰہی کے سامنے استکبار اور اس سے انکار شیطان کے کردار کی دو خصوصیات ہیں جنھوں نے اُسے شیطان بنایا قرآن شریف میں بھی ان ہی دو باتوں کی وجہ سے کافر قرار دیا گیا ہے ۔ ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین ۔ لیکن اقبال نے اس انکار کو بھی اس کے کردار کی بلندی تصور کیا ہے اور اس کے اسباب بھی ہیں ۔ اقبال کی نگاہ میں اس انکار کی حقیقت صرف اتنی نہیں کہ شیطان امر یزدانی سے سرتابی کرنا چاہتا تھا یا ایک مشت خاک کے حضور میں سجدہ ریزی سے عار تھی بلکہ وہ اپنی ذات کی کمتری کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا چاہتا تھا ۔ آدم کے سامنے سر نیاز خم کر دینے سے آدم کی فطرت سوز دروں سے محروم ہو جاتی تھی ۔ اپنے جوہر کی تب و تاب سے آدم میں تپش حیات پیدا کرنے کی صورت یہی تھی کہ اس کے سامنے نیاز مندی کا اظہار نہ کیا جائے ۔ آدم کی ہمدردی میں اس نے قہر بلا کے تلخ جرعے گوارا کر لئے اپنی زشتی آشکار کی ۔ مگر آدم کو ذوق ترک و اختیار سے شادکام بنایا ؂

تا نصیب از درد آدم داشتم — قہر یار از بہر او نگزاشتم
شعلہ ہا از کشت زار من دمید — او زمجبوری بہ مختاری رسید
زشتی خود را نمودم آشکار — با تو دادم ذوق ترک و اختیار

شیطان نے نافرمانی سے آدم کو بھی عصیان کا سبق سکھایا اور اسے اس لذت سے آشنا بنایا جس سے اگر وہ محروم رہتا تو اس کے باطن میں جذبہ و شوق کی بجلیاں کبھی نہ کوندتیں ۔ شیطان آدم کی کائنات کا سوز دروں ہے ۔ اس کی زندگی کا راز ہے ۔ اس کی بزم کی رونق ہے جس نے اس کے باطن میں فتنے جگائے اور نئے نئے ہنگاموں سے اس کی ہستی کو شرر ساماں بنایا ۔ اس کا اولیں درس جو اس نے آدم کو دیا ملاحظہ فرمایئے ؂

ہیچ نیاید ز تو غیر سجود و نیاز — خیز چو سرو بلند اے بعمل نرم گام
کوثر و تسنیم بُرد از تو نشاط عمل — گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام
قطرۂ بے مایۂ گوہر تابندہ شو — از سر گردوں بجنبت گیر بدریا مقام
تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل — چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام

یہ شاعرانہ بے دینی نہیں بلکہ حقیقت کی صحیح تعبیر اور آیت قرآن کی بھی تفسیر ہے ۔ وہ آیت یہ ہے ۔

ھل ادلک علیٰ شجرۃ الخلد و ملک لا یبلیٰ ۔ — (اے آدم!) کیا میں تمھیں حیات دوام کے درخت اور ملک ناتمام کی راہ نہ بتاؤں ۔

یہ بات کہ "حیات دوام سوختن ناتمام ہے" آدم نے کہاں سے سیکھی؟ اسی انکار اور عصیان سے جسے مایۂ شر بتایا جا رہا ہے ابلیس نے یہ راز کی بات آدم ہی سے نہیں کہی بلکہ اپنے ہمدم دیرینہ یعنی جبریل کو بھی اس سے آگاہ کرنا چاہا تھا ۔

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے — کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبُو

اور جب جبریل نے اس پر طعن کیا کہ ؂

کھو دیئے انکار سے تو نے مقامات بلند — چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

تو اس نے یہ راز کھول کر رکھ دیا ؂

ہے مری جرأت سے مشت خاک میں ذوق نمو — میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر — کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو

عشق بھی ہے دست و پا ایسا بھی بے بخت ہوا — پیر سلطاں یم بہ یم، دریا بدریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے — قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح — تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

شیطان آدم کا ایک حصہ ہے۔ اور ایسا ہی ایک حصہ ہے جیسے فرشتہ۔ شیطان اور فرشتہ کی ترکیب سے پیکرِ آدم کی تعمیر ہوئی۔ اس لئے خیر و شر کی رزمگاہ دراصل آدم کی فطرت ہے۔ آدم کی تمام ترقیاں اس باطنی رزم و پیکار ہی کی رہینِ منت ہیں۔ شاید اسی حقیقت کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ شیطان انسان کے پیکر میں رواں دواں ہے جیسے رگوں میں خون۔ یہیں سے یہ راز بھی آشکار ہوا کہ آدم کو خدا نے تمام اسماء اور صفات کا علم عطا فرمایا تھا۔ لیکن فرشتے جو صفات سے آگاہ نہ تھے۔ اس لئے آزمائش کے وقت ناکام رہے اور بہت سی اشیاء کے نام تک نہ گنا سکے۔

خیر و شر جدا جدا کچھ نہیں۔ دونوں قرار و سکون کے دو مظہر ہیں۔ ان دونوں کے امتزاج سے حیات کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ زندگی درحقیقت ان کے امتزاج اور آمیزش سے ہے۔ ان کے اختلاط سے ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔ جسے ہم نہ خیر ہی کہہ سکتے ہیں اور نہ شر۔ یہ آدم کا مایۂ حیات اور اس کا جوہرِ اصلی ہے۔ اقبال نے اس جدید مخلوق کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

خدا نے اس مخلوق کو اپنا جانشین بنایا جو باغی ہے جس میں یہ جرأتِ رندانہ بھی ہے کہ اپنے خالق ہی سے سرتابی کرے۔ یہ کائنات کا ایک دقیق راز ہے۔ شوخ اور بیباک نقش کی جاذبیت کچھ وہی محسوس کر سکتے ہیں جو آشنائے لذتِ شکست بھی ہیں اور تو اور شیطان بھی اس لذت کے تصور سے بے چین ہو کر پکار اٹھتا ہے ؎

اے خداوند صواب و ناصواب — من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت
صیدِ خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ — سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست — لذتے شاید کہ یابم در شکست

فرشتوں کی اطاعت شعاری سے اکتا کر ہی شیطان کی تخلیق ہوئی تھی۔ اور پھر شیطان اور فرشتہ کی ترکیب سے ایک نئی مخلوق کا نیا نقش تیار کیا گیا تھا۔[1] اب شیطان اس سے نالاں ہے کہ انسان آسانی کے ساتھ اس کے دامِ تزویر میں پھنس جاتا ہے۔ رونقِ حیات کارزار سے ہے اور اس کی گرمی سرتابی کی چنگاریوں میں آشیانہ بنائے ہوئے ہے خیر و شر کی آویزش کو برابر قائم رہنا چاہیئے۔ اگر یہ نہیں تو ایک دوسری دنیا پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی جو برابر شیطان سے برسرِ پیکار رہے اور اس کی فریب کاریوں کا شکار نہ ہو سکے ؎

جس کی نومیدی سے ہے سوزِ درونِ کائنات — اُس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

شوکت سبزواری

---

[1] اس سلسلہ میں نظیری کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بر البشر یا قوی ملائکہ اند — جز دو گل راست در سجود اینجا
نزد تو جبریل وحی آورد — عقل برقع ز رخ کشود اینجا
موفقا فرمائے ہیں ؎ — موسیٰ و فرعون در [illegible] نشست
بایداین دو خصم را در خویش جست

خدا

میں نے کب دیکھا تجھے رُوئے ابد
ان گنت گھرے خیالوں میں ہے تیرا مرقد
صبح کا شام کا نظارہ ہے
ذوقِ نظارہ نہیں چشمِ گداگر کو مگر

میں نے کب جانا تجھے روحِ ابد
راگ ہے تو یہ مجھے ذوقِ سماعت کب ہے
مادّیت کا ہے مرہون مرا ذہن ... مجھے
چھو کے معلوم یہ ہو سکتا ہے شیریں ہے ثمر
اور جب پھول کھلے اس کی مہک اڑتی ہے
اپنی ہی آنکھ ہے اور اپنی سمجھ کس کو کہیں ... تو مجرم

میں نے کب سمجھا تجھے روحِ ابد
خشک مٹی تھی مگر چشم زدن میں جاگی
اسے بے تاب ہوا لے کے اُڑی
پھر کنارہ نہ رہا کوئی کنارہ نہ رہا
بن گیا عرصۂ آفاق نشانِ منزل
زور سے گھومتے پہیئے کی طرح

ان گنت گھرے خیال ایک ہوئے
ایک آئینہ بنا
جس میں ہر شخص کی اپنی تصویر
اپنے ہی رنگ میں اک لمحہ دکھائی دی تھی
ایک لمحہ کے لئے
بن گیا عرصۂ آفاق نشانِ منزل

میں نے دیکھا ہے تجھے —— روحِ ابد
ایک تصویر ہے — شب رنگ — مہیب
درِ معبد پہ لرز اٹھے ہر اک کے پاؤں
ہاتھ ملتے ہوئے پیشانی جھکائے دونوں

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصور کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں
چشمِ ظاہر کے لئے خوف کا عکسِ مرقد
اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

میراجی

خطِ مستقیم اور قوسیں

پے درپے مقابلے کے چھ امتحانوں میں ناکام سعادت ٹیلر ماسٹر کی دکان پر کھڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کپڑوں کے اعتبار سے کمیشن کے ممبروں کو یقین دلانا ضروری ہے۔ اور اسی لئے اس نے اپنا سوٹ باسط کے ہاں سلوایا تھا۔ اس نے دکان پر کھڑے ہو کر زد لوٹائپ میں لکھے ہوئے بورڈ کی طرف دیکھا ——— "باسط، لندن ڈپلومیڈ کٹر، ...."

دکان میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے دائیں اور بائیں جھانکا۔ اس کے دل کے کسی کونے میں خواہش تھی کہ اس کی جان پہچان والا کوئی شخص اُسے باسط کی دکان میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لے۔ باسط کٹنگ کے لحاظ سے بڑا استاد تھا کٹنگ کی انگریزی فرم کے علاوہ کوئی اس کا لگا نہ کھاتا تھا۔ اور شہر کے سب درزی اس کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ لیکن اس وقت بازار میں دفتر جانے والوں کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور وہ دفتر والے انٹرویوں کی حد سے گزر چکے تھے۔ وہ اس وقت باسط یا ماجد کی دکان پر کیوں آتے؟

لیکن اب انٹرویو سعادت کے لئے ایک عام چیز ہو چکے تھے۔ اگرچہ اچھے سوٹ کا خیال اس بات کو جھٹلاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار اور صرف ایک بار وہ اچھی "نال" والی تپلون اور گردن پر جم کر آنے والا کوٹ پہن کر کمیشن کے سامنے چلا جائے۔ اس کے بعد چاہے وہ لیا جائے یا نہ لیا جائے اس میں اس کا کوئی قصور نہ ہوگا۔ وہ اپنے سر سے ایک خوبصورتی کے ساتھ ایک الزام ہٹانا چاہتا تھا .... دکان پر جاتے ہوئے اس نے باسط کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر تموّل کے آثار نظر آتے تھے۔ سعادت کو دیکھتے ہی باسط ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکا ———

"اوہ ——— آیئے ——— آ .... پ رک کیوں گئے؟"

"یونہی" سعادت نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کہئے میرا کام ہوا یا نہیں؟"

"جی ہاں ——— اتنے تنگ وقت کے باوجود ...."

"تو لایئے، دیجئے .... مجھے کہیں پہنچنا ہے۔"

ماسٹر باسط نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "صرف بٹن ٹانکنے ہیں آغا صاحب ———"

"اوہو!" سعادت نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ "درزیوں کی یہ عادت نہ گئی ——— کہ بس صاحب ایک سیکنڈ کا کام ہے۔ بس ہے سیکنڈ کا، اور وہ سیکنڈ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جاتا ہے۔ درزی خواہ لندن سے کام سیکھ آئے یا ٹورنٹو سے یہ "سیکنڈ"

باسط نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "گستاخی معاف آغا صاحب، آپ جانتے ہیں کہ سوٹ کا کپڑا ہمیں وقت پر مل گیا تھا۔ ن ماسٹر کے لئے اٹیلین آپ دو دن کے بعد دینے آئے تھے، اور وہ بھی دو ڈھائی بجے کے قریب۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ میرا دن ہاپ کے ذمہ پڑا ...."

"اچھا، اچھا" ——— سعادت نے خاموش ہوتے ہوئے کہا۔ "اب آپ باتوں میں زیادہ وقت نہ لگایئے ... اس کا بگر

کو کہئے بٹن ٹانک دے۔"

باسط نے ایک کی جگہ دو کاریگروں کو سعادت کا سوٹ دے دیا اور کہا صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ یہ کام پلک جھپکنے میں ہو جائے گا" اور اس کے بعد ماسٹر باسط نے بڑے احترام سے آغا سعادت کو دکان کے اندر بٹھا دیا۔ خدا جانے اس جگہ پر بٹھانے کے لئے باسط کی طرف سے اہتمام ہوا تھا یا گیا لیکن یہ بات درست تھی کہ وہاں سے دکان کا کونہ کونہ نظر آتا تھا۔ اور تمام وہ تصویریں جن میں اچھے سے اچھے سوٹوں میں ملبوس اکثر نوجوان انگریز کسی خوبصورت بلانڈ یا برونیٹ کے ساتھ ہو، خوری کے لئے جا رہے تھے نظر آ رہے تھے۔ سامنے چار خانے کے ہنٹنگ کوٹ اور بلیس نور میں کوئی صاحب گولف کی چھڑی کو کندھوں سے اوپر اٹھائے دکھا دیتا تھا۔ ایک بڑی سی تصویر میں کارنروں کی ڈائنا اپنے کتے کو تھامے کھڑی نظر آتی تھی۔ اور اس کا گاؤن ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ اور ڈائنا کا جسم لباس میں ہونے کے باوجود لباس سے علیحدہ نظر آتا تھا۔ اس کی پوشاک میں بظاہر درزی کی قدرت سے زیادہ خدا کی قدرت نظر آتی تھی۔ لیکن چونکہ ہر کاریگر کا مقصد خالق کی قدرت کو سامنے کرنا اور آپ خالق کے انداز میں چھپ جانا ہے۔ اس لئے کسی ہوشیار کاریگر نے احتیاط کے ساتھ ایک بے احتیاطی سی پیدا کی تھی۔ ورنہ اگر وہ تصویر صرف خدا کی ہوتی تو باسط ——— لنڈن ڈپلومیڈ کٹر.... "کی بجائے شہر کے کسی کلال خانے میں ہوتی۔

اور یہ ڈائنا کی تصویر پر ہی موقوف نہیں تھا۔ جہاں سعادت بیٹھا تھا وہاں سے شیشوں کے اندر قد آدم مجسمے نظر آتے تھے۔ جو اتنے سرخ سپید اور چپ تھے کہ ان سے ڈر لگتا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ چپ تھے۔ اگرچہ بولتے تھے! تمام کے تمام مختلف شیڈ کی لیڈی ہلٹن پہنے اپنے سراپا کو دیکھ رہے تھے۔ اور ان کے قریب ان بے آوازوں کی آواز، ماسٹر باسط فیتے کو بے پروائی سے گلے میں ڈالے، ڈائنا اور لیڈی ہلٹن سے بے خبر، اپنا حساب کتاب کر رہا تھا۔

ابھی دن شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ بل بھی وصول ہونے لگے۔ دو تین آدمی تو اس خاموشی کے ساتھ ہاتھ میں پیسے تھما گئے کہ وہاں چور بازار ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اگرچہ وہاں ایسا بازار ہونے کی گنجائش نہ تھی صرف سینے سلانے کا کام تھا۔ شاید اچھی دکان کی نشانی یہی تھی کہ اس کے چور بازار ہونے کا پتہ چلے۔ سعادت کے دیکھتے دیکھتے ماسٹر باسط نے دو اڑھائی سو روپے اپنے رول ٹاپ کی میز کے ایک ڈبے میں رکھ دیئے۔ اور ٹاپ کو کھینچ کر میز کی سطح کے برابر کر دیا۔ اگرچہ چابی گچھے میں تالے کے اندر لٹکی رہی۔ ان روپوں میں ساٹھ روپوں کا سعادت خود اضافہ کرنے والا تھا۔

سعادت جھلا گیا۔ آخر اس نے کیا گناہ کیا ہے جو اسے روپے نہیں ملتے۔ وہ انٹرویو میں کامیاب نہیں ہوتا۔ سوچتے سوچتے وہ صرف یہی سوچ سکا ——— آخر ماسٹر مجھے ممنون کرنے کے لئے میرا سوٹ جلدی نہیں تیار کر سکتا تھا۔ وہ ایک کاریگر کو زیادہ عرصہ بٹھا لیتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نا کہ اسے چار چھ آنے اوور ٹائم کے دینے پڑتے۔ لیکن مجھے تو چیز وعدے پر مل جاتی۔ شاید باسط ——— لنڈن ڈپلومیڈ ——— ہونے کی وجہ سے کاریگروں کو وقت پر بلاتا اور وقت پر چھٹی دیتا ہے۔ لیکن لنڈن سے ڈپلوما اس نے کپڑا کاٹنے کے سلسلے میں حاصل کیا ہے۔ وقت کا ڈپلوما تو اپنا ہی ہے۔ اور اسے کاریگروں کی نسبت اپنے گاہکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہیئے۔ حالانکہ کام کرنے والوں کے اوقات، سرکاری طور پر تصدیق ہونے کے بعد ڈائنا کی تصویر کے نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ تاہم اس وقت سعادت شاپ اسٹنٹس ایکٹ کی بابت غور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

پیسے کو میری زندگی میں دخل ہی نہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ سعادت نے پھر سوچا۔ اور اب وہ باسط کی دکان سے باہر اس سرمئی سیاہ سڑک پر دیکھنے لگا جو سیدھی کیشن کے دفتر تک چلی گئی تھی۔ جیسے کسی نے پیمانہ رکھ کر اس دکان اور دفتر

ے درمیان پون ایک میل لمبا سیدھا خط کھینچ دیا ہو۔ سعادت نے غنودگی کی سی حالت میں پہلے اپنے سوٹ اور پھر اس سیدھی سڑک
طرف دیکھا۔ گویا وہ اتنے اچھے کپڑے پہن کر اس سیدھی سڑک پر چلتا ہوا گیارہ بجے کیمش کے دفتر میں پہنچ جائے گا۔ ادھر مہینے
پہلے سے اڑھائی سو روپے جیب میں ڈال لیا کرے گا۔

پھر سعادت کو خود ہی چپکے سے "کے لفظ پر اعتراض ہوا۔ شاید اس لئے کہ رول ٹاپ پھر اٹھا لیا گیا تھا اور ایک خانے میں مزید
روپے ڈالے گئے تھے اور باسط مسکرا رہا تھا اور سعادت بوکھلا رہا تھا۔ سوٹ قریب قریب تیار تھا۔ ۔ ۔ سعادت نے اپنی سبز
یٹ کو ماتھے پر سرکایا اور باسط کے مخروطی ہاتھوں کو نوٹ گنتے ہوئے دیکھا ـــــ سعادت نے سوچا ـــــ "اگر میں ٹیلر ماسٹر ہوتا:
کھنڈے!" ماسٹر باسط نے اپنے ایک شاگرد کو پکارا۔

ایک شاگرد سامنے آیا جس کا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ وہ بہت دبلا پتلا اور نحیف و نزار تھا۔ اس نے گلوبند کے گرے ہوئے
پلے کو گلے میں ڈالا اور کٹے ہوئے ہونٹ کے احساس کی وجہ سے نیچے کا ہونٹ اوپر کے ہونٹ کے ساتھ بھینچنے لگا۔ اس نے گلوبند
میں تھوڑا سا منہ چھپایا اور بولا۔ "جی! بس تیار ہے۔" اور کھنڈے کے کانوں میں طلائی بیربلیاں تھیں۔ وہ مسلمان تھا۔ لیکن
وہ ہندوانہ سونے کی بیربلیاں اس کے کانوں میں ایک ایسے سوال کی صورت لٹک رہی تھیں جس کا جواب ہمارے ہندو اور مسلمان
لیڈر دینے کے ناقابل تھے۔ "شام کے صاحب کی طرح اپنے منہ سے نکلتے ہوئے بھاپ کو دیکھتے ہوئے کھنڈا بولا ـــــ "صبح سے
انگلیاں سیدھی نہیں ہوئیں۔" اور اس نے انگلیوں کو دبایا اور بولا۔ "پھر بھی آغا صاحب کو ساڑھے دس بجے سوٹ پہنا دوں گا۔"

سعادت نے خوشنودی کے اظہار میں سر ہلایا۔

ماسٹر باسط نے رول ٹاپ کے قریب ایک صاف سطح پر فلالین ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے فلالین پر ایک سفید خط
ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاں، بس مجھے یہی کہنا تھا۔"

سعادت اپنی جگہ اور اس کے ماحول کی منظم سازش سے نکلا۔ آخر اسے اور سوٹ تو سلوانا ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہ وہاں سے
اٹھ کر دکان سے باہر چوبی تختے پر ٹہلنے لگا۔ اور بازار اور باہر کی غیر منظم چیزوں کو دیکھنے لگا۔ بے ربط شور سننے لگا۔ دفتر جانے والوں
کے ساتھ اب سکول کی چھوکریاں بھی نکل آئی تھیں۔ اور اپنے سبک پاؤں پر پھسلتی ہوئی کیمش کے مخالف سڑک پہ چلنے لگیں۔ کہیں
کہیں ایک دو جوڑے شاپنگ کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے تھے۔ چمڑے اور آئل کلاتھ کی دوکان کا نوکر اور ایک کیمسٹ
اپنی اپنی دکان کے بورڈ صاف کر رہے تھے۔

باسط کے ہاں دو اور نوجوان داخل ہوئے۔ ایک کا سوٹ سل چکا تھا اور دوسرا چیسٹر کے لئے کپڑا لایا تھا۔ دکان کے
اندر ایک درجن مشینوں کی آواز کے ساتھ باسط کہتا ہوا سنائی دیا ـــــ دور چودہ ـــــ کمر بتیس ـــــ چھاتی پونے چھتیس!
لیکن یہ چیز بھی سعادت کو متوجہ کرنے کے لئے کافی نہ تھی۔ وہ جمائی لے کر بازار کا غیر منظم اور بے ربط ماحول دیکھنے لگا۔ آخر پھر اسے
وہ ربط پسند آیا۔ اور وہ دکان کے اندر جا کر ڈائنا کی تصویر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس بار ڈائنا کی بجائے اس کے کتے کی طرف
دیکھنے لگا۔ آخر انگریزی تہذیب کے مطابق بات کتے سے شروع ہوتی ہے۔ اور پھر ڈائنا یا ایڈنا تک پہنچتی ہے ـــــ!

انگریزی کا مقولہ ہے ـــــ "مجھ سے محبت کرو۔ میرے کتے سے محبت کرو۔" اور یہ کتا لیلیٰ کے کتے سے سراسر مختلف ہے
کیونکہ ایک وقت میں لیلیٰ کا کتا ہوتا ہے یا لیلیٰ، دونوں ایک ساتھ نہیں ہوتے۔ سعادت نے پھر سوچا کہ یہ تصویر اس دکان میں کس قدر
موزوں ہے۔ لباس کی طرف اتنی توجہ آخر مغربی چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو محبت کی خاطر محبت سکھائی جاتی ہے۔ بیوی سے کہو

تم اچھے کپڑے پہنو۔ تو وہ کہتی ہے۔ میں جانتی ہوں ـــ آپ کو مجھ سے محبت تھوڑی ہے۔ محبت میرے کپڑوں سے ہے۔ افوہ یہ مغربی فیشنوں کی تقلید سکھلی ہے۔ لیکن مجھ سے محبت کرو۔ میرے کتے سے محبت کرو " کا حسین مقولہ نہیں سیکھا۔

اب تک سعادت باسط کا اور بھی قائل ہو چکا تھا۔ لیکن ......

اس وقت دو لڑکیاں جو ابھی ابھی دکان میں داخل ہوئی تھیں ایک چھوٹے سے کیبن میں شیشے کے سامنے اپنا سراپا دیکھنے لگیں ایک نے کوٹ سلوایا تھا اور ایک نے شلوار اور قمیص۔ یہ بُت بہت بھی تھے۔ ان کی وجہ سے کمرے میں ایک خوشگوار سی گرمی پھیل گئی تھی۔ اور وہ سردی اور بے رونقی جو اس سے پہلے وہاں مسلط ہو چکی تھی، دور ہو گئی تھی۔ کھنڈے کا ہاتھ سیدھا ہو گیا تھا۔ اور دوسرے نوجوان کی پتلون کی کریز بہت حد تک درست ہو گئی تھی ـــ اور سعادت کو وہ نوجوان جو ٹانڈ اور بروینیٹ کے ساتھ بولا کرتے تھے حرکت کرتے ہوئے نظر آنے لگے ـــ اور ڈانٹا اور کتا ـــ!

اور کیبن کی تصویروں میں کتا بہت پیارا معلوم ہو رہا تھا۔ کتا ـــ کوٹ! کیونکہ اس ٹننگ میں مغربی رواج کے مطابق لیلیٰ اور سگ لیلیٰ مجھ سے محبت کرو اور میرے کتے سے محبت کرو" کے انداز میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کار زماں کی ڈانٹا اس تصویر سے اتر کر کیبن میں چلی آئی ہے۔ اور باسط کا رول ٹاپ آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا ہے۔

" یہ پھندنا سا کیا لگا دیا ہے سوداں؟"

دوسری جواب دیتی ہوئی دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ دوسری جس کی پیٹھ سعادت کی طرف تھی۔ اس کا منہ آئینہ میں نظر آنے لگا۔ اور سعادت ایک جذب کے ساتھ بیٹھا رہا۔ دوسری لڑکی بولی۔

" اسے رواج ہے ـــ پیٹھ پر بھی پھول سا ابھار دیتے ہیں اور سینے پر بھی ....."

" مجھے تو تمہارا کپڑا بہت پسند ہے۔"

" نرا ماٹ معلوم ہوتا ہے ـــ سلا اچھا ہے، باسط جو ہوا ......"

دونوں ایک دوسرے کے کپڑے اور سلائی کو بہتر سمجھتی تھیں۔ لڑکی جس کا نام سوداں ـــ سعودہ بیگم تھا، اس نے اپنے بال کوئن آسٹریا کی طرح بنائے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا چہرہ لمبا کم تھا اور چوڑا زیادہ تھا، اور یوں توازن قائم رہتا تھا اس کی آنکھوں کے قدرتی بلور میں سرمے کی ہلکی سی تحریر دکھائی دیتی تھی ـــ وہی مجھ سے محبت کرو، میرے کتے سے محبت کرو' انداز کی۔ دوسری لڑکی سرمز کی طرح کم گو اور تیکھی تھی۔ تھوڑی اور منہ کے درمیان ایک پھوڑے کا ہلکا سا داغ تھا۔ لیکن اتنا ہی جتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ اور ایک خوبصورت، اتناعی حکم والے چہرے سے کم ہوتا ہے! اس کا نام سلطان تھا۔ بہتی ہوئی لکیروں والا کوٹ اس کے جسم کے ابھار پر اُبھرتا اور دباؤ پر دبتا پنڈلیوں کے وسط تک چلا آیا تھا۔ چھاتی پر خوبصورت قوسین بن رہی تھیں۔ سعادت قوسوں کے لئے ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بےخبر چھاتی اور کمر کی قوسوں کی طرف دیکھنے لگا۔

سعادت سلطان اور سوداں کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ ان لڑکیوں کو اپنی بے پردگی کا احساس ہونے لگا۔ سلطان نے بڑھ کر ہاتھ مارا اور پلائی ووڈ کے کمرے کا پردہ بیل کے پھولوں کو پورے پھیلاؤ میں لے کر تن گیا۔ صرف ایک معمولی سی درز باقی رہ گئی۔

اس وقت کھنڈے، سعادت کا سوٹ لے کر آیا۔ اور ایک علیحدہ کیبنٹ میں لے جا کر پہننے لگا۔ سعادت نے فیلٹ کو سیدھا کیا! تاکہ وہ ایک شریف انسان نظر آئے۔ اور اس نے جلدی جلدی نیا سوٹ پہنا۔ سوٹ بالکل درست تھا لیکن سعادت نے اس بات کا اعتراف ضروری نہ سمجھا۔ کاروباری طور پر بھی یہ بات درست نہ تھی۔ " بغلوں کے قریب دبتا ہے " اس نے کھنڈے کو دکھاتے

ہوئے کہا۔ "اور یہ دیکھو ــــ فال سیدھی نہیں پڑتی ــ ... لیکن ... لیکن ... مجھے جلدی ہے ... "

کھنڈے نے گھٹنوں کے قریب سے قینچی سرکائی۔ انگشتانہ اتارا اور سوٹ کی جیبوں سے تمام کچے دھاگے نکال دیئے۔
اس وقت لڑکیوں نے کھنڈے کو اشارے سے بلایا۔ کھنڈا معذرت کئے بغیر اُدھر چلا گیا ــــ لیکن سعادت نے بھی احتجاج نہ کیا کھنڈے کی وجہ سے سعادت اور ان لڑکیوں میں ایک رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔ سعادت کے پاس سے ان لڑکیوں کے کیبن تک جانے میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان دو جگہوں کے درمیان ایک غیر مرئی خط لگ گیا ہے ... اور یہی خطوط ہیں جو بات کا شجرہ ہیں۔ اور ایک دوسرے کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

لڑکیوں کے کیبن میں بے احتیاطی سے داخل ہونے پر پردہ سرک گیا۔ اب سلطان کی پیٹھ سعادت کی طرف تھی۔ وہ پنجابی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اور کمر کے نیچے قوسیں بڑی بڑی اور کچھ خوفناک تھیں۔ ان لڑکیوں نے پردے کو اُٹھا رہنے دیا۔ شاید ان کی احتیاط کی بے احتیاطی تھی۔ وہ سیدھا لٹکانا چاہتی تھیں۔ اسی قدر بے حجابی کے ساتھ، جیسے سعادت دیکھ رہا تھا۔ لیکن سعادت کیا کر سکتا تھا۔ مرد کا انداز ہی کچھ سیدھا سیدھا، اُجڈ اُجڈ ہوتا ہے۔ لیکن عورت نگاہیں جھکا کر ڈالتی ہے۔ جیسے اس کا جسم حسین قوسوں کا مجموعہ ہے۔ ویسے ہی اس کی نگاہیں اس کے افعال، لیکن مرد ... ...

سعادت کے جسم میں خون حرکت کرنے لگا۔ اسے اپنے کانوں کے کنارے جلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ کھنڈے نے لڑکیوں کے کیبن میں داخل ہوتے ہی سلطان کا کوٹ کھینچا اور پھر اپنے آپ ایک بازو کی دوری پر جا کھڑا ہوا ــــ "یہ کالر کیسے ہے۔ ذرا ٹھیک کر دو ــــ" سلطان بولی۔ کھنڈے نے ہاتھ بڑھا کر کالر ٹھیک کر دیا۔ اور پھر باہر نکلتے ہوئے بولا ــــ "بس بی بی جی ــــ آپ کو کوٹ ایسا پسند آئے گا ــــ جیسے ... کبھی پسند نہیں آیا۔" کھنڈا رک گیا اور بڑے زور سے دونوں ہونٹ بھینچ رہا تھا۔ اور لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔

یہ سازش تھی، سب سازش تھی ــــ سعادت نے کہہ دیا، صاف کہہ دیا۔ لیکن وہ کوٹ اتار کر خود کچے دھاگے اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ابھی تک اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ مسعودہ نے بھی کوٹ اُتار دیا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھی۔ "باسط صاحب ــ !"
باسط نے حساب کتاب کا رجسٹر دور پھینکا۔ اور کیبن کی طرف آیا۔ ایک لڑکی نے کپڑے کے ایک پلندے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اور کپڑے سلوانا ہیں ــــ لیکن ایک شرط پر کہ آج دوسرے ہفتہ کے روز مل جائیں۔ مسعودہ بیگم کی شادی ہے ... " مسعودہ شرما گئی اور کہنے لگی۔ "یوں کپڑے مانگ لیتی ایک خاص تاریخ کو ــــ میری شادی کا ذکر بھی کیا اتنا ضروری ہے کہ دنیا بھر ــــ"

"چلو ہٹو ــــ ہٹو ــــ" سلطان نے کہا۔ باسط نے مسکرائے بغیر کہا۔
"ٹینیل ہے ــــ ٹینیل، کے گز لائیں کپڑا ؟"
"ایک گز عرض ہے ــــ اور ساڑھے چھ گز ہے"

باسط اور کھنڈا دونو کھڑے تھے۔ کھنڈے نے ایک نظر سے سوداں کے تندرست جسم کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو ــــ "پونے سات گز ہوجاتا تو اچھا تھا" لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ شاید کھینچ کھانچ کر گزارا ہو جائے گا۔ مسعودہ کا چہرا ابھی تک گلابی ہو رہا تھا، باسط نے آگے بڑھتے ہوئے سلطان سے کہا۔ "آپ کی قمیص شلوار کا ناپ تو ہے ــــ مگر ان کا ... "
مسعودہ نے کہا ــــ "تو ناپ لے لیجئے"

باسط نے کچھ دور جا کر اپنے سعل ناپ کی چابی گھمائی اور اُسے گچھے سمیت اچھالتے اُچھالتے ادھر چلا آیا۔ کمرے کے پاس پہنچتے ہوئے ماسٹر باسط نے گلے سے فیتہ نکالا اور بولا۔

"آپ ذرا ہاتھ اٹھا دیں ——"

مسعودہ بیگم نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور سعادت کے گلے میں لعاب خشک ہو گیا۔ مسعودہ سامنے کھڑی تھی ایک خوبصورت عورت —— اپنی تمام قوس و قزح کے ساتھ۔ لیکن ماسٹر نے مسعودہ بیگم کے پیچھے سے فیتہ نکالا اور اس کا دوسرا سرا اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور سامنے لاتے ہوئے بولا۔ کٹ لیے لکورے۔

"چھاتی اڑتیس!"

پھر کمر تیس، آستین تیئیس، کراس بیک پندرہ، بازو بارہ، کلائی ساڑھے تین، اور قمیص کی لمبائی گیارہ رکھوائیں گی آپ گز سے اوپر —— رواج نہیں —— خیر اپنا اپنی اپنی، فیشن اچھی ہے، اچھا انتخاب ہے، ہپ؟ لیکن اس کے ناپ کی کیا ضرورت ہے؟ اور شلوار —— یہ فیتہ رکھیئے، ہاں ہاں رکھیئے —— اور فیتے کو مسعودہ بیگم کے گلابی پاؤں پر چھوڑتے ہوئے باسط اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے فیتے کو گلے میں ڈالا اور چلتا بنا۔

"عجیب ہونق ہے" سعادت نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے سوچا۔ "کتنا جذبات سے کورا —— غیر شاعرانہ انسان ہے —— اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان خوبصورت قوسوں، ان گولائیوں کو دیکھ سکے۔"

اور سعادت مبہوت کھڑا سلطان اور مسعودہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کہنیاں مارتی ہوئی چلدیں سعادت کو کچھ یاد آیا اور اس نے ماسٹر باسط کے رول ناپ پر ساٹھ روپے رکھے اور گھبرا کر باہر نکلا —— انگلش واچ کمپنی کا کلاک پونے بارہ بجا رہا تھا —— اور امشر ولیم کا وقت گزر چکا تھا!

راجندر سنگھ بیدی

نذرِ غالبؒ

اگر زاہد کو کعبہ قیس کو محمل پسند آیا
تعجب کیا جو ہم کو جذبۂ کامل پسند آیا

بہت دلچسپ تھا گو جلوۂ آزادئ دنیا
نظر کو منظرِ خودداریٔ ساحل پسند آیا

سنا ہے کل درِ میخانہ تک آ ہی گیا واعظ
تماشائے شراب و ساقی و محفل پسند آیا

گل و غنچہ خس و خاشاک لاکھوں تھے زمانے میں
مگر برقِ جمالِ یار کو اک دل پسند آیا

لگا دنیا میں جی آدم کا آخر خلد سے چھٹ کر
نظامِ کشتِ زار و بارشِ حاصل پسند آیا

خدائی کر گئے تیری رضا جوئی کے دیوانے
تری رحمت کو نقدِ طاعتِ کامل پسند آیا

کسی کو ذبح کر کے دیکھنے والے تجھے شاید
طریقِ التجائے دیدۂ بسمل پسند آیا

کتابِ زیست کا ہر اک ورق دلچسپ تھا لیکن
حدیثِ غم پسند آئی بیانِ دل پسند آیا

یہی ہے ابتدائے انحطاطِ فطرتِ عالی
گرائے پروردۂ طوفاں تجھے ساحل پسند آیا

شباب آیا شبِ مہتاب میں سیرِ گلستاں کو
جمالِ رقص تنویرِ مہِ کامل پسند آیا

کمالِ علم و فن کو جس جگہ پایا پرستش کی
وقارِ زندگیٔ جوہرِ قابل پسند آیا

رکھا فطرت نے رسوا ظالم و جابر کو عالم میں
مشیت کو ضمیرِ بندۂ عادل پسند آیا

زہے ہمت غرورِ حسن کی تسخیر کا سودا
دلِ شوریدہ سر کو عقدۂ مشکل پسند آیا

چلا ہے ساتھ دل بھی گردِ راہِ کارواں ہو کر
یہ کس کا اشتیاقِ جلوۂ منزل پسند آیا

اٹھانے کے لئے بارِ امانت کم نہ تھے قدسی
پسند آیا تو اک گم کردۂ منزل پسند آیا

یہ کون آیا کفن باندھے ہوئے میدانِ الفت میں
یہ کس کو شیوۂ بے مہریٔ قاتل پسند آیا

شہیدانِ وفا کو اس گماں آباد ہستی میں
یقینِ محکم و غارت گرِ باطل پسند آیا

سروشِ بے نوا نے یہ غزل بیساختہ کہدی
کہ اندازِ بیانِ شاعرِ کامل پسند آیا

سروش بختیاری

کُوچ

(منظوم ڈرامے اُردو ادب کیلئے ابھی ایک نئی چیز ہیں۔ اب تک اس سلسلے کے دو ڈرامے پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن آج کا شاعر اس تجربے کی تکمیل ہی نہیں توسیع بھی چاہتا ہے۔ اس ڈرامے کے فن کار نے ڈرامے کے چار کرداروں کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے انہیں چار مختلف بحروں میں بولنے پر مجبور کیا ہے۔ جن میں سے ایک کردار صرف گانے پر اکتفا کرتا ہے۔ یہ قیود فنی طور پر بہت کڑی ہیں اور توجہ طلب بھی۔ ا۔ ھ)

کردار:۔

حسن خاں
ہاشم خاں
روشن
سلامت
} چار سپاہی

کپتان

منظر:۔ تین سپاہی سرحد کی ایک چوکی میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ماحول اداس ہے۔ چاروں طرف چٹانیں دکھائی دے رہی ہیں۔ پس منظر میں ایک فوجی دستہ گزر رہا ہے۔ دُور کہیں بگل بجتا ہے۔

حسن خاں:۔ ہاشم خاں!
پھر صبح ہوئی!
ختم بھی ہوگا یہ قصہ کہیں؟
ختم بھی ہوگا یہ کہ نہیں؟
گھر پہنچیں گے ہم بھی کہیں؟

ہاشم خاں:۔ حسن خاں! میرے دوست گھبرا نہیں!

حسن خاں:۔ کیسے اب نہ گھبراؤں میں!
کتنے سُونے، کتنے سخت!
کتنے بے حس ہیں یہ پہاڑ!
اور ان پر ڈیرے ڈالے!
بیہودہ سی یہ چوکی سنبھالے!
جانے کب سے پڑے ہیں ہم!

روشن:۔ (گا کر) کل شام جو مینہ برس گیا ہے
کس کس کو نہ جی ترس گیا ہے

حسن خاں:۔ روشن!
تجھ کو خدا سمجھے
شاید تو انسان نہیں
ورنہ تو بھی میری طرح
اس جینے سے تنگ آ کر
چاہتا اپنے دل میں یہی!
ٹکراؤں ہر پتھر سے

روشن:۔ (اسی طرح گا کر) اب دل پہ کسے رہا ہے قابو!
نس نس میں یہ کون بس گیا ہے!

حسن خاں:۔ ہاشم! بھئی دیکھو روشن

ہاشم :- سنو تم بھی روشن!
سنا ہے کہ وہ لوگ ہیں پاس ہی!
حسن خاں :- کس نے کہا ہے؟
ہاشم :- عجب ہے کہ تم کو خبر ہی نہیں!
سلامت علی خاں نے کل رات کو
یہیں دامنِ کوہ میں!
آگ دیکھی تھی جلتی ہوئی
حسن خاں :- دو دو ہاتھ اب ہو جائیں گے!
روشن :- (گا کر) اب وہ پہلی سی اپنی بات نہیں
حسن خاں :- روشن سچ کہتا ہے ہاشم!
ہاشم :- ہمیں اپنی کمزوریوں کی خبر ہے
وہ کل رات کی تیرگی میں
بھگا لے گئے ہیں۔
"دریاب" ـــــ
کپتان کی سیم تن، برق رفتار گھوڑی
اسی کے تعاقب میں وہ خود گیا ہے!
حسن خاں :- جھگڑا یقینی ہے
ہاشم :- چلو کچھ تو ہے
یونہی روز و شب بیٹھے رہنا
مصیبت ہی تھی
کوئی بات تو خوں بہانے کی پیدا ہوئی
نہائیں گے اب یہ بیڈل گرانڈیل پتھر
بھٹکتی ہوئی زندگی کے لہو سے
یہ صدیوں سے بے خانماں ریت کے ان گنت بکھرے ذرے
لپٹ جائیں گے آج اک دوسرے سے
چمٹ جائیں گے آج بہتے لہو کے سہارے
ہوا اپنے رُخ پر نہ آئندہ ان کو
اُڑا یا کرے گی!
حسن خاں :- [illegible]

میں نے تمہاری کڑیل باہیں
جوش میں ڈوبی
خون میں لت پت
فتح میں اٹھتی
اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں!
ہاشم :- حسن میں بتاؤں تمھیں
مگر ایک پل ٹھہرو ـــ دیکھو
یہ کون آ رہا ہے؟
سلامت ہے شاید!
روشن :- (گا کر) زندگی اب عزیز ہے کس کو
ہو چکیں انتظار کی باتیں
حسن خاں :- آؤ سلامت بیٹھو!
سلامت :- کتنی پر سوز ہے روشن یہ تمہاری آواز
کہو کس دھیان میں یوں کھوئے کھوئے بیٹھے ہو
ان پہاڑوں سے گزرگاہوں سے!
جانتا ہوں جو تمھیں نسبت ہے!
ہاشم :- سلامت تمھیں خوب معلوم ہے!
سلامت :- مجھے معلوم ہے کیا؟
ہاشم :- (نہایت سنجیدگی سے) محبت میں گو جان بھی دیتے ہیں لوگ
محبت میں جینا بڑا کام ہے
حسن خاں :- لیکن سہل نہیں مرنا بھی
روشن :- (گا کر) کون لیتا ہے نام مرنے کا
کون کرتا ہے پیار کی باتیں
(سب ہنستے ہیں)
سلامت :- اور کچھ!
حسن خاں :- اور سناؤ
روشن :- کام کرتیں نہ تاکے اپنا
عشق کا حسن پیار کی باتیں
[illegible]

سُن رہے تھے بہار کی باتیں
یاد آئیں گی میرے بعد تمہیں
اک غریب الدیار کی باتیں

ہاشم :- وطن کی دلاؤ نہ یوں یاد روشن
گئے سال میں نا مراد بن میں تھا
مگر آج !
یہ پوچھو نہ مجھ سے !

سلامت :- ہمیں معلوم ہے کیا گزری ہے اس نگری پر
ہمیں معلوم ہے تم کیسے ہوئے ہو برباد
کس طرح آگ کے شعلوں کی لپٹ میں تم نے
اپنی پامال روایات کو تابندہ کیا!
سینۂ دہر پہ کتبے کی طرح لکھا ہے ——

حسن خاں :- اپنے وطن سے کوسوں دور اس سرحد پر
بیٹھے رہنا بے معنی ہے
خون یہاں بہتا تو ہے لیکن
پتھروں کے رنگیں کرنے کو
پھول کھلے ہیں یوں بھی کبھی

ہاشم :- مگر ہم نے ہر بار ان ڈاکوؤں کو
بھگا تو دیا ہے
لٹیرے درندے
فنا کر کے دم لیں گے ان کو

حسن خاں :- مان لیا ——
لیکن میں اک بات کہوں۔
میں نے دن کے اجالے میں۔ میں نے رات کی تاریکی میں
رہ رہ کر یہ سوچا ہے
اور یہی محسوس کیا ہے
اتنی بڑی دنیا ہے
لڑنا اور پھر لڑتے رہنا
[illegible]

ہاشم :- سنو!
ابن آدم نے اس کے سوا
اور بھی آج تک کچھ کیا ہے
حسن خاں!
سنو تم بھی روشن!
ازل سے چلی آ رہی ہے
ابد تک رہے گی
یہ خواہش جو انساں میں ہے برتری کی
نتیجہ ؟
یہ ہر روز کی اک نئے ڈھنگ سے جنگ
کبھی یوں بھی سوچو!

حسن خاں :- میں اس وقت ایسی باتیں شاید
سوچ نہیں سکتا
ہاں اپنے گھر کے بارے میں

سلامت :- (مسکراتے ہوئے) لطف آ جائے حسن خاں کتنا!
اب۔ اسی وقت اگر کوچ کا نقارہ بجے

حسن خاں :- (ہنستے ہوئے) میں تو آخر شوہر ہوں!
میری بات ہی کیا!
عید منائیں وہ ڈاکو بھی
جن کو ہم نے جانے کب سے ناکہ بندی کر کے گھیرا ہے

سلامت :- اور اس چوکی سے جب آگ کے شعلے اٹھیں
تمتمانے لگیں بے حس پتھر!
سانس لیتی نظر آنے لگے یہ مُردہ فضا!
کیا ہی ان گالوں پہ سُرخی دوڑے۔

ہاشم :- سلامت!
حسن کو نہ لپٹا دو یوں

روشن :- لگا کر چمکا دیا ہے رنگ چمن لالہ زار نے
شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے

سلامت :- واہ کیا چیز ہے گاتی ہوئی یہ آواز

دم غنیمت ہے ترا

ایسے میں تو بھی نہ ہو تو کیا ہو!

حسن خاں :- ہاشم میں اک بات کہوں!

ہاشم :- کہو!

حسن خاں :- تم نے جنگ کی ٹھانی!

تم بچے ہو!

تم پہ، تمھارے گھر پہ، تمھارے شہر پہ، جو بیتی،

ہم جانتے ہیں

ہم جانتے ہیں اس جنگ سے باہر دنیا میں

ہاشم :- حسن۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہے تمھارا

حسن خاں :- (تلخی سے) تم نہ لڑو تو کون لڑے

(طنزاً) مجھ سے نہیں، دشمن سے (ہنستا ہے، اور پھر خفا سے)

اور یہ روشن

دھتکارا ہوا، ٹھکرایا ہوا

اک لڑکی . . . .

اک عورت کا

(سب ہنستے ہیں)

دنیا میں اب کیسے رہے۔

بے معنی ہے جینا اس کا

اور . . . . (ہنستا ہے)

بس!

ہاشم :- کہو اور بھی کچھ

سلامت کے بارے میں تم کیا کہو گے!

حسن خاں :- کچھ بھی نہیں!

سلامت :- ہیں۔ جو تم چاہو تو خود ہی کہہ دو!

حسن خاں :- لیکن . . . .

ہاشم :- یہ کون آ رہا ہے

حسن خاں :- کپتان . . . . !

دیکھو تو منہ کیسے لٹکا ہے؟

کپتان :- تم سلامت!

سلامت :- جی جناب!

کیا ملا ان کا کہیں کوئی سراغ؟

کپتان :- ہاں ملا!

ہاشم :- دُرناب کو پا لیا کیا؟

کپتان :- دُرناب . . . .

دُرناب اب محراب کی وادیوں میں رہے گی

دُرناب کے مخملیں جسم کو۔ میرے یہ آہنی ہاتھ

ابد تک نہ اب چھو سکیں گے۔

حسن خاں :- کتنی اچھی، کتنی پیاری گھوڑی تھی۔

کپتان :- اس سے بڑھ کر!

اور اک منحوس خبر ہے!

ہاشم :- سنیں!

سلامت :- آج کچھ ہو کے رہے گا شاید!

کتنا بے رنگ ہے یہ صبح سے سہما سورج

جیسے برسوں کا مریض

کپتان :- ہاں بُرے دن نہیں تنہا آتے!

ہاشم :- مگر بات کیا ہے!

کپتان :- شکست۔

ہاشم :- دگر اک شکست۔

کپتان :- شکست اور شکست اور شکست

ہاشم :- خدایا یہ کیا ہو رہا ہے۔

سلامت :- یوں بھی ہونا تھا کبھی!

ہر جگہ

ہر گھڑی ہم کو شکست

کپتان :- اور جرنیل کا حکم آیا ہے

ہم اسی وقت . . . . ابھی

کوچ کریں

حسن خاں :- [illegible]

واپس جائیں۔

...ں :۔ ہارے ہوئے۔
ڈالے ہوئے ہتھیار
ذلت ہے
کون جیئے گا یوں

...ن خاں :۔ روشن تم کس سوچ میں ہو؟

...ان :۔ میں فوج کو تیاری کے لئے
خود آتے ہوئے کہہ آیا ہوں

...شم :۔ سنو بات۔ روشن۔

...لامت :۔ کہاں جانے کو یوں اُٹھے ہو

...پتان :۔ اپنی بربادی کا ماتم کرنے

...لامت :۔ جیسے سنتے ہی نہیں ہو روشن

...پتان :۔ جانے ان بازوؤں میں
اپنی عظمت کی حفاظت کے لئے
آج کیوں اگلی سی وہ بات نہیں

سلامت :۔ میں بھی تصویر کے اس پہلو سے
آشنا نہیں آگاہ بھی ہوں
مجھے معلوم ہے خوب
کس طرح ہم کو ہمارے ہی بڑے بوڑھوں نے
اپنی ہمت سے، ارادے سے، جوانمردی سے
اس بلندی پہ ہمیں پہنچایا
اس بلندی پہ جہاں رقصاں ہے صدیوں ہم نے
تاجداروں کا غرور
اس بلندی کا مگر آج یہ پُرہول نشیب
ہمیں آغوش میں لیتا ہی نہیں
ہچکچاتا ہے، پس و پیش کئے جاتا ہے

ہاشم :۔ نہیں! یوں نہیں!
ابھی ہم [illegible] جینے کی حسرت
[illegible] میں

حسن خاں :۔ اب کون رہے گا یہاں
اس چوکی پر

کپتان :۔ گدھ ....
لاشوں پر پلنے کے لئے (وقفہ)
اب نہ کبھی دیکھیں گے ہرگز
اس دنیا کو

حسن خاں :۔ اب نہ کبھی آئیں گے
اس چوکی پر

کپتان :۔ آگ لگا دو اس چوکی کو
وہ دیکھو
ان خچروں کو
وہ سامان چلا۔

[بگل بجتا ہے اور گاڑیوں کی مسلسل آوازیں
آرہی ہیں اور ان میں مل کر کہیں قریب ہی سے
روشن کی لرزتی ہوئی آواز ...]

روشن :۔ (گا کر) رت بیت چکی ہے برکھا کی اور بیت کے مارے بیٹھے ہیں
روتے ہیں رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے
دل توڑ کے جانے والے سن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری باقی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

ہاشم :۔ کہاں چھپ کے بیٹھا ہے

حسن خاں :۔ میں لاتا ہوں

کپتان :۔ ہاں۔
جذباتی ہے۔

ہاشم :۔ بہت زخم گہرا ہے سینے میں اس کے
خدا جانے انجام کیا ہو

[قریب ہی سے پستول چلنے کی آواز]

سلامت :۔ کیسی یہ آواز آئی۔

کپتان :۔ جیسے پستول کسی نے داغا

سلامت :۔ آگے سے کھیل رہے ہوں گے بچے ہی شاید

دل کو بہلاتے ہیں جاتے جاتے
اور کیا رکھا ہے بیچاروں کے پاس

حسن خاں :- روشن تھا۔

کپتان :- روشن !

ہاشم :- حسن خاں کو کیا ہوا ؟

حسن خاں :- اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن ٹوٹا ہے

کپتان :- صاف کہو

حسن خاں :- سانس کی ڈوری
توڑ دی ظالم نے

سلامت :- خودکشی کی

حسن خاں :- بیچارہ

سلامت :- ہم نے اس دن کے لئے کیا نہ کیا
لیکن انجام، وہی ناکامی
جانے کب پیدا ہو پھر ان کی مثال
سنگدل خاک نے اس بار چھپایا جن کو
اپنے سینے کی کچلتی ہوئی تاریکی میں

(بگل کی آواز)

حسن خاں :- بجتے رہو۔ بجتے رہو

کپتان :- وقت بہت تھوڑا ہے
ہاشم !
تم بھی حسن خاں
اٹھو، اسے دیکھیں دفنائیں،

سلامت :- آگ در و دیوار سے اٹھی
یوں اٹھی، ہم راکھ ہوئے

حسن خاں :- اب نہیں دیکھیں گے ہم اس کو
کوئی شاید نہ دیکھ سکے

ہاشم :- حسن ! کیوں

حسن خاں :- اس گہری کھڈ میں کون اترے گا
کون اس کی لاش نکالے گا۔ دفنانے کو

سلامت :- یہ ستم اور کیا ظالم نے
اب نہ اک پل بھی یہاں ٹھہروں گا۔

(بگل کی آواز پھر آتی ہے)

کپتان :- ایسے میں کیا ہوگا حسن۔

حسن خاں :- کوچ !

کپتان :- لیکن ! ــــــ

حسن خاں :- لیکن ! ــــــ
میں نہ یہاں سے جاؤں گا

ہاشم :- اکیلے یہاں کیا کرو گے ؟

حسن خاں :- اس کو دفناؤں گا۔
یہ بھورے کالے، بے حس پتھر
اس کی آواز کو ڈھونڈوں گا
بے جان ہو کے سینے میں

کپتان :- اگلی چوکی تک آن ملو گے ؟ ــــــ
اس کو دفنا کر ــــــ

حسن خاں :- اگلی چوکی ــــــ کس نے دیکھی ؟

[فوجی دستے مارچ کرتے ہوئے گزرتے ہیں]

کپتان :- وہ دیکھو ــــــ (وقفہ)
جلدی یہاں سے ملو
تم دونوں
لو آؤ

میں چلا ــــــ (وقفہ)

حسن خاں :- ہاں جاؤ ہاشم
کبھی گھر پہنچو گے

ہاشم :- مگر تم حسن

کپتان :- (دور سے جاتے ہوئے) حسن خاں، ہاشم، چلو بھی

حسن خاں :- دل توڑ کے جانے والے سن۔
روشن ! روشن ! تو اب کیوں چپ ہے ؟

ہاشم :- حسن خاں چلو بھی۔

حسن خاں :۔ تم بھولتے ہو
یا شاید سنتے ہی نہیں۔

ہاشم :۔ نہیں سنتا کیا؟

حسن خاں :۔ وہ دیکھو کیا کہتا ہے؟

[دُور سے آتی ہوئی روشن کی آواز جیسے آسمانوں میں اس کی ردح گا رہی ہے]

دل توڑ کے جانے والے سُن ——!

[بگل بجتا ہے۔ فوجی دستے مارچ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔]

(پردہ گرتا ہے)

قیوم نظر

ترتیبِ گلستاں بدلے گی

ترتیبِ گلستاں خوب سہی، ترتیبِ گلستاں بدلے گی
جب وسعتِ امکاں بدلی ہے تقدیرِ بہاراں بدلے گی

آئینہ گرو! شانہ سازو! تدبیر کی ناکامی پہ ہنسو
اب زلفِ پریشاں بھی اپنے اندازِ پریشاں بدلے گی

سورج کا سبو، کرنوں کی چھلک، یہ خاص سحر کی چیزیں ہیں
جب رنگِ شبستاں ہی نہ رہا تہذیبِ شبستاں بدلے گی

اے حسنِ جہاں بیچارگیِ آشفتہ سراں پر طنز نہ کر
اب شکلِ گریباں بدلے گی اب صورتِ داماں بدلے گی

وہ اور کوئی طوفاں ہونگے جو رک بھی گئے جو تھم بھی گئے
اب نوح کا طوفاں آئے گا کیفیت طوفاں بدلے گی

بجلی کا خطر، صرصر کا اثر، اِن کا تو ظہیر اب خوف نہیں
ملبوسِ گلستاں بدلے گا رودادِ گلستاں بدلے گی

ظہیر کاشمیری

وقفہ

اب تو رگ رگ میں ہے ساری نیند کی موجِ سُرور
لمحہ بھر پہلے کے طوفانی خیال اب ہیں نڈھال
کھو چکے بپھرے ہوئے جذبات اپنے جی کا زور
نیم بیداری کے رس میں جھومتے سپنوں کے جال
گردشِ خوں میں بہاتے ہیں نئی لذت کے پور
جسم و جاں ہیں اس انوکھی سرخوشی سے چُور چُور

چومنے کو ہے ان آنکھوں کو تھکی پلکوں کا بار
ایک لمحہ پیشتر جن کی حزیں پہنائی میں
رچ گئی تھیں وہ رسیلی نیلی نیلی انکھڑیاں
سُست گہرے سانس میں بستی ہے وہ بھینی سی باس
جو ابھی ان تیز سانسوں کی تپش میں تھی رواں
اب وہ اعضا غرق ہیں اک راحتِ ہرجائی میں
جن میں گھلتی تھیں ابھی اُس جسم کی رعنائیاں
چھا رہا ہے جسم پر تسکیں کا البیلا غبار

لمحہ بھر کے بعد ہم ہونگے نہ یہ کیفیتیں
ڈوب جائے گا سبھی کچھ راحتوں کی جھیل میں

مختار صدیقی

لینن اور لٹریچر

روس کا سب سے بڑا لیڈر اور مشہور زمانہ عالم لینن ایک ایسی سائنس کا معتقد تھا جو انسان کے قوانین کے مطابق سماج کی ترقی میں حارج ہونے والی روایتوں، قدروں اور اصولوں کو مٹا کر نئی روایتوں، نئی قدروں اور نئے اصولوں کو پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہو۔ چنانچہ لینن نے لٹریچر میں بھی نئی روایتیں، نئی قدریں اور نئے اصول رواج دیئے۔ لینینیت یا لینن کا نظریۂ حیات ادب کی تاریخ اور تھیوری سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

لینن نے ادبی تنقید کے عام اصول ہی وضع نہیں کئے بلکہ اس نے اس ضمن میں کلاسیکی ادب کی مثالیں بھی مہیا کی ہیں۔ ہرزن، بیلنکی، چرنیشوسکی، ڈوبرولیبو، نیکراسو، اوسپنکی، ٹالسٹائی اور [illegible] کی کتابوں پر اس نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ انھیں اور دیگر مصنفوں کو سمجھنے کے لئے اور ان کی مزید تحقیق کرنے کے لئے بہت ہی کار آمد ہے۔ لینن نے اپنی تنقیدی تحریروں میں ادب کو پرکھنے کے لئے ہمیشہ جدلیاتی منطق (dialectical materialism) سے مدد لی ہے۔ مثال کے طور پر اس کے مضامین —— ٹالسٹائی روسی انقلاب کے ترجمان کی حیثیت میں —— ایل۔ این ٹالسٹائی —— ایل۔ این ٹالسٹائی اور معاصر مزدور تحریک —— ٹالسٹائی اور پرولتاریہ کی جدوجہد —— ایل۔ این ٹالسٹائی اور اس کا دور —— جو ٹالسٹائی کے ادب پر روشنی ڈالنے کے لئے لکھے گئے تھے ٹالسٹائی کو بالکل نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔

لینن کی تعلیمات نے عموماً اور اس کی ادبی تنقیدات نے خصوصاً روس اور دیگر ممالک کو ادب کے مطالعہ کا ایک نیا انداز بخشا۔ یہ لینن ہی تھا جس نے روس کے آرٹ اور لٹریچر کو اجاگر کر کے اس کی گزشتہ قدروں کو سمجھنے میں مدد دی۔

لینن مستند ادب میں کس قدر دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے متعلق کروپسکایا (Krupskaya) لینن کی بیوی (Reminiscences of Lenin) میں یوں بیان کرتی ہے —— "لینن سے پہلی بار تعارف کرانے والے کامریڈ نے جب مجھے بتایا کہ وہ فاضل شخص ہے۔ اس نے لاتعداد کتابوں کا بغور مطالعہ ہے۔ لیکن اس نے تمام عمر ناول اور شاعری کا بالکل مطالعہ نہیں کیا تو میں حیران رہ گئی۔

"بعد میں جب ہم اکٹھے کام کرنے لگے اور مجھے اس کو سمجھنے کا زیادہ موقع ملا تو میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اس نے زندگی اور عوام کو قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ میں ذہنی طور پر اسے ایک ایسا آدمی سمجھ بیٹھی تھی جس نے عوام کی زندگی کے متعلق کوئی کتاب نہ پڑھی ہو لیکن وہ بالکل الٹ نکلا۔

"لیکن وہ دور کچھ ایسا تھا کہ ہمیں اس موضوع پر بحث کرنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ آخر یہ بات مجھے سائبیریا پہنچ کر معلوم ہوئی کہ اس کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ میرے مطالعہ سے کسی صورت میں بھی کم نہیں۔ مثال کے طور پر وہ ترجینو کو ایک سے زیادہ بار دہرا چکا تھا۔ پشکن، لرمنتوف اور نکراسو کی کتابیں ہم سائبیریا ساتھ لے گئی تھیں۔ لینن انھیں ہیگل کی کتابوں کے ساتھ اپنے بستر کے پاس رکھا کرتا تھا۔ اور شام کے وقت ہر کتاب کو بار بار پڑھا کرتا تھا۔ پشکن کو وہ سب سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور اپنے

اسلوب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ چرنیشوسکی کا ناول (What is to be Done) ادبی کمزوریوں اور گھٹیا پلاٹ کے باوجود محض چست اچھے اسلوب کی وجہ سے اسے عزیز تھا۔ وہ اسے اتنی توجہ سے پڑھتا اور باریک باتوں کے نوٹ لیتا کہ میں حیران رہ جاتی۔

"یہ بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ چرنیشوسکی سے اُسے بہت ہی لگاؤ تھا۔ اس مصنف کی پوسٹ کارڈ سائز کی دو تصویریں اس کے سائبیرین البم میں لگی رہتیں۔ ایک کے نیچے اس کی تاریخ ولادت اور دوسری کے نیچے اس کی تاریخ وفات لینن کے اپنے دستخطوں سے مرقوم تھی۔ غیر ملکی مصنفوں کی تصویروں میں ایملی زولا کی تصویر تھی۔ اور روسی مصنفوں میں ہرزن اور پسارو کی۔ مقدم الذکر ادیب کو بھی لینن گہری دلچسپی سے پڑھا کرتا تھا۔

"سائبیریا میں ہمارے پاس گوئٹے کے فاؤسٹ کا جرمن ایڈیشن بھی تھا اور ہائنے کی نظموں کا مجموعہ بھی ——"

خود اپنی تحریروں میں بھی لینن مستند روسی ادب سے مدد لیا کرتا تھا۔ وہ اپنے سیاسی دشمنوں کا گھٹیا پن ظاہر کرنے کے لئے گریبوئدو، گوگول، گنچاروو، چیخوف، چرنیشوسکی اور سالٹیکو کے کرداروں کے حوالے دیا کرتا تھا۔

مثال کے طور پر آئینی جمہوریت پسندوں (جو روسی عوام کو اپنی قیادت کا دھوکہ دے کر جنگ آزادی سے دُور رکھنا چاہتے تھے۔) کی فطرت کو بے نقاب کرنے کے لئے لینن، سالٹیکو کے مشہور عامیانہ کردار (Molchalin) کو مماثلت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ روس کے عوام دشمن سیاسیین کے سیاسی خدوخال اجاگر کرنے کے لئے —— بلیک ہنڈرڈ سیاکورچ، سپاہی مینی لوف، چالاک نارد ڈنک ایسے گھٹیا قسم کے کرداروں سے لینن نے اکثر مدد لی ہے۔

لینن نے ہر ادبی رائے میں ادب کو سماجی ارتقا کا ایک ذریعہ سمجھا اور اسے ہمیشہ معاشرہ کی جدوجہد کا ایک کارآمد ہتھیار گردانا۔ چنانچہ اس تاریخی مشن کی ادائیگی کے پیش نظر اس نے زور دیا کہ ادب کو حقیقت کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دَور کے ترقی پسند رجحانات کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ اس نے ہمیشہ ایسے مصنفین کو پسند کیا جو مظلوم عوام سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ وہ پُر تکلف اور مبالغہ آمیز ادب کا دشمن تھا۔ کیونکہ ایسا ادب اصلیت کو بگاڑ کر پیش کرتا ہے۔ اور لوگوں کی اکثریت کے لئے قابل فہم نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا تھا کہ ادب صداقت پر مبنی ہو۔ شیئت پسندانہ ہو۔ عام لوگوں کی زندگی سے متعلق ہو اور اسے محارجی بنائے۔

لینن نے آزاد اقوام کے لٹریچر کا تصوّر، سٹالین کے اشتراکی شیئت پسندی کے نظریہ سے اخذ کیا۔ وہ یہ کہ آزاد ادب اعلانیہ طور پر لوگوں کے مفاد کا محافظ ہوتا ہے۔ اور اشتراکی شیئت پسندی کا حامل ادب ترقی یافتہ سماجی نظریوں کی حمایت کے ساتھ ساتھ ملک کے لوگوں کی تحریکی اور تخلیقی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

لینن نے ٹالسٹائی کے متعلق لکھتے ہوئے ایک مضمون میں کہا —— "اگر ہمارے سامنے آنے والا واقعی کوئی بڑا آرٹسٹ ہے۔ تو اس کے ادبی کارنامے (بالشویک) انقلاب کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر ضرور روشنی ڈالتے ہوں گے۔"

ٹالسٹائی بالشویک انقلاب کو نہ سمجھ سکا۔ اور اس سے دامن کش رہا۔ اس کے باوجود لینن اسے روسی انقلاب کا ترجمان گردانتا ہے۔ کیونکہ اس نے روسی انقلاب کے چند اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے علاوہ اپنے دَور کی چند عظیم معاشرتی تحریکوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لینن کے نزدیک حقیقی زندگی کے اظہار کی صداقت اور گہرائی ہی ادب کی صحیح قدریں جانچنے کا اصلی معیار ہے۔

ادب کے کئی طالب علم کلاسیکی ادب کی حیرت انگیز علمی اہمیت کو کم کر رہے تھے۔ وہ اس ذہنی افلاس اور ذہنی

بے راہ روی سے پیدا شدہ خواہشات کا اظہار سمجھتے تھے اور اس کی گزشتہ زمانے کے لوگوں سے تعارف کروانے کی خدمت کو نظر انداز کر رہے تھے۔ لینن نے اس کے برخلاف ادب میں تعمیری نظریاتی اور علمی کروٹوں کو جانچنے کا بیڑا اٹھایا۔ کیونکہ یہی وہ چیزیں ہیں جو ادب کی قیمت اور عظمت کو بڑھاتی ہیں۔

عملی طور پر لینن جب بھی ادب پر بحث کرتا ہے۔ وہ یہ ضرور دیکھتا ہے کہ مصنف نے اپنے دور کے خیالات اور معاشرہ کی عکاسی کرتے ہوئے کتنی دیانتداری اور گہرائی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اپنی ایک ابتدائی کتاب (The Development of capitalism in Russia) میں لینن نے یورال کے مرکزی روس سے کٹ جانے کا حال لکھا ہے۔ اس نے یہ بیان کرتے ہوئے کہ اشیائے فروخت کو دریاؤں میں بہا دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس وقت انھیں اسکو پہنچانے کا یہی ایک بڑا ذریعہ تھا۔ اس نے آخر میں ضمیمہ کے طور پر ایک نہایت دلچسپ نوٹ دیا ہے ——" اشیا رسانی کے اس فرسودہ طریقہ کا سرسری کے اس منظر سے مقابلہ کرو جو اس نے اپنی کہانی 'The Rapids' میں کھینچا ہے۔ یہ ادیب اہل یورال کے بیکار مزے کے باوجود بندی بھری زندگی کا نہایت خوبصورتی سے خاکہ کھینچتا ہے۔ محکوم، جاہل اور روندے ہوئے لوگ فیکٹریوں میں مقید رہتے تھے۔ لیکن سرمایہ دار فضول اور واہیات قسم کی عیاشیوں میں وقت گزارتے۔ پڑھا لکھا درمیانہ طبقہ مفقود تھا۔ سرمایہ داری کے ارتقا میں ایسی سٹیج کا آنا ضروری ہے اور یہ سٹیج اس وقت روس میں تھی۔"

اسی کتاب میں ایک اور جگہ روس کے بدحال کسانوں کا ذکر کرتے ہوئے لینن نے سالتیکو اور اوسپنسکی کے حوالے دیئے ہیں جن سے زار کے وقت کی کسانوں کی تباہ حالی بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

لینن علم انسان کو حقیقت کا عکس سمجھتا ہے۔ موزوں ذہنی تصویریں، اور حسین اسلوب خارجی دنیا کے عکس ہیں اور فطرت و معاشرہ انسان کی پیدا کردہ مختلف علمی صورتوں کا نتیجہ ہیں۔ علم و ادراک کا یہ عمل مردہ اور بلا واسطہ (Immediate) نہیں ہوتا بلکہ اپنے اندر کئی تضاد رکھتا ہے۔ ادراک سے تعلق رکھنے کے علاوہ احساس اور خیال سے بھی متعلق ہوتا ہے اور آخر کار عمل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ ادب میں جمالیاتی صورتیں فطرت اور انسانی معاشرہ کے عکس سے پیدا ہوتی ہیں۔ خارجی ماحول کی تصویریں جب آرٹسٹ کی تخلیقی ذات میں سے گزرتی ہیں تو ہر اُس نصب العین، نظریہ اور احساس کو اپنا لیتی ہیں، جو آرٹسٹ کی ذات میں مضمر ہو۔ لینن کا یہ اعلان ادب میں حقیقت نگاری کی بحث کو بہت واضح کر دیتا ہے ——" علم (بذریعہ انسان) فطرت کا عکس ہے — لیکن یہ عکس آسان، بلا واسطہ، اور سالم نہیں ہوتا بلکہ مختلف ذہنی الجھنوں، خیالوں اور اصولوں کے باہمی عمل سے پیدا ہوتا ہے۔"

آرٹ اور لٹریچر کی خصوصیت کو جاننے کے لئے یہ فلسفیانہ اصول لینن کے نظریہ عکس Theory of Reflection کے مرہون ہیں۔

گوئٹے، بلزاک اور ٹالسٹائی کے ادب میں زندگی کی صداقت کا موجود ہونا ہی ان کا سب سے بڑا تخلیقی جوہر ہے۔ گوئٹے کا ذہنی دور اٹھارویں صدی کے خستہ و درماندہ جرمنی کے مخصوص حالات کی پیداوار ہے۔ انقلاب جرمن کے مخصوص کیریکٹر کی تخلیق ٹالسٹائی کا فلسفیانہ تضاد بھی وہی تضاد ہے جو انیسویں صدی کے آخری ثلث میں روسی عوام کی زندگی میں پایا جاتا تھا۔

لینن نے ادبی قدروں کے نظریہ میں اگر کسی چیز پر نسبتاً زیادہ زور دیا ہے تو وہ یہ ہے کہ آرٹسٹ کو کسی موضوع پر کچھ کہنے کا اس وقت تک حق نہیں پہنچتا جب تک کہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح عبور حاصل نہ کرلے۔

اور ہرزن بیلنسکی - چرنیشوسکی ایسے روسیوں نے اپنے وقت کے معروف خیالات پر قلم آرائی بھی کی۔ لینن نے ان کی ہر قابل قدر بات کو اجاگر کیا۔ اور روسی ادب کے سماجی مافیہ پر زور دیکر اس کی عالمگیر خصوصیت کو واضح کیا۔

لینن نے روس کی تحریک آزادی کے مختلف دوروں کا جو تجزیہ کیا ہے اس کی روشنی میں بلینسکی اپنی ادبی تنقیدوں کو سماجی نظریوں کے باعث انقلابی جمہوریت کا پیشرو نظر آتا ہے۔ بلینسکی کے مشہور letter to Gogol کے بارے میں لینن نے لکھا۔۔۔ "یہ خط جو بلینسکی کی ادبی کاوشوں کا خلاصہ ہے اپنے وقت کی ان بہترین تحریروں میں سے تھا جو آج تک بھی اپنی حیرت انگیز خصوصیت کے ساتھ زندہ ہیں۔ اور جو جمہوریت پسند پریس میں بغیر سنسر کے شائع ہو سکی تھیں۔" بیلنسکی کے اس جوشیلے پیغام میں لینن کو ان مظلوم کسانوں کے جذبات نظر آتے ہیں۔ جو فیوڈل آقاؤں کے ظلموں کے باعث کچلے جا چکے ہوں اسی طرح دیگر بڑے روسی مصنفوں کی تحریروں سے لینن نے ثابت کیا کہ روس کے ترقی پسند کلاسیکی ادب کا عوام سے بہت زیادہ تعلق ہے۔

ترقی پسند ادب کے ساتھ عوام کے فطرتی رشتوں کا موضوع لینن کے نظریہ ادب کی جان ہے۔ عوام کا ادب پر صرف حق ہی نہیں بلکہ وہ اس کے پیدا کرنے والے ہیں۔

کلارا زٹکن (Reminiscences) میں لینن کے ایک بیان کا حوالہ دیتی ہے۔۔۔ "ادب عوام کی ملکیت ہے۔ عوامی زندگی ہی کو اس کی بنیاد قرار دینا چاہیئے تاکہ یہ عوام کے جذبات خیالات اور آرا کی نمائندگی کر سکے اور انھیں اونچا اٹھا سکے۔ آرٹسٹوں کا فرض ہے کہ عوام کا بغور مطالعہ کریں اور انھیں بلندی پر پہنچانے کی سعی کریں۔" لینن کے اس بیان نے آرٹ اور لٹریچر کی ترقی کے لئے ایک عظیم پروگرام مہیا کر دیا ہے۔

عوامی زندگی، عوامی خیالات، اور عوامی خواہشات کے ساتھ ترقی پسند ادب کے فطری رشتوں کا موضوع لینن نے مشہور روسی مصنفوں کے ادب سے اخذ کیا ہے۔

ہمعصر غیر ملکی ادیبوں میں لینن کو سنکلیر اور ہنری باربسے خاص طور پر پسند تھے۔ موخرالذکر کی تعریف میں وہ اس لئے رطب اللسان تھا۔ کہ اس نے پہلی عالمگیر جنگ کے ہولناک امتحان سے پیدا شدہ عوام کی ذہنی ترقی اور غیر قومی باشندوں کے ضمیر کی جاگرت تصویر بالکل اصلی رنگ میں پیش کی تھی۔

۱۹۱۹ میں (Reply to The question of an american correspondent) لکھتے ہوئے لینن نے باربسے کی ادبی قدروں کے ضمن میں کہا کہ باربسے جب جنگ میں گیا تو وہ ایک صلح جو، متیں، قانون پسند اور ناتربیت یافتہ پیٹی بورژوا تھا۔ لیکن بعد میں وہ ایک بہت بڑا ادیب بن گیا اور اس نے دنیا کی انقلابی طاقتوں سے اپنے آپ کو منسلک کر لیا۔ اسی سال لینن نے مزید لکھا کہ باربسے کے (Le Feu) اور (Clarte) میں عام اور جاہل لوگوں کی بیداری کا نقشہ غیر معمولی قوت بیان، خوبی اور صداقت کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔

گورکی روس کا مستند ادیب۔ لینن اور سٹالین کا بہت قریبی دوست تھا۔ اور دونوں اس کے ادبی کارناموں کو بہت سراہتے تھے۔ کرپسکایا نے لینن اور گورکی کی دوستی کو بہت واضح طور پر بیان کیا ہے۔۔۔ "لینن گورکی کو ادیب کی حیثیت سے بہت اچھا سمجھتا تھا۔ وہ اس کی (mother) اور اس کے (Moraya Zhizn) کے مضامین جو دیہاتی لوگوں کے متعلق ہوتے تھے خاص طور پر پسند کیا کرتا تھا۔ اسے تنگ نظری کے مظاہرے سے نفرت تھی۔ وہ The Lower Depths

سے (Falcon) کے گیتوں اور (Stormy Petrel) سے بہت محظوظ ہوا کرتا تھا۔ اسے شعر کے بحور سے نفرت تھی۔ گورکی کے دیگر کارناموں میں اسے (Bawdy Face) اور Twenty Six men and Girls بہت عزیز تھے۔
مجھے یاد ہے کہ ایک دن وہ آرٹ تھیٹر میں The Lower Depths دیکھنے کے لئے کتنا بے تاب ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں My Universities کو بڑے انہماک سے سنا کرتا تھا۔

گورکی کا عام موضوع مزدوروں، شہر کے غریبوں اور سماج کے نچلے طبقے پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور یہی موضوع لینن کا تھا۔ گورکی نے زندگی کی اصل حقیقتوں اور واقعوں کو بیان کیا۔ اس نے زندگی کو انقلابی نظر سے دیکھا۔ ایک ایسی نظر سے۔ جسے ظلم، استحصال اور ذہنی مفلسی سے نفرت ہو۔ چنانچہ گورکی نے جو کچھ بھی لکھا وہ لینن کے ذہنی تاروں کو چھیڑنے کے لئے کافی تھا۔

لینن ۱۹۰۷ء میں گورکی سے زیادہ قریب ہوا۔ اور اس کے بعد یہ دونوں مانوس ذہن ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ لینن کے وہ خطوط جو اس نے اپنی دوسری جلا وطنی کے دور میں لکھے بہت دلچسپ ہیں۔ ان میں لینن ایک انسان کی حیثیت سے بہت واضح نظر آتا ہے۔ گورکی کو لکھتے ہوئے وہ صاف اور سیدھے طریقے سے ان باتوں کا ذکر کرتا ہے جن سے اُسے اختلاف ہو۔ جو اُسے دکھ پہنچاتی ہوں۔ اور تحریک پر آمادہ کرتی ہوں۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی اسی انداز میں خط و کتابت کرنے کا عادی تھا۔ لیکن جو خطوط اس نے گورکی کو لکھے ہیں ان میں یہ انداز خصوصیت سے موجود ہے۔ عام طور پر وہ بہت سخت طبیعت کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن اس کی سخت طبیعت ہمیشہ ایک خاص قسم کی شرافت سے ملوث ہوتی ہے۔ لینن نے یہ تمام خطوط اپنے ذہنی آنے کے واقعات سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ یہ خطوط بہت جذباتی ہیں اور مدتوں کے مروجہ مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے علاوہ امید بیم کے علمبردار ہیں۔ لینن محسوس کرتا تھا کہ گورکی اس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ وہ گورکی کو اپنے عقائد کی سچائی کا قائل کرنا چاہتا ہے اور ان کے اثبات کے لئے بہت سخت مجادلہ کرتا ہے۔

لینن نے جو خطوط گورکی کو لکھے وہ بہت پر اثر ہیں۔ لینن کو عوام کی ضرورتوں کا کس قدر احساس تھا اور وہ ان کی بہبودی کا کس قدر خواہشمند تھا اسے ہر آدمی جانتا ہے اور ہر آدمی جانتا ہے کہ گورکی نے بھی اکثر انہی باتوں کے متعلق لکھا۔

گورکی نے ادب میں اشتراکی حقیقت پسندی کا آغاز کیا۔ اس کی تصنیفوں نے روسی ادب میں ایک نئے دور کا افتتاح کیا۔ اس حقیقت کو لینن سے بہتر نہ تو کوئی سمجھ سکتا تھا۔ اور نہ بیان کر سکتا تھا۔ مندرجہ ذیل سطریں لکھتے ہوئے لینن کے ذہن میں گورکی کے ادب کی خصوصیات پوری طرح موجود تھیں۔

"یہ ایک آزاد ادب ہوگا۔ جو نہ تو بزدل عورتوں کی ترجمانی کرےگا اور نہ ہی ان دس ہزار بڑے آدمیوں کی جو اپنی پھولی ہوئی توندوں سے بیزار ہیں۔ بلکہ یہ ادب ان لاکھوں غریبوں کی خدمت کرے گا جو ہمارے ملک کی بہار ہیں۔ ہمارے ملک کی طاقت کا مرکز ہیں اور ہمارے ملک کا مستقبل ہیں۔

(ولادیمیر سپربنیا۔ انٹرنیشنل لٹریچر شمارہ جولائی ۱۹۴۲ء)

ظہیر کاشمیری

اُمیدِ وفا پہ جینے والو اُمیدِ وفا نہیں ہے

انجم شناس سے

ایک بوسیدہ و خاموش فسردہ مینار
زرد رو پودوں کا خاشاک کا گنجِ بے سوز
پرنیاں اس کی سرِ راہ کی عریانی پر
عنکبوتوں شب و روز
جال بنتی ہوئی بے خواب فضاؤں کیلئے
میرے اجداد کی روحوں سے ہے آباد ہنوز
جامد و سرد صداؤں کی لحد
اس کے ہر گوشۂ ویراں کا جنوں خیز سکوت
میری آشفتگیٔ شام و سحر کا تابوت
تجھ پہ آئینہ ہے تقدیر مری
عارفِ شعبدۂ چرخ ہے تو

ہر نظر تیری جہانتاب رہی
تجھ سے کیا کاتبِ تقدیر نے سرگوشی کی
میں بھی آئینۂ اسرار ہوں — جامِ جمشید
فاش ہوتے رہے اسرارِ نہاں بھی مجھ سے
ہر نظر صیرفیٔ کون و مکاں تھی میری
راکبِ مرحلۂ سود و زیاں تھی برسوں
اب مگر کھو بھی چکی اپنی رسائی کا غرور
بند ہوتے کو ہیں پتھرائی ہوئی آنکھیں مری
فرصتِ یک نفسِ سوختہ راس آئی تو کیا
ریگزاروں میں حسیں گیتوں کے مدفن دیکھے
سیکڑوں مارِ سیہ سیکڑوں رہزن دیکھے
رہبرِ تیز قدم جادہ و منزل کے امیں
جن کی تنہائی پہ برسوں سے رہے لوحِ مزار

خندۂ اہرمن و گریۂ یزداں دونوں
نرم جاں پودوں پہ بے سوز چٹانوں کا جمود
وادیاں خون سے شاداب چڑیلوں کے دیار
روحِ فغفور و ہلاکو کا درخشندہ جلوس
اس گذرگاہ میں شمشیر بکف
دور و نزدیک رواں
ایک مخلوق نگوں سار و دریدہ دامن
شہریاروں کا ہدف
خارزاروں کی فضاؤں میں سکوں کیا ملتا
اک پناہ ڈھونڈتی تھی دنیا کے جنوں زاروں میں
پا گئے تھے مرے برگشتہ خیال
اک حسیں جسم کے گہوارے میں
ایک مسکن کہ جہاں غم کا نشاں بھی نہ ملے
ایک مدت سے مگر نیم عیاں بھی نہ ملے
وہ شرارے جو ستاروں پہ ہنسا کرتے تھے
کربِ آلودۂ تنفس کے سوا
اور جو کچھ ہے وہ قانون کی زنجیر کا ماتم ہی نہ ہو
عارفِ شعبدۂ چرخ ہے تو
چرخ کے ثابت و سیارے سے شکوہ ہی نہیں
کھا گئی مجھکو یہ بے نور زمیں
کھا گئی مجھکو یہ بے نور زمیں

حامد عزیز مدنی

شائستہ

"کمرا نہ سہی کوئی کونہ ہی ہو جس میں ایک چارپائی بچھائی جاسکے" میں نے امید بھری نظر سے ہوٹل والے کی طرف دیکھا۔

"جی نہیں" وہ لاپرواہی سے بولا "ذرہ بھر جگہ نہیں ہے یہاں۔ شاید کل تک ہو جائے"۔ یہ چوتھا ہوٹل تھا۔

منیجر کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ کسی اور ہوٹل تک جانے کی ہمت نہ رہی۔ شکر ہے میں اپنا سامان سٹیشن پر کلوک روم میں رکھوا آیا تھا۔ وہ کس قدر مشکل ہوتی۔ ہوٹل سے باہر نکل کر کچھ دیر تو میں حیران کھڑا رہا۔ کدھر جاؤں مجھے تو کراچی کے رستوں سے بھی واقفیت نہ تھی۔ پہلی مرتبہ تو وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر دفعتاً مجھے ہنسی آگئی جیسے تمام مشکلات یکلخت دور ہو گئی ہوں شاید اس لئے کہ میری پریشانی اور بےبسی حد سے گزر چکی تھی۔ تو صاحب نتیجہ یہ ہوا کہ میں بازار اور کوچوں میں یوں ٹہلنے لگا گویا کوئی بے فکر اسیر کو نکلا ہو۔ اف کیا خوبصورت کوچہ ہے میں نے اس گلی کی طرف دیکھ کر کہا جس کی ایک جانب فلیٹ بنے تھے۔ اور دوسری طرف پارک تھا جس میں بچے کھیل رہے تھے۔ "کبیر ——— !"

دفعتاً میرے کان میں آواز پڑی میں نے مڑ کر دیکھا گلی خالی پڑی تھی۔ یہاں میرا جان پہچان کون ہوگا۔ میں نے سوچا۔ آخر اس نام کے لوگ بھی تو ہوں گے "کبیر ———" پھر آواز آئی میں نے اوپر دیکھا۔ فلیٹ کے چھجے پر وہ کھڑی مسکرا رہی تھی ——— میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ "یہ رہا زینہ" وہ بولی "اس طرف۔ دروازے میں داخل ہو کر بائیں طرف چلا۔ میں نوکر کو بھیجتی ہوں۔"

شائستہ میرے چچا زاد بھائی سکندر کی بیوی تھی میں جانتا تھا کہ وہ کراچی رہتے ہیں مجھے معلوم تھا کہ سکندر مجھ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن کراچی کو روانہ ہوتے وقت اماں نے مجھے تاکید کی تھی کہ سکندر سے نہ ملوں اگر اتفاقاً ملاقات ہو جائے۔ اور وہ میرے وہاں ٹھہرنے پر اصرار کریں تو کسی بہانے ٹال دوں۔ مجھے سکندر کے ہاں ٹھہرنے کی قطعی ممانعت تھی۔ جبھی تو آتے ہوئے میں نے یہ جاننے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔ کہ وہ کس محلے میں رہتے ہیں۔

محلے میں ایک نہیں تین لڑکے ایسے تھے۔ جنہیں کراچی میں سکندر کے گھر رہنے کا اتفاق ہوا تھا اسلم تو وہاں صرف دو دن ٹھہرا ہوگا۔ پھر کسی بات پر وہ سکندر سے ناراض ہو کر ہوٹل میں جا ٹھہرا۔ یہ خبر جب محلے میں پہنچی، تو بڑی باتیں ہوئیں۔ عزیز کو سکندر نے وہاں ملازمت دلوا دی تھی۔ اس نے صرف ایک مہینہ ملازمت کی ہوگی۔ پھر وہ انہیں بتائے بغیر وہاں سے بھاگ آیا۔ محلے میں آکر ماں سے کہنے لگا۔ "میں ان کے یہاں نہ رہوں گا"۔ "کیوں اس کے یہاں رہنے میں کیا تکلیف تھی"۔ اس کی ماں بولی۔ "نہیں اماں تکلیف تو نہیں تھی لیکن میرا ان کے پاس رہنا ناممکن ہے۔ چاہے ان کے پاس نہ رہتا۔" ماں نے کہا "پر نوکری چھوڑ کر تو نہ آتا۔" "تو رہتا کہاں" اس نے چڑ کر جواب دیا۔ وہاں واپس آکر کانوں پر ہاتھ رکھتا اور کہتا ان کے گھر رہنا تو قیامت ہے قیامت۔ صبح و شام لڑائی لگی رہتی ہے۔ مہمان کی شامت آجاتی ہے شامت۔

اسلم مرید اور سعید کا خیال تھا کہ سکندر کی طبیعت شکی ہے۔ بات بات پر شک کی نظر سے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

عورتیں کہتی تھیں۔ سارا قصور شائستہ کا ہے۔ بس قدرے بن ٹھن کے رہتی ہے۔ ہر وقت اللہ مارا پاؤڈر کریم اور کاجل لگا مسکرا مسکرا کر رہاتی ہے۔ نوجوان لڑکی کو کیا ہے انہیں تو اللہ دے یہ بات۔ ایسی عورت کے زیب میں چھپتے ہوئے دیر لگتی ہے کیا۔ پھر خاوند نے تو جلنا ہی ہوا۔ کیسے نہ ہو شکی اس کی طبیعت۔ نوجوان جاں سکندر کے مزاج میں نقص نکالتے رہیں شائستہ کی محبت اخلاق اور مہماں نوازی کی تعریفیں بھی کیا کرتے۔ یہ سُن کر عورتیں زیر لب مسکرائیں اور آپس میں اشارے کرتیں۔ پھر جب وہ اکیلی بیٹھی ہوتیں۔ تو کوئی نہ کوئی کہتی۔

بس باہر کی کوئی آ جائے سبھی اس کے سبھاؤ کی دھوم مچا دیتے ہیں۔

نہ جانے باہر والیاں کیا جادو کرتی ہیں۔

آنکھیں مٹکانا جو جانتی ہیں وہ

ہمیں تو نہ آیا آنکھیں مٹکانا۔ کوئی آہ بھر کر کہتی

اللہ نہ کرے ———— ہم اس کے بغیر ہی اچھی ہیں

دوسری حسرت بھری مسکراہٹ سے جواب دیتی۔

محلے کے بزرگ شائستہ یا سکندر کی بات سُن کر کھکھلا کر ہنس دیتے۔ اور کہتے اصل میں بات یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں نے مل کر شک کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ تاکہ مہمانوں کی جان بچی رہے۔ بھئی خوب طریقہ ہے۔

نہ جانے کونسی بات سچی تھی۔ آیا لڑکوں کا خیال درست تھا یا عورتوں کا یا پھر بزرگوں کا۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی کہ اب کوئی محلے دار سکندر کے پاس ٹھہرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر کسی کو کراچی جانا ہوتا تو سبھی یک زبان ہو کر اسے نصیحت کرتا۔ سیدھے کسی ہوٹل میں ٹھہرنا۔ نا کہ وہ اپنے ہی پر بٹھا کے گھر ٹھہرا

دیکھو ہم تو تمہیں یہ مشورہ دیں گی۔

آخر ہوٹل بھی تو ہیں وہاں۔

کیا نہیں وہاں ہوٹل بھی سرائیں ہیں۔ سُنا ہے بڑا بھاری شہر ہے۔

تو تو آپ سامنے ہے کبیر۔ بھلا دو ہفتے کھیلتے رہتے نے ہوئے میاں بیوی کی خوشی کو حرام کر دیا۔ کیا یہ اچھی بات ہے آپ سے کہہ دینے میں کیا منع ہے۔ کہ ان کی نصیحتوں کے باوجود نہیں بلکہ انہی کی وجہ سے سفر کے دوران بار بار میرے دل میں سکندر سے ملنے کی خواہش ڈر کی صورت میں پیدا ہوتی اگر وہ مجھ سے مل گیا تو؟ ———— میں گھبرا کر کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرتا۔ لیکن خواہ مخواہ مجھے شائستہ کا خیال آ جاتا۔ بدن میں سنسنی دوڑ جاتی اور پھر میرے لئے کسی اور بات کے متعلق سوچنا بھی ناممکن ہو جاتا خوبصورت تو وہ تھی۔ لیکن اس کا حسن آنکھ نے کی بجائے مبہوت کر دینے والا تھا۔ اس کے انداز میں خوشی کی جگہ وقار جھلکتا تھا۔ وقار خلوص اور سنجیدگی۔ یہ تینوں وصف میرے لئے چنداں دلفریب تھے پھر نہ جانے کیوں محلے والیوں کی باتیں سُن سُن کر دل میں ایک انجانا عزم پیدا ہو چکا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ مجھے ان کے یہاں رہنے کا اتفاق ہو یہ دبی دبی خواہش کسی وقت شدت سے مجھ پر حاوی ہو جاتی پھر میں پوری کوشش سے اسے اور بھی دبا دیتا۔

شاید اسی لئے ہوٹلوں میں جگہ نہ پا کر میرے دل میں اطمینان پیدا ہو گیا تھا۔ شائستہ کے یہاں رہنے کا جواز تو مل چکا تھا۔ اب صرف ان سے اچانک ملاقات ہو جانے کی کسر باقی تھی۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کبھی سرسری تذکرہ سن پایا تھا۔ کہ وہ ایک انگریزی وضع کے فلیٹ میں رہتے ہیں جس کے مقابل بچوں کے کھیلنے کا پارک بنا ہے۔

کراچی میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک صاف ستھرا شہر ہے اور آخر ہوٹل والے کا انکار سن کر پھرتے پھراتے وہ فلیٹ دیکھ کر میری نظر پڑا جس کے مقابل

پارک جاتا تھا اس کی بناوٹ مجھے اس قدر پسند آئی۔ کہ میں بازار کو چھوڑ کر وہیں گھومنے لگا حتیٰ کہ اس کی آواز میرے کان میں پڑی۔ حیرت سے میں ہونقا ہو گیا۔ دل ڈر یا شوق کی شدت سے تڑپ کر جیسے گلے میں آ گیا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی حباب پیار چھلکنے لگا ہو۔

شائستہ مجھے بڑے تپاک سے ملی بار بار میری طرف دیکھ کر مسکراتی۔ ماما کو میری تواضع کے متعلق ہدایات دیتی۔ پھر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ کس قدر خوشی ہے مجھے کہ تم آئے ہو۔ بڑی مہربانی ہے تمہاری۔ اُف اتنی دیر ہو چکی ہے۔ کوئی ہمارے یہاں نہیں آیا۔ کوئی نہیں آتا ہمارے پاس۔ جیسے ملنے والوں نے ہمارے یہاں۔ آنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ سُنا ہے رضا اور محبوب کراچی آئے تھے۔ ہمیں صورت تک نہیں دکھائی۔ نہ جانے کیا قصور ہو گیا ہم سے کہ ملنے والوں نے ہم سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ رفیق کو کئی بار کہا۔ ان سے لکھوایا۔ لیکن وہ بھی نہ آیا۔ ہفتہ دو ہفتہ کے لئے سیر کو آ جاتا تو کیا حرج تھا۔ نہ جانے بات کیا ہے کوئی بھی نہیں آتا۔ کوئی بھی نہیں"۔ وہ آہ بھر کر چپ ہو گئی۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرا دی "شکر ہے تم آئے ہو بڑی مہربانی ہے تمہاری"۔ اس کی آنکھیں پُر نم تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی آنسوؤں کا تار بندھ جائے گا لیکن مجھے دیکھ کر ان پُر نم آنکھوں میں مسکراہٹ جھلکتی اور ان کی نمی جذب ہو جاتی۔ شکر ہے تم آ گئے۔ تمہارے بھائی تو ہر وقت مطالعہ میں کھوئے رہتے ہیں آدھی آدھی رات تک لائبریری میں رہتے ہیں۔ مجھے تو اس تنہائی نے مار دیا۔ کبیر" اس نے مسکرانے کی کوشش کی کتنا ویران ہے یہ شہر کوئی ملنے ملانے والا نہیں۔ اگر اپنے ہی نہ آئیں تو بیگانوں کو کوئی کیا کہے اور ان کا آنا بھی کس کام کا آئے بھی تو دو گھڑی باہر بیٹھ کر چلے گئے گھر میں اپنوں کے سوا کون آ سکتا ہے خیر اب تو تم آ ہی گئے ہو۔ وہ مسکرائی میری نظر دیکھ کر اس کی اداسی اور مایوسی کافور ہو جاتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی اندھیری ناؤ کو کنارہ مل گئے پھول اور وہ کھل گئی ہو۔

شائستہ کی باتیں سن کر وہ امیدیں اور بھی استوار ہو گئیں جو مجھے والیوں کی باتیں سن سن کر خواہ مخواہ میرے دل میں پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں کی اداسی ہونٹوں کی سنجیدگی اور انداز وقار مجھے پریشان کئے دیتے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کسی جھجک کے بغیر ایسی باتیں کیوں کئے جا رہی تھی۔ کیا اپنی ملازمہ شمو کا بھی ڈر نہ تھا؟ اگر سکندر آ جاتا تو؟ باہر کا دروازہ بھی تو کھلا تھا۔ لیکن وہ ان باتوں سے قطعی بے نیاز تھی۔ اس بے نیازی کی وجہ سے مجھ پر خواہ مخواہ رعب چھائے جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس سے ہنس ہنس کے باتیں کروں۔ مذاق کروں چھیڑوں۔ لیکن میں زبان ہلاتے ہوئے جھجک محسوس کرتا۔ میرے بدن میں چیونٹیاں رینگتیں اور میں چپ چاپ اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس وقت میری صرف یہ آرزو تھی کہ اس کی خاطر دنیا کو ٹھکرا دوں۔ تاکہ وہ میری ہو جائے۔ اس کے قریب تر ہو جاؤں اس سے متعلق بے نام امیدیں میرے دل میں بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنا رہی تھیں۔ اور میں اس کے ایک اشارے کا منتظر تھا۔ صرف ایک اشارہ — نوکرانی کے آنے پر دفعتاً چپ ہو جانا۔ یا دروازے کی طرف دیکھ کر کہنا وہ — یہ دروازہ تو کھلا پڑا ہے۔ شمو سے بند کر دے۔ یا میرے کچھ کہنے پر ہونٹوں سے خاموش چپ کہنا اور مجھے پیار سے گھورنا یا کراچی آتے ہوئے گاڑی میں کئی مرتبہ میں اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت میں یوں چپ چاپ نہ تھا۔ میں نے کئی ایک دلچسپ باتیں کی تھیں اور باتوں ہی باتوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔" شائستہ — اس وقت ایسا محسوس ہوا تھا مجھے جیسے کسی ہوائی کرتب نے آگ دکھا دی ہو۔ لیکن اب میرا ہاتھ آگے بڑھنے کی بجائے کوٹ کی جیب میں گھسا ہوا تھا۔ اور میری زبان کچھ کہنے کی بجائے منہ میں ٹنگی ہوئی تھی۔

"وہ کبیر آیا ہے" سکندر اندر داخل ہو کر چلا ئے "خوب کیا تم نے۔" وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دیر

بلکہ مجھ سے ملنے والوں کے متعلق پوچھتے رہے۔ اس دوران میں شائستہ گھر میں چاروں طرف گھومتی رہی۔ "شمو تم نے کبیر کے کمرے میں بلب نہیں لگایا" "شمو" میں نے کہا۔ ایک میز لگا دو نا ـــــ شاید کبیر سونے سے پہلے مطالعہ کرنے کا عادی ہو۔ ان انتظامات کے دوران میں وہ دوڑی دوڑی میرے پاس آتی۔ اور کوئی نہ کوئی بات پوچھتی۔ سکندر کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھ کر مسکراتی۔ اس کا سکندر کی موجودگی میں مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا میرے لئے بے حد پریشان کن تھا۔ میں خواہ مخواہ جھینپ رہا تھا گھبرا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ شائستہ کو اپنی طرف متوجہ کرکے ایسا اشارہ کروں کہ اسے اس بات کا احساس ہو جائے۔ کہ سکندر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ لیکن مجھ میں ہمت نہ پڑتی تھی۔ اور وہ بار بار کہے جا رہی تھی۔ شکریہ تمہارا ہو کبیر۔ بڑی مہربانی ہے تمہاری۔ میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ ایک پرائیویٹ بات عام کی جا رہی تھی۔ سکندر کے سامنے اس کے وہ دلنواز اور رنگین فقرے اپنا مفہوم اور رنگینی کھوتے جا رہے تھے۔ اس بات سے تنگ آکر میں نے تھکاوٹ کا بہانہ کیا اور اپنے کمرے میں جاکر لیٹ رہا۔

اگلے دن جب سکندر دفتر سے آئے تو ہم دونوں بالکنی میں کرسیاں جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ شائستہ سویٹر کچھ بن رہی تھی۔ بنتے ہوئے وہ مجھ سے مسلسل باتیں کئے جاتی تھی۔ جن کے دوران میں اکثر کنکھیوں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ اس وقت میں تھرکتے ہوئے ساز کی طرح نغموں سے بھرا بیٹھا تھا اور محض ایک ہلکی سی چھیڑ کا منتظر تھا۔ شائستہ کی پتلی پتلی رنگین انگلیاں ایک اضطراب سے چل رہی تھیں۔ میں انہیں متوقع نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ مخروطی انگلیاں بڑھتے بڑھتے مجھ تک پہنچ جائیں گی۔ اور فضا میں دلنواز نغمے گونجنے لگیں گے وہ نغمے جو میرے اندر تڑپ رہے تھے جنہیں مضراب کی جستجو تھی۔ امید تھی لیکن وہ انگلیاں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ جب وہ سلائیوں میں الجھی ہوتی تھیں میرا جی اٹھتا کہ ان مضطرب اور بھٹکی ہوئی انگلیوں کو اس بھنور سے چھڑا لے لیکن نہ جانے کیوں رک جاتا۔ اور پھر خفت کے مارے جیب کے کونے کریدنے لگتا۔

سکندر نے ہمیں یوں بیٹھے دیکھا تو ٹھٹکے۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ چپ رہے پھر کچھ کہنے کی خاطر بولے "تم سیر کو نہیں گئے کبیر۔" "بس ابھی جانے کو تھا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "میں نے ہی روک رکھا تھا انہیں" شائستہ بولی "میں نے کہا وہ آئیں گے تو تمہیں ساتھ لے جائیں گے۔ اکیلا کہاں مارا مارا پھرتا کبیر کوئی بچہ ہے کیا۔" ان کی ہنسی طنز آلود تھی جو کھو جانے لگا۔ اس بات پر شائستہ گھبرانے کی بجائے اور بھی چہکنے لگی۔ سکندر کمرے میں چلے گئے۔ اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگے۔ شائستہ پہلے تو مجھ سے چپکے چپکے باتیں کرتی رہی۔ پھر اس قدر زور سے باتیں کرنے لگی جیسے سکندر کو سنا رہی ہو۔ "تمہارے آنے سے ہمارے گھر میں کس قدر رونق ہو گئی ہے کبیر۔ گھر بھرا بھرا نظر آتا ہے۔ اور آج کا دن آنکھ جھپکتے ہی بیت گیا ہے۔" پھر وہ دوڑی دوڑی سکندر کے کمرے کے دروازے میں جا کھڑی ہوتی۔ اور مسکرا مسکرا کر ان سے کچھ پوچھتی اور پھر وہیں سے کبیر کبیر چلاتی ہوئی میرے پاس آ جاتی "یہ تو تم نے سنا کبیر آج یہ باہر جانے سے بھی منکر ہیں۔ تم بھی نہ جاؤ باہر۔ جب یہ جائیں گے تبھی جانا کبیر۔" پھر بھاگی بھاگی سکندر کی طرف جاتی۔ "سنا آپ نے کبیر کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے میں موٹی ہو گئی ہوں۔ کیا میں واقعی موٹی ہو گئی ہوں۔ میری طرف دیکھئے نا" وہ ان کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لئے بچے کی طرح چلاتی اور بسورتی۔ "دیکھئے بھی نا۔" پھر گلہ کرتی "ان کی بات سنی تم نے کبیر کتنے ہیں کسی کے منہ سے تعریف کی بات سن کر [illegible]

باچھیں کھلنے لگتی ہیں پھر ان سے مخاطب ہو کر مسکراتی۔ آپ بھی کیجئے نا میری تعریف اور متوقع اور مسحور نگاہوں سے انہیں دیکھتی۔ اس سے اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دونوں کے درمیان ایک متوقع چاند ڈول رہا ہو۔ شائستہ کا یہ رویہ دیکھ کر میرا دل بجھا جا رہا تھا۔ اُمیدیں خاک میں ملی جا رہی تھیں۔ اُف۔ میں اُٹھ بیٹھا میں ذرا باہر ہو آؤں۔ مجھے جانے پر تیار دیکھ کر وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی۔

باہر ہو آؤں ——— وہ زیرلب گھورنے لگی ذرا ٹھہرو نا۔ پہلی مرتبہ اُس نے مجھ سے چھپا کے بات کی تھی۔ میرا دل ازسرنو دھڑکنے لگا۔ اور آنکھ امید کی روشنی سے چمکنے لگی۔ میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں میں نے رازدارانہ انداز سے کہا اور سکندر کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے سکندر کی طرف دیکھ کر منہ بنا دیا اور لاپرواہی سے زیرلب بولی ان کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ تم مان گئے کیا۔

بازار میں گھومتے ہوئے بار بار مجھے وہ باتیں یاد آئیں جو شائستہ نے زیرلب مجھ سے کی تھیں۔ نہ جانے اُن باتوں میں کیا تھا۔ کس قدر مفہوم سے لبریز تھیں وہ۔ وہ زیرلب باتیں ہر لحظہ اور بھی زیرلب ہوتی جاتیں۔ یہاں تک کہ وہ سرگوشیاں بن گئیں اور ان پر وعدوں کے رنگین پھول پھوٹ نکلے۔ اُن کی مہک سے مسحور ہو کر میں لڑکھڑاتا ہوا لوٹ آیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے مجھے شدید احساس ہوا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ رنگین انگلیاں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ آنکھیں میری طرف دیکھ کر ڈولتیں۔ ہونٹ بولے بغیر کچھ کہتے۔

اندر وہ دونوں بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے مجھے دیکھ کر بولی لو سنو کبیر مجھ سے کہہ رہے ہیں یہ بلیک سویٹر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ کیوں کبیر کیا یہ رنگ مجھے جچتا ہے دیکھو میں نے ——— کہہ کے وہ ان سے باتیں کرنے میں مشغول ہوگئی۔ اور وہ دیر تک ایک دوسرے کی باتوں میں کھوئے رہے کبھی کبھار وہ مجھے وہیں سے آواز دیتی۔ لیکن میرا جواب سنے بغیر پھر سے اُن سے باتوں میں لگ جاتی۔ اِدھر میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کی توقع میں بیٹھا تھا۔ منتظر تھا کہ وہ آئے اور دھیمی آواز میں مجھ سے کچھ کہے۔ ان کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ یا کچھ اور لیکن وہ نہ آئی۔ حتیٰ کہ میں ہار کر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد ہمارا یہ معمول ہو گیا کہ سکندر کی غیر حاضری میں وہ میری کرسی سے کرسی جوڑ کر بیٹھ رہتی۔ باتیں کرتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ ہنستی۔ میں بار بار اُٹھ بیٹھتا۔ میں سیر کر آؤں۔ وہ پیار سے مجھے گھورتی۔ ذرا بیٹھو شام کو چلے جانا ——— بس کوئی نہیں جانا وانا ——— چائے پی لو۔ جب آجائیں گے تو چلے جانا ——— بیٹھو بھی نا کبیر میرے پاس بیٹھو کر ڈر لگتا ہے کیا؟ ——— ہر بار میں مجبور ہو کر بیٹھ جاتا۔ اسی طرح شام ہو جاتی اور سکندر آجاتے۔ وہ ہمیں یوں بیٹھے دیکھ کر باری باری دیوار دروازے اور ماما کو گھورتے اور پھر اپنے کمرے میں جا داخل ہوتے۔ ان کی بے بسی اور خشمگینی دیکھ کر شائستہ مسکراتی۔ پھر وہ ان کے پاس جا بیٹھتی ہنس ہنس کر اُن سے باتیں کرتی۔ اس کی باتیں سن کر ان کا غصہ اور بھی چمکتا حتیٰ کہ وہ اعلانیہ ہماری بے تکلفی پر آوازے کسنے شروع کر دیتے۔ ان کی باتیں سن کر شائستہ کی خوشی کی انتہا نہ رہتی ———

پھر کسی نہ کسی بہانے وہ چپکے سے میرے کمرے میں آکر کہتی تم چپ کیوں ہو گئے کبیر۔ ناراض تو نہیں ہو گئے ——— خدا کے لئے بُرا نہ مان لینا ——— اُن کی تو عادت ہے ایسی باتیں کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اس کی باتیں اس قدر رازدارانہ ہوتیں۔ کہ میری امیدوں کے خشک دیئے میں تیل پڑ جاتا۔ سکندر بُرا مانتا ہے تو بُرا ماننے میں لاپرواہ ہو جاتا۔ اگرچہ اس کی باتوں کے جواب میں میں صرف یہ کہا کرتا: اچھا۔

تمہاری مرضی"۔ اور پھر سیر کو نکل جاتا۔

جب میں سیر سے لوٹتا تو دیکھتا کہ سکندر غصے کی بجائے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ اور شائستہ اسے بہلا رہی ہے۔ صبح سویرے وہ اُٹھتے ہی پیار محبت کی باتیں شروع کر دیتے۔ پھر سکندر دفتر چلا جاتا۔ اس کے چلے جانے کے بعد فوراً شائستہ کو احساس ہوتا کہ میں ابھی وہیں ہوں اور وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آتی اور اس گرم جوشی سے مجھ سے ملتی گویا اپنی گذشتہ لاپرواہی کی تلافی کر رہی ہو اپنی کرسی میرے پاس رکھوا دیتی۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی۔ وہی ترچھی نگاہیں وہی مسکراہٹ اور وہی بے تکلفی۔ اُف وہ مسکراہٹ۔ ہر بار میں محسوس کرتا کہ منزل آپ میری جانب چلی آ رہی ہے۔ شام کو جب میں سیر کو نکلتا تو دن بھر کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔ خواہ مخواہ مجھے احساس ہونے لگتا۔ کہ بام پر پہنچنے کے لئے صرف ایک سیڑھی رہ گئی ہے۔ ایک قدم اور —— بس لیکن دوسرے ہی لمحے جب میں دیکھتا کہ ہمارے درمیان ایک دیوار حائل ہے تو میں یکلخت تڑپ جاتا۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔

آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے کہا آج میں واپس جا رہا ہوں۔ جا رہے ہو اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ نہیں نہیں وہ چلائی یہ کیسے ہو سکتا ہے ابھی تو تمہیں یہاں آئے دو دن ہوئے ہیں"۔ "آج پانچواں دن ہے"۔ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ تو پھر کیا ہوا وہ بولی "نہیں آج مجھے جانا ہی ہوگا"۔ میں نے جواب دیا۔ کیا اس نے سوٹ کیس پرے پھینک دیا۔ نہیں نہیں تم مذاق کر رہے ہو۔ تم ابھی نہیں جاؤ گے! میں نے فیصلہ کر لیا"۔ میں نے لاپرواہی سے کہا فیصلہ کر لیا ہے! وہ چلائی۔ گھبرا کر اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ جونہی وہ گرم اور روغنی انگلیاں مجھ سے مس ہوئیں لنڈا ہوا —— کسی بوتل کا کاگ اڑ گیا۔ سرخ شراب کے چھینٹے چاروں طرف اڑنے لگے۔

عین اس وقت سکندر داخل ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ شائستہ نے انہیں دیکھا لیکن وہ جوں کی توں کھڑی رہی۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ چھڑا لئے تھے۔ ورنہ شاید وہ میرے ہاتھوں کو پکڑے رہتی۔ شائستہ کی آنکھوں میں گھبراہٹ کی جگہ خوشی کی جھلک لہرا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے شکاری پرندے کو اپنے دام میں پھنسے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔

جانا وانا کوئی نہیں۔ وہ مجھ سے آنکھیں ملا کر آہستہ سے بولی۔ اور پھر سکندر کے کمرے میں جا داخل ہوئی "تمہیں گود میں لے کر بیٹھی رہتی ہو شرم نہیں آتی تمہیں"۔ سکندر غرایا۔ "کیا بکتے ہو گھر جا کر —— یہاں میرے لئے آیا ہے یا تمہارے جادو میں پھنسنے کے لئے"۔ میں نے سنا اور میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سچ کہتی تھیں محلے والیاں۔ میں نے کس قدر بھول کی جو یہاں آ ٹھہرا۔ مگر میں نے اپنے کپڑے اکٹھے کئے۔ اور ٹائم ٹیبل لے کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ صبح گیارہ بجے سے پہلے کوئی گاڑی نہ چھوٹتی تھی۔ لاچار میں چارپائی پر پڑ گیا۔ اندر نہ جانے وہ ایک دوسرے سے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ ان کی باتیں سننے سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اگلے دن صبح سویرے وہ میرے پاس آئی سرہانے کھڑی ہو کر ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کر لیں" بوجھو کون ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ مجھے غصے میں دیکھ کر وہ گھبرائی۔ اوہ یہاں غصے سے بھوت بنے بیٹھے ہیں۔ پھر وہ منت سے کہنے لگی خدا کے لئے آج نہ جانا صرف آج اور کل کا دن اور ٹھہر جاؤ۔ پرسوں میں تمہیں نہ روکوں گی اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ ان

رنگین انگلیوں کے چنگل سے نکل جاؤں لیکن میری کوشش ناکام رہ گئی۔ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے چاروں طرف وہ رنگین انگلیاں چل رہی تھیں۔ میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ بڑھ رہی تھیں۔ حتیٰ کہ میں ان کی گرفت میں آگیا —— دفعتاً کسی بوتل کا کاگ اڑا۔ کھولتا ہوا سرخ پانی چھلکا۔ میری آنکھوں تلے بھی کچھ سرخ دکھائی دینے لگا۔ میرا سر جھکا ہونٹ ان انگلیوں پر چسپاں ہو گئے۔ شائستہ —— !! مجھے زبان مل گئی۔ دفعتاً اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔ سرخ ابلتی ہوئی لہریں ریت بن کر رہ گئیں میں ٹھٹھک کر بیٹھ گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور گھبرا کر دوبارہ قریب آ بیٹھی ہنسنے لگی بڑی بہن سے مذاق کرتے ہو۔ ہنستے ہنستے اس کے گالوں پر دو آنسو ڈھلک آئے۔ بڑے مسخرے ہو تم کبیر!!

پہلے تو میں شرم سے پانی پانی ہوا بیٹھا رہا۔ لیکن جب وہ میرے پاس آ بیٹھی اور معصومیت اور محبت سے بولی۔ صرف ایک دن اور رک جاؤ۔ تمہیں تکلیف تو ہو گی۔ لیکن میری خاطر اُسے سہہ لینا۔ کل بے شک چلے جانا۔ اس کی معصومیت خلوص اور بے بسی کو دیکھ کر میری شرمندگی یک قلم کافور ہو گئی۔ میں اسے اس کی طرف دیکھ کر محسوس کرنے لگا۔ جیسے اس روز میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا ہو نہیں میں نہیں جاؤں گا میں نے ہنس کر کہا اور پھر پیار سے اس کا سر تھپکنے لگا۔

دوپہر کو اس کے پاس بیٹھے ہوئے میں محسوس کر رہا تھا گویا ہمارے درمیان آخری پردہ اُٹھ چکا ہے۔ اس سے ایک پراسرار قرب محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں منزل تک پہنچ چکا تھا۔ میرا دل دھڑک نہیں رہا تھا۔ زبان بند نہ تھی۔ ہاتھ جیب کے کونے میں بھینچے کی بجائے بے تکلف چل رہا تھا۔ اس کی رنگین انگلیاں رنگین تو تھیں مگر کڑی کی ٹانگوں کی طرح چاروں طرف سے میری طرف بڑھنے کی بجائے اپنے ہی اور گرد رینگ رہی تھیں۔ یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں کسی بے نام قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس روز میری گپیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ مجھے نئی نئی سوجھ رہی تھی۔ میں نے کہا شائستہ سکندر کی کیا طبیعت ہے؟ ہے نا؟ وہ مسکرائی۔ بڑی شگی طبیعت ہے۔ جانے کہوں " تمہارا دل نہیں کرتا میں نے پوچھا۔ اُس نے آہ بھری "اُن دنوں بھی ایسے ہی تھے۔ ابھی تک اپنی عادت کا احساس نہیں نہیں کن دنوں"۔ میں نے جان بوجھ کر بات کو بڑھانے کے لئے کہا۔

"جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ اُن دنوں کی یاد آتی ہے تو بے ساختہ ہنسی آتی ہے"۔ وہ ہنس کر بولی تم سے کیا چھپانا ہے یہ میری اپنی خواہش تھی کہ میری ان سے شادی ہو جائے"۔ "سچ" میں نے حیرانی سے پوچھا ہاں وہ جھینپ کر بولی ان دنوں سکندر صاحب اور میرے پھوپھی زاد کرامت دونوں ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رہنے کو اچھے مکان نہ ملتے تھے اس لئے مجبور تھے۔ میرے بھائی کی سکندر صاحب سے بڑی دوستی تھی۔ اس لئے ہم سب ان کو اپنا ہی سمجھتے تھے۔ ان سے پردہ بھی اٹھا رکھا تھا۔

تمہیں سکندر سے محبت تھی؟ میں نے شرارت سے پوچھا۔

وہ شرما کر چپ ہو گئی۔ پھر اپنا آپ سنبھال کر بولی۔ تم جانتے ہو مجھے ادب سے عشق تھا عشق اور یہ پورے ادیب تھے۔ مجھے پڑھایا کرتے تھے ان دنوں بس جی ہم تو ان سے پڑھتے ہی ہیں لٹ گئے۔ اف کس قدر قابل ہیں یہ۔ میں تمہیں کیا بتاؤں مجھ پر تو پہلے دن ہی ان کا رعب پڑ گیا تھا۔ چوری چوری انہیں دیکھا

کتابوں کے پڑھنے میں مشغول رہتے اور میں ان کے
منہ کی طرف دیکھا کرتی۔ ان کی عادت تھی کہ پڑھاتے
ہوئے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے۔ پھر میں نے اپنی
اماں سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا؟

وہ مسکرائی۔ ان کی بلا سے یہ تو ہر وقت اپنی
کتابوں اور مطالعہ میں کھوئے رہتے تھے۔ ان کی معروفیت
لامتناہی تھی۔ اس بات پر میرا دل جلتا تھا۔ جی چاہتا تھا
کسی طریق سے ان کی کتاب چھین لوں لیکن میں کر ہی
کیا سکتی تھی۔ خیر جتن تو میں نے بھی بہت کئے وہ مسکرائی
لیکن کوئی بات نہ بنی اور یہ اپنی شغل میں منہمک رہے
——— پھر اتفاق سے ایک ذریعہ نکل آیا۔

وہ کیا میں نے شوق سے پوچھا

میری عادت تھی کہ کرامت بھائی سے روز کھیلتی
گپیں مارتی اور لڑتی جھگڑتی رہتی۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا
تھا نا۔ چھ ایک ماہ چھوٹا ہوگا۔ ہم دونوں بہت بے تکلف
تھے۔ ایک روز جب ہم دونوں حسب معمول بیٹھے ایک
دوسرے سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سکندر صاحب
آ گئے۔ ہمیں اکٹھے دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن سنبھل
کر جلدی واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شام کو جب
میں سبق پڑھنے کے لئے ان کے پاس گئی تو دیکھتی ہوں
کہ آپ کا منہ سوج کر کپا بنا ہوا ہے۔ پھر انہوں نے
پڑھانا شروع کر دیا۔ لیکن ایسی بے دلی سے پڑھاتے
تھے۔ کہ میں پہلی نظر میں ہی تاڑ گئی۔ پھر میں سوچ میں
پڑ گئی۔ نہ جانے کیا بات ہے آج۔ پڑھاتے ہوئے
انہوں نے مجھے بے توجہ پایا۔ تو تنک کر بولے بس جی
میں نہیں پڑھا سکتا تمہیں۔ اب اسی سے پڑھا کرو۔
اپنے کرامت سے جس سے سارا سارا دن خوش گپیاں
ہانکتی ہو میں نے ان کی طرف دیکھا آنکھیں سرخ ہو رہی
تھیں ہونٹ کانپ رہے تھے۔ بس جی پھر کیا تھا۔ میری
خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اس [illegible]
جوش دینے کی ضرورت تھی صرف کس قدر [illegible] لگ گئے
گا جائے گا۔ میں نے سوچا۔ اس کے بعد میں نے کرامت سے
اور بھی بے تکلفی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اماں بھی گھورنے
لگیں۔ بھائی جان بھی گرم ہو گئے۔ اماں بولیں۔ "بیٹی چاہے
وہ اپنا ہے۔ لیکن کرامت سے یوں دھینگا مشتی کرنا تمہیں
زیب نہیں دیتا۔" میں نے اماں کے اشارے سمجھے۔ بھائی
کی نصیحتیں سنیں اور انہیں پی گئی۔ پھر میں نے بڑی کوشش
سے وہ کمرا لے لیا۔ جس کی ایک دیوار سکندر صاحب کے
کمرے سے ملحق تھی۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ ہماری آوازیں
دیوار کے پار پہنچتی تھیں۔ یہ تو بس آگ بگولہ ہو گئے۔ کئی دن
مجھے پڑھانے نہ آئے۔ مجھ سے بول چال ترک کر دی۔

ایک دن میں ان کے کمرے میں جا نکلی اور چھیڑنے کے
لئے بولی۔ "بھائی صاحب آپ چپ چپ کیوں ہیں۔" میں
انہیں بھائی صاحب کہا کرتی تھی۔ "تمہیں اس سے کیا غرض؟"
یہ تلملائے۔ "چاہے میں کیسا بھی ہوں۔" "آپ سے پڑھتی
جو ہوں۔" "نہیں، میں نہیں پڑھاؤں گا تمہیں۔" یہ غرائے۔
"اچھا نہ سہی لیکن آپ میرے بھائی صاحب تو ہیں۔" "انہیں
ہی بناؤ بھائی صاحب۔" آپ جل کر بولے۔ "ہم تمہارے کچھ
نہیں لگتے۔ تمہیں کیا چاہے میں مروں یا جیوں۔" انہوں نے
اپنی کتاب اٹھا کر دیوار سے دے ماری۔ "بڑا اچھا کیا آپنے"
میں نے لاپروائی سے کہا۔ "یہ کتابیں تو آپ کی جان کھا گئی ہیں"
"یہ کتابیں جان کھا گئی ہیں یا ——— یا ———" دفعتاً آپ چپ
ہو گئے۔ "یہ پنسل بھی پھینک دیجئے نا۔" میں نے ان کی انگلیوں
سے پنسل چھیننے کی کوشش کی۔ میری انگلیاں ان کے ہاتھوں
سے مس ہوئیں۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب جو دیکھتی
ہوں تو گالوں پر آنسو۔ "شائستہ" آپ نے مشکل سے کہا۔
"مجھے اس قدر عاجز نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"پھر" میں نے اسے یاد دلایا

"پھر کیا؟" شائستہ ہنسی۔ مصیبت یہ تھی کہ کرامت بھائی کو اکثر دورے پر جانا پڑتا تھا۔ ایک بار جو وہ پندرہ دن کے لئے دورے پر چلے گئے تو سکندر صاحب پھوپھی جی بے حد ہو کر رہ گئے۔ اف کس قدر اداسی میں کٹے وہ دن۔ میں بیٹھی کرامت کا انتظار کیا کرتی۔ کب وہ آئیں اور" وہ مسکرا پڑی۔ "آتے بھی تو وہ چند دنوں کے لئے۔ اور پھر جب جانے لگتے تو میں ان کی منتیں کیا کرتی۔ کرامت بھائی نہ جاؤ۔ خدا کے لئے آج نہ ـــــ" دفعتہً وہ چپ ہو گئی۔

"اُف یہ میں نے کیا کر دیا ہے۔" وہ چلائی۔ "یہ دیکھو اس نے سویٹر میرے سامنے رکھ دیا۔ سارا اُلٹ بُن گئی ہوں میں بھی پاگل ہوں۔ باتوں ہی باتوں میں کھو گئی۔ نہ جانے کیا کیا بکتی رہی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عین اس وقت باہر سے سکندر کی آواز آئی۔ وہ چونکی۔ "وہ آ گئے" اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "کبیر بھائی! جانا نہ تم ـــــ" وہ دفعتاً رک گئی اور جھینپ کر بات بدلنے لگی ـــ "پرسوں میں نہ روکوں گی تمہیں، پرسوں!"

نہ جانے اس وقت مجھے کیا ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں پھیل رہا ہوں۔ پھیلے جا رہا ہوں۔ تمام فضاؤں پر چھائے جا رہا ہوں۔ ارد گرد کی چیزیں سمٹ رہی تھیں۔ سمٹی جا رہی تھیں۔ سمٹی جا رہی تھیں۔ وہ صحن۔ دیواریں گڑیا کے گھر کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ گڑیا میرے سامنے کٹ پتلی کی طرح بیٹھی تھی۔ سامنے دروازے میں ایک گڈا دیوار۔ صحن اور زمین کو گھور رہا تھا۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا مجھے جیسے وہ ایک تماشا گاہ ہو۔ جہاں کٹ پتلیاں ناچ رہی تھیں۔

"پرسوں چلے جانا" گڑیا نے ماتھا ٹیک کر کہا۔

"پرسوں" میں ہنسا "نہیں پرسوں نہیں"

"تو کیا؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"اونہوں۔ میں تو یہاں ایک مہینہ ٹھہرونگا۔ تمہارے پاس" یہ کہہ کر میں باہر سیر کے لئے نکل گیا۔ گڈا اندر بیٹھا غصے میں بڑبڑا رہا تھا۔

ممتاز مفتی

آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

اقبال

غزل

حسن و محبت کی رہ میں ایسے بھی مقامات آئیں گے
وہ ہم کو سمجھائیں گے اور ہم ان کو سمجھائیں گے

طوفانوں سے کھیلنے والے ساحل پر کب آئیں گے
ساحل جو قریب آ جائے گا کچھ اور پرے ہٹ جائیں گے

اُمید گئی دل ٹوٹ گیا، تقدیر ہے یوں تو یوں ہی سہی
تب زیست سے دل بہلاتے تھے اب موت سے دل بہلائیں گے

ساقی نیچی نظریں رکھ کر، دینا مجھکو پیمانہ
ورنہ پیمانے سے پہلے ہوش مرے اُڑ جائیں گے

اُف یہ موسم، یہ صہبا، یہ مستی بدمست آنکھوں کی
پینے والے سوچ رہے ہیں ہوش میں کیونکر آئیں گے

نزدیک نہیں آتے نہ سہی، آنچل ہی ہلا دو دُور سے تم
کچھ تسکیں تو ہو جائے گی، کچھ آنسو تو پُچھ جائیں گے

گلشن میں تعمیر نشیمن کا جو کروں میں قصد علیؔ!
بادل اپنے دامن میں بجلی بھر بھر لائیں گے

علی احمد

سنگ تراش

کردار:- (۱) فن کار (۲) بُت (حسینہ)

منظر:- چاندنی رات، فن کار کا باغ

فن کار:- میرے شہکارِ جمیل، اے مرے شہکارِ جمیل
چاند کا نغمۂ سیال، ترے سینے میں
کاش اک ولولۂ زیست فروزاں کردے
یہ مہکتی سی، تھرکتی سی، چھلکتی چپ چاپ
تیرے قدموں میں کوئی رقصِ مست بھر دے
منجمد سینۂ سنگیں کا یہ بیہوش ابھار
یک بیک شدّتِ احساس سے موجوں کی طرح
نور و ظلمت کی کشاکش کا نمونہ بن جائے
مرمریں جسم میں انگڑائیاں لے گرم لہو
جیسے مینائے بلوریں میں لرزتی ہے شراب
اے مرے عکسِ تصور۔ مری قندیلِ خیال
میری تخئیل کی تصویرِ حسیں۔ جسم ترا
میرے ہاتھوں نے تراشا ہے ترے ہونٹوں پر
جاوداں ہے وہ تبسم کہ دیا ہے میں نے۔
کاش یہ ہونٹ یہ نغمات مجسم تیرے
گائیں، ٹپکائیں میرے کانوں میں رس کی بوندیں۔
میں خدا ہوں کہ مرے ہاتھوں سے اک تودۂ سنگ
جسم پاتا ہے مگر روح نہیں پا سکتا۔
میری مجبوری خداؤں کی ہنسی ہے شاید
میں وہ فن کار ہوں، یہ سارے خدا مل کر بھی
میرے اس خامۂ آہن کو نہیں پا سکتے
ان کی تخلیق کوئی کبڑا، کوئی اندھا، اُف!
اور یہ حُسن، یہ ڈھالا ہوا بے حس شعلہ
یہ توازن، یہ تبسم، یہ اُتار اور چڑھاؤ
ایک خوابیدہ طلسم، تا بہ ابد مست شباب
اس کا آئینہ کہاں دہر کے فن پاروں میں
دیوتا چاند کے انوار کے گہواروں میں
کاش آجائیں یہاں اور مرے نغمے کو
میرے اس نغمۂ جامد کو حرارت بخشیں
اور حسین جواں سیلِ رواں بن جائے (وقفہ)
میری تکمیلِ تمنا، مری دنیا ہے یہی!
دیوتاؤ مری ہستی کا تقاضا ہے یہی!
آج تک میرے تکبر نے اٹھایا تھا جسے
لو وہ سر آج میں سجدے میں جھکا دیتا ہوں

[ہوا کے تیزی سے چلنے کی آواز جیسے طوفان آگیا ہو۔ درخت لرز رہے ہیں ہر طرف ایک مہیب کیفیت طاری ہے]

فن کار:- میں نے جرم کیا ہے شاید ـــ میری خطا پر ناراضی ہے

[ہوا بدستور چل رہی ہے۔ فن کار کی آواز وقفے کے بعد اسی مصرع کو دہراتی سنائی دیتی ہے رفتہ رفتہ ہوا بند ہو جاتی ہے]

فن کار:- یہ نرم نرم چاپ۔ کہاں سے۔ کون ہے یہاں
ایسے میں میرے گھر میں بھلا کون آئے گا؟

ابرِ سیاہ ڈھانپ چکا رُوئے ماہتاب
تاریکیوں میں نور کا احساس ہے مگر؛

ہیں! کیا!! - ارے!!! وہ میری سمینہ ہے - میرا بُت
شاید سنی ہے میری دُعا دیوتاؤں نے!

ہاں! ہاں سنی ہے میری دعا دیوتاؤں نے
(دوڑ کر سمینہ کے پیچھے جاتا ہے)
میری سمینہ، میرے تخیل کی ساحرہ
اے میری شاہکار خدائی کی شاہکار
میں! دیکھ! میں ہوں خالقِ ارضی ترا - سُنا
رُک تو سہی — یہ میری محبت تھی جس کی آگ
تیری رگوں میں خون کے مانند ہے رواں

سمینہ:- محبت! نہیں یہ محبت نہیں ہے
ہوس ہے - ہوس - میں تمھیں جانتی ہوں
تمھاری نگاہوں کی تنہائیوں نے
مرے جسمِ سنگیں کی تعمیر چاہی
مگر پھر بھی تسکین ممکن نہیں تھی،
مرے جسمِ سنگیں کی ٹھنڈی حرارت
تمھاری رگ وپے میں خوں کیسے دوڑائے
مرے سرد ہونٹوں کا برفیلا سانس
بھلا کیسے تشنہ لبی کو بجھائے!
یہ ممکن نہیں تھا — ہوس نے مگر پھر
نیا جال پھینکا — نئی بات سوچی
محبت، غلط یہ محبت نہیں ہے

فن کار:- بہت عجیب ہے اندازِ گفتگو تیرا
کہیں خدا سے بھی ایسے کلام کرتے ہیں
مری دعائیں، میری التجائیں کام آئیں
مجھے خداؤں نے آخر دیا وہ حسنِ جواں
کہ جس کے سامنے خود چاند بھی ہو جائے
میری حیات کی تاریکیوں کو تاریکی کار
تیری نگاہ کی مشعل کی ضیا ہی میں
نہیں ہے مجھ سا کوئی خوش نصیب کوئی کہاں
میری حسینہ، سمینہ چلو چلیں گھر میں
چلیں چراغ جلائیں، ایاغ چھلکائیں

سمینہ:- اے بوالہوس! تری نگہِ گرم کا چراغ
روشن ہوا ہے حرص و ہوس کے چراغ سے
تو دُشمنِ حیات ہے اے خالقِ حیات
تو جانتا ہے میں تھی ستاروں کی رازدار؟
میں دخترِ ہمالہ سرافراز و پُرشکوہ
صدیاں رہی ہیں مرے پلّوئے سنگ پر
تونے میرا شکوہ - میری ہیبت و وقار
پربت کی رفعتوں سے زمیں پر پٹک دیا
اے خالقِ حیات، نہیں دشمنِ حیات

فن کار:- میرے طوفانِ محبت کی امیں، میری حسیں
نہیں یہ بات نہیں، مجھ پہ گمانِ دشمن؟
چھوڑ ان باتوں کو اب رہنے دے
حسن ہر رنگ میں اک شعبدۂ حیرت ہے
تیرا خاموش تبسم بھی قیامت تھا مگر
اب غضبناک تکلم بھی نہیں کم اس سے
مسکرا میری محبت کے شرار
میرے ان ہاتھوں کی ترشی ہوئی رنگین بہار
آ میرے ساتھ کہ اک عمر رہا ہے مجھ کو
انتظار ایک اسی لمحے کا۔

سمینہ:- تجھے تو اپنے تقاضوں سے ہی نہیں فرصت
تجھے مرے دلِ غمگیں سے کام کیا ہوگا!
مجھے خبر ہے کہ یہ اہتمامِ شوق تمام
یہ تیرا فن — کہ میسر ہو تجھ کو عمرِ دوام

فقط گریز ہے۔ اے پیکرِ ہوس ہے گریز
یہ تُو، یہ تیرے شبِ معتدل، یہ تیرے ایام
یہاں گریز ہے ہر صبح و شام تیرے لئے
میرا وجود ہے تیرے لئے گریز ۔۔۔ مگر
میرے وجود کو تیری گریز سے کیا کام
میں تیری حرص پہ قربان ہو نہیں سکتی

فن کار:- گریزاں ہے تو سہی زندگی گریز۔ مگر...
تیری حیات بھی میری گریز ہے۔ لیکن...

سمینہ:- لیکن کیا۔ اس لیکن ویکن سے کیا مجھکو مطلب ہے
کیوں لائے ہو پیکرِ سنگیں سے مجھکو مٹی میں ملانے
میرے جلال کو اپنے جمالِ بے مایہ کی بھینٹ چڑھانے
میں اس دھوکے آہنی پہیوں سے بچنا کب جانتی ہوں
میری جوانی کے ڈھلنے پر کون آئیگا مجھ کو بچانے
پتھر تھی تو وقت کی دھیمی گردش دیکھ کے ہنس دیتی تھی
اب اک مٹی کی پتلی ہوں وقت چلا ہے ناچ نچانے
میں اس دو روزہ جینے سے موت کو بہتر جانتی ہوں
جو کل اُجڑے گا اس گھر کو میں کیوں جاؤں آج بسانے

فن کار:- میں تری باتوں پہ حیراں ہوں مجھے حیرت ہے،
یہ ترا فلسفہ۔ یہ حُسن، یہ اندازِ نظر
آہ میں کیا کہوں۔ کچھ بات نہیں بن پڑتی
دیوتاؤں نے ترے جسم میں خوں دوڑایا
لیکن افسوس ترا دل ہے ابھی پتھر کا
دیوتاؤں کو میسر نہ ہُوا پر نہ ہُوا
کہ ترے دل کو دھڑکنے کے لئے کہہ سکتے
اور اس پارۂ سنگیں کو حرارت دے کر
موم کر سکتے میرے غم میں پگھلنے کے لئے

سمینہ:- تُو تو کہتا تھا کہ تکمیلِ تمنا تیری
میرے پیکر کیلئے زیست ہے اور کچھ بھی نہیں
تُو تو کہتا تھا کہ یہ ہونٹ مرے گانے لگیں
لے ترے دل کے تقاضے کی یہ تکمیل ہو دیکھ
[سمینہ آہستہ آہستہ گانے لگتی ہے]

جیون ایک ادھورا سپنا
جو دیکھے گھبرائے
کاہے آنکھ لگائے ۔۔۔ جی ترسائے موکھ
خود پھونکے گھر اپنا
جیون ایک ادھورا سپنا

فن کار:- بس میری جان کہ اب تاب نہیں سننے کی
چھوڑ ان باتوں کو ان درد بھرے نغموں کو

سمینہ:- اب نہ دے طولِ ہوس کو میرے فن کار عبث
ہے یہی بس کہ ملی عمرِ گریزاں مجھکو
یہ تیری بھول تھی کیا میری ہوس کچھ بھی نہیں
میری ہستی کے تقاضے نہیں کیا کچھ بھی نہیں
کیا میرے دل کو کسی بات کی خواہش ہی نہیں
کیا میری زیست فقط تیرا اشارہ ہے نہیں
نہیں یہ بات نہیں میرا تقاضا بھی ہے کچھ
میری تمنا بھی ہے کچھ ۔۔۔

فن کار:- تیرا تقاضا بھی ہے کچھ ۔۔۔ کیا ہے تقاضا تیرا
[ہوا پھر زور سے چل پڑتی ہے۔ پتے لرز رہے ہیں۔ درخت ہل رہے ہیں جیسے طوفان آگیا ہے]
(فنکار کی آواز بار بار سنائی دیتی ہے)
تیرا تقاضا بھی ہے کچھ ۔۔۔ کیا ہے تقاضا تیرا
[ہوا بند ہو جاتی ہے۔ چاند بادل سے نکل آتا ہے]

فن کار:- پھر یہ طوفان ۔۔۔ یہ طوفان ۔۔۔ یہ اندھا طوفان
(وقفہ)
مجھے تو ہول سا آنے لگا تھا ۔۔۔ اُف توبہ
یہ کیسی تیز ہوا تھی ۔۔۔ یہ کیسا طوفاں تھا
مگر خداؤں کا احسان ہے کہ نکلا چاند
(چونک کر) کہاں گئی وہ سمینہ ۔ ارے ۔ ارے ۔ یہ کیا

[قدموں کی چاپ بت کی طرف بڑھتی ہے]
تو اپنے خوابِ مرمریں کی سمت پھر چلی گئی
چلی گئی مجھے سکونِ مضمحل میں چھوڑ کر
تجھے نہ تھی یہ میری آب و گل کی زندگی پسند
تو ایک بت ہے۔ میرا شاہکار۔ میرا شاہکار

(سوچتا ہے)

میرا شہکار غلط — یہ نہیں شہکار مرا
یہ تو اک تودۂ سنگیں ہے۔ فقط تودۂ سنگ

(سوچتا ہے)

میں اس کو توڑ دوں — [illegible]
کہ یہ جہالت کی بیٹی ہے — شاہکار نہیں
کہ اس کے سینۂ سنگیں میں دل ہے پتھر کا
یہ میرا فن — یہ مری زندگی یہ صبح و شام
یہ سنگ پارہ دل میں میری تلاشِ حسن تمام
گریز ہے — تو پھر اس سے گریز کرتا ہوں

(قہقہہ لگاتا ہوا بت کو توڑ دیتا ہے)

یوسف ظفر

دُعا

ریگِ صحرا میں کوئی شاخ نہیں پھول نہیں
ریگِ صحرا میں کہیں ایک پرِ کاہ بھی موجود نہیں
ہر افق وسعتِ صحرا کا فسوں ہے گویا!
دور تک کچھ بھی نہیں — کچھ بھی نہیں!
ریگِ صحرا میں کہیں برگِ خزاں تک بھی نہیں
وہرِ لالہ و گل کی لیکن
ررے ذرّے سے مہک آتی ہے
یگِ صحرا میں ہے اک گہرا طلسمِ خوشبو
س نے ہر ذرۂ صحرا کو مہک بخشی ہے؟!
وحِ گلزار میں صحرا کو بسایا کس نے؟!
س نے صحرا کو مہک بخشی ہے؟!

ہم بھی ویران تمنائیں لئے پھرتے ہیں
ہم بہاروں کے تصوّر سے بھی محروم ہوئے پھرتے ہیں
دل میں اب نقشِ خزاں تک بھی نہیں
عہدِ رفتہ کی بہاروں کا نشاں تک بھی نہیں
دل میں ویرانۂ ارماں کے سوا کچھ بھی نہیں
کچھ نہیں اس کے سوا کچھ بھی نہیں!
روحِ گلزار میں صحرا کو بسانے والے
ہم بھی ویران تمنائیں لئے پھرتے ہیں!

محمد خلیل الرحمٰن

قواعد

۱- "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- مسودے نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے۔

۳- دل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۴- جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے۔

۵- "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتاً مل سکتا ہے۔

۶- منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔

۷- چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنے۔

مینیجر "ہمایوں"

۳۶- لارنس روڈ- لاہور

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
باہتمام [illegible] یوسف ظفر بی اے

فہرست مضامین

"ہمایوں" - بابت ماہ جون ۱۹۴۶ء

جلد ۴۹ — نمبر ۶

قیمت سالانہ ۵ روپے — ششماہی ۳ روپے — فی پرچہ ۸ آنے

بزمِ ہمایوں

یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو "ہمایوں" اپنی زندگی کی چھبیسویں منزل میں قدم رکھے گا۔ یہ عمر بظاہر کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتی لیکن اپنے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمایوں ان چند ماہناموں میں سے ہے جو وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ رواں رہے اور جنہیں ماحول کی ناقابلِ برداشت سختیاں بھی مایوس نہ کر سکیں۔

گزشتہ پچیس سال کے دوران میں اردو ادب نے جو کروٹیں لیں اُن کی آئینہ داری کے سلسلے میں "ہمایوں" ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ اُس نے اپنے دامن کو ملوّث نہیں ہونے دیا۔ اور آج بھی مستقل اور معیاری ادب کے لئے اُس کی آغوش وا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کل کا مورخِ ادب اور نقاد ہمایوں کی ان خدمات کا اعتراف کرے گا۔

جنگ ختم ہو چکی ہے۔ لیکن صورتِ حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ اس کے باوصف ہم "ہمایوں" کی روپہلی جوبلی منانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمایوں کی چھبیسویں منزل کے آغاز پر ہم اپنے ماضی کا جائزہ لیں اور "انتخابِ ہمایوں" کے نام سے ہمایوں کے بہترین مطبوعہ مضامینِ نظم و نثر کا مجموعہ شائع کریں۔ یہ مجموعہ ہمایوں کی تقطیع کے کم و بیش چار سو صفحات پر مشتمل ہو گا، اور مجلد صورت میں شائع کیا جائے گا۔ اسی سلسلے کی دوسری شق کے طور پر حسبِ معمول سالگرہ نمبر جسے اب جوبلی نمبر کا نام دیا جائے گا شائع ہو گا۔ اس میں ایک نمایاں فرق ملحوظ رہے گا، اور وہ یہ کہ اس کے تمام تر مضامین گزشتہ پچیس سالہ ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہوں گے۔ جوبلی نمبر کی ضخامت تین سو صفحات ہو گی اور خریداران ہمایوں کی خدمت میں بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

دیکھنے میں یہ کام بہت مشکل اور محنت طلب ہے۔ لیکن اس گرانبہا علمی خدمت کے اعتراف کا یہی تقاضا ہے کہ ہم "ہمایوں" کی اس جوبلی کو پوری اہمیت دیں، تاکہ اس کا مستقبل زیادہ روشن ہو اور اس کو قرار واقعی داد ملے۔

جوبلی نمبر اور انتخاب ہمایوں کا کام ابھی سے شروع کیا جا رہا ہے۔ اگر ہمارے قارئین کرام ہمیں اس سلسلے میں کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم اُن کی ہر مناسب تجویز کو شکریئے کے ساتھ عملی جامہ پہنائیں گے۔

اور اب ایک اور بات —— دو سال سے ہمایوں مجبوراً اخباری کاغذ پر شائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب حکومت ہند کی کرم فرمائی سے ہمیں آئندہ کے لئے سفید کاغذ کا کوٹا مرحمت کیا گیا ہے۔ یہ امر جہاں باعثِ مسرت ہے۔ وہاں ایک دقت کا پیش خیمہ بھی، بدقسمتی یہ ہے کہ سفید کاغذ کا حصول قریب قریب ناممکن ہے۔ تاہم "ہمایوں" کی روایات کی سختی سے پیروی کرتے ہوئے ہم کوشاں رہیں گے کہ اس کی پابندئ اوقات میں فرق نہ آنے پائے۔

اس شمارے کے بعد "ہمایوں" سفید کاغذ پر شائع ہو گا۔

یوسف ظفر

جہاں نُما

گاندھی جی کی ہندستانی

گزشتہ آٹھ دس سال سے کانگریس نے ہندستانی کو ملک کی قومی زبان بنانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ہندستانی بقول گاندھی جی ہندی اور اُردو کی آمیزش کا نام ہے۔ اپریل کے "جہاں نما" میں ہم نے گاندھی جی کا یہ سوال دُہرایا تھا کہ "کوئی ہندستان کا رہنے والا حقیقی معنوں میں ہندستانی سے کیسے مُنہ موڑ سکتا ہے؟ اسے سب کے لئے قابلِ قبول ہونا چاہیئے۔" اس کے ساتھ ہی آپ نے ملک کو دونوں زبانوں کے مطالعے کا مشورہ دیا تھا۔ تاکہ یہ تیسری زبان وجود میں آسکے۔ ہم اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ ہندستانی وہ زبان ہوگی جو آل انڈیا ریڈیو کی تقاریر یا خبروں میں ملتی ہے اور جسے اُردو یا ہندی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ہماری یہ تعبیر بقول پرنسپل ایس۔ این۔ اگروال جنرل سکریٹری ہندستانی پرچار سبھا غلط ثابت ہوئی کیونکہ ان کے نزدیک ریڈیو کی زبان "خالص اُردو زبان ہے" ہمارا ماتھا تو وہیں ٹھنکا تھا کہ یہ بزرگ جس ہندستانی کی ترویج چاہتے ہیں وہ فارسی حروف میں خالص ہندی ہوگی۔ لیکن چونکہ اس نومولود کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہ تھا۔ ہم صدائے احتجاج بلند کرکے خاموش ہو رہے۔ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ اعلان دیکھ کر کہ گاندھی جی کا اخبار "ھریجن" ہندستانی میں بھی شائع ہوگا۔ ہمیں ایک گونہ اطمینان ہوگیا کہ اب ٹکسالی گجرات کاٹھیاواڑ کے زبان ساز جس ہندستانی کا ڈھنڈورہ پیٹ رہے تھے وہ پہلی مرتبہ ظہور میں آئے گی۔ اور ہم اُسے قبول یا رد کر سکیں گے چنانچہ اخبار شائع ہوا۔ نام ہے "ہریجن سیوک" اس کے دو شمارے ہمارے سامنے ہیں۔ سب سے پہلے جس چیز پر نظر جاتی ہے وہ "سمپادک" کا لفظ ہے۔ جسے مدیر کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "جلد" کی بجائے "بھاگ" اور "نمبر" کی بجائے "انک" ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتے ہیں۔ "فہرست مضامین" کے لئے "وشے سوچی" کا لفظ تراشا گیا ہے۔ اور صفحے کی جگہ "پرشٹھ" کا۔ اب دو تین عنوانات بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ آہنسک سیوادل۔ جات پات روپی گھن۔ سفید پوشوں یا آر دپ۔ پہلے شمارے کے تمام مضامین گاندھی جی کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔ اس پرچے کا نقطۂ نظر سیاسی ہے یا فلاحی، ادبی ہے یا اقتصادی، اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ مضامین کے دیکھنے سے البتہ اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی ہر سوچ ایک مضمون کی صورت اختیار کر لیتی ہے اب زبان کی طرف آیئے۔ فل سکیپ کے آٹھ صفحوں میں جو زبان پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعض الفاظ اور جملے اس کا تعین کرنے میں مد ثابت ہوں گے۔ چنانچہ درجِ ذیل ہیں۔

شریر (جسم) گون (کم اہمیت والی) شریری (آتما) چرتر (چال چلن) چرترواں، وشے، سہیوگ، وشواس، شردا (اعتقاد) شکتی کا اپیوگ، نیم (قاعدے) سیوک کے پاس کھاٹوں وغیرہ کی سار سنبھال کے لئے ترنت کام دینے والی چیزیں رہنی چاہئیں، ہتوک شاستر، ادھیاتم، (روحانیت) ورودھ، شاستراوی کے ابھیاسی، پھل ماتر، بھڑوتری، جیودیا کا اتھ، جیومنش، وچار، اپدرشٹ کشٹیہ۔ بدھی، تیغشر پانی، (دوسرے جاندار) سیتا، بدیا، سوارتھ، مہادیو کے واہن، لیکھک کی بات ترک پورن ہے، دیا پورن

تیاگ، ساودھان، آہاج، نیتک بندی، سجل بھاتی، بھرپائی، منتری منڈل (وزارت)، سوابھاوک، پرانتیہ، ایمت (محدود)، ختر، جمہوری سنستھا کو شدھ بنانا، وچار، راج راجیہ، دیمان، بھوشیہ، آتھک، پونجی پتی، پرتی روپ، کلپنا، نیتک درشٹی، آہنسا وادی، سدھارک، نراشا وادی، ساودھان، آشا، پریتن، امبھو سا، چیتر میں وچے بنی، اچت، تین ماس، سمپرک، دشٹ، پرتین، پھانڈال، ایک کنڈ مریادا - شور (کیمپ)، سنچ لک، سدسیا، بیتھ پر ورتنک، کمیا کارن، ترشتعلنا (سستی)، سجل کارن، آویدن پتر، تراس، پدھتی کے انوسار، پرورسنے، روزکا دکینی گت، بھوجن، انوبھو، کریا، جھنڈا، ارو ہن کی چالو پدھتی، ادھیکشن، ابھاس، (مشق) سوبھاوک، آرمبھ، پروچن، پربل، اچھا، چلیے، اس طرح ہمیں لگا کہ اس شبد میں اردو ورگ شروع کرنے سے ہمیں فائدہ ہوا ہے، سماستھیا - رتل، شکشکوں، سپتہ، —— اور اب آخری جملہ پرنٹر پبلشر کی بجائے مدرک اور پرکاشک صاحب کا پتہ نوجیون مدرنالیہ، کالوپور، احمد آباد ہے۔ یہ ہے گاندھی جی کی ہندستانی جسے ہندوستان کی قومی زبان بننا ہے۔ اب اردو کی آمیزش بھی ملاحظہ فرمایئے —— "نقطۂ نگاہ، رقیبانہ تصورات، اس آشا میں، اور نظریے، —— لیکن یہ الفاظ ایک ایسے تذکرے کے ہیں جو شیشین سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی ترجمے کا ایک نہایت خوبصورت جملہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔۔ "سانس لینے کی مہلت کی، مبارک افاقہ کی، انسان اور خدا میں علائق صلح کی جتنی ضرورت آج کل ہے، کبھی نہ تھی۔"

اب گاندھی جی کی جناتی ہندستانی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے —— "مجھے ایسے کافی خط ملے ہیں۔ ان میں کانگریس کے نامی لوگوں پر دیبھچار کا آروپ ہے۔ سب خط بناوٹی ہیں۔ ایسا مان کر بیٹھے رہنا اچت نہیں لگتا۔ یہ ابھیمان کی بات ہے کہ کانگریس میں کچھ بھی عیب نہیں ہونا چاہئے۔ ایسی مانیتا رہتی ہے۔ دیبھچار آدمی ہر قسم کے لوگوں میں چلتا ہے۔ میرا کرتویہ اتنا ہے کہ اگر یہ الزام کسی کو بھی لگو ہوتا ہے تو اسے درست کیا جائے۔ دیبھچا کرنے میں بھی کچھ مریادا تو رہتی ہے۔"

—— کیا سمجھے آپ، اگر ہندوستان بھر میں کوئی شخص آپ کو یہ زبان بولتا ہوا ملے، تو ہمیں اطلاع دیجئے گا، ہم مشکور ہوں گے۔ "ہریجن سیوک" اور اس کے سمپادک کے بارے میں اب کچھ لکھنا لاحاصل ہے۔ ہاں یہ ضرور کہیں گے کہ اگر یہ اعلان کر دیا جاتا کہ ہندی کو اردو کے حروف میں پیش کیا جا رہا ہے تو ہمیں قطعاً اعتراض نہ ہوتا —— گاندھی جی خود تو اب اس مقام پر ہیں جہاں وہ اپنی روح کی آواز کے سوا کسی کی سنتے ہی نہیں اس لئے ہمیں ہریجن سیوک کے سمپادک پیارے لال صاحب سے یہ کہنا ہے کہ یہ زبان جس کی آپ ترویج چاہتے ہیں ہر ہندستانی کے گھر تک پہنچایئے۔ تاکہ ہمارا ملک ساڑھے تین سو سال کے بعد پہلی مرتبہ قہقہوں سے گونج اٹھے۔ آپ اردو کے لئے اس ہندستانی کے نمونے شائع فرما کر جو کام کر رہے ہیں وہ ہم سب سے نہیں ہو سکا۔ اور ہم اس کے لئے آپ کے مرہونِ احسان ہیں۔

پرماتما آپ کو اس سے بھی بڑا سمپادک بنائے!

یوسف ظفر

عورت اور مرد

حیاتِ انسانی کا ذہنی و جسمانی پہلوؤں سے مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ عورت مرد کی نسبت جلد ذہنی و جسمانی پختگی حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے علاوہ عورت میں مرد کی نسبت بچوں کی سی خصوصیات زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے ذہنی و جسمانی اعتبار سے ایک اوسط درجے کی عورت ایک اوسط درجے کے آدمی سے بہت مختلف ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ اختلافات نہایت اہم اور گہرے ہوتے ہیں۔ اگر ان نفسیاتی اور حیاتیاتی اختلافات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ عورت مرد کی نسبت بچے سے نزدیک تر ہوتی ہے۔

عورت کے قبل از وقت ذہنی و جسمانی پختگی حاصل کر لینے سے ہر شخص واقف ہے۔ مگر اس کی صحیح اہمیت سب سے پیشتر ہیولاک ایلس نے ہی محسوس کی تھی۔ ہربرٹ سپنسر کے نزدیک عورت کا بعض خصوصیات میں بچے کے نزدیک ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ عورت ایک "غیر مکمل مرد" ہے۔ یہ ایک غلط اور گمراہ کن خیال ہے کیونکہ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ مرد عورت کی نسبت کسی اعتبار سے زیادہ مکمل ہے۔ یا یہ کہ ارتقا کے نقطۂ نظر سے مرد عورت کی "ترقی یافتہ صورت" ہے۔ یا پھر یہ کہ سلسلۂ ارتقا میں مرد زیادہ بلند ہے۔ یہ کہنا کہ عورت ایک "غیر مکمل مرد" ہے اتنا ہی صحیح ہے جتنا یہ کہنا کہ مرد ایک "نامکمل عورت" ہے۔ کیونکہ جسمانی طور پر ہر جنس میں بعض ایسے نامکمل اعضا موجود ہیں جو دوسری جنس میں اپنی پوری پختگی کو پہنچ چکے ہیں۔ اس لئے ان میں سے کوئی بھی جنس مکمل یا نامکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔ اگر مکمل ہوں گی تو دونوں جنسیں اور غیر مکمل ہوں گی تو جب بھی دونوں لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو مکمل اور دوسری کو غیر مکمل جنس تصور کرنا ہماری اپنی عدم واقفیت کا ثبوت ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کا مرد کی نسبت بچے سے قریب تر ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آخر کس حیثیت سے عورت اور بچہ ایک دوسرے کے قریب ہیں؟ یہ جاننے کے لئے ہمیں سلسلہ ارتقا میں سے ایک مثال پیش کرنی پڑے گی۔ یہاں ہمیں سلسلۂ ارتقا میں بچے کا درجہ متعین کرنا پڑے گا۔ اور معلوم کرنا ہو گا کہ اس سلسلے میں بچے کی اور خاص طور پر انسانی بچے کی کیا حیثیت ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ارتقائی لحاظ سے بندر کا بچہ بندر کی نسبت انسان سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندر کا بچہ بندر کی نسبت سلسلۂ ارتقا میں زیادہ بلند ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے ارتقائی منازل طے کرتے وقت کسی جوان بندر سے نہیں بلکہ بندر کے بچے سے آغاز کیا ہو گا۔ اور اس کے بعد بندر رہا ہے۔ اب انسانی بچے کا اپنی جنس میں وہی درجہ ہے جو بندر کے بچے کا اپنی جنس میں۔ اور آئندہ ارتقائی منازل طے کرنے میں انسانی بچے کا وہی حصہ ہو گا جو بندر کے بچے کا اس سلسلہ کو انسان تک پہنچانے میں ہے۔ جس طرح بندر کا بچہ انسان کو وجود میں لانے میں مدد ثابت ہوا ہے بعینہٖ انسانی بچہ کوئی دوسری جنس ظہور میں لانے میں مدد ہو گا۔

ہمارے دماغ میں خواہ مخواہ یہ خیال سما گیا ہے کہ ایک جوان آدمی بچے کی نسبت زیادہ مکمل اور ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ ماحول کی مطابقت کی رو سے یہ بالکل صحیح ہے کہ مضبوط ہڈیوں اور چھوٹے سر والا گوریلا اپنے بچے کی نسبت دنیا

میں زندہ رہنے اور قدرت کا مقابلہ کرنے کے زیادہ قابل ہے۔ لیکن علم الحیوانات کی رو سے یہ قدر ابھی ترقی نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک جوان مرد بچے کی نسبت اپنی حفاظت بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں زیادہ تیز بھاگ سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی عمر کے تیسرے سال کے بعد جتنی بھی ترقی کرتا ہے سب ترقی معکوس ہوتی ہے۔

اس نقطے کی وضاحت کے لئے ہمیں علم بشریات کی مدد لینا ہو گی۔ اگر ہم دنیا کی مختلف اقوام کا مقابلہ کریں تو افریقہ کے غیر مہذب بچے اور ایک یورپین بچے میں اس کی ذہانت کے لحاظ سے بہت کم تفاوت نظر آئے گا۔ لیکن جوں جوں یہ بچہ بڑھتا جاتا ہے نہایت غبی اور اکھڑ بنتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک مہذب مرد اپنی عمر کے ساتھ بچے کی سی شگفتگی اور تازگی قائم رکھتا ہے۔ دنیا کے ذہین ترین انسانوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان خصوصیات کے لحاظ سے بچوں سے کس قدر نزدیک ہوتے ہیں۔ ان میں وہی شگفتگی تا عمر قائم رہتی ہے جو بچوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس مختصر بحث سے بخوبی ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ عورت اور بچے کی باہمی مماثلت کا کیا مطلب ہے؛ اس سے مراد عورت کی شگفتگی و تازگی۔ بڑا سر، چھوٹا چہرہ اور بغیر بالوں کے نرم و نازک جسم ہے۔

سلسلۂ ارتقا میں بچے کا درجہ متعین کر لینے سے عورت کی حیثیت بھی ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ عورت میں انسانیت کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بالوں کے معاملہ میں جیسا کہ ڈارون ہمیں بتلاتا ہے عورت کا بغیر بالوں کا جسم ارتقائی منازل طے کرنے میں مرد کے پیش پیش ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت بچے سے زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔ جبکہ مرد اپنی اصلی منزل سے منحرف ہو چکا ہے۔ عورت کسی حد تک قدامت پرست بھی ہے۔ لیکن اس کی قدامت پرستی کا ازالہ ہو جاتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عورت جسمانی خصوصیات کے لحاظ سے اس انسانی نصب العین کے زیادہ قریب تر ہے جس کی طرف انسان اپنے قدم بڑھا رہا ہے۔ وحشی انسان کی نسبت ایک مہذب باشندہ اپنے بڑے سر، چھوٹے چہرے اور نازک جسم کے لحاظ سے عورت سے مشابہت رکھتا ہے۔ نہ صرف جسم کی دوسری ہڈیوں کی ساخت کے لحاظ سے ہی موجودہ مرد عورت کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ بلکہ ایک مہذب مرد کی کھوپڑی بھی وحشی انسان کی نسبت زنانہ کھوپڑی سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

موجودہ زمانے کا طالب علم ایک مثالی مہذب انسان ہے۔ نفسی و جسمانی اعتبار سے وہ عورت اور مرد کا درمیانی درجہ رکھتا ہے۔ موجودہ تہذیب میں انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ہم مرد کو عورت کے تعاقب میں دیکھتے ہیں۔ تمدن کی ابتدائی منازل پر تمام دستکاریاں عورت کے قبضہ میں تھیں اور مرد کا پیشہ وحشی پن اور جنگ و جدل تھا۔ جوں جوں مختلف ممالک میں دستکاریاں بڑھتی جاتی ہیں درندہ صفات مرد یہ پیشے اختیار کرتے جاتے ہیں جو کسی زمانے میں صرف عورت کے لئے مخصوص تھا۔ لہٰذا دستکاری نے مرد کو عورت سے قریب تر کر دیا۔

ان دلائل سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ عورتوں کو عمرانی، نفسیاتی یا حیاتیاتی بنا پر مرد سے کمتر بتانا ہماری اپنی نادانی اور بے بسی کا اظہار ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ان دونوں جنسوں میں سے کسی ایک کی کمزوری اور دوسرے کی فوقیت ثابت کرنا فضول کوشش ہے۔ کیونکہ جو ایک جنس میں کمی ہے وہ دوسری جنس میں پوری کر کے نوع انسانی کا توازن قائم رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ حیات انسانی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کی نسبت مرد میں "سلسلۂ اختلافات" بھی بہت وسیع ہے۔ جس کے عمرانی و عملی اثرات نہایت گہرے اور مستقل ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "سلسلۂ اختلافات"

سے ہماری کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ جہاں مردوں میں غالب، شیکسپیر، ٹیگور، اقبال، ڈارون اور فرائڈ جیسے فطین اشخاص زیادہ پیدا ہوتے ہیں وہاں اس کا یہ بھی اثر ہے کہ ان میں عورتوں کی نسبت دیوانے اور مخبوط الحواس بھی زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فطین اور مخبوط الحواس اشخاص میں اختلافات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ چونکہ مردوں میں فطین اور دیوانے بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مردوں میں سلسلۂ اختلافات بہت وسیع ہے۔ اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ یہ اختلافات جہاں نہایت اعلیٰ اور مثالی مظاہرات کا باعث ہیں وہاں ان کی وجہ سے بعض نہایت نقصان دہ اثرات اور انحرافات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ عورتیں ہی تو ہیں جو اپنی میانہ روی سے نوعِ انسان کا توازن قائم رکھتی ہیں اور ان مضر اثرات اور انحرافات کو زیادہ نمایاں نہیں ہونے دیتیں۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے مردوں کو دقیق اور پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر عورت مرد کی نسبت زندگی کے عملی پہلو میں زیادہ حصہ لیتی ہے۔

ان نتائج کو ہم جتنا زیادہ اعماقِ نظر سے دیکھتے ہیں اتنا ہی یہ نقش ہمارے ذہن پر زیادہ مرتسم ہوتا جاتا ہے کہ ان دونوں جنسوں میں سے کسی کو بھی دوسری جنس پر تفوق حاصل نہیں۔ اور یہ ہے بھی درست کیونکہ اگر نوعِ انسانی کا نصف حصہ دُوسرے حصے سے کمتر ہوتا تو آج نوعِ انسان صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئی ہوتی۔ اور اشرف المخلوقات کہلانے کا حق تو انسان کو کسی صورت میں بھی حاصل نہ ہوتا۔

رفیع الزماں

غزل

جہاں والو جہاں میں رہ سکو گے	مگر کیا دردِ ہستی سہہ سکو گے
وفائیں رنگ لائیں گی کبھی تو	یونہی دھوکے میں کب تک رہ سکو گے
کہاں تک اے محبت کرنے والو	تمناؤں کی رَو میں بہہ سکو گے
ستانے والو، کیا مجھکو ستا کر	گھڑی بھر کے لئے خوش رہ سکو گے

عیاں اُن سے محبت کی کہانی
اگر کہنا بھی چاہو کہہ سکو گے

عیاں حیدرآبادی

حشرِ جذبات

عظمتِ تو یہ اگر میری نمایاں ہو جائے
دامنِ زُہد بھی آلودۂ عصیاں ہو جائے

کاش مِٹ جائے یہ محدود نگاہی کا اثر
کاش قسمت سے مرا گھر ہی بیاباں ہو جائے

تابشِ حُسن اُسے دعوتِ نظّارہ نہ دے
تیرے جلوؤں کے تلوّن سے جو حیراں ہو جائے

دیکھ اے سوزِ دروں دل سے دُھواں اُٹھتا ہے
ضبط کا راز نہ عالم پہ نمایاں ہو جائے

اس گنہگار کا پردہ نہ اُٹھا محشر میں،
دوسروں کی جو خطاؤں پہ پشیماں ہو جائے

ضبط کر ضبط کہ ایسا نہ ہو محرومئ دید
شکوۂ تنگئ دامانِ گلستاں ہو جائے

سجدۂ دیر ہو مفہومِ بنائے کعبہ
خام ہے خام اگر کفر بھی ایماں ہو جائے

خانہ ویرانی دعبرت کا سبق ہے جس میں
ذہن سے محو وہ رودادِ گلستاں ہو جائے

میری آنکھیں تو ہیں خونابہ فشاں اے ثاقب
میں جو چاہوں تو یہ دامن بھی گلستاں ہو جائے

ثاقب کانپوری

ہتک

ایک مدّت کے بعد آج حامد بھائی کا خط ملا تھا ــــــ!

"کل شام میں ایک ضروری کام سے انبالے جا رہا ہوں - واپسی پر چند دن کے لئے لاہور بھی اُتر دوں گا۔"

مجھے جیسے میرا کھویا ہوا خزانہ مل گیا - شدّتِ جذبات سے دل رُک رُک کر دھڑکنے لگا - آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں - اور میں خود کو پلنگ پر گرا کر سوچ میں کھو گئی -

تین سال ہوئے جب لوگوں کے تیروں کی تاب نہ لاکر حامد بھائی کو لاہور سے اپنی تبدیلی کروالینی پڑی تھی - مگر وہ یہاں سے کہاں چلے گئے تھے، اس کا علم مجھے بالکل نہ تھا - اور وہ شام کتنی اُداس تھی جب جاتے ہوئے انھوں نے کچھ بھیگی بھیگی آنکھوں اور کانپتے ہوںٹوں سے پہلی بار مجھ سے اس قسم کی گفتگو کی تھی کہ ــــــ "صغرا، لوگ اگر مجھے اس سے بھی زیادہ ذلیل باتیں کہہ دیتے شاید تب بھی میں اتنی پرواہ نہ کرتا - لیکن اپنی وجہ سے تمھیں بدنام ہوتے ہوئے میں نہیں دیکھ سکتا - اور اب میں اس وقت تک نہ آؤں گا جب تک کہ تم مکمل طور پر کسی کی ملکیت نہ بن جاؤ ــــــ لیکن مجھے ڈر ہے کہ لوگ اس وقت بھی ہمیں ــــــ" وہ کہتے کہتے رُک گئے - ان کی آنکھیں دُھندلی ہوتی جا رہی تھیں اور آواز بھاری -

"مگر میں آپ کو نہیں جانے دوں گی حامد بھائی" میں نے دیوانوں کی طرح اُن سے لپٹتے ہوئے کہا تھا -

"بیوقوف نہ بنو صغرا، تم نہیں جانتیں"

"لیکن آپ آخر اس کی پرواہی کیوں کرتے ہیں؟" میں نے چھپے چھپے اپنی صفائی پیش کی -

"وہ تو ٹھیک ہے بھئی - لیکن یہ دنیا ہے اور ہم اس کے کٹھن بندھن توڑ کر اس کا ساتھ نہیں دے سکتے"

"جی نہیں، میں ان ظالم بندھنوں میں پھنسی رہنا نہیں چاہتی - میں انھیں توڑ دوں گی" میں نے ضد کی -

"بھئی یہ کیا بچپن ہے ــــــ اور اب تو میری تبدیلی بھی ہو چکی - مجھے کل وہاں ضرور پہنچنا ہے"

"کہاں ــــــ؟" مجھ میں اتنی سکت ہی کب رہ گئی تھی کہ یہ پوچھ لیتی -

"لو بھئی، خدا حافظ" وہ تانگے میں سامان رکھوا کر واپس آئے تو میں کچھ کھوئی کھوئی سی دروازے میں کھڑی تھی - انھوں نے آتے ہی جھک کر میری پیشانی چوم لی ــــــ "اب اس روز آؤں گا جب تم اپنے پریوں کے شہزادے ــــــ!" وہ اپنے پرانے مذاق پر اُتر آئے -

"جائیے ــــــ خدا کے لئے جائیے حامد بھائی - مجھے مت چھیڑیئے" میں نے انھیں دھکیل دیا -

"اچھا پھر ملیں گے، خدا حافظ ــــــ" اور وہ لپک کر امّی وغیرہ سے رخصت ہونے صحن میں چلے گئے -

ان کے جانے کے تین چار روز بعد تک میں نے مُنہ نہ دھویا - پھر جب امّی نے ڈانٹا اور بانو اور صفیہ میں سرگوشیاں سی ہوئیں تو مجھے یہ خیال کشاں کشاں غسل خانے کی طرف لے گیا کہ حامد بھائی کی چُنی ہوئی دیوار مجھے گرنے نہیں دینا چاہئے -

اور پھر نہ جانے کتنی ہی دیر بعد تک میں اُس پاگل کو بلکتے ہوئے تالی میں سے دیکھتی رہی جو میری پیشانی پہ وہ مقدس بوسہ چرا کرنے گیا تھا۔

حامد بھائی آگئے تھے۔ وہی ناچتی ہوئی آنکھیں، مسکراتے ہوئے لب، اور تھرکتی ہوئی بھولی بھولی۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے والے نہ تھے۔ اور آگے پیچھے ہر گھڑی ہاتھ پاؤں چلتے ہی رہتے۔ یہ توڑ، وہ پھوڑ، وہ پھینک، وہ گرا۔ ایک طوفان سا آیا رہتا اور پھر عورتوں میں گھس کر بیٹھنے کی عادت تو ان کی ایسی تھی جس سے گھر کے بڑے بوڑھے ہمیشہ ہی جلے۔ ابا جان تو خیر مسکرا کر چپ ہو جاتے لیکن دادا میاں اور دادی اماں کے ماتھے پر بے شمار شکنیں پڑ جاتیں۔ اور وہ انھیں ایسی نظروں سے دیکھتے گویا اب گھر سے نکالا اور اب ——!

ایک دن سخت قسم کی سردی تھی۔ اور حامد بھائی رات کے کھانے کے بعد سب کو جمع کئے میرے کمرے میں تاش کھیل رہے تھے، کھیلے جا رہے تھے۔

"بھئی اب بس۔" میں اپنے دامن سے چلغوزے کے چھلکے جھٹکتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں بھئی اب چلو سب اپنے اپنے کمروں میں۔" انھوں نے میرے پلنگ میں گھستے ہوئے حکم چلایا۔

"اور آپ؟ ——"

"ہم تو آج یہیں سوئیں گے۔"

"لیکن میں؟"

"تم اپنے لئے یہاں ایک اور پلنگ منگوا لو۔ یا پھر میرے کمرے میں چلی جاؤ۔"

"آپ کا کمرہ تو کالے کوسوں ہے۔ مجھے ڈر لگے گا۔"

"تو پھر —— تو پھر ——؟" وہ سوچ میں پڑ گئے اور میں دل ہی دل میں بڑی خوش ہوئی کہ چلو پھا چھوٹا۔

"جی —— ؟" میں نے ہمہ تن انتظار بن کر پوچھا۔

"تو پھر —— تو —— تم —— تو —— پھر —— زہر کھا لو، اور کیا بتاؤں!"

"آپ نہ کھا لیجئے۔" میں واقعی چڑ گئی —— "ایک تو میرے کمرے پر قبضہ جما لیا۔ اوپر سے چلے ہیں زہر دینے۔"

"اچھا بھئی لو، میں ہی لائے دیتا ہوں تمھیں پلنگ، روتی کیوں ہو۔" وہ اُچک کر برآمدے میں نکل گئے۔ میدان صاف تھا۔ میں جلدی سے اپنے بستر میں گھس گئی۔

"خیر —— خیر ——" انھوں نے پلنگ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب اس پر بستر تو بچھا دو۔ میں ہی سو جاؤں گا اس پر —— لو اٹھو ——!"

اور جب میں بستر بچھانے اٹھی تو وہ نہایت اطمینان سے پھر میرے پلنگ پر دراز ہو گئے۔

"بھئی میں نہیں، بالکل تو جھولا ہو رہا ہے یہ پلنگ ——" میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ یہ چلے جائیں اپنے کمرے میں۔ ورنہ امی ——!"

"چلو زیادہ باتیں نہ بناؤ، اور چپکی پڑ کے سو رہو۔"

"لیکن پھر میں — اونہہ!" میں نے ناگواری کا اظہار کیا۔

"اوفوہ ری لڑکی" نے بھی میں چلا "تو تو بڑی اکٹر ہو گئی ہے۔ جیسے میں — ہونہہ!"

میرے دل کو ٹھیس سی لگی، اور میں چپکے سے لحاف میں دبک گئی۔ اور جب انھوں نے مُنہ ڈھک لیا تو میں کاپی پنسل سنبھال کر لکھنے کے نوٹس بنانے لگی۔ ایک نامعلوم گھبراہٹ سے میرا ہاتھ بار بار کانپ رہا تھا۔

بارہ بجے کے قریب امی اٹھیں۔ اور گھر کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ ہم لوگوں کی لاپروائی سے وہ بڑی بیزار تھیں کہ کھلے دروازے اور جلتی بجلیاں چھوڑ کر سو جاتی ہیں۔ خلاف معمول آج میرا دروازہ بھی کھلا تھا اور بجلی بھی روشن — وہ اندر آ گئیں۔

"یہ — حامد؟" انھوں نے دھیرے سے پوچھا۔

"جی! —"

"تو پھر تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ کیسی بُری بات ہے کہ وہ سو رہا ہے اور تم بجلی جلائے پڑھ رہی ہو" ان کا مطلب پالینا میرے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر بنتے ہوئے بولی۔

"اونہہ! تو کیا ان کے لئے میں پڑھائی بھی چھوڑ دوں اپنی۔ اور پھر اتنی سردی میں مجھ سے تو نکلا نہیں جاتا اپنے بستر سے"

"پاگل مت بنو۔ اپنی دادی کو جانتی ہو۔ اگر انھیں معلوم ہو گیا تو —" انھوں نے سچی بات کہہ دی۔

"اچھا لیجئے" میں جھنجھلا کر پیر پٹکتی ہوئی ان کے پیچھے چل دی۔ حامد بھائی کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے شکر کیا وہ بڑے مزے سے سو رہے تھے۔

ساتھ کے خالی کمرے میں آ کر میں دھم سے پلنگ پر گر گئی۔ میرا جی چاہا کہ چلا چلا کر روؤں — "امی آخر مجھے ایسا کیوں سمجھتی ہیں، گھٹیا، اور جذباتی، جیسے میں — وہ — وہ —" باوجود ضبط کے میں رو پڑی۔

اور ایک بار تو میرا جی چاہا کہ بس خودکشی کر لوں۔ اتنی ذلت سے زندہ رہنا مرجانے سے بھی بُرا ہے۔ حامد بھائی دل میں کیا خیال کریں گے۔ وہ تو ضرور یہی سوچیں گے کہ اب تک یونہی رعب گانٹھتی رہی۔ بڑی پست نظر ہے یہ تو — اور کون جانے غصہ میں آ کر وہ کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھیں، مثلاً اگر انھوں نے اشفاق کے سامنے اقرار کر لیا کہ وہ مجھے ہمیشہ ایک لڑکی کی حیثیت سے دیکھتے رہے ہیں، ایک اجنبی لڑکی کی حیثیت سے، جس سے محبت بھی کی جا سکتی ہے اور جسے جھوٹا بھنبھوڑا بھی جا سکتا ہے تو — تو میں کیا کر دوں گی؟ یہ سب لڑکے اور لڑکیاں ایکدم خباثت پر اُتر آئیں گے۔ وہی ذلیل سا مذاق، فرسودہ اور عام — "کیوں بھئی حامد بھائی کا پتہ کیا ہے بھلا؟ ذرا بتانا تو؟" — "یہ رات کے بارہ بجے تک بتی کیوں جلتی ہے تمھارے کمرے کی، اب تو حامد بھائی بھی نہیں ہیں جو گپ شپ" — "اچھا کیا تو نے کمبخت اتنی موٹی ناک تھی اشفاق کی اور ٹھگنا سا، بھلا حامد بھائی کا مقابلہ کر سکتا تھا وہ —" اوہ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی کہ ان باتوں کا جواب بھی دے سکوں گی — بس خون کے گھونٹ پی کر رہ جایا کروں گی۔ اف، فوہ۔ میں نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"کاش —!" امی کے خلاف میرے دل میں زہر بھر اٹھا۔ میں سوچنے لگی۔ "کاش ابا جان کو پتہ چل جائے تو وہ ابھی امی سے لڑ لیں۔ دن بھر میں کم سے کم پچاس بار بھی ان سے نہیں کہتے کہ تم میرے بچوں کو یہ احساس مت دلایا کرو کہ وہ اپنے ذمہ دار خود نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں، آخر اگر ان میں اتنی بھی عقل نہیں کہ یہ سیدھے رستہ پر چل سکیں تو ان کی سزا

اس سے بھی بدتر ہونا چاہیئے۔"

"ہاں تم تو یہی چاہو گے۔" امّی خفا ہو کر کہتیں۔ "لیکن میں تو یہ نہیں چاہ سکتی۔ کوئی بھی اپنی اولاد کے متعلق یہ نہیں چاہ سکتا ہمیں ہی انھیں سیدھا رستہ دکھانا ہوگا۔"

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر امّی بھائی جان وغیرہ کو کچھ کیوں نہیں کہتیں۔ انھیں "سیدھا رستہ" کیوں نہیں دکھاتیں۔ وہ جو —— چاندنی راتوں میں منور آپا کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتے پھرتے ہیں تو —— اور یہ ماجد کہاں کا پاکباز ہے جسے میں جانتی نہیں۔ اب جو یہ اس کا ہر مہینے ایک نیا سوٹ بنتا ہے تو کس لئے؟ نائیوں کے انتخاب میں جو گھنٹہ گھنٹہ بھر ضائع کیا جاتا ہے۔ کیوں؟ ادھر خالدہ لارنس باغ جلتے ہوئے ہمارے ہی گھر کے سامنے سے کیوں گزرتی ہے؟ اب اس کے ساتھ لڑکیوں کا جھرمٹ کیوں نہیں ہوتا؟ اور اب اس نے سلیقے سے ماجد کے پسندیدہ "شیڈ عاریٗ" لباس کیوں پہننا شروع کر دیئے ہیں۔ ثریا کی ساڑی کا کنارا ماجد کے سامنے آ کر ہی کیوں بائیسکل میں الجھ جاتا ہے۔ اور خود ماجد کے پاؤں کرونا کے پاس سے گزرتے ہوئے کیوں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اور وہ کیوں گرنے کی حد تک اس پر جا پڑتا ہے۔ پھر کیوں کرونا کا زرد رنگ منٹ بھر میں لال بھبھوکا ہو جاتا ہے اور وہ مسکراتے ہوئے اپنی پسلیاں مسلتی رہ جاتی ہے —— ؟ کیوں، پھر گھر آ کر ایسا معصوم بنتا ہے۔ جیسے۔ ہنھ ——!

اور یہ بانو، عفت اور صفیہ، بھی اماں سمجھتی ہیں کہ ان سا نیک بھی کوئی کیا ہوگا —— جی! کالج کے بہلانے دنیا بھر کی خاک چھاننا کوئی ان سے سیکھے۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ لوگ پڑھتی کس وقت ہیں۔ کبھی بھی تو ——، اور معاً میری نظریں غیرارادی طور پر برآمدے میں سے ہوتی ہوئی ان کے کمرے سے جا ٹکرائیں۔ بجلی جل رہی تھی، اور ان تینوں کے ہلکے ہلکے قہقہے گونج رہے تھے۔

احساس ذلت بار بار میرے دماغ کو زیر و زبر کر رہا تھا۔ وحشت سی ہونے لگی اور میں تھاہ لینے کو ان کے کمرے میں چلی آئی ——!

"آیئے —— آیئے۔" وہ تینوں ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "آج محفل رنداں آباد کرنے کدھر آنکلیں آپ؟"

"کیا کوئی البیلا اس تحریک کا باعث ——" عفت آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنسی اور اپنی سفید اوڑھنی پر کناری ٹانکنے لگی۔

"بھئی کوئی تو —— ؟"

"حامد بھائی نا —؟" بانو کھلکھلائی۔

"بچارا اشفاق!"

"ارے ہٹاؤ بھی صفیہ۔ یہ فضولیات، کوئی اور بات کرو۔"

"مثلاً ——" بانو اپنے پرنٹڈ کاسنی سوٹ کی قمیص پر چمکیلے بٹنوں کی قطار میں بٹن گنتے ہوئے بولی۔

"مثلاً یہی کہ ——" میں نے آتشدان کے قریب قالین پر گاؤ تکیہ لڑھکاتے ہوئے کہا۔

"امتحان میں صرف ڈیڑھ مہینہ رہ گیا ہے اور تم —— میں نے کئی دن سے تمھیں کالج میں نہیں دیکھا —— کافی تیاری کر لی ہے کیا؟"

عفت سوئی تھام کر یکدم ہنس پڑی، اور اتنا ہنسی کہ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"بیوقوف ہو"۔ میں نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات بھی ہو ہنسی کی"۔
"ارے بھئی صغرا آپا، آپ بھی تو زیادتی کرتی ہیں۔ لے بیٹھیں کالج اور امتحان کا جھگڑا۔ یہ پوچھئے کہ کل جو کلکٹر صاحب کے یہاں ڈنر تھا، اس کی کیا کیفیت رہی۔ پرسوں جج صاحب نے جو پروفیسر حمید کو الوداعی پارٹی دی تھی اس میں کون کون آیا تھا۔ اور کس کس نے کیا کیا لباس پہن رکھا تھا۔ یا یہ پوچھئے کہ کل تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"
"ہاں بھئی ــــ" اس نے آنکھیں مٹکائیں۔ "یہ پوچھو نا۔"
مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں بھرے بازار میں بالکل بے پردہ کھڑی کر دی گئی ہوں۔ اور ان کی نظریں بچا کر میں چپکے سے بھاگ آئی۔ لیکن ان کے مسخر انگیز قہقہے دُور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔
واپس آئی تو وہی ایک خیال مجھے کچوکے دے رہا تھا۔ حامد بھائی کیا کہیں گے، اوہ! ہاں ــــ اونہہ! میرا دماغ شل ہوا جا رہا تھا۔ اسی اُدھیڑبن میں تین بج گئے۔ میں چونک پڑی۔ جیسے ایک کھویا ہوا سا خیال میرے دماغ میں چکر مارنے لگا۔ پو پھٹنے سے پہلے ابا جان نماز پڑھنے کے لئے اٹھ جاتے ہیں۔ دادا میاں اور دادی اماں بھی۔ بس ٹھیک ہے جب تک میں آنکھیں بند کئے پڑی رہتی ہوں۔ چھ سات بجے چپکے سے اپنے بستر میں جا گھسوں گی۔ حامد بھائی کو تو پتہ بھی نہ چلے گا۔ اور میں اپنی اس تجویز پر اتنا جھومی، اتنا جھومی کہ ــــــ
"اٹھو نا ــــ بھئی صغرا اٹھو بھی ــ" اس سے پہلے کہ میں اپنی مات کی سوچی ہوئی تجویز پر عمل کر سکوں انھوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔
"اوہ، آپ حامد بھائی ــــ؟" کچھ گھبرا کے انگڑائی لیتے ہوئے میں اُٹھ بیٹھی۔
"جی! ــــ مگر یہ تو فرمایئے، کہ یہ آدھی رات کو سیر کی کیا سوجھی تھی آپ کو؟" وہ طعن سے بولے۔
"وہ ــــ" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "وہ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے عادت ہے رات کو، بارہ ایک تک پڑھنے کی۔ میں نے سوچا کہ آپ کی نیند خراب ــــــ"
"بس رہنے دو، کیوں باتیں بناتی ہو ــــ" وہ کھڑکی سے باہر نجانے کس چیز کو گھورتے ہوئے آہستہ سے بولے۔
"اوفوہ! کتنی نیچ نفس تم صغرا، افسوس! میں اب تک تمھیں ایک آسمانی مخلوق سمجھتا رہا۔"
"مگر حامد بھائی امی جو ــــــ" میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ انھیں سچ سچ بتا دوں۔
"اوہ! تو کیا پھوپھی اماں اس قدر ذلیل سمجھتی ہیں مجھے ــــ" وہ انتہائی جوش میں کانپ گئے۔
"ایک بھوکے کتے سے بھی ذلیل ــــ میں تو ــ" ان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔
"ارے ہٹایئے بھی حامد بھائی، یونہی ــ اتنی سی بات ــــ کچھ بھی تو نہیں ــ" میں ... بنا ہی نہ سکی۔
"مگر تم، سوچو تو صغرا، میں یہ ــــ"
"اونہہ، اچھا آیئے چلئے چائے پئیں۔" میں نے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر انھیں کھینچنا شروع کیا۔
"تم مجھ سے اتنی نزدیک نہ ہو صغرا ــ کون جانے میں بھوکا کتا ہوں ــــ" انتہائی سنجیدگی ــــــ سے انھوں نے میری باہیں الگ کر دیں۔
"حامد بھائی، خدا کے لئے ــــــ" میں چلّائی اور خود کو اُن کی گود میں گرا کر سسکنے لگی۔

"اچھا بھئی چلو — چلو" وہ اٹھنے لگے۔
"اوں — آپ معافی مانگئے پہلے مجھ سے" میں نے معصومیت سے بسورتے ہوئے کہا۔
"معاف کر دو —" گردن کو ذرا سا خم دیکر انھوں نے میری آنکھوں میں گھورا۔
"ہاں —" میں ہنس پڑی۔
"ارے تم لوگ —" آپا انجم جاتے جاتے دروازے میں سے جھانک کر بولیں۔
"چلو چائے پی لو نا —"
"اچھا، مگر سنو تو انجم —" حامد بھائی چلائے، لیکن جب تک ان کی آواز آپا تک پہنچی، وہ جا چکی تھیں۔
میز پر — وہ کھوئے ہوئے سے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لہر پیدا ہوتی۔ اور پھر مُردنی چھانے لگتی۔ آنکھیں گہری ہو جاتیں۔ وہ چوڑا چکلا سینہ پھولتا اور پھول ہی کر رہ جاتا۔ وہ شاید اپنے سینے میں مچلتی ہوئی آہوں کو وہیں دبا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک انھوں نے گھڑی دیکھتے ہوئے گھبرا کر لڑکے کو آواز دی۔ "ڈرائیور سے کہو کہ موٹر نکالے —"
"اور ہاں —" انھوں نے کشو سے پوچھا۔ "آج اُنیس تاریخ ہے نا؟"
"جی — کیوں؟"
"مجھے خیال ہی نہ رہا۔ اور آج میری چھٹی کی آخری تاریخ تھی۔
یہ کہہ کر انھوں نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں "تم کیوں سوچ میں پڑتی ہو۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں — ہاں، مگر پھوپھی اماں — اب کیا کہوں!"
میں نظریں چرا کر جلدی سے پیالی پر جھک گئی۔ اور میرے گلے میں بار بار چائے کے پھندے پڑنے لگے۔

ناہید عالم

زیر و بم

ایک بے پایاں خلا تیرہ و تار
نہ کوئی تارہ نہ مہتاب نہ مشعل نہ چراغ
کوئی مینا نہ ایاغ
چنگ و بربط کی صدا اور نہ پائل کی سہانی جھنکار
تیرگی چھائی ہوئی خامشی لہرائی ہوئی
ایک سیارہ نگاہوں کے اُفق پر چمکا
مسکرا اٹھی فضا

گنگنا اُٹھا سکوت
زندگی جھوم اٹھی — ناچ اُٹھی
جیسے جمنا کے کنارے رادھا
سن کے مُرلی کی سُریلی تانیں
رقص مستانہ کرے
صبح جنت کا سماں۔ ایک ہی لمحے کیلئے
پھر وہی تیرہ و خاموش فضا
ایک بے پایاں خلا

غلام ربانی تاباں

اونچے پربت

اونچے اونچے پربتوں پر بھیگی بھیگی چادریں
جی میں آتا ہے کہ ان کے سائے میں سویا کروں
اور جب خوابوں کا جادو ٹوٹ جائے ناگہاں
ابر پاروں کو رلاؤں اور خود رویا کروں

اونچے اونچے پربتوں پر ٹکٹکی باندھے ہوئے
میں بناتا ہوں افق پر بھیگے بھیگے دائرے
اے مرے خوابوں کی رانی شغلِ گریہ کے سوا
ایک پردیسی وطن سے دور آخر کیا کرے

اونچے اونچے پربتوں پر بچھ گیا چاندی کا جال
بدلیوں سے ہٹ کے جھانکا چودھویں کے چاند نے
ایک چنچل سی کرن نے جانے کیا طعنہ دیا
میں نکل بھاگا جدائی کی حدوں کو پھاندنے

اونچے اونچے پربتوں کی اس طرف جاؤں گا میں
اور جب ان وادیوں میں لوٹ کر آؤں گا میں
اپنے گھر میں ہوگا لہراتی ہوئی باہوں کا رقص
ایک نغمہ چوڑیوں کے ساز پر گاؤں گا میں

اونچے اونچے پربتوں پر ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے
جانے ان میں کیسی کیسی جنتیں آباد ہیں
صبح صبح تک وہ میٹھی میٹھی گفتگو اک حور کی
خواب کے مانند وہ گرما کی راتیں یاد ہیں

قتیل شفائی

کامرانی کا سفینہ

کیا یہ گردابِ حوادث کو نہیں ہے معلوم
کہ مری ناؤ کو موجوں سے کوئی خوف نہیں

عزمِ راسخ کے ہیں پتوار مرے ہاتھوں میں
رنگ ہے جوش و تہور کا مری باتوں میں
ہول اس سے نہیں آتا کہ ہے طوفاں بیتاب
دل لرزتا نہیں اس سے کہ ہے پیچاں گرداب
یہ فضاؤں کی سیاہی یہ ہواؤں کا ہراس
ان میں خوش رکھتا ہے مجھکو یہ یقینی احساس

کہ مری ناؤ کو موجوں سے کوئی خوف نہیں
کیا یہ گردابِ حوادث کو نہیں ہے معلوم؟

کیا یہ گردابِ حوادث کو نہیں ہے معلوم؟
کامرانی کے سفینے کو چلا ہوں لے کر

ہے مرے خوف سے طوفانوں کا چھٹنا ممکن
خوفِ طوفاں سے نہیں میرا پلٹنا ممکن
تند سیلاب سہی بحر بلاخیز سہی
ساحل افسردہ، فضا تیرہ، ہوا تیز سہی
اٹھتی موجوں کو مرے سامنے جھکنا ہوگا
یعنی گردابِ حوادث ہی کو رکنا ہوگا

کامرانی کے سفینے کو چلا ہوں لے کر
کیا یہ گردابِ حوادث کو نہیں ہے معلوم؟

عبدالعزیز فطرت

ریاست ایک وفاق ہے

آج تک ریاست کے متعلق جتنے بھی نظریئے قائم کئے گئے ہیں وہ سب کے سب اپنے ماحول کی پیداوار ہیں چنانچہ ۱۶۸۸ء میں انگلستان میں جو انقلاب آیا اسے دیکھ کر لاک نے کہا کہ بادشاہ کے اختیارات رعایا کی رضامندی پر منحصر ہیں۔ اسی طرح روسو وغیرہ دوسرے مفکرّوں نے اپنے وقت کی فضا کے مطابق نظریئے قائم کئے۔

آج بھی یہی حال ہے۔ آج جو بھی شخص تھوڑی بہت سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہے وہ یہ نہیں پوچھتا کہ ریاست اپنے اختیارات کو کس طرح استعمال کرتی ہے۔ بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ ریاست کو ان اختیارات کا حق بھی ہے یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ موجودہ ذہنوں میں جو سوال گردش کرتا رہتا ہے وہ یہ نہیں کہ ریاست کیسی ہو بلکہ یہ ہے کہ ریاست کیا ہے؟ آج ریاست کی ساخت[1] کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں بلکہ سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی نظام میں ریاست کی حیثیت کیا ہے۔

گزشتہ تیس چالیس برس سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ ریاست کی اطاعت اس لئے ضروری ہے کہ یہ سماج میں نظم قائم رکھتی ہے۔ پرامن تغیر کا ایک ذریعہ ہے۔ اور مانگوں کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پورا کرتی ہے۔ مگر موجودہ ذہن اس نظریئے کو قبول نہیں کرتا۔ اسے اس بات کا تو اعتراف ہے کہ ریاست ایک نظم ضرور قائم رکھتی ہے۔ لیکن اسے اس بات میں کلام ہے کہ ریاست جو نظم قائم رکھتی ہے وہ پرامن تغیرّ کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ اور مانگوں کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پورا بھی کرتا ہے۔ اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج سب سے بڑی کشمکش "دار" اور "نادار" کی ہے۔ چنانچہ جب وہ اس کشمکش کی روشنی میں ریاست کے نظم ونسق پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے یہی دکھائی دیتا ہے کہ ریاست کی تمام قوتیں "دار" کے ساتھ ہیں اور وسائل پیداوار کے مالکوں کی رائے کو "ناداروں" پر ٹھونسنے کا ایک ذریعہ۔ چنانچہ وہ یہ کہہ اٹھتا ہے کہ ریاست پرامن تغیرّ کا ذریعہ نہیں۔ کیونکہ نادار جس وقت بھی پرامن تغیرّ کی کوشش کرتا ہے ریاست اپنی تمام قوتوں سے اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ انقلاب ہوتا ہے۔ اور نادار ریاست کی تمام قوتوں کو چھیننے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ گویا ریاست اپنے موجودہ اختیارات کے ساتھ پرامن تغیرّ کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ پرامن تغیرّ کے راستے میں حائل ہے۔ علاوہ ازیں ریاست زیادہ سے زیادہ مانگوں کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پورا بھی نہیں کرتی۔ بلکہ اس کی تمام کوششیں اس بات پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں کہ مانگوں کو پورا کرنے میں زیادہ سے زیادہ امتیاز روا رکھا جائے۔

ان حالات میں کچھ لوگ "نراج" کا نعرہ لگاتے ہیں اور کچھ ریاست کے وفاق ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ پہلا نظریہ زیر نظر موضوع سے بالکل الگ حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ ریاست کی بنیادوں پر حملہ کرتا ہے۔ اور مجھے یہاں صرف ان لوگوں کا

---

[1] انگلستان میں ملوکیت قائم ہے لیکن دور دور جمہوریت کا ہے اس لئے ریاست کی ساخت کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اکرام

نظریہ پیش کرتا ہے جو ریاست کی ضرورت کے تو قائل ہیں۔ مگر اس کے اختیارات کو لامحدود نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ریاست خواہ کتنے ہی وسیع اختیارات رکھتی ہو وہ سماج کی مختلف جماعتوں میں سے محض ایک جماعت ہے۔ (میں نے اس مضمون میں جماعت کو "ایسوسی ایشن" کے معنوں میں استعمال کیا ہے) اس لئے اس کے اختیارات دوسری جماعتوں کی طرح محدود ہیں اور جس مقصد کے لئے اُسے قائم کیا گیا ہے اس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ وہ ریاست اور کلیسا' ریاست اور مزدور سبھا اور ریاست اور فرد کی چپقلشوں کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ریاست کے مفروضہ غیر محدود اختیارات کی بنیاد جبر کے سوا کسی دوسری چیز پر ہوتی تو وہ کلیسا یا مزدور سبھا یا فرد کے حق میں اپنے اختیارات سے دستبردار نہ ہوتی۔ اس مکتب خیال کا نظریہ یہ ہے کہ ریاست نے محض جبر و قوت کے ذریعہ اپنے اختیارات کو لامحدود بنا لیا ہے ورنہ ان اختیارات کے لامحدود ہونے کے حق میں کوئی اخلاقی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا اور کہ ریاست کے قوانین جن لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں ان کے تجربات اور آراء کا بھی ان قوانین کی تشکیل میں دخل ہونا چاہئے۔

انسان فطرتاً جماعت پسند ہے۔ وہ مختلف اغراض کیلئے مختلف جماعتیں بناتا ہے۔ لیکن کوئی ایک جماعت اس کی کل زندگی پر حاوی نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی کا ایک پہلو کسی ادبی جماعت سے وابستہ ہوتا ہے' دوسرا کسی مذہبی سے' تیسرا کسی سیاسی سے' چوتھا کسی معاشی سے وعلیٰ ہذالقیاس' اسی طرح ریاست بھی ایک جماعت ہے' جو بعض مخصوص مقاصد کیلئے قائم کی گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اُسے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو محیط سمجھا جاتا تھا۔ مگر حقیقت یہ نہیں کیونکہ جن مقاصد کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی انسانی سماج کے کچھ مقاصد ہیں۔ لیکن ریاست کی صرف ایک خصوصیت ایسی ہے جو اسے تمام دوسری جماعتوں سے متمیز کرتی ہے کہ یہ اپنے جغرافیائی رقبہ کے تمام انسانوں پر حاوی ہوتی ہے اور دوسری جماعتوں کی صورت میں ایسا نہیں۔ ریاست کا کام تمام دوسری جماعتوں کو زندہ رہنے دینا ہے۔ ان میں تال میل قائم رکھنا ہے' اس لئے اسے تمام دوسری جماعتوں پر فوقیت حاصل ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ریاست اپنے ہر جائز و ناجائز حکم کی تعمیل کروا سکتی ہے۔ فرد جس وقت بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ ریاست کا فلاں حکم یا قانون مانا نہیں جا سکتا۔ اور ریاست کے اس غلط اقدام کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تو وہ فوراً بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یُوں سمجھئے کہ افراد اور جماعتیں اکائیاں ہیں اور ریاست ان سب کا وفاق۔ ریاست کے احکام میں ان سب کے منشا شامل ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اکائی اپنے حقوق پر کسی قسم کا چھاپہ برداشت نہیں کرتی۔ جب تک ریاست کے قانون کی تشکیل میں متاثر ہونے والے فرد یا جماعت کی رائے کو بھی دخل نہ ہو وہ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتی۔ چنانچہ نیابتی ادارے صرف اسی لئے قائم کئے گئے ہیں کہ قانون کی تشکیل اور ریاست کے انتظام میں فرد اور دوسری جماعتوں کی رائے کو بھی دخل ہو اگر کسی طبقے کی منشا کے خلاف اس پر کوئی قانون عاید کر دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ طبقہ اس وقت تو ریاست کی قوت سے ڈر کر خاموش رہے لیکن وہ جلد یا بدیر اس قانون کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال شاردا ایکٹ ہے۔ چونکہ یہ عوام کی منشا کے خلاف نافذ کیا گیا تھا اس لئے بیکار محض ہو کر رہ گیا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں انسان فطرتاً جماعت پسند ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ کہیں کسی مقصد کو اکیلا حاصل نہیں کر سکتا تو اپنے ہم خیال افراد کی ایک جماعت بنا لیتا ہے گویا جماعتیں افراد کے مختلف ارادوں اور خواہشوں کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہیں

لیکن یہ جماعتیں نہ ریاست کے ماتحت ہیں اور نہ انھیں ریاست قائم کرتی ہے۔ ہر جماعت اپنے ماحول کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہے اور اپنے ماحول کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ اس کی ایک شخصیت ہوتی ہے، لیکن یہ شخصیت اس جماعت کے ارکان سے الگ نہیں ہوتی۔

اگرچہ ان جماعتوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی فرد کی مکمل زندگی کو محیط نہیں ہوتی۔ فرد مرکز ہے اور یہ جماعتیں اس کے ارد گرد مختلف دائرے۔ اور کوئی بھی دائرہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فرد صرف میرا مرکز ہے۔ یہ سب جماعتیں سوائے ریاست کے رضاکارانہ ہوتی ہیں، وہ فرد کو اپنا رکن رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتیں چنانچہ وہ جب چاہے کسی جماعت سے مستعفی ہو سکتا ہے اس لئے ہر جماعت کو اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے اپنے نظریوں میں وقتاً فوقتاً ترمیم کرنی پڑتی ہے اور اپنے مقاصد کو اور زیادہ وسعت دینی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو خود اپنی موت کا باعث ہو جب تک ارکان کو اس پر اعتماد ہے یہ زندہ ہے۔ اور جب یہ اعتماد ختم ہو جاتا ہے تو یہ بھی اپنی موت مر جاتی ہے۔

ہر انسان زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق مختلف نظریئے رکھتا ہے۔ مثلاً وہ مزدور سبھا کا بھی رکن ہے، مذہبی جماعت میں بھی شامل ہے، بزم ادب میں بھی حصہ لیتا ہے اور ایک بین الاقوامی جماعت سے بھی وابستہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان جماعتوں میں توازن کس طرح قائم رکھا جائے۔ اگر ان جماعتوں کو کسی اور جماعت کے ماتحت کر دیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ انسان اپنے تجربات خیالات اور خواہشات کا خون کر دے۔ اور انھیں اس نئی اور بالاتر جماعت کا غلام بنا دے۔ گویا انسان اپنی امتیازی خصوصیت یعنی اپنی شخصیت کو قربان کر دے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ سب انسان ایک ہی نظام فکر سے وابستہ نہیں ہوتے۔ مثلاً میں مذہبی امور میں زید کے ساتھ ہوں لیکن سیاسی میدان میں اس کا مخالف۔ صنعتی تنظیم کے مسئلہ میں بکر کے ساتھ ہوں لیکن ادبی معاملات میں اس سے مختلف رائے رکھتا ہوں، اس لئے مختلف جماعتوں میں توازن قائم رکھنے کیلئے جو نظام قائم کیا جائیگا وہ مختارِ کل نہیں ہوگا بلکہ وفاقی ہوگا۔ انسان کوئی ایسا نظام قبول نہیں کر سکتا جو اس کی شخصیت کو ختم کر دے بلکہ وہ ایک ایسا نظام چاہتا ہے جس میں اس کی آرا اور تجربات کو بھی دخل ہو۔

اس لئے سماجی تنظیم کا ڈھانچہ وفاقی ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ صرف ریاست اور فرد یا جماعت اور فرد، یا ریاست اور جماعت کے تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ یہ فرد، جماعت اور ریاست ان سب کے آپس کے تعلقات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ریاست کا کوئی حکم فرد کے مذہب پر اثر انداز ہو تو اس صورت میں ریاست فرد سے اپنا حکم جبراً نہیں منوا سکتی۔ کیونکہ اس کا نتیجہ تشدد اور بغاوت ہوگا بلکہ اسے یہ سمجھانا ہوگا کہ ریاست اپنا یہ حکم اس پر ٹھونس نہیں رہی بلکہ خود اس کا اپنا تجربہ اس حکم کا متقاضی ہے اور یہ نہ صرف اس کی اپنی ذات کیلئے فلاح کا باعث ہوگا بلکہ اجتماعی فلاح میں بھی اضافہ کا سبب بنے گا۔

اس لئے قانون بنانے میں تمام شہریوں کو ایک ساتھ ہونا چاہیئے اور صرف اسی صورت میں کسی قانون کی رضاکارانہ پابندی کی جا سکتی ہے ورنہ جو قانون بنیں گے وہ فرد، جماعت اور ریاست میں توازن قائم رکھنے والی جماعت یعنی ریاست کے قانون نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ یہ قوانین حکمران طبقہ کے خیالات کا نتیجہ متصور ہوں گے۔ اور کوئی قانون اس وقت تک قانون نہیں بنتا جب تک وہ اپنے سماجی نظام کے میلانات کا مظہر نہ ہو۔ اور سماجی نظام کا مطلب کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ وہ تمام طاقتیں ہیں جو اس نظام میں اپنی مانگوں کو زیادہ سے زیادہ پورا کرنا چاہتی ہیں اس لئے ہماری سماجی اور صنعتی زندگی میں جتنے بھی گروہ یا طبقے ہیں ان سب کا ریاست سے وفاقی تعلق قائم ہونا چاہیئے۔ صرف اسی صورت میں سرکاری قوانین دانشمندانہ اور منصفانہ ہو سکتے ہیں۔

گویا ان تمام گروہوں کے خیالات معلوم کرنے چاہئیں۔ ان کے اعتراضات کا پتہ لگانا چاہیئے اور ان کی سماجی ضروریات کو پورا کرنا چاہیئے۔ اور ان گروہوں کو اپنے اندرونی معاملات میں کلی آزادی ہونی چاہیئے۔ چند لفظوں میں اس ساری بحث کا مطلب

یہ ہے کہ ریاست براہ راست حکومت کم کرے اور اس کے قوانین میں اتنی لچک ہو کہ ان کا مختلف حالات میں مختلف انداز سے نفاذ کیا جا سکے۔ ریاست کا کام صرف ان سماجی حقوق کی حفاظت کرنا ہے جن کے بغیر کوئی فرد اپنی انفرادیت میں مکمل نہیں ہو سکتا۔ ایسی ریاست کسی محدود طبقے کی ترجمان نہیں ہوگی بلکہ اس میں کثیر ترین افراد کی خواہشات متصادم رہیں گی۔ یہ ریاست تمام سماج کی منقبض ترجمان ہوگی اور مختلف گروہوں کے متصادم مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک ذریعہ۔

جس جماعت کے سامنے اتنا اعلیٰ اور اہم مقصد ہو اسے سب سے پہلے ایسے افراد تیار کرنے ہوں گے جو حکومت ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی پر گرفت کر سکیں اس کے علاوہ جن معلومات پر قوانین و احکام کی بنیاد رکھی جاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ غیر جانبدارانہ ہونی چاہئیں۔

اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا سیاسی نظام ہماری الجھنوں اور مشکلوں کو قطعی طور پر ختم کر دیگا تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کے فیصلوں کی زیادہ سے زیادہ پابندی کی امید کی جا سکتی ہے کیونکہ کسی سابقہ نظام میں افراد کے محسوسات و تاثرات کو اتنا دخل حاصل نہیں رہا۔ وفاقی نظریہ سے پہلے تو ریاست کو وحدانی سمجھا جاتا تھا جس میں کسی انفرادی یا مجموعی عمل کی گنجائش نہ تھی مگر اب انفرادی اور مجموعی عمل کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے ریاست کا وحدانی نظریہ اب اقتضائے وقت کے خلاف ہے۔ اب تو سیاسی نظام کو وفاقی ہونا پڑے گا۔ صرف اسی صورت میں سے افراد کی مخلصانہ و رضا کارانہ اطاعت حاصل ہو سکتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ ریاست ایک قائد ہے جس کے الفاظ میں عوام کو اپنے دل کی دھڑکنوں کی گونج محسوس ہوتی ہے۔

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر افراد کو ریاست کے قوانین سے اختلاف کا حق دے دیا جائے تو تمام سماجی نظم ہی ملیامیٹ ہو جائے گا۔ ایسے اصحاب کی خدمت میں گزارش ہے کہ اختلاف کے حق سے سماجی نظم ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس اختلاف کے حق سے اگر انکار کر دیا جائے اور افراد کو ان کی مانگوں کے پورا کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو سماجی نظم ختم ہوتا ہے۔

اب ذرا بین الاقوامی تعلقات کی طرف آئیے۔ قومی ریاست سماجی نظام کی آخری منزل نہیں۔ اس کی حاکمیت صرف مقامی معاملات تک محدود ہے۔ لیکن جونہی اس کے اقدامات و خواہشات اس وسیع دنیا کے مفاد پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ مختار مطلق نہیں رہتی — بین الاقوامی اثر رکھنے والے فیصلے وہ اکیلے نہیں کر سکتی۔ ان مسائل میں دوسرے ممالک کے سیاسی نظاموں کا دخل بھی ہوتا ہے۔ اور ہر ملک کا سیاسی نظام ان مسائل میں ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختار مطلق کی نہیں۔ اس لئے ایک ایسا بین الاقوامی نظام قائم کرنا ہوگا جو تمام قومی ریاستوں پر حاوی ہو۔ یہ نظام ہر ریاست کو یقین دلائے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول پر عمل نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کے حقوق و مطالبات کو حق کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ ایسے بین الاقوامی نظام کے قیام کے بعد جنگ کو خلاف قانون اور جرم قرار دیا جائے۔ اور تمام تہذیبی طاقتیں ان ریاستوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں جو جنگ کے ذریعہ اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتی ہیں۔ گویا ریاستوں کا ایک وفاق قائم کرنا ہوگا اور تمام بڑی بڑی ریاستوں کو اس کے ماتحت لانا ہوگا۔ یہی کام بہت مشکل ہے۔ لیکن جب تک عالمگیر وفاق قائم نہ ہوگا دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک ریاست کو وفاق نہ سمجھا جائے گا اقتصادی انصاف ظہور میں نہیں آئے گا۔

(حلقہ ارباب ذوق شاخ دہلی میں پڑھا گیا) اکرام قمر

غزل

کیا دیکھ زمانہ کہتا ہے، کیا لمحے اشارا کرتے ہیں
بگڑی کے رونے والے خود بگڑی کو سنوارا کرتے ہیں

تدبیر کا یارا ہو نہ سکا، قسمت کا سہارا ہو نہ سکا
لے دے کے غمِ محرومی ہے، ہم جس پہ گزارا کرتے ہیں

طوفانوں سے ڈرتے تھے کبھی وہ دن نہیں وہ ہنگام نہیں
ساحل کی طلب کرنے والے ساحل سے کنارا کرتے ہیں

آرائشِ زنداں فصلِ خزاں کے دم سے تھی اے عہدِ جنوں
اب اپنے رختِ ہستی کو خود پارا پارا کرتے ہیں

آنکھیں ہیں مگر محرومِ نظر اے دیکھنے والو دیکھتے ہو
ارمان دلِ بے تاب کے جو کچھ رنگ بہارا کرتے ہیں

گو چارہ گروں کی باتوں سے کچھ بوئے ریا بھی آتی ہے
بے چارگیٔ غم کا اپنے کیا دیکھئے چارا کرتے ہیں

موہوم اُمیدوں میں عامرؔ پُر کیف دھندلکے یادوں کے
خوابوں میں حسین مستقبل کے ماضی کو پکارا کرتے ہیں

عامرہ سلطانہ عامرؔ

رات کی وادی

[انسان کو ازل سے ایک اُلجھن درپیش رہی ہے، اور وہ یہ کہ وقت کے سلسلے میں اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس اُلجھن کو حل کرنے کیلئے اُس نے تخیل اور تصور سے کام لے کر ماضی کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس منظوم تصور یئے میں یہی کوشش کارگر ہے۔ شاعر رات کی تنہائیوں میں زندگی کی تلاش میں کھویا ہوا ماضی کے آسمان پر جا پہنچتا ہے۔ اس سفر میں اس کا لاشعور اُس کا ہمراہی ہے!]

شاعر:۔ رات کی وادیاں خاموش ہیں بے جان نہیں!
زندگی! جیسے خموشی بھی ہے آواز کوئی!
زندگی! جیسے ابھی چرخ کے تارے سارے
میرے چہرے پہ برس جائیں گے شبنم بن کر
زندگی سیلِ تبسم ہو کہ طوفانِ الم!
بول اٹھتی ہے۔ ہر عالم میں ہر آئینے میں!
دل کی دھڑکن کی طرح ناچتی ہے سینے میں

لاشعور:۔ یہ خموشی مجھے محصور نہیں کر سکتی
رات ہے۔ میرا تصور ہے مرے نغمے ہیں
سیکڑوں نغمے ہیں جن کے لئے آواز نہیں
میں انھیں ساز بھی دے سکتا ہوں آواز تو کیا!
کئی جلوے ہیں، جنھیں قدرتِ پرواز نہیں
انھیں انداز بھی دے سکتا ہوں۔ پرواز تو کیا!
میں تصور کا خدا ہوں۔ میری دنیا کے لئے!
نہ کوئی قیدِ حقیقت، نہ کوئی قیدِ مجاز!
میرا انجام مرا ہے، مرا آغاز، آغاز!

شاعر:۔ ہاں مرے نغمو! اُبھر آؤ کہ اب کوئی نہیں!
تم پہ اب خوابوں کی پابندی نہیں آجاؤ!
آؤ اور زیست پہ اک دامِ مسرت پھیلاؤ!

(بہت سے منتشر نغمے مختلف سازوں سے نکلنے لگتے ہیں۔ اور آخر میں ایک نغمہ اُبھرتا ہے)

موہے چین نہ آئے
رُوپ رنگ کی شوبھا میرے نینوں کو اُلجھائے!
موہے چین نہ آئے
اِس کی بِندی، اُس کا کاجل
من پر تیر چلائے
موہے چین نہ آئے
رُوپ رنگ کی شوبھا میرے نینوں کو الجھائے!
الھڑ اور رسیلا جوبن آشاؤں کا درپن!
یہ گوری مُسکائے، رِجھائے، بھرے مانگ میں چندن!
وہ متوالی سانولی جب جل بھرنے کو جائے!
موہے چین نہ آئے!
رُوپ رنگ کی شوبھا میرے نینوں کو اُلجھائے
موہے چین نہ آئے!

لاشعور:۔ چین کیسے دلِ بیکل کو بھلا آئے گا!
جال پھیلائے ہوئے گھات میں رہتی ہے نظر
خواہشِ کیف و سکوں حرص و ہوس بن کے مجھے

لحظہ لحظہ نئے افکار میں اُلجھاتی ہے!

شاعر۔ ایک مرکز نہ بنا میری نظر کا مسکن
زندگی ایک بدلتا ہوا افسانہ رہی

لاشعور۔ دہر خود ایک بدلتا ہوا افسانہ ہے
کروٹیں لیتا ہے ہر گام پہ اک تازہ سرود
ابھی تاریکی ہے پل بھر میں اُبھر آئے گا
چاند اک ساحرِ نوخیز کے افسوں کی طرح
اور گائے گا ابھی نغمۂ خاموشی پر!

(دُور سے آہستہ آہستہ اُبھرتے ہوئے چاند کا نغمہ سُنائی دیتا ہے)

یہ سب کیا ہے!
ابھی اندھیرا ——— ابھی سویرا
ابھی سویرے کا سپنا
میں دیکھوں اور چھم چھم روؤں
مجھ کو غم ہے اپنا ——— یہ سب کیا ہے!
یہ سب کیا ہے!
نینوں کے بجھتے دیپوں سے
جلتے دیپ چتائیں!
کلی کلی آنسو بن کر!
ٹپکے - یہ آشائیں - کیوں مرجھائیں!
یہ سب کیا ہے ———

(گیت چپوؤں کی آواز میں گم ہو جاتا ہے)

لاشعور۔ یہ سب کچھ تغیر کے افسانہ خواں ہیں
تغیر ازل سے ہے اک رازِ فطرت

شاعر۔ مگر یہ ہوا کیا - یہ پروازِ فطرت،
بلندی کی جانب رواں ہے تصور
یہ محسوس ہوتا ہے میں اُڑ رہا ہوں
فضاؤں میں رنگیں فضاؤں سے آگے
خلاؤں میں بڑھتا ہوا مُڑ رہا ہوں!

(چپوؤں کی آواز قریب ہوتی جارہی ہے)

قریب آگئی چاند کی زرد کشتی،
کہیں ڈوب جاؤں نہ بحرِ سکوں میں،
چلو کشتیٔ ماہ میں سیر کرلوں
یہاں تم بھی ہو!... میری جانِ تصور!
مری روح کا نغمۂ کیف و راحت
مری آرزوئے سکوں میری زہرہ!

زہرہ:- ہاں! میں تو اپنی کشتیٔ نور میں ایک عمر
تکتی رہی ہوں راہ تمھاری نگاہ کی
یہ رات انتظار کے لمحوں کی موت ہے
یہ رفعتیں کہ دیکھنے والا نہیں کوئی
ملنے کے راستوں میں ہمالا نہیں کوئی
وہ رسم وہ رواج - وہ اندھی موئی سماج
حائل نہیں ہماری محبت کی راہ میں
اچھا! کہو کہ آج یہاں کیسے آگئے

شاعر۔ تصور کی حقیقت آج لے آئی یہاں مجھکو
یہ قسمت ہے کہ تو بھی مل گئی اے مہرباں مجھکو

زہرہ - اب آگئے ہو تو میرے قریب آ بیٹھو
یہاں گزرتی ہوئی کشتیاں ہیں جن کو تم
ستارے کہہ کے سمجھتے ہو رات کے آنسو
انہیں میں رہتے ہیں صدیوں سے شاعروں کے گروہ
یہ ایک کشتیٔ تابندہ دیکھتے ہو تم
اسی میں چین کا عاشق ہے نغمہ گر لی پو
سُنو سُنو کہ یہ کیا کہہ رہا ہے آج کی رات

لی پو۔ میری محبوب کا خط! لکھتی ہے کیا دیکھوں تو
"چھ مہینے سے مری جان ہو پردیس میں تم
گھر کے دروازے پہ اُگ آیا ہے سبزہ ہر سُو
میں اسے کاٹ کے کیا لوں گی مجھے کیا حاصل
پتے پیڑوں سے گرے جاتے ہیں آنسو بن کر

جوڑے بھنوروں کے ہر اک پھول پہ جب ناچتے ہیں۔
میرا دل دکھتا ہے۔۔۔ میں دیکھ کہاں سکتی ہوں
جانے بوڑھی سی ہوئی جاتی ہوں تنہائی میں

ہاں! جب آؤ تو خبر دینا مرے پردیسی
بھاگی بھاگی میں تمھیں لینے چلی آؤں گی"

شاعر:- لی پو کی یہ نظمِ کیف آگیں ......
وہ کون ہے شاعرِ نوا سنج!
زہرہ! وہ جو بیٹھا گا رہا ہے

زہرہ:- لوئی چی ہے یہ چین کا نغمہ گر
سنو کیا مزے لے کے کہتا ہے یہ

لوئی چی:- "ندی مشرق کو بہ رہی ہے مگر
ایک بھی موج لے کے کوئی پیام
آج تک لوٹ کر نہیں آئی..."

شاعر:- واہ کیا حسنِ تصوّر ہے .... یہ کیا نغمہ تھا
زندگی بخش محبّت کا سنہرا نغمہ (وقفہ)
بڑھ گئی چین کے شعرا کی روپہلی کشتی
دُور سے نغموں کے بجنے کی صدا آتی ہے

زہرہ:- اور یہ کشتیٔ جاپان ہے یاکاموچی
کوئی نغمہ .... کوئی شیریں نغمہ

یاکاموچی:- "اپنا در کھولے وقت سے پہلے
شام سے راہ اُس کی دیکھوں گا
جس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
میرے خوابوں میں۔ میرے خوابوں میں"

شاعر:- (زیرِ لب) زندگی بخش محبّت کا سنہرا نغمہ
(بلند آواز سے) بڑھ گئی دُور وہ جاپان کی کشتی لیکن
یہ تو ہے ہند کے گزرے ہوئے ایام کی لے

زہرہ:- مہاکوی بھرتری ہری کوئی نغمہ ارشاد کیجئے گا

بھرتری ہری:- "چلے سبز کھیتوں پہ وہ تیز جھونکے
کھڑے ہیں سب خوشے وہ سر جھکائے

یونہی وقت کے تیز سانسوں سے تم ... ہم
جھکے ہیں تو پھر مرگ و ہستی کا کیا غم!

زہرہ:- کچھ آپ بھی کہیئے میرے وطن کے شیکسپیر — اے کالی داس

کالی داس:- وہ خزاں آئی وہ حسینۂ مست
چال میں ایک لوچ ایک انداز
اُس کی زلفوں میں خوشے چاول کے
اُس کے چہرے پہ یاسمن کے پھول
اُس کا ملبوس گھاس کے غنچے —
جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی ہے
چہچہاتے ہیں بہرِ استقبال،
وہ پرندے کہ جن کے نغموں میں
ناچتی چھاگلوں کی ہے آواز

شاعر:- کشتیٔ ہند بڑھی ناز سے اٹھلاتی ہوئی
نشّہ آور ہے مگر نغمۂ یاد آلودہ
سرد پانی پہ فقط ایک لکیر اب بھی ہے
جو سرکتی ہوئی موجوں میں گھلی جاتی ہے
موجیں گھلتی ہیں تو یادوں کی سہانی وادی
خود بخود آبِ زمرد سے اُبھر آتی ہے

لاشعور:- ایک وادی ہے مرے سامنے تنہا وادی
چار سو پیڑ ہیں، خاموشی ہے، ویرانی ہے
رینگتا آتا ہے لیکن یہ کوئی خوابِ وجود
ناچتے سایوں میں ملبوس یہ کون۔ آہ یہ کون
دلکشی میں یہ کوئی جادوئے بنگالہ ہے
اس کے آنچل سے وہ خوشبو میں لپک اٹھتی ہیں
جو بہاروں میں گل و لالہ سے وابستہ ہیں
اس کے گیسوئے حسیں ناگ ہیں ڈسنے کیلئے

شاعر:- کون ہے یہ ستم ایجاد۔ یہ پیمانۂ رقص

زندگی:- "میں — میں ہوں جیون جیوتی،
جیون جیوتی میں —

مَیں — مَیں ہوں جیون جیوتی
تیرے سیپ کا موتی — مَیں
مَیں — مَیں ہوں جیون جیوتی
شہر کی گلیوں میں ہوں مَیں
پھول میں، کلیوں میں ہوں مَیں
مَیں ہوں اوس پہ روتی۔ مَیں
مَیں — مَیں ہوں جیون جیوتی
جیون جیوتی — مَیں
مَیں ہر ہر ذرے کی جوالا
میں ہوں سانسوں کی مالا
ہر مالا کو پروتی۔ میں
مَیں — مَیں ہوں جیون جیوتی۔ جیون جیوتی مَیں
میں — میں ہوں جیون جیوتی

شاعر:- زندگی رقصِ مسلسل ہے کہ تھمتا ہی نہیں
زندگی جیسے خموشی بھی ہے آواز کوئی
زندگی جیسے ابھی چرخ کے تارے سارے
میرے چہرے پہ برس جائیں گے شبنم بن کر
رات کی وادیاں خاموش ہیں بے جان نہیں
رات خاموش ہے۔ بے جان نہیں
رات بے جان نہیں

یوسف ظفر

گولکنڈہ کے شاہی مزار

گولکنڈہ کے یہ خاموش مزار!
جن کے آغوش میں آسودہ ہے شاہوں کا غبار
اور پھیلے ہوئے، مرجھائے ہوئے یہ میداں
خشک، بے رنگ سے آئینے ہیں
جن میں آتی ہے نظر عکس نشاں
عظمتِ خاک بہ سر، رفعتِ فریاد کناں
اس جگہ رُوح مری سنتی ہے
اُن کے نیزوں کی درخشاں، مترنّم جھنکار
گولکنڈہ کے یہ خاموش مزار

قلمِ وقت کی بے رحم خراش
ان کی یادوں پہ کبھی چل نہ سکی
آج تک زندہ و پائندہ ہیں
شان و عظمت کے چراغوں سے درخشندہ ہیں
اب بھی ہیں وقت سے محوِ پیکار
گولکنڈہ کے یہ خاموش مزار!

(سروجنی نائیڈو)

سید صابر علی

تمثیل

اور کچھ دیر یونہی رقص رہے

چھن چھنا چھن سے یونہی گونجے فضا
یونہی پازیب کے زیر و بم پر
تھرتھراتی رہے دل میں اُمید
نرم اعضا میں یہ خم کیا کہنا
اُف، یہ کیفیتِ رَم کیا کہنا
جیسے پَو پھٹنے میں رنگِ خورشید
جیسے ہر گام پہ چھلکے ساغر
ہاں، یونہی حشر رہے آج بپا

ہاں یونہی اور ابھی رقص رہے

اور کچھ دیر یونہی رقص رہے

چھن چھنا چھن سے یونہی گونجے فضا
زیست ہے تشنۂ تکمیل ابھی
رنگ اُبھرا نہیں تصویروں کا
سحر پھیلا نہیں تدبیروں کا
دل ہے بیگانۂ تمثیل ابھی
کھیل جاری ہے تمناؤں کا

دل انھیں لہروں پہ کچھ اور بہے!

(حلقۂ اربابِ ذوق دہلی)

اختر ہوشیارپوری

شعر اور اُس کے معجزات

قبل اس کے کہ شعر کی معجزانہ قوتوں اور پوشیدہ و مخفی طاقتوں کو الم نشرح کیا جائے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ شعر کی حقیقت پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

علامہ اقبالؒ شعر کے متعلق فرماتے ہیں ؎

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن — یہ نکتہ ہے تاریخِ اُمم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے — یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

بعض ادبی کتابوں میں جو شعر کی تعریف کی گئی ہے۔ وہ محض اسی قدر ہے کہ "کلام موزوں ہو اور متکلم نے بہ تکلف کیا ہو۔" لیکن فی الحقیقت شعر کی یہ تعریف ایک عامیانہ تعریف ہے۔

ایک محقق نے شعر کی تعریف یہ کی ہے۔ "کہ شعر اس کلام موزوں کا نام ہے جو ہمارے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں مسرت و بہجت یا یاس و الم یا حسرت و افسوس یا حزن و ملال کے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرے۔"

ایک اعرابی سے کسی نے پوچھا۔ "اچھا شعر کسے کہتے ہیں اور اس کی پہچان کیا ہے۔" اس نے کہا "ما یدخل الأذن بلا إذن" یعنی جو بلا اجازت کانوں میں داخل ہو جائے۔

کتب ادبیہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ مشہور شاعر حضرت حسان بن ثابت کے ننھے بچے کو بھڑ نے کاٹ کھایا۔ وہ اپنے والد کے پاس روتا ہوا آیا۔ کہ مجھکو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ حسان نے جانور کا نام پوچھا۔ بچہ نام نہ جانتا تھا۔ حسان نے پوچھا اس کی شکل و صورت کیا تھی؟ بچے نے سسکیاں لیتے اور روتے ہوئے جواب دیا۔ "کانّہ مُلتفٌ ببُردِ مُخطّطٍ" (وہ دھاری دار چادر میں لپٹا ہوا تھا) چونکہ بھڑ کے بدن پر رنگدار دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس لئے بچے نے دھاری دار چادر سے تشبیہ دی۔ حسان اچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا۔ "واللہ صار ابنی الشاعر" (خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا) اس سے معلوم ہوا کہ عمدہ تشبیہ بھی شعر کا دوسرا نام ہے۔

اسی بنا پر ایک ادیب کا قول ہے کہ "کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اُس شے کی اصل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئے گی۔ صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک، بلبلوں کی چہک، نسیم کے جھونکے، صبا کی اٹکھیلیاں، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑے کی خنکی، بہار کی خوشگواری، رنج و غم، حسرت و افسوس، غیظ و غضب، حزن و ملال، جوش محبت کا اس طرح ادا کرنا کہ ان کی صورت آنکھوں میں پھر جائے، شعر ہے۔ لفظ شعر شعور سے مشتق ہے۔ اور شعور احساس کو کہتے ہیں)۔ اور شاعر وہ شخص ہے جس کا شعور دوسروں سے زیادہ قوی اور جس کا احساس دوسروں سے زیادہ نازک ہو۔

انسان پر خاص حالتیں واقع ہوتی ہیں۔ مثلاً رونا، ہنسنا وغیرہ، یہ حالتیں جب انسان پر طاری ہوتی ہیں تو اس

خاص خاص حرکات و افعال سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً رونے کے وقت آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ ہنسی کے وقت ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت و کیفیت کا نام ہے۔ شاعر کی طبع حساس پر رنج یا خوشی، غصہ یا تعجب کے وقوع کے وقت ایک خاص قسم کا اثر چھا جاتا ہے۔ اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعے اس کی زبان سے ظاہر ہوتا ہے انہی الفاظ کا نام شعر ہے۔

(۲)

اب دیکھنا یہ ہے کہ شعر جس میں کہ انسانی جذبات کو برانگیختہ کرنے کی زبردست قوت پنہاں ہے اپنی اس بے نظیر قوت کے ذریعے سے کیا کیا کام نکالتا ہے اور اپنے تاثرات سے زمانے میں کیا کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ ادبی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر نے عام انسان تو درکنار بڑے بڑے تاجداروں کے جذبات و احساسات کو اس طرح برانگیختہ کیا، کہ سننے والے متعجب اور دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔

نصر بن احمد سامانی جو خاندان سامانی کا ایک نہایت باوقار بادشاہ تھا اور اس کے عہد میں اس خاندان کا آفتاب اقبال نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا اور بہرہ مندی اور برتری کے تمام اسباب موجود تھے، خزانے معمور تھے، ور رعایا مطیع فرمان، وہ موسم سرما میں دارالسلطنت بخارا میں مقیم رہتا، اور موسم گرما میں سمرقند یا کسی اور شہر میں چلا جاتا۔ ایک دفعہ اس نے ہرات کا سفر کیا اور بادغیس میں جو ہرات کی مشہور سیرگاہ ہے پڑاؤ ڈالا۔ بہار کے دن تھے۔ تمام دشت زار ہجوم گل سے دامان باغبان و کف گلفروش بنا ہوا تھا۔ نصر ان دلفریبیوں میں ایسا محو ہوا کہ ساری بہار یہیں گزر گئی جاڑے کا موسم آیا تو پھلوں اور میووں کی کثرت ہوئی۔ اس علاقے میں ایک سو بیس قسم کے انگور ہوتے تھے۔ نصر جنگل سے اٹھ کر آبادی میں آیا، اور بزرداد میں جو ایک مشہور جگہ ہے قیام کیا۔ یہ مقام نہایت شاداب و پر بہار تھا۔ ہر طرف عالی شان قصر و ایوان اور ہر ایوان کے ساتھ خانہ باغ اور پائین باغ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں سیستان اور مازندران کے میوہ جات کی آمد ہوئی۔ نصر بادشاہ نے جاڑے بھی یہیں گزار دیئے۔ ہر دفعہ ارادہ کرتا کہ اب کی بہار گزرنے پر واپس بخارا کو روانہ ہو جائے گا۔ لیکن جب ایک موسم گزرتا تو دوسرا دامنگیر ہو جاتا۔ اسی طرح پورے چار سال گزر گئے۔ اور امراء، اور فوج کے لوگ جنہیں اپنے گھروں اور بال بچوں سے جدا ہوئے چار سال کا طویل عرصہ ہو گیا تھا۔ بہت تنگ آ گئے۔ لیکن بادشاہ سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ کیونکہ ؂

خلاف رائے سلطاں رائے جستن ــــــ بخون خویش باشد دست شستن

آخر رودکی کے پاس گئے جو دربار کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اور اس کو پانچ ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینا منظور کیں کہ بادشاہ کو واپس بخارا کی طرف جانے پر آمادہ کرے۔ چنانچہ رودکی نے اسی وقت یہ شعر کہے۔ اور اگلے روز دربار میں حاضر ہو کر ایک خاص دھن میں گائے ؂

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے ــــــ یادِ یارِ مہرباں آید ہمے
آب جیحوں باہمہ پہناوری ــــــ خنگ ما را تا میاں آید ہمے
اے بخارا شاد باش و شاد زی ــــــ شاہ سویت میہماں آید ہمے
شاہ سرو است و بخارا بوستاں ــــــ سرو سوئے بوستاں آید ہمے
شاہ ماہ است و بخارا آسماں ــــــ ماہ سوئے آسماں آید ہمے

جب شاعر آخری شعر پر پہنچا۔ تو اس وقت بادشاہ شعر سے اس قدر متاثر ہو چکا اور اس پر شعر کا جادو اس طرح چل چکا تھا۔ کہ شدت جذبات میں آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پاؤں میں موزے تک نہ پہنے اور فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر بخارا کی طرف گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا اور پوری منزل پر پہنچ کر دم لیا۔

(۳)

شعر میں ایک خاص طاقت یہ ہے کہ۔ وہ افراد کے دلوں میں شجاعت اور بہادری کے جذبات برانگیختہ کر کے اقوام و ملل میں بہادری کی روح پھونک دیتا ہے۔ اور بسا اوقات اس کے اثرات صدیوں تک زائل نہیں ہوتے۔ عربی شاعری اس معاملے میں دوسری تمام زبانوں سے گوئے سبقت لے گئی ہے۔ عرب کے میلوں میں شجاعانہ جذبات کے اشعار عوام میں مردانگی و جرأت کا طوفان پیدا کر دیتے تھے۔ اور میدان جنگ میں رزمیہ اشعار کمک سے بڑھ کر کام دیتے تھے۔

عرب کا ایک مشہور بادشاہ عمرو بن ہند گزرا ہے۔ اس کا شاہی اقتدار جب بہت زیادہ بڑھ گیا تو اس نے ایک روز ازرہ تفخر اپنے درباریوں سے کہا۔ کہ کیا اب مملکت عرب میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسے میرے سامنے سر نیاز خم کرنے اور گردن جھکانے میں عار ہو؟ راستگو درباریوں نے کہا ہاں، عمرو بن کلثوم قبیلہ تغلب کا مشہور شاعر ہے جس کی خودداری اسے کسی بھی آستانے پر جبیں سا نہیں ہونے دیتی۔ اس کی خودی پہاڑ سے زیادہ اٹل اور اس کا ارادہ چٹان سے زیادہ مضبوط ہے۔ بادشاہ نے اُسے دعوت دے کر بلایا۔ اور لکھا کہ مستورات بھی ساتھ آئیں۔ عمرو بن کلثوم دربار میں آیا اور مستورات شاہی حرم میں گئیں۔ بادشاہ کی والدہ نے عمرو بن کلثوم کی ماں سے کسی چیز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ بی بی وہ چیز ذرا پکڑا دینا۔ شاعر کی ماں نے کہا۔ انسان کو اپنا کام خود کرنا چاہیئے۔ بادشاہ کی ماں نے دوبارہ فرمائش کی تو شاعر کی ماں چیخ کر پکاری وا تغلباہ وا ذلاہ (ہائے تغلب کی ذلت) عمرو بن کلثوم نے باہر سے آواز سنی۔ اس نے سمجھا کہ اندر ماں کی تحقیر کی گئی ہے۔ اسی وقت نیام سے تلوار نکالی اور بادشاہ کا سر اڑا دیا۔ اور خود بچ کر نکل آیا۔ اس پر دونوں قبیلوں کے درمیان بڑے زور کی جنگ چھڑی اور ہزاروں سر کٹ گئے۔ عمرو ابن کلثوم نے اس پر ایک قصیدہ لکھا اور عکاظ کے مشہور میلے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ پڑھا۔ ایک مدت تک یہ کیفیت رہی کہ قبیلۂ تغلب کا بچہ بچہ اس قصیدہ کو زبانی یاد رکھتا تھا۔ اہل ادب کا بیان ہے کہ اس قصیدہ نے دو سو برس تک قبیلہ تغلب میں شجاعت کا جوش قائم رکھا۔ یہ قصیدہ آب زر سے لکھ کر در کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔ اسی بنا پر اس کو معلقہ کہتے ہیں۔ اس قصیدے کا ایک ایک شعر جوش غیرت، حمیت و آزادی، مردانگی و فتوحات اور دلیری و بہادری کے بے پناہ جذبات سے مملو ہے۔ نمونہ اشعار ملاحظہ ہو ؎

ابا هند فلا تعجل علينا　　وانظرنا نخبرك اليقينا
بانا نورد الرايات بيضاء　　ونصدرهن حمرا قد روينا
اذا بلغ الفطام لنا صبي　　تخر له جبابر ساجدينا

(ترجمہ) اے ابو ہند جلدی نہ کر۔ ہم تجھے سچے واقعات بتاتے ہیں۔ ہم معرکۂ جنگ میں سفید جھنڈے لے کر جاتے ہیں اور اُن کو سرخ کر کے لاتے ہیں۔ ہماری قوم کا بچہ جب دودھ چھوڑتا ہے تو بڑے بڑے جابر اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

(۴)

بعض دفعہ شعر سامع یا قاری کے دل پر ایسا اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ مشہور ہے کہ عرب شاعر متنبّی جب شعر پڑھتا تھا تو سننے والے دیوانے ہو جاتے۔ ... بعض دفعہ شعر کے مطالب ... معرکے دل و دماغ پر اسی قسم کا برقی

اثر ڈالتے ہیں۔ کہ وہ اُس کے سیلِ معانی کی تاب نہیں لا سکتا۔ اور اُس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ کہیں مجلس سماع منعقد تھی۔ گانے والا گاتے گاتے جب اس شعر پر پہنچا ؎

آرزوئے دیدِ جاناں بزم میں لائی مجھے | بزم سے میں آرزوئے دیدِ جاناں لے چلا

تو ایک صاحب اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور اسی حالت میں انھوں نے جان دے دی۔

مولانا شبلی شعر العجم میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں لبِ دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر ہنود کی عبادت اور اشنان کا طریقہ دیکھ رہے تھے۔ امیر خسرو بھی حاضر تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ دیکھتے ہو۔ ع

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کے سر پر ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی۔ امیر خسرو نے اس کی طرف اشارہ کر کے برجستہ کہا۔ ع

ما قبلہ راست کردیم بر طرفِ کج کلاہے

جہانگیر نے "تزکِ جہانگیری" میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے۔ میں نے شانِ نزول پوچھا۔ ملا علی احمد مہرکن نے یہ واقعہ بیان کیا۔ مصرعہ کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہو گئی یہاں تک کہ غش کھا کر گرے۔ دیکھا تو دم نہ تھا۔

(۵)

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے۔ کہ ایک شخص کو دو شعروں نے بادشاہ بنا دیا تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی "چہار مقالہ" میں لکھتے ہیں کہ احمد بن عبداللہ خجستانی سے پوچھا گیا۔ کہ تم تو گدھے بیچا کرتے تھے، تم خراسان کے بادشاہ کیسے بن گئے۔ تو اس نے جواب دیا کہ۔ میں خجستان میں ایک دفعہ حنظلہ بادغیسی کا دیوان پڑھ رہا تھا۔ جب میں ان دو شعروں پر پہنچا کہ ؎

مہتری گر بکامِ شیر دراست | رو خطر کن زکامِ شیر بجو
یا بزرگی و عزّ و نعمت و جاہ | یا چو مرداں ....

(ترجمہ) "سرداری اگر شیر کی حلق میں بھی ہے تو جا خطرے کو اختیار کر کے شیر کے حلق سے نکال۔ یا تو تجھے بزرگی و عزت اور نعمت و مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔ یا تو بہادروں کی طرح شاندار موت مرے گا۔"

تو میرے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ موجودہ حالت پر قانع نہیں رہنا چاہئیے۔ میں نے گدھوں کو بیچ ڈالا اور گھوڑا خرید لیا اور اپنے وطن سے کوچ کیا۔ اس وقت صفاریوں کی حکومت کا شہباز فلکِ ہفتم پر پرواز کر رہا تھا۔ میں علی بن لیث والی خراسان کی خدمت میں پہنچا جب وہ خراسان سے عزل کیا گیا تو مجھے خراسان کا داروغہ جاگیرات بنا گیا۔ میں نے جاگیرات میں پھر پھرا کر اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ اور بہت سے سواروں کو اپنے ساتھ ملا کر خراسان کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

ایک مورخ احمد بن عبداللہ (مذکور) کی شان و شوکت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ

"امروز در تاریخ از ملوکِ قاہرہ یکے اوست۔ واصلِ آں دو بیت بود۔"

(۶)

بعض دفعہ شعر کے توسّل سے شاعروں نے بڑے بڑے امراضِ لئیمہ اور مصائبِ عظیمہ سے نجات پائی ہے۔

عرب کا ایک مشہور شاعر ابو عبداللہ محمد بن سعید بن حسن بصیری کو فالج ہو گیا۔ ہر چند علاج کیا مگر فائدہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی آخر اس نے حضور سرورِ کونین کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جس کا نام قصیدہ بردہ ہے۔ اسی قصیدے کے طفیل اسے اس لا علاج مرض سے شفا ملی۔ ملاحظہ ہو دبیرِ

محمد سید الکونین والثقلین — والفریقین من عرب ومن عجم

(آں محمد سید کونین فخر انس و جاں ، — بہتر خلق دو عالم مہتر عرب و عجم)

ھو الحبیب الذی ترجی شفاعتہ — لکل ھول من الاھوال مقتحم

(آں حبیبے کو بود امید گاہ مومناں — از شفاعت نزد سختیہائے پیچیدہ بہم)

اسی طرح عارف مشرق حضرت علامہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کو بھی ایک دفعہ فالج ہو گیا مرض کے دوران میں ایک رات خواب میں اقبال کو سر سید ملے اور کہنے لگے کہ بصیری نے نعت رسولؐ لکھ کر فالج سے شفا پائی تھی۔ تم بھی شاعر ہو۔ سوز و ساز عرب و عجم سے آگاہ ہو اور دل درد مند رکھتے ہو رسول خداؐ کی نعت میں کچھ شعر لکھو چنانچہ اقبالؒ نے نعت لکھی اور اسی نعت کی برکات و فیوض سے اس شاعر اعظم نے فالج ایسے مرض سے نجات پائی۔ اقبال رسول خداؐ کے حضور میں عرض کرتے ہیں ؎

اے مقام و منزل ہر راہرو — جذب تو اندر دل ہر راہرو

گرد تو گردد حریم کائنات — از تو خواہم یک نگاہ التفات

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی — کشتی و دریا و طوفانم توئی

آہوئے زار و زبون و ناتواں — کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہ من حریم کوئے تو — من بہ امیدے رمیدم سوئے تو

اے وجودے تو جہاں را نوبہار
پرتو خود را دریغ از من مدار

(۷)

شعر کا ایک بڑا معجزہ یہ ہے کہ وہ بقائے نام اور حیات دوام کے لئے ایک چلتا جادو ہے۔ عمدہ شعر چونکہ خود ایک غیر فانی چیز ہے اس لئے اس کے تعلق سے شعر کا کہنے والا اور جس کے متعلق شعر کہا گیا ہے دونوں کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہو جاتا ہے اور قرنہا قرن گزر جانے کے بعد بھی ایسے انمٹ اور لافانی اشخاص کے نام الواح قلوب پر اس طرح ابھر نظر آتے ہیں گویا وہ ہمارے سامنے زندہ و حاضر ہیں۔ غور فرمایئے سعدی و فردوسی۔ حافظ و نظامی کے نام کتنے زندہ اور پائندہ ہیں گو ان کے اجساد فانی کو زیر زمین دفن ہوئے مدتیں گزر گئیں، صدیاں بیت گئے۔ مگر ابھی تک ان کی حیات ہائے غیر فانی اس قدر واضح ہیں کہ ہم ان کے اذکار سے اپنی محفلوں کو گرم اور اپنی مجلسوں کو بارونق بناتے ہیں۔ ان کے فرمودات سے بہرہ اندوز ہوتے اور ان سے ہر معاملے میں استصواب رائے کر سکتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ شعر کی برکات و فیوض سے ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اگر "شاہنامہ" نہ ہوتا تو آج فردوسی کا نام لینے والا روئے زمین پر کوئی نظر نہ آتا۔ اور اگر فردوسی نہ ہوتا تو رستم و اسفندیار کی داستانیں کبھی ہمارے لئے سمع نواز نہ ہو سکتیں۔ فردوسی نے بجا کہا ہے ؎

منم کردہ ام رستم داستاں — وگرنہ یلے بود در سیستاں

ملاحسین واعظ کاشفی (مصنف اخلاق محسنی) نے اس کے متعلق کیا ہی خوب کہا ہے ؎

ز نیروئے نظم فردوسی چہ دانستے کسے ؏ بزم کیکاؤس و رزم رستم و اسفندیار ؛ گشت از نظم نظامی نام بہرام بلند ؏ شد ز شعر انوری و صافی سنجر آشکار

عصور گزشتہ اور دور رفتہ میں سلاطین جہاں اپنے اپنے دربار ہائے دُربار میں بڑے بڑے قادر الکلام اور شیریں زبان شاعروں کو بیش بہا وظائف عطا کرتے اور انہیں لاتعد و لاتحصٰی انعامات و اکرامات سے مالامال کیا کرتے تھے اس کی تہ میں بھی یہی راز تھا کہ ایک بہترین شاعر اور اس کا بہترین کلام صاحب تاج و تخت کیلئے موجب حیات جاودانی اور باعث بقائے دوامی ثابت ہوا کرتا ہے۔ بقول ؎

شاعراں را عزیز باید داشت — کہ از ایشاں بقا پذیرد نام

شعر سلماں نگر کہ تا نہ ادست — نام سلطان اویس در ایام

محمد رمضان راتھر

برادری کا لحاظ بیمار کو بھی۔۔۔ اللہ اللہ

بخار نے مرا عالم ہی اب بدل ڈالا
مزا زبان کا کیونکر کہوں میں کیسا ہے
دیئے بخار کی غیظ آفریں تجلی نے
میں دل کا آئینہ ہر آن دیکھنے والا
کہوں بخار میں کیا اپنی وحشتوں کا مآل
عزیز تک نظر آتے نہیں عزیز مجھے
یہ لوگ میری عیادت کی خاطر آتے ہیں
وہ بکس جام کا ہے ۔۔۔ یہ کھجور کا ڈبا
یہ پیاکٹ آم کا ہے وہ انار کا بنڈل
مرے لئے اناناس آج کوئی تو لاتا
مجھے تو ان کی کوئی چیز بھی پسند نہیں
کوئی لبسورتا ہے کوئی منہ بناتا ہے
مزاج پوچھا۔۔ دعا دی ۔۔ کیا سلام ۔۔ چلے
میں ٹالدوں انھیں باہر سے آتنی تاب بغلط

کراہتا ہے بصد یاس مجھ سا متوالا!
برادرم! ابھی کڑوا تھا ۔۔۔ اب کسیلا ہے
بیک نظر کئی ہیبت فروش آئینے
یہ آئینے مری دنیا کریں تہ و بالا
خیال ہی وہ نہ آیا جو بن سکا نہ ملال
بھلا عزیز ہو کیا کوئی اُن کی چیز ۔۔ مجھے
پسند تھے جو مجھے ایسے میوے لاتے ہیں
میں تحفۂ رمضاں لیکے اب کروں گا کیا
میں کھولتا انھیں کیا' ہیں حواس ہی مختل
ابھی منگاؤں گا یہ پھل ہے میرا من بھاتا
یہ لوگ رسم کے بندے ہیں درد مند نہیں
سرھانے بیٹھے کوئی مغز کھائے جاتا ہے
نہ یہ کہ تپ جسے دانۓ وہ ان سے ادر چلے
برادری کا ہے "سخت جان" عذاب بغلط

بُلا رہا ہوں انھیں پھر بھی میں بنا چاری
بڑھا رہے ہیں جو پُرسانِ حال بیماری

علی منظور

ادیب شوہر

رات کے ساڑھے گیارہ بجے جب گھر کے سب لوگ سو چکے تھے وہ چوروں کی طرح اپنے بستر سے اُٹھا اور دبے پاؤں اند
میں ٹٹول ٹٹول کر رستہ ڈھونڈتا ہوا سونے کے کمرے سے نکلا - آئے دن کی عادت کے طفیل اس کے قدم کمرے کے چپے چپے سے آ
تھے - اس لئے اس نے کسی چیز سے ٹکر نہ کھائی - تاہم اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا - اس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے ا
ایک قدم اس کو ایک ایک میل کے برابر معلوم ہو رہا تھا - کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جب وہ اپنی بیوی کے بستر کے قریب
سے گزرا - تو وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹکا - اس کی بیوی نے نیند میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لی - اس کا دل دھک سے رہ گیا
" ارے ، وہ کہیں جاگ تو نہیں رہی ؟ " وہ یہ دریافت کرنے کے لئے بستر پر جھکا - لیکن تاریکی میں اس کی آنکھوں نے کچھ مدد نہ دی
وہ یہ سوچنے لگا ، کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوی سونے کا بہانہ کر کے جال پھیلائے تاک میں بیٹھی ہو - لیکن اس کا پتہ چلانے کا آخر طریقہ کیا تھا
وہ چند لمحوں تک کھڑا یہی سوچتا رہا - اگر وہ اس کو ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سچ مچ سو رہی ہو اور اس کے چھونے سے
جاگ اٹھے - سوتی بھڑوں کو جگانے کا فائدہ ؟ اور اگر وہ اس کے متعلق پوری طرح تسلی نہ کرے تو کہیں بعد میں مصیبت نہ آ پڑے - لاحو
توۃ ! عجیب مخمصہ تھا - بالآخر وہ بیوی کو چھوئے بغیر اس کے جس قدر قریب جا سکتا تھا - گیا ، اس کے سانس لینے کی آواز سے تو یہی
ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے ، مگر یہ بھی کہیں بہروپ نہ ہو ؟ خیر ہے تو ہوا کرے ، بلا سے - اگر وہ اس کے کمرے سے نکلتے نکلتے جاگ
اُٹھی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ اس کا جانا ملتوی ہو جائے گا - اب نہیں تو تھوڑی دیر کے بعد سہی ، آخر کبھی تو نیک بخت کو نیند آ
اور اگر وہ پوچھ بیٹھی کہ " آپ کہاں جا رہے ہیں ؟ " تو غسل خانے جانے کا بہانہ کافی ہوگا - اور اگر اس سے کام نہ چلا تو آئیں بائیں
شائیں کوئی عذر پیش کر دیا جائے گا - بالآخر اپنے دل میں یہ فیصلہ کر کے اور جی کڑا کر کے اس نے دروازہ کھولا - کمبخت دروازہ
بلا چون و چرا کھلنے کا نہیں تھا - دروازے سے باہر جا کر وہ پھر ایک بار ٹھٹکا - کہیں دروازے کی چوں چوں سے وہ جاگ تو نہ اٹھی تھی !
چند لمحوں تک کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا رہا - لیکن وہ خوف انگیز للکار جس کے خیال سے اس کا دل کانپ رہا تھا ، اور جس گرج
گرجنے کئی مرتبہ اس کی عشرت کے ایوان مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈھا کر ملیا میٹ کر دیئے تھے ، سنائی نہ دی ، اس نے اطمینان کا سانس
اور دبے پاؤں کمرے کی طرف چل دیا -

گول کمرے میں پہنچ کر اس نے نہایت آہستگی اور احتیاط سے دروازہ بند کیا اور بجلی کی بتی جلا دی - بجلی کی تیز روشنی
تھوڑی دیر کیلئے نہ صرف اس کی آنکھوں میں بلکہ اس کے دماغ میں بھی ایک چکا چوند سی پیدا کر دی - اس کو یقین نہ آتا تھا کہ پھر
بار وہ ازدواجی زندگی کے تنگ و تاریک قید خانے سے نکل کر آزادی کی دنیا کی سرحد میں داخل ہو گیا ہے - اور اس دنیا کی وسعت
اس کی آنکھوں کے سامنے جگمگا رہی ہے - وہ فضا جس میں اس کو زیادہ نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی مکمل اختیار تھا کہ ایک
پرندے کی طرح جہاں تک اس کے پر پرواز اسے لیجا سکیں بے روک ٹوک اُڑے اور اُڑتا پھرے -

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا - اور اپنی حالت پر غور کرنے لگا - اس کی زندگی بھی ایک عجیب زندگی تھی ، ایک ایسی زندگی

دو متضاد قوتیں باہمی کشمکش میں مصروف تھیں۔ ایک طرف دنیاداری کی مجبوریاں تھیں۔ دوسری طرف اس کی فطرت کا ایک بنیادی مقتضا، ایک طرف اس کی بیوی کے وہ جابرانہ مطالبات تھے جو اسے ایک کولھو کے بیل کی طرح دن رات خانگی زندگی کے ایک لگے بندھے معمول کے دائرے میں محدود رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوسری طرف وہ ذوقِ ادب تھا جو اسے مجبور کرتا تھا کہ خانگی زندگی کے اس چکر سے فرار کا کوئی رستہ نکال کر کسی گوشۂ خلوت میں جا بیٹھے اور ادب کے صنم خانۂ خیال کی سیر میں محو ہو جائے۔ وہ نہ صرف اس صنم خانے کا ایک زائر تھا بلکہ ان کے دل کا سب سے بڑا ارمان یہ تھا کہ اس کے ہاتھ کے تراشے ہوئے بُت اس صنم خانے کی زینت بنیں۔ اس صنم خانے کی سیر اور اس کی زینت کے لئے نئے نئے بُت بنا بنا کر بگاڑنا اور بگاڑ بگاڑ کر بنانا یہ تھی اس کی عشرت جس کا لطف اسے بیوی کی نظر سے اوجھل ہو کر چوری چھپے اُٹھانا پڑتا تھا۔ جیسے وہ کوئی گناہ ہو، میخواری، جوئے بازی یا کچھ اور۔

وہ یہ سوچ سوچ کر اپنے دل میں افسوس کر رہا تھا کہ جو چیز اوروں کے لئے فخر و مباہات کا باعث تھی۔ اور جس کی نمائش کر کے وہ دوسروں سے داد لیتے تھے۔ اس کے لئے وہ چیز گویا ایک شرمناک عیب تھی۔ اس کی زندگی کے اس اندرونی تضاد کے باعث اس کی اور اس کی بیوی کی طبیعت اور خیالات کا باہمی اختلاف تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تو ضرور تھی لیکن نہ صرف ذوقِ ادب سے بالکل بے بہرہ تھی بلکہ ادیبوں کی اس ساری جماعت سے جس کا نمائندہ اس کا شوہر تھا بیزار تھی۔ اس کا نظریہ تھا کہ ایک ادیب اچھا شوہر نہیں بن سکتا اور ایک اچھا شوہر ادیب نہیں ہو سکتا۔ اس نظریئے کو وہ زندگی کی بدیہیات میں شمار کیا کرتی تھی اور اس کی تصدیق کے طور پر اپنے شوہر کی مثال پیش کیا کرتی تھی، گویا اس کا ایک خراب شوہر ہونا ایک مسلمہ امر تھا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ اچھا شوہر کسے کہتے ہیں تو وہ یہ کہا کرتی کہ اچھا شوہر وہ ہے جو اپنی ساری زندگی بیوی بچوں کے لئے وقف کر دے وہی اس کا کھانا پینا اور اوڑھنا ہوں، وہی اس کی زندگی کا واحد مقصد ہوں، اور انہی کی ضرورتوں کے پورا کرنے کو وہ اپنا اولیں اور آخری فرض سمجھے۔ دوسرے الفاظ میں اچھا شوہر وہ تھا جو بیوی بچوں کا غلام خانہ زاد ہو۔ یا ایک اچھی طرح سدھا ہوا گھریلو جانور۔ اس بچارے کے لئے اس معیار پر پورا اترنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس سے جہاں تک بن پڑتا وہ اپنی سی کرتا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اگرچہ اس کا جسم تو خانگی زندگی کے تنگ دائرے کے اندر دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے مقید رہتا۔ لیکن اس کی روح ہزاروں میل دور خیالی دنیاؤں میں ٹامک ٹوئیے مارتی رہتی تھی۔ چنانچہ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک عجیب انہماک کے آثار موجود رہتے تھے۔ جن کو اس کی بیوی سرد مہری اور بے توجہی پر محمول کرتی تھی۔ وہ صرف اس کے جسم کو نہیں بلکہ اس کی روح کو بھی چوبیس گھنٹے اپنی خدمت میں حاضر رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی ان کی ہر وقت کی باہمی کشاکش کی۔

وہ کبھی کبھی سوچا کرتا کہ جن لوگوں پر اس کی بیوی کی تعریف عاید ہوتی تھی۔ وہ کیسے خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔ اور اس کی جان پہچان کے لوگوں میں کتنے ایسے تھے جن پر یہ تعریف عاید نہ آتی ہو۔ وہی ایک ایسا تھا جس نے ذوقِ ادب کے مرض میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی ایک عذاب بنا رکھی تھی۔ اس کی بیوی اس کی ادب پرستی کو انہی نگاہوں سے دیکھتی تھی جن سے عورتیں سوکن کو دیکھا کرتی ہیں۔ اور اس پر کیا منحصر تھا، وہ یہ سرے ہی سے برداشت نہ کر سکتی تھی کہ اس کی ناز برداریوں اور دلداریوں کے سوا اس کے شوہر کو دنیا کے کسی مشغلے سے دلچسپی ہو۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اپنے شوہر کو سرکاری ملازمت کے فرائض بھی نہ ادا کرنے دیتی کیونکہ ان کے ادا کرنے میں بھی وہ اپنی عادت کے مطابق پوری جانفشانی سے کام لیتا تھا۔ لیکن آخر سرکاری کام تو اس کا کسب معاش کا ذریعہ تھا۔ رہے ادبی مشاغل، سو ان کے لئے چاہیئے فرصت، اور اسے فرصت ملنا معلوم۔ کم از کم ان اوقات میں جن میں عام لوگ دن کے کام کاج کرتے ہیں اسے سرکار اور گھر کی سرکار کی خدمات کہاں اجازت دیتی تھیں۔

اپنے پریشان خیالات کو جمع کر کے سپرد قلم کر سکے۔ چند مرتبہ اس نے ان اوقات میں تھوڑی سی فرصت نکال کر ایسا کرنے کی وندیدہ کوشش کی۔ لیکن ہر موقع پر اسے اپنی کوششوں کے نتیجے سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کی بیوی جو کراماً کاتبین کی طرح اس کے جسم اور روح کی محافظ بن کر ہر وقت اس کی نگرانی کرتی رہتی تھی، ناگہاں آ پہنچی۔ اور اسے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا نامۂ اعمال معاینہ کے لئے پیش کرنا پڑا۔ بعض مرتبہ وہ معاینہ کے بعد اور بعض مرتبہ معاینہ کے بغیر ردی کی ٹوکری یا آگ کی نذر کر دیا گیا۔ بھلا ایک بیوی بچوں والے آدمی کو کیا حق تھا کہ وہ ان فضولیات میں وقت ضائع کرے ؟

ان حالات کے ماتحت چند مہینے ہوئے اس نے اپنے طبعی تقاضے کو پورا کرنے کا ایک اور طریقہ نکالا تھا۔ وہ کبھی کبھی رات کو چپکے سے اُٹھ کر گول کمرے میں جا بیٹھتا۔ اور دو تین گھنٹے تک خامہ فرسائی کرنے کے بعد پھر چپکے سے آکر سو جاتا۔ خوش قسمتی سے وہ آج تک پکڑا نہ گیا تھا۔ اس نے مہینوں کے مشاہدے کے بعد یہ دریافت کر لیا تھا کہ رات کے کون سے حصے میں اس کی بیوی گہری نیند سوتی ہے، اور اسی حصے سے وہ فائدہ اٹھاتا تھا۔ چار مرتبہ وہ پھنستے پھنستے بال بال بچا۔ دو مرتبہ جب وہ سونے کے کمرے سے نکلنے کو تھا۔ تو اس کی بیوی جاگ اٹھی۔ اور اسی آواز میں جس میں ایک چوکیدار چور کو دیکھ کر للکارتا ہے چلائی۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں ؟" پہلی مرتبہ تو اس نے قدرے تامل کے بعد جواب دیا۔ "کہیں نہیں، مچھر دانی میں مچھر گھس آئے ہیں۔ بتی جلا کر دیکھنے لگا ہوں۔" "تو کیا آپ بھول گئے ہیں کہ سویچ ادھر ہے اُدھر نہیں ؟" "لاحول ولا قوۃ! خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے ؟" اس کے بعد اس نے بتی جلا کر پھر دیکھنے کا سوانگ رچایا۔ اور پھر چپکے سے قسمت پر شاکر ہو کر سو گیا۔ دوسری مرتبہ اس نے سوال کا جواب ذرا تن کر دیا ——— "کہاں جا رہا ہوں کیا معنی ؟ غسل خانے جا رہا ہوں اور کہاں جاؤں گا ؟" اس مرتبہ بھی اسے آگے کی طرح تنگ ہو کر بیوی کے شکوک کو رفع کرنا پڑا۔ تیسری مرتبہ وہ گول کمرے سے واپس آ رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ لیکن اس نے باز پرس کا جواب پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ "کمبخت ہوا کتنی تیز چل رہی ہے۔ اور یہ نوکر بھی کیسے ذلیل ہیں۔ باہر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور اتنے زور سے کھٹ کھٹ کر رہا تھا کہ سونا مشکل ہو گیا۔ تم نے نہیں سُنا ؟" ——— "نہیں!" ——— "خیر میں اب بند کر آیا ہوں" چوتھی مرتبہ بھی وہ گول کمرے سے واپس آ رہا تھا کہ گول کمرے اور سونے کے کمرے کے بیچوں بیچ بڑے ہال میں میاں بیوی کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ بیوی کو دیکھتے ہی بولا ——— "افوہ! تم بھی کیا بی۔بی۔سی سے بادشاہ سلامت کا براڈ کاسٹ سننے کے لئے اٹھی ہو۔ وہ تو کب کا ختم بھی ہو چکا ———"

بادشاہ سلامت کے براڈ کاسٹ سے اس کی بیوی کو اتنا ہی تعلق تھا، جتنا خود بادشاہ سلامت سے۔ اس لئے اُس نے اس کا جواب صرف اس تو کدار فقرے میں دیا۔ "کیا خوب! آپ اتنی رات گئے بادشاہ سلامت کا براڈ کاسٹ سننے اُٹھے تھے جب میں کہتی ہوں کہ ذرا سونے سے پہلے بیرے پاؤں دبا دیجئے۔ یا رات کو اٹھ کر بچے کو پیشاب کرا دیجئے تو آپ کو سو عذر سوجھتے ہیں ———"۔ "میں کام کاج والا آدمی ٹھہرا۔ دن کو جہاں تک ہو سکتا ہے۔ سرکار کی اور تم لوگوں کی خدمت کر دیتا ہوں رات کو نہیں کر سکتا ———"۔ "لیکن آپ راتوں کو اٹھ کر ریڈیو سن سکتے ہیں ؟ ———" اس وقت تو بات یہیں پر ختم ہو گئی (اور یہ ریڈیو کی انتہائی خوش قسمتی تھی کہ وہ توڑ نہیں دیا گیا) لیکن دوسرے دن اس بچارے سے چند ایسے کڑے اور تھکا دینے والے جسمانی کام لئے گئے جن کا مطالبہ پہلے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ خوش تھا۔ اس کی بیوی کو ہزار تنگ ہوا کریں۔ لیکن ابھی اس کو حقیقت حال کا پورا پتہ نہ چل سکا تھا۔ اس کو خبر ہوتے ہوتے اس کا ناول جو تکمیل کے آخری مراحل میں تھا ختم بھی ہو چکا ہو گا۔ اور چھپنے کے لئے بھیج بھی

جا چکا ہوگا۔ چھپائی کا بندوبست اس نے پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔

ناول اس وقت ایک بڑی تصویر کے چوکھٹے کے پیچھے جو کافی اونچائی پر ٹنگی ہوئی تھی چھپا ہوا رکھا تھا۔ وہاں تک اس کی بیوی کی رسائی نہ تھی۔ کہیں آس پاس پڑا ہوتا یا کسی صندوق، بکس یا الماری میں بند ہوتا تو کب کا بیوی کے ہاتھ لگ کر اس کی سابق ادبی کوششوں کی طرح نیست و نابود ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ وہ ہر وقت گھر کی تلاشی لیتی رہتی تھی۔ اپنی معنوی اولاد کے لئے یہ گوشہ اخفا اسے ایک دن بیٹھے بیٹھے اتفاق سے سوجھ گیا۔ اسی دن اس نے راتوں کو اٹھ کر لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کا تقریباً تین سو صفحوں کا ناول مکمل ہو چکا تھا، بلکہ وہ ایک بار اس کی نظرثانی بھی کر چکا تھا۔ آج رات اس کا ارادہ تھا کہ پھر ایک بار نظرثانی کر کے اسے رجسٹری پارسل کے ذریعہ پبلشر کے یہاں بھیجنے کیلئے تیار کر لے۔ اور دوسرے دن کسی طرح دفتر لے جا کر وہاں سے روانہ کر دے۔ آہا کس قدر اعلیٰ پایہ کا ناول تھا۔ اس نے کس کمالِ فن سے کام لیکر ایک ادیب کی خانگی زندگی اور اس کی پوشیدہ روحانی زندگی کو بیان کیا تھا۔ اپنے تجربے اور مطالعہ نفس سے اخذ کر کے اس نے کتنی پتے کی باتیں لکھی تھیں! اس پر اس کا اسلوب تحریر! یہ ناول اس کی ان تمام چیزوں کا نچوڑ اور نقش ثانی تھا، جنھیں اس کی بیوی کے بیرحم ہاتھوں نے تباہ کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کی پہلی چیزیں چھپ گئی ہوتیں تو یہ ناول وجود میں نہ آتا۔ ان کے تباہ ہو جانے میں خدا کی ایک حکمت مضمر تھی۔ قدرت کو یہ منظور تھا کہ نئے سرے سے وجود میں آجائیں۔ اور ایک زیادہ پختہ صورت میں یعنی شراب دو آتشہ بن کر۔ "شراب دو آتشہ" کی ترکیب کا صحیح اس کے ناول پر اطلاق ہوتا تھا۔ اس ترکیب کا مفہوم اور اس کا ناول جس پر یہ ترکیب صادق آتی تھی۔ ان دونوں کو گویا ایک خیالی جام میں انڈیل کر وہ بڑے مزے سے چسکیاں لگا رہا تھا۔ اور اس پر ایک بڑھتی ہوئی مستی اور سرخوشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت اگر اس کی بیوی یکایک گول کمرے کا دروازہ کھول کر آ داخل ہوتی تو وہ ایک فاخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتا۔ کیونکہ اس کا ناول محفوظ رکھا تھا۔

یکایک اس کو ایک نہایت پرلطف بات سوجھی۔ وہ کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور چلا اٹھا۔ "آہا بیوی کے نام سے ناول کو معنون کر دیا جائے تو کیسا لطف آئے۔" اس کا ناول نفسیاتی واقعہ نگاری کا ایک شاہکار تو تھا ہی! بیوی کے نام معنون ہو کر وہ طنز نگاری کا بھی ایک شاہکار بن جائے گا۔ اور جب ناول چھپ کر آئے گا تو وہ ایک کاپی لا کر بیوی کی خدمت میں پیش کرے گا۔

اس کا تصور اس ہدیہ کے پیش کرنے کی تصویر کھینچنے لگا۔ میاں بیوی دونوں بیٹھے ہیں معمول کے مطابق ان کے درمیان اچھے شوہر کے فرسودہ موضوع پر بحث و تکرار ہو رہی ہے۔ بیوی اس مافوق البشر انسان کی خوبیوں پر ایک دھواں دھار تقریر کر رہی ہے اور اس کی زبان اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہیں۔ وہ ایک بناوٹی ندامت کے انداز سے سر جھکائے ان شعلوں کی بوچھاڑ میں بیٹھا ہے۔ البتہ کبھی کبھی اس کی زبان سے اس قسم کے احتجاجی جملے نکلتے ہیں۔ "ارے بھئی یہ سب درست ہے، مگر میں یہ کہتا ہوں کہ میں کس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہوں...." "بس اب جانے بھی دو۔ بہت ہو چکا۔ کتنی بار ایک ہی بات کو دہراؤ گی۔"...."ہاں ہاں، میں مانتا ہوں لیکن آخر انسان کیلئے ترقی کی معراج یہی تو نہیں کہ گھریلو جانور بن کر رہ جائے۔ بیوی بچوں کے فرائض کے علاوہ اور بھی تو اسے دنیا میں کچھ کرنا ہوتا ہے...." "بالکل بجا، بالکل بجا، لیکن جس شخص کو خدا نے کوئی جوہر دیا ہو، اس پر یہ ظلم ہے۔ بلکہ دنیا پر ظلم ہے کہ وہ اس جوہر سے کام نہ لے سکے۔" "اس میں کچھ شک نہیں کہ ادیب عموماً اچھے شوہر نہیں ہوا کرتے، لیکن مجھ کو تم یہ الزام نہیں دے سکتیں۔" یہاں پہنچ کر اس کی بیوی ایک انتہائی کرب انگیز طعن کے انداز میں کہتی ہے۔ "بڑے آئے کہیں کے ادیب! دنیا بھر کے اخبار اور رسالے آپ کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں نا!" کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ایک حسرت آمیز آہ بھر کر یہ کہتا۔ "تم مجھے کچھ لکھنے بھی دو۔ میں نے جو دو چار چیزیں لکھیں وہ بھی تم نے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیں،

لیکن اس موقع پر وہ مسکرا کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ اور اپنا چھپا ہوا ناول نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے ایک خوشنما اور دیدہ زیب جلد ہے۔ عنوان "ادیب شوہر" رنگین سرورق۔ اس پر ایک مست الست ادیب کی تصویر ہے۔ جو قلم دانتوں میں دبائے ہوئے فکر تحریر میں غرق ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ پس منظر میں ایک کھڑکی کھلی ہے جس میں سے تاروں بھرا آسمان دکھائی دے رہا ہے۔ ادیب کی آنکھیں آسمان پر جمی ہوئی ہیں پس منظر کے ایک اور حصے میں ایک دروازہ کھلا ہے۔ اس میں ایک عورت اور دو بچے کھڑے ہیں۔ عورت کا چہرہ نہایت غضب آلود ہے۔ اور بچے رو رہے ہیں۔ وہ نہایت لطف لے کر سوچنے لگا کہ اس کی بیوی اپنے آپ کو اس عورت کے بھیس میں پہچان کر کتنی جز بز ہوگی اور وہ کس طرح ایک فاتحانہ انداز سے مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اس منظر کی عملی طور پر مشق کرنے کیلئے اٹھا اور ایک کرسی پر کھڑے ہو کر اس نے تصویر کے چوکھٹے کے پیچھے ہاتھ ڈالا۔ ہیں' یہ کیا؟ ناول کیا ہوا؟ اس نے پنجوں کے بل اپنے آپ کو اور اونچا کر کے چوکھٹے کے پیچھے کی اچھی طرح تلاشی لی۔ ناول کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا اُف! یہ کس کی کارستانی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ —— ؟ مگر یہ کیسے ممکن تھا؟ بھلا اس کی بیوی کے فرشتوں کو بھی یہ کیسے پتہ چل سکتا تھا؟ ممکن ہے کہ ناول کسی نہ کسی طرح چوکھٹے کے پیچھے سے پھسل کر نیچے گر پڑا ہو اور کسی نوکر نے اٹھا کر رکھ دیا ہو۔ اس نے جلدی جلدی جا کر اپنے مطالعے کے کمرے کی اور اس کے بعد بچوں کے کمرے کی تلاشی لی چیزوں کے اٹھانے اور رکھنے کے شور سے بچے جاگ اٹھے۔ اس نے ایک ایک سے پوچھا "دیکھو ایک اتنی موٹی کاپی جس پر اردو میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ تم نے تو کہیں نہیں دیکھی؟" ایک بچے نے نیم بیداری کے عالم میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے وحشت آلود چہرے کو دیکھا اور قدرے سہمے ہوئے انداز سے جواب دیا "نہیں آبا! میں نے تو نہیں دیکھی"۔ دوسرا جو اس سے چھوٹا تھا ڈر گیا۔ اور زور زور سے چیخیں مار کر رونے لگا۔ اس کی چیخوں کی آواز برابر کے کمرے میں جہاں اس کی بیوی سو رہی تھی یقیناً پہنچی ہوگی اور قیاس چاہتا تھا کہ وہ جاگ اٹھی ہوگی۔

لیکن جب وہ دل کڑا کر کے بیوی کے کمرے میں گیا اور اس کے بستر کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ گہری نیند میں بے خبر پڑی ہے، اس نے شانہ ہلا کر اسے جگانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ پھر بھی نہیں جاگی۔ ابکی اس نے اس کے سارے جسم کو زور سے جھنجھوڑا۔ بالآخر بیوی نے آنکھیں کھولیں اور نہایت خشمگیں لہجہ میں پوچھا "کیا ہو گیا ہے آپ کو جو اتنے زور سے مجھے جھنجھوڑ رہے ہیں؟" "سنو تم نے تو میرا ناول نہیں دیکھا؟" بیوی نے نہایت طنز آمیز آواز میں کہا "ناول!" اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ "دیکھو اگر تم نے لیا ہو تو مہربانی کر کے مجھے واپس دے دو"۔ بیوی نے کروٹ بدلے بغیر پوچھا "کیوں؟" "میں اسے چھپنے کیلئے بھیجنا چاہتا ہوں"۔ "اب کوئی نیا ناول لکھ کر چھپوائیے گا"۔ "کیا معنی، تم نے کہیں اسے پھاڑ کر تو نہیں پھینک دیا؟" "پھینکا نہیں، جلا دیا ہے"۔ "اُف! میرے اللہ مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو میری مہینوں کی محنت تھی"۔ "ہوگی۔" "لیکن یہ تو کہو کہ تمہیں اس کا پتہ کیسے چل گیا؟" "جی میں مردوں سے شرط لگا کر تھوڑی سوتی ہوں۔ آپ کی حرکتوں سے بھانپ گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے کل رات گول کمرے کے دروازے کے باہر سے کان لگا کر سن رہی تھی کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ کرسی کے کھینچنے اور چوکھٹے کی کھٹ کھٹ سے مجھے پتہ چل گیا کہ آپ نے کون سا چور خانہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ بس ——" "تو پھر؟" —— "پھر کیا؟ آج دوپہر کے وقت آپ کا ناول چور خانے سے نکال لیا گیا اور چولھے میں پھینک دیا گیا"۔

غم اور غصے سے اس کا سر جھک گیا۔ اور وہ سر تھام کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جہاں اس کا ناول پھینک دیا گیا تھا وہیں اٹھا کر بیوی کو بھی پھینک دے۔ لیکن پھر اس کو خیال آیا کہ وہ ایک مہذب انسان تھا اور ایک اچھا شوہر بننا اس کا فرض تھا۔ یہ جملہ رہ رہ کر اس کے ذہن میں گونج رہا تھا کہ "ایک اچھا شوہر ادیب نہیں ہو سکتا"۔

محمد ہادی حسین

ہم لوگ

چمن گذیرہ لبِ جوئبار ایک درخت
نہ جانے دیکھتا ہے کس جہان کی باتیں
کچلتا سبزہ، نئے پھول، دودھیا کرنیں
اُلجھ رہا ہے ابھی اس سے چاند کا دامن

چمکتی چڑیاں چہکتی ہیں کتنے رنگوں میں
فضا میں گھلتی ہوئی اُن کی زرفشاں آواز
ہر ایک سمت جھلکتا ہے جس سے شعلۂ ساز
خیال و خواب کی دُنیا میں اس کو رکھتی ہے

بہار ایسی اک آئی کہ اُس کی رعنائی
نکال لے گئی رگ رگ سے اُس کی ذوقِ نمو
اُبلتی تازگی رہ رہ کے پھیلتی خوشبو
خزاں کا نام تو بدنام ہے زمانے میں

قیوم نظر

فیروز شاہ تغلق پر ایک اعتراض

"دیگر از عطایائے سبحانی آن ست کہ ہنودِ مردماک و بُت پرست کہ زرِ ذمہ پذیرفتہ اند و جزیہ قبول کردہ و خانمان ایشاں مصئون ماندہ، بتخانہائے جدید در شہر و حوالی بنیاد نہادہ بودند و در شرع محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم احداثِ بتخانہ روانہ باشد۔ بہ توفیق حق جل و علا آں بناہائے فاسد ایشاں را خراب کردیم۔ و ائمہ کفر کہ دیگراں را اضلال می کردند، بکشتیم۔ و عوام ایشاں را بہ تعزیرات زجر کردیم تا ایں فساد بہ کلی افتاد۔"

"دیگر، اخبار کردند کہ در موضع صالح پور بتخانہ جدید بعضے از ہنود عمارت کردہ اند و بت پرستی کنند۔ آں جا نیز کساں فرستادیم کہ بتخانہ خراب کنند۔ و نیز آں اشخاص را کہ در گمراہی اصرار نمودہ بودند، دفع کردیم —"

(فتوحات فیروز شاہی)

فتوحات فیروز شاہی کے یہ دو اقتباسات سلطان فیروز شاہ تغلق کی مشہور تالیف کے اس حصے سے متعلق ہیں جن کی بنا پر فیروز کو ہندو کش، متعصب، تنگ نظر اور اسی قسم کے دیگر القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ فیروز ایک پاکباز اور زاہد منش سلطان تھا۔ کذب و افترا، فریب و کینہ، بغض و حسد اس سے اتنی ہی دور تھے جتنی صبح کی سپیدی سے رات کی سیاہی۔ فتوحات فیروز شاہی اس کی خود نوشتہ کتاب ہے۔ جس میں اُس نے عموماً اپنے ان کارہائے نمایاں کا تذکرہ کیا ہے جو اُس نے اپنی رعایا کے فلاح و بہبود کے لئے انجام دیئے۔ فیروز اپنی اس شاندار کامیابی پر فخر کرتا تھا۔ جس کا اظہار اس نے "فتوحات" میں بعض مقامات پر کیا ہے۔ اس فہرست میں مندروں کا انہدام اور ہندوؤں کا (نام نہاد) قتل و غارت بھی شامل ہے۔ اور یقیناً اس پر بھی فیروز نے خود کو مبارکباد کہا ہوگا۔ لیکن کسی سلطان عادل کا یہ طرز عمل اس کے ان کارناموں کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا جن کا مقصد وہ خود رعایا کی فلاح و بہبود بتاتا ہے۔ مندروں کا انہدام اور ہندوؤں پر بیجا ظلم و تعدی خود اسلام میں بھی جائز نہیں۔ اسلام ہرگز بیجا جبر و تشدد کی تلقین نہیں کرتا۔ اسلام ہرگز قتل و غارت کا حامی نہیں۔ فیروز اسلام کی تعلیمات سے کماحقہٗ بہرہ ور تھا۔ اس لئے کوئی ایسا عمل جو اسلام کے احکام کے منافی ہو اس سے سرزد ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ اس لئے فیروز کے اس جرم کا جس کا اقبال اس نے خود مندرجہ بالا اقتباسات میں کیا ہے کوئی سبب ضرور ہوگا۔ اور یہ سبب تلاش کرنا ہی اس مضمون کا مقصد ہے۔

یہ کہنا بالکل تحصیل حاصل کے مانند ہے کہ محمد بن قاسم کے حملہ سندھ (سنہ ۷۱۲ء) کے بعد مسلمانوں کی تعداد ہندوستان میں تھی ضرور لیکن نہ ہونے کے برابر۔ اور جب سندھ میں مسلم حکومت کا زوال ہوا تو مسلمانوں کا تعلق ہندوستان سے یکسر تجارتی ہو کر رہ گیا۔ محمود غزنوی کے بعد مسلمانوں کی اس تعداد میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ لیکن چونکہ محمود کا منشا خود مذہب کی تلقین و اشاعت نہیں بلکہ دولت کی ہوس تھا۔ اس لئے اس نے اپنی توجہ اس طرف منعطف کرنے کی زحمت اس وقت تک گوارا نہ کی۔ جب تک ملتان قرمطی الحاد کا زبردست مرکز نہ بن گیا۔ شہاب الدین غوری کے حملہ کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد میں ایک مرتبہ پھر اضافہ

ہو۔ لیکن اب بھی غیر مسلم آبادی مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ غلام خاندان کے کسی سلطان نے خاص طور سے اسلام کی اشاعت کی طرف توجہ نہ کی۔ اور اس زمانہ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جب کسی ہندو کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کے تین سبب تھے (۱) افزائش نسل (۲) باہر سے آمد اور (۳) غیر مسلموں کا مسلمان ہونا۔ اس میں شک نہیں کہ منگولوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے وسط ایشیا اور ایشیائے کوچک سے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہندوستان آئے۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی عددی نسبت میں کوئی خاص فرق ہونا تھا نہ ہوا۔ بلبن کا شمار اگرچہ مذہبی ذہنیت رکھنے والے حکمرانوں کیا جاتا ہے۔ لیکن تاریخ برنی شاہد ہے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ عدل گستری اور اشاعت اسلام ایک حکمران کے دو سب سے اہم فرائض ہیں۔ اس نے موخرالذکر کو قطعاً نظر انداز کیا۔

علاء الدین خلجی کو مذہب سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسے اسلام اور مسلمانوں کی حیثیت مسلمان ہونے کے کوئی پروانہ تھی۔ اس نے ہمیشہ شریعت اور سیاست کو دو جداگانہ چیزیں خیال کیا۔ لیکن ایک بات سے ہمیشہ اس کا دل دکھتا تھا۔ اور وہ عوام کی بے راہ روی، ان کی مبتذل عادات، ان کے گندے اخلاق اور ان کا فسق و فجور تھا۔ عوام کی اصلاح کی طرف علاؤالدین نے اپنی توجہ کی اور نہایت تشدد سے کی۔ اس نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ کیا اسلام کے منافی ہے اور کیا اسلام کے موافق۔ کس سزا کی اسلام اجازت دیتا ہے۔ اور کس کی نہیں۔ برنی اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے۔

"سلطان را بوالعجب عادتہا و رسم ہا بودہ است۔ و از نہایت بدخوئی و سخت گوئی و قہر و عنف و بیمہری و بیباکی کہ سلطان در سرشت داشت حالت سیاست فرمودن نظر در مشروع و نامشروع نینداختے و مشروع و نامشروع ندانستے و خون و پیوند و حقوق دیگر او را مانع سیاست نشدے"

سلطان کی اس سخت گیری سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ایک حد تک رعایا کی اصلاح ہو گئی۔ لیکن اسلام کو اس کے طرز عمل سے فائدے کے بجائے نقصان ہی پہنچا۔ ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کے اچھے اور بُرے اثرات جو عام مسلمانوں پر تھے جوں کے توں باقی رہے۔ ان کے رسوم اور رواج جو مسلمانوں اور خصوصاً نومسلموں میں رائج تھے بالکل نہ بدلے۔

مسلمان سوسائٹی کی یہ حالت تھی جب خاندان خلجی کے مکمل زوال کے بعد غیاث الدین تغلق دہلی کے تخت پر متمکن ہوا چونکہ اس کا عہد حکومت بہت مختصر تھا۔ اس لئے اسے اس طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ محمد بن تغلق کے مذہبی عقاید اگرچہ علاوہ ایک مختصر سے وقفہ کے ایک کٹر مسلمان کے سے رہے۔ لیکن اس نے بھی وہی کیا جو علاء الدین خلجی نے اپنے عہد حکومت میں کیا تھا۔ محمد بن تغلق بھی علاء الدین کی طرح مذہب اور سیاست کو علیحدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اس طرز عمل کا نتیجہ وہی نکلا جو ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی سوسائٹی کی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی۔ علما اور مشائخ کی ایک کثیر تعداد ملک میں موجود ہونے کے باوجود بھی اسلامی روایات مسلمانوں سے تقریباً نابود ہو گئیں۔ مسلمان ہندو ہونا شروع ہو گئے۔ اور بحیثیت مجموعی اسلام خطرہ میں نظر آنے لگا۔

سوسائٹی کی یہ حالت تھی جب فیروز شاہ تغلق نے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ فیروز نے اس سوسائٹی کی عموماً اور مسلمانوں کی اصلاح کی ذمہ داری خصوصاً اپنے سر لی۔ بحیثیت ایک نیک اور سچے مسلمان کے فیروز نے ایک ابتر اور روبانحطاط مسلم سوسائٹی کی اصلاح اپنا فرض اولین سمجھا۔ فیروز کو اس تلخ حقیقت کا شدید احساس تھا۔ کہ وہ سوسائٹی جس میں جمود و تعطل کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں جلد ہی اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود لیتی ہے۔ اقبال کا مطلعہ زندگی آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے

ی اس کے دماغ میں جگہ کئے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ فیروز کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام
عالم اسلام میں اعتزال کا بہت زور تھا۔ ہر بات منطقیانہ نقطۂ نگاہ سے جانچی جا رہی تھی، ہر اصول کا فلسفیانہ تجزیہ کیا جا رہا ہے۔
سلام کے اصول بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اسلام کے قواعد کی بھی فلسفیانہ تاویلیں کی جا رہی تھیں۔ اعتزال کی اس لہر کا یہ اثر ہوا کہ
نہ صرف کم پڑھے لکھے مسلمان بلکہ محمد تغلق جیسے عالم بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ضیاء الدین برنی کو اس کا احساس تھا۔ اور
یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفہ کی بیخکنی کو بھی کامیاب حکمرانی کے لوازمات میں شمار کرتا ہے۔

اس مختصر سے تجزیہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم سوسائٹی کو نہ صرف بیرونی بلکہ کئی اندرونی خطرے بھی لاحق تھے
ایسے نازک وقت میں نئے مندروں کی تعمیر فیروز کے دل پر یقیناً گراں گزری ہوگی۔ اور اگر اس نے ان نئے مندروں کے
انہدام کا حکم دیا بھی تو کیا بیجا کیا؟ یہ بات ہر حال میں قابل لحاظ ہے کہ فیروز نے جہاں بھی کسی مندر کے انہدام کا تذکرہ کیا ہے
وہاں لفظ "جدید" ضرور موجود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ فیروز کا یہ اقدام محض دافعانہ تھا نہ کہ جارحانہ۔ اور دفاع بھی کیسا
ایک حقیر اقلیت کا ایک زبردست اکثریت کے خلاف! ـــ مسلمانوں کو شکرگزار ہونا چاہیئے کہ فیروز کے اس اقدام کے بغیر بحیثیت
القوم ان کا وجود ہندوستان میں بہت دشوار تھا۔ اور کیا عجب تھا کہ ہندوستان میں اسلام ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے ہندو روایات کی گود میں سو جاتا۔

ہندو اور یوروپین مورخین نے اس ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر رکھ دیا۔ اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے مسلمانوں کو تباہی
سے بچا لیا اسے مختلف طریقوں سے مطعون و ملعون کیا جاتا ہے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ فیروز ایک حد تک مذہبی تنگ نظری کا شکار
تھا۔ لیکن کوئی مثال ایسی موجود نہیں کہ جب اس نے محض تعصب کی بنا پر کسی غیر مسلم فرد یا جماعت پر ظلم روا رکھا ہو۔ فیروز کا
شمار ان حلیم الطبع حکمرانوں میں کیا جاتا ہے جو ملک کے ہر طبقہ کو اپنا حلقہ بگوش رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ یقیناً بلا پس و
پیش کوئی ایسا کام نہ کر سکتا تھا جس سے خود اس کی سلطنت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔ ہندوؤں کو برہم کرنا گویا ملک کی سب سے
زبردست جماعت کو اپنے خلاف کر لینا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور بات قابل لحاظ ہے اور وہ یہ کہ فیروز کے عہد حکومت میں ایک بھی بغاوت نہیں ہوئی۔ کیا ہندوؤں
کو اس وقت اس کا احساس نہ تھا کہ ان کے ساتھ زیادتی کی جا رہی ہے؟ کیا ہندوؤں میں یہ سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی کہ سلطان کا
برتاؤ ان کے ساتھ عادلانہ نہیں ہے؟ کیا ہندوؤں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ فیروز جیسے کمزور بادشاہ کے خلاف بغاوت کر سکتے؟
تھی اور یقیناً تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کے دلوں میں فیروز کی طرف سے تنفر پیدا نہ ہوا؟ مذہبی تو مذہبی کوئی سیاسی بغاوت بھی پیدا
نہ ہوئی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ فیروز کا برتاؤ ملک کے ہر سیاسی اور مذہبی گروہ کے ساتھ منصفانہ ہی نہیں بلکہ ایک
بڑی حد تک خوشامدانہ تھا۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ اس کا یہ طرز عمل خاندان تغلق کے زوال کا ایک سبب بنا۔ لیکن ڈاکٹر ایشری پرشاد
کی طرح یہ کہنا کہ دہلی سلطنت کے زوال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حکومت پر سیاست کی بجائے مذہب نے غلبہ پا لیا تھا یقیناً غلط
ہے۔ اور فیروز کی نہیں بلکہ خود ان کی تنگ نظری اور مذہبی تعصب پر روشنی ڈالتا ہے۔

وحید بخش

ذرّہ

ان کے چہرے پہ وہ ناکامیٔ کاوش کا غبار
دھوپ کی آنچ سے لہراتا ہوا اگرتا ہے
کہ اُفق تا بہ اُفق گنبدِ بے حِس کی طرح
منظرِ یاس پہ خاموشی سے ہے چھایا ہوا
ہر طرف حدِّ نظر ماتمی گردشِ
وسعتِ کون و مکاں سمٹی ہوئی ہر جانب
چند پیڑوں کے اُبھرتے ہوئے ہیولوں کے سوا
کس نے دیکھا ہے۔ کسے دیکھا ہے۔ کیا دیکھا ہے
گرد آلود دھندلکوں سے اُلجھتی ہے نگاہ
اور افکار کا احساس کہ ان کے اُس پار
ہیں ابھی اور بھی کچھ وسعتیں کچھ دنیائیں
دھوپ کی آنچ سے مُرجھائی ہوئی جھلسی ہوئی

(۲)

رات لے آئی ہے پردوں کے یہ افسانے
وسعتیں اور چلی آئی ہیں نظروں کے قریب
زندگی اور خموشی سے گراں بار ہوئی
زندگی — جیسے اُٹھے سینۂ سوزاں سے دھواں
اور نظروں سے اُلجھ جائے دھندلکا بن کر
ہر حقیقت پہ نقابِ سرِ زلفِ جاناں
اس طرح ڈالا ہے مشاطگیٔ یارانِ شب نے
کہ مجھے اپنی حقیقت کا بھی احساس نہیں
زندگی — جیسے نظر آتا ہے قبروں کا سماں
اور ہر قبر کے سینے میں وہ ذرّہ ہے نہاں
آج صدیوں کے تجربے نے جسے پایا ہے
اک وہی ذرّہ کہ جو موت کا ہمسایہ ہے

(۳)

راز ہی راز ہیں پابندِ حقائق ہر سمت
سانس لیتی ہے نظر اپنی فضاؤں میں جہاں
کہ جہاں قبروں کے ملبوس میں ہے ہر نغمہ
کہ جہاں سایوں کے مدفن میں ہیں انوار نہاں
کون اس قیدِ تجسّس سے رہائی دے گا؟
کب مجھے قبروں کے اُس پار دکھائی دے گا؟

یوسف ظفر

طلسمِ باطل

لاری سے اترتے ہی اُس نے ڈاکخانے پر ایک نظر دوڑائی - واقعی خوبصورت فضا میں بنا ہوا یہ ننھا سا ڈاکگھر بھلا دکھائی دیتا تھا - اس کے ایک طرف بیگنا ندی اور دوسری طرف سبز بیلوں سے لدا ہوا ٹیلہ تھا - اور وہ دھینل سے آنے والی موٹر کاری سڑک کے کنارے واقع تھا - یہاں خوش آمدید کہنے کے لئے ڈاکخانے کے تمام بابو اور پوسٹمین کھڑے تھے - اس نے سب کو سلام کہا - اپنا مختصر سامان ڈاکیوں کے حوالے کر کے وہ خود عبدالرحمن اور جنگل کشور کے ہمراہ ڈاکخانے کی طرف چلا - رستہ ذرا چڑھائی کا تھا اس کا دم اوپر پہنچتے پہنچتے پھول گیا -

ڈاکخانے کے دروازے پر کھڑے پوسٹماسٹر جلال الدین اسے دیکھ کر مسکرائے - وہ اپنا لمبا ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر آداب عرض، آداب عرض کے نعرے لگانے لگے - سفر کا حال پوچھا، کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی - جگہ نہایت خوشگوار ہے - یہ اور وہ - اس کو لی دھیرے سے اپنی کرسی پر بٹھا کر کہنے لگا "یہ پانچسو لفافے، چھ سو ایک آنے والی ٹکٹیں - یہ سیونگ بنک کی کاپیاں - یہ سالانہ کوڈ اور یہ چارج کی تبدیلی کے فارم"۔ گنتے گنتے دونوں کو شام ہو گئی اور بتی کی مدھم روشنی میں پوسٹ ماسٹر جلال الدین نے آخری بار اس سے مصافحہ کیا اور کہا - "خدا حافظ! ہم تو کل دھینل سے دُور باڈھورہ میں چارج لے رہے ہوں گے - واقعی لاجواب جگہ ہے یہ - نہایت سستی - آنے سیر آلو - دو پیسے سیر مٹر - دو آنے سیر کا دودھ - واقعی خوش قسمت ہو جو یہاں آگئے"۔

پوسٹ ماسٹر جلال الدین نے اسی لاری میں اپنا سامان لدوایا اور باری باری سب بابوؤں اور پوسٹ مینوں سے ہاتھ ملایا ——— لاری چل دی -

---

اس نے اپنا بیگ بستر اسنبھالا - لیکن کوارٹر میں جانے سے پہلے اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایک بار چکر لگا کر اپنے نئے حلقے کو دیکھ لے - رات چاندنی تھی اس نے کرتارا کو آواز دے کر رات کا کھانا بنانے کے لئے کہا - اور خود چھڑی لیکر بابو عبدالرحمن کے ساتھ چل کھڑا ہوا -

واقعی بیگنا کی وادی قدرت کی خوبصورتیوں سے مالا مال تھی - اس نے ڈاکخانے والے ٹیلے پر ہی کھڑے کھڑے کچھ دُور سوئے ہوئے دھینل کے گاؤں کی طرف دیکھا جو چاندنی میں نہا رہا تھا - پھر نیچے بہتی ہوئی ندی دیکھی جو اس وقت بالکل چاندی کی لہر سی بن کر چٹانوں پر کودتی پھاندتی جا رہی تھی - اس نے ایک آہ بھری - اور اسے کوچہ چڑیماراں میں اپنا چھوٹا سا تاریک گھر یاد آگیا - جہاں اس کی بیوی ننھے رفی کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی - ماجد ضد کر رہا ہوگا - سندر چیخ رہا ہوگا شمی پڑوس کی لڑکی سے لڑ رہی ہوگی - اور کاکا تو ایک بلا ہے - رو رو کر گھر کو سر پر اٹھا رہا ہوگا - اور اس کی تیلی دُبلی بیوی ان سب کو سنبھال رہی ہوگی - جیسے مرغی اپنے چوزوں کو - وہ شاید اسے یاد کر رہی ہوگی - آہ، یہ جگہ کتنی پُر سکون ہے - اور خدا سے کتنے قریب - اور وہ لاہور کا کوچہ چڑیماراں ——— خدایا!

عبدالرحمن نے اپنی بھیگی مسوں پر ہاتھ پھیرتے کہا۔ "جناب اُداس کیوں ہیں۔ واللہ یہ تو عجیب جگہ ہے۔ کل تک آپ کا جی نہ
ل جائے تو میرا ذمہ۔ وہ وہ مال ہے کہ آپ لاہور کو بالکل بھول جائیے گا۔" اس کی بھوری بھوری آنکھوں میں شرارت کی چمک پیدا
ئی۔ کمبخت یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا نیا پوسٹ ماسٹر اُس کی طرح آزاد مجرّد نہیں۔ بلکہ آدھ درجن بچوں کا باپ۔

"اونہہ! اچھا یہ بات ہے۔" اس نے معمولی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ اس اُداس اکیلے پن کا اور علاج ہی کیا تھا۔ "کیوں
ہیں بھائی! کشمیر جنت نظیر ہی تو ہے۔"

بابو پھڑک اُٹھا۔ بس جناب کچھ نہ پوچھئے۔ ایک ایک وہ لاجواب چیز ہے کہ خدا کی قسم قاف کی پریاں قربان کر دوں۔ گُل ہیں
ل، وہ کیا شعر کہا ہے کسی نے۔ سیاہ چشمان کشمیری۔ واللہ حقیقت ہی تو ہے۔ آپ کو کچھ شعر و شاعری سے بھی مس ہوگا؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا "کیوں نہیں۔ میں نے حالی کا سارا دیوان دو روز
بن ختم کر لیا تھا۔

عبدالرحمن نے اپنی لے میں آتے ہوئے کہا۔ "بس یہی موزوں جگہ ہے شاعر کے لئے تخیل پسند کیلئے۔ آپ کو قسمت نے صحیح جگہ پہ لا دی ہے"
ادھر اس کے دماغ میں اپنے مادھو۔ شمی۔ کاکا۔ ردّی اور اپنی دُبلی پتلی بیوی کا نقشہ کھنچ گیا۔ اور اُس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا صنوبر
کے دو درختوں پر بیٹھے ہوئے کچھ پرندے اپنے راگ الاپ رہے تھے۔ اور تارے خاموش سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور اس طرف
رستے سے ذرا ہٹ کر نیل دھاری کے ننھے ننھے پھول چاندنی میں ایسے چمک رہے تھے جیسے آبدار موتی!

وہ ڈاکخانے سے کافی دُور آ چکے تھے اور بیگنا کی سرشار سُریں یہاں سے صاف سنائی دیتی تھیں۔

دوسرے روز صبح ہی اُس نے ایک خط اپنی بیوی کے نام لکھا "عزیز از جان پیاری! یہاں پہنچ گیا ہوں۔ نہایت اچھی جگہ ہے کوارٹر
بھی بڑا صاف ستھرا ہے۔ پانی کا مناسب انتظام ہے۔ گاؤں بھی کچھ زیادہ دُور نہیں۔ لاہور سے ٹھنڈک بھی زیادہ ہے۔ اُمید ہے تم سب کو جلدی یہاں
بُلا لوں گا۔ ننھے کو کاڈ لیور آئیل دیتے رہنا۔ اور دیکھو شمی اور ردّی کو لڑنے نہیں دینا۔ ہمسایوں سے بھی زیادہ بات چیت بند کر دیں۔ اور ہاں
میں اپنا دھاری دار وسکٹ وہیں بھول آیا ہوں کسی آتے جاتے کے ہاتھ بھیج دینا۔ گو میں تم سب کو جلدی بلوا لوں گا کسی قسم کی تشویش نہ کریں،
کسی چیز کی ضرورت ہو تو لکھیں۔ تمہارا۔۔۔" خط لکھنے کے بعد اُس نے نتھو پوسٹمین کو بلایا اور خط ڈاک کے تھیلے میں بند کرا دیا۔ اسے ایک گونہ تسلی
ہوگئی۔ اور اس کے بعد وہ پھر سیونگ بنک کی کاپیوں، منی آرڈروں کی رسیدوں اور پارسلوں کے رجسٹروں میں منہمک ہو گیا۔ عبدالرحمن
نے جگل کشور کے کان میں کہا۔ "نیا پوسٹ ماسٹر محنتی اور شریف آدمی ہے۔۔۔"

اپنے کام میں وہ سب کچھ بھول گیا۔ بیگناندی صنوبر کے درخت۔ چاندنی اور نیل دھاری کی بیلیں، محلہ چڑیماران۔ ردّی شمی اور
کاڈ لیور آئیل۔ سب کچھ بھول گیا۔ چالیس روپے نکالے گئے۔ باقی رہے ستّر۔ ابھی یہ تو درج نہیں کئے۔ اندراج لال سیاہی سے ہونا چاہیئے۔
نئے پوسٹل رولز میں لکھا ہے۔ ہزاری مل کا منی آرڈر سو روپے کا اس کے لڑکے کی طرف سے۔ پنڈت شانتی سروپ کا بیمہ۔ یہ رجسٹری لفافے
پوسٹمین نمبر ۲ کے حوالے۔ اُس نے محسوس کیا کہ دھیبل کا گاؤں تو مختصر سا ہے۔ لیکن کام کافی ہے۔

سہ پہر کو ایک بڑھیا ہاتھ میں لاٹھی ٹیکتے اور ایک ہاتھ لڑکی کے کندھے پر رکھتے اس کی کھڑکی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ "بابو جی
یہ میری کتاب ہے۔ روپیہ نکلوانا ہے۔ کل پچاس روپے جی۔"

اس نے ایک ہاتھ سے کاپی تھام لی۔ دوسرا ہاتھ ابھی ٹکٹکی پر تھا۔ سرینگر میں تار دے رہا تھا۔ سیٹھ جواہری مل کا تار تھا۔ اُس لئے

سونے کا بھاؤ پوچھا تھا ۔ "ٹھہر و مائی جی! ایک منٹ میں نکال دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر لفظوں کے ہیر پھیر میں گم ہوگیا۔ بڑھیا کھڑکی کے نیچے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ساس کی لڑکی پاس ہی ایک طرف ہو کر کھڑی رہی۔ پوسٹماسٹر سونے کا بھاؤ پوچھتا رہا۔

ادھر سے فارغ ہو کر اُس نے کاپی پر نظر دوڑائی "سماۃ جیواں بیوہ پنڈت گوپی دھر سکنہ دھنیل" اُس نے کھڑکی میں سے کھڑی ہوئی لڑکی کو دیکھا ۔ عام کشمیری لڑکیوں ایسی لڑکی تھی۔ لیکن لاہور میں اُس نے ایسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی ۔ سیاہ لہراتی ہوئی آنکھوں میں اُس نے حقیقتاً سیاہ چشمان کشمیری کا جادو دیکھا ۔ اور پھر نظریں جھکا کر کہا ۔ "مائی جی کہاں ہیں ؟"

"یہ بیٹھی ہیں جی!" لڑکی نے جواب دیا۔ نیچے دیوار سے آواز آئی "مجھے بُلایا ہے لاجو!" اور بڑھیا یہ کہہ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی "بیٹا! ایشور تجھے مراد مند کرے ۔ یہ بچاس روپے بڑی جلدی چاہئیں ۔ لڑکے کا نیوتا آیا ہے۔" اس نے کاپی کے ورق اُلٹ کر دیکھے۔ کل رقم ۴۵۰/-/- تھی۔ کہنے لگا "مائی تمھیں یہاں کون جانتا ہے ؟" ۔ "سب ہی جانتے ہیں بیٹا ۔ آئے روز تو ڈاکخانے میں آتی ہوں ۔ یہ بابو جگل کشور جانتے پہچانتے ہیں۔" اس نے بابو جگل کشور کی طرف پچھلی کھڑکی میں دیکھتے ہوئے کہا ۔

جگل کشور نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز دی ۔ "ہاں جناب جانتا ہوں مائی جی کو ۔ پنڈت گوپی دھر کی گھر والی ہیں"

پوسٹماسٹر نے جلدی سے میز کی دراز کھولکر دس دس روپے کے پانچ نوٹ گن کر کھڑکی میں بڑھا دیئے ۔ "یہ لو مائی جی! اب باقی چار سو روپے رہے آپ کے ۔ ٹھہریئے، میں اندراج کئے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے ۵۰ کا ہندسہ نیلی سیاہی سے اور ۴۰۰ کا ہندسہ سُرخ سیاہی سے جیسا کہ قواعد چاہتے ہیں لکھا اور کاپی لاجو کے ہاتھ میں دیدی ۔ کاپی دیتے وقت اس کا ہاتھ گھبراہٹ میں لڑکی کے ہاتھ سے چھو گیا ۔

"ہرے رام" اُس نے دل ہی دل میں کہا "میرے چھ بچے ہیں ۔ لیکن نہ جانے یہ سیاہ چشمان کشمیری ..." خیال اس کے دل سے یکلخت معدوم ہوگیا ۔ ٹائنکنگ کی کھٹ کھٹ شروع ہوگئی تھی اور اُس نے دیکھا کہ جواہر مل کے جواب میں سرینگر والے سونے کا بھاؤ ۷۰ روپے تولہ بتا رہے تھے ۔

جب اس نے تار کے فارم پر اندراج کر کے جواہر مل کا پتہ لکھ کر تار رجسٹر میں نمبر کے ہاتھ پر رکھ دیا تو گھڑی نے پانچ بجائے ۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا ۔ تکان دور کرنے کے لئے وہ چھت کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایڑیوں کے بل کھڑا ہوگیا ۔ بابو عبدالرحمٰن پیچھے سے آکر اس کے پاس کھڑا ہوگیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا ۔ "بابو جی! یہ لاجو تو نری آفت کا پرکالہ ہے پرکالہ" یہ کہہ کر وہ ہی ہی کرتا ہوا اپنی جگہ پر واپس چلا گیا پوسٹماسٹر نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا ۔

آج اس کے دھنیل میں آنے کے بعد پہلا اتوار تھا ۔ چنانچہ وہ بڑی دیر تک اپنے بستر میں لیٹا رہا ۔ پھر شیو کی، نہایا اور کپڑے بدلے، آج اس کی زندگی کا پہلا بیکار دن تھا جب اُسے پاپڑ منڈی، انار کلی اور لوہاری دروازے سے گھر کے لئے تیل، لکڑیاں، نمک مرچ اور ایسی کئی ایک چیزیں نہیں لانی تھیں ۔ آج وہ اپنے آپ کو اپنا اور اپنے وقت کا مالک سمجھ رہا تھا ۔ اسے اپنے سکول کے وہ بے فکر دن یاد آگئے جب وہ اس طرح جاڑوں کی صبحوں کو دیر تک بستر میں پڑا خواب لیتا اور گنگناتا رہتا ۔ آج بھی اسے ایسے ہی خواب آئے ۔ دھنیل کے بیگنا وادی کے، چاندنی کے، صنوبر کے درختوں کے، اور پھر لاجو کے، حالانکہ اس کے بستر کے پاس پڑی ہوئی تپائی پر کل کا آیا ہوا لاہور کا خط پڑا تھا ۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کے جانے کے بعد بچوں نے رو رو کر بُرا حال کر دیا تھا ۔ شمی نے سکول جانا بند کر دیا تھا ۔ کنکوا ہر روز دودھ دے جاتا تھا ۔ ننھا کا ڈالڈا آئیل کی بوتل ختم کر چکا تھا ۔ اب اسے گلیکسو کا دودھ دینے کا ارادہ تھا ۔ لاہور میں گرمی معمول سے کچھ زیادہ تھی ۔ اور پھر آپ کے چرنوں کی داسی ...... " چرنوں کی داسی پڑھتے ہی اُس کی آنکھوں میں بیوی کا نقشہ پھر گیا ۔ وہ دبلی پتلی مغنی سی تھوڑ پیلی ساری میں، زرد سی آنکھوں میں بے رونقی، ننھے کو گود میں لئے کاڈ لور آئیل کا چمچہ پلا رہی ہے ۔ اور پھر وہ بڑھیا اور راجر کی لڑکی لاجو اُف! اس کے ہاتھوں میں کس قدر بجلی کی طاقت تھی ۔ وہ تڑپ اُٹھا ۔ اوہ یہ زندگی!

اُس نے کپڑے بدلے۔ چھڑی ہاتھ میں لی اور باورچی خانہ کی طرف گیا۔ کرمارا ابھی تو بھوجن رہا تھا۔ ابھی دیر تھی۔ اُس نے سوچا۔ چلو ذرا سیر ہو آئیں۔ وہ ڈاکخانے سے باہر آگیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ پڑ رہی تھی یہاں لاہور کے مقابلہ میں درجہ حرارت کم تھی۔ یہ سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر اُس نے سرسراتی چیلوں کی طرف دیکھا۔ دُور وہی صنوبر کے درخت ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑے تھے۔ نیچے بگنا کا شفاف پانی کلیلیں کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اُس نے سوچا گاؤں چلیں۔ آج وہ سیٹھ عبدالرحمن اس کے ہمراہ نہیں تھا اُس کی بے موقع ہی ہی اس کے کانوں کے پردے نہیں پھاڑ رہی تھی۔ اس کے قدم گاؤں کی طرف بڑھنے لگے اور اُس کے نتھنوں میں دھان کی سوندھی سوندھی خوشبو سما گئی۔ اُس نے گہرے گہرے سانس لینے شروع کر دیئے۔ "ڈیپ بریدنگ" اس نے دل ہی دل میں کہا "پھیپھڑوں کیلئے نہایت مفید ہوتی ہے۔" وہ اسی طرح چلتا گیا۔ دھان کے کھیتوں میں ہوا کھاتی ہوئی منڈیروں پر۔

گھاٹی کے اُس سرے پر دھنیں کا گاؤں کھڑا تھا۔ جہاں وہ ہر روز بہت سے ... یا بسل ... آ ڈرا و دیکھیں ... کرتا تھا مطلع صاف تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا دھان کے پودوں میں لہریں پیدا کرتی ہوئی گزرتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ اس نے دل میں سوچا۔ یہ وادی بھی کیا عطیہ ہے قدرت کی طرف سے تھکے انسان کو۔ لاہور سے تھکے انسان کے لئے اس سے بہتر جگہ کہاں۔ تب ہی اُس کے کانوں میں آواز آئی۔

سوہے چیرے والے پھول ککراں دے   ککراں لائی بہار میلے منڈراں دے

اس پر ایک غنودگی چھا گئی۔ گلے میں ایک شراب تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پرے دھان کے کھیت کی منڈیر پر بیٹھا ہوا کوئی گا رہا تھا۔ ع

سوہے چیرے والیا پھل ککراں دے

اُس کے قدم خود بخود اسی طرف بڑھ گئے۔ وہ کھیتوں کو چیرتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ جہاں اخروٹ کے درخت کے نیچے لاجو سرمست ہواؤں میں سرمست موسیقی کی ہوائیں چھوڑ رہی تھی۔ اسے اُس کی موجودگی کی کوئی خبر نہیں تھی اور وہ اپنے پھیپھڑوں کا تمام زور لگا کر گا رہی تھی۔ ع   "سوہے چیرے والیا پھل نوری دا"

اس کی سحر کن آواز دُور پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی واپس آتی اور تمام وادی میں گونج پیدا کرتی۔ پرے سبزے پر چند گائیں چر رہی تھیں۔ وہ بھی سر اٹھا کر کبھی کبھی گانے والی کی طرف دیکھنے لگتیں۔ گویا موسیقی کے سحر سے مسحور ہو گئی ہوں۔ جب وہ گا چکی تو یہ اور بھی نزدیک ہو گیا۔ اور بلوط کی آڑ میں کھڑے ہو کر اُس نے بڑی تسلی سے لاجو کی لہراتی ہوئی زلفوں پر ایک نظر دوڑائی۔ اس سے زیادہ وہ دیکھ نہ سکا۔ اس کے تصور میں لاہور کا کوچہ چڑیماراں پھرنے لگا۔ اور درد کی شدت سے اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن اُس چھٹی حس کی وجہ سے جو صرف عورتوں کو ہی مخصوص کی گئی ہے۔ لاجو نے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا اور مڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ اس کے کانوں تک سُرخی دوڑ گئی اور وہ گھبرا کر زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بابو جی! آپ یہاں کیسے؟"

"یونہی سیر کو چلا آیا۔" اس نے اپنے ماتھے پر سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا۔

"تو آؤ نا۔ بیٹھو ہمارے پاس۔ ہم تمھیں گانا سنائیں گے۔" وہ بیٹھ گیا۔ لڑکی کھڑی رہی۔ اپنی انگلیوں کو کانوں میں دبا کر اس نے بڑے زور سے ایک نغمے کی الاپ لگائی۔ وہ ایک گیت گانے لگی۔ ہرنوں کا، ہرنیوں کا اور ایک شکاری کا۔

پوسٹ ماسٹر ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ سورج اس کے پیچھے کی طرف چمک رہا تھا۔ اور اُس کا سارا مجسمہ تاریک بنا ہوا تھا۔ اس کے بال پریشان ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور اُس کی آنکھیں کسی نامعلوم خوشی سے ناچ رہی تھیں۔

پوسٹ ماسٹر نے ایک سرد آہ بھری۔ اور اس کی نظروں میں کوچہ چڑیماراں کا ایک ننھا سا تاریک گھر پھر گیا۔

دوسرے دن صبح ہی اُس نے دفتر جاکر خط لکھا۔ "جان سے پیاری! پُتر ملا۔ افسوس کی بات ہے کہ میں ابھی تم سب کو یہاں نہیں بلا سکتا۔ جگہ نہایت مہنگی ہے۔ اور اس تنخواہ میں یہاں گزارہ ہونا مشکل ہے۔ اس لئے چند دن اور انتظار کرو ـــ اُمید ہے اگلی ترقی پر تم سب کو یہاں بُلا لوں گا۔ کچھ روپے بھیج رہا ہوں ـــ اور چاہیئے تو لکھیئے۔ روانہ کردوں گا۔"

اُس شام وہ پھر گاؤں کی طرف اکیلا ہی سیر کو گیا۔ عبدالرحمن نے ہی ہی کرکے جگل کشور کے کان میں کہا۔ "بابو جی پھنس گئے جگل! ـــ ہی ہی ـــ" اُسی دھان کے کھیت کی منڈیر پر اُسے لاجو اپنی گائیں چراتی ہوئی ملی۔ آج اس نے دھانی رنگ کا دوپٹہ اور رفریب تن کی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ وہ گا رہی تھی ؎

"ڈھول جانی۔ ساڈی گلی آویں تیری مہربانی"

رات اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اور لاجو ایک کشتی میں سوار بیگنا کی لہروں پر سیر کر رہے ہیں۔ صنوبر کے درختوں پر چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ اور نیل دھاری کے پھول کسی کی نیلی آنکھوں کی طرح چمک رہے ہیں اور دُور کوئی گا رہا ہے ؎

"ڈھول جانی ساڈی گلی آویں تیری مہربانی"

اور وہ اسی طرح لہروں پر بہے جا رہے ہیں۔ دُور، کہیں دُور، حتیٰ کہ چاندنی پیلی ہوگئی۔ نیل دہاری کی بیلیں سُوکھ گئیں۔ صنوبر کے پتے صرصر کرتے ہوئے گرنے لگے۔ نغمے کی دُھن دھیمی پڑ گئی۔ اور پھر سکون، خاموشی، موت، ایک لاانتہا سکون. . . . ایک نہ ختم ہونے والا خواب۔

لیکن چند ہی روز بعد اُسے خط ملا ـــ "ہم سب آ رہے ہیں۔ پتا جی نے بڑے اصرار کے بعد ہمارے ساتھ آنا منظور کر لیا ہے۔ اور ہم صبح کی لاری سے دھنیل پہنچ جائیں گے ـــ"

چنانچہ اُس سے اگلی صبح جب وہ ایسے ہی ایک سہانے خواب سے چونکا اور صحن سے گزر کر اپنے کوارٹر کا دروازہ کھولا تو سامنے ہی اُسے شمی۔ کاکا۔ روی۔ ننھا۔ رادھو۔ مادھو اور ایک دُبلی پتلی عورت میلی ساڑی میں دکھی۔ ایک بڑھا دیہاتی ہاتھ میں دو تین بقچیاں لئے اُسے کہہ رہا تھا۔

"دروازہ کھولو لالہ! کب سے کھڑے ہیں۔ بچے سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں!"

راجیشور ملہوترہ

اصغر کی یاد میں

آج جمعہ کا دن ہے اور ۲۴ رمئی ہے،
چھ سال ہوئے آج کے دن ۲۴ رمئی تھی اور وہ بھی جمعہ ہی کا دن تھا،
اُس دن کو کیا کہوں اور کیا کہہ کر یاد کروں؟
بہرحال وہ ایک مقدس دن تھا غم انگیز، دل انگیز، خیال انگیز:
دن آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں،
لیکن دنوں میں کوئی دن ایسا بھی آجاتا ہے کہ وہ محض گزر نہیں جاتا،
گئے دن پھر لوٹ کر نہیں آتے، وہ وقت کی تاریکی میں کھو جاتے ہیں،
لیکن یہ گیا دن کبھی نظروں سے پوری طرح اوجھل نہیں ہوتا۔!
یہ رہ رہ کر یاد آتا اور چھپ چھپ کر اپنی جھلک دکھاتا ہے!
گزرتے ہوئے اور آنے والے کا دامن اس گزرے ہوئے سے بندھا ہے۔اک تار ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا!
یہ گیا دن گو اک موت کی خبر لایا، مگر اسی لئے یہ مر نہیں سکتا،
یہ کئی اور دنوں سے زیادہ زندہ و پائندہ ہے!
زندگی کی نظریں اس پر گڑی ہوئی ہیں اور اس کی نظریں زندگی پر جمی ہوئی،
زندگی ایسے ہی دنوں سے زندہ ہے، گو ان کے ہوتے وہ موت کی سی جانکنی سے دوچار ہو جائے۔
یہی چوٹیاں ہیں جن پر چڑھ کر زندگی موت کے بحرِ ناپیدا کنار کا نظارہ کرتی ہے،
اور
سمجھتی ہے کہ یہ بحر و بر ایک ہی دنیا کے متصل قطعے ہیں جن کا چولی دامن کا ساتھ ہے!

ب ل

المنظر۔ ۲۴ رمئی ۱۹۴۶ء
جمعہ۔ ۹ بجے صبح

جامعہ نگر مطبوعات

دامِ خیال، از ضیاء الاسلام پی۔سی۔ ایس

ضیاء الاسلام کے مضامین کا ایک مجموعہ "ادب پارے" کے عنوان سے حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ اس مجموعے کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مصنف دور رس نظر کا حامل ہے۔ زیر نظر مجموعہ اُن کے شعری تخلیقات پر مشتمل ہے۔ انداز بیان جہاں قدیم ہے وہاں یکسر قدیم اور جہاں جدید ہے وہاں نظم آزاد تک پہنچ گیا ہے ـــ اس مجموعے کا شاعر کہیں جگر سے کہیں ساغر سے اور کہیں ن۔م۔ راشد سے متاثر نظر آتا ہے۔ آخر میں چند نظمیں تاثرات اور ترجمے کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مجموعہ ہندوستان کے دونوں اسالیب بیان کا حامل ہے۔ البتہ انداز فکر کے اعتبار سے جدید تر سکول کا کوئی اثر اس میں نہیں ملتا۔ کاغذ بہترین، کتابت عمدہ۔ بعض اشعار اور نظمیں تصاویر سے مزین ہیں۔ ضخامت ۴۰ صفحات

قیمت دو روپے چار آنے۔ پتہ:۔ حلقۂ ادب ۱۲۳۔ اسٹینلے روڈ۔ الہ آباد

ہمالیہ کی گود میں از ساگر چند گورکھا،

ساگر چند صاحب اخباری دنیا میں گورکھا کی حیثیت سے مشہور ہیں ـــ ہمالیہ کی گود میں ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ شاید یہ کہانیاں نہیں حقیقت کا بیان ہے۔ پہاڑوں کے قریب پہنچ کر، ہمالیہ کی گود میں بیٹھ کر، ان کے تجربات اور محسوسات نے ان افسانوں کی شکل اختیار کرلی ہے۔ تجربات! یوں تو ہر افسانہ نویس کے افسانوں کے پس پشت اس کے اپنے تجربے اور محسوسات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ پس پشت نہیں، سامنے ہیں۔

ہمالیہ کی گود میں ان وادیوں اور پہاڑوں کی داستانیں ہیں جہاں کی ہر چیز بقول مصنف "خوبصورت ہے"۔ آسمان پر بادل نہ ہوں تو برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں دست جلی لگتی ہیں۔ گھر گھر بادل آرہے ہوں، تو دل سودائی ہوجاتا ہے، ہوا بند ہو تو سارا جنگل کسی کمسن لڑکی کی طرح معصوم بن جاتا ہے ـــ یہاں کی بڑی بڑی بکریاں خوبصورت ہیں، بڑی بڑی بکریوں کو چرانے والے چھوٹے چھوٹے بچے خوبصورت ہیں، چشمہ خوبصورت ہے، میدان خوبصورت ہے اور ان چیزوں میں رہتے رہتے مانو میرا دل بھی خوبصورت بن گیا ہے

"پاپا" سچ مچ ان کا دل بڑی خوبی سے ان لوگوں کی سادگی، سادہ دلی، اور ساتھ ہی اُن کی غربت اور روزمرہ کی مشکلوں کا جائزہ بھی لیتا ہے۔ پاکی ہیں وہ کہتے ہیں کہ "یہاں آپ کو مردوں کے چہروں پر نور نظر نہیں آئے گا۔ ہاں جب وہ بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ چوٹی پر چڑھیں گے، تو آپ پسینہ ٹپکتا ضرور دیکھیں گے۔ وہاں کی عورتیں چیونٹیوں کی طرح کھیتوں میں کام کرتی ہیں"۔ اس میں ان لوگوں کے معصوم دل دھڑکتے نظر آئیں گے جو بناوٹ نام سے بھی واقف نہیں، جو ایک معصوم دل رکھتے ہیں اور ایک نادان دماغ، جو افسانوں کی سرزمین ہیں وہ کبھی افسانوں کا مطلب نہیں سمجھتے ـــ!

ان کہانیوں میں افسانہ پن بہت کم ہے۔ تفصیلات سے گریز ہے، ہر بات مختصراً کہی گئی ہے۔ "نعلوم کیمرہ ـــ! سپنوں کی دنیا میں" وہ کہتے ہیں کہ اگلے جنم میں وہ ہمالیہ کی چوٹیوں اور پہاڑوں کی غاروں کی برف بننا چاہتے ہیں جو دیہاتی حسن کی طرح خوبصورت بھی ہوتی ہے اور معصوم بھی جس کا چہرہ بھی صاف ہوتا ہے اور دل بھی۔ گورکھا صاحب کے چہرے کے متعلق تو میدی صاحب نے شروع ہی میں کہہ دیا ہے کہ صاف ہے، دل کے متعلق وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ۔ پتہ:۔ راج محل پبلشرز، جموں کشمیر،

[illegible]

ہمایوں ... جامعہ نگر دہلی
رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۳۶۲

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔ مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ۔

۳ - دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۴ - جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے بصُورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ۔

۵ - "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتاً مِل سکتا ہے ۔

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصُورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصُول ڈاک) [illegible] پرچہ آٹھ آنے ۔

مینیجر "ہمایوں"

۳۶۔ لارنس روڈ - لاہور

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: یوسف ظفر بی۔ اے

قیمت سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
۶ روپے	۳؎	۸؍

جہاں نما

مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندستانی

قارئین ہمایوں کو یاد ہوگا کہ دسمبر ۱۹۴۵ء کے جہاں نما میں ہم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری کا وہ خط شایع کیا تھا جو انھوں نے اس استفسار کے جواب میں ہمیں مولانا کی طرف سے لکھا تھا کہ ملک کی قومی زبان کیا ہے۔ اس خط کا ایک ناقابل فراموش اقتباس ملاحظہ فرمایئے ــــــ "اُردو زبان ملک کی حقیقی زبان ہے۔ کوئی بناوٹی زبان اب اس کی جگہ نہیں لے سکتی ــــــ" مزید براں آپ نے فرمایا تھا: "حضرت مولانا کی اس بارے میں جو رائے ہے وہ تمام ملک کے سامنے آچکی ہے اور ان کو اس رائے کی درستگی اور قوت پر پورا اعتماد ہے۔ آپ اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ سالہا سال سے کانگرس کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ کانگرس کے سالانہ اجلاس میں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں تمام کارروائی **اُردو زبان** میں ہوتی ہے۔ صرف مدراس اور بنگال کے ممبر انگریزی میں تقریریں کرتے ہیں۔"

اس خط کے بعد ہم مطمئن ہو گئے تھے کہ کم از کم صدر کانگرس اُردو کے حق میں ہیں اور ان کا وجود اُردو کے تحفظ کے لئے ایک زبردست ستون ثابت ہوگا۔ اس سیاسی جماعت کے سربرآوردہ رکن پنڈت جواہر لال نہرو علی الاعلان کہتے ہیں کہ "میرے گھرانے میں جو زبان بولی جاتی ہے اُسے اُردو کہتے ہیں۔ ہندستانی نہیں۔" اس لئے مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت کا جس نے اُردو کی بے پناہ خدمت کی ہے، جس کی اُنگلیاں اُردو کے لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے رجحانات کی نبض پر ہیں۔ اور جو خود اُردو میں ایک نئے طرز کی بانی ہے گاندھی جی کے ایک اشارے پر اپنے کردار و گفتار کی تمام عظمتوں کو بالائے طاق رکھ دینا ایک ایسی پستی ہے جس کا جواب شاید ہی کہیں ملے۔

ہریجن سیوک بابت ۲۶ مئی ۱۹۴۶ء کا افتتاحی مضمون مولانا کے قلم سے ہے جسے ہم من و عن درج ذیل کرتے ہیں اس کے نیچے گاندھی جی کا ایک نوٹ ہے جس میں فخر کی ایک ایسی جھلک پائی جاتی ہے جو ایک کارنمایاں کر گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے بعد ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ فخر بلا وجہ نہیں۔ مضمون ملاحظہ فرمایئے۔

ہندستان اور اس کی ملکی زبان

گاندھی جی نے ہندستان کو بہت سی چیزیں دی ہیں۔ مگر شاید بہت کم لوگوں کا دھیان اس طرف گیا ہوگا کہ ایک بڑی چیز جو ہندستان کو ان کے ہاتھ سے ملی وہ اس کی ملکی زبان ہے۔ بہت سی بولیاں رکھنے پر بھی ہندستان اپنی ملکی بولی نہیں رکھتا تھا۔ گاندھی جی نے اس کی یہ کمی پوری کر دی۔

انگریزی زبان حکومت کے دروازے سے آئی لیکن آتے ہی سارے ملک پر چھا گئی، اور اس طرح چھا گئی کہ ہماری تعلیمی، علمی اور سماجی زبان کی جگہ اسی کو مل گئی۔ اب پڑھے لکھے ہندستانی ملکی زبان میں بات چیت

کرنا شرم کی بات سمجھنے لگے تھے۔ بڑائی اور عزت کی بات یہی سمجھی جاتی تھی کہ ہر موقع پر انگریزی ہی زبان سے نکلے، لوگ اپنی بیچ کی بات چیت میں بھی انگریزی کو بھلانا پسند نہیں کرتے تھے۔

پچھلی صدی کے آخری حصہ میں ملک کی نئی سیاسی جاگرتی شروع ہوئی اور انڈین نیشنل کانگریس کی نیو پڑی اب کانگریس کے جلسے اس لئے ہونے لگے تھے کہ ملک کی قومی مانگوں اور قومی فیصلوں کی آواز دنیا کو سنائی جائے لیکن یہ آواز بھی اپنی زبان میں نہیں اٹھتی تھی، انگریزی میں اٹھتی تھی۔ ہندستان اب انگلینڈ کو یہ بات سنانی چاہتا تھا کہ اس کا ملک خود اس کے لئے ہے۔ دوسروں کے لئے نہیں ہے۔ لیکن یہ بات کہنے کے لئے بھی اسے اپنی ہندستانی زبان نہیں ملی تھی۔ وہ دوسروں ہی کی زبان اُدھار لیکر اپنا کام چلانا چاہتا تھا۔

لیکن جونہی گاندھی جی نے ملک کے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ اچانک ایک نیا انقلاب ابھرنا شروع ہو گیا اب ملک کی آواز خود اس کی زبان میں اٹھنے لگی۔ اور ملکی زبان میں بات چیت کرنا شرم کی بات نہیں رہی انھوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ شرم کی بات یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان بولیں۔ شرم کی بات یہ ہے کہ اپنی زبان بھول جائیں۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں سارے ملک کا دورہ کیا اور سیکڑوں تقریریں کیں۔ لیکن ہر جگہ اُن کی تقریروں کی زبان ہندستانی ہی رہی۔

مجھے یاد ہے، پہلی بڑی لڑائی کے زمانہ میں جب میں رانچی میں قید تھا تو میں نے اخباروں میں اس کانفرنس کی کارروائی پڑھی تھی جو ۱۹۱۷ء میں لارڈ چیمس فورڈ نے دہلی میں بلائی تھی۔ گاندھی جی اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے مگر انھوں نے یہ بات بطور شرط کے ٹھہرائی تھی کہ وہ تقریر ہندستانی میں کریں گے۔ اس وقت اخباروں نے اس واقعہ کو ایک نئی اور عجیب طرح کی بات خیال کیا تھا۔ لیکن یہ نئی بات بہت جلد ملک کی سب سے زیادہ عام بات بننے والی تھی۔ چنانچہ آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ جو جگہ پچیس برس پہلے انگریزی زبان کی سمجھی جاتی تھی وہ ہندستانی زبان نے لے لی ہے۔"

ابوالکلام آزاد

[اوپر کا لکھان میری تعریف کے لئے نہیں ہے۔ جو آدمی اپنا دھرم سمجھ کر کچھ سیوا کرتا ہے اس میں تعریف کیا؟ مولانا صاحب ودوان ہیں۔ فارسی اور عربی کا گیان رکھتے ہیں اس لئے اُردو خوب جانتے ہیں۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ نہ تو عربی فارسی مئی اُردو ہندستان کی عام زبان ہو سکتی ہے اور نہ سنسکرت مئی ہندی ہی۔ اس لئے وہ اُردو اور ہندی کا میل چاہتے ہیں اور دونوں کو ملا کر برتتے ہیں۔ میں نے ان سے پرارتھنا کی ہے کہ ہر ہفتہ ہندستانی کا ایک چھوٹا سا لیکھ دیتے رہیں۔ جس سے ہندستانی کا ایک نمونہ ہریجن سیوک پڑھنے والوں کو ملتا رہے۔ اس پر تین کا پہلا نمونہ اوپر کا لکھان ہے۔ نئی دلی ۲۱-۵-۱۹۴۶ء م۔ک۔ گاندھی]

مولانا صاحب کے اس مضمون میں ہمیں ستھری اور سلیس و شستہ اُردو کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ملتا ہے جسے آپ ہندستانی کا نام دیتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آسکا کہ آج ملک کی زبان ہندستانی کیسے قرار دی گئی۔ جب آج سے چھ ماہ پیشتر اُردو ہی ملک کی حقیقی زبان تھی۔ مولانا کے اسلوب نگارش سے آگاہ حضرات اس خالص اُردو کے نمونہ پر ضرور چونکیں گے۔ مولانا کے یہاں فارسی اور عربی کے حسین الفاظ اور تراکیب کی اتنی چاشنی ہوتی ہے کہ یہ مضمون ان کا لکھا ہوا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا سے ہمیں یہ پوچھنا ہے کہ آپ کی تازہ ترین تصنیف "غبار خاطر" کی زبان میں کیا خرابی ہے کہ آپ اپنے عقاید میں ترمیم کی ضرورت

محسوس کرنے لگے ہیں۔ اب اس پر گاندھی جی کا ارشاد بھی قابل داد ہے۔ "... اس کے علاوہ وہ اُردو اور ہندی کا ملاپ چاہتے ہیں اور دونوں کو ملا کر لیتے ہیں۔" اگر "جاگرتی" کا لفظ استعمال کرنے سے اُردو اور ہندی کا ملاپ ممکن ہے تو یہ بھی کچھ دور نہیں کہ "نمونہ" کا لفظ شامل کر کے گاندھی جی خالص ہندی میں ہمیں ہندوستانی کا جھوٹا سا لیکھ دیتے رہیں۔ ان "لیکھوں" کا استقبال ملک نے کس طرح کیا ہے یہ خود گاندھی جی ہی بتائیں گے۔ چنانچہ ۱۶ ر جون کے "ہریجن سیوک" میں ارشاد ہوتا ہے۔

اُردو ہریجن کی ہنسی

بھائی جیون جی نے مجھ کو ہندی اور اُردو اخباروں سے کڑی ٹیکا (نکتہ چینی) کے نمونے بھیجے ہیں۔ سب میں کافی مذاق اُڑایا گیا ہے۔ ہندی والے کہتے ہیں اُردو ہریجن میں چُن چُن کر اُردو شبد بھرے جاتے ہیں۔ اُردو والے کہتے ہیں سنسکرت شبد بھرے ہیں جو مسلمان نہیں سمجھتے۔ مجھے تو دونوں ٹیکا اچھی لگتی ہیں "ہریجن سیوک" کیوں؟ خدمتگار کیوں نہیں؟ سمپادک کیوں، ایڈیٹر یا مدیر کیوں نہیں؟ اُردو والے مانتے ہیں کہ ہندستانی اور اُردو ایک ہی ہیں۔ ہندی والے مانتے ہیں کہ اُردو لپی ہو تو بھی ہندستانی ہندی ہی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں ہار کر اُردو لپی چھوڑ دونگا۔ میں ہار جاؤں، ایسی آشا تو نراشا ہی ہونی چاہئے۔ ہندستانی نہ ہندی ہے نہ اُردو۔ وہ تو بیچ کی بولی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج اس کا چلن نہیں ہے۔ اگر اخبار والے اور دوسرے ٹیکا کرنے والے دھیرج رکھیں گے تو دونوں دیکھیں گے کہ ہندستانی آسانی سے دونوں سمجھ سکیں گے۔ میں قبول کرتا ہوں کہ آج ہریجن والے ہم سب تیار نہیں، تیار ہونے کی آشا رکھتے ہیں۔ آج ہریجن سیوک کی ہندستانی کھچڑی سی لگے گی۔ بھدی لگے گی۔ اس کے لئے معاف کریں۔ اگر ایشور نے مجھے زندہ رکھا تو اسی اخبار کو پڑھنے والے دیکھیں گے کہ ہندستانی بولی ویسی ہی میٹھی ہوگی جیسی ہندی یا اُردو ہے۔ دونوں کے بیچ میں مقابلہ سا لگتا ہے۔ کل دونوں بہنیں بن جائیں گی اور دونوں کا سہارا لے کر ہندستانی ایسی بولی بنے گی جو کروڑوں کی ضرورت پوری کرے گی۔ اور کم سے کم بھاشا کا جھگڑا مٹ جائے گا۔ اس درمیان میں ٹیکا کار غلطیاں بتلاتے رہیں۔ اسے محبت سے سمجھنے سے "ہریجن سیوک" کی بھاشا میں درستی ہوتی رہے گی۔ موہن داس کرم چند گاندھی"

گاندھی جی کے الفاظ میں جو انھوں نے ایک اور مقام پر تحریر فرمائے ہیں ہمیں یہی کہنا ہے۔ "لیکھک سے میری پرارتھنا ہے کہ اپنی تنگ نظری (سنکچت درشٹی) کو چھوڑ دیں۔" اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہماری یہ درخواست ہے کہ ع

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

خدا کے لئے اس کے حال پر رحم کیجئے اور دونوں کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش نہ کیجئے۔ آج تک آپ نے اپنے عمل سے جس زبان کی زندگی کا ثبوت دیا ہے اسے اپنے سیاسی اعتقادات پر قربان نہ کیجئے ورنہ آپ کی تصانیف ایک ایسی بدعت کی حامل ہوں گی جس پر آپ کی یہ "شترگربگی" بدنما داغ بن کر چمکتی رہے گی۔ زبان کا مسئلہ گاندھی جی کی تنگ نظری کے باعث تمام ملک میں آگ لگا چکا ہے۔ آپ کا کام اس آگ کو ہوا دینا نہیں بلکہ سکون بخشنا ہے۔

ہماری "پرارتھنا" ہے کہ "پرماتما" آپ کو اس کی شکتی دے۔

یوسف ظفر

عروض میں ترمیم کی ضرورت

اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ آج کل اکثر شعرا عروض سے کما حقہٗ واقف نہیں اس سے پہلے کہ اس کی وجوہ پر غور کیا جائے یہ سوال پیدا ہوتے ہیں کہ عروض سے ناواقف ہونے کے کیا معنی ہیں ؟ اور کسی شاعر کے لئے اس کا جاننا کہاں تک ضروری ہے۔

عرفِ عام میں عروض صرف فاعلاتن مفاعیلن وغیرہ کا نام ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ اصطلاح میں عروض اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے وزنِ شعر کی صحت و سقم دریافت ہوسکے۔ کسی شعر یا کلامِ منظوم کو وزن کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وزن سے کیا مراد ہے ؟ کیونکہ عروض کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ وزن کے تصور میں معمولی سی تبدیلی بھی عروض کے سارے ڈھانچے کو بدلنے کے لئے کافی ہوگی۔ اس کے بعد جہاں ارکان افاعیل کے ساتھ ساتھ مروجہ بحور اور اُن کی محذوف شکلوں کا علم ہونا لازمی ہے وہاں حروف ملفوظی و غیر مکتوبی اور حروف مکتوبی و غیر ملفوظی کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے اس آخری بات کی وضاحت کے لئے یہ شعر دیکھئے ؎

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس کی تقطیع یہ ہے۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

مے بلا تا تُ ہُ اُس کو گرِ اے جذ بَ ءِ دل

اس پہ بن جا ئے کچھیسی کہ بنا ئے ن بنے

ظاہر ہے کہ اس شعر کی تقطیع کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا جاننا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ارکان افاعیل یاد مروجہ بحور کا۔

(۱) شعر میں اکثر جگہ کسی لفظ کے شروع کے الف کو حذف کرکے اُس کی حرکت اس سے پہلے لفظ کے آخری حرف ساکن کو دے دیتے ہیں چنانچہ "مگر اے" "کچھ ایسی" اور "بن آئے" تقطیع میں بالترتیب "گرِ اے" "کچھیسی" اور "بنائے" رہ گئے ہیں۔

(۲) "نہ" اور "کہ" کو ہمیشہ بالترتیب حرف نونِ مفتوح اور کاف مکسور سمجھا جاتا ہے۔

(۳) بعض اوقات کچھ الفاظ کے آخری حرفِ علت کو تقطیع سے گرا دیا جاتا ہے۔ وغیرہ

اب رہا یہ سوال کہ کسی شاعر کے لئے عروض سے واقف ہونا کہاں تک ضروری ہے۔ مختصراً اس کا جواب یہ ہے کہ مرتبِ عروض خلیل بن احمد بصری سے پہلے بھی عربوں میں شاعری کا عام چرچا تھا۔ لیکن اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے کہ شاعر کی رہنمائی کیلئے اس کا ذوقِ سلیم ہی کافی ہے۔ ایسے شعرا جو صرف ذوقِ سلیم کے سہارے چل سکتے ہیں بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر تمام شعرا کو ان کے ذوقِ سلیم کی رہنمائی پر چھوڑ دیا جائے تو عروضی افراتفری مچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی شاعری میں زحافات اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ہم اُردو والوں کو عربی اشعار میں بسا اوقات غیر مترنم اور بے آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ خلیل سے پہلے کے عرب شعرا کا معیارِ وزن اکثر و بیشتر ذوقِ سلیم ہوتا تھا۔ جس کے باعث ان کے کلام میں کئی جگہ اوزانی بیقاعدگیاں پائی جاتی تھیں۔ عروض منضبط ہوا تو ان میں سے قابلِ برداشت اور عام اوزانی لغزشوں کو زحافات کا نام دیا گیا۔ اس زمانے سے لے کر آج تک کے سیکڑوں شعرا کے کلام نے عروضی اعتبار سے ہمارے

ذوقِ سلیم کی تربیت کی ۔ چنانچہ آج ایک عام شاعر کے لئے عروض سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی فاش غلطی کرنے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے ۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ذیل کی چند مثالیں اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ آج کل اکثر شعرا عروض سے پوری طرح واقف نہیں ۔ سلام مچھلی شہری کی ایک نظم "معاف کیجئے" کے چند مصرعے ہیں ؎

آپ مہ جبین ہیں خوب جانتا ہوں میں　　جی بہت حسین ہیں یہ بھی مانتا ہوں میں
لیکن اپنے حسن پر اس قدر غرور کیوں　　اُڑ رہی ہیں آسماں پر آج کل حضور کیوں

آخری مصرع میں تیسرا رکن "فاعلن" کی بجائے "مفاعلن" ہو گیا ہے ۔ ذیل کے شعر میں ڈاکٹر تاثیر کو ان کا ذوقِ سلیم دھوکا دے گیا ہے ؎

اُڑے آتے ہیں انگاروں کی طرح خاک کے تودے
ابھی تھے اور نہیں ہیں ایک دم میں جھاڑیاں پودے　　(دہقان کا مستقبل)

یہی حال مختار صدیقی کے اس مصرع کا ہے ۔ ع　نازک ارمان کی طرح نٹ کھٹ　　(کھلانو)

مختار صدیقی کی اسی نظم کا ایک اور مصرع ہے ع　تیکھی ہو نوک پلک تا کونا

یہاں "نہ" "سبب خفیف" بن گیا ہے ۔ اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں آج کل جا بجا ملتی ہیں ۔ جو اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ شعرا کی اکثریت عروض کا سہارا لئے بغیر نہیں چل سکتی ۔

کسی علم کے سیکھنے کے عموماً دو ذریعے ہوا کرتے ہیں ۔ اس علم کے جاننے والے یا اس سے متعلقہ کتابیں ۔ شاعری کے دورِ جدید سے پہلے عروض سیکھنے کا زیادہ تر پہلا طریقہ رائج تھا ۔ استادی اور شاگردی کا دور دورہ تھا ۔ کلام کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اُستاد شاگردوں کو فنی رموز بھی بتاتا جاتا تھا ۔ کبھی کبھی کسی کتاب کے مطالعے کا بھی مشورہ دے دیتا تھا ۔ دقیق نکات پھر استاد کی مدد سے حل ہوتے تھے ۔ بہت سی باتیں سینہ بسینہ چلی آتی تھیں ۔ لیکن زمانے نے کروٹ بدلی ۔ تمدنی اقدار کے ساتھ ساتھ ادبی اقدار بھی تغیر پذیر ہوئیں ۔ شعرا میں استادی شاگردی کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر ہو گیا ۔ علم عروض کے اکتساب کے لئے لے دیکے چند کتابیں رہ گئیں جن میں سے زیادہ عربی اور فارسی میں ہیں اور یہ زبانیں انگریزی کے لئے جگہ خالی کر چکی ہیں ۔ اُردو میں ان کتابوں کے جو تراجم ہوئے ہیں ان میں لکھی پر مکھی ماری گئی ہے ۔ اس لئے صحیح مفہوم سمجھنے میں دشواری اور معلم کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تراجم کے علاوہ عروض پر اُردو میں جو دوسری کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے مصنف یا تو خود عروض کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے اور کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا جمع کر کے بھان متی کی طرح کنبہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یا پھر پرانی طرزِ تحریر کے رسیا ہیں ، جس میں عربی اور فارسی کے دقیق الفاظ سے قطع نظر فقروں کی ساخت اور الفاظ کی ترتیب کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ سیدھے سادے مطالب اُلجھ کر رہ جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ جہاں بحور و مضافات کے نام اور دیگر عروضی اصطلاحات عربی سے مستعار ہیں ، وہاں عروض جیسے سادہ علم کو ایک گورکھ دھندا بنا کر پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے برعکس دورِ حاضر کے نوجوان شعرا اکثر مغربی رنگ کی سہل الفہم اور سائنٹفک طرزِ تحریر کے عادی ہیں ۔ آج اگر عروض کی کتابیں دکانوں اور لائبریریوں کو زینت دینے کے علاوہ اور کسی کام نہیں آتیں تو اس کی ذمہ داری ان کی دقیانوسیت ہے ۔ چنانچہ اُردو عروض میں جہاں آج بنیادی تراجم کی ضرورت ہے ۔ جن کا ذکر آگے آئے گا ، وہاں اسے عربی عروض کی اصطلاحات اور غیر ضروری زحافات کے گورکھ دھندے سے نکال کر ایک سادہ علم بنانے کی بھی ضرورت ہے ۔

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ زبان پہلے وجود میں آتی ہے اور اس کے قواعد بعد میں مرتب کئے جاتے ہیں اور ایک زندہ زبان میں اس کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ نئے نئے روزمرہ کے الفاظ اور غلط العام تراکیب داخل ہوتی رہتی ہیں ، جن سے اکثر

قواعد میں لچک پیدا ہوتی رہتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال شاعری اور عروض کا ہے۔ خلیل بن احمد نے جب عروض کو منضبط کیا تو اُس کے پیشِ نظر اس وقت کی عربی شاعری تھی جو صرف قصیدے تک محدود تھی۔ مرثیہ، ہجو، مدح وغیرہ سب کچھ اسی ایک صنفِ سخن میں ہوتا تھا۔ چنانچہ خلیلی عروض جو آج تک نظری عروض کا درجہ رکھتا ہے صرف انہی اصنافِ سخن کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے جو ہیئت کے اعتبار سے قصیدے کے تحت میں آ سکتی ہیں۔ اسی ہیئت کو مدِنظر رکھتے ہوئے خلیل نے پورے بیت کو بحر کی اکائی قرار دیا۔ کیونکہ عربی میں منظوم کلام کی مختصر ترین صورت ایک مصرع نہیں بلکہ ایک بیت ہے۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ شعر کے پہلے مصرع کا اختتام کسی پورے لفظ پر ہو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ کا کچھ حصہ پہلے مصرع میں شامل ہے تو باقی دوسرے میں۔ جیسے ذیل کی مثال میں پہلے اور چوتھے اشعار میں ؂

یَا بَدْرُ وَالْاَمْثَالُ یَضْـ | ـرِبُہَا لِذِی اللُّبِّ الْحَکِیْمُ
دُمْ لِلْخَلِیْلِ بِوُدِّہٖ | مَا خَیْرُ وُدٍّ لَا یَدُوْمُ
وَاعْرِفْ لِجَارِکَ حَقَّہٗ | وَالْحَقُّ یَعْرِفُہُ الْکَرِیْمُ
وَاعْلَمْ بِاَنَّ الضَّیْفَ یَوْ | مًا سَوْفَ یَحْمَدُ اَوْ یَلُوْمُ (یزید بن الحکم)

انہی باتوں کے پیشِ نظر بحور کے نام میں پورے بیت کے ارکان کی تعداد کا لحاظ رکھا گیا۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شعر بحرِ ہزج مثمن سالم میں ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ "مفاعیلن" جو بحرِ ہزج کا سالم رکن ہے اس شعر میں مجموعی طور پر آٹھ بار (مثمن) آیا ہے۔ چار بار پہلے مصرعے میں اور چار بار دوسرے مصرع میں چنانچہ عربی شاعری کی طرح خلیلی عروض میں بھی تنہا مصرعے کا تصور نہیں ملتا۔ اور تنہا مصرع جہاں بھی واقع ہوگا خارج از بحر ہوگا۔ کیونکہ بحر کا اطلاق دو مصرعوں کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ بحر کے تصور سے وابستہ صدر، ابتدا وغیرہ اصطلاحات ہیں۔ صدر بیت کے پہلے مصرع کے پہلے رکن کو کہتے ہیں۔ آخری رکن کا نام عروض ہے۔ دوسرے مصرعے کا پہلا اور آخری رکن بالترتیب ابتدا اور ضرب کہلاتے ہیں اور ہر مصرعے کے پہلے اور آخری ارکان کے درمیان آنے والے ارکان کو حشو کا نام دیا جاتا ہے۔ تنہا مصرع جہاں بحر کے لحاظ سے ناقص ہے۔ وہاں ان اصطلاحات کے دائرے سے بھی خارج ہے۔

عربوں کے ساتھ یہ عروض جب ایران میں آیا تو وہاں کی شاعری ابھی عالمِ طفولیت میں تھی۔ جس کا عروض ابھی تک انضباط میں نہیں آیا تھا۔ تاہم اس بات کا سراغ ضرور ملتا ہے کہ ابتداً ایرانی شاعری قافیہ اور ردیف سے معرا اور زیادہ تر گیتوں پر مشتمل تھی۔ جن کے ترنم کا انحصار الفاظ کی ترتیب پر ہوتا تھا (مآثرِ عجم مصنفہ حنیفی ص) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی شاعری میں وزن کا تصور پہلے ہی سے موجود تھا، لیکن اس کی صورت کیا تھی؛ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ قیاس غالب یہی ہے کہ اس لحاظ سے قدیم ایرانی شاعری دوسری آریائی زبانوں کی قدیم شاعری سے ملتی جلتی ہوگی۔ انگریزی (prosody) اور سنسکرت پنگل میں اس قدر مماثلت پائی جاتی ہے کہ یہ قیاس یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ انگریزی کا جزوی (syllabic) طریقہ ہوبہو سنسکرت کا ورنک طریقہ ہے۔ مؤکد (accented) اور غیر مؤکد (unaccented) جزو لگھو اور گرو کہلاتے ہیں caesura کے مقابلے میں بشرام ہے۔ قدیم انگریزی شاعری کی طرح قدیم سنسکرت شاعری بھی قافیے سے معرا تھی۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے قدیم ایرانی شاعری کا بھی یہی حال تھا۔ اگر فارسی شاعری عربی اثر کے بغیر پروان چڑھی ہوتی تو اس کا عروض بھی آج دوسری آریائی زبانوں سے مشابہ ہوتا۔ لیکن ہونے والی بات کب ٹلتی ہے۔ عربی عروض آیا اور فارسی شاعری کے رگ و پے میں نفوذ کر گیا۔ لیکن اس کے باوجود عارضی علامتیں کسی نہ کسی صورت میں بروئے کار آ کر رہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عربی

شاعری کے برعکس فارسی میں دوسری آریائی زبانوں کی طرح ایک لفظ ٹوٹ کر دو مصرعوں میں نہیں آسکتا۔ اور یہ خصوصیت ہر مصرعے کی جداگانہ حیثیت ہونے کی علامت ہے۔ اس کے بعد جب منوچہری (۴۳۲ھ) نے مسمط کی ابتدا کی تو خلیلی عروض کے خلاف عملی طور پر ایک مصرعے کو بحر کی اکائی تسلیم کر لیا گیا جو تمام آریائی زبانوں کے اصول کے مطابق ہے۔

اصطلاح میں مسمط اس نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر بند ہم وزن مصرعوں کی ایک مقررہ تعداد پر مشتمل ہے۔ اور پہلے بند کے تمام مصرعے اور ہر بند کا آخری مصرع ہم قافیہ ہوں۔ پہلے بند کے بعد ہر بند میں آخری مصرعے کو چھوڑ کر باقی مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ مثلث مربع مسدس وغیرہ۔ اس کی ذیلی قسمیں ہیں۔ مثلث میں توافی کی ترتیب یوں ہوگی۔

پہلا بند { ا ا ا

دوسرا بند { ب ب ا

تیسرا بند { ج ج ا

وعلیٰ ہذا القیاس۔ یا یوں کہئے کہ غزل یا قصیدے کے ہر شعر کے شروع میں اس شعر کے پہلے مصرعے کے ہم قافیہ مصرعے مقررہ تعداد میں اضافہ کرنے سے مسمط حاصل ہوتی ہے۔ قیاس غالب یہی ہے کہ اس صنف کی ایجاد تضمین کی صورت میں ہوئی کیونکہ اس کے ضمن میں تضمین شدہ غزلیں بھی درج کی جاتی ہیں۔ ہیئتی جائزے کے بعد اب مثلث، مخمس یا کسی اور طاق مصرعوں والی مسمط کو عروضی لحاظ سے بھی دیکھئے۔ میر کی ایک مثلث کا ایک بند ہے ؎

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی ہیلی   امروز یقیں شد کہ نہ داری سرِ آلی

بیچارہ زلطفِ تو بہ دل داشت گماں ہا

یہاں خلیلی عروض کی رو سے آخری دو مصرعے مل کر تو بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف الآخر میں ایک شعر ہوتے ہیں۔ جو اہلی کی ایک غزل کا مقطع ہے لیکن پہلا مصرع کسی بحر میں نہیں۔ کیونکہ بحر کا لفظ دو مصرعوں کے بغیر استعمال نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنا کہ ع

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی ہیلی

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف الآخر میں ہے خود تناقض (Contradiction in terms) ہے کیونکہ یہ بحر آٹھ رکنی ہے اور یہ مصرع حسب ذیل کے چار ارکان پر مشتمل ہے ۔ مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن،

اس کے علاوہ اہلی کے شعر پر صدر و ابتدا وغیرہ اصطلاحات کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میر کا بڑھایا ہوا تنہا مصرع ان اصطلاحات کے دائرے سے بھی خارج ہے۔ یہی صورت طاق مصرعوں والی دیگر اصناف سخن میں پیش آئے گی۔

اس تمام بحث سے یہ مطلب نہیں کہ منوچہری جس نے عروضی لحاظ سے ناقص اصناف ایجاد کیں اس علم سے بے بہرہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جدت کی دھن میں اُس نے خلیلی عروض سے انحراف کرتے ہوئے عملاً ایک مصرع کو بحر کی اکائی مان لیا ہے۔ جس کی جھلک مشاعروں کے سلسلے میں طرح کے لئے صرف ایک مصرع مقرر کرنے میں بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ رباعی کا لفظ اور اس کا عروض بھی اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے باوجود نظری عروض اپنی پرانی ڈگر پہ چل رہا ہے۔ آج بھی اس علم پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں سب کی سب مثال کے طور پر متذکرہ بالا بحر کو مربع کی بجائے مثمن ہی بتائیں گی۔

۱؎ مثال کے طور پر انگریزی کی بحر Pentameter لیجئے۔ اگر کوئی نظم اس بحر میں ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اس نظم کا ہر مصرع پانچ Iambus پر مشتمل ہے۔ Iambus اس بحر کے بنیادی رکن کا نام ہے۔

چونکہ خلیلی عروض قصیدہ اور اس کی اصناف متعلقہ تک محدود تھا' اس لئے رباعی کی ایجاد اپنے ساتھ اپنا علیٰحدہ عروض لائی کیونکہ یہ صنف سخن وزن کے تصوّر کے لحاظ سے آریائی ہے۔ دوسری اصناف کے برعکس رباعی کے ہر مصرعے میں ساکن اور متحرک حروف کی ترتیب ایک سی نہیں ہوتی۔ اس لئے خلیلی عروض اس پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ اس ناممکن امر کو ممکن بنانے کی کوشش ہی کا نتیجہ ہے کہ بحور رباعی کے بارے میں عروضیوں کے بیانات اکثر متضاد اور الجھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ نو ترمیم عروض قصیدہ اور اس کی اصناف متعلقہ کے علاوہ مسمّط اور رباعی پر بھی حاوی ہونا چاہیئے۔

ایرانیوں کا نسلی غنائی شعور رباعی کے بعد اسی کی ایک ذیلی صنف میں ظہور پذیر ہوا۔ رباعی کے مصرعوں پر چھوٹے چھوٹے ہموزن "فقرے" بڑھانے سے جو شکل پیدا ہوئی اسے مستزاد کہا گیا جو رفتہ رفتہ مسمّط کی بعض اقسام اور غزل پر بھی چھا گئی۔ اور اس سلسلے میں نت نئے تجربے کئے گئے۔ ایک عام مستزاد غزل کی مثال یہ ہے ؎

کس نیست کہ گوید زمن آں ترک خطا را گر رفت خطائے

باز آئے کہ داریم توقع بتو ما را با وعدہ وفائے

امروز منم چوں خم ابروئے تو در شہر مانند ہلالے

تا دیدہ ام آں صورتے انگشت نما را انگشت نمائے (خواجو کرمانی ۶۸۹ھ تا ۷۵۳ھ)

مستزاد کی عروضی حیثیت کیا ہے؟ یہ بڑھائے ہوئے "فقرے" علیٰحدہ مصرعے شمار کئے جاتے ہیں یا انھیں اصلی مصرعے کا جزو سمجھا جاتا ہے؟ اس کے متعلق عروض کی کتابیں خاموش ہیں (بعض کتابوں میں تو اس صنف کا تذکرہ تک نہیں ملتا)۔ مستزاد کے مختلف نمونوں کو سامنے رکھتے ہوئے خلیلی عروض کی رُو سے اس قسم کا بیشتر کلام ناموزوں ثابت ہوتا ہے۔ اس عروض کے مطابق مصرعوں کا مساوی الوزن ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ خواجو کرمانی کی مستزاد میں "گر رفت خطائے" اور "با وعدہ وفائے" کو الگ مصرعے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے انھیں اصل مصرعے میں شامل سمجھنا پڑے گا۔ لیکن اس صورت میں ذیل[1] کی مستزاد رباعی ناموزوں قرار پائے گی۔

اے درد بہت کیا پیکھا ہم نے پر آئی نہ تاب

دیکھا تو عجب حال کا لیکھا ہم نے مانند حباب

بینائی نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کچھ

جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے در پردہ حجاب

کیونکہ یہاں اگر بڑھائے ہوئے "فقروں" کو اصلی مصرعوں کا جزو سمجھا جائے تو تیسرے کے علاوہ باقی سب مصرعے تو ہم وزن ہو جائیں گے۔ لیکن تیسرا مصرع اس وزن سے خارج ہوگا اور یہ بات مروجہ نظری عروض سے جائز نہیں۔ یہی حال ذیل کے مستزاد کا ہے۔

اس رشک مسیحا کی جدائی میں ہے یہ حال

عاشق کو نہ ہے صبر نہ طاقت ہے بدن میں بیمار ہے گویا

اس بُت کی محبت ہے مری خاک میں مخلوط

یہ رشتۂ جاں ہے جو عیاں میرے بدن میں زنّار ہے گویا

---

[1] خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم مصنفہ درگا پرشاد نادر ص ۲۵۹

آتشؔ کی ایک مختصر ترین مستزاد رنجیتی عروضی لحاظ سے اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے ؎

نسبت وہ جو آرام سے ہے ہاتھ کو سو کیا   کچھ سوچ کے بتلا

ہے اس میں کلائی

اس مستزاد کو اگر تین مصرعوں پر مشتمل سمجھا جائے تو یہ مصرعے مساوی الوزن نہیں ہوں گے اور اگر "کچھ سوچ کے بتلا" اور "ہے اس میں کلائی" کو اصل مصرعے میں شامل کیا جائے تو یہ ساری "نظم" ایک مصرعے کی رہ جاتی ہے لیکن عروضیوں کے نزدیک وہ کلام جو دو مصرعوں سے کم پر مشتمل ہو شاعری کے دائرے سے باہر ہے۔ خلیل کے نزدیک بیت کا انقسام دو مصرعوں پر ضروری ہے' خلیل کے نزدیک بیت کا اقسام دو مصرعوں پر ضروری ہے البتہ جب خلیلی بحروں سے کم یا زیادہ ارکان والی بحریں ایجاد ہوئیں تو اُن میں مثلث بحریں بھی تھیں۔ اس ضمن میں نجم الغنی، بحر الفصاحت میں لکھتے ہیں کہ دوسرے بحور کی طرح "مثلث دو مصرعوں پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام ایک بیت ہے۔" لیکن آتشؔ کی یہ رنجیتی کسی بحر مثلث (تین رکنوں والی بحر) میں بھی نہیں۔ اور کسی طرح بھی عروض سے مطابقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں دیگر اصناف کی ایجاد سے بحر کی اکائی ایک مصرع قرار پایا وہاں رباعی اور مستزاد کے ساتھ موزونیت کا تصور بھی تبدیل ہو گیا۔ لیکن نظری عروض جہاں تھا وہیں رہا۔

جب ہم علمی انحرافات کی تاریخ کا ایک اور ورق پلٹتے ہیں تو ہمیں ایک نہایت باغی قسم کی صنف سخن نظر آتی ہے۔ اس صنف کو (خواہ غلطی ہی سے سہی) بحر طویل کا نام دیا جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اور آتشؔ کے مجموعۂ کلیات میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہیئت کا اندازہ ذیل کی مثال سے ہو سکتا ہے ؎

پہلا مصرع:۔ "ایک دن باغ میں جا کر، چشم حیرت زدہ وا کر، جامۂ صبر قبا کر، طائر ہوش اُڑا کر، شوق کو راہنما کر، مرغ نظارہ اُڑا کر، دیکھی رنگت جو چمن کی، خوبی نسرین و سمن کی، شکل غنچوں کے دہن کی، تازگی لالہ کے تن کی، نازکی گل کے بدن کی، کشت سبزے کی ہری تھی، نہر بھی لہر بھری تھی، ہر خیابان میں تری تھی، ڈالی ہر گل کی پری تھی، خوش نسیم سحری تھی، سرو شمشاد و صنوبر سنبل و سوسن و عرعر، نخل میوے سے رہے بھر، نفس باد معنبر، در و دیوار معطر، کہیں قمری تھی مطوق، کہیں انگور معلق، نالے بلبل کے مدقق کہیں غوغائی کی بق بق۔ اس قدر شاد ہوا دل، مثل غنچے کے کیا کھل، خرمی ہو گئی حاصل، روح بالیدہ ہو آئی، شان قدرت کی دی دکھائی، جان سی جان میں آئی، باغ کیا تھا گویا اللہ نے اس باغ میں جنت سے اُتارا۔"

دوسرا مصرع:۔ "ناگہاں صحن چمن میں، مجمع سرو و سمن میں، جیسے ہو روح بدن میں، جیسے ہو شمع لگن میں، جیسے خورشید کرن میں، ماہ پروین دہن میں، دیکھا اک دلبر رعنا، طرحدار، جفاکار، دل آزار، نمودار، نگہ ہمسر شمشیر، مژہ ترکش پُر تیر، سر زلف گرہ گیر دل خلق کی زنجیر، زباں شہد، بیاں شیر، نظر روح کی اکسیر، دہن غنچہ خاموش، سمن برگ بر و دوش، سخن بحر گہر جوش، بدن سر تپا پوش، چھڑی گل کی ہم آغوش، دفا رحم فراموش، ہر اک آن ستم کوش، عجب حسن دل آرا، نہ کبھی پھر کے دیکھا نہ کبھی ماہ نے دیکھا، نہ کسی فہم میں آیا، نہ تصور میں سمایا، وہ نظر مجھ کو جو آیا، مجھے حسن اپنا دکھایا، دل نے اک جوش اٹھایا، جی نے سب ہوش اُڑایا، سر کو پاؤں پہ جھکایا، اشک آنکھوں سے بہایا، اُس نے جب یوں مجھے پایا، یہ سخن ہنس کے سنایا کہ "تو ہے عاشق شیدا، لیکن عاشق نہیں بیدا، ہو وے تجھ پر یہ ہویدا، کہ اگر ہم کو تو چاہے، یا محبت کو نباہے، نہ کبھی غم سے کراہے نہ کسی غیر کو چاہے، نہ کبھی گل کی طرف دیکھ، نہ سنبل کی طرف دیکھ، نہ بلبل کی طرف دیکھ، نہ بستاں پہ نظر کر، نہ گلستاں میں گزر کر، چھوڑ دے سب سے مودت، ہم سے رکھ دل کی محبت، اس میں ہم بھی تجھے چاہیں، تجھ سے اُلفت کو نباہیں، ہیں یہی چاہ کی راہیں

گر یہ مقدر ہو تجھے، اور یہ منظور تجھے ہو تو نظیر آج سے تو چاہنے والا ہے ہمارا"
(نظیر اکبر آبادی)

اس نظم کے پہلے مصرع میں اٹھاون رکن ہیں اور دوسرے میں ایک سو بیس۔ یہاں میرا جی کی نظم "جاتری" کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ یہ نظم تقریباً تین صفحات کے ایک مصرع پر مشتمل ہے ؎

"ایک آیا۔ گیا۔ دوسرا آئے گا، دیر سے دیکھتا ہوں، یونہی رات ساری گزر جائے گی، میں کھڑا ہوں یہاں کس لئے مجھ کو کیا کام ہے، یاد آتا نہیں، یاد بھی ٹمٹماتا ہوا ایک دیا بن گئی جس کی رکتی ہوئی اور جھجکتی ہوئی ہر کرن بے صدا قہقہہ ہے مگر میرے کانوں نے کیسے اسے سن لیا — ایک آندھی چلی چل کے بٹ بھی گئی .... الخ"

عروضی لحاظ سے ان دونوں نظموں میں کوئی فنی فرق نہیں (یہاں یہ یاد رہے کہ مدالقافیہ "علم عروض سے ایک علیحدہ علم ہے) نظیر اور انشا کے زمانے تک عملی طور پر کلام موزوں کا کیا تصور تھا؟ اس کا اندازہ لگاتے وقت مستزاد اور بحر طویل کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ان اصناف کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر صحیح طور پر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آزاد نظم میں موزونیت کا تصور نیا نہیں۔

تذکرہ نگاروں اور عروضیوں نے اوپر کی تمام اصناف سخن کا ذکر کرکے انھیں تسلیم تو ضرور کیا ہے لیکن نظری عروض کو عملی عروض سے ہم آہنگ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور آج جبکہ موزونیت کا تبدیل شدہ تصور زیادہ مروج پیکر آزاد نظم کی شکل میں ظاہر ہوا ہے تو عملی عروض والے بوکھلائے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ آزاد نظم اگرچہ ہمارے ہاں مغرب سے آئی۔ لیکن اس کے لئے وزن کا جامہ مختلف قسم کی مستزاد نظموں کی صورت میں تیار ہو رہا تھا۔ اس ضمن میں جو تجربے ہوئے ان کا کما حقہ جائزہ لینے کے لئے ایک طویل مضمون درکار ہے۔ یہاں حفیظ جالندھری کے گیت "حسن اور موت" کا صرف ایک بند نقل کرنا کافی ہوگا ؎

موت نے چاہا کہ تکمیل جہانبانی کرے
یعنی شاہِ حسن کو وقفِ پشیمانی کرے
دیکھ لے ———— حسن آکر دیکھ لے
زندگانی کا مآل
اس جوانی کا مآل

عیش کو
طیش کو

پائمال ———— لن ترانی کا مآل،
دیکھ لے ———— حسن آکر دیکھ لے
موت نے چاہا کہ تکمیل جہانبانی کرے

اس قسم کی نظمیں چونکہ اکثر ایک ہی ہیئت کے خدوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس لئے عروضیوں کی نظروں میں نہ کھٹکیں اور دنیائے ادب میں ایسا شور و غوغا مچا جیسا کہ آزاد نظم کے سلسلے میں آج تک پایا جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آزاد نظم میں یہ ہیئتی ترتیب جس کا ابھی ذکر ہوا ہے، ترک کردی گئی اور یہی بے لچک ترتیب ہنگامہ آراؤں کے نزدیک موزونیت کی جان ہے۔ حالانکہ رباعی کے سلسلے میں وہ اس کے قائل نہیں کیونکہ رباعی کے مصرعوں میں حروف ساکن و متحرک کی ترتیب کا ایک سا ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ موزونیت کے تصور کا جائزہ لے کر اس کی تعریف

انشا کی ایک مختصر ترین مستزاد ریختی عروضی لحاظ سے اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے ؎

نسبت وہ جو آرام سے ہے ہاتھ کو سو کیا   کچھ سوچ کے بتلا
ہے اس میں کلائی

اس مستزاد کو اگر تین مصرعوں پر مشتمل سمجھا جائے تو یہ مصرعے مساوی الوزن نہیں ہوں گے اور اگر "کچھ سوچ کے بتلا" اور "ہے اس میں کلائی" کو اصل مصرعے میں شامل کیا جائے تو یہ ساری "نظم" ایک مصرعے کی رہ جاتی ہے لیکن عروضیوں کے نزدیک وہ کلام جو دو مصرعوں سے کم پر مشتمل ہو شاعری کے دائرے سے باہر ہے۔ خلیل کے نزدیک بیت کا انقسام دو مصرعوں پر ضروری ہے، خلیل کے نزدیک بیت کا اقسام دو مصرعوں پر ضروری ہے البتہ جب خلیلی بحروں سے کم یا زیادہ ارکان والی بحریں ایجاد ہوئیں تو ان میں مثلث بحریں بھی تھیں۔ اس ضمن میں نجم الغنی، بحر الفصاحت میں لکھتے ہیں کہ دوسرے بحور کی طرح "مثلث دو مصرعوں پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام ایک بیت ہے۔" لیکن انشا کی یہ ریختی کسی بحر مثلث (تین رکنوں والی بحر) میں بھی نہیں۔ اور کسی طرح بھی عروض سے مطابقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں دیگر اصناف کی ایجاد سے بحر کی اکائی ایک مصرع قرار پایا وہاں رباعی اور مستزاد کے ساتھ موزونیت کا تصور بھی تبدیل ہو گیا۔ لیکن نظری عروض جہاں تھا وہیں رہا۔

جب ہم عملی انحرافات کی تاریخ کا ایک اور ورق پلٹتے ہیں تو ہمیں ایک نہایت باغی قسم کی صنف سخن نظر آتی ہے۔ اس صنف کو (خواہ غلطی ہی سے سہی) بحر طویل کا نام دیا جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اور انشا کے مجموعۂ کلیات میں اس کی مثالیں ملتی ہیں ہیئت کا اندازہ ذیل کی مثال سے ہو سکتا ہے ؎

پہلا مصرع:- "ایک دن باغ میں جا کر، چشم حیرت زدہ وا کر، جامۂ صبر قبا کر، طائر ہوش اُڑا کر، شوق کو راہنما کر، مرغ نظارہ اُڑا کر، دیکھی رنگت جو چمن کی، خوبی نسرین و سمن کی، شکل غنچوں کے دہن کی، تازگی لالہ کے تن کی، نازکی گل کے بدن کی، کشت سبزے کی ہری تھی، نہر بھی لہر بھری تھی، ہر خیابان میں تری تھی، ڈالی ہر گل کی پری تھی، خوش نسیم سحری تھی، سرو شمشاد و صنوبر سنبل و سوسن و عرعر، نخل میوے سے رہے بھر، نفس باد معنبر، در و دیوار معطر، کہیں قمری تھی مطوّق، کہیں انگور معلق، نالے بلبل کے مدقق کہیں غوغائی کی بق بق۔ اس قدر شاد ہوا دل، مثل غنچے کے کیا کھل، خرمی ہو گئی حاصل، روح بالیدہ ہو آئی، شان قدرت کی دی دکھائی، جان سی جان میں آئی، باغ کیا تھا گویا اللہ نے اس باغ میں جنت سے اُتارا۔"

دوسرا مصرع:- "ناگہاں صحن چمن میں، مجمع سرو و سمن میں، جیسے ہو روح بدن میں، جیسے ہو شمع لگن میں، جیسے خورشید کرن میں، ماہ پروین و پرن میں، دیکھا اک دلبر رعنا، طرحدار، جفاکار، دل آزار، نمودار، نگہ ہمسر شمشیر، مژہ ترکش پُر تیر، سر زلف گرہ گیر دل خلق کی زنجیر، زباں شہد، بیاں شیر، نظر روح کی اکسیر، دہن غنچہ خاموش، سمن برگ بر و دوش، سخن بحر گہر جوش، بدن سرو قبا پوش، چھڑی گل کی ہم آغوش، دفا رحم فراموش، ہر اک آن ستم کوش، عجب حسن دل آرا، نہ کبھی مہر نے دیکھا نہ کبھی ماہ نے دیکھا، نہ کسی فہم میں آیا، نہ تصوّر میں سمایا، وہ نظر مجھ کو جو آیا، مجھے حسن اپنا دکھایا، دل نے اک جوش اٹھایا، جی نے سب ہوش اُڑایا، سر کو پاؤں پہ جھکایا، اشک آنکھوں سے بہایا، اُس نے جب یوں مجھے پایا، یہ سخن ہنس کے سنایا کہ "تو ہے عاشق شیدا، لیکن عاشق نہیں پیدا، ہو وے تجھ پر یہ ہویدا، کہ اگر ہم کو تو چاہے، یا محبت کو نباہے، نہ کبھی غم سے کراہے نہ کسی غیر کو چاہے، نہ کبھی گل کی طرف دیکھ، نہ سنبل کی طرف دیکھ، نہ بلبل کی طرف دیکھ، نہ بستاں پہ نظر کر، نہ گلستاں میں گزر کر، چھوڑ دے سب سے مودّت، ہم سے رکھ دل کی محبت، اس میں ہم بھی تجھے چاہیں، تجھ سے اُلفت کو نباہیں، ہیں یہی چاہ کی راہیں،

گر یہ مقدر ہو تجھے، اور یہ منظور تجھے ہو تو نظیر آج سے تو چاہنے والا ہے ہمارا۔ (نظیر اکبر آبادی)

اس نظم کے پہلے مصرع میں اٹھاون رکن ہیں اور دوسرے میں ایک سو بیس۔ یہاں میرا جی کی نظم "جاتری" کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ یہ نظم تقریباً تین صفحات کے ایک مصرع پر مشتمل ہے ؎

"ایک آیا۔ گیا۔ دوسرا آئے گا، دیر سے دیکھتا ہوں، یونہی رات ساری گزر جائے گی، میں کھڑا ہوں یہاں کس لئے مجھ کو کیا کام ہے، یاد آتا نہیں، یاد بھی ٹمٹماتا ہوا، ایک دیا بن گئی جس کی رکتی ہوئی اور جھجکتی ہوئی ہر کرن بے صدا قہقہہ ہے مگر میرے کانوں نے کیسے اسے سن لیا — ایک آندھی چلی چل کے بجھ بھی گئی ...."

عروضی لحاظ سے ان دونوں نظموں میں کوئی فنی فرق نہیں (یہاں یہ یاد رہے کہ مع القافیہ علم عروض سے ایک علیحدہ علم ہے) نظیر اور انشا کے زمانے تک عملی طور پر کلام موزوں کا کیا تصور تھا؟ اس کا اندازہ لگاتے وقت مستزاد اور بحر طویل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان اصناف کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر صحیح طور پر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آزاد نظم میں موزونیت کا تصور نیا نہیں۔

تذکرہ نگاروں اور عروضیوں نے اوپر کی تمام اصناف سخن کا ذکر کر کے انھیں تسلیم تو ضرور کیا ہے لیکن نظری عروض کو عملی عروض سے ہم آہنگ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور آج جبکہ موزونیت کا تبدیل شدہ تصور زیادہ رواج پا کر آزاد نظم کی شکل میں ظاہر ہوا ہے تو قلیلی عروض والے بوکھلائے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ آزاد نظم اگرچہ ہمارے ہاں مغرب سے آئی۔ لیکن اس کے لئے وزن کا جامہ مختلف قسم کی مستزاد نظموں کی صورت میں تیار ہو رہا تھا۔ اس ضمن میں جو تجربے ہوئے ان کا مکمل جائزہ لینے کے لئے ایک طویل مضمون درکار ہے۔ یہاں حفیظ جالندھری کے گیت "حسن اور موت" کا صرف ایک بند نقل کرنا کافی ہوگا ؎

موت نے چاہا کہ تکمیل جہانبانی کرے

یعنی شاہ حسن کو وقف پشیمانی کرے

دیکھ لے ——— حسن آ کر دیکھ لے

زندگانی کا مآل

اس جوانی کا مآل

عیش کو

طیش کو

پائمال ——— لن ترانی کا مآل

دیکھ لے ——— حسن آ کر دیکھ لے

موت نے چاہا کہ تکمیل جہانبانی کرے

اس قسم کی نظمیں چونکہ اکثر ایک ہی ہیئت کے خدوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس لئے عروضیوں کی نظروں میں نہ کھٹکیں اور دنیائے ادب میں ایسا شور و غوغا مچا جیسا کہ آزاد نظم کے سلسلے میں آج تک پایا جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آزاد نظم میں یہ ہیئتی ترتیب جس کا ابھی ذکر ہوا ہے ترک کر دی گئی، اور یہی بے لچک ترتیب ہنگامہ آراؤں کے نزدیک موزونیت کی جان ہے۔ حالانکہ رباعی کے سلسلے میں وہ اس کے قائل نہیں کیونکہ رباعی کے مصرعوں میں حروف ساکن و متحرک کی ترتیب کا ایک سا ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ موزونیت کے تصور کا جائزہ لے کر اس کی تعریف

ہر رائج الوقت اصنافِ سخن کے مطابق بنانے کی بھی ضرورت ہے اور یہ ترمیم اتنی اہم اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ ہمیں تمام عروض کا نقشہ بدلنا ہوگا۔

نظری عروض سے جہاں متذکرہ بالا بنیادی انحرافات ہوئے وہاں بہت سے فروعی انحرافات بھی عمل میں آئے۔ مثال کے طور پر مثنوی ہی کو لیجئے اساتذہ نے اس کے لئے سات بحریں مخصوص کی تھیں لیکن بعد میں آنے والے شاعروں نے رفتہ رفتہ یہ قید بالکل اُڑا دی چنانچہ ہر بحر مثنوی کیلئے استعمال ہونے لگی۔ اس کا جائزہ، وحیدالدین سلیم مرحوم نے ایک مضمون میں لیا ہے جو ان کے مجموعہ مضامین "افاداتِ سلیم" میں شامل ہے۔ تعریفِ شعر سے قافیہ کا تصوّر اگرچہ "فرد" کے سلسلے میں پہلے ہی عملی طور پر خارج ہو چکا تھا۔ لیکن نظم معریٰ کے رواج پانے سے اکثر حلقوں میں تسلیم کر لیا گیا۔ اُردو میں جہاں عربی اور فارسی کی بہت سی بحور ترک کر دی گئیں وہاں کچھ نئی بحروں کا بھی اضافہ ہوا۔ ہندی شاعری کے زیر اثر بحر متدارک نت نئے ڈھب سے استعمال ہونے لگی۔ اس بات کو اگرچہ کافی عرصہ ہو چکا ہے لیکن عروض کی کسی کتاب میں ان بحور کا مکمل جائزہ نہیں ملتا۔ بحورِ منفصل اور متصل کا امتیاز اُڑا دیا گیا۔ عربی شاعری کی طرح مصرعے کے آخری حرف کے متحرک ہو سکنے کا اصول فارسی اور اردو کے مزاج کے خلاف تھا اس لئے شروع ہی سے عمل میں نہ آیا۔ بہت سے زحافات رفتہ رفتہ متروک ہو گئے۔ ان سب کے علاوہ اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ لیکن اس کے باوجود علم عروض پر کتابیں لکھنے والے ٹس سے مس نہیں ہوتے اور پُرانے عروض کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہوئے اس کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ جیسے پہلے دیکھا جا چکا ہے عروض شاعری کے مطابق ڈھلا کرتا ہے نہ کہ شاعری عروض کے مطابق۔ شاعری کی مثال نسوانی جسم کی سی ہے جس کا لباس عروض ہے۔ غدودوں کے تغیرات کے ساتھ ساتھ جسم کی نشو و نما وابستہ ہے اور جسم کی نشو و نما کے مطابق لباس کی کتر بیونت میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اگر ایک جوان جسم پر بچپن کا لباس پہنانے کی کوشش کی جائے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ مختلف انحرافات کے اس مختصر سے جائزے سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ خلیلی عروض بنیادی قسم کی ترامیم کے بغیر اُردو شاعری کا عروض نہیں کہلا سکتا۔ اور عروض نو ترمیم کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہو وہاں اسے بیکار کا گورکھ دھندا بھی نہیں ہونا چاہئے تاکہ اُسے آسانی سے سمجھا جا سکے اور اس کا مقصد فوت نہ ہو۔ عروض کی بنیاد موزونیت کے نئے تصور پر رکھتے ہوئے ہمیں خلیلی عروض کی ان باتوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا جو اُردو شاعری کے رگ و پے میں رچ چکی ہیں چنانچہ عظمت اللہ مرحوم کا مضمون "اُردو شاعری اور اس کا عروض" اس سلسلے میں چنداں کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا (یہ مضمون ان کی تصنیف "سُریلے بول" میں شامل ہے) کیونکہ اس کا تعلق ان عملی انحرافات سے قطعاً نہیں جن کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔ یہی بات آریہ دیش کے ان مضامین پر صادق آتی ہے جو کچھ عرصے "ہمایوں" میں شائع ہو رہے ہیں۔ عظمت اللہ مرحوم کا خیال تھا کہ عربی عروض کو یکقلم ترک کر دیا جائے اور اُردو شاعری کے لئے ہندی پنگل اختیار کر لیا جائے۔ لیکن جہاں حروف ساکن و متحرک کے تعلیم میں آنے کے سلسلے میں ہندی اور اُردو عروض میں کچھ بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں وہاں ہندی کی اکثر بحریں اُردو میں بحر متدارک کی مختلف صورتوں میں پہلے ہی سے رائج ہیں۔

آخر میں آتش کی ایک تجویز پر غور کرنا غالباً بیجا نہ ہوگا۔ اُس نے بحور کے بنیادی ارکان کو اُردوانے کی غرض سے مفاعیلن، فاعلن، مفعول وغیرہ کی جگہ بالترتیب پری خانم، چت لگن، بی جان وغیرہ استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ چنانچہ ؎

کاٹوں تری فرقت میں کیونکر شبِ تنہائی   مشکل تھا ترا آنا پھر موت نہ کیوں آئی

کی تقطیع یوں ہوگی ؎

بی جان، پری خانم، بی جان، پری خانم   بی جان، پری خانم، بی جان، پری خانم

لیکن اس میں ایک نقص ہے عربی کے الفاظ مفعول، مفاعیلن وغیرہ ہمارے لئے قریب قریب مہمل ہیں اور دورانِ خیال گوئی میں ان کا خیال میں آنا کسی قسم کا خلل واقع نہیں کرتا۔ لیکن بی جان، پری خانم وغیرہ میں یہ وصف نہیں پایا جاتا۔

انجم رومانی

وادیٔ رنگ

آج پس جائے گی یہ وادیٔ رنگ

اپنے دامن میں بہاروں کو لئے
شوخ اور شنگ شراروں کو لئے
آج پس جائے گی یہ وادیٔ رنگ

سر کوہسار یہ سرگوشیاں ہیں
لالہ و گل میں جو مدہوشیاں ہیں
کام دے جائے گا بس ایک ہی سنگ

سیم و زر کے یہ کلس یہ ایواں
دامنِ کوہ کہ فردوس نشاں
دیکھ کر جس کو فرشتے بھی ہوں دنگ

اس میں خوش رنگ حسیں آئیں گے
لالہ رُخ، ماہ جبیں آئیں گے
انگبیں ہونٹوں پہ آنکھوں میں نہنگ

نغمے برسائیں ستاروں سے کہو
اور گہری ہوں بہاروں سے کہو
جلترنگ بجنے دو بجنے دو چنگ

ایک دھڑکا ہے مگر جانِ بہار
قلبِ کہسار سے آتی ہے پکار
ہوئی بیدار رگِ مُردہ سنگ
آج پس جائے گی یہ وادیٔ رنگ!!

مسعود حسن

فائل

"رشید، مسٹر رشید، وہ میسرز بنالین کے آڈٹ کے متعلق فائل کہاں ہے؟ ان کا حساب ابھی مکمل نہیں ہوا"۔

ایک دھیمی سی آواز میری کرسی سے ٹکراتی ہوئی میرے کانوں تک پہنچی اور میری نظریں رشید کی طرف اٹھیں۔

رشید سگریٹ سلگائے کچھ سوچ رہا تھا۔ ہاں سگریٹ تو سلگ رہا تھا لیکن وہ اُسے پی نہیں رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی تیسری اور چوتھی انگلی کے درمیان تھاما ہوا وہ سگریٹ اُس کی توجہ کا محتاج یونہی اپنی زندگی کو دھوئیں میں تبدیل کر رہا تھا۔ کوئی بڑی سی فائیل اپنے صفحے بکھیرے اس کے سامنے پڑی تھی۔ کس بُری طرح صفحے بکھر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے لمبے چوڑے صفحے عجب بے ترتیبی سے اس میں ایک کنارے سے ٹنکے ہوئے تھے۔ مجھے خیال آیا رشید کیسے اس کو دیکھ سکتا ہوگا کس طرح وہ اس کو برداشت کر سکتا ہوگا۔ یہی آج سے چار سال پہلے جب وہ اور میں کالج میں اکٹھے تھے مجھے یاد ہے کبھی فائیل استعمال نہ کرتا تھا۔ ایک دن ہم نے پوچھا تو فرمایا۔

"بھئی یہ صفحے خراب ہو جاتے ہیں کوئی ادھر سے مڑا ہوا کوئی ادھر سے۔ پھر کبھی کوئی بڑا صفحہ اور کوئی چھوٹا۔ یہ سب بے ترتیبی، میرا تو خیال ہے میں کبھی اپنے نوٹس بھی نہ پڑھ سکوں۔ میں تو اخبار بھی نہیں دیکھ سکتا اگر وہ اچھی طرح تہ نہ ہُوا ہو۔ اسی لئے تو سٹیٹسمین پڑھتا ہوں"۔

اب وہی رشید یہ اُلجھے سے صفحوں والا فائیل لئے بیٹھا تھا۔

یہ میرے بہت پرانے اور گہرے دوستوں میں سے ہے۔ اب مجھے یہ بھی یاد نہیں وہ کیسے میرا واقف ہُوا تھا کوئی خاص واقعہ بھی تو یاد نہیں۔ جسے آغاز کہا جا سکے ــــ ہاں ایک بات ضرور یاد آتی ہے اور وہ یہ کہ فاصلے کی دُوری ہمیں ایک دوسرے کو نزدیک لانے میں بہت ممد ہوئی۔ جب وہ اور میں تعلیم کے لئے جدا ہوئے تو کچھ عرصہ بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اور میں بہت قریب آ چکے تھے، وہ جیسے میری زندگی کا جزو بن گیا تھا۔ اور میری زندگی اور میری شخصیت کے کئی پہلو اس کی صحبت اور اس کے ساتھ ہی کے مرہون منت ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید یہ صلاحیتیں کبھی مجھ میں پیدا نہ ہوتیں۔ اور یہ قوتیں کبھی بیدار نہ ہوتیں۔

ہم کبھی اکٹھے بیٹھ کر سوچتے تھے اور سپنے بنتے تھے۔ اب ہم اس عالم خواب سے جاگ چکے ہیں۔ یا شاید جگا دیئے گئے ہیں لیکن کبھی کبھی تجدید ملاقات کے لئے میں یہاں اس کے دفتر میں چلا آتا ہوں۔ چند دنوں کے لئے اپنی مصروفیات بھلا کر یا بھلانے کے لئے!

صبح سے اس کے دفتر میں بیٹھا طرح طرح کی باتیں سُن رہا تھا، بس تو اتنے عرصہ میں ہی کچھ گھٹن سی محسوس کرنے لگا تھا میں اس سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ میں بھول جانا چاہتا تھا کہ میں وہاں بیٹھا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ــــ پنڈت جی اُسے بلا رہے تھے، میں نے دیکھا رشید ویسے ہی دائیں ہاتھ کی تیسری اور چوتھی انگلی کے درمیان سگرٹ تھامے ہوئے ٹھوڑی کو دوسری انگلیوں کا سہارا دیئے گویا یہاں بیٹھا ہی نہ تھا۔ وہ کہیں اور بس رہا تھا ــــ سگرٹ کا دھواں ہالوں کی شکل میں فضا میں

تحلیل ہو رہا تھا۔ اس میں سے میں نے اُسے دیکھا۔ اس کی شکل ہی بدلی ہوئی سی دکھائی دی گویا یہ سگریٹ کا دھواں فضا میں گم نہیں ہو رہا تھا اس کے چہرے پر جم رہا تھا۔ ایک منٹ کے لئے میں حیران سا رہ گیا کہ یہ میرے سامنے کون بیٹھا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر کہیں دور پھینک دوں۔ پھر خیال آیا کہ یہ دیوانگی ہے اور میں ابھی دیوانہ تو نہیں ہوں۔

"رشید بھائی! پنڈت جی بلا رہے ہیں۔"

وہ گویا خواب سے چونکا۔ "اوہ! مجھے یہ دیکھنا تھا۔ یہ رہا نٹ بجٹ تھا۔ حساب درست نہیں ان کا۔ یہ لوگ کیسی کیسی فضول غلطیاں کرتے ہیں۔ جی میں آتی ہے کہ ان کے بڑے بڑے آڈٹ کے رجسٹر ان کے منہ پر دے ماروں ان کا [illegible] لیکن پھر خیال آتا ہے اس طرح ڈاکٹروں کو فائدہ پہنچے گا۔ اور یہاں اس دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے کا فائدہ نہیں چاہتا۔ اور روزی کا ذمہ دار میں کیوں بنوں۔ وہ تو خدا کے ہاتھ ہے۔ مگر یہ لوگ یہ جراب فلاں کو، یہ قمیص فلاں کو، تنخواہ۔ سیدھی سیدھی باتیں اس کا حساب نہیں رکھ سکتے۔ اور چلے ہیں جنگ کرنے کو۔۔۔!"

"ارے کیا بڑبڑا رہے ہو! ادھر پنڈت جی چیں بجبیں ہو رہے ہیں۔"

"اچھا بھئی سنتا ہوں۔"

اور اس اُلجھی سی فائل کو بند کر کے اس زور سے میز پہ پٹخ دیا کہ اس کی آواز سے سارا کمرہ گونج اٹھا۔ سگریٹ کو راکھ دان میں رکھ کر ایک بار پنڈت جی کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ پھر سگریٹ کے اس ٹکڑے کو اسی راکھ دان میں بُری طرح مسل دیا۔ یوں کہ اس کی انگلیوں نے پورا دائرہ بنا دیا۔ اس کے لب بھنچ گئے اور گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ "یہی حساب پوچھے گا!"

اور پنڈت جی آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینکیں چڑھائے اتنی ہی یا شاید اس سے بھی زیادہ بڑی اور اُلجھی سی فائل لئے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ اس میں کچھ ایسی بات تھی جو باوجود کوشش کے ان کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے سر کے چھدرے بالوں کو کھجاتے اور لبوں کے دائیں کنارے کو اوپر اٹھاتے اس طرح کہ ان کی دائیں آنکھ بھی مچ جاتی۔

"مسٹر رشید، یہ آڈٹ آپ نے کیا۔۔۔ جانے کیسے آنکھیں بند کر کے کام کرتے ہیں یہ لوگ!"

پیچھے سے کوئی آہستہ سے بول اُٹھا۔ "آنکھیں تو ابھی پنڈت جی میچ رہے تھے۔"

اور سب لوگ ہنس پڑے۔ سوائے پنڈت جی کے۔ وہ ابھی تک سوالیہ علامت بنے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"پنڈت جی! میں تو اُدھر گیا ہی نہ تھا، یہ کام تو مسٹر بھلہ کے ذمے تھا۔"

"اچھا تو بلاؤ اُسے!"

"جی وہ چھٹی پر ہے۔"

"کیا ہو گیا اُسے۔۔۔؟"

"جی۔ اس کی بیوی بیمار ہے۔ کوئی دو ماہ ہونے کو آئے کمبخت بخار ہے کہ اُترنے ہی میں نہیں آتا۔ اب تو غریب علاج کراتے کراتے بھی تنگ آ گیا ہے۔ ڈاکٹر بھی کچھ نہیں بتاتے۔"

"اتنے میں تو تپ محرقہ بھی اُتر جاتا ہے۔ یہ کیا بلا آن ٹپکی، یہ بیماریاں بھی روز بروز بڑھ ہی رہی ہیں۔"

"جی ڈاکٹر کہتے ہیں ایکس رے ہو۔ لیبارٹری ٹسٹ ہوں۔ یہ ہو، وہ ہو، بیچارہ بھلہ یہ سب کہاں سے کرائے۔ ہم

ساغریب کلرک ۔۔ اور پھر دوائیاں ۔۔۔ گلوکوز تک تو بازار میں ملتی نہیں"۔

" اچھا بھئی برا تمہارا آرام دے اسے اور اس دکھ سے بچائے ۔لیکن اس حساب میں غلطی ہے' یہ ایک جراب دی گئی مگر نوٹ میں شامل نہیں ۔ یہ پگڑی پرانی بگڑی واپس لیکر نہیں دی گئی memorandum کئے گئے مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ دفتر کا کام تو بند نہیں ہو سکتا۔ ورنہ مجھے تو صاحب کو لکھنا پڑے گا۔ نہیں تو میری پیشی' مجھے روز صاحب کے پاس جانا پڑتا ہے"۔

پنڈت جی ــــ پنڈت رام کرشن دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہیں' نہایت ہی شریف' ملنسار اور حلیم الطبع انسان ۔ دل کے بہت کمزور' کسی حد تک بزدل بھی ۔صاحب کے پاس جانے سے بہت کتراتے ہیں ۔اگرچہ دفتر کے کلرکوں کے سامنے صاحب سے باتوں کے متعلق بیشمار گپیں ہانکتے ہیں۔

" اس غریب کی تو رپورٹ نہ کیجئے ۔بہت پریشان ہے آج کل' اس غریب کی بیوی ـــــ"

" لیکن یہ سامان' یہ گڑبڑ' یہ حساب' کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ۔۔ ورنہ سارا ریکارڈ خراب ہو جائے گا ۔اور اگر صاحب کی نظر پڑ گئی ـــــ"

" کچھ آپ کر دیجئے' کچھ ہم کر دیتے ہیں ۔وہ بیچارہ دو ماہ سے سخت مشکل میں ہے' ایسے میں اُسے کیا سوجھتا ہے' اُسے ۔سنبھالے' گھر کا کام' بچے کی دیکھ بھال' ڈاکٹر کے بڑھتے ہوئے بل ـــــ اور پھر یہ دفتر اچھے بھلے کا سر چکرا دیتا ہے ۔کالج سے نئے نئے آئے ہوئے لڑکے' اور یہاں یہ جھگڑا ـــــ ۱۵ لاریاں' ۲۲۵ میل ٹسٹ ڈرائیو' جس کا کوئی حساب نہیں ۔پٹرول جتنا چاہے خرچ ہو جائے' مگر ایک جھاڑن اس کی صفائی پر کیسے زیادہ لگ گیا ـــــ

"کیا کیا جائے پھر بھی' جب تک یہ تعلیم ہے کلرک ہی نکلتے رہیں گے' پرزے حکومت کی مشین کے' جو قطعاً بیکار ہوں گے۔ اگر اپنی جگہ جڑے نہ ہوں ـــ مگر یہ حساب ـــ میری پیشی ہو جاتی ہے ہر روز ـــ اور صاحب بیمار آدمی ہے ـــ خواہ مخواہ ناراض ہو جاتا ہے ـــــ"

" اچھا پنڈت جی! مجھے یہ ریمانڈر بھیجنا ہے' اور پھر ہیڈ کوارٹر جانا ہے ۔جانے سے پہلے کر دوں گا ۔بابو نوز کو دیئے جاتا ہوں ۔یہ مکرجی کم بخت بنگالی بڑا ہوشیار لڑکا ہے ۔منٹوں میں جھگڑا چکا دے گا ـــــ"

" ہاں تو جاؤ ـــ مگر جلدی کرو' دیکھا' ہاں!"

پنڈت جی سے یہ بے تکی اور بے سرو پا باتیں کرنے کے بعد رشید ویسے ہی پریشان آکر پھر سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سگرٹ سلگانے لگا۔

"کہئے رشید صاحب! کیا باتیں ہو رہی تھیں پنڈت جی سے ؟"

" پیار کی باتیں ـــ" اُس نے جل کر کہا۔

"حسنِ یار اور زلف و رخسار کی باتیں ـــ!" میں نے اور چڑایا۔

"ہاں معشوقہ تعلیم کی زلفِ سیاہ کی جو اس کے چہرے کو چھپائے رکھتی ہے' ہم اسے معشوقہ سمجھ کر زندگی بھر اس کے رُخِ زیبا کی جھلک دیکھنے کے تمنائی پھرتے ہیں ۔اور آخر کو یہ چڑیل سامنے آکر ہمیں ڈرانے آتی ہے ـــ کاش ہم جاہل ہی رہتے کاش ہم کچھ بھی نہ پڑھتے"۔

رشید آج کل ذرا ذرا سی بات پر یونہی سی کہنے لگتا ہے' گویا وہ مایوس ہو چکا ہے ۔وہ کچھ سوچ نہیں سکتا' کچھ سمجھ نہیں سکتا

اس کا دماغ جیسے ایک اُلجھن میں ہے اور روح ایک عالمِ اضطراب میں،

میں یہاں اس کے پاس آتا ہوں اور اسے یُوں دیکھتا ہوں تو بے چین سا ہو جاتا ہوں' چہرے سے مسکراہٹ، ہنسی اور تاثرات گم' عجیب چاپ، وہ سب کام کئے جاتا ہے۔ میں اسے یوں دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتا۔ اُسے کچھ اور چھیڑتا ہوں یُوں نہیں کہ مجھے اس میں کوئی لُطف محسوس ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بے جھجک سب کچھ کہدے' کچھ بھی چھپا نہ رکھے اور یُوں یہ گھٹن کا عالم ختم ہو' فضا صحت مند ہو جائے۔ اور پھر جب انھیں چھیڑتا ہوں تو کچھ پرانی باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ کچھ داستانیں اور ان کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن میں خود کی ہلکی سی جھلک دیکھ سکتا ہوں ——— میں خود وہ باتیں سوچ کر اُلجھن میں پھنسنا نہیں چاہتا، لیکن کبھی کبھی ان سے متعلق کچھ سُننا چاہتا ہوں اور ان میں اپنے ماضی کے واقعات اور مستقبل کے خواب دیکھ کر ایک میٹھا سا درد' ایک موہوم سا غم محسوس کرتا ہوں۔

وہ بیچارہ پنڈت جی سے جانے کیا کیا کچھ سن کے آیا تھا' میں نے تو کچھ ہی باتیں سنی تھیں' پنڈت جی بولتے بہت آہستہ ہیں۔ شاید ان کی عادت ہی ایسی ہے یا شاید صاحب کے ڈر کے مارے۔ آتے ہی میں نے کہا اس انداز میں" پنڈت جی سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟" پوچھا جیسے کالج کے زمانے میں ہم اس لڑکے سے پوچھتے تھے جسے ہم نے کسی لڑکی سے چھپ کر باتیں کرتے دیکھ پایا ہو ———!

ایک بناوٹی ہنسی اور پیار کی باتیں کہہ کر اُس نے ٹالنا چاہا' مگر میں نے نہ چھوڑا۔" کاش ہم جاہل ہی رہتے ——— واہ میرے بھائی' کیا بات کہی ہے، ذرا غور کرو' کیا خوب سمجھتے تم یہ بڑا سا نیلا تہمد' یہ لمبا گاڑھے کا کرتا اور منڈا ہوا سر' بجائے ان فرینکٹ مونچھوں کے پرتھی راجی مونچھیں۔ ہمارے جاہل کسان بھائی' کسی کھیت میں ہل پہ ہاتھ رکھے ———"

"کسی رادھے کے انتظار میں' کہدو ———!" اس نے بات کاٹ دی۔

"جی! کسی نوراں کے انتظار میں' یہ پنڈت رام کرشن تھوڑے ہی ہیں کہ رادھے کا انتظار کریں ———"

"اور تم شاید وہیں کالج کے برآمدوں میں رہنا پسند کرتے۔ دیپ کے حسن کی تجلیوں سے اپنی سیاہ بختی کو کم کرنے کی کوشش میں مجھے چپ دیکھ کر انھیں جرأت ہوئی۔ "کیا ہوا' بس بُجھ گیا دیپ!"

"ہاں' وہ شمع بُجھ گئی' میرے لئے تو وہ چراغ حل ہو گیا۔ لیکن نوراں کا تو کہاں غائب ہو گیا؟"

"یونہی' حسن و جوانی کا وہ مجسمہ اب خزاں رسیدہ پتّے کی طرح زرد اور حرماں نصیب ہے۔ اس کے تین بچے ہیں' اس کا خاوند مر چکا ہے۔ وہ اب ایک بیوہ ہے جو لوگوں کے لئے آٹا پیس پیس کر اور دوسرے کام کر کے بچوں کا پیٹ پالتی ہے' وہ وقت سے بہت پہلے ہی بوڑھی ہو گئی ہے ———"

وہ اپنی اس پرانی داستان کو یاد کر کے بہت مغموم سا ہو گیا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہ ذکر چھیڑ کر بُرا کیا تھا۔ میں تو اس لئے یہاں آیا تھا کہ کچھ دن مل کر یہاں رہیں اور پُرانے دنوں کی یاد تازہ کریں۔ مگر یہ واقعے خواہمخواہ یاد آ گئے تھے۔ یہ یونہی آ جاتے ہیں اور یہی تو ماضی کی سب سے خوشگوار باتیں تھیں۔ مگر ان کو یاد کر کے دل کس قدر اُداس ہو جاتا ہے' حسین باتوں کی یاد کس قدر غمناک ہوتی۔ لیکن اس خلش میں کچھ عجیب سا مزا ملتا ہے ———

رشید نے پھر سے بڑبڑانا شروع کر دیا۔" اس کا خاوند ایک جھگڑے میں مارا گیا۔ سنتے ہیں ———"

"جاہل بات بات پر لڑ پڑتے ہیں اور ———"

"ہاں جو چیز مجھے عزیز ہے - میں اس کی رکشا کے لئے ضرور لڑوں گا۔ مجھے لڑنا چاہئے - میں نہیں بتانا چاہتا کہ وہ کیسا جھگڑا تھا، اس نے کوئی بُرا نہیں کیا ــــ اور میں، میں محسوس کرتا ہوں، مجھ سے میری روح چھن چکی ہے - میں ایک مشین بن گیا ہوں، بے جان، اس ٹایپ رائٹر کی طرح، یہ بھی کام کرتی ہے - اگر اس کی دھمکا پر انگلیاں رکھ کے اسے چلایا جائے - اور میں بھی روز کام کرتا ہوں جو سپرنٹنڈنٹ مجھے دیتے ہیں - وہ مجھے جھاڑتے ہیں، سخت سست بھی کہتے ہیں، اور میں چپ رہتا ہوں ــــ سب برداشت کرتا ہوں، حالانکہ تمہیں معلوم ہی ہے میں کسی کی ایک بات بھی نہیں سکتا تھا - پروفیسر سیٹھی سے میرا جھگڑا تمہیں یاد ہوگا ــــ مگر اب -"

اس نے ایک لمبی سانس لی اور اپنے ارد گرد نظر ڈالی -

"اور اب" میں نے کہا -

"میرے ہاتھ شل ہو چکے ہیں - میری زبان گنگ ہو چکی ہے - ان مضبوط ہاتھوں سے میں صرف قلم گھسٹ سکتا ہوں یا ٹایپ کر سکتا ہوں - اب میں ایک کلرک ہوں"

"تو کلرک صاحب قبلہ، کیوں آگئے ادھر؟ لفٹننٹ ہو جاتے - ان دنوں دروازے کھلے تھے"

"والد صاحب کو میں نے بہتیرا کہا ــــ فوج نہیں تو پولیس ہی سہی - لیکن انہیں کچھ بھی منظور نہ تھا، وجہ جانتے ہو ــــ خطرہ رشوت، خوشامد، بے ایمانی، انہیں کیا معلوم ساٹھ روپے تنخواہ والا کلرک چار سو روپیہ ماہوار کمیشن بنا کر کماتا ہے ــــ ہم ہر روز پنڈت جی کی خوشامد نہیں کرتے تو اور کیا کرتے ہیں - یہ سب ریا ہے - بھیا یہ دنیا بہت بڑی ریاکاری ہے، فریب کھلا ہوا فریب!"

"لیکن آخر تم اس قدر مایوس کیوں ہو؟ کوشش کرو - ایسے ہی میں تمہیں بہتر جگہ مل جائے - امتحان دے ڈالو محکمے کا بڑا امتحان ــــ ونود کی طرف دیکھو، کیا بڑے بڑے منصوبے لئے بیٹھا ہے - دو سال میں اکونٹنٹ ہو جائے گا - اور پھر یہ ــــ اور وہ ــــ"

"یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو اکبر بھائی، یہ سوال تم مجھ سے کر رہے ہو - خود سے پوچھا ہوتا ــــ اور ونود ــــ! وہ ابھی بچہ ہے ــــ"

"بچہ ــــ! گویا تمہارا مطلب ہے ــــــ" مجھے پھر مذاق سوجھا تھا مگر اس نے میرا مطلب پا لیا تھا - اور میرے بولنے سے پہلے ہی خود پھر سے کہنا شروع کر دیا -

"ہاں، وہ ابھی بچہ ہے ــــ اس سے پہلے اس نے کبھی منصوبے نہیں باندھے - اس نے کوئی ناکامی نہیں دیکھی - اور پھر وہ امیر آدمی ہے - وہ سپنے بُن سکتا ہے - اسے اس کا حق پہنچتا ہے ــــ کبھی تم نے اپنی زندگی پر بھی پلٹ کے نگاہ ڈالی ہے، کیا باغی بنے پھرتے تھے - عوام میں ایک نئی روح پھونکنے کا آدرش لئے ــــ"

"آداب عرض پنڈت جی!" کسی نے زور سے کہا اور ہم سب کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی -

"ارے صدیقی تو کہاں سے ٹپک پڑا ــــ؟"

"W. A. C(I) کے یونٹ سے آڈٹ کرکے، وہاں تھوڑا سا کام تھا"

"ختم کر کے ــــ؟"

"جی، سارا نہیں ہو سکا - کل ہو جائے گا ــــ"

"ہاں ختم کاہے کو کرنا تھا - W یونٹ ہے نا وہ - کیسے بھاگتا ہے یہ لونڈیوں کے پیچھے - اور کوئی یونٹ ہو تو ہفتے کا کام دو دن میں ختم، اور یہاں ایک دن کا کام تھا - ہفتہ ہونے کو آیا ہے ــــ ارے وہاں تیرے لئے کیا رکھا ہے؟"

"واہ پنڈت جی! اس کے لئے کیا نہیں رکھا۔ یہی تو ایک خوبرو لڑکا ہے ہمارے آفس میں، اس پہ تو سب جان چھڑکتی ہیں لفٹیننٹ۔ کرنل کپتان ایسے یا کمانڈر تک سب اس پہ مرتی ہیں ———" ایک اور صاحب بول اٹھے۔

"نہیں پنڈت جی یہ یونہی بک رہا ہے ——" صدیقی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی ہنسی میں فخر بھی تھا اور شرمندگی بھی۔ فرائڈ کے لفظوں میں وہ کہہ رہا تھا "کاش ایسا ہی ہوتا۔"

"یونہی کیسے بے، یہ سنگار کاٹ کو ہوا تھا اگر یہ بات نہیں، یہ بال یہ سوٹ اور ٹائی یہ بوٹوں پہ پالش یہ چہرے پہ کریم تمہیں کہیں سے لاجانا تھا۔ وہاں تو پنڈت جی اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ دعوتیں ہوتی ہیں اور دعوتوں میں بڑی بڑی باتیں، گراموفون۔ ریڈیو۔ ستار سنائی جاتی ہے۔ سینما کے وعدے کئے جاتے ہیں۔ اور ———" اور صدیقی ہنس دیا۔ "ہی ہی ہی ———" اور کہنے لگا۔ "ہماری کہاں وہاں تو بڑے بڑے ہیں ناز اٹھانے کو ——— اور پھر وہاں ہے بھی کیا ——؟"

"واہ بے ہے کچھ نہیں تو یہ سب کیا پنڈت جی کو اکسایا جا رہا تھا۔" ایک اور حضرت بھی شامل ہو گئے۔ یہی موقع تھا پنڈت جی پہ چوٹ کرنے کیلئے۔

"نہیں بھئی، یونہی تو کوئی نہیں مرتا۔ اس نے تو سنا ہے میجر پھانس رکھا ہے۔ لیکن وہ تو جا رہا ہے، اب وہ کیا کرے گی ——"

"جو نیا آئے گا، اسے پھانسے گی، اس کو بھی فائدہ اور اسے بھی ——" اور سب ہنس پڑے ——— ہی ہی ——— ہاہا ——

"ہاں بھئی، یہ بڑی کائیاں ہوتی ہیں۔ مجھے بھی ایک دفعہ ——" کسی نے اپنی داستان شروع کی مگر اس کی آواز ہنسی میں دب کے رہ گئی۔

"یہ لوگ ذہنی طور پہ ابھی بچے ہیں۔" رشید نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہاں وہ تمہارے آدرش کیا ہوئے۔ بیداری کی روح پھیلانے کے عزم، وہ جوش وہ ولولے کہاں ہوا ہو گئے ——— آخر نوکری ہی کی ———!"

"شکست! میرے پیٹ سے میرا دماغ شکست کھا گیا۔ اور روح، اس دیس میں، لاکھوں ذی روح گلیوں، سڑکوں اور راہوں پر سسک سسک کر مر گئے، انسانی جسموں کی تجارت ہوئی، اور روح پھر بھی سوئی رہی ———"

"تو تمہارا خیال ہے سب لوگ یہ کوشش بھی چھوڑ دیں، جب تک کوئی انہیں جھنجھوڑے گا نہیں۔ عوام بیدار کیسے ہوں گے۔"

"یہ کام مخالف گروہ کی گولیاں زیادہ بہتر طریق پر کر رہی ہیں۔ یار لوگ تو ان کے ہمدرد بن کے اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔ جب تک لوگ خود حالات کو سمجھ کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، یہ سب رونا فضول ہے ———"

"اور جب تک، اس وقت تک ہم کیا کریں ——؟" رشید نے اطمینان سے پوچھا۔

"اگر بھوکوں مرنا نہیں چاہتے تو کلرکی ——" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ اور پہلی بار اس کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھی۔

"اچھا تو بھئی میں یہ ریمائنڈر ذرا یہ سگرٹ سلگا نا۔ یہ پہلا تو یونہی ضائع ہو گیا۔ مگر وہ پانچ بج رہے ہیں اب تو ماہر چل کر ہی سگرٹ پئیں گے آرام سے"

"لیکن ابھی تو پانچ نہیں بج سکتے، اور پھر یہ ریمائنڈر لکھ تو لو۔ وقت ہی کیا لگتا ہے اس میں، زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ ———" میں نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ سگرٹ کا سلیٹی سلیٹی دھواں اس کے اور میرے درمیان فضا میں گم ہونے لگا۔ اور اس نئی فضا میں اس کی شکل ہی بدلی ہوئی سی دکھائی دینے لگی۔ میں نے سگریٹ راکھدان میں رکھ دیا اور پھر سے کہا۔

"لکھ ہی لو، ابھی چلتے ہیں ———"

"یہ کل کر لیں گے۔ یہ کام تو ایسے ہی چلتے رہتے ہیں ——— اور پھر ہمیں آج سینما بھی تو دیکھنا ہے ——— اور پھر ہمارے دفتر کی گھڑی میں پانچ بج گئے ہیں ———" اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا جس پر ریمائنڈر لکھنے کا خیال تھا۔ پھر سے فائل میں رکھ دیا ——— اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

(حلقۂ اربابِ ذوق میں پڑھا گیا)

صلاح الدین اکبر

حشرِ جذبات

یہ کیا ہے کر رہے ہیں آج اظہارِ وفا وہ بھی
کہ شاید ہو چکے ہیں اب پشیمانِ جفا وہ بھی

عجب انداز ہے تیرے کرم کا او جفا پرور
نگاہِ لطف مجھ پر ہے مگر صبر آزما وہ بھی

تری پرسش بھی گویا ایک رحم پر ستم ٹھہری
کہ میرے حق میں جیسے بن گئی ہے اک بلا وہ بھی

کبھی کی تھی جو میں نے تنگ آ کر اس کی محفل میں
غلط سمجھی گئی افسوس میری التجا وہ بھی

خدا اس عشق کو سمجھے کہ خودداری مٹی اس سے
کہ جو سُننا نہ تھا مجھ کو محبت میں سنا وہ بھی

اگر وہ آج ہنستے ہیں وفاؤں پر تو ہنسنے دو
کریں گے ایک دن تم دیکھنا قدرِ وفا وہ بھی

فروغِ ماہ و انجم سے مجھے تسکیں نہیں ہوتی
جو جلوہ آج تک محفوظ ہے مجھ کو دکھا وہ بھی

جو باقی رہ گئی ہے خُم میں تیرے اے مرے ساقی
پلا دے ہاں پلا دے تُو بقدرِ حوصلا وہ بھی

جو باتیں رہ گئیں دل میں مرے خوفِ طوالت سے
یہ میں کیسے کہوں تم سے کہ تھیں تو مدعا وہ بھی

مری سعیٔ طلب کا یہ ہوا انجام اے ثاقب
مری آواز پر دینے لگے ہیں اب صدا وہ بھی

ثاقب کانپوری

اقبال۔ عالمِ بالا میں

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں، بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

راوی ۱ :۔ اقبال کی گہری نظر نے اس خاکدان کے علاوہ اور بھی کتنے جہان دیکھے۔ اور ان کی ہمت بلند نے عشق کی پرواز سے ان دنیاؤں کو عبور کر کے مادی حدود سے پار حقیقت کا جمال دیکھنا چاہا۔ علامہ کی تمام شاعری اسی جمال کی دید کا افسانہ ہے۔ اسی روحانی تجربے کا بیان ہے۔ ان کی نظم میں عشق کی زندگی کے گہرے راز ہیں۔ یعنی وہ زندگی جس میں ایک جذبے کی قیمت دو جہان کی دولت سے زیادہ ہے۔ دورِ حاضر کی مادہ پرستی اور خود غرضی کے بتوں پر اقبال نے حق گوئی اور بے لاگ تبصرے اور تنقید کی کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے دل میں بلند ارادوں کے طوفان اٹھتے ہیں۔ حق کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ اور عمل اور سخت کوشی کے لئے دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ جس دل پر اس کلام کی ضرب کلیم لگ جائے وہ دردمند ہو جاتا ہے۔

راوی ۲ :۔ ایک بار اقبال کی آسمان طلب طبیعت نے اس عالم پست سے اٹھ کر فلک کے نیلگوں پردے کے پار کی سیر کرنا چاہی۔ اس سیر میں ان پاک اور بلند روحوں سے اکتسابِ فیض کیا جو دنیا کی کثافتوں سے بری عالم بالا کی سیاحت میں مصروف ہیں۔ اس فلکی سیر میں اقبال کی رہنما مشرق کے بلند پایہ مفکر مولانا جلال الدین رومی کی روح تھی۔ جس کی حقیقت بیں نظر فطرت کے سینے میں تیر کی طرح اُتر جاتی ہے۔

راوی ۱ :۔ اس سیر میں اقبال کی روح نے آسمان کے مختلف طبقوں، ستاروں اور سیاروں کو دیکھا۔ ملائکہ اور انجم کے نغمے سُنے۔ حق و باطل کی جنگ کے ان نظاروں کو پرکھا جو انسان کی دنیا میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ملے جلے نظر آتے ہیں اور زندگی کے مشکل مسائل اور معموں کے جواب اپنے ہادی کی مدد سے ڈھونڈے۔

رُومی :۔ اے جوان ہمت مرد تیری آنکھوں میں فراست کی روشنی ہے۔ اور تیرے چہرے پر ذوق کی جھلک، تو نے میرا دامن کس لئے پکڑا ہے۔ یہ بتا کہ وہ کون سی حاجت ہے جسے میں پورا کر سکتا ہوں۔

اقبال :۔ اے پیرِ رومؔ! میں ایک آنکھ ہوں نورِ حق کی جویا ایک سینہ ہوں عشق کی تڑپ سے معمور۔ ایک گاہی ہوں تلاش میں بھٹکا ہوا۔ آپ کے فیض و کرم کا طلبگار، عقل کی گتھیوں کو سلجھاتے سلجھاتے تنگ آچکا ہوں۔ مجھے جنونِ رسا۔ نذر کیجئے۔

رومی :۔ اے طالب وید! تو نہیں جانتا کہ تو کیا مانگ رہا ہے

اس جنون کی راہ میں کڑی منزلیں ہیں۔ دشوار گھاٹیاں
ہیں۔ نفس پر قابو پانا ہوگا۔ اس کو یہ نظر عطا کی جاسکتی
ہے جو اس نفس کو مارنے کا تہیہ کرے۔

اقبال۔ اے میرے مرشد! آپ کی نگاہ نے مجھ پر یہ اثر کیا ہے
کہ شوق دل میں بڑھتا جا رہا ہے۔ آنکھیں دید کے لئے
بیتاب ہو رہی ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلئے۔ ایک
جھلک اس عالم کی دکھا دیجئے جس میں آپ ہمیشہ ملائکہ
اور پاک روحوں کے ہمنشیں رہتے ہیں!

رومی۔ اس دنیا میں جا بجا بجلیاں کوندتی ہیں۔ طور اور سینا
کے نظاروں سے چکا چوند کا عالم ہے۔ ملائک کے
سحر اور نغموں سے روح وجد میں کھو جاتی ہے۔ تجھ
میں اتنا ضبط ہے کہ اس عالم کے نظارے کی تاب
لا سکے؟ تجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اس دنیا کو دیکھ سکے؟

اقبال۔ پیر و مرشد! یہ خاکسار عشق کی راہ میں راتیں کاٹ
چکا ہے۔ منزلوں کی خاک چھان چکا ہے۔ کوہ و دشت
میں نالہ و زاری کرتا پھرا ہے۔ جس میں طلب کا اتنا
شوق ہو اسے نظارے سے محروم نہ رکھئے۔

رومی۔ اس دنیا کے رازوں کو جاننا ایک کڑے ایثار کی طلب
کرتا ہے۔ خوب سوچو اور سمجھو۔ جس نے ایک بار وہاں
کی جھلک دیکھ لی، وہ اس دنیا کے لطف اور لذائذ
کو بھول جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایک قلندرانہ
بیخودی آجاتی ہے۔ دنیا کی رنگینیاں تمھاری نظر میں
خاک ہو جائیں گی۔ اگر تمھیں یہ منظور ہے تو ہم تمھیں
اپنے ساتھ لے چلتے ہیں اور غیب سے حضور میں
پہنچاتے ہیں۔

اقبال۔ مجھے منظور ہے بہ شرط پیر و مرشد! زندگی کی لذتیں
میری نظر میں ہیچ ہیں۔

رومی۔ تو آ، اے طالب نظارہ! ہمارا دامن تھام کر چل
تیری آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اور جگہ جگہ
تیرا پاؤں لڑکھڑائے گا۔

(یک بیک بجلی کی کڑک سے دل دہل جاتے ہیں اور
ایک نئی دنیا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے)

اقبال۔ (آہستہ سے) یہ عالم بالا ہے؟

رومی۔ ہاں! ہم فلک کے اس پار آگئے ہیں۔ دیکھو یہاں
نور ہی نور ہے۔ نیچے چاند اور سورج ہمارے ارد گرد
گھوم رہے ہیں۔ تاروں کے جھرمٹ پرواز کر رہے ہیں

اقبال۔ یہاں ہر طرف قوس قزح کے حسین رنگ پھیلے
ہوئے ہیں اور سُریلے نغموں کی آوازیں آرہی ہیں

رومی۔ یہ ملائک کے نغموں کی آوازیں ہیں جو حمد باری
میں مصروف ہیں۔

اقبال۔ ہم ملائک کے مقام تک پہنچ سکتے ہیں؟

رومی۔ ہاں، ذوق اور تاب نظر کی بات ہے۔ عشق کی
بلند ہمتی کے لئے کوئی مقام بھی دور نہیں، دل میں
جذب ہونا چاہیئے۔

اقبال۔ اے مرشد روم! یہ کون سی دنیا ہے جس میں ہم
اس وقت پرواز کر رہے ہیں۔

رومی۔ اے راہ رَو سن! اور جان کہ اس عالم معنوی میں
گھڑیوں اور پہروں، دن اور رات کا تعین نہیں
یہاں غیب نہیں، دور نہیں، ماضی نہیں، مستقبل
نہیں، یہاں محض ایک کیفیت ہے اور وہ حضور
کی کیفیت ہے۔ یہاں کا منظر سراپا جمال ہے۔ یہ
عالم فلک قمر ہے۔

اقبال۔ کس قدر اونچے پہاڑ ہیں یہاں۔ اور کتنی گہری
گھاٹیاں۔

رومی۔ یہ چاند ایک قندیل ہے۔ اس خاکدان کے لئے
جسے دنیا والے زمین کہتے ہیں۔ اس کی راہیں
تمھاری زمین سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں یہ اسی کا
جگر گوشہ ہے۔

اقبال - اس میں کتنا سکون اور سکوت ہے - ہر طرف سکون اور موت! اس کی سطح پر کبھی سبزہ نہیں اُگتا - اس کی فضا میں کوئی پرندہ نہیں بھٹر پھڑایا - مگر کیا طوفان باد و آب ہے کہ زمین کے سمندروں کے تلاطم کی یاد دلاتا ہے - مرشد طریقت اس دنیا میں بھی کوئی رہتا ہوگا؟ مجھے آگاہ کیجئے اس کے راز سے -

رومی - بہت دنوں سے اس سیارے کے ایک غار میں نژاد عارف رہتے ہیں - آؤ چلتے چلتے ان سے ملتے چلیں - ان کی روح نے فقر و غنا کا لطف اٹھایا ہے اور ریاضت کی منزلوں کو عبور کرکے ضمیر کو صیقل کیا ہے - اب ہم انہیں کی طرف جا رہے ہیں - یہ دیکھو' اس غار میں وہ رہتے ہیں - لو دیکھو! وہ آ ہی رہے ہیں -

اقبال - یہ جس کے گلے میں سیاہ سانپ حمائل ہے - یہ کون ہے؟

رومی - اس کی آنکھوں میں عرفان کی جھلک ہے - اس کے سفید بال ایک ہالہ ہیں جو اس کی ہزاروں سال کی ریاضت کا پتہ دیتے ہیں - اس کا نام جہاں دوست ہے - اہل ہند کی زبان میں وشوامتر - یہ ہماری ہی طرف بڑھا آ رہا ہے -

اقبال - انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے - اشارے سے بلا رہے ہیں -

جہاں دوست - اے عارف روم! میں اپنی کٹیا میں تمھارا اور تمھارے ہمراہی کا خیر مقدم کرتا ہوں - پیشتر ازاں کہ میں کچھ اور استفسار کروں' مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کون ہے' مجھے اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزو جھلکتی دکھائی دیتی ہے - جو دنیا والوں میں نہیں ہوتی -

رومی - اے جہاں دوست! میرے محترم رفیق راہ' یہ شخص تلاش حق میں سرگرداں ہے - یہ ایک ثابت ہے - مگر فطرت اس کی سیاروں کی سی ہے - اگرچہ خام ہے لیکن مجھے اس کی تڑپ عزیز ہے - یہ ایک عقاب ہے جو سات آسمانوں کے طواف کا شوق اپنے جذبۂ دل میں رکھتا ہے -

جہاں دوست - مبارک ہے وجود ایسے لوگوں کا کیونکہ دنیا کے ظاہر بین اور مادہ پرست لوگوں کو اس کی شعلہ بار نظر کی سخت ضرورت ہے - اس کی بلند ہمت اور جرأت کا حال سن کر میرا دل بہت مسرور ہوا -

رومی - میں نے اس کے سینے کی بینائی دیکھ کر اس کو اپنا دامن پکڑایا ہے - اور سیر فلک کے لئے اسے اپنے ہمراہ لایا ہوں: عجب رند ہے یہ کہ اہل دنیا کے فریب نظر کو جگر کے پار نکل جانے والے نغموں سے توڑتا ہے - عجب سوز ہے اس کی آواز میں - جسے سنتے ہی طبیعت اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے -

جہاں دوست - اے خاکی! مبارک ہے تمھارا وجود - اہل مشرق کی حالت اب کیسی ہے؟

اقبال - اے عارف روشن ضمیر! اہل مشرق میں اب ایک روحانی بیداری آ رہی ہے - جس کے اثر سے اب وہ نہ بے بس ہیں اور نہ جمود میں مبتلا - میں نے انھیں اپنے بزرگوں کے دیئے ہوئے روحانی خزانوں کی چمک دکھائی تو ان کے دلوں میں شوق اور ان کے سینوں میں غیرت پیدا ہوئی - اور وہ مغربی تہذیب کی پرستش سے دل برداشتہ ہو گئے - اے عارف! مجھے کچھ پیغام دیجئے جو میں آپ کی جانب سے اہل ہند کو پہنچاؤں -

جہاں دوست - سنو اے طالب حق! چند نکات میں تمھیں بتاتا ہوں' جو میں نے اپنی ریاضت کے دوران میں حل کئے ہیں - یہ لوگوں کو بتا دینا' مادہ پرستوں سے جو دھن' دولت' راج اور طاقت کی طلب میں سرگرداں ہیں یہ کہنا کہ جو فانی کی طلب کرتا ہے وہ خود فنا ہو جاتا ہے - زندگی نام ہے حق کی طلب کا

رنگ و بو کی دنیا سے بالاتر نغمے کا سا اور ان زاہدوں
سے جو دنیا کا کار چھوڑ کر غاروں اور پہاڑوں میں
گوشہ نشین ہوتے ہیں یہ کہنا کہ دنیا ایک نقش ہے
جو دنیا سے اس لئے بھاگتا ہے کہ وہ حق سے دُور
چلا جائے گا وہ دھوکے میں ہے۔

اقبال ۔ تو اے عارف زندہ دل! آپ عمل کے حامی ہیں؟

جہاں دوست ۔ ہاں! میں عمل اور جہد کا حامی ہوں۔ اصل
ریاضت عمل ہی میں ہے۔ نیک عمل میں۔

اقبال ۔ یہ صحیح زندگی کا پیغام ہے .....

اے عارف روم! یہ کون زاہد ہے جو اس غار کے
پاس بیٹھا ہے۔ اس کا چہرہ کتنا نورانی ہے جو اُس
کی پاکیزہ روح کی خبر دیتا ہے۔

رومی ۔ یہ بھرتری ہری ہے۔ اس کی وضع قلندرانہ اور اس
کی آنکھوں میں ازلی سُرور ہے۔

اقبال ۔ یہ بھی اہل ہند میں سے ہے؟

رومی ۔ ہاں یہ صاحب تاج و تخت تھا۔ بادشاہت
کو اس نے ٹھکرا دیا۔ اور روحانیت سے لو لگائی۔
فانی دنیا کے جھوٹے ناتے توڑ کر ابدی دنیا سے رشتہ
جوڑا۔ جہاں یہ جاتا ہے فضا میں گلباری ہوتی ہے
یہ اس کی ریاضت کا فیض ہے۔

اقبال ۔ ہم اس کی صحبت سے بھی فیض یاب ہو سکتے ہیں؟

رومی ۔ آج ادھر ہی کو چلتے ہیں۔ اے رفیق عزیز بھرتری
ہری۔ ہم آپ سے ملنے کے لئے ادھر آتے ہیں اور
ہمارا ہم صحبت میں ایک جویائے عرفان ہے۔ اس
کو نور معرفت سے بہرہ ور کیجئے۔

بھرتری ۔ اے صاحب عرفان ملک روم! جو تمھاری صحبت
سے فیض حاصل کرتا ہے اسے کسی اور کے دیئے
ہوئے عرفان کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ اے
زمین کے ساکن! تمھارے دل میں اگر جذب ہے

تمھارا سینہ پگھل سکتا ہے تو تم ہماری بات کو سمجھ سکو گے
ورنہ نہیں۔ کیونکہ ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اقبال ۔ اے زاہد حقیقت بیں! میں بھی گرمی کلام کا جویا۔
سفر کا مارا۔ کوہ و صحرا کی دشواریاں پھاندتا ہوا اس
مقام تک آ پہنچا ہوں۔ اجازت ہو تو ایک سوال
پوچھوں ---!

بھرتری ۔ کہو، تمھارے انداز میں خلوص ہے اور تمھاری
باتوں کا جواب دینے کو جی چاہتا ہے۔

اقبال ۔ یہ فرمایئے کہ کلام میں سوز و اثر کیونکر پیدا ہوتا ہے
یہ کہنے والے کے دل کی گہرائیوں میں سے ابھرتا ہے
یا اس دنیا کو پیدا کرنے والے خدا کی دین ہے؟ میری
سمجھ میں یہ نکتہ نہیں آسکا۔

رومی ۔ تم نے بہت اچھا سوال کیا۔ سحر کلام کیا ہے؟ جذب
اس میں کہاں سے آتا ہے۔ میرے دوست بھرتری
اس کی روح کی تشفی کرو۔

بھرتری ۔ شعر اور شاعر کی حقیقت بہت گہری ہے۔ کوئی
اس نکتے کو نہیں سمجھ سکتا۔ شاعر کے تڑپتے ہوئے
دل کی گہرائی کو کون جانچ سکتا ہے؛ جذب شعر
اسی سوز، اسی تڑپ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم شاعروں
کی روح سدا جستجو میں رہتی ہے۔ اس جستجو کی خلش
سے ہمیں لذت ملتی ہے۔ اس ناکام جستجو کی خلش
اس ناتمام آرزو سے کلام کا سوز پیدا ہوتا ہے۔
جس دل کی یہ تڑپ مر جاتی ہے اس کا کلام بے جان
ہو جاتا ہے۔ اور کسی دل میں گرمی پیدا نہیں کرتا۔

اقبال ۔ آپ نے بہت گہرے راز کا انکشاف کیا ہے۔ میری
طبیعت اس سے مطمئن ہو گئی۔ ایک اور سوال
پوچھوں --- ؟

بھرتری - پوچھو -

اقبال - یہ تو درست ہے کہ جو بات دل کی گہرائی سے نہ نکلی ہو اس کا اثر نہیں ہوتا - مگر اس کا کیا سبب ہے کہ جذبِ درد دل سے نکلی ہوئی بات زمانے پر اثر نہیں کرتی - شاعر دنیا میں بے رفیق تنہا گھومتا ہے - یادہ ہوتا ہے یا اس کی ذات - اسے دیکھنے والے خاموش اور روشن تارے ہوتے ہیں - مگر دنیا والے اس کی بات نہیں سنتے - اس کے خروش کی طرف متوجہ نہیں ہوتے - یہ کیوں؟

آسمانوں پر مرا فکرِ بلند
میں زمیں پر خوار و زار و دردمند

بھرتری - اے عرفان کے جویا! تونے یہ سوال مایوسی کی حالت میں پوچھا ہے' یاس کو چھوڑ' دل سے نکلی ہوئی بات ضرور اثر کرتی ہے - آگ کی چنگاری دبی رہے - دبی رہتی ہے - مگر آخر خس و خاشاک میں شعلے اٹھاتی ہے - کیا ہوا، تمھاری صدا کو کوئی نہیں سنتا - تمھارے نور کے سحر سے ایک زمانہ غافل ہے - مگر آخر سنیں گے تمھاری آواز کو - یقین رکھو - اس آواز سے ہنگامے بپا ہوں گے - ایک دنیا متاثر ہوگی -

ہم تمھاری باتوں سے بہت متاثر ہوئے ہیں -

ہم میں اب بھی جذبہ ہے - ہماری روح اب بھی شوق کی جنبش سے لرزاں ہوتی ہے - ہمیں کچھ اپنا کلام سناؤ - کوئی دل سے نکلی ہوئی چیز -

اقبال - اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری' یہی ہے بادِ مراد
قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

رومی - اے جویائے عرفان! اب ہم تمھیں ایک اور عالم میں لے چلتے ہیں - وہ دیکھو اہرمن زرتشت کو ورغلا رہا ہے اور اس کی پاکیزہ روح کو نورِ حق سے مادیت کی طرف لے جا کر راستے سے گمراہ کرنا چاہتا ہے -

اقبال - تو یہ قیل و قال انہی کی ہے؟

رومی - ہاں سنو اس قیل و قال میں تمھیں زندگی کی کشاکش دکھائی دیگی، جو ہر انسان کی روح میں جاری رہتی ہے، یعنی حق و باطل کی جنگ - یا یہ سوال کہ زندگی میں انسان دنیا کی رنگینیوں کا انتخاب کرے یا راہِ حق کی دشواریوں کا -

اقبال - تو اب ہم قریب ہی آگئے ہیں -

رومی - وہ سنو - اہرمن کی پھسلانے والی منطق -

اہرمن - تم یزداں کے وعدے پر اعتبار کرتے ہو؟ کتنے بھولے ہو تم - جو یزداں کے پیچھے چلتا ہے - اسے آرے سے چیرتے ہیں - اس کے بدن کو کیڑے کھاتے ہیں - سُنا نہیں تم نے ایوب کا قصہ؟

زرتشت - حضرت ایوب کی داستان میں جانتا ہوں -

اہرمن - اور حضرت عیسیٰ کا نام بھی سنا ہے جنھیں دار پر کھینچا گیا؟

زرتشت - ہاں، وہ بھی مجھے معلوم ہے -

اہرمن - اور پھر بھی تم یزداں کی طرف کھنچے جا رہے ہو - تمھیں اب بھی اپنے خدا پر اعتقاد ہے؟

زرتشت - ہاں!

اہرمن - میں جانتا ہوں تمھیں بہت بھولے ہو تم - دیکھو

میں تمھیں بتاتا ہوں۔

زرتشت ۔ کہو۔

اہرمن ۔ اگر تم میری بات مانو تو زندگی میں تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

زرتشت ۔ میں تکلیفوں سے نہیں ڈرتا۔ مجھے کوئی اور دلیل دو اپنے دعوی کے جواز میں۔

اہرمن ۔ تم انسانوں کے درمیان یزداں کے نام کا پرچار کرتے ہو۔ تمھیں معلوم ہے لوگ بڑے خود غرض ہیں تمھیں یا تو مار ڈالیں گے۔ اذیتیں دیں گے یا اگر یہ نہ ہوا تو تمھیں بھول جائیں گے۔ تمھاری پروا نہیں کریں گے۔ تمھارا نام نہیں لیں گے تمھاری خبریں نہیں چھاپیں گے۔ اور یوں تمھارا پیغام حق دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ کیوں مفت میں زندگی گنواتے ہو۔ آؤ میری بات سنو۔

زرتشت ۔ اے اہرمن! تو مجھے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش نہ کر۔ یاد رکھو تو دیزداں ایک دریا ہے۔ ظلمت اس کا ساحل ہے۔ اب تک مجھ سا طوفان اس دریا میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ میرے سینے میں بے قرار لہریں ہیں۔ یہ لہریں ظلمت کے ساحل کو تاراج کئے بنا خاموش نہیں ہو سکتیں۔ تو بڑا سیانا بنتا ہے مگر یہ تیری خود غرضانہ سمجھ سے دور ہے کہ جو یزداں کی راہ میں چلتے ہیں۔ وہ کامیابی اور ناکامی مسرت اور غم کی حدوں سے پرے ہوتے ہیں۔ ان کی مسرت اُن کی تڑپ میں ہے۔

اہرمن ۔ اور اگر دنیا کے لوگ تمھارا استقبال آرہ اور صلیب سے کریں تو پھر بھی تم خوش ہو؟

زرتشت ۔ آرہ اور صلیب، دار و رسن، ان میں مجھے کیف ملتا ہے۔ میں انسان کی روح کی وہ تڑپ ہوں۔ جو قید و بند، مصائب و آلام میں سہمی رہتی۔ اور تھک ہار کر بھی منزل کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔

اہرمن ۔ تمھیں لوگوں کی بے اتفاقی کا ڈر بھی نہیں؛ جو آج کل کے زمانے میں اپنی بے اتفاقی سے اپنے پیغمبروں کو ناکام کرتے ہیں۔ انھیں قتل کرکے نہیں،

زرتشت ۔ جن کے سر میں سودا ہے وہ بے اتفاقی سے بھی نہیں ڈرتے۔ کوئی سنے یا نہ سنے وہ اپنی سی کہے جاتے ہیں۔ اور آخر کار سب کو سننا پڑتا ہے۔

اہرمن ۔ تو تم میری بات نہیں مانو گے؟

زرتشت ۔ اے اہرمن! مجھ پر تیرا جادو نہیں چلتا۔ میری دعا یہ ہے۔ اور اسی میں میری مسرت ہے۔

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد! جس کی کسک لازوال ہو

اقبال ۔ وہ اہرمن مایوس ہو کر چلا گیا۔

رومی ۔ یہ بار بار جاتا ہے مگر پھر لوٹ آتا ہے۔ حق کے پرستاروں کو ورغلانا ہی اس کا کام ہے۔ یہ کبھی دولت بن کر آتا ہے، کبھی شہرت، کبھی عورت، اور کبھی حکومت۔ اس سے جو بچ نکلے وہی حق کی راہ میں ثابت قدمی سے چل سکتا ہے۔

اقبال ۔ ادھر دیکھئے ایک اور بحث جاری ہے۔ یہ کون ہیں۔

رومی ۔ یہ جبریل امین اور ابلیس ہیں۔

اقبال ۔ ابلیس؟ وہ ابلیس ہے جس کے چہرے پہ اتنا جلال ہے۔ اور جس کی صورت اور ہیئت میں اتنی متانت اور ہیبت ہے؟ میں تو ابلیس کو بڑی گھناؤنی اور بھونڈی شکل کا عفریت سمجھا تھا۔

رومی ۔ یہ تمھاری بھول تھی۔ ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور گو وہ نافرمانی کا گنہگار ہے۔ مگر اس میں غیرت ہے۔ خود عنانی ہے۔

اقبال ۔ تو اے مرشد! ابلیس نے جو کچھ کیا اچھا کیا؟ آپ یہ فرماتے ہیں؟

رومی - نہیں، میں ابلیس کی تعریف تو نہیں کرتا۔ مگر بھیڑ کی
سی مسکینی اور بیکسی سے ابلیس کی غیرت اچھی - جس
بشر یا قوم میں غیرت نہیں، اور جو اطاعت کو اچھی
صفت سمجھتی ہے۔ اس میں بزدل پیدا ہوتے ہیں
برے غلام۔ ابلیس سے کچھ سیکھنا چاہیئے۔ مگر ابلیس
تنہا نہیں چاہیئے۔

اقبال - ہم ان کے پاس ہی آگئے ہیں۔ سنئے کیا کہہ رہے ہیں

جبریل - ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو
ابلیس - سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو
جبریل - ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو
ابلیس - آہ! اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں، ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا
جبریل - کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو؟
ابلیس - ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اقبال - ابلیس کے دل میں ایک جذبہ ہے جو متاثر کرتا ہے۔

رومی - یہ بارگاہ الٰہی سے باغی ہے۔ ورنہ خود اتنا برا نہیں۔

اقبال - مگر یہ انسان کو دھوکا دیتا اور گمراہ کرتا ہے۔

رومی - اس وقت یہ قابل حقارت ہوتا ہے۔ ایک جھوٹا
بن گیا۔ ایک سازش کرنے والا بہروپیا۔ مگر اس کی
سرگزشت دردناک ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرو۔

اقبال - یہ نغمے کی آواز آرہی ہے۔ یہ کون آرہا ہے۔ کیا
کیف اور سرور ہے۔

رومی - یہ زندہ روحوں کا نغمہ ہے۔ اس میں تمنا ہے شوق
ہے۔ دیکھو نسیم اسے ہمارے قریب تر لے آئی ہے سنو:

۵ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بیکنار کر

اقبال - واہ کیا تڑپ ہے۔ یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

رومی - بے پایاں جذبہ ہے، سنو،

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر
نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

اقبال - آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر۔ زندگی کیا
عمدہ موقع ہے۔ کچھ بننے کے لئے۔ کچھ کرنے کے لئے
مگر اسے کس حسرتناک طریق سے ضائع کیا جاتا ہے۔

رومی - زندگی میں اتمام نہیں، جو اس میں اتمام ڈھونڈتا ہے
وہ سراب کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اسی بلند مرتبہ تلاش
کا نام زندگی ہے۔ اس مقام کی تلاش جو کبھی نہ مل سکے
اس کی کھوج کا نام جینا ہے۔ جس دل میں اس کھوج
کا شوق نہیں وہ مُردہ ہے۔ جو آسان طلب ہے
اس کی منزل پست ہے۔ جس کی منزل بلند ہے اُس
کی منزل محال بھی ہے۔

اقبال - اے مرشدِ برحق! ہم نے اب تک ان نیک سیرت
روحوں کو دیکھا ہے۔ جنھوں نے باطن کو پاک کیا ہے
اور نفسانیت کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ مجھے
کچھ ایسی روحیں بھی دکھائیے۔ جنھوں نے ظاہری دنیا
میں جنگ لڑی ہو۔ جنھوں نے قوموں کی قسمتیں
جگائی ہوں۔ انسانوں کے درمیان ایک نئی روح
پیدا کی ہو۔ مجھے ایسے حضرات سے ملنے کی تمنا ہے۔

رومی - وہ دیکھو سامنے المانوی فلسفی نیطشے کا مقام ہے۔

اقبال - دیوانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ بکھرے بکھرے بال بیخود
اور لاابالی سا۔

رومی - اسے دیوانہ نہ سمجھو۔ یہ زندگی کے بھید سے واقف
ہے۔ اس نے بڑے بڑے بھرم کھولے ہیں۔ مُردہ
قوموں کو اس کے لفظوں سے زندگی ملی ہے۔ سوئی
ہوئی ملتوں کو اس نے جھنجھوڑ کر جگایا ہے۔

اقبال - پھر تو اس سے ضرور ملنا چاہیئے۔ یہ ہم سے
بات کرے گا؟

رومی - اگر جی میں آئے گی تو ضرور باتیں کرے گا اور بہت
شوق سے کرے گا۔

اقبال - اے ہادئ المان! اجازت ہو تو آپ سے دو
ایک سوال پوچھوں؟

نیطشے - کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ کون ہو تم؟ کس قوم سے
تعلق رکھتے ہو؟

اقبال - میں ہندی ہوں۔

نیطشے - ایک تن آسان قوم کا فرد۔

اقبال - اے فلسفیِ حیات! میری قوم کو اس دور میں کوئی
ایسا ہادی نہیں ملا جیسے آپ ہیں۔ کاش ہند میں بھی
ایک نیطشے پیدا ہوتا۔ جو ہمیں زندگی کی طرف لاتا۔

نیطشے - سن کہ جس قوم میں شاہین کی سی سخت کوشی نہیں
ہوتی۔ وہ مرجاتی ہے۔ جس کے مالدار حسن و نشاط میں
راتیں گزاریں اور مفلس بھوک سے سسکتے ہوئے
مرجائیں وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ قوم زندہ
رہتی ہے۔ جہد سے۔ ہمت سے۔ ترکِ عیش سے۔

اقبال - اے فلسفیِ المان! آپ کے الفاظ آبِ زر سے
لکھنے کے قابل ہیں تاکہ قوم کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام
دیں۔ کیا آپ کوئی پیغام دیں گے جو میں ہندوستان
کے نوجوانوں کے نام آپ کی طرف سے لے جا سکوں؟

نیطشے - سنو، نوجوانوں کو میری طرف سے کہنا ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

اقبال - کیا حیات افزا پیغام ہے۔ زندگی کا سرچشمہ۔

رومی - وہ دیکھو عقاب کی سی نظروں والا شخص، وہ
لینن ہے۔ دورِ حاضر کا ایک بڑا مفکر۔ اور زر سود نظام
کو درہم برہم کرنے والا۔

اقبال - یہی لینن ہے۔ جس نے روس میں خون کی ندیاں
بہادیں۔ جس نے مذہب سے انکار کیا۔ اس نے مذہب

سے کیوں انکار کیا؟

رومی۔ اس میں انسان کی برابری اور اخوت کا جذبہ تھا۔ جس پر مذہب کی تعلیم مبنی ہے۔ مگر اس کو جو فروش گندم نما لوگوں کی ریاکاری نے مذہب کی ظاہری نمود سے متنفر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کرنا چاہئیں یہ ہر بات کا جواب بڑی متانت سے دیتا ہے۔

اقبال۔ اے قائد اشتراک! مجھے آپ کے فلسفے کا احترام ہے۔ الارض للہ، زمین اللہ کی ہے۔ نہ میری نہ تیری اور نہ کسی اور کی۔ یہ آپ کا اور آپ کے رفیقوں کا پیغام ہے۔ مگر یہ تو فرمائیے۔ آپ نے مذہب سے کس لئے کنارہ کیا؟ راہب اور پاپا کی فریب کاری سے مذہب کی تعلیم کیونکر غلط ثابت ہوتی ہے؟

لینن۔ میں تمہیں اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا جو میں نے بارگاہ الٰہی میں دیا تھا۔ میری روح کو بعد از مرگ معلوم ہوا کہ جن باتوں کو میں کلیسا کی خرافات سمجھتا تھا وہ سچ ہیں تو میں نے دل سے کردگار سے عفو کی درخواست کی۔

اقبال۔ تو بارگاہ الٰہی سے آپ کو بخشش حاصل ہو گئی؟

لینن۔ بخشش اور عفو تو کردگار کے ہاتھ میں ہے۔ میں کم فہم انسان بارگاہ الٰہی کے بھیدوں کو کیونکر سمجھ سکتا ہوں۔ سنا ہے کہ اس کی بارگاہ میں مجھ جیسے منکر بار پا جاتے ہیں۔ مگر میں نے خدا کے حضور میں اپنے انکار کا ایک جواز پیش کیا تھا۔ بات گستاخی کی تھی۔ مگر میری بیباکی کو خود باری تعالےٰ نے سراہا۔ اور ملائکہ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

اقبال۔ کیا عرض کیا تھا آپ نے بارگاہ خداوندی میں؟

لینن۔ اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں ہماری مدنیت کے فتوحات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام
یہ غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اقبال۔ تو آپ کو اس کے بعد حضرت باری سے کیا جواب ملا؟

لینن۔ مجھ سے تو کچھ بھی نہیں فرمایا البتہ جو ملائک حضور میں تھے ان سے کہا یہ آداب سے واقف نہیں۔ اسی لئے اتنا بیباک ہے۔ مگر دل اس کا صاف ہے۔ میں نے جو اتنا سنا تو ایک عرضداشت اور کر ڈالی۔

یارب یہ جہان گزراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردان جفاکیش و ہنرمند
تو برگ گیا ہے نہ دہی اہل خرد را
او کشت گل و لالہ بہ بخشد بہ خرے چند

اقبال۔ اس پر کیا ہوا؟

لینن۔ میں ابھی اور کہنا چاہتا ہی تھا کہ اشارہ ہوا اور میں بارگاہ خداوندی سے پرے کروڑوں ستاروں کی دشت کے پار اس مقام پر آ پہنچا۔

اقبال۔ آپ دنیا کے متعلق پر امید ہیں یا نا امید؟ جہاں خونریز لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ انسان انسان کا دشمن ہے مالدار خود غرض اور مفلس بھوک سے تباہ حال ہیں۔

لینن۔
جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے!
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ
شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے، یہ جوئے خوں ہے،
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

گوربچن سنگھ طالب

ساس

نمک سالن میں اتنا تیز۔ توبہ
مزعفر "ڈالڈا" آمیز توبہ
بہو اور ساس۔ رستاخیز توبہ

کسے "مٹیوں" کسے "ڈالوں کٹاون"
کہاں غائب ہے "پن کٹی کی ہاون"
اری مُردار۔ یہ آنسوؤں کا ساون"

ڈراتی ہے مجھے جھڑیاں لگا کر
گرا دے چلنیں چڑیاں اُڑا کر
کہوں کب تک نہ چل کوٹھے ہلا کر

یہی اسکول میں سیکھا ہے تو نے
"بڑے بیباک مغرب کے نمونے"
پڑھایا ہے پڑوسن کی بہو نے

وہ حرّافہ کہ۔ اک دن۔ یاد آیا
"سینچر وار" کو اُلّو منگایا
پکا کر اپنے شوہر کو کھلایا

اِدھر کھایا اُدھر ماری گئی مَت
بدی پر جب اُتر آتی ہے جُرأت
برائے نام رہ جاتی ہے عورت

اُسی نے ... تجھکو بھی تعویذ گنڈے
ہوائی قلعوں کے بُرجوں پہ جھنڈے
مرے سر تھپی کھلا دو اُن کو انڈے

مگر میں نے کہا... اللہ... توبہ　　　وہ خود چلتے ہیں سیدھی راہ توبہ

ترا لگتا ہے "کلّو شاہ! توبہ

"ترا شوہر ہے اس بندی کا بیٹا　　　وہ کب کرتا تھا. بیں نے سر جپیٹا

بُرا ہوتا ہے "قسمت کا لپیٹا"

خدا سمجھے... یہ "ساری" کون جامہ　　　جو باندھے سا جدہ بن جائے "شاما"

لونڈر!.... چھوڑ کر عطرِ شمامہ

چھچھوندر کا سا بھپکا... مار ڈالا　　　یہ کس بھڑنے نے تھا پوڈر نکالا

نگاہوں کیلئے مکڑی کا جالا

مسلمانوں میں یہ "بندی کی ٹِکیا"　　　صدا دیتی نہیں شیطان کی مار

یہ "ہندو ماسٹرنی" سے جو ہے پیار

لئے پھرتی ہے بن شوہر کا بچّہ　　　گر "مِس صاحبہ" ہونے کا... غچّا

یہ "لے پالک" بُوا... "تُو جان سچّا"

نکے جاتی ہے مُنہ کچھ پھُوٹ مُنہ سے　　　نکالا چاہتی ہے کام "اونہہ" سے

دو ہتّڑ سر پہ دُوں سینے پہ "گھونسے"

شاد عارفی

ؔ قافیہ کی اس بدعت کو میں اپنی کمزوری سمجھتا ہوں۔

تصویر

وہ تصویر اُسے پسند تھی۔ ہر رات سونے سے قبل چارپائی کے سرہانے کی جانب دیوار پر لٹکے ہوئے اس سہ رنگے آئل پینٹ میں وہ ڈوب سا جاتا۔ مسلسل دیکھنے کی خاطر وہ چارپائی پر اس طور سے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتا گویا کسی خدائی امداد کیلئے عبادت کر رہا ہو۔ بعض اوقات تو یہ تسلسل یوں طول پکڑ لیتا کہ اس کی بیوی اکتا کر بڑبڑانا شروع کر دیتی اور چونکہ بڑبڑا چکنے کے بعد اپنی قسمت کو کوسنا اس کا معمول بن چکا تھا اس لئے یہ نوبت آنے سے پیشتر ہی وہ اس کے سوار بھانپ کر لمبے دلی سے جماہیاں لیتا ہوا چارپائی پر لیٹ جاتا۔

یوں اس تصویر میں کوئی ایسا عنصر نہ تھا جسے خاوند کے یوں دیکھنے پر بیوی کے وقار کی تذلیل ہوتی یا وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتی۔ مگر یہ بات اس کی قوت برداشت سے باہر تھی کہ آنکھوں کے سامنے اس کا خاوند دنیاداری کی باتوں کو تلاطلی دیکر یوں سمادھی لگائے بیٹھا رہے۔ صحت گر جانے، صبح جلد نہ اٹھنے، دفتر جانے میں دیر ہو جانے وغیرہ کئی بہلنے تراشتی، ادھر اُدھر دنیا جہان کے خاوندوں کی نیک خصلتوں کا تذکرہ کرتی۔ اس بُری گھڑی کو کوستی جب وہ تصویر گھر میں لائی گئی ہو گی اور ہر حربے کے ناکام ہونے پر جونہی اپنے بُرے نصیبوں پر ٹسوئے بہانے کو تیار ہوتی وہ جماہیاں لینی شروع کر دیتا۔ پچھلے چند دنوں سے تو اُسے ایک نئی چال بھی سوجھ گئی تھی۔ خواہ مخواہ سردردی سے نجات کی خاطر وہ اٹھ کر لیمپ ہی بجھا دیتی۔

بیٹے کو اس تصویر کی طرف اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اکثر اس کی ماں حسب معمول ایک گہرے سانس کے ساتھ کہنا شروع کر دیتی ——" تمہارے پتاجی کی یہ نشانی ان دنوں کی یادگار ہے۔ جب ہم پر بُرے دن آئے تھے اور وہ دن تو ایک خدائی قہر ہی تھا۔ گھر میں تنکا تک توڑ کر منہ میں ڈال لینے کی سبیل نہ تھی کہ گھر والا اس بیکار سی شے پر اپنی جیبیں جھاڑ آیا۔

" بیکار سی شے " اور وہ سوچنے لگتا۔ خدانخواستہ اگر اس کے والد مرحوم کل کنبے کی بھوک پر اس بیکار سی شے کو ترجیح نہ دیتے تو ورثہ میں سونپی ہوئی ان کی دوسری نعمتیں ہرگز ہرگز ان کی توجہ کا مرکز نہ بن پاتیں۔ یہ فات برادریوں کے جھمیلے چھوٹی بڑی ناک، ماں، بہن، بہو، ان کے خالی پیٹ، ان کے رلانے ہنسانے کی ذمہ داری —— زندگی میں زندگی کے لئے لمحاتی سکون وقتی راحت کس قدر لازم ہے۔ صرف ایک ثانیہ کہ انسان کل غموں کو پچھاڑ کر کسی فانی یا غیر فانی شے میں کھو سکے۔

ہر رات اس تصویر کو دیکھ چکنے کے بعد وہ اپنے آپ میں ایک غیر معمولی ردعمل محسوس کرتا۔ دن بھر کی سرتوڑ مشقت، افسروں کی گھرکیاں، بیوی کی تنگی کی حالت، چالیس روپے میں ماں کے سیکڑوں جوڑ توڑ، منہ آتی ہوئی بہن، ان جھنجھنوں سے پیدا شدہ ذہنی پریشانیاں —— وہ ہر الم کو بھول جاتا۔ آنے والا کل صدہا مسرتوں اور راحتوں کا پیغام لئے اسے اپنا خیر مقدم کرتا ہوا دکھائی دینے لگتا۔ اس میں ایک نئی زندگی، نئی طاقت بھر جاتی۔ ماضی، حال اور مستقبل اسے اپنے ہاتھوں گھڑے ہوئے گیلی مٹی کے کھلونے سے معلوم ہوتے جنہیں جس وقت اور جس طرح چاہے توڑ مروڑ کر نیا بنا سکتا تھا۔ اس وقت اسے احساس

۷۔۱۰ھ مطابق ۱۶۶۲ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یہ بیان بھی درست نہیں۔ برہمن کے مذکورہ بالا مکتوب کی شہادت کافی ہے اورنگ زیب کو تخت نشینی کے چھٹے سال بھیجا گیا اور یہ زمانہ ۷۵۔۱۰ھ مطابق ۱۶۶۴ء کا تھا۔

برہمن نہایت وسیع المشرب اور بلند اخلاق انسان تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُسے شاہجہاں، دارا شکوہ اور دوسرے اعیان سلطنت کا کامل اعتماد حاصل تھا۔ اسے پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کی نگارشات کا غائر مطالعہ از بس ضروری ہے۔ وہ اسلامی تہذیب و ثقافت سے غایت درجہ متاثر ہوا تھا۔ گو اپنی تحریروں میں اس نے اپنے ہندوانہ رجحانات کی بیش از بیش نمائندگی کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے ایک شعر میں یوں کہتا ہے ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار ‏ ‏ بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

کہا جاتا ہے[1] کہ برہمن نے جب اپنے اس شعر کو دربار میں پڑھا تو شاہجہاں ناراض ہو گیا۔ مگر اسی وقت برہمن کے سرپرست افضل خاں نے از راہ تفریح سعدی کا یہ مشہور شعر پڑھ دیا ؎

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود ‏ ‏ چوں بیاید ہنوز خر باشد

شہنشاہ اس تفریح پر مسکرا دیا۔

برہمن ایک نہایت راسخ الاعتقاد ہندو تھا۔ اور اس کے دل میں اپنے زنار کی بڑی توقیر و تکریم تھی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

مرا برشتۂ زنار الفتے خاص است ‏ ‏ کہ یادگار من از برہمن ہمی دارم

اس لئے "اعمال صالح" کے مصنف کی یہ رائے کہ "وہ بظاہر ہندو تھا۔ مگر درحقیقت وہ اسلام پر ایمان لا چکا تھا"[2] قابل اعتنا نہیں۔ تاہم یہ سچ ہے کہ اسلام کا علمی فلسفہ اس پر بڑی حد تک اثر انداز ہوا تھا گو اپنے مذہب سے اس کی وابستگی و ارادت میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ وہ صوفیانہ مشرب کی طرف بہت مائل تھا۔ اس کے مکتوبات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اپنے لڑکے بھائی اور باپ سے بے حد محبت تھی۔ وہ اپنے خطوط میں اپنے باپ اور اپنے سرپرست عاقل خاں کا تذکرہ نہایت احترام سے کرتا ہے۔ اس نے اپنے ایک خط میں اپنے عقیدہ کا ذکر خود ان الفاظ میں کیا ہے۔

"این برہمن وفاکیش بہ آشنا و بیگانہ و دوست و دشمن طرح مدارا انداختہ، عالم کثرت را بچشم وحدت شاہد نمودہ وغیرے را درمیان ندیدہ و غیر از حق ندانستہ۔"

یہ ایک نہایت بلند مطمح نظر تھا۔ اور برہمن کو اطمینان تھا کہ اُس نے اس کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔

فارسی نظم و نثر کا برہمن وہ پہلا ہندو فنکار ہے۔ جس کے کارنامے بے کم و کاست ہم تک پہنچے ہیں۔ محمد افضل سرخوش[3] نے اس کی طباعی و گیرائی کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں۔

"طبع درست داشت، شعر بطور قدماشستہ و صاف می گفت و سلیقہ انشاپردازی نیز داشت۔"

فارسی کے بلند پایہ ادیب منیر لاہوری نے برہمن کو اپنے ایک مکتوب خاص میں یہ الفاظ تحریر کئے تھے۔ اور غایت عقیدت و تحسین کے اظہار کے لئے ان سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے۔

"حرفے از مدح و اوصاف آں چشم و چراغ آفرینش، سرلوح کتاب دانش و بینش، اشرف دودمان حشمت و اقبال،

---

[1] کلمۃ الشعراء ص۱ ‏ [2] ہر چند بصورت ہندو است لیکن دم در اسلام زند ‏ [3] کلمۃ الشعراء ص۱

مطلع دیباچہ دولت وجلال، خط جبین فصاحت، نقش نگین بلاغت، سحبان العصر، حسان الزماں، ملک الشعرا، چندربھان نثر اں رقم زدا امنیر سادہ لوح را خیال آں است کہ باوجود پریشانی حواس وشوریدگی دماغ و آشفتگی اوضاع ونارسائی طبیعت دکوتہی فطرت داستان بے پایاں ثنائے آں حلقہ ارباب معنی رادرمنیر عبارت بہ تحریر آرد۔

مذکور بالا خط مکتوبات منیر کے نستعلیق ایڈیشن میں نہیں ملتا۔ لیکن لچھمی نرائن شفیق نے اپنی گل رعنا[۱] میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ منیر کسی کی مدح وستائش میں کبھی مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ "نشتر عشق"[۲] کا مصنف رقم طراز ہے کہ ایک مرتبہ برہمن نے اپنے دیوان کی متعدد جلدیں نہایت خوشخط لکھوائیں اور ہر صفحہ کو نقش ونگار سے مزین کرایا اور ان مخصوص جلدوں کو بعض ایرانی شعرا کی خدمت میں روانہ کیا کہ وہ انتخاب اشعار سے اسے ممنون احسان کریں۔ شعرائے فارسی نے منقش اور خوبصورت جلدوں کے بعض قیمتی حصوں کو دیوان سے الگ کرلیا اور بچی کھچی جلدوں کو برہمن کے پاس خاص ایرانی طنز واستہزا کے ساتھ واپس کردیا "تمھارا تحفہ بے نیل مرام واپس کیا جاتا ہے"۔ پتہ نہیں صاحب نشتر عشق نے اس واقعہ کا اندراج کس بنا پر کیا ہے مجھے یہ روایت بالکل لغو معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ برہمن نے خود اپنے ایک مراسلے[۳] میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"رقایم و نوشتہ جات ایں نیاز مند در ایران و توران شہرت یافتہ"

صائب نے جو فارسی زبان کے سب سے بڑے شعرا میں شمار ہوتا ہے اپنے ذاتی گلدستۂ اشعار میں برہمن کے شعر نقل کئے ہیں۔ یہ سب سے بڑا خراج تحسین ہے جو صائب سا شاعر کسی شاعر کو ادا کر سکتا ہے۔

برہمن اپنے مکتوبات[۴] میں سات دواوین کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً (۱) دیوان، جو غزلیات ومثنویات پر مشتمل ہے (۲) گلدستہ (۳) چہار چمن (۴) تحفۃ الانوار (۵) کارنامہ (۶) تحفۃ الفصحا اور (۷) مجموعۃ الفقراء

بانکی پور کے ذخیرے میں "سوال وجواب لال داس ودارا شکوہ" کی دو جلدیں موجود ہیں۔ اس کتاب کو چرنجی لال نے مدون ومرتب کیا ہے اور وہ ۱۸۸۵ء میں دہلی سے طبع ہو کر شائع ہوئی ہے۔ اس میں بابا لال داس اور دارا شکوہ کے مابین ہندو فقرا پر جو گفتگو ہوئی تھی، مکالمے کی صورت میں درج ہے۔ شروع میں مکالمے ہندی میں لکھے گئے تھے جن کو برہمن نے فارسی میں منتقل کیا اگرچہ مکالمے مذہبی مسائل سے متعلق ہیں مگر برہمن نے ان کا ترجمہ نہایت حسن وخوبی اور کامیابی سے کیا ہے۔

برہمن کی شہرت وعظمت تین کارناموں کی رہین منت ہے۔ (۱) چہار چمن (۲) مکتوبات اور (۳) دیوان برہمن لچھمی نرائن شفیق نے لکھا ہے کہ اس کے زمانے میں برہمن کے مکتوبات اور "چہار چمن" ادب فارسی کے اعلیٰ نصاب میں داخل تھے[۵]۔ برہمن کے کارناموں کو اگر ذرا وضاحت وتفصیل سے بیان کیا جائے تو غالباً از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۱) چہار چمن:- یہ ۱۰۵۷ھ کے فوراً بعد کی تصنیف ہے۔ یہ چار چمنوں پر مشتمل ہے۔ پہلے چمن میں مختلف درباری تقریبوں کا ذکر ہے اور اس میں وہ اشعار درج ہیں جنھیں مصنف نے ان موقعوں پر پڑھا تھا۔ دوسرے چمن میں دربار کی شان وشوکت شاہجہاں کی روزمرہ کی مصروفیات نئے پایہ تخت شاہجہان آباد اور سلطنت کے خاص خاص قصبات وامصار کا بیان ہے تیسرا چمن مصنف کے حالات زندگی اور اس کے چند خطوط پر محیط ہے۔ چوتھا چمن اخلاقی ومذہبی موضوعات سے بحث کرتا ہے۔

(۲) مکتوبات برہمن:- یہ برہمن کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو اس نے وقتاً فوقتاً بادشاہوں، شہزادوں، درباریوں

---

[۱] گل رعنا ص ۲۶۲ [۲] نشتر عشق ص ۳۰۸ [۳] مکتوبات برہمن ص ۱۲ [۵] گل رعنا ص ۲۶۲

مطبُوعات

لاجونتی از ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر۔ مرزا غالب کے شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسے ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر ہندوستان کے ان سائنس دانوں میں سے ہیں جن کا نام یورپ اور امریکہ تک میں سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اور اگرچہ ادب اور سائنس کی حدود میں نمایاں طور پر حد فاصل موجود ہے لیکن یہ ادب اُردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک سائنس دان ایسا بھی ملا ہے جس نے سائنس کی راہ پر چل کر اپنی زبان کی بے بضاعتی یا کم مائگی کا ڈھنڈورہ پیٹنے کی بجائے اس کا دامن اپنی تخلیقات سے بھر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب دیباچے میں فرماتے ہیں —— "میری تمام زندگی علم کیمیا کی تلاش میں گزری ہے۔ یہ امر اتفاقیہ ہے کہ مجھے اپنی زبان میں شعر سننے اور کہنے کا چسکا ہے" ... یہ امر اتفاقیہ ان کی دبی ہوئی خواہش کا وہ پہلو ہے جو دنیا کے بعض نمائندہ ادیبوں کی تعمیر کا ذمہ دار ہے۔ لاجونتی کے مطالعہ سے ڈاکٹر صاحب کے نقطہ ہائے نظر کا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مایہ ناز سائنس دان عالی ظرف ہے۔ وسعتِ خیال اور تلبِ نظر کا حامل ہے اور سیاسی اور سماجی ماحول کے سلسلے میں اتحاد و اتفاق کا خواہاں ہے۔ ؎

مزا تو جب ہے کہ ہندو کہے مسلماں سے   بغیر آپ کے ہندوستان کیا معنی؟

تلبِ نظر کے سلسلے میں ان کے وہ جذبات جو انھوں نے لیڈی بھٹناگر کی وفات پر پیش کئے ہیں بہت قابل قدر ہیں اور اُن کے دلی خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

میں جاگتا ہوں کہ شاید کہیں سے آجاؤ   یہیں پہ کھوئی گئی تھیں یہیں سے آجاؤ
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں گوشہ گوشہ میں   نہیں زمیں پہ تو عرش بریں سے آجاؤ
سپردِ خاک اگر ہوگئیں تو کیا پروا   بشکلِ لالہ و گل ہی زمیں سے آجاؤ
شرابِ نیست کے گرداب سے نکلنے کو   دہن پہ میرے لبِ ساتگیں سے آجاؤ

یہ اور اسی نوعیت کی دوسری نظمیں ڈاکٹر صاحب کے اس رنگِ تغزل کی غماز ہیں جس کے نمونے اس مجموعے میں کہیں کہیں۔ بعض نظموں میں سیاسی عقاید پر لطیف تبصرہ ہے۔ امتیاز رنگ و نسل کے سلسلے میں بعض نظمیں خوب ہیں۔ کتابت خاصی لیکن طباعت ناقص۔ جلد بندی اور کاغذ بہترین۔ کتاب سر تیج بہادر، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے تعارفات سے مزین ہے۔ قیمت درج نہیں، پتہ:۔ آنند سروپ بھٹناگر ۲۵ تغلق روڈ، نئی دہلی،

(۲) Pakistan & Constitute Assembly از افتخار الحق ہندوستان کی سیاسیات نے وزرا کے مشن کی آمد پر ایک زبردست کروٹ لی ہے۔ اب تک ان تجاویز پر غور کیا جا رہا ہے جو اس مشن نے پیش کی ہیں۔ لیکن ان کو قبول کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہندوستان کے وہ عوام جن کی قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا ہے یہ جانیں کہ اب تک ان کی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد کا نقطۂ نگاہ کیا تھا اور اب انھیں کیا مل رہا ہے؟

زیر نظر تصنیف میں مسلم لیگ کے نظریہ پاکستان کی اہمیت اور تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس فیصلہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ مشن کی سفارشات کس حد تک قابل قبول ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے سلسلے میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ مقدمہ نواب افتخار حسین خاں صاحب والی ممدوٹ ایم۔ ایل۔ اے۔ صدر پنجاب مسلم لیگ نے لکھا ہے۔ ضخامت ۱۵۶ صفحات مجلد قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ پتہ:۔ ینگ میں پبلشنگ بیورو۔ ۴۲ لارنس روڈ لاہور

(۳) Othman از خورشید احمد انور۔ مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اسلامیات کا دخل بہت کم ہے ہماری اعلیٰ سوسائٹی میں انگریزی کی تعلیم عام ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین کے حالات کا علم شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ خورشید احمد انور صاحب نے پیغمبر اسلام سے لیکر اتاترک تک کے تمام اکابرین ملت اور بزرگان دین کے سوانح حیات پیش کئے ہیں۔ جن میں سے آنحضرت، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان غنی اور حضرت عمر فاروق پر سو سو صفحات کے کتابچے ہمارے سامنے ہیں۔ مصنف کی یہ کاوشیں قابل قدر ہیں اور ہم ان کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ کسی کتاب کی قیمت ایک روپیہ سے زیادہ نہیں۔

پتہ:۔ ینگ میں پبلشنگ بیورو ۴۲۔ لارنس روڈ۔ لاہور

اور بانسری بجتی رہی۔ از دیوندر ستیارتھی۔ 'ہمایوں' کے قارئین کے لئے اس مصنف کا نام نیا نہیں، ۱۹۳۹ء سے اب تک اُن کی زندگی کے بیشتر رُخ ہمایوں کی وساطت سے نمایاں ہوئے اس لئے یہ کہنا کہ اس مصنف کا انداز بیان ایسا ہے کہ اس میں خلوص کے ساتھ طنز، شیرینی، اور لطافت پائی جاتی ہے کچھ زیادتی سی معلوم ہوگی۔ مقدمے میں پروفیسر کنھیا لال کپور نے ایک افسانے کے متعلق کہا ہے۔ وہ ہمارے خیال میں تمام افسانوں پر حاوی ہے۔ "یہ ان افسانوں میں سے ہے، جن کی عظمت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جن کا تجزیہ کرنا اتنا ہی مشکل اور شاید اتنا ہی احمقانہ ہے جتنا پھول کی رنگت اور خوشبو پر ——" اور آخری جملہ —— "ستیارتھی کا فن اس کی شخصیت سے بھی زیادہ دلآویز اور دلپذیر ہے۔"

مجموعہ نہایت آب و تاب سے شایع ہوا ہے اور بارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات قیمت تین روپے۔ ناشر:۔ انڈین اکیڈیمی۔ لاہور

سید نذیر حسین بخاری پرنٹر و پبلشر نے کمرشل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۴۲ لارنس روڈ لاہور سے شایع کیا

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۳۶۲

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲ - علمی وادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں ۔ مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ۔

۳ - دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۴ - جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے ۔ بصورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ۔

۵ - "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے ۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتاً مِل سکتا ہے ۔

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے ۔ بصورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک)، قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۔

مینیجر "ہمایوں"

۳۶ - لارنس روڈ - لاہور

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(حالی)

بیادگار علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

اگست ۴۶ء

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔
جائنٹ ایڈیٹر: یوسف ظفر بی۔ اے

جلد ۵۰

نمبر ۲

فہرست مضامین

ہمایوں۔ بابت ماہ اگست ۱۹۴۶ء

فی پرچہ	ششماہی	الانہ
۸ر	۳ر	

جہاں نما

ہندوستانی بچّوں کی تعلیم

پروفیسر برٹرینڈ رسل (Prof: Bertrand Russell) اپنے تازہ ترین مضمون "شاہراہ عظمت" میں لکھتے ہیں۔ "میں لبا اوقات سوچتا ہوں کہ ایسے لوگ عظیم المرتبت مقامات حاصل کرتے ہیں جو بچپن میں تنہائی یا عدم توجہی کا شکار رہے ہوں اور وہ لوگ جنھیں اوائل عمر میں ہر قسم کی آسائش اور ترجیح حاصل رہی ان تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ سوچ کسی قاعدے یا کلیئے پر مبنی نہیں تاہم بھیڑ چال یا اسی قسم کی عادات اور خصلتیں ان بچّوں کے لئے بیحد نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں جن میں کچھ کر گزرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے دائرے میں "بڑے لوگوں" کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اسے اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت یوں کرنی چاہیئے کہ وہ اپنی انفرادی فہم و فراست سے کام لے سکیں۔ ایسے بچے جن کی عقل و دانش اپنے سماجی ماحول کی بازگشت پر منحصر ہوتی ہے کبھی اس ماحول سے بلند نہیں ہو سکتے۔ اوائل عمری میں ایک حد تک آزاد نظری جو بغاوت کے مترادف نہ ہو، بیحد مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ بچے جن میں یہ خصوصیت ہے یقیناً بڑے لوگ بننے والے ہیں۔ اور وہ جو اس سے عاری ہیں کسی عالم میں بھی اس مقام کو نہیں پا سکتے۔ تنظیم کے اس دَور میں یہ قاعدہ ہر معلم کے پیش نظر رہنا چاہیئے اور ہمیں کسی ایسی تعلیم سے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے جو اوسط درجے کے انسان پیدا کرتی ہے۔ یہ اوسط بے داغ ہی کیوں نہ ہو۔"

پروفیسر رسل کے اس ارشاد کے بعد ہم اپنے تعلیمی اداروں میں بچّوں کی کیفیت پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے بچّوں کی تعلیمی حالت اس قدر ناقص ہے کہ اسے ایک فوری تغیّر کی ضرورت ہے۔ تمام تر طریق تعلیم اس لئے بھی ناقص ہے کہ وہ ہمارے بچّوں پر ایسی باتیں ٹھونستا ہے جو ان کی دلچسپی یا افادیت کا باعث نہیں بنتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ننھا سا دماغ غیر ضروری بار اٹھا کر لڑکھڑانے لگتا ہے۔ وہ سکول کی غیر دلچسپ دنیا میں اپنے وجود کو مجبور و مظلوم قرار دیتا ہے۔ اور علوم اصلی کے اکتساب کی تگ و دو شروع ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ سکول کی چار دیواری اس کے لئے جیل خانہ بن جاتی ہے۔ یہ احساس بچوں کے نازک اذہان کے لئے بہت تلخ ثابت ہوتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سکول سے گھسٹ گھسٹ کر باہر نکلتے ہیں اور بالآخر کسی ایسے دفتر کے کلرک بن کر زندگی کے دن کاٹ دیتے ہیں جو اسی سکول کا نعم البدل ہوتا ہے نفسیاتی اعتبار سے ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ یہی بچّے سکول کی تلخ یادوں کی بدولت بڑے ہو کر ایک طرف انسانیت کش، مجرم، قاتل، اور اذیت پسند بن جاتے ہیں، یا دوسری طرف زندگی کی تمام کیفیتوں سے دست بردار ہو کر یہی کہتے نظر آتے ہیں ؏

کہ بر من و تو درِ اختیار نکشاد است

اس کیفیت کی ذمہ[illegible] کئی باتوں پر عاید ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے بچّوں کو غیر ملکی زبانیں سیکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اکتساب خالص ذاتی ہو اور بچپن کا دور ختم ہونے کے بعد اس کے اپنے انتخاب پر مبنی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اس لڑکپن میں جب بچے کو کسی نیکی بدی کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ غیر ملکی زبانوں کی تعلیم

اس کے ذہن پر بہت زیادہ بوجھ ڈال دیتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ زبان جس کا حصول لازمی قرار دیا گیا ہے اس پر کیوں لادی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بہت جلد محکومی اور اس کے لوازمات کا احساس ہونے لگتا ہے۔ غیر ملکی لوگوں کا ہوا اس کے معصوم دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ انہیں لوگوں کی نقل اتارتا ہے۔ بس، انداز گفتگو، لب ولہجہ کھیل کود، ہر بات میں اسے غیر ملکی تمدن پسندیدہ نظر آنے لگتا ہے اور اس کی انفرادیت کا دیا جھلملانے لگتا ہے۔ ایک غیر ملکی زبان کے حصول کا دوسرا خسارہ ملکی زبانوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہی بچے جب عالم شباب میں پہنچتے ہیں تو انہیں اپنی زبانیں حقیر و بے مایہ نظر آتی ہیں، اور وہ انہیں اپنانے کی بجائے پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے ادب، ہماری تہذیب اور ہماری زبانوں کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

اس داخلی پہلو کے بعد ہم خارجی پہلو پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے یہاں کی ابتدائی تعلیم ان اساتذہ کے ہاتھوں میں ہے جو محض حروف ابجد یا ہندسے یاد کرانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہ اساتذہ ڈانٹ ڈپٹ، گالی گلوچ، اور چھڑی تک کے استعمال سے پرہیز نہیں کرتے۔ چنانچہ نوعمر بچے ان سے ڈرنے لگتے ہیں۔ چھٹی کے دن کو غنیمت جانتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کو مفلوج کرنے میں جس قدر ہاتھ ان کم علم اساتذہ کا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ چاہیئے تو یوں تھا کہ ابتدائی تعلیم کسی ماہر نفسیات، ہنس مکھ، خوش رو اور خوش پوشاک استاد کے ہاتھ میں ہوتی کہ بچے اسے پیار کرنے لگتے۔ اس کے اشاروں پر کام کرتے، گھر سے زیادہ سکول کو عزیز رکھتے۔ لیکن جہاں طوطے کی طرح رٹنا ہی انتہائے کمال سمجھا جاتا ہو وہاں کے بچوں کے لئے ایسے استاد کہاں سے آئیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں ان اساتذہ کو سب سے زیادہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ پندرہ بیس روپیہ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ناجائز طریقے استعمال کرنے لگتے ہیں اور بھیک مانگنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اساتذہ جو نمونہ بچوں کے سامنے پیش کریں گے وہ اسی کے مطابق گامزن ہوں گے۔

بچے کا ذہنی امتحان ہر استاد کا سب سے بڑا فرض ہے۔ اس کو دیکھنا چاہیئے کہ فلاں بچہ اس عمر میں ذہنی طور پر کس مقام پر ہے۔ اس کی ترقی کیوں رک گئی ہے؟ اور اگر وہ بچے کے غلط رجحانات کا ازالہ کرے تو کیسے کرے؟ لیکن ہمارے سکولوں کے اساتذہ یہی جانتے ہیں کہ ان کے زیادہ سے زیادہ لڑکے امتحان میں پاس ہوں۔ ایک طالب علم کی سولہ سالہ زندگی میں بمشکل ایک شفیق استاد ہوتا ہے۔ جس کی یاد وہ عمر بھر لئے رہتا ہے۔ ورنہ بیشتر اساتذہ کی گالیاں اور ماریں ہی اس کی یادداشت پر مرقوم رہتی ہیں۔

ابتدائی تعلیم سے ذرا آگے بڑھیں تو آپ کو پڑھتے ہوئے مضامین کی فہرست نظر آئے گی۔ جن کی افادیت پر بہت کم ماہران تعلیم متفق ہوں گے۔ بچے پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ استاد کی بتائی ہوئی باتوں کو چبا چبا کر حفظ کرے۔ اسی میں اس کی نجات ہے۔ ان مضامین میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں بچے کو فطری طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ انہیں پڑھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن نفرت حائل ہو کر اسے نالائق کا لقب دیتی ہے اور وہ اپنے ہم جماعت طلبا کے سامنے سر جھکائے مار کھاتا رہتا ہے۔ بیشمار بچوں کی فطانت اسی کی نذر ہو جاتی ہے۔ اور وہ سکول کی حدود سے باہر نکل کر اپنے ماحول کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ سکول میں دوسرا ضروری عنصر گھریلو ماحول ہے جس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ بچوں کو اپنے استاد کے پاس جانے میں کسی قسم کا کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیئے۔ یہی ڈر انہیں جھوٹ بولنے پر مجبور کرتا ہے۔ سکول میں رہ کر بچے صفائی کا درس نہیں لے سکتے۔ اس لئے کہ یہاں کی دیواریں انسپکٹر کی آمد ہی سے چمک سکتی ہیں۔ بچے کے

ذہن میں ڈر کا ایک ایسا سلسلہ چھڑ جاتا ہے جو اس کی اپنی کم مائگی کے احساس پر ختم ہوتا ہے۔ یہاں جس زندگی کا شعور ہونا چاہیئے وہ قریب سے نہیں پھٹکنے پاتا۔ طلبہ سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ وہ سلیقے سے اٹھنا بیٹھنا سیکھیں۔ سکولوں کے باغیچے بچوں کی آماجگاہ بن سکتے ہیں۔ یہیں ان کا معیارِ حسن تراشا جاسکتا ہے۔ لیکن خدا کی اس نعمت غیر مترقبہ سے بھی بچوں کو دُور رکھا جاتا ہے۔ انھیں باغبانی کا شوق دلا کر ہم ان کے گھروں میں پھلواریاں لگوا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی نوبت ابھی تک نہیں آئی۔

اساتذہ اور تلامذہ کو قریب تر کرنے کے لئے سیر و سیاحت ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف بچے استادوں سے مانوس ہوسکتے ہیں بلکہ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں۔

ہندوستان ایک غریب ملک ہے۔ یہاں کے عوام جاہل ہیں۔ تعلیم بیحد ناقص ہے۔ ایسی حالت میں یہاں کے تعلیمی اداروں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کریں۔ بچے مستقبل کی قوم ہیں۔ آج ان معصوم چہروں کی نظریں ان کے افسروں پر لگی ہوئی ہیں۔ کل انہیں بچوں کو خود گامزن ہونا ہے۔ اس لئے قوم کی اس امانت کو زیادہ سے زیادہ حفاظت سے رکھنا ان کا فرض اوّلیں ہے۔ ان کی بہبود کے لئے محض درسی علم بہم پہنچانا بہت ناکافی ہے اور اس کی تلافی انھیں خود کرنی چاہیئے۔

ہمایوں کا جوبلی نمبر

جون کی بزمِ ہمایوں میں ہم 'جوبلی نمبر' کا اعلان کرچکے ہیں۔ آئندہ یکم جنوری کو ہمایوں کی پچیس سالہ جوبلی منائی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں ہم گزشتہ پچیس سالہ ادب پر ملک کے مشاہیر اہلِ قلم کو دعوت دے رہے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس دور ادب کے ہر شعبے پر مستند حضرات سے مضامین لکھوائے جائیں۔ اگر ہمارا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہُوا تو ہمیں یقین ہے کہ کل کے تاریخ نگار کو اس مواد سے بیش بہا فائدہ ہوگا۔ مستقبل کا ادب اس جائزے پر اپنا محل تعمیر کرے گا۔ اور اس نمبر کو اُردو ادب میں ایک یادگار مقام حاصل ہوگا۔

ہم اپنے ان اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں التماس کرتے ہیں جن تک ہماری ذاتی رسائی نہیں کہ وہ اس اعلان کو ہمارا دعوت نامہ تصوّر فرماتے ہوئے اور کسی تکلف کو کام میں لائے بغیر اس کارِ نمایاں کی تکمیل میں ہماری اعانت کریں۔

یوسف ظفر

خواتین کی ناول اور افسانہ نگاری

یوں تو اُردو زبان میں قدیم زمانہ سے نظم اور نثر میں افسانے لکھے جاتے رہے ہیں اور اس قسم کا جو قدیم ذخیرہ اب تک دستیاب ہوا ہے وہ کسی دُوسری زبان کے ادبیات سے کم نہیں ہے۔ لیکن ناول کی ابتدا مغربی اثر کے بعد ہوئی ہے۔ مولانا نذیر احمد کو اُردو ناول نگاری کا پہلا شخص قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کے بعد کئی شخصوں نے ناول نگاری میں نام آوری حاصل کی ہے۔

افسانہ اور ناول ایک فوٹو یا آئینہ ہوتا ہے۔ جس سے زمانہ گزشتہ کے حالات اور موجودہ زمانہ کے واقعات اصلی رنگ و روغن میں نظر آتے ہیں۔ ناول میں پلاٹ (خاکہ) اور کردار اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ واقعات کے انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب سے پلاٹ (خاکہ) بنتا ہے۔ اس میں حرکت، روانی اور جوش پایا جانا چاہیئے ورنہ خاکہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ خاکہ کی طرح کردار نگاری ہے۔ جن اشخاص کا اس میں تذکرہ ہوتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل اس طرح ہونی چاہیئے کہ وہ انسانوں کی طرح چلتے پھرتے۔ کام کرتے۔ بولتے زندہ معلوم ہوں۔ ایک تیسری چیز یہ ہے کہ قصے کے اشخاص کا تعلق جس زمانہ اور جس مقام سے ہو اس زمانہ اور مقام کے رسم و رواج، تمدن و تہذیب کا پورا حال اس ناول سے معلوم ہونا چاہیئے۔ جب تک اس کا لحاظ نہ ہو کوئی ناول مکمل نہیں ہو سکتا۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول یا افسانہ میں جو قصہ بیان کیا جاتا ہے وہ ہر طرح اصل معلوم ہونا چاہیئے۔ اس کا کوئی پہلو خلافِ عقل نہ ہو۔

ان امور کو پیش نظر رکھ کر جب ہم خواتین کی ناولوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ناکامی نہیں ہوتی اور کئی ناول اس معیار پر پورے آتے ہیں۔ سب سے پہلے جو ناول پیش کئے جا سکتے ہیں وہ طیبہ بیگم بلگرامی مرحومہ کے "انوری بیگم" اور "حشمت آرا" ہیں۔ یہ دونوں ناول اصلاح معاشرت کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان میں آج سے چالیس پچاس سال پہلے کے حیدر آباد کے تمدن و تہذیب کی سچی اور اصلی تصویر کھینچی گئی ہے۔ حقوق نسواں۔ تعلیم نسواں۔ پردے کے توہمات اور تعصبات۔ رسم و رواج۔ روزمرّہ کے کام کاج۔ بیکاری اور فرصت کے مشاغل وغیرہ امور کو بہت دلچسپ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

قدیم ناولوں میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کے ناول "سرگزشت ہاجرہ" اور "موہنی" بھی قابل تذکرہ ہیں جو ایک سے زیادہ مرتبہ طبع ہوئے ہیں۔ بہار کی ایک خاتون خدیجۃ الکبریٰ بیگم نے "اصلاح النسا" کے نام سے ایک ناول لکھا تھا یہ ناول بھی اصلاح سماج سے متعلق ہے۔

عباسی بیگم مرحومہ کا ناول "زہرہ بیگم" بھی خصوصیت سے قابل ستائش ہے۔

عصر حاضر میں کئی خواتین نے ناول لکھے ہیں۔ ان میں سے "شوکت آرا بیگم" مصنفہ والدہ عبدالرؤف عباس۔ "ثروت آرا بیگم" مصنفہ حمیدہ سلطانہ "ظالم محبت" مصنفہ حجاب امتیاز علی "ماہ درخشاں" مصنفہ بیگم مرزا احمد علی "شمع اور تصویر" مصنفہ آر۔ خاتون صاحبہ "ضدی" مصنفہ عصمت چغتائی خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔ ان کے علاوہ روشنک بیگم۔ قمر جہاں نوشباب، غنیش، صنیغم وغیرہ کئی اور ناول ہیں جن کو مسز۔ ا۔ ط صاحبہ بیگم ضیاء الحق۔ رضیہ سلطانہ بیگم۔ فاطمہ بیگم۔ سعیدہ

مظہر صاحبہ وغیرہ نے لکھا ہے۔

یہاں ان سب پر اظہار خیال موجب طوالت ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول کا جو ذخیرہ خواتین نے فراہم کیا ہے وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے اکثر ہر حیثیت سے مکمل ہیں اور ان میں جو خامیاں ہیں وہ ایسی ہیں جن کو نظر انداز کر دیا جا سکتا ہے۔ خواتین کے ناولوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انھوں نے ناول کی خصوصیات اور ایک اچھے ناول کے لوازم کو پوری سمجھ لیا ہے اور اس امر کی پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اس معیار پر زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کریں۔ اب ہم دو ایک ناولوں پر مختصر اظہار خیال کرتے ہیں۔

"شوکت آرا بیگم" یہ ایک ضخیم ناول ہے جس کے تین حصے ہیں۔ والدہ محمد عبدالرؤف صاحب عباسی لکھنوی کی تصنیف ہے جس کی اشاعت ان کے انتقال کے بعد ہوئی۔ اس ناول میں ایک تعلیم یافتہ شریف خاتون کی داستان حیات کا تذکرہ ہے۔ پہلے حصہ میں اس کی ایام طفلی، دوسری میں شباب اور تیسرے میں بڑھاپے کے حالات ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت مذہبی۔ اسلام کی فضیلت اور اخلاقی خوبیاں اور اچھی معاشرت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ قصہ کی دلچسپی اور تسلسل، خیالات کی بلندی قابل تعریف ہے۔ جذبات انسانی کی اچھی مصوری کی گئی ہے۔ اور طرز بیان کے لحاظ سے ٹکسالی ہے۔

"ظالم محبت" یہ ناول حجاب امتیاز علی صاحبہ کے خامہ رنگیں کا مرقع ہے۔ حجاب کی شخصیت دنیائے اُردو میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ جنوبی ہندوستان میں پروان چڑھیں اور اب پنجاب میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے متعلق ملک کے بہترین انشا پردازوں نے داد دی ہے۔

حجاب امتیاز علی کے تخیل نے ایک نئی دنیا آباد کی ہے۔ اس دنیا میں جو لوگ آباد ہیں وہ ہم سے مشابہ تو ضرور ہیں مگر بالکل ہماری طرح نہیں ہیں۔ یلدرم مرحوم کا خیال ہے کہ وہ فوٹو سے عکاسی نہیں کرتی بلکہ ہاتھ سے تصویر بناتی ہیں بالکل صحیح ہے۔

حجاب کے افسانوں کے اشخاص ایک مستقل خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دادی زبیدہ۔ ڈاکٹر گار۔ سر ہارلی۔ روحی حبش وغیرہ "ظالم محبت" میں بھی یہی خاندان موجود ہے۔ حسن اور عشق ہی ان کا موضوع ہے۔ لیکن ان میں بیباکی اور عریانی نہیں ہوتی۔ بلکہ شوخی ہوتی ہے لطافت اور شیرینی ہوتی ہے۔ حجاب کی نثر ایسی دلکش ہوتی ہے کہ کہیں نثر پر نظم کا گمان ہونے لگتا ہے۔

بہر حال حجاب امتیاز علی اُردو زبان کی ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں جن کی امتیازی شان اُردو زبان میں درخشاں ہے۔

بیگم مرزا احمد علی نے "ماہ درخشاں" میں مشرق اور مغرب کی آویزش اور مادیت و مذہب کی کشمکش کو واضح کر کے درمیانی رستہ کی رہنمائی کی ہے۔ اور اس کو ایک کامیاب ناول کہا جا سکتا ہے۔ آر۔ خانم صاحبہ کے ناول "شمع" اور "تصویر" بھی اچھے ناولوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ طوالت کے خیال سے کسی اور ناول کا تذکرہ اس موقع پر نہیں کیا جا سکتا۔

افسانے اور مختصر افسانے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے قدیم ادب میں افسانوں کا کافی ذخیرہ ہے لیکن مختصر افسانے مغربی ادب کے باعث وجود میں آئے ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم افسانوں اور جدید افسانوں میں ایک اہم تبدیلی یہ ہے کہ زمانہ سابق میں افسانے زیادہ تر مبالغہ آمیز واقعات پر مبنی اور دور از کار حالات کا مجموعہ ہوتے تھے۔ وہ اصلیت سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اور ان میں دیوؤں، پریوں اور محیّر العقول واقعات کی کثرت ہوتی تھی اور یہی باتیں دلچسپی اور دلکشی کا باعث ہوتی تھیں۔ اس کے برخلاف موجودہ زمانہ میں ایسے افسانے پسند کئے جاتے ہیں جو

اصلیت رکھتے ہوں۔ اور جن کے صحیح ہونے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ جن کو دیکھ کر ہماری آپ کی اور سماج کی اصلی تصویر سامنے آجائے۔ طویل افسانوں اور مختصر افسانہ نویسی میں کئی خواتین نے نام آوری حاصل کر لی ہے۔ طویل افسانوں میں "فیروزہ" مصنفہ جمیلہ بیگم۔ "مشرق و مغرب" مصنفہ حمیدہ سلطان صاحبہ وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ مختصر افسانوں کا رواج آج کل دنیا کی ہر زبان میں بہت مقبول ہو گیا ہے۔ مختصر افسانوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً رومانی افسانے۔ خوفناک افسانے۔ عشقیہ افسانے۔ مزاحیہ افسانے۔ اصلاحی افسانے۔ اشتراکی افسانے وغیرہ۔ ان تمام اقسام کے افسانوں میں خواتین کا پورا حصہ ہے۔ اور وہ ہر قسم کی افسانہ نویسی میں اپنا مقام حاصل کر چکی ہیں۔ عصر حاضر کی افسانہ نویس خواتین کو دو طبقہ میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو قدیم نہج پر افسانہ نگاری کرتی ہیں اور دوسری وہ ہیں جو ترقی پسند مصنفین کے زمرہ میں شامل ہیں۔ پہلے زمرہ میں بلقیس بیگم۔ سرور جہاں بیگم۔ مسز عبد القادر۔ آمنہ نازلی۔ ظفر جہاں بیگم۔ ایس۔ آر۔ کے۔ بیگم۔ راحت آرا بیگم۔ مسز حجاب امتیاز علی ــ فاطمہ بیگم۔ جہاں بانو بیگم نقوی۔ وغیرہ نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اور ترقی پسند ادب میں ڈاکٹر رشید جہاں۔ عصمت چغتائی۔ خدیجہ مستور۔ ہاجرہ مسرور۔ تسنیم چھتاری۔ شکیلہ اختر وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

اوّل الذکر خواتین کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ یہ جائے کہ ان پر اظہار خیال کیا جائے۔ اس لئے صرف چند خواتین کے متعلق کچھ تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔

مسز عبد القادر ہیبت ناک افسانوں کے لئے شہرت رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "لاشوں کا شہر" اور "صدائے جرس" شہ کار ہیں۔ اگرچہ ان کے افسانوں میں کوئی اصلاحی پہلو نہیں ہوتا۔ مگر آرٹ کے نقطۂ نظر سے وہ مکمل ہیں۔ ان سے ذہنی تفریح حاصل ہوتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اس قسم کے ہیبت ناک افسانہ نگار کی حیثیت سے آپ پہلی خاتون ہیں۔ ان کے افسانوں میں رنگینی نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود جاذبیت اور تاثر پایا جاتا ہے۔

راحت آرا بیگم صاحبہ کے افسانوں کے کئی مجموعے مثلاً بانسری کی آواز۔ غنچہ افسانہ۔ شب کی پکار وغیرہ تاج کمپنی لاہور کی جانب سے شائع ہو چکے ہیں۔ ادبی حیثیت اور اصلاحی پہلو کے مدنظر ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور راحت آرا بیگم کو ایک کامیاب افسانہ نگار کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

جہاں بانو بیگم نقوی حیدر آباد کی وہ ممتاز اور مشہور افسانہ نگار ہیں جنھوں نے دنیائے اردو میں اچھی نام آوری حاصل کر لی ہے۔ ان کے افسانے اصلاحی بھی ہوتے ہیں اور عشقیہ بھی ــــ ان میں معاشرت کی اصلاح کے لئے سماج کی دکھتی ہوئی رگوں پر نشتر ہوتا ہے۔

حجاب امتیاز علی کا تذکرہ بحیثیت ناول نگار ہو چکا ہے۔ مگر وہ اس کے ساتھ مختصر افسانہ نگاری میں بھی امتیاز رکھتی ہیں، ان کے حزنیہ افسانے اپنی ادبی شان، رنگینی اور تخیل کی بلندی کے لحاظ سے قابل ستائش ہیں۔

ایس۔ آر۔ کے بیگم کے افسانوں کا مجموعہ "نیرنگ" کے نام سے جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے۔ ان کے افسانے اصلاحی اور معاشرتی حیثیت سے پسندیدہ ہوتے ہیں۔ اور نفس مضمون کے لحاظ سے ان کو کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ دوسری بیسوں افسانہ نگار خواتین ہیں۔ جن کے افسانے مختلف حیثیت سے پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کو اس فن کی صف اوّل میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اور ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے ممتاز اور اصلاحی نقطۂ نظر سے پسندیدہ، ادبی لحاظ سے بلند اور تخیل کے لحاظ سے اعلیٰ پائے کے قرار پائے ہیں۔

جدید ترقی پسند مصنفین میں ہمیں سب سے پہلے ڈاکٹر رشید جہاں کا تذکرہ کرنا ہے۔ ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ "عورت اور دوسرے افسانے" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ترقی پسند مصنفین کے زمرہ میں شامل ہو کر اپنے تخیل کو جولانی دی اور "انگارے" میں حصہ لیکر اپنی طبیعت کی روانی بتائی۔ موجودہ سماج کے عیوب اور انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بے حجاب، بلا جھجک ظاہر کر دینا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ لیکن اب آپ عرصے سے ادبی میدان میں جلوہ گر نہیں ہوئی ہیں۔

خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور بھی ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں۔ ان دونوں کے افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ حقیقت نویسی ان دونوں کی طرز نگارش کی اصلی خوبی ہے لیکن ان میں اس قدر عریانی اور بے حجابی نہیں ہوتی جس قدر ڈاکٹر رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے یہاں ہوتی ہے۔

تسنیم چھتاری، تشکیلہ اختر، طاہرہ دیوی وغیرہ وہ دوسری ترقی پسند خواتین ہیں جنہوں نے افسانہ نگاری میں اچھا نام پیدا کر لیا ہے۔ اور ان کے افسانے اردو افسانوں کی صف اول میں جگہ پاتے ہیں۔

آخر میں ہمیں عصمت چغتائی کا تذکرہ کرنا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عصمت چغتائی افسانہ نگار خواتین کی چوٹی پر نظر آتی ہیں اور ان پر اردو زبان اور ادب کو فخر ہو سکتا ہے۔ فطرت انسانی کے عیوب کی عکاسی کرنے۔ خود اپنی جنس کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے میں آپ کو جس قدر ملکہ حاصل ہے وہ شاید ہی کسی کو ہو۔ نفسیات کے تجزیہ کرنے میں آپ کو جس قدر سلیقہ ہے وہ بہت کم اشخاص کو میسر ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار ہیں۔ جس طرح عورت کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنا جنس قوی کے لئے محال ہے۔ اسی طرح ان کے افسانوں کی تہ تک پہنچنا مشکل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کے شہری مسلم گھرانے کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی زندہ تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ان میں دکھوں، تکلیفوں، مسرتوں، خوشیوں اور صعوبتوں کا پورا نقش اپنے اصلی رنگ و روغن میں پیش ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانے حجاب کی طرح دوسری دنیا سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ اپنے ہی خاندان، اپنے ہی کنبہ کی روداد معلوم ہوتے ہیں۔ عصمت نے اخلاق اور کردار کے اعتبار سے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بدتر سے بدتر دونوں نمونہ کو پیش کر دیا ہے۔ ان کے یہاں عورت چلمن کے پیچھے سے جھانکتی نہیں۔ بلکہ وہ اب کالج کی شوخ لڑکی ہے۔ وہ رانی کی تل بن کر اور "لحاف" اور "پیشہ" کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ عصمت نے نہایت بے باکی اور جرأت سے سماج کی برائیوں کو ظاہر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ انہوں نے ایسی ایسی باتیں بیان کر دی ہیں جو موجودہ سماج کے لحاظ سے "عورت" کی زبان سے ادا نہیں ہو سکتیں۔ نہ کہنے والی باتوں کو بھی وہ سلیقہ اور بے باکی سے بیان کر دیتی ہیں۔ ان ہی وجوہ سے ایک طبقہ ان کی تحریر کا مخالف ہو گیا ہے اور ان کے افسانوں کو مردود قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے جو ذخیرہ اردو افسانوں کا مہیا کر دیا ہے وہ دوسری ترقی یافتہ زبان کے مقابل پیش ہو کر قابل تعریف قرار پا سکتا ہے۔

اس تفصیل سے خواتین کی ناول اور افسانہ نگاری کا حال منکشف ہو سکتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس فن میں ان کا کیا مقام ہے۔ اور کس طرح وہ اردو زبان کی ادبی خدمت میں مصروف اور منہمک ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ ان کے کارنامے مردوں سے تفوق حاصل کر لیں۔

نصیر الدین ہاشمی

غزل

دیکھا کسی نے اور کوئی مسکرا دیا — آنکھوں کو اک بہار کا عالم دکھا دیا

جو دل میں تھا وہ دل سے زباں تک نہ آ سکا — کچھ اس طرح وہ جانِ وفا مسکرا دیا

گزری ہے اس طرح سے محبت میں زندگی — خود کو بھلا دیا کبھی اُن کو بھلا دیا

اب وہ بھی انتظار کرے عمر بھر مرا — جس نے فریبِ وعدہ کو صبر آزما دیا

بے کیفیٔ حیات گوارا نہ تھی انھیں — ہر ابتدا کے ساتھ غمِ انتہا دیا

پہلو ہزار ہیں تری ایک ایک بات کے — پل میں رُلا دیا مجھے پل میں ہنسا دیا

حد سے گزر گئیں تری بندہ نوازیاں — غم بھی دیا تو ذوقِ طلب سے سوا دیا

تیری ہوائے لُطف و کرم کو میں کیا کہوں — جس نے مرا چراغِ تمنا بُجھا دیا

کیا خود فریب ہیں ترے محرومِ التفات — ہر لحظہ ہے یقیں تجھے دل سے بھلا دیا

مل کر مری نگاہ نے تیری نگاہ سے — اک حرفِ زیرِ لب کو فسانہ بنا دیا

اُس بدنصیب دل کو نہ آیا قرار پھر — تم نے نگاہِ لُطف سے جس کو دکھا دیا

تکمیلِ ذوقِ عشق کو اک عمر چاہیئے
برسوں تری نگاہ نے درسِ وفا دیا

پڑتی ہے مجھ پہ سارے زمانے کی اب نظر
مجھکو تری نگاہ نے تجھ سا بنا دیا

پھر یاد آگئے تری آنکھوں کے میکدے
ان میکدوں کی یاد نے بیخود بنا دیا

دل ہی تو ہے سنبھل نہ سکا پھر کسی طرح
تیری نگاہ نے بھی بہت آسرا دیا

آئینے میں بھی اب کوئی تیرے سوا نہیں
مجھکو مری نگاہ سے تونے چھپا دیا

وہ دن بھی تھے کہ مجھکو خوشی بھی خوشی نہ تھی
اب غم بھی ہے عزیز کہ ہے آپ کا دیا

یہ حُسنِ اتفاق غنیمت ہے عشق میں
کچھ یاد آگیا تو کوئی مسکرا دیا

دیکھی سکونِ قلب کی لذّت بھی بارہا
لیکن کہاں جو دل کی تڑپ نے مزا دیا

میرے غرورِ عشق کی رسوائیاں نہ پُوچھ
اک ناشناسِ غم کو غمِ دل سُنا دیا

اُس نے تو خیر تم کو بھُلا یا ہی تھا حفیظ
یہ کیا کیا کہ تُم نے بھی اُس کو بھُلا دیا

حفیظ ہوشیارپوری

گوروں کے کالے سائے

اتنے میں دوپہر کرڑکنے لگ گئی تھی۔ تھکان اور بھوک کے مارے ہمارا بُرا حال تھا۔ لیکن جو نئی زندگی کی ہلکی سی
ملک ہمیں ملی تھی۔ جو اس نئے بنگال کا دھندلا دھندلا روپ ہماری آنکھوں میں رنج رہا تھا۔ اس کے برتے پر ہم رواڑی
گ پر ڈگ بڑھائے جا رہے تھے۔ آج ہماری طاقت زیادہ ہو رہی تھی۔ شاید عمر بھی بڑھ گئی تھی۔ اپنے بُھک وٹنے بھ بدن
ے پاس پیٹ کا دھندا ہی نہیں بلکہ ایک نئے جیون کا سندیسہ لے کر جا رہے تھے۔

چٹیل زمین سے مرگھٹ کا سا دھواں اٹھ رہا تھا۔ کھیت سوکھے پڑے تھے۔ مرنے والے اور مرے ہوئے
بچوں کی باس چو کھونٹ پھیل رہی تھی۔ کھیتوں میں دھوپ کی رنگت چمپئی ہو چلی تھی اور تپش کی وجہ سے مٹی ایک تیز
سی بُو چھوڑ رہی تھی جیسے مذبح کی سڑاندھ ہو۔ سڑتے ہوئے لہو کی سی بھپک۔ کہیں کہیں بیجوں سے انکھوئے پھوٹے
ہی تو وہ اتنے نازک تھے کہ انہیں دھوپ سے پکی ہوئی مٹی سے باہر نکلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ مٹی کے یہ پتھر دل ڈھیلے ان
پنپنے والے خوشوں کا دم یوں گھونٹ رہے تھے۔ جیسے بنگال کی نئی نئی جاگی ہوئی جنتا کا دم گھٹ رہا تھا۔ یہ زمیندار۔
ماجن اور اناج چور ــــ میں نے ایک کھیت سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی۔ دانے میں سے پھوٹا کلّا سوکھ چکا تھا۔ میرا دل اُن
روٹھوں بیجوں کے لئے رحم اور درد سے بھر آیا۔ جو زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے تھے۔

اُجڑے پُجڑے کھیتوں میں سے ہوتے ہوتے ہم اگلے گاؤں کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ مکھیوں کے دَل کے
دَل ہم پر جھپٹے تو ہم نے اندازہ لگایا کہ اب بستی آیا ہی چاہتی ہے۔ اَن گنت مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے ہم گھبرا گئے
انسانی لاشوں پر ناچتی ناچتی وہ اتنی نڈر ہو رہی تھیں۔ کہ انھیں دُور رکھنے کی سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں
میری رگ رگ میں تپش سی پھیل رہی تھی۔ جوں جوں ہمارے جسم سے پسینہ چھوٹتا گیا۔ ان مکھیوں کے حملے بھی تیز تر ہوتے گئے

ہوتے ہوتے ہم گاؤں میں پہنچے اور یہ آدم خور مکھیاں ہمارا پیچھا چھوڑ جھونپڑوں میں پڑے شکاروں پر ٹوٹ پڑیں
یں کہیں تو مکھیوں وغیرہ کا اتنا جمگھٹا تھا کہ دیوار کی دیوار پُتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ہر چیز یوں خاموش تھی
جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

ہوا ٹھہری ٹھہری سی تھی گویا سُورج بھی ساکن ہو رہا ہے۔ دھوپ کی رنگت چمپئی تھی۔ گاؤں کا گاؤں برقائی
ہو رہا تھا۔ ہر چیز اکھڑی اکھڑی سی تھی گاؤں بھر سکڑ کر اتنا چھوٹا اور مصنوعی معلوم ہو رہا تھا۔ کہ فی الجملہ یہ گمان
ہوتا کہ کسی اناڑی نے بچّوں کے کھیلنے کے لئے گھروندے بناتے بناتے کام ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ اس کڑکتی دوپہر
کی خفگی کیا اب بھی نہیں ٹلے گی۔ کیا یہ آفتاب اب قدرت کے ذرّہ ذرّہ کو جھلس کر راکھ کر دینے پر اُتر آیا ہے
گاؤں کی دہلیز پر ہی پیپل کے بے برگ پیڑوں کا جُھرمٹ تھا۔ جو اب باوا آدم کے زمانہ کے دیو ہیکل درندوں کے
ڈھانچے سے کھڑے تھے۔ اُن میں سے ایک رام چڑیا اڑ کر ایک بلنی[۱] کے پیچھے پیچھے چکر کاٹنے لگی۔ جس نے کھانے کے

۱؎ بلنی ایک خاص قسم کی بھنورے سی موٹی اور کالی مکھی ہوتی ہے جو دیواروں پر مٹی کے ابھرے ہوئے گھر بنا کر رہتی ہے۔ مشرقی
بنگال میں یہ بہت کثرت سے ہوتی ہے۔

بیٹے منہ میں تنکا دبوچ رکھا تھا۔ ہر طرف عجیب سی بو اٹھ رہی تھی۔ دتی اور موت کی بو کہیں لا انتہا فلک ڈھیروں کے ڈھیر۔ بے حرکتی سمٹ کر بہ سڑا ندھ تو نہیں بن گئی۔ کہیں ہماری اپنی زندگی کا جمود ہی ہمارے گلے میں کانٹا بن کر تو کھٹک نہیں رہا تھا۔ گاؤں بھر میں ایک ہی پکی عمارت تھی، مسجد، خدا کا گھر۔ یہاں بھی دعو کا تھا جمود تھا، اس کے مینار چھوٹے تھے۔ ٹھوس ہونے کی وجہ سے اُن پر چڑھنے کی بجائے ان کے نیچے کھڑے ہو کر اذان دی جاتی تھی۔

کیا یہ جھونپڑے جھونپڑیاں بوڑھے ہیں کیا یہ گاؤں بوڑھا ہو چکا ہے، کیا یہ گھر گھروندے قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں۔ ایک مدتوں لولے لنجے کی طرح۔ کیا عمر ہوگی اس گاؤں کی، پچاس، پانچ سو یا پانچ ہزار برس۔ کہیں یہ دور عصری گردش سے آزاد تو نہیں ہو چکا۔ صدیوں سے یونہی پڑا ہے۔ ایک مکتی یافتہ سنیاسی جو قدیم زمانہ سے اسی طرح سمادھی لگائے ہوئے ہے۔ جو راسی لاکھ جونوں سے چھٹکارا پایا ہوا۔ جنم مرن سے مکت ہو کر پتھر سا بنا یہاں پڑا ہوا ہے، غیر متحرک غیر متبدل۔ مکتی اور نجات کے لئے دن رات تلملاتے ہوئے ہندوستانیوں کو کاش معلوم ہو تاکہ انھیں یہ مکتی حاصل ہو چکی ہے۔ وہ بھی تو اس گاؤں کی طرح پتھر بنے پڑے ہیں۔ مٹی کے تودے ہیں جن پر نئے نئے جنم کی کونپلیں اب نہیں پھوٹتیں۔ بے جان چیزیں پل پل بدلتی ہلتی رہیں۔ لیکن یہ جان دار ہونے پر بھی جمود پسند ہیں۔ چلنے سے کام چل جائے تو وہ دوڑنے کے نہیں، کھڑے رہنے سے کام بن جائے تو کیا مجال جو وہ قدم اٹھائیں۔ بیٹھنے سے گذر ہو سکے تو کھڑے رہیں اُن کے دشمن، اور آیا اگر لیٹا رہا جا سکے تو بیٹھنا اٹھنا کیسا۔ فاقوں سے جان بے شک نکل جائے۔ لیکن انگلی تک نہیں ہلے گی ـــــ اور کیا ہوتی ہے نجات، اور کیا ہوتی ہے جنم مرن کے چکر سے مکتی؟ نمک کی کان میں ہر چیز نمک ہو رہی تھی۔ یہاں خاموشی بھی کچھ اتنی خاموش اور پر سکون تھی کہ اس کے سامنے جنگل بیابان کے سناٹے کو حرکت کہا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ بات نہیں۔ یہ لوگ تو زندہ ہیں۔ زندگی سے بھرپور۔ اس جنتا میں تو انتھاہ زندگی محسوس ہوتی ہے۔ قدیم ترین زمانے سے ان کو لوٹا کھسوٹا جا رہا ہے۔ ان کی چمڑی نوچی جا رہی ہے۔ براہمنوں اور پہنتوں نے، راجاؤں اور سمراٹوں نے، شاہوں اور نوابوں نے ان کی کھال ادھیڑی۔ لیکن ہر بار انھوں نے پہلے سے زیادہ خوبصورت اور نئی جلد نکال لی۔ مگر کہاں گئی ہے اس بار ان کی نت نئی کھال اوڑھ لینے کی اہلیت۔ لاتعداد سیلاب اور بھونچال آئے۔ ان گنت قحط اور وبائیں نازل ہوئیں۔ مگر ہر بار وہ ان مصیبتوں میں سے نئے تازہ بیدار ہوئے ـــــ لیکن کیوں اس بار اس گاؤں سے مرگھٹ کا سا دھواں اُٹھا رہا ہے۔

کوئیں کی ٹوٹی پھوٹی منڈیر سے اُٹھ کر ہم سامنے والے مکان کے چوپال میں پہنچے۔ کسی پرندہ کی گردن مروڑ کر اُسے زمین پر ٹپک دیا جائے۔ اس پر چیونٹیاں اور مکھیاں آ جھپٹیں۔ ایسی ہی دکھ اور بے بسی کی مورت وہ گھر تھا۔ ہم نے کواڑوں پر دستک دی پھر ذرا زور سے تھپتھپایا ـــ اور پھر بار بار زور زور سے کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے دھکا دیا۔ پٹ چوپٹ کھلے اور اندر نظر دوڑائی۔ اُجاڑ تھا۔ چپ چاپ تھی۔ آنگن خالی تھا۔ نا ندخالی سب طرف سناٹا تھا۔ یہاں کبھی انسان رہتے تھے۔ اس کا گمان بھی نہ تھا اس پریت شالہ میں آدم بو تک نہیں تھی۔

میں نے پوری طاقت سے پھر ہانک لگائی۔ کوئی جواب نہ ملا ایک کوٹھڑی کے کواڑ کھول کر میں نے

اندر جھانکا چوہے ہی چوہے تھے۔ اور مکھیوں کی بھن بھن ۔ پرلی کوٹھڑی کے آدھ کھلے دروازوں سے میں نے جو اندر
جھانکا تو چوہوں کی فوج کی فوج مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ مکھیوں کا دَل کا دَل مجھ پر آ جھپٹا۔

چوہوں، مکھیوں، چیونٹیوں سے جان بچاتا ہُوا میں کمرہ کے اندر پہنچا۔ لحظہ بھر کے لئے وہاں سنّاٹا چھا گیا۔
اور چوہے، گھیسیں، مکھیاں، بلنیاں، چیونٹے چیونٹیاں، بن بلائے مہمان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے لگیں۔ کمرہ کی
دیواریں بلنیوں کی مٹی کی ممبیوں سے بھرپور تھیں۔ یہ بلنیاں کوٹھڑی کے جسم پر اَن گنت پھوڑوں کی طرح اُبھری ہوئی
تھیں۔ جگہ جگہ پر چوہوں کے بِل تھے۔ جگہ جگہ مکھیوں کی بھرمار تھی۔ سامنے کھاٹ پر مکھیوں کا لمبا سا چھتہ ہی لگا ہُوا
معلوم ہو رہا تھا۔ آہ! یہ تو ایک ماں ہے جو بچوں سے لپٹی ہوئی مری پڑی ہے۔

اس نظارہ نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ دانت جھکڑے ہیں، ہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا —— اور اس
بے سُدھی کے عالم میں مجھے پرماتما — اس قادرِ دوجہاں کی جھلک نظر آئی۔ میں نے ایشور کو حاصل کر لیا۔ لیکن میں
نے دیکھا کہ یہ خدا یا پرمیشور خوشی اور محبت کا پیکر نہیں بلکہ موت اور نفرت کا پیکر مجاز تھا۔ ایک نئے اعتقاد نے
جو پُرانے اعتقاد کی طرح تسلی بخش اور عقیدت پرور نہیں تھا بلکہ دل دہلا دینے والا تھا۔ میرے تمام خون کو کڑوا کر دیا
اور نس نس کو اکساہٹ سے جکڑ دیا۔ یہ زندگی کی ہریاول جو صدیوں سے سوکھ نہیں سکی تھی اس نے اب جلا کر راکھ
کو کر دیا تھا۔ کھیت ہتھیلی کی طرح بنجر چٹیل ہو رہے تھے۔ زمین پر دھول ہی دھول اُڑ رہی تھی۔ اوپر آسمان غصہ سے
جل کر گیروا ہو رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ خالق تو ہر وقت ناک بھوں چڑھا لال پیلی آنکھیں نکال نفرت اور
غصّہ سے پھنکارتا رہتا ہے۔ اس کے رنگ ڈھنگ میں تو ساری انسانیت کی طرف بے اعتنائی اور مذاق بھرا ہُوا ہے
کہاں ہے سچائی اور نیکی کی مورت کہاں ہے وہ جود و سخا کا تصور۔ یہاں تو ظالم کالی چنڈی ہی ہے۔ یہ آدم خور ڈائن
باہر نکلتے ہی مجھے دیکھ کر میرے ساتھی ایسے خوف زدہ ہوئے گویا اُس کوٹھڑی سے اُن کا واقف کار انسان
نہیں بلکہ کوئی بھوت نکلا ہے۔ میں نے کسی اور کو اس کوٹھڑی میں نہ جانے دیا۔ یہ انسان کو شیطان بنا دینے والا
بُرا خواب کسی اور کو نظر آئے۔ یہ میں نے مناسب نہ سمجھا۔

ہم اپنا سامان اٹھائے ہر دروازہ کھٹکھٹاتے، گھر گھر ہانک لگاتے، گاؤں بھر میں چکر لگانے لگے۔ خاموش
بے سُدھ تھے سب لوگ، دم توڑ رہا تھا گاؤں کا گاؤں۔ سویا پڑا تھا مہاتما بُدھ جو ہر ہندوستانی کے دل کے کسی
اندھیارے کونے میں چور سا بنا چھُپا رہتا ہے۔ بجھے ہوئے اس دیپک کی دھواں چھوڑتی بتی نے سب کے دِلوں میں یہ کیا
کالک بھر دی ہے۔ اُٹھو جاگو اہلِ ہند جلا لو اپنے مَن میں بجھا دیپ۔ اٹھ جاگ تو بھی سب کے دل میں سو رہے بدھ بھگوان،
ہزار دو ہزار برس کے بعد کسی ایک کے دل میں نہیں، بلکہ اسی وقت ہر ایک کے، ایک ایک ہندی کے دل میں۔

سب گھر خالی تھے۔ سنسان تھے۔ اُجڑے پُجڑے تھے۔ کہاں گئے ہیں یہ لوگ اپنے گھر گھاٹ چھوڑ کر، اگر وہ
ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر چکے ہیں تو کہاں ہیں اُن کی لاشیں، یہاں چت پڑا تھا ہمارا ایک گاؤں۔ ہمارے جسم کا ایک انگ

ایک طرف سے گائے کا دھیما دھیما ڈکارنا سنائی دیا اور اُس گھر کے اندر ہم پہنچے۔ آٹے کی ڈھیری کے قریب
ایک آدمی بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ بوڑھا تھا، ادھیڑ یا جوان، یہ میں نہیں بتا سکتا۔ اُس کے چہرہ پر جوانی کا کوئی نشان
نہیں تھا۔ لیکن باسی مولی کے رنگ کے اس کے پچکے سوکھے مُنہ پر جو جھرّیاں تھیں۔ وہ موٹی موٹی نہیں تھیں۔

جیسی کہ بڑھاپے میں ہوتی ہیں بلکہ باریک باریک تھیں۔ گویا پیروں تلے روندے جانے کے نشان ہوں۔ اس کے پٹھے ڈھیلے نہیں تھے۔ نہ ہی مالنسل تھے، اس کے بال سفید نہیں بے رنگ تھے۔ زیادہ عمر سے پک جانے کی وجہ سے نہیں شدت غم سے اس کے ہاتھ سخت تھے۔ اور یہ محسوس ہوتا تھا۔ کہ اُس کی تمام قوت اور زندگی اُن میں آسمٹی ہے۔ اس کی کلائیوں میں ابھی زور تھا اور کندھے بے ڈول ابھری ہڈیوں کے باوجود طاقتور تھے۔ سب کچھ چھن جانے پر بھی ابھی اُس کے جسم میں کام کرنے کی ہمت اور خواہش باقی معلوم دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اُس گلنے کے جذبات نقش تھے جیسے دو ہاتھ بلانا غہ جائے لیکن دانے سانسے سے محروم رکھا جائے۔ اس احساس کی بھرمار کے باوجود بھی میں اُن تاثرات کا اظہار نہیں کر سکا۔ جو اُس کے چہرہ پر حاوی تھے اور اس کی ہر چال ڈھال پر جادو کی طرح چڑھ کر بول رہے تھے۔ مجھے ایک کہانی یاد آئی۔ ایک ہزار پا بڑے مزے سے چہل قدمی کر رہا تھا[1]۔ کہ جھینگر سے اُس کی مُلاقات ہوئی۔ رام رام کے بعد جھینگر نے ہزار پا سے پوچھا " گوشت جبر دادا۔ اِن سو دو سو پیروں سے کیسے کام چلاتے ہو، کونسا پہلے اٹھاتے ہو کونسا پیچھے یہ بھلا پرماتما نے کیا مصیبت تمہارے گلے مڑھی ہے " آج تک ہزار پا سے کسی نے یہ سوال نہ پوچھا تھا۔ اور نہ خود اُسے اِس پر دھیان دینے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی، وہ سوچا گیا، سوچا گیا اور ایسے اینچ پینچ میں پڑا کہ کوئی پاؤں اٹھایا نہ جاسکا۔ اور وہ ہکا بکا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایسی ہی پس و پیش اور کان سُن کر دینے والی بے بسی اُس انسان کی نس نس پر چھا رہی تھی۔

اُس آدمی کے پاس ہی ایک گلا سڑا چرخہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے پاس بیٹھنے کے خیال سے میں نے چرخہ ہٹانا چاہا۔ لیکن ہاتھ لگاتے ہی وہ ٹوٹ کر گر پڑا۔ ہم اُس پر آڑے ترچھے بیٹھ گئے۔ بیشتر اس کے کہ ہم اُس سے کچھ معلوم کریں۔ وہ ہم سے بنگالی میں پوچھنے لگا۔ کہ کیا میں بنگالی ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اِس کے پاس اِس کال میں آٹے کی یہ ڈھیری کہاں سے آئی۔ اگرچہ اُس آٹے پر بھی موت کی کالی رنگت چڑھ رہی تھی، اس کے سوال سے چونک کر میں نے جواب دیا کہ ہاں میں بنگالی ہوں "کون بنگالی" اُس کا اگلا سوال تھا "اُتری بنگالی" "کون اتری بنگالی؟ ہندو" "کون ہندو؟" — "دیدیا" "کون ویدیا؟" "راجشاہی ویدیا" یا باریسال دیدیا؟" باریسال ویدیا" "کون گوتر؟" یہ سوال در سوال چلتا رہا حتیٰ کہ میری دُنیا سکڑ کر اتنی ادنےٰ اور علیحدہ ہوگئی کہ میں پاگل سا ہو کر بول اُٹھا "یہ یوگینڈا کا دودھ، برازیل کے چاول، آسٹریلیا کے گیہوں، افریقہ کے سوکھے انڈے۔ امریکہ کی دوائیاں اور مکھن، دیکھ کہاں کہاں سے دُنیا آئی ہے تیرے دکھوں میں شریک ہونے — اُٹھ تو بھی اب نکل کوئیں سے باہر۔ اُٹھ جاگ کھول آنکھیں، جگا لے اپنے دل میں سویا ہوا بُدھ بھگوان۔ جلا لے یہ سلگتی ہوئی دھواں چھوڑتی بتی۔ اور آ پھر دریا کی طرح اپنا راستہ آپ ڈھونڈیں۔ نئے جیون، نئے بنگال کا راستہ "

شمشیر سنگھ نرولا

" ناول گوروں کے کالے سائے کا ایک باب "

---

[1] مشرقی بنگال کا ایک خاص قسم کا ہزار پا جو بہت لمبا ہوتا ہے اور اس کے سو سے لے کر ہزار تک پاؤں ہوتے ہیں ؎

قہقہہ

پکارتا ہوں میں، چیختا ہوں حیات سے مطمئن نہیں ہوں
حیات سے مطمئن نہیں کائنات سے مطمئن نہیں ہوں
میں کیا ہوں، آیا ہوں کس جہاں سے اگر گیا میں یہاں سے جاؤں گا کس جہاں میں -؟
اگر مجھے پھینکنا ہی تھا ایسے تیرہ و تار خاکداں میں
طویل اگر تھے رموزِ فطرت، مجھے بھی عمرِ دراز ملتی
مرے لئے ہے مگر یہ احساس تلخ کتنا، کہ تیرگی ہی میں جان دوں گا
میں روشنی کے فراق میں روشنی کا دھندلا سا اک تصور لئے ہوئے جزوِ خاک ہوں گا
مرے لئے ہے مگر یہ احساس تلخ کتنا
حیاتِ آدم کی داستاں ایک مرثیہ ہے، غزل نہیں ہے۔
وجود ـــــ انساں کا مظہرِ تیرگی ہے ـــــ ہرگز شبیہِ نورِ ازل نہیں ہے۔

:(۲):

کوئی تصور حسیں نہیں ہے کہ جس سے میری نگاہ ملتی
ملا نہ اک فلسفہ بھی ایسا کہ جس میں محبؔ کو پناہ ملتی
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں خلا میں لٹک رہا ہوں
میں اپنی نظروں میں آج خود ہی کھٹک رہا ہوں
یہ فلسفہ ـــــ بوڑھا، زنگ خوردہ
سنہری ژولیدہ زلف دلہن کی ہے جو پائی گئی ہو بستر پہ صبح مُردہ
اگر میں اس پر یقین کر لوں کہ کائنات ایک مادّہ ہے

تمام عالم کے بسنے والے ہیں مادّیت کے برق پارے
زمیں، فلک، مہر و مہ، ستارے انوکھے اک اتفاق کا ہیں کرشمہ سارے
تمام عالم کے بسنے والے ہیں بندروں کی شگفتہ رُو ارتقائی نسلیں
کہ جن کے چہرے بنے ہیں صدیوں کے بعد راحت فزا نظارے ——— !
اگر میں اس بات پر بھی اپنا جھکا کے سر اعتبار کرلوں
نظامِ عالم کا کوئی خالق ضرور ہے جو عیاں ہے اور جو عیاں نہیں ہے
نہاں ہے اور جو نہاں نہیں ہے۔
کوئی بتائے مجھے کہ کیا میری زندگی پُر نشاط ہوگی ؟
بتاؤ کیا ——— بھوک پیاس سے، موت سے بھی حاصل نجات ہوگی ؟
مری جوانی مرے لئے کیا سدا بہار انبساط ہوگی ؟
یہ رنگ اور نسل کے تفوّق، یہ میرے تیرے کے امتیازات
زمیں کی حد بندیوں کی رسمیں
بتاؤ کیا ٹوٹ جائیں گے یہ تمام غم آفریں طلسمات ——؟

——————— :(۳): ———————

جواب بس ——— ان تمام باتوں کا قہقہہ ہے
جہاں کو ہے اصل میں ضرورت بھی قہقہوں کی
تمہیں کہو ——— بزمِ ذہن سے کیا کبھی کوئی قہقہہ اُٹھا ہے ——؟
یہ دل ہی پُر کیف قہقہوں کی طرب سرا ہے
مگر یہ انسان ہے ——— کہ افکار کے بیاباں میں جانے کب سے بھٹک رہا ہے ——!

مخمور جالندھری

———————

نفسیاتِ فیشن

• فیشن کیا ہے؟ — ایک مخصوص وقت کی مروجہ طرز یا وضع — طرز یا وضع بقول پروفیسر نشر دم ایک غالب یا نمایاں ادبی طریقۂ اظہار ہے۔ یا طریقہ تمثیل نمائی ہے۔ یا تصور ہے آرٹ کی مملکت کا۔ دوسرے الفاظ میں لفظ فیشن ہر اس مروجہ طرز پر منطبق ہوتا ہے۔ جو اپنی پیکر و ہیئت میں تغیر پذیر ہو۔ یہ طرز باری باری ظاہر ہوتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ اور اس قانون کا اطلاق نہ صرف لباس پر ہوتا ہے۔ بلکہ آرائش و تزئین، فن تعمیر، گاڑیوں کی ساخت، طرزِ گفتگو، لغت، موسیقی اور ینگ (؟) سمنر کیبلر کے نظریے کے مطابق مختلف قسم کے اشارے اور مسکراہٹیں تک فیشن کی پروردہ ہیں۔ اور چونکہ وہ انسانی میل جول میں آسانی پیدا کرتی ہیں اس لئے مفید بھی ہیں۔ اسی پر بس نہیں۔ مذہب اور فلسفہ جیسے سنجیدہ مضامین بھی اس کی لپیٹ سے بچ نہیں سکے۔[1] فیشن ایک اجتماعی عمل ہے۔ اور زیادہ تر جسمانی متعارفت پر مبنی گو تیز رفتار ذرائع آمد و رفت بھی اس کی توسیع اور استقرار کے حامل ہیں (بارٹلٹ)[2] فیشن کا اس اخلاقی معیار سے کوئی واسطہ نہیں جس کی وجہ سے کسی عمل کو جمہور کے لئے مفید یا غیر مفید قرار دیا جا سکے۔ یہ صرف اُن رسوم کا مظہر ہے جن کے لئے اخلاقی کسوٹی پر پورا اترنا لازم نہیں۔ یہ ایک ایسا خیال و عمل واحد ہے۔ جو کسی خاص گروہ کے مروجہ خیالات و اعمال کے دھارے پر بہہ رہا ہو۔ اس کے میلان تقابلتاً غیر مستقل اور سطحی ہوتے ہیں۔ اور عام رسومات کے برخلاف جلد جلد بدلنے والے بھی۔ تاہم تعجب ہے۔ کہ جب ان کا دورہ ہوتا ہے تو وہ بالکل اہم اور معنی خیز معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ایک معاشرتی رسم کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور ایک ظاہری شعار کے حامل بلکہ یہاں تک بھی کہہ سکتے ہیں کہ فیشن ہماری سوسائٹی میں ہر رسم و رواج پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

مگر اُس سکونیاتی سماج میں جس میں ذات پات کی تمیز قطعی طور پر نمایاں ہو۔ فیشن کے لفظ کو جن معنوں میں ہم لیتے ہیں۔ موجود نہیں پاتے۔ کیونکہ ایسے تمدن کے اندر طبقۂ امرا اپنے معیارِ رفعت و بلندی میں بندہ کو جو گرد کو اپنا ہم لباس و ہم کلام دیکھنے کی تاب برداشت نہیں لا سکتا۔ ایسی سوسائٹی میں ہر جماعت کے افراد کے لئے خاص قسم کے لباس مقرر ہیں جن کو تبدیل کرنا گویا اپنے لئے ایک سزا مول لینا ہے۔ اُس کی سینکڑوں مثالیں آج بھی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں نہیں تو دیہات میں ضرور دیکھنے میں آئیں گی۔ بہت عرصہ نہیں گذرا کہ شاہ پور (پنجاب) کے ایک گاؤں میں ایک آدمی کو محض اس لئے شدید طور پر پیٹنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ کہ وہ ململ کی سفید کلف دار پگڑی کیوں پہنتا ہے۔ کیونکہ پتی داروں کے خود ساختہ قانون کے مطابق یہ حق صرف پتی داروں ہی کو پہنچتا ہے۔ کہ وہ لٹھے کی سفید چادر ململ کا چولا اور ململ کی سفید کلف دار پگڑی پہن سکیں۔ ایسے ماحول میں عام دیہاتی کا نہ صرف اندازِ بیان مختلف ہوتا ہے۔ بلکہ آداب و اطوار میں بھی وہ مختلف رہ کر ہی گزران کر سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ خود ان طبقوں کے اندر بھی لباس و کلام کی تبدیلی کو ایک ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ کیا ہمارے باپ دادا غلطی پر تھے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے۔ جو ہر اہلِ نظر کے قوائے

(1) SOCIAL PSYCHOBSZ—K. YOUNG (2) PKIMITIVE CULTURE BY BARTIET (3) STATK SOCIETY

اور اک میں ایک شدید ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ تمیزِ بندہ و آقا جس کی بنیاد رنگ و خون پر رکھی گئی۔ مشرقی ممالک تک
محدود نہیں یورپ کے سفید ہاتھ آج بھی اسی امتیاز کے خون سے سُرخ ہو رہے ہیں۔ وہی امتیازی لباس اور وہی آداب
و اطوار کا فرق ہر طبقے میں نمایاں ہے۔ اور جہاں جہاں یہ فرق زیادہ شدید ہے۔ وہاں قدامت پرستی بھی مقابلتاً زیادہ ہے
فیشن ایک ایسا فن ہے جس میں ارتقا نہیں اس کے برعکس یہ چکر ہی میں رہتا ہے۔ اگر ہم اپنے ہی ملک میں گذشتہ چند
سالوں میں عورت کے فیشن کا جائزہ لیں تو یہ مطالعہ بہت حد تک بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔ ہمارے یہاں زیادہ زور چولی
کے بعد قمیص کی مختلف پیمائشوں پر دیا گیا ہے۔ پُرانے رواج کے مطابق قمیص ڈھیلی ڈھالی رکھی جاتی تھی۔ اور اُس کی
لمبائی عموماً پنڈلیوں تک ہوتی تھی۔ مگر جنگِ عظیم کے بعد تقریباً ۱۹۲۰ میں فیشن کی پہلی کاری ضرب قمیص کی مختلف پیمائشوں
پر پڑی۔ اور تقریباً ہر پیمائش میں تفرلق کی ضرورت پیش آئی۔ طول و عرض میں تراش جاری رہی خصوصاً گلے کی کاٹ
کے انداز کچھ عجیب ترتیب سے بدلتے رہے۔ حتّٰی کہ ۲۹ — ۱۹۲۸ میں ساڑھی نے سلوار و قمیص کے جھمیلے کو ختم ہی کر دیا
یہی حال ۴۰ — ۱۹۳۹ تک رہا۔ آج پھر یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ساڑھی کو نیچا دکھانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

یہ نظریہ کہ فیشن ایک منظم ترتیب کی تقلید کرتا ہے تجسس کرنے پر درست معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ فیشن
کے متعلق پیشین گوئی کرنا بھی آسان نہیں۔ پال پائیرے (PAUL POIRET) پیرس کا شاہِ فیشن لکھتا ہے "فیشن کے متعلق
آئندہ کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ طرزیں یا وضعیں مقابلے سے ترقی پاتی ہیں۔ لیکن جب یہ تقابل شدید ہو جائے۔ تو
انتہا پسندی بعید نہیں ہوتی۔ خیال فرمایئے۔ کہ ۱۹۰۰ کے جمہور کی طرف سے کیسا ہنگامہ اٹھتا۔ اگر وہ آج کل کی لڑکیوں
کو اپنے معذرت نامۂ لباس[1] میں دیکھ پاتے "

آیئے اب ذرا فیشن کے اُس سطحی پہلو پر بھی ایک جھلکتی ہوئی نگاہ ڈال لیں جسے انگریزی میں فیڈ (FAD) یا
کریز (CRAZE) کہا گیا ہے۔ جزئی تزئین و آرائش پر غیر معمولی توجہ بخشنے کو فیڈ یا کریز کہتے ہیں۔ اس کی توجیہہ یہ کی
گئی ہے۔ کہ ہم اس سطحی عمل میں ہیجِ شوخی، اور جذبات کو مشتعل کرنے والے عناصر پاتے ہیں۔ جن سے یہی خبط اور بھی
دلکش بن جاتا ہے۔ مگر باوجود اپنی جاذبیت و دلفریبی کے یہ عارضہ بھی باقی ذہنی وباؤں سے کم نہیں۔ اس کا اثر زندگی
کے تقریباً ہر سطحی پہلو پر پڑتا ہے۔ تاہم اپنے لباس و تزئین میں عورتیں ہی مقابلتاً اُن سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ ایک
ماہرِ نفسیات نے اعداد و شمار سے بتلایا ہے۔ کہ ۷۲ فی صدی (ان فیڈ یا کریز) کا اثر عورتوں پر ہوتا ہے اور باقی مردوں پر
نفسیاتِ فیشن کا مدعا یہ ہونا چاہیئے۔ کہ وہ ہماری اس عجوبہ عادتِ حاضرہ کی وضاحت کرے۔ جو ہر وقت ایک
انوکھے لباس و زیبائش گفتگو اخلاق اور جذبات کو اکسانے والی اشیا کی جستجو میں لگی رہتی ہے۔ زمانۂ حاضرہ کی متحرک
سوسائٹی کو ہر لمحہ تبدیلی ہی خوش آتی ہے۔ گو ازمنۂ قدیم میں بھی انسان خوبصورت رنگ بھلانے والی آواز، ناچ اور دیگر
تفریحی اسباب سے جنتِ نگاہ و فردوسِ گوش کا سامان بناتے رہتے تھے۔ لیکن اب اور تب میں فرق یہ ہے۔ کہ اب
یہ ایک اجتماعی عمل بن چکا ہے۔ اور تب محض انفرادی تھا۔

ہمارے باقی معاشرتی اعمال کی طرح فیشن بھی ہمارے جذباتی اور غیر منطقیانہ میلان کی پیداوار ہے۔ لباس و تزئین
گاڑیوں کی ساخت، موسیقی اور رقص کی تبدیلیاں اکثر و بیشتر غیر افادی ہوتی ہیں۔ تاہم اس کی توجیہہ کرنا لازم ہے۔ پروفیسر

---

[1] AN APOLOGY FOR DRESS.

زنگ اسی مسئلے پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے "پانچ سال پیشتر امریکی عورتوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ چھوٹا سکرٹ (SKIRT) اور چھوٹے بال اب دائمی طور پر رائج رہیں گے۔ اس لئے کہ وہ اتنے آرام دہ سریع الحس اور معقول ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۷۰ فی صدی عورتیں آج پھر لمبے بال رکھ رہی ہیں" افادیت فیشن کی تخلیق کا باعث نہیں اور نہ یہ اپنے اطراف میں اندیشۂ سود و زیاں رکھتا ہے۔ بلکہ مانند شباب اپنی مستانہ روی میں غیر منطقیانہ ہونا ہی اسے مرغوب ہے۔

بڑے بوڑھے تخلیق آدم ہی سے نوجوانوں کی فیشن پرستی پر طعن و تشنیع کی بارش کرتے آئے۔ لیکن ان دانایان راز نے یہ تو معلوم کرنے کی زحمت کبھی گوارا نہ کی۔ کہ آخر ہم پر اس کی گرفت اتنی سخت کیوں ہے۔ نفسیاتی طور پر فیشن پرستی کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ دل پر ایک جذباتی اثر رکھتا ہے۔ اور ہمارے اندر وقار کی حس کو پیدا کرتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے۔ کہ سماج بھی اسے پسندیدگی سے دیکھتا ہے۔ اس جگہ ایک نکتہ متناقض پیدا ہوتا ہے۔ کہ اب جبکہ فیشن کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ سماج اسے نظرِ استحسان سے دیکھے۔ یہ ساتھ ہی عوام سے ذرا اختلاف بھی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ہم مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ صرف یہ ہو سکتا ہے۔ کہ چند اور اشخاص بھی اسے اپنا لیں۔ پروفیسر راس لکھتا ہے۔ "فیشن مروجہ وضع کی یکسانیت ہے۔ اس میں ذہنی ہم آہنگی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ لیکن جب بہت سے آدمی اسے اپنا لیں۔ تو گویا یہی ہر دلعزیزی اس عنقا کے واسطے ایک چتا بن جاتی ہے۔ جس کی خاکستر ایک نئے فیشن کی تعمیر میں صرف کر دی جاتی ہے۔

نفسیاتی اصول کے مطابق فیشن کی جائے قیام ہماری تغیر پسند جبلت ہے۔ ہم اُن طرزوں سے تنگ آ جاتے ہیں۔ جو بہت دیر تک چلتے رہیں۔ اس جبلت کا ربط معاشی استحقاق سے بھی ہے۔ لیکن بہت حد تک یہ بچپنے کی خود پرستی سے بھی متعلق ہے۔ جس کے طفیل ہم اپنے والدین کی نظروں میں جچنے کی سعی کرتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ فیشن کو اس کی تیزی اور طریقِ تبدل سے جانچنا چاہیئے۔ یہ ایک معاشی رسم کی حیثیت سے تلون مزاجی۔ تخصیص اور درمیانہ درجے کے درود کا باعث ہے۔ لیکن یہ ایک امر لا محالہ ہے۔ کہ اس کی پیدائش طبقۂ امرا میں ہی ہوتی ہے۔ وہیں یہ شہزادہ پروان چڑھتا ہے۔ مگر جونہی یہ جمہوریت پسند شہزادہ اپنا دور دورہ غربا کی جھونپڑیوں میں کرنے لگتا ہے۔ تو مغرور امراء اس کا جنازہ نکال کر کسی اور جدت کے سر پر طرۂ امتیاز رکھ دیتے ہیں۔

ایک طرف اگر فیشن ہمارے اندر انفرادی سطوت پیدا کرتا ہے۔ تو دوسری جانب یہ بھی ممکن ہے۔ کہ کوئی شخص اس کے ذریعے محض اپنے باطنی احساسِ کمتری[1] کی تلافی کر رہا ہو۔ جب ہم کسی جدید ترین طرز کو اختیار کرتے ہیں۔ تو ہمیں ایک امتیازی حیثیت دی جاتی ہے۔ امرا ہمیشہ جدید ترین اسٹائل کے حصول اور لٹیسر کا نشان بھی بنانا چاہتے ہیں۔ جن کی دیکھا دیکھی مئی جون کے مہینوں میں دوپہر کی جھلستی ہوئی لُو میں کام کرنے کے بعد ہر مزدور کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ کہ وہ اچھے کپڑے زیب تن کئے سگرٹ مُنہ میں دبائے سینما کی طرف گامزن ہو۔ خواب کی سحر آفرین دنیا کی حد سے باہر شاید یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ مزدور چند لمحوں کے لئے اپنے تئیں فراموش کرکے نفسِ شعوری و غیر شعوری میں اپنے آپ میں انہی امیرانہ تمکنت کا احساس پاتا ہے۔ جو امرا کا باسی معمول بن چکا ہوتا ہے۔ عورت میں فیشن پرستی کی وجہ خود

[1] INFERIORITY COMPLEX سے۔ اس کی کتاب ۱۹۲۸ میں چھپی تھی۔

کے علاوہ مکافاتِ حسِ کمتری بھی ہے۔ جو وہ مرد کی ہتیائی ہوئی دنیا میں محسوس کرتی ہے۔ تاریخ اور ادب شاہد ہیں۔ کہ ازل سے عورت کا ہتھیار اس کی ذاتی خوبصورتی اور آنسوؤں کے علاوہ اُس کی آرایش و تزئین تھا جس سے وہ مرد کو ملتفت کر سکتی تھی مگر دوسری جانب اس آرایش کا مقصد یہ بھی تھا۔ کہ وہ اپنے لئے ایک علیحدہ جنسی جماعت قائم کر سکے۔

آج عورتیں مردوں کی تقلید کر رہی ہیں۔ مغرب نے عورتوں کے لباس میں وہ قطع و وضع روا کر رکھی ہے جو مشرقی نظریے کے مطابق قدرت نے مُردوں کے لئے بھی ودیعت نہ کی تھی۔ لیکن نظریوں کی پروا کون کرتا ہے۔ مشرقی عورتیں بھی اپنی بہنوں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے اخلاق و اطوار و لباس میں "اصلاح" کرنے لگیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ تقلید یا ایسی تراش جائز ہے یا ناجائز ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے۔ کہ اس انقلاب کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ عورتوں کی بدلتی ہوئی سیاسی و معاشی حالت ہے۔ قدیم جرمن زبان میں مقولہ تھا۔ کہ عورت کا کام کھانا پکانا۔ بچے پالنا اور سینا پرونا ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی صورت میں بھی مرد سے برتر نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ زبان درازی میں اپنی مثال آپ ہے۔ مگر آج عورتیں مردوں کے دوش بدوش چل رہی ہیں۔ اب انہیں ضرورت نہیں کہ خواہ مخواہ اپنے تئیں کمزور سمجھتے ہوئے ایسا لباس پہنیں جس سے مرد کا دل ترحم و ہمدردی کے احساس سے کھنچا چلا آئے۔ یہ مساوات زن و مرد کا نتیجہ ہے۔ عورتیں مردوں کا لباس پہن کر ثبوت دینا چاہتی ہیں۔ کہ وہ مرد سے کسی صورت میں کم نہیں۔ اور یہی زمانے کی رو ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ بیداریٔ جذبۂ وقار اور اپنے آپ کو کاملاً اُس معاشی عمل کے ساتھ ہم آہنگ کرنا جس سے سماج میں امتیاز میسر ہو۔ فیشن کے دو بڑے عناصر ہیں۔

فیشن اور جنسی کشش

جہاں لباس نے مختلف ارضی طبقوں میں موسمی عناصر سے بچانے میں بڑا کام کیا ہے۔ وہاں انسانی اظہارِ خودی میں بھی اِس کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ بلکہ دوسروں کی توجہ جذب کرنے میں بھی بڑا کام سر انجام دیا ہے۔ پرانے زمانے میں مرد عورتوں کی نسبت بہت زیادہ زرق برق لباس پہنتے تھے۔ مبصّرین فیصلہ نہیں کر سکے۔ کہ آیا ان شوخ رنگ کے لباسوں سے اُن کا مدعا عورت کے دل کو مسحور کرنا تھا۔ یا یہ ثابت کرنا کہ ایک اعلےٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہرکیف عورت کو لبھانے کے لئے آج کل کے عملی اور مستعار لباس بھی بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ لیکن بزعمِ خود ہوشیار مرد صدیوں تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ کہ اس حسین کھلونے کے دل بہلا دے کے لئے جو جذبات و حسیات سے آراستہ تو ہے۔ مگر ادراک سے نہیں محض بھڑکیلے رنگ ہی مقناطیس کا کام کر سکیں گے۔ مگر نفسیات یہ سمجھاتی ہے۔ کہ عورت مرد کی نسبت زیادہ عملی ہے۔ وہ ایک خیالی دُنیا بسانے کی خاطر بہت تھوڑی قربانی کر سکتی ہے۔ اور اس میں اتنی محتاط ہے۔ کہ محبت جیسے شدید جذبے میں بھی جب تک وہ ہر عملی پہلو پر ایک غائر نگاہ نہ ڈال لے کوئی اقدام کرنے پر رضامند نہیں ہوگی۔ وہ غالب کے اس مصرعے کی کہ "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا" بہت شاذ ہی مصداق ہوتی ہے۔ میرین سٹورٹ نے اپنے ایک مقالہ "عورت رومانی محبت کرنے کی نا اہل ہے" میں لکھا ہے۔ کہ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ عورت کی فطری نزاکت اُسے شدید ابدی عشق کے قابل بنا سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک دردناک حقیقت ہے۔ کہ نسوانی دل اس کے بالکل برعکس چلتا ہے۔ اور جہاں مرد اپنے دونوں جہان بھی عورت کے لئے قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ وہاں عورت عشق پہ

مادی آسائشوں کو ترجیح دیتی ہے۔ مقدس کتابوں کے فرشتوں کی مانند تمام سچے عشاق مرد ہوتے ہیں۔ دولت، عزت شہرت عورت کے اصول ہیں۔ اور اگر مرد اِن کو اپنی محبوبہ کے قدموں میں ڈالنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تو عورت طوطا چشمی کے ساتھ اُسے الوداع کہہ ڈالے گی۔ اور راہی لمحے اُس کے مرمریں بازو کسی اور خوش نصیب کے گلے میں حمایل ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس سادہ لوح مرد اپنی محبوبہ دلنواز کے لئے تخت و تاج جاہ و مال کو ٹھکراتے ہُوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ لے لیجئے اس علاقے کو اِن محلوں کی عشرت کو . . . . . . اور مجھ کو اور میری انارکلی کو ایک ویرانے میں ڈال دیجئے۔ جہاں میں صرف اِس کو دیکھوں اس کو سنوں۔ میں جیتے جی اپنی جنت میں پہنچ جاؤں گا . . . . اور ماں باپ کے احسان کی یاد میں میری آنکھیں ہمیشہ پرنم رہیں گی"۔ لیکن زمانہ شناس ناصفہ اپنی آنکھوں کو جھکا کر سوچے گی۔ کہ ان راحتوں کے بغیر زندگی کیسے کٹ سکتی ہے۔ اور اس دوران میں اس کا برق رفتار تخیل کسی اور مرد کا تعاقب کرنے میں محو ہو جائے گا۔ جو اسے دولت، عزت اور شہرت کے بازار میں جا بسائے۔ اپنے موضوع کی طرف دوبارہ آتے ہُوئے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جس طرح وہ مرد متعدد لباس کو پسند کرتی ہے۔ اسی طرح ہم بھی زمانہ حاضرہ کی چھوٹی لٹوں والی عورتوں اور ملبوسِ تنگ تنگ پیرہناں سے بیخ پا نہیں ہوتے۔ بلکہ ہمیں آتنی ہی دلکش (شاید کسی قدر زیادہ) معلوم ہوتی ہیں پروفیسر زنگ کا نظریہ ہے۔ کہ اگرچہ خود آرائی کی گہرائیوں میں شاید جذبۂ جنسیت کام کر رہا ہو۔ لیکن فیشن میں جنسیت کے علاوہ کئی اور معاشی عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں۔

جو کچھ بھی فیشن میں رائج ہو وہی دوسری صنف کے لئے دلکش ہوگا۔ مرد — باپ یا بھائی کی جنسیت سے — پاؤڈر کے استعمال کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں یا ناپسندیدگی سے، خواہ وہ غیر مرد کی ملاقات کو بیباکی پر محمول کریں یا، خواہ وہ برہنہ ٹانگوں کو اخلاق سوز تصور کریں یا نہ، اگر ایک بار یہ فیشن کے دائرے میں محفوظ ہو چکی ہیں۔ تو وہی لڑکی مرد کی نگاہوں میں کھب سکتی ہے۔ جو فیشن کو فیشن کے واسطے اختیار کرے۔ مجھے لاہور میں دو بار آل انڈیا اولمپک دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان دونوں موقعوں پر میں نے ایک ایک ہندوستانی خاتون کو بھی اِن کھیلوں میں حصہ لیتے ہوئے دیکھا۔ جو اینگلو انڈین لڑکیوں کی نکروں کے برعکس سلوار پہن کر مقابلہ کر رہی تھیں مجھے یہ نظارہ نہیں بھولتا جبکہ نکروں والی لڑکیاں اپنے "خلاصۂ لباس" میں اٹھلا اٹھلا کر چل رہی تھیں۔ اور وہ سلواروں والی اپنے لباس کے انوکھے پن کی وجہ سے اس خاص ماحول کے اندر بوکھلاتی پھرتی تھیں! روزمرہ کی زندگی میں دیکھئے۔ لڑکیوں کا دوپٹہ کو شانوں پر ڈال لینا تو مقبول ہو ہی چکا ہے۔ آج اگر طبقہ امراء کی لڑکیاں بال کٹوا کر یورپین سکرٹ (SKIRT) کا استعمال شروع کر رہی ہیں۔ تو عجب نہیں کہ کل اگر جیب نے اجازت دی تو عوام بھی اِس پر معترض نہ ہوں۔

جب کوئی نیا فیشن رائج ہوتا ہے تو ہم اُس کی توجیہ کو بھی مقابلتاً اتنی ہی تیزی سے مرتب کر لیتے ہیں۔ اگر فیشن کی آمد جنسیاتی کشش کی وجہ سے ہو تو ہر طرز اتنا ہی موثر ہوتا ہے۔ جتنا کہ دوسرا۔ جس طرز کو عالمگیر پسندیدگی کا شرف حاصل رہو وہی درست ہوتا ہے۔ اگر ایک طرز عالمگیر حیثیت حاصل کرے تو دوسرے طرز کا شباب پیری میں ڈھلنے لگ جاتا ہے۔ اس کی متلوّن مزاجی ہی اس کی دلکشی اور تیکھے پن کا راز ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس ضمن میں رنگوں کے انتخاب کی نفسیات پر بھی ذرا سی روشنی ڈال لی جائے۔
سیاہ رنگ ماتمی رنگ ہے۔ سوائے چند ایک رسمی موقعوں کے اس رنگ کے پہننے سے غم واندوہ کا اظہار مقصود

ہوتا ہے۔ گویہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ یہ رنگ غم واندوہ کی انتہائی صورت کا مظہر نہیں ہوتا۔ اسے اکثر صبح کے لباس میں پہ
جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں عمل اور نسوانیت کی جھلک ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر یہ رنگ شاعرانہ دلکشی سے وا
ہے۔ اور کیا یہ صحیح نہیں کہ سفید بدن پر سیاہ رنگ کا لباس ایک دلفریب تضاد پیدا کرتا ہے خصوصاً جب گلا رو
ایک سیاہ رنگ کی لیس لگی ہوئی ہو۔ سیاہ لباس پہننے والی عورتیں اکثر اپنے ظاہری سکون کے باوجود مزید راحت کی ا
ہوتی ہیں۔ کمر پر یہ لباس تنگ ہونا چاہیئے لیکن یاد رہے۔ کہ سیاہ رنگ صرف چھریرے بدن پر ہی زیب دیتا ہے۔

سرخ رنگ کے لباس کو صرف مخصوص موقعوں پر ہی پسند کیا جاتا ہے۔ مگر فربہ اجسام اس رنگ کے بھی حامل
ہو سکتے۔ اور نہ نیلی آنکھوں اور سرخ بالوں والی عورتوں کو زیب دیتا ہے۔ پتلے جسم پر بھی جب تک اس کے ہمراہ سیاہ
اور سیاہ جوتے استعمال نہ کئے جائیں۔ اپنی کم مائیگی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ اگر شام کے وقت اس رنگ کا لباس پہنا جا
تو اس کے ساتھ لال سلیپر پہننے چاہئیں۔ گلابی رنگ جذباتی عنصر لئے ہوئے محض نوعمر لڑکیوں کے لئے مخصوص ہو چکا
زیادہ عمر کی عورت کو یہ رنگ زیب نہیں دیتا۔ مغربی عورتیں اگر اپنے رومانی عہد رنگیں کی تکمیل ازدواجی زنجیروں سے بچ
طے کرنا چاہیں۔ اور اپنے ہونے والے شوہر سے شادی کی درخواست جلد کروانا چاہیں۔ تو وہ زردی مائل نیلگوں رنگ
کا لباس پہن کر اپنے مقصد کو حل کر لیتی ہیں۔ علاوہ ازیں گلابی یا بھورے رنگ کا لباس بھی یہی اثر پیدا کر سکتا ہے بشرطیکہ
کا رنگ بھی دہی ہو جو لباس کا ہے۔ مگر کوئی رنگ بھی جو بے موقع استعمال کیا جائے۔ مرد کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتا
خانگی زندگی میں مرد اکثر شوخ رنگ کے لباس کو پسند کرتے ہیں۔ سیاہ یا سرخ پاجامہ اور گلابی یا سبز ململ اگر گھر میں استعمال
جائے۔ تو مرد اسے پسند کرتے ہیں۔

اب ہمیں صرف ایک پہلو سے فیشن کا مطالعہ کرنا ہے۔ وہ یہ کہ فیشن کا اخلاق سے کہاں تک تعلق ہے۔ نگاہوں کو خیرہ
کرنے والی مغربی تہذیب کی جھلک ہندوستان کو مدہوش کر گئی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے دل خصوصاً اس تصور
حامل رہے جو انھوں نے مغربی معاشرت میں پایا اور سوائے چند مذہبی آدمیوں کے جنہیں ترقی پسند طبقے نے متعصب ا
قدامت پرست کا لقب دیا۔ باقی ہر فرد اس رَو میں بہ گیا۔ آوازیں اٹھیں تو مسجدوں اور مندروں سے مگر جس طرح کو
سنگدل ایک ہی جنبش پا سے کسی پاؤں پر پڑے ہوئے کو ٹھکرا دے یونہی یہ التجائیں صدا لئے بازگشت ہو کر رہ گئیں۔ یورپ
میں چودہویں صدی عیسوی کے بعد عریاں لباس کے خلاف قانون رائج کئے گئے۔ اور مذہبی ہیجان میں "اصلاح دین" کی بھی
نمایاں سعی کی گئی۔ کہ لباس و آرائش کو ضبط میں لایا جائے۔ یہی وقت تھا۔ جب صنف نازک جوش نمود میں گلے اور سینے
کے بالائی حصّوں کو عریاں کرنے لگی تھیں۔ عیسائیوں کے چند فرقے عورتوں کی اس نمود پرستی کے خلاف جہاد کرنے
مگر اکثریت نے اس جہاد کو سخت کڑی حدوبندی کہہ کر مسترد کر دیا۔ نفسیاتی طور پر نتیجہ یہ ہوا۔ کہ فیشن کا ربط و ضبط
نہ تو مذہب کے ہاتھ میں ہے اور نہ اخلاق کے بلکہ اکثریت کی رائے کے اختیار میں۔ ہندوستان میں دیکھیے۔ زمانہ حاضرہ
کی ایک شائستہ لڑکی اور آج سے پچیس تیس سال پیشتر کی عورت کا موازنہ اسی مسئلے کو خوب ذہن نشین کرائے گا۔ سر سے لیکر
پاؤں تک ایک مکمل تبدیلی ہے۔ دوپٹہ اور سلوار اب بھی ہے اور جب بھی تھی۔ مگر اب دوپٹہ بجائے بالوں، گردن اور
سینہ ڈھانپنے کے محض زینتِ شانہ ہو کر رہ گیا ہے۔ بالوں کی آرائشگی میں لاکھوں فتنے آوارہ ہوتے ہیں۔ اور نام
نہاد سادگی ہی "دامِ ہمرنگِ زمین" بن کر جنسی کشش کا باعث بنتی ہے۔ مگر یہ سب اس لئے ہے کہ اکثریت کی رائے

حقیقت اس کی حامی ہے۔ تجزیہ نفس کرنے والے بتلاتے ہیں۔ کہ کس حد تک نفس غیر شعوری ہماری جنسی خواہش کو نمود پرستی اور لباس کی صورت میں ظاہر کرتا رہتا ہے۔ فرائڈ لکھتا ہے: "اگر سوسائٹی کے تاثرات کی تہ در تہ بندشیں اور جبر و ضبط (REPRESSION) اس خواہش نمود پرستی کو دبا نہ دیں۔ تو یہی خواہش جنون کی صورت میں رونما ہو جائے۔ عورتوں میں جو نمود پرستی کی انفعالی صورت کی حامل ہوتی ہیں یہ خواہش تقریباً ہمیشہ ہی ایک گونہ سگھڑپن سے جنسی حجاب کے عمل تقابلی سے ڈھانپ دی جاتی ہے۔ تاہم اس کے آثار اُن کے لباس سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔"

یہ مسئلہ کہ آیا گلے اور سینے کا عریاں ہونا یا ٹانگوں اور بازوؤں کی نمائش بد اخلاقی میں شامل ہے یا نہیں۔ ہمیشہ سے معرضِ بحث میں آتا رہا ہے۔ یہاں بھی وہی نفسیاتی اصول کار فرما ہے۔ جو لباس میں تھا یعنی یہ کہ اکثریت کی رائے کے مطابق اسے اچھا یا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ روس اور جاپان میں مرد اور عورتوں کا عریاں ہو کر سمندر میں غسل جائز ہے۔ آج کی عورتیں جسم کے ہر زاویے کو نمایاں کرنا باعثِ فخر سمجھتی ہیں۔ لیکن پچاس برس پہلے کے بوڑھے اس کی تاب نہیں لا سکیں گے۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس آج کل کے نوجوان بھی پرانے زمانے کی چولیوں کو جن سے عورت کا پیٹ نکلا رہتا تھا۔ بے حیائی پر محمول کریں گے۔ بقول سمنر "فیشن میں جو بھی ہے ٹھیک ہے"۔

پا بیرے نے سکرٹ کی تاریخ کے ذریعے فیشن کے غیر شعوری پہلو کو یوں ظاہر کیا ہے: "مجھے ۱۹۰۳ء میں جب امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ تو اُس وقت پیرس میں چھوٹے سکرٹ کا رواج ہو چکا تھا۔ میں اپنے ساتھ پیرس سے اپنے دو جسموں کی فلم لیتا گیا۔ جو مروجہ سکرٹ پہنے ہوئے تھیں۔ بلا شبہ سکرٹ چھوٹے تھے۔ مگر نہ اتنے جتنے کہ آج کل سنسر نے محض اس بنا پر فلم روک لیا کہ ننگی ٹانگوں والی عورتوں کی نمائش غیر اخلاقی ہے۔"

نامناسب ہوگا۔ اگر ہم اعتراف نہ کریں۔ کہ فیشن چند ایک مفادات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرائش و لباس میں افادی میلانات بھی پائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ اور درمیانے طبقے کے لوگ لباس میں کوئی غیر معمولی تبدیلی واقع نہیں کرتے۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انہیں دماغ نہیں خندہ بننے دیا جاتا۔ اس لئے انقلابِ فرانس سے لے کر آج تک یورپ و امریکہ میں سوائے چند رسمی موقعوں کے پتلون ہی کا رواج ہے۔ اسی طرح شاید آئندہ نسلوں کی عورتیں جو کاروبار (BUSINESS) میں ہوں اپنے اونچے سکرٹ اور کٹے ہوئے بالوں کو کام میں آسائش کے خیال سے نہ چھوڑ سکیں کہ بفرضِ محال اگر اس قسم کا فیشن تغیر آشنا ہونا بھی چاہے تو اسے مقابلتاً زیادہ وقت لگے گا۔

جب تک موجودہ معاشی تسلسل کی بنائے عقلی سرمایہ دارانہ نظام پر رہے گی۔ کاروباری مفاد کے پیش نظر چھوٹے سکرٹ بریدہ بال اور کھلے بازو شاید استقرار حاصل کر سکیں۔ اور ان کی جگہ کوئی اور لباس فیشن بن جائے۔ کیا عجب کہ ہندوستان میں دھوتی کا ایک دَور اور چل جائے۔

جب تک آدم و حوا کے بیٹے اور بیٹیاں اپنی آبائی بنیادی جبلتوں کے حامل ہیں۔ فیشن کا اثر جانا بعید از قیاس ہے۔ اور ان جبلتوں کو بدلنے کے لئے نہ صرف ایک مہیب عضویاتی تغیر کی ضرورت ہوگی۔ بلکہ ایک شدید انقلابِ معاشرت بھی درکار ہوگا۔

بشیر احمد رازی (ملک)

غزل

ہاں کہہ تو دیا تھا کہ دوست کو مے نوش
کس وجہ سے کس دن یہ کہا تھا نہیں اب ہوش

سونپے کسے پھر زندہ دلی بارِ محبت
ہو مجھ سا گرانبارِ محبت جو سبکدوش

بڑھ جائے نہ کیوں دلکشیٔ شکوۂ بیجا
شکوہ تو ادھورا ہی رہا، ہو گئے خاموش

کیوں ساقیٔ گلچہرہ! کہاں کا ہے یہ انصاف
مینوش تہیدوش! فضا میکدہ بردوش!

حُسنِ طرب انگیز کا خود ہے یہ کرشمہ
مجُھ سے بھی وفاکیش کو سمجھے وہ طرب کوش

کھُلتا نظر آتا ہے مرا غنچۂ خاطر
ہنستے نظر آتے ہیں سمن پاش سمن پوش

رُخ پھیر لیا چشمِ سخنگو کا اِدھر کیوں
کچھ اور گلے کر، میں ابھی ہوں ہمہ تن گوش

چلتے ہوئے فقرے ہیں محبّت کے تقاضے
میں کر نہ سکوں گا ترے فقروں کو فراموش

پوُرے چمنستاں کے یہ سمٹے ہوئے جلوے!
یوُں شبنمِ شاداب گلِ تر کی ہم آغوش

گلشن میں صبا روز یہ گاتی ہوئی آئی
اک لہر میں دو وصف۔ کہیں نیش کہیں نوش

اچھا — یہ صلائے کرم و رند نوازی!
بہتر — یہ جہانِ طرب و بادۂ سرجوش

منظور سمجھتا رہے سرکار کی چالیں
سرکار سمجھتے رہیں منظور کو بیہوش

علی منظور

جالے

(ایک مجلسی تمثیل)

افراد

مشتاق - مشتاق کا دوست - بوب - انگوری -

وقت دس بجے شب **جگہ** مشتاق کا کمرہ -

[ایک اوسط درجے کی حیثیت کے آدمی کا کمرہ ! دائیں جانب ایک اونچا لیمپ رکھا ہے اس کے نیچے ایک چھوٹا سا صوفا بیس - پہلو میں نئی طرز کی ایک خانہ دار میز ہے - میز کے اوپر اور مختلف خانوں میں کتابیں رکھی ہیں - پشت میں دیوار سے لگی کتابوں کی نیچی الماری ہے - اس کے اوپر ایک جانب خوبصورت ٹائم پیس رکھی ہے - دوسری جانب ٹانگوں پر کتاب رکھے بچہ کا چھوٹا مجسمہ ! بائیں جانب ایک صوفا رکھا ہے - دائیں جانب کا دروازہ باہر برآمدہ میں کھلتا ہے - اور بائیں جانب سونے کے کمرے میں جانے کا دروازہ ہے - اس کمرے میں جالے لگے ہیں - کتابیں بے ترتیبی سے پڑی ہیں - ٹائم پیس بند ہے اور مجسمہ کا چہرہ بے التفاتی سے دیوار کی جانب پھرا ہوا ہے -]

[اونچا لیمپ روشن ہے - لیمپ کے نیچے صوفا بیس پر مشتاق بیٹھا ہے - روشنی کتاب پر پڑ رہی ہے - جو اس کے گھٹنوں پر کھلی رکھی ہے مشتاق کا چہرہ اندھیرے میں ہے - آنکھیں سیاہی کے گڑھے میں چمکتی نظر آتی ہیں - چہرا اُترا ہوا ہے اور بدن چھریرا - عمر ستائیس سال ہوگی لیکن روشنی اور اندھیرے کے اس امتزاج میں یادہ عمر کا دھوکا ہوتا ہے - مشتاق ان جوانمردوں میں سے ہے جو اپنی جوانی سے زیادہ بڑھاپے کے نزدیک نظر آتے ہیں - مشتاق اکیلا بیٹھا خیالوں کے جالے بن رہا ہے -

دوست داخل ہوتا ہے - بھرے ہوئے بدن کا ایک خوش باش نوجوان ہے - جسے ابھی تک کبھی سنجیدہ ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی]

دوست: - (آواز دیتے ہوئے) مشتاق !

مشتاق: - (چونک کر گردن پھیر کر دیکھتا ہے) ایں ! کون ؟

دوست: - (جواب میں ہنستا ہے) میں ایک جگہ کھانے پر گیا ہوا تھا - وہ ہیں نا عبداللہ ان کے ہاں - یہ شخص بھی عجیب بے تکے آدمی معلوم نہیں کہاں سے اکٹھے کر لیتا ہے - لیکن دوست کھانا بہت اچھا تھا - پیٹ بُری طرح پھول گیا ہے ... اوہ باہر سردی بھی بہت ہو رہی ہے - (اوورکوٹ اتار کر ایک طرف ڈال دیتا ہے) موٹر بندے کو نصیب نہیں کوئی اور سواری ملی نہیں - پیدل چلا نہیں جاتا - بمشکل تمھارے گھر تک پہنچا ہوں (صوفے پر بیٹھ

جاتا ہے) ایں ایں! یہ نہ سمجھنا تم سے ملنے آیا ہوں
اونہوں... بس ایک سگریٹ پینے۔ سگریٹ کے
دھوئیں سے کھانے کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگا۔ (سگریٹ
سلگاتا ہے اور کش لیکر دھواں چھوڑتے ہوئے) ارے
بھئی تم بھی تو کچھ بولو کیا حال ہے؟

مشتاق:۔ (مسکراکر) حال پوچھتے ہو؟

دوست:۔ (قہقہہ لگاکر) بھئی خوب! میں نے آواز دی تو بڑی
لاپروائی سے ایک نظر ڈالی۔ اتنی دیر بکواس
کرتا رہا وہ سب ان سنی ہوئی۔ اب حال پوچھا
تو ارشاد ہوا (نقل اتارتے ہوئے) حال پوچھتے ہو؟
(بلند آواز میں) ارے میاں سوتے ہو یا جاگتے؟

مشتاق:۔ (کچھ توقف کے بعد) تم جانتے ہو ابھی یہاں
کون آیا تھا؟

دوست:۔ ارے میاں ہوگا کوئی۔ مجھے کیا خبر۔ میں کیا
یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس سردی میں اتنی
رات گئے آنے کی بہت ہمت کی۔ بھینس کی
کھال ہوگی! اچھا تھا کون؟

مشتاق:۔ (کچھ توقف کے بعد آہستہ سے) بوب!

دوست:۔ (حیرت سے) بوب! ہیں! سچ؟ وہ یہاں آئی تھیں؟

مشتاق:۔ ہاں!

دوست:۔ اسی لئے اب تم ہم سے سیدھے منہ بات نہیں
کرتے۔ خوشی سے پھول کر کپّا بنے ہو۔

مشتاق: تم بوب کا یہاں آنا بہت بری بات سمجھتے ہو؟

دوست:۔ ایک دفعہ آ جو گئیں تو اب بیٹھے اترا رہے ہو
(رازدارانہ) اچھا یہ بتاؤ کیسی رہی ملاقات؟

مشتاق:۔ رہتی کیسی؟

دوست:۔ ایں ہیں، یہ نہیں چلے گی۔ بتانا ہوگا!.....
سب کچھ بتانا ہوگا... سمجھے؟

مشتاق:۔ لیکن بتاؤں کیا؟

دوست:۔ یہ بتاؤ کیا کیا باتیں ہوئیں۔ تم نے کیا کہا۔
وہ کیا بولیں؟

مشتاق:۔ باتیں پوری ہوئیں کہاں۔ تم جو آ گئے۔

دوست:۔ (گھبراکر کھڑا ہو جاتا ہے) ایں!..... تو کیا وہ
گئی نہیں؟.... ابھی یہیں ہیں! تم نے مجھے بتایا
نہیں۔ نہیں بھئی، میں مخل ہونا نہیں چاہتا۔ تم
نے کہہ دیا ہوتا تو میں اندر ہی کیوں آتا۔ تم بھی
کیا آدمی ہو (ذرا آہستہ سے) وہ بھی مجھے کوسنے
دے رہی ہونگی کہاں لونڈھکے بینگنے کی طرح آ
ٹپکا۔ (آہستہ سے ہنستا ہے)

مشتاق:۔ کہاں چلے؟..... بیٹھو تو!

دوست:۔ نہیں بھئی۔ کوئی تکلف نہیں ہے۔ بندہ
جا رہا ہے۔ یہ لو سلام!

مشتاق:۔ (اٹھ کر پکڑتا ہے) ارے بھئی آئے ہو تو بیٹھو۔ اس
طرح اٹھ کر جانے کے معنی؟

دوست:۔ نہیں بھئی، تم بیٹھ کر ان سے باتیں کرو۔ انھیں
اکیلا بند رکھنا مناسب نہیں۔

مشتاق:۔ تم سمجھ رہے ہو کہ بوب کو میں نے اس کمرہ میں
بند کر دیا ہے؟

دوست:۔ تو کیا انھیں غسل خانے میں چھپا دیا ہے؟

مشتاق:۔ نہیں بھئی نہیں، تم بیٹھو تو۔

دوست:۔ یا تو ان سے ملنے کے اتنے جتن ہوتے تھے، اور آج
جب وہ آئیں تو انھیں کہیں بند کر دیا ہے اور وہ
بھی میری خاطر، کیا حماقت کی ہے آپ نے؟

مشتاق:۔ تمھارے ذہن میں یہ کیسے بیٹھ گیا کہ میں نے
انھیں کہیں بند کر دیا ہے۔

دوست:۔ تو کیا اب وہ یہاں نہیں ہیں؟

مشتاق:۔ نہیں!

دوست:۔ (حیرت سے) تو وہ گئیں کہاں؟ (غور کرتے ہوئے

میرے آنے تک تم ان سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انھیں جاتے نہیں دیکھا۔ اگر ہوا میں اُڑ گئی ہوں تو دوسری بات ہے!

اق:۔ (کچھ توقف کے بعد) تم نہیں سمجھ سکتے۔

ست:۔ میں سمجھ نہیں سکتا۔ یا تم یونہی بے پر کی اڑا رہے ہو

اق:۔ یہی سمجھ لو۔

ست:۔ (بگڑ کر) تو اس کے معنی ہیں کہ آپ مجھے بیوقوف بنا رہے تھے۔

تاق:۔ نہیں! نہیں!! نہیں!!!

ست:۔ تو پھر یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے؟

تاق:۔ تم ذرا بیٹھو تو اطمینان سے بتاتا ہوں۔

ست:۔ زیادہ کھا لینے کے بعد اطمینان سے بیٹھنا تو مشکل ہے (بیٹھ جاتا ہے) اچھا خیر تم بتاؤ۔

تاق:۔ بتاؤں کیا... جب میں رات کو اکیلا بیٹھتا ہوں اور تنہائی سے طبیعت گھبراتی ہے تو میں لُوب سے باتیں کرتا ہوں۔

وست:۔ تو آپ بیٹھے تصور میں ان سے باتیں کر رہے تھے (قہقہہ لگا کر) بہت خوب!

شتاق:۔ (غصے سے) تم بالکل گدھے ہو؟

وست:۔ (ہنستے ہوئے) اور تم سے بڑا گدھا کون ہوگا۔ آپ اتنے دنوں سے لوب کی محبت کا دم بھر رہے ہیں اور آج تک کیا کیا؟ .... تصور میں باتیں! (ہنس کر) خوب!

شتاق:۔ (چڑ کر) تم چاہتے ہو کہ میں لوب کے آگے پیچھے چکر لگایا کروں۔ اپنی اوقات ضائع کروں؟

وست:۔ ادھ! اس میں اوقات ضائع ہونے کی کیا بات ہے۔ نکڑ والے بنگلے میں وہ رہتی ہیں۔ مشکل سے ۵۰ قدم پر۔ اگر اتنی دور بھی جاتے تمھارے پیر دکھتے ہیں تو ہو چکی دل لگی۔ تمھیں ان سے کچھ محبت بھی ہے یا یونہی ہائے دیا مچا رکھی ہے؟

مشتاق:۔ (چند لمحہ خاموشی کے بعد) میری کیفیت یہ ہے کہ میرے پاس سب کچھ ہے۔ رہنے کے لئے متوسط درجے کی جگہ ہے جس میں گنجائش زیادہ ہے اور آرام کم۔ خرچ کے لئے معقول آمدنی جس میں آسودگی سے بسر ہو سکتی ہے۔ اس غریب اور مفلوک الحال ملک میں تم جیسے مخلص دوست جن میں خلوص زیادہ ہے اور دوستی کم ــــ مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اکثر جب میں تنہا سڑکوں پر ٹانگیں تھکاتا پھرتا ہوں یا ایسی خنک راتوں میں جب میں تنہا کمرے میں بند بیٹھا اپنے دل کی دنیا کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ اس ساری بے کیف زندگی میں اگر کچھ رنگینی نظر آتی ہے، تو وہ لوب ہے۔

دوست:۔ یہ لمبی لمبی باتیں تو میں جانتا نہیں، میں تو یہ جانتا ہوں، آدمی میں جذبات ہوں، ادھر رنگ روپ اچھا ہو اور التفات، تو پھر سب کچھ ہے۔

مشتاق:۔ یہی تو مصیبت ہے۔

دوست:۔ تم ایک کام کرو

مشتاق:۔ کیا؟

دوست:۔ انھیں ایک پرچہ لکھ بھیجو۔

مشتاق:۔ (ٹھنڈا سانس لیکر) ایک نہیں کئی لکھ چکا ہوں۔

دوست:۔ (تشویش سے) کوئی جواب آیا؟

مشتاق:۔ پہلا پرچہ پہنچنے کے بعد دوسری صبح جو نظر آئیں تو ذرا مسکرائیں۔ کچھ دنوں کے بعد دوسرا پرچہ بھیجا۔ اس کے پہنچنے کے بعد کئی دن سامنے نہیں آئیں۔ بڑی مشکل سے انھیں دیکھ پایا تو مُنہ پھولا ہوا تھا۔

دوست:۔ پرچہ بھیجا کس کے ہاتھ تھا؟

مشتاق:۔ وہ ہے نا پیچھے دھوبن، اس کی لڑکی انگوری کے ہاتھ!

دوست:۔ اس سے پوچھا ہوتا نا! کچھ مسکرائی وسکرائی تھیں یا نہیں؟

مشتاق:۔ دھمکایا تھا کہ اگر ایسے پرچے لائے تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔

دوست:۔ ایک اور پرچہ بھیجتے! ہیں! بس یہیں تو مات کھا گئے تم!

مشتاق:۔ ارے بھئی، ایک نہیں دو اور بھیجے۔

دوست:۔ ہیں! (حیرت سے) تو پھر؟

مشتاق:۔ ایک چھوٹا سا پرچہ ملا۔ جس میں پرچے مت لکھو کا فرمان تھا۔

دوست:۔ (سوچتے ہوئے) وہ تمھیں اب پہچانتی تو اچھی طرح ہیں۔ یہ بھی جانتی ہیں کہ تم ان سے محبت کرتے ہو۔ کہیں موقع سے جب اکیلی ملیں تو بات کر ڈالو۔

مشتاق:۔ پھر؟

دوست:۔ (سوچتے ہوئے) پھر!..... پھر!! پھر ایک دفعہ اور بات کرنا۔

[مشتاق کچھ جواب نہیں دیتا۔ ہاتھ بڑھا کر شیلف میں سے ایک کتاب نکالتا ہے اور اس میں سے ایک تصویر.....]

مشتاق:۔ (دیتے ہوئے) یہ دیکھو!... بوب کی تصویر!

دوست:۔ (حیرت سے) سچ!..... مرداں چنیں کنند..... ہاتھ کیسے لگی یہ تو بتاؤ استاد!

مشتاق:۔ میں نے یہ کتاب انھیں Oxford Book Depot کے ذریعہ بھجوائی تھی۔ ایک ہفتہ بعد یہ کتاب واپس آئی۔ اندر یہ تصویر رکھی ہوئی تھی۔

دوست:۔ (ہنستا ہے) بہت خوب۔ داد دینی پڑتی ہے اُن کی۔ یہ بھی جان لیا کہ کتاب تم نے بھیجی ہے۔ اور تصویر بھی کس ادا سے بھیجی ہے۔ یعنی رکھ دی کتاب میں واپس کرتے ہوئے۔

مشتاق:۔ لیکن یہ تو یقین نہیں کہ جان بوجھ کر تصویر یہ ہے یا اتفاق سے کتاب میں رکھی چلی آئی۔

دوست:۔ ارے یار میں جانتا ہوں ان لڑکیوں کو۔ بڑی مکّار ہوتی ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ تم بُری طرح ریجھی ہوئی ہیں۔ یہ حسن کا نام بوب مان بھی لو میری بات!

مشتاق:۔ اچھا مان لی۔ پھر؟

دوست:۔ اونہوں، یوں کام نہیں چلے گا۔ کل ہی صبح اپنے سامنے کمرہ صاف کراؤ، اچھی طرح سے.. یہ سب جالے نکلواؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دیوار سے رال ٹپک رہی ہے۔ وہ اوپر کے روشن دان بھی کھلواؤ۔ کمرے کی غلیظ بو دور ہو۔ اور ہاں تمھارے پاس کوئی اچھی تصویر وصویر نہیں ہے اسے لگاؤ نا ـــ یہ ہونق سی دیواریں کیا اچھی لگتی ہوتی ہیں۔ ارے لاحول ولاقوۃ..... اب یہ بھی میں تمھیں بتاؤں۔ ان شیشہ لگے دروازوں پر پردے ڈالو..... سمجھے؟

مشتاق:۔ تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے!

دوست:۔ ٹھیک بات بتاؤ تم تو کاٹنے کو دوڑتے ہو

مشتاق:۔ آخر تمھارا ان باتوں سے مطلب کیا ہے؟

دوست:۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جب وہ آئیں گی تو اُنھیں بٹھاؤ گے کہاں۔ باہر سڑک پہ؟

مشتاق:۔ تمھارے سر پہ۔

دوست:۔ (بگڑ کر) یہ کیا مذاق ہے۔

مشتاق:۔ کھانے کے بخارات تمھارے دماغ پر چھا گئے ہیں۔ تم اب جا کر سو جاؤ۔

دوست:۔ تمھارا خیال ہے میں بکواس کر رہا ہوں۔

مشتاق:۔ نہیں نہیں۔ یہ میں نے کب کہا ہے

یوسف:۔ تم چاہتے ہو میں یہاں سے دفع ہو جاؤں۔ اچھی بات ہے (گھڑی دیکھ کر) رات بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ میں گھر جا کر سوتا ہوں

مشتاق:۔ تم یہیں کیوں نہیں سو جاتے۔

یوسف:۔ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ اس سردی میں اب کون گھر جائے۔ نیند بھی خوب آ رہی ہے۔

مشتاق:۔ اس کمرے میں میرا بستر بچھا ہوا ہے!

یوسف:۔ اچھا تو میں اب جا کر لمبی تانتا ہوں۔ تم کہیں اور پڑ رہنا۔ مجھے مت جگانا، ورنہ ایک آدھ دھر دوں گا۔ ہاں!

مشتاق:۔ اچھا تم جاؤ۔ سو جاؤ۔

یوسف:۔ (جاتے ہوئے) اور تم کب تک بیٹھے تارے گنو گے؟

مشتاق:۔ ابھی نیند نہیں آ رہی!

یوسف:۔ (دروازے میں سے) یہ کیوں نہیں کہتے کہ نُوب کا انتظار ہو رہا ہے۔

(قہقہہ لگاتا بائیں جانب کے دروازے سے چلا جاتا ہے)

مشتاق:۔ نالائق کہیں کا!

یوسف:۔ (دوسرے کمرے میں) ارے کوئی پاجامہ واجامہ بھی ہے۔ یا پھر جیسے دنیا میں آئے تھے ویسے ہی...

مشتاق:۔ (بات کاٹ کر بلند آواز میں) نہیں نہیں یہ حرکت نہیں ہو گی۔ وہ کھونٹی پر جو اجلا پاجامہ ہے نا..... وہ پہن لو۔

[مشتاق کمرے میں بیٹھا اس کتاب کے ورق الٹ رہا ہے جو نُوب کے پاس سے واپس آئی ہے۔ اس میں سے نُوب کی تصویر نکال کر دیکھتا ہے اور خیالوں کے جالے بنتا ہے۔ دروازے پر آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ ہوتی ہے]

مشتاق:۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟..... اتنی رات گئے کون آیا ہو گا؟

[دوبارہ آہستہ سے کھٹ ہوتی ہے۔ چوڑیوں کی ہلکی سی جھنکار سنائی دیتی ہے]

مشتاق:۔ (چونک کر) چوڑیوں کی آواز؟.... (جلدی سے دروازہ کھولنے کو لپکتا ہے.... دروازہ کھول کر) کون ہے؟ (گردن نکال کر دیکھتا ہے) کون؟...... (باہر اندھیرا گھپ ہے) یہاں تو کوئی نہیں (واپس آ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

[نُوب دروازہ کھول کر اندر آتی ہے۔ سادے کپڑوں میں معمولی شکل و صورت کی جوان لڑکی ہے۔ اندر آنے کے بعد کچھ گھبراتی ہے۔ کمرے کی فضا اسے نہیں بھاتی۔ مشتاق کو دیکھ کر اپنے کو کوستی ہے کہ کیوں یہاں چلی آئی۔ واپس پلٹتی ہے اور باہر جانا چاہتی ہے۔]

مشتاق:۔ (قدموں کی آہٹ سن کر) کون؟ (مڑ کر دیکھتا ہے حیرت سے) نُوب! (گھبرا کر کھڑا ہوتا ہے)۔

نُوب:۔ میں آئی تھی!

مشتاق:۔ آئیے آئیے۔ یہاں بیٹھئے آپ......

نُوب:۔ شکریہ!..... میں خود بیٹھ جاؤں گی۔ آپ میرے پاس زیادہ آنے کی کوشش نہ کیجئے۔ (بیٹھ جاتی ہے)

مشتاق:۔ ابھی آپ ہی نے دروازے پر کھٹ کھٹ کی تھی؟

نُوب:۔ جی ہاں!

مشتاق:۔ لیکن جب میں نے دروازہ کھولا تو آپ نظر نہیں آئیں

نُوب:۔ میں دروازے کے پیچھے ہو گئی تھی۔

مشتاق:۔ (ہنس کر) اوہ!

نُوب:۔ (شال میں سے ایک پرچہ نکال کر دیتے ہوئے) یہ آپ کا بھیجا ہوا پرچہ ہے؟

مشتاق:۔ پہنچ گیا تھا آپ کو؟

نُوب:۔ ذرا پڑھئے تو کیا لکھا ہے؟

مشتاق:۔ آپ نے نہیں پڑھا
لوب:۔ میں نے تو پڑھا ہے۔ لیکن آپ بھی تو ذرا پڑھیئے۔
(مشتاق خاموشی سے پڑھتا ہے)
لوب:۔ آواز سے پڑھیئے نا!
مشتاق:۔ (کوشش کرتا ہے لیکن بے سود) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!
لوب:۔ مطلب یہ کہ جو باتیں آپ نے اس پرچے میں لکھ رکھی ہیں وہ زبان پر لانے کے قابل نہیں ہیں آپ کو یہ باتیں نہ لکھنی چاہیئے تھیں۔
مشتاق:۔ (شرمندگی سے) میں بہت شرمندہ ہوں۔
لوب:۔ اگر یہ پرچہ کسی اور کی نظر پڑے تو وہ مجھے کیا سمجھے گا؟
مشتاق:۔ (پھاڑ دیتا ہے) میں پرچہ پھاڑے دیتا ہوں۔ اب تو معاف کر دیجیئے، بس!
لوب:۔ اور آپ کی اس انگوری نے جو ناک میں دم کر رکھا ہے۔
مشتاق:۔ وہ کیا کرتی ہے؟ میں نے تو اس سے کچھ نہیں کہا
لوب:۔ خوب دیدے مٹکاتی ہے۔ کولھے مٹکاتی ہے۔ ہنستی ہے۔ اور کیا... میں جل کر رہ جاتی ہوں)۔
مشتاق:۔ بڑی نالائق ہے۔ آنے دیجیئے اب کے میں ٹھیک کر دوں گا۔ اس کی پھر مجال نہیں ہوگی کہ آپ کے ساتھ ایسی حرکت کرے۔
لوب:۔ بس اب آپ اور پرچے مت بھیجیئے گا۔ وہ خود ٹھیک ہو جائے گی۔
مشتاق:۔ آپ ناراض ہو گئی ہیں؟
لوب:۔ اور آپ نے مجھے یہاں آنے کو کیوں لکھا تھا؟
مشتاق:۔ (مسکرا کر) یونہی!
لوب:۔ یونہی سے مطلب؟
مشتاق:۔ (ہمت سے) لوب! (اٹھ کر لوب کی طرف بڑھتا ہے)
لوب:۔ نہیں نہیں آپ وہیں تشریف رکھیئے۔

مشتاق:۔ لیکن لوب!......
لوب:۔ میں اب جاتی ہوں...
مشتاق:۔ ابھی تو آپ آئی ہیں۔
لوب:۔ آپ نے بلایا تھا۔ میں آ گئی۔ بس میں اب جاتی ہوں اور ہاں دیکھیئے۔ اب دوبارہ مت بلائیے گا۔
مشتاق:۔ ذرا تو ٹھہریئے۔
لوب:۔ اگر مجھے دیر ہو گئی تو مصیبت آ جائے گی۔
مشتاق:۔ ایسی ہی جلدی تھی تو آئی کیوں تھیں؟
لوب:۔ آپ کو بتانے کہ پرچے بھیجنے بند کر دیجیئے۔
مشتاق:۔ یہ تو آپ کے بتانے سے پہلے بھی میں جانتا تھا۔ آپ کیا کوئی بھی شریف لڑکی یہ بات پسند نہ کرے گی کہ اس کے پاس اس طرح کے پرچے آئیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں نے پرچے بھیجے۔ اس کی وجہ..... میرا مطلب ہے کہ... یعنی.... محض والہانہ پن اور کیا جوانی میں ایسی جرأت کبھی خود بخود ہو جاتی ہے۔ اگر آپ یہاں نہ بھی آتیں تو میری خودداری خود مجھے اور پرچے بھیجنے سے روک دیتی۔
لوب:۔ تو یہ اچھا ہی ہوتا۔
مشتاق:۔ لیکن آپ یہاں جو آئیں یہ اچھا نہیں ہوا۔
لوب:۔ کیوں کسی نے دیکھ تو نہیں لیا؟
مشتاق:۔ نہیں نہیں!
لوب:۔ اس کمرے میں کون ہے؟
مشتاق:۔ کوئی نہیں، میرے ایک دوست سو رہے ہیں۔
لوب:۔ ہائے اللہ! آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟
مشتاق:۔ وہ تو بےخبر سو رہے ہیں۔ انھیں کچھ خبر نہیں ہوگی۔
لوب:۔ اگر انھوں نے میری آواز سنی ہوگی تو کیا کہا ہوگا؟
مشتاق:۔ میں کہہ جو رہا ہوں انھوں نے کچھ نہیں سنا۔
لوب:۔ بس میں اب جاتی ہوں۔
مشتاق:۔ (آہستہ آواز میں) میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟

رُوب :۔ جلدی کیجئے۔

مشتاق :۔ آپ مجھے پسند کرتی ہیں؟

رُوب :۔ (شرماکر) یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟

مشتاق :۔ جاننے کے لئے۔

رُوب :۔ بیکار بات جاننے سے کیا فائدہ؟

مشتاق :۔ آپ کا کچھ حرج ہے؟

رُوب :۔ دیکھئے۔ اگر آپ کو ایسا ہی اصرار ہے تو آپ میرے ابا جان کے پاس جائیے۔ اگر وہ آپ کو پسند کر لیں گے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ آپ کی قسمت!

مشتاق :۔ لیکن آپ کا بھی تو کچھ عندیہ معلوم ہو؟

رُوب :۔ اگر ابا جان نے میری مرضی پوچھی تو میں انھیں بتا دوں گی۔

مشتاق :۔ کیا؟

رُوب :۔ جو کچھ وہ مناسب سمجھیں گے ٹھیک ہی ہوگا۔

مشتاق :۔ (تنک کر) اوہ۔ یہ تو میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ آپ نے بھی ہندوستان کی اور لڑکیوں کی طرح اپنے خاوند کا انتخاب اپنے ابا جان پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ کسی دن کہیں سے کوئی بیل پکڑ لائیں گے اور آپ اس کے ساتھ نتھ جائیں گی۔ آپ کے لئے ایک بیل اور دوسرے بیل میں بھلا کیا فرق ہو سکتا ہے۔ آپ کو بیلوں کی بھلا کیا پہچان؟

رُوب :۔ دیکھئے آپ بُرا مت مانیئے۔ میں آپ کو بہت کم جانتی ہوں۔ میں نے آپ کو صرف چند مرتبہ دیکھا ہے نہ دیکھنے کے برابر۔ چند آپ کے پرچے پڑھے ہیں۔ ایک کتاب ملی۔ مجھے انگریزی زیادہ نہیں آتی اور انگریزی ادب سے بالکل لگاؤ نہیں۔ طبیعت پر زور دے کر بھی اسے آخر تک نہیں پڑھ سکی۔ اب آپ ہی بتایئے میں آپ کی بات کا جواب کیسے دوں؟

مشتاق :۔ لیکن رُوب! میں بھی تو تمھیں بہت کم جانتا ہوں۔ پھر بھی میں تمھیں جانتا ہوں۔ میرے اندر سے کوئی کہتا ہے۔ میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ پہچان لیا۔ اور میں جانتا ہوں وہ ٹھیک کہتا ہے۔

رُوب :۔ مجھ سے تو کوئی نہیں کہتا۔

مشتاق :۔ رُوب! تم عورت ہو۔ یہ بات تو کوئی اگر مرد کے کانوں میں کہتا ہے۔ پھر مرد کانپتے ہوئے ہونٹوں سے چپکے سے عورت کے خوبصورت نازک سے چہرے کے کان میں کہتا ہے ...... آہستہ سے کہتا ہے، "تم میری ہو۔"

رُوب :۔ کیا؟

مشتاق :۔ تم میری ہو۔

رُوب :۔ پھر!

مشتاق :۔ (مسکرا کر) تم بیوقوف بننے کی کوشش کر رہی ہو۔

رُوب :۔ (مسکرا کر) اور آپ کا خیال ہے کہ میں بہت عقلمند ہوں۔ ...... (چاروں طرف دیکھتے ہوئے) اچھا دیکھئے آپ کے گھر میں کوئی نوکر نہیں ہے؟

مشتاق :۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟

رُوب :۔ آپ اس سے کمرہ صاف کیوں نہیں کراتے؟

مشتاق :۔ اوہ! (ہنستا ہے) آپ کو بُرا لگتا ہے اس طرح سے پڑا ہوا کمرہ!

رُوب :۔ ذرا دیکھئے تو کس قدر جالے لگے ہوئے ہیں۔ نہ دیواروں پر کوئی تصویر ہے۔ نہ کرسیوں پر کشن ہیں۔ دروازوں پر پردے بھی تو نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مدتوں سے اجاڑ پڑا ہو۔

مشتاق :۔ (ہنس کر) میرے خیال سے زیادہ تمھیں اس کمرہ کا خیال ہے۔ یہ کمرہ اجڑ رہا تو کیا ہوا۔ مکڑیوں نے اپنے جالوں سے اسے بھر دیا ہے۔ میں بھی یہاں مکڑی کی طرح اکیلا بیٹھا خیالوں کے خوبصورت جال بُنا کرتا تھا۔ تم کبھی یہاں آؤ گی اور تمھاری ہنسی اس کمرے کی

ساری فضا کو بدل دے گی۔ دروازوں پر ایسے رنگین
پردے پڑ جائیں گے۔ جیسے کوئی ہنستے ہنستے شرما جائے
دیواروں کے منہ سے ٹپکتی رال غایب ہو جائے گی۔ اور
ایسا تبسم کھل جائے گا جیسے کرشن کے چھونے کے انتظار
میں کھڑی رادھا کے لب مسکرائے ہوں۔

پُوب:۔ (ہنستی ہے) آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔

مشتاق:۔ ایک بار پھر ہنسو پوب۔!

پُوب:۔ (حیرت سے) کیوں؟

مشتاق:۔ اس کمرے کی خاطر۔

[پوب خوب ہنستی ہے۔ ہنسی سارے کمرے میں گونجتی
ہے۔ انگوری دروازے میں سے جھانکتی ہے۔
اچھے پکے رنگ کی شوخ سی لڑکی ہے۔ اپنے گول
گول دیدے مٹکا کر سارے کمرے کا جائزہ لیتی ہے]

انگوری:۔ پُو پُو جی!

پُوب:۔ (ایک دم رک کر آہستہ آواز میں) انگوری کی بچی!

انگوری:۔ (آہستہ آواز میں خوب کھینچ کر) بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔

پُوب:۔ (کھنچی ہوئی آواز میں) آئی!

[انگوری جلدی سے اپنی گردن باہر نکال لیتی ہے]

مشتاق:۔ (گھبرا کر) یہ تو بہت برا ہوا پوب! انگوری کہیں
جا کر کہہ نہ دے۔

پُوب:۔ اس کمبخت سے ایک پانچ منٹ بھی تو انتظار
نہیں ہوا۔

مشتاق:۔ (حیرت سے) یہ باہر کھڑی ہوئی تھی؟

پُوب:۔ ہاں!

مشتاق:۔ تم اسے ساتھ لائی تھیں؟

پُوب:۔ (مسکرا کر) ہاں مجھے آپ سے ڈر لگتا تھا۔ اب
بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ اس کمرے کے جالے کہیں مجھے
لپٹ نہ جائیں۔

مشتاق:۔ (مسکرا کر) پھر تم ہنسنے کی کوشش کر رہی ہو پوب!

پوب:۔ اچھا دیکھئے آپ انگوری کو کچھ نہ بتایئے گا۔

مشتاق:۔ لیکن اسے معلوم ہو ہے کہ.....

پُوب:۔ نہیں۔ یہ بات نہیں.... آپ اسے یہ نہ بتائیےگا
کہ باتیں کیا ہوئیں!

مشتاق:۔ اچھا!

پُوب:۔ اس کے ہاتھ اب کوئی اور پرچہ بھی مت بھیجیے گا۔

مشتاق:۔ لیکن پُوب!

پوب:۔ انگوری کو تو بس یہ معلوم ہے کہ اب میرا آپ کا
کوئی تعلق نہیں۔

مشتاق:۔ اور میں کیا سمجھوں؟

پُوب:۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) اوہ! تو آپ کو اب کیا
دوبارہ سمجھانا پڑے گا۔

مشتاق:۔ نہیں پوب! میں اب اور کچھ سمجھنا نہیں چاہتا۔
میں مکڑی کی طرح اکیلا بیٹھا خیالوں کے خوبصورت
جال بنایا کروں گا۔ تم کبھی کبھی آ کر مسکرا دینا۔

[پوب ہنستی ہے ہنسی کمرے میں گونجتی ہے انگوری
دروازے میں سے پھر جھانکتی ہے]

انگوری:۔ پُو پُو جی! بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔

پُوب:۔ آتی ہوں۔ (مشتاق سے) اچھا میں اب جاتی ہوں

مشتاق:۔ لیکن پُوب سنو تو!

پُوب:۔ کیا ہے؟

مشتاق:۔ تم یہاں پھر آنا۔ اس کمرے کی خاطر۔

پُوب:۔ (مسکرا کر) اونہوں۔ مجھے ان مکڑی کے جالوں سے
ڈر لگتا ہے۔

مشتاق:۔ نہیں۔ ان دیواروں کے منہ سے رال نہیں ٹپکے
گی۔ اب جالے نہیں رہیں گے۔

انگوری:۔ (تنک کر) پُو پُو جی!

پُوب:۔ ارے آئی۔

[جلدی سے بھاگ جاتی ہے]

مشتاق:۔ (آواز دیتے ہوئے) بُوب!

(دروازے کی طرف جاتا ہے۔ باہر اندھیرے میں دیکھتا رہتا ہے۔ پھر دروازہ بند کر کے واپس آجاتا ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر خیالات جمع کرنے لگتا ہے دوسرے کمرے سے دوست آتا ہے۔)

دوست:۔ کیا مصیبت ہے۔ یہ جناب کا پاجامہ ہے جو پنڈلی پر پھنس گیا ہے۔ تمہاری ٹانگیں ہیں کہ کھپچیاں ۔۔ اب مجھ سے سویا کیسے جائے گا۔ چلو اتارو اسے۔ (ٹانگ آگے بڑھاتا ہے)

مشتاق:۔ (آہستہ سے رازدارانہ) بُوب آئی تھیں!

دوست:۔ (حیرت سے) بوب! (قہقہہ لگاتا ہے) خواب میں یا خیال میں؟

مشتاق:۔ (سنجیدگی سے) ابھی ابھی گئی ہیں۔

دوست:۔ سچ! یہ (نقل اتارتے ہوئے) "ای" کی آواز انہی کی تھی۔

مشتاق:۔ ہاں!

دوست:۔ تو کیا مِلی بھی گئیں؟

مشتاق:۔ ہاں!

دوست:۔ تو اتنی سی دیر میں ہوا کیا ہوگا۔ مجھ سے تو اتنی دیر میں پاجامہ بھی مشکل سے پہنا گیا۔

مشتاق:۔ وہ ہنسی تھیں۔

دوست:۔ ہنسی تھیں۔ کیا مطلب؟

مشتاق:۔ وہ ہنسی تھیں۔ کس قدر حسین ہنسی۔ ان کی ہنسی سارے کمرے میں گونجی اور میں نے دیکھا کہ کمرے کی ساری گھٹا ہنس رہی تھی۔ اور تم دیکھنا کہ میں اب یہ سارے جالے صاف کر دوں گا۔ دیواروں کے منہ سے اب رال نہیں ٹپکے گی ــــــ

(پردہ)

ناصر شمسی

غزل

گلشن چمک اُٹھے گل و لالہ سنور گئے
جلوے ترے جمال کے ہر سو بکھر گئے

دیکھا ترے خیال میں جب سوئے آسماں
ماہ و نجوم اور زیادہ نکھر گئے

وہ چاندنی، وہ صحنِ گلستاں، وہ حُسنِ دوست
کچھ خواب تھے کہ راہِ نظر سے گزر گئے

روشن تھی جن کے نور سے بزمِ طرب کبھی
یارب وہ خوشگوار نظارے کدھر گئے

جنّت بدوش جن کے کرم سے تھی زندگی
کس سرزمیں میں جانے وہ شام و سحر گئے

اے مرگِ چارہ ساز تری جستجو میں ہم
ہر منزلِ جہاں سے سلامت گزر گئے

منزل نے بار بار پکارا ہمیں ضمیر
ہم بے خبر خود اپنی ہی دُھن میں گزر گئے

ضمیر اظہر

انتباہ

کیوں مرے حال پہ یوں تم نے عنایت کی ہے؟
اس سے پہلے بھی مسافر کئی آئے ہیں یہاں
اور گونجے ہیں اسی راہ میں نغمے جن سے
ایک اک گام پہ تاروں کا گماں ہوتا تھا
کئی آئندہ بہاروں کا گماں ہوتا تھا
لیکن اس تلخئ انجام کو کیا کوئی کہے
اُف یہ غم خانۂ دل کی ابدی تاریکی
تم نے کیوں آج یہاں آنے کی زحمت کی ہے؟

چُپ کھڑی سوچ رہی ہو، کہو کچھ تم بھی کہو
میں نے پہلے بھی کئی بار یہ کوشش کی ہے
آرزو میرے مقدّر کی سیاہی نہ بنے
زندگی بُجھتی ہوئی شام کی تصویر نہ ہو
یہ مگر ظلمتِ غم بڑھتی رہی بڑھتی رہی
تم سے پہلے بھی یہاں جتنے ستارے اُبھرے
کھو گئے تیرہ و تاریک فضاؤں میں تمام
اور اب تم بھی چلی آئی ہو اختر بن کر
ان دھندلکوں کو بدل سکتا نہیں کوئی نظام
میں نے ماضی کے دفینوں سے یہی پایا ہے
تم انھیں دیکھ کے گھبرا تو نہیں جاؤ گی
اب بھی جا سکتی ہو گر لوٹ کے جانا چاہو

(حلقہ اربابِ ذوق شاخ دلّی) اختر ہوشیارپوری

بے شرم

بات سچی تھی۔ وہ اپنے میں عجیب کیفیت سی محسوس کرتا تھا۔ ایک طرح کا اشتعال جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔
کیا یہ جذبات کا تلاطم تھا۔ جو حسین منظر دیکھ کر خود بخود پیدا ہو گیا تھا؟ یا اُن فطری کمزوریوں کا اُبال جو صحت مند ماحول کے اثر سے آگیا تھا۔ بہرکیف کچھ نہ کچھ تھا۔ جسے وہ بیان نہیں کر سکتا تھا اور صرف محسوس کر سکتا تھا۔ مٹی کی جھُلسانے والی گرمی سے بھاگ کر وہ اس وقت اس وادی میں تھا۔ جو سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھی۔ جہاں ہر طرف قدرت کی صناعی کے لازوال شاہکار، خاموش اور سنجیدہ آرٹ اور اَدب کے زندۂ جاوید جواہر پارے بکھرے ہوئے تھے۔ جہاں ہر چٹان کی چھاتی پر، ہر درخت کے سینے میں اِن شاہکاروں اور جواہر پاروں کے نقوش کندہ تھے۔ جہاں پتھروں سے ٹکرائے ہوئے پانی کے شور میں ایک جاں نواز نغمہ پوشیدہ تھا۔ اور ہوا کی سرسراہٹ میں وہ آواز جس نے کبھی آدم کا استقبال کیا تھا۔ یقیناً جنت سے نکالے جانے کے بعد آدم نے اپنے آپ کو اس ماحول میں پا کر زیادہ افسوس نہیں کیا ہوگا اور پھر جنت ـــــ ہے کیا۔ محض عقیدت کو زندہ رکھنے کا فرسودہ حربہ!

وہ خوش تھا مشتعل تھا۔ پُرسکون تھا۔ اُس کے سامنے حدِ نظر تک جنگلوں سے بھرے ہوئے پہاڑ تھے اور پہاڑ کے دامن میں بہتی ہوئی ندی دونوں ہنس رہے تھے۔ اِن کی ہنسی میں اُسے ایک طعنہ سا سنائی دیا۔ "تم یہاں کس لئے آئے ہو۔ اِس وادی میں تمہارا کیا کام؟ مصنوعات کی تخلیق کر کے اپنے آپ کو سُورما کہنے والو، ہمارا ادب اور آرٹ تمہارے ادب اور آرٹ سے یکسر مختلف ہے۔ اِن دونوں میں کہیں بھی ہم آہنگی نہیں۔"

وہ چونک پڑا۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ پہاڑ اور ندی اُسے طعنے دے رہے ہیں۔ نہیں اب نہیں ہو سکتا۔ قدرت کے یہ بے زبان نباتاتی اور جماداتی مجسمے آلِ آدم کو طعنے نہیں دے سکتے۔ جس نے انہیں سنوارا، انہیں حسین بنایا۔ یہ دراصل جذبات کا تاثر ہے، حسین جذبات کا تاثر۔ جو حسن اور جاذبیت کی تپش محسوس کر کے پارے کی طرح کمزور جگہوں کو چیر پھاڑ کر مچلنے کے لئے باہر نکلتے ہیں۔ اور پھر وہاں کوئی متنفس بھی نہ تھا۔ صرف اُس سے کچھ دُور بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ تھا۔ اور چیل کے لمبے لمبے سایوں میں سوئے ہوئے چرواہے ـــ جنھوں نے اُسے دیکھا تک نہ تھا۔

لیکن طعنے پھر بھی سنائی دے رہے تھے۔ اور ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ بالکل اُن بدمذاق اور آوارہ نوجوانوں کی طرح جو کامیاب ہڑتال کے بعد کسی کارخانے کے احاطے میں بجاتے ہیں۔ اور کارخانے دار کو شکست کا تدبیر احساس دلاتے ہیں۔
"کیا یہ سارا ہنگامہ بھی ایک کارخانہ ہے؟" وہ سوچنے لگا۔ "اور یہ پہاڑ، ندیاں، درخت، ہوا اِس کارخانے میں کام کرنے مزدور، لیکن اِن کے چہروں پر اطمینان کی یہ جھلک کیوں ہے؟ کیا ان کی اجرتیں معقول ہیں۔ اور کام کرنے کے اوقات مقرر؟"
وہ اِنہی خیالات میں ڈوب گیا۔ ہنگامی سکون کے بعد اُسے عجیب طوفان سے دوچار ہونا پڑا! ۔ حالانکہ وہ اسی طوفان سے بچنے کے لئے احمد آباد سے یہاں آیا ہوا تھا۔ کون جانے اُس کے کارخانے میں اِن دنوں کیا ہوا ہوگا ـــ ہڑتال، جلسے، نعرے لاٹھی چارج یا بالآخر مفاہمت، کارخانہ دار کی شکست اور بدمذاق مزدوروں کی سیٹیاں اور قہقہے ـــ انقلاب زندہ باد کے

نغرے ۔۔۔ اور مبارک بادیاں ۔۔! عام طور پر ایسی حالت میں وہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا تھا، کوئی جاسوسی ناول یا رومان سے بھرے ہوئے گیتوں کا مجموعہ جنہیں سیاسیات سے کوئی تعلق نہ ہو ۔ کارخانہ دار اور مزدور سے واسطہ نہ ہو لیکن یہاں اُس کے پاس ایسی کوئی کتاب نہ تھی ۔ سوائے بالِ جبریل کے، جس کا وہ طالب علمی کے زمانے سے بے حد دلدادہ تھا ۔ وہ اُسے اقبال کا شاہکار سمجھتا تھا ۔ اُس نے کتاب کھولی ۔ اور آدم کا استقبال پڑھنے لگا ۔ لیکن آج وہ پڑھ نہیں سکا ۔ نظم کے تمام حروف اور مصرعے ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے نظر آنے لگے ۔ ایک خاص ولولے اور جوش کے زیرِ اثر، غیر منظم صورت میں، کیا یہ حروف بھی ایک طرح کے مزدور رہیں ۔۔؟ خیالات کے مزدور، جو اپنے آقا کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں ۔ بسیار کوشش کے بعد بھی اِن مصرعوں سے ماسوائے ایک سیاہ لکیر کے کچھ پیدا نہ ہوا ۔۔ اور اُسے اِنقلاب زندہ باد کی مانوس سی آواز کانوں میں گونجتی ہوئی سنائی دی ۔ شکست ۔ اور انقلاب ۔ نعرے اور سیٹیاں

اُس نے کتاب بند کی ۔۔ اور آنکھیں میچ کر اپنے طوفانی اور متلاطم جذبات کو بہلانے لگا ۔۔ یکا یک اس کے ذہن میں ایک روشنی سی پیدا ہوگئی ۔ اور اسی روشنی میں اُسے ایک ضخیم کتاب نظر آئی ۔ قدرت کی ازلی کتاب اُس نے اِس کی ورق گردانی شروع کی ۔ حروف واضح اور روشن تھے ۔ مصرعے خوبصورت اور چمکدار ۔ شاید انہی سے مادیت نے آدم کا استقبال کیا تھا ۔ اُس نے دوسرا ورق الٹا ۔ آدم اور حوّا مادیت کی دنیا میں آگئے تھے ۔ ننگے مطمئن مگر سہمے سہمے، جنت سے نکالے جانے کا افسوس شاید انہیں ابھی تک نہ تھا ۔ وہ ہر چیز کو غور سے دیکھ رہے تھے ۔ اور ایک قسم کی بیگانگیت سی محسوس کر رہے تھے ۔ پھر بھی انہوں نے دُنیا کو آباد کرنے کا عزم کیا تھا ۔ جس کی استحکامت اُن کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی ۔

اُس نے دوسرا صفحہ اُلٹا ۔ آدم اور حوّا کہیں نہ تھے ۔ نظر آنے والے لوگ شاید اُن کی اولاد تھے ۔ جو کمین گاہوں میں چھپے تھے ۔ اُن کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی ۔ وہ گونگے تھے ۔ مگر بہرے نہیں تھے ۔ وہ ہوشیار تھے ۔ مگر چالاک نہیں تھے ۔ وہ بار بار اپنے گندے ہاتھ پیٹ پر پھیرتے تھے ۔ اور ایک دوسرے کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ۔ کیا وہ بھوکے تھے ؟ کیا اُن کی اِس آزاد زندگی میں خوف آگھسا تھا ۔

اُس نے ایک اور ورق اُلٹا ۔ اُسے دریا کے کنارے جھونپڑیاں نظر آئیں ۔ جن کے باہر الاؤ جل رہے تھے ۔ اور الاؤ کے گرد مرد، عورتیں اور بچے ناچ رہے تھے ۔ ہڈیوں کے زیور پہنے نوکیلے پتھر ہاتھ میں لئے بدن پر کھالیں لپیٹے ناچ رہے تھے ۔ تالیاں بجا رہے تھے ۔ اُن کی آنکھوں میں چھپی ہوئی وحشت مُسرّت اور شادمانی میں بدل چکی تھی ۔ وہ خوش تھے ۔ انہوں نے پیٹ اور خوف شاید دونوں پر فتح پائی تھی اور اب اظہارِ مسرت میں ناچ رہے تھے ۔ ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے ۔

اُس نے ایک اور ورق الٹا ۔ جھونپڑیاں اُجڑ چکی تھیں ۔ گاؤں بس گئے تھے ۔ مکانوں کے اِرد گرد باڑ لگی ہوئی تھی دھان کے کھیت لہلہا رہے تھے ۔ ایک سایہ دار درخت کے نیچے چبوترے پر ایک بزرگ بیٹھا تھا ۔ جس کے ارد گرد کچھ عورتیں اور مرد تھے ۔ یہ گاؤں کا سردار تھا ۔ اُس نے اپنے مکان کے گرد زمین کے کافی حصّے پر قبضہ کر کے باڑ لگوائی تھی ۔ اور وہ سب سے زیادہ طاقتور تھا ۔ شاید انہی دو چیزوں نے اُسے گاؤں کا سردار بنایا تھا ۔۔ زیادہ زمین، زیادہ طاقت،

وہ ورق الٹتے الٹتے اکتا گیا ۔ اُس کا ذہن تھک گیا ۔ اور پھر اِن غیر مانوس اور بد مذاق تصویروں میں

تھا بھی کیا — ؟ ماسوائے جہالت کے مظاہرے کے، یا اندھیرے کے، جو ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اُس نے یک وقت کئی ورق اُلٹے۔ اور وہ حیران رہ گیا۔ جب اُس کے سامنے وہ ورق کھلا رہ گیا جس کا عنوان موٹے حروف میں لکھا تھا بیسویں صدی" کس قدر خوبصورت ورق تھا۔ حاشیہ پر نفیس نقش و نگار تھے۔ جن کے مختلف رنگ اپنی مناسب ترجمانی کرتے تھے ننگے بھوکے اور ہڈیوں کا ہار پہنے ہوئے انسان کی جگہ اس پر خوش پوش انسانوں کی تصویریں تھیں۔ جو ہوا میں بھی اُڑ سکتے تھے۔ پانی میں بھی بھاگ سکتے تھے۔ اور زمین پر بھی چل سکتے تھے۔ جن کے دماغ سے حیران کن مشینیں ایجاد ہوئی تھیں اور ہو رہی تھیں۔ جن کے چہرے پر اطمینان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ البتہ جن کی آنکھوں میں حرص و ہوا کا شعلۂ جوّالا بھڑک رہا تھا۔ جن کے سامنے خدائی سرنگوں اور نادم تھی۔ جو اپنے دونوں ہاتھوں میں سارے کرۂ ارض کو چھپا کر بھاگنا چاہتے تھے تاکہ بھوکے کتّوں کی طرح اُسے کہیں اطمینان سے نوچ ڈالیں۔ جہاں شرکت کرنے والا دوسرا نہ ہو۔ دیکھنے والا دوسرا نہ ہو
یکایک سلام صاحبؑ کی بے شمار آوازوں نے اُس کے ذہن کی روشنی کو بجھا دیا۔ اُس کا دماغ قبر کی طرح تاریک ہو گیا۔ مادیت کی ازلی کتاب اور اُس کتاب کے عجیب و غریب اوراق نہ جانے کہاں غایب ہو گئے۔ وہ چونک اٹھا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں — ریوڑ ہانکنے والے آٹھ دس بوڑھے اور بچے اُس کے سامنے کھڑے سلام کہہ رہے تھے۔ اور وہ کوئی فیصلہ کئے بغیر ہی انہیں دیکھتا رہا۔ کیا یہ آدم کی اولاد ہیں۔ جن کی تصویریں ابھی اُس نے دیکھی تھیں ؟ لیکن نہیں وہ بیسویں صدی میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ اور اُن میں سے کوئی خوش پوش نہ تھا۔ کوئی ہوا میں اُڑ نہیں سکتا تھا۔ کوئی پانی میں بھاگ نہیں سکتا تھا۔ کسی کے اِتنے بڑے ہاتھ نہیں تھے۔ کہ وہ کرۂ ارض کو چھپا کر بھاگ جائے — پھر یہ کون تھے — ؟
اُس نے اپنے چہرے پر کسی جذبے کو ظاہر کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ ابھی اِس بات کی تشخیص نہ کر سکا تھا۔ کہ یہ کس دَور کے اِنسان ہیں میلے۔ گندے چیتھڑوں میں ملبوس، مُسکرا مُسکرا کر سلام کہنے والے، اور وہ بوڑھے اور بچے خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ شاید اُس کا اضطراب بھانپ گئے۔ لیکن پھر بھی اُسے محسوس ہُوا جیسے اُن کی آنکھوں میں بدعملی کے لاکھوں شعلے دہک رہے ہوں۔ جیسے اُنھوں نے اُس کے وجود سے کوئی بُو سونگھی ہو۔
"کیا چاہتے ہو — ؟" اُس نے جبر سا محسُوس کر کے پوچھا۔ کیونکہ وہ اِس وقت کسی سے باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بوڑھے اور بچے سب ہاتھ پھیلا کر اُس کے نزدیک آ گئے "پیسہ" اُنھوں نے مشترکہ آواز میں ہنس کر کہا۔
"پیسہ ؟"
سب نے سر سے اِشارہ کر کے کہا "ہاں پیسہ —"
اُس نے ایک ذلت آمیز قہقہہ لگایا۔ اور بوڑھوں کے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ جن پر گوشت نہ تھا۔ صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ اس کی سمجھ میں بچّوں کا پیسہ مانگنا تو آ گیا۔ لیکن یہ بوڑھے — قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے — بے حیا اور بے شرم — کس ڈھٹائی سے ہاتھ پھیلا رہے تھے۔
"کیا کرو گے پیسے کو ؟" اُس نے کسی قدر تُندی سے پوچھا۔
بوڑھے اُس کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ لیکن اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کے نشان باقی رہے۔ البتہ بچے اور نزدیک آ گئے "ہم دودھ لائیں گے۔ ساگ کے لئے نمک لائیں گے — بتی کے لئے تیل لائیں گے —"
اُنھوں نے معصومانہ انداز میں کہا۔

بیک وقت اُنھوں نے ایک پیسے کے بے شمار مصرف بیان کئے ۔ دودھ نمک تیل اور خدا جانے وہ کیا کیا کچھ بیان کرتے ۔ اگر ذرا بھی اُس کے پُر جلال چہرے پر غم و غصّہ کے نقوش پیدا نہ ہوتے ۔ اُسے اپنا وجود بہت بڑا دکھائی دیا ۔ ایک معزز سیاح، جو کشمیر کی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے احمد آباد سے آگیا تھا صرف چند یوم آڑو جیسے صحت افزا مقام پر ـــــ جہاں اِس ریاست کے بے شرم اور بے حیا انسان اُسے تنگ کرنے لگے تھے ۔ دودھ کے لئے پیسہ نمک کے لئے پیسہ، تیل کے لئے پیسہ، ......

• بھاگ جاؤ یہاں سے ـــ تمہیں پیسہ مانگتے شرم نہیں آتی ۔ اُس نے بے رُخی سے کہا ۔ اور بالِ جبریل کی ورق گردانی کرنے لگا اُسے اپنا فیصلہ بالکل حق بجانب محسوس ہُوا ـــ مانگنا لعنت ہے ـــ ذلّت ہے ۔ زندگی کی توہین ہے اور جو لوگ بھیک کی حمایت کرتے ہیں ۔ وہ خدا کی مخلوق کی توہین کرتے ہیں ۔ اِنسانیت کو داغدار بناتے ہیں ۔ اگر اس قدر نادار ہے ۔ تو مزدوری کیوں نہیں کرتے ـــ محنت کیوں نہیں کرتے ۔

شرم کا لفظ سُن کر بچّے بوڑھوں کی طرف اور بوڑھے اُس کی طرف دیکھنے لگے ۔ ایسی نظروں سے جن سے بدگمانی زیادہ واضح ہوتی تھی ۔ اور اُسے محسوس ہُوا جیسے وہ اُس پر جھپٹنا چاہتے ہیں ۔ کالے حروف کی طرح ۔ اُس کا مُنہ نوچنا چاہتے ہیں ۔ اُس کے مُنہ پر تھوکنا چاہتے ہیں ۔ وہ گویا خاموش زبان میں اُس سے کہ رہے تھے ۔ "پیسہ مانگنا شرم ہے ۔ جب ہماری چائے میں دودھ میسّر نہ آئے ۔ ساگ میں ڈالنے کے لئے نمک نہ ملے ۔ بتّی کو جلانے کے لئے تیل نہ ملے ۔ تو ہم کیا کریں ـــ کس سے مانگیں ـــ ؟ اُس سے نہیں جس نے ہمارا پیسہ ہم سے چھینا ہے ـــ ؟"

لیکن اُس نے اُن کا پیسہ نہیں چھینا تھا ۔ وہ صرف چند ایام کے لئے آڑو آگیا تھا ۔ مگر نہیں چھیننے والا ایک اِنسان ہی ہوگا ۔ بیسویں صدی کا اِنسان جو دو ہاتھوں میں کرۂ ارض کو چھپا کر بھاگنا چاہتا ہے ۔ جس میں لٹے ہوئے بھی میلے گندے اور بد مذاق قسم کے کروڑوں لوگ تھے ۔

بوڑھے اور بچّے چلے گئے ـــ دُور اُن کے مویشی عجیب و غریب آوازوں سے انہیں اپنے پاس بلا رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "آؤ ہمارے ساتھ مل جاؤ ۔ اِس بیسویں صدی میں ہم تم ایک ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے ۔ کہ تم ہاتھ پھیلا کر سوال کر سکتے ہو ۔ اور ہم آنکھوں سے دیکھ کر جذبۂ ترحم اُبھار سکتے ہیں ۔ آؤ ہمارے ساتھ مل جاؤ ـــ"

سورج چھپنے لگا ۔ پہاڑ پر جمی ہوئی برف پر سیاہی چھا جانے لگی ۔ چیل اور دیار سیاہی کے لپیٹے مہیب نظر آنے لگے ۔ لدّر کی روانی میں نیا جوش آگیا ۔ چٹانوں سے ٹکراتا ہُوا پانی دُودھ بن کر بہنے لگا ۔ اور پہاڑ کے دامن میں آڑو کا ریسٹ ہاؤس کوڑھ کے پھوڑے کی طرح دکھائی دینے لگا ۔ جو کسی صحت مند اور توانا اِنسان کے جسم پر اچانک ظاہر ہوگیا ہو ۔

اُس نے اُٹھنے سے پیشتر ڈوبتے ہوئے سُورج کا منظر پہاڑ اور ندی پر دیکھنا چاہا ۔ لیکن پہاڑ سیاہ سے سیاہ تر ہو چکا تھا ۔ اور ندی ـــ دُودھ اچھالتی ہوئی ایسے جا رہی تھی ۔ جیسے اُس کی توہین کی گئی ہو ۔ اُسے دوپہر کے طعنے اور فقرے دوبارہ سنائی دینے لگے ۔ لیکن اِس وقت اُن میں طنز نہیں ۔ صرف غصّہ تھا ـــ جو جذبۂ انتقام کے بڑھنے سے پیدا ہوتا ہے ـــ "ننگوں اور بُھوکوں کا مذاق اڑا کر کیا تو اپنے آپ کو مہذب کہتا ہے؟"

وہ تلملا اٹھا — کانپ اُٹھا — سامنے کا پہاڑ اور اُس کے جنگل جیسے اپنے جبڑے کھول کر اُسے نگلنا چاہتے
ور للکار للکار کر کہہ رہے تھے — "زمین کے گرد باڑ لگا کر لوٹ کھسوٹ کی ابتدا کرنے والے کمینے — کیا تو
ن تہذیب کہتا ہے۔ کہ ریسٹ ہاؤس میں بیٹھ کر تو چائے اور سینڈوچ کے مزے لے اور روٹی کے ساتھ ہرن
ب کھلائے۔ اور رات اور دن تیرے سامان عیش و عشرت کے محافظ بے نمک ساگ کھائیں۔ دُودھ کے
نے پئیں۔ اور بتی جلانے کے بغیر سو جائیں — ؟

وہ اٹھا — اور اُن بوڑھوں اور بچوں کو تلاش کرنے لگا۔ لیکن وہ جا چکے تھے۔ البتہ اُن کی معصوم آوازیں
۔ اُس کے کانوں میں گونج رہی تھیں — "ہم دودھ لائیگا۔ ساگ کے لئے نمک لائیگا۔ اور بتی کیلئے تیل۔"
واپسی پر اُس کے جذبات نہ مشتعل تھے — نہ پُرسکون، اُسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ کہ اس حالت کا کیا نام ہو سکتا
ہے ....!!

پریم ناتھ پردیسی

نہا کے آئی ہیں

صبح دم وہ نہا کے آئی ہیں — رُخ پہ کلیاں کھلا کے آئی ہیں

صبح میں تیرگیٔ شب آ گئیں — دوشِ سیمیں پہ کاکلِ مشکیں

کاکلوں میں حسین مکھڑا ہے — جیسے بدلی سے چاند نکلا ہے

رُخ پہ انداز نازنینی کا — دل میں احساس مہ جبینی کا

آنکھ میں رس جبیں پہ شادابی — زلف میں قصۂ شکر خوابی

رُخ پہ ہے یہ اثر نہانے کا — شبہہ ہوتا ہے مسکرانے کا

کہہ رہی ہے بہارِ رعنائی — وہ کُھلے ہونٹ وہ ہنسی آئی

جلال ملیح آبادی

غزل

تیرے بغیر کنجِ گلستاں کو کیا کروں
اس اہتمامِ فصلِ بہاراں کو کیا کروں

نسرین و نسترن سے نظر مطمئن نہیں
لالہ کے اس چراغِ فروزاں کو کیا کروں

گُلہائے رنگ رنگ نگاہوں پہ بار ہیں
میں یاسمین و سنبل و ریحاں کو کیا کروں

تیرے بغیر عشرتِ نظّارگی کہاں
برگِ سمن پہ شبنمِ لرزاں کو کیا کروں

طوفانِ رنگ و بُو میں بھی دل ہے اُداس اُداس
رقصِ بہار و ابرِ خراماں کو کیا کروں

بجلی کی تاک جھانک مجھے ناگوار ہے
کالی گھٹا کی زلفِ پریشاں کو کیا کروں

جب تو نہیں تو لطف و مسرّت کا ذکر کیا
میں عیش و انبساط کے ساماں کو کیا کروں

میرے جنوں کی کون اُڑائے گا اب ہنسی
اے دوست! اپنے چاکِ گریباں کو کیا کروں

کس سے کہوں؟ کہیں بھی بہلتا نہیں ہے دل
رُوئے نگار و چشمِ حسیناں کو کیا کروں

تیرے عتابِ خاص کا مارا ہُوا ہوں میں
اَوروں کے التفاتِ فراواں کو کیا کروں

ماہر القادری

پنجاب کا ایک نوجوان شاعر

سید احتشام حسین نے جدید اُردو ادب کو تاریخی نکتۂ نگاہ سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جدید ادب اپنا مواد "انفرادیت" یعنی نہاں خانوں کی بجائے اجتماعی احساسات سے اخذ کرتا ہے۔ سید صاحب نقادوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نزدیک ادب ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ اس لئے ان کی تلاش و جستجو زیادہ تر مواد کے متعلق رہی ہے۔ جدید شعرا کے طریق اظہار کے متعلق غالباً یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اگرچہ ان کا موضوع تصوّف، روایاتی عشق و محبت اور زبان و بیان کی خارجی دلکشی کی بجائے اجتماعی دکھ درد، بحیثیت مجموعی قوم کا جنسی ردّ عمل اور ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلوب یا طریق اظہار کا تعلق ہے، اُردو شعرا میں "انفرادیت" نمایاں حیثیت حاصل کر رہی ہے۔ قدیم شعرا کے ہاں عقل و جذبات کی کشمکش کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ داخلی یا جذباتی سکول کے شعرا کا مطمح نظر تصوف رہا ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں جہاں عقل یا خارجیت کی حکمرانی تھی وہاں زیادہ تر توجہ زبان و بیان کی ظاہری خوبیوں یا فلسفیانہ موشگافیوں پر صرف کی گئی۔ لیکن دونوں کے ہاں مسلّمہ روایات کی پیروی لازمی تھی۔ تشبیہ و استعارے، تلمیحات مخصوص اصطلاحات، زبان و بیان سے متعلقہ صنعتیں ان سب کا ایک محدود دائرہ اثر تھا۔ اور کسی فنکار کو اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ اپنی شخصیت کے تقاضوں سے۔ یا اپنے خیالات کی نوعیت کے مدنظر اس دائرے سے باہر قدم رکھ سکتے، مضامین سے لے کر تراکیب اور بندشوں تک اپنی روایات سے اس طرح وابستہ تھے کہ اگر روایات سے ان کا تعلق کٹ جاتا تو ان کی معنویت اور خارجی دلکشی دونوں کو زبردست ٹھیس پہنچتی۔ لیکن جدید شعرا کے یہاں اس کے برعکس اس قسم کی کوئی قید باقی نہیں۔ وہ اپنے موضوع اور اظہار بیان کے طریقوں کے انتخاب میں قطعاً آزاد ہیں اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید اُردو ادب قدیم ادب کی "روایاتی یا اجتماعی" خصوصیات کے خلاف "انفرادیت" کی بغاوت ہے۔

ادبی روایات کا طلسم حالی اور آزاد کے ہاتھوں ٹوٹا۔ لیکن ان کا طریق کار جدید دَور کے شعرا سے مختلف تھا۔ ان کے ہاں موضوع اور مقصد کو اسلوب کے مقابلے میں اوّلیت کا شرف حاصل تھا۔ اس وقت شعرا مخصوص موضوعات کو بطور عنوان قائم کر کے اپنی نظم کا آغاز کرتے تھے۔ لیکن جدید دَور میں "نظم" اپنی مکمل صورت میں پہلے شاعر کے ذہن میں جنم لیتی ہے۔ اور اس کے بعد اور شاید نظم لکھ چکنے کے کچھ عرصہ بعد جب ذہن فنی ضروریات سے نپٹ لیتا ہے تو عنوان کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ عنوان شعوری طور پر نظم کو سمجھنے کے بعد قائم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ نظم غیر شعوری طور پر ذہن میں اُبھرتی ہے۔ اور نیم شعوری طور پر الفاظ کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ (غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایک سچا فنکار اپنی تخلیق کے ہاتھوں میں کسی حد تک بے بس ہو کر کام کرتا ہے۔ اس کا فنی وجدان اس کی عقل پر چند لمحوں کے لئے پورے طور پر مسلط ہوتا ہے) موضوع کے انتخاب میں شاعر کے جذبات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شعوری اور غیر شعوری دونوں کا تعین اس کی شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ اور اس کی تاثر پذیری کی صلاحیت اس کی مجموعی شخصیت سے کسی

حال میں بھی آزاد نہیں ہوسکتی اور اسی لئے جدید دَور کے شعرا کی ذہنیت جدید علوم، جدید معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالا
کے ماتحت ایک خاص جذباتی انداز اختیار کرلیتی ہے۔ شاعری کا موضوع وہ جذباتی تاثرات ہیں جنھیں قبول کرنے
اس کی شخصیت میں خاص صلاحیت پائی جاتی ہے اور یہی خصوصیت اسے حالؔی اور آزاؔد کے دَور کے شعرا سے الگ کرتی
ان کے ہاں موضوع ایک خارجی چیز تھی جسے عقلی طور پر انتخاب کیا جاتا ہے۔ اور پھر اسے منطقی دلائل کے سہارے نظم
پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس جدید دَور کے شعرا کا موضوع داخلی تاثرات ہیں جنھیں جذباتی طور پر نیم شعوری حالت
اخذ کیا جاتا ہے اور انھیں جذبات ہی کے سہارے نظم میں اجاگر کیا جاتا ہے۔ دراصل حالی کی کوشش قدیم شعرا کی متصو
حال مستی کے خلاف ایک ردّ عمل کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ ردّ عمل فنی ضروریات سے ہم آہنگ نہ تھا
لطیفہ کی فطرت خارجیت اور عقلی نکتہ نگاہ کی ضد ہے۔ چنانچہ جلد ہی اس شاعری کو جدید شاعری کے لئے جگہ خا
کرنا پڑی۔

اس توضیح کو سامنے رکھتے ہوئے قیوم نظر کی نظموں پر نگاہ ڈالئے تو موضوع اور ہیئت دونوں کے لحاظ سے ا
کا کلام شدید ذہنی الجھنوں سے مبرّا نظر آئے گا۔ وہ نظم کے ساتھ غزل بھی کہتا ہے اور نظم میں بھی قافیہ اور ردیف کی پا
پابندی کرتا ہے۔ وہ کرکٹ کا کھلاڑی ہے اور جب ہنستا ہے تو اس کے قہقہے فلک شگاف نہیں تو سقف شگاف ضر
ہوتے ہیں۔ اس کی شخصیت میں توازن اور اعتدال پسندی ہے۔ نرم شاخ کی طرح ہوا کے جھونکوں میں لہلہاتا ہے
خشک شاخ کی طرح آندھی کا منتظر نہیں کہ اپنی قوت آزمائے۔ یا ٹوٹ کر زرد پتوں کے ڈھیر میں چھپ جائے۔ لیکن ا
سے یہ مطلب نہیں کہ اس کی شخصیت کمزور ہے۔ وہ اپنی لیک مقرر کرچکا ہے۔ اور اب اس راہ سے بھٹکتا نہیں۔ البتہ ا
کی راہ قدیم اور جدید کے بین بین ہے۔ جدید ادب کا تحلیلی طریقۂ کار اور ڈرامائی اسلوب اظہار اس کی دسترس سے با
نہیں۔ لیکن اسے یہ بھی گوارا نہیں کہ قدیم اسلوب کی تمام خوبیوں کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ چنانچہ وہ جہاں ان ن
فنی امکانات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہاں قافیہ اور ردیف سے گریز نہیں کرتا۔ بلکہ ان سے جہاں تک بھی ممکن ہوسکے مدد لیتا
قیوم نظر بحیثیت مجموعی ایک واضح اور غیر مبہم اسلوب کا مالک ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کے ارتقا میں ایک مقام ایس
بھی گزر چکا ہے جہاں اس کے رجحانات پر تاریکی، تنہائی اور سردی مسلط ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس کی طبیعت کا یہ رنگ اس
فن پر بھی اثر انداز ہوا۔ اس کی بعض نظمیں مبہم ہیں اور بعض خشک اور سرد۔ ان میں جوش، والہانہ پن، حرارت اور جذ
لذت کی پیدا کردہ رنگینی نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ سطحی مطالعہ کے وقت خشک اور بوجھل محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن گ
پر ان کی بظاہر ساکن سطح کے نیچے ایک دبا ہوا طوفان نظر آتا ہے۔ ایک اُبال جو سطح کے سنگین جمود کو توڑ نہیں سکتا۔

"قندیل" کی نظموں کو مندرجہ ذیل تین ادوار میں آسانی کے ساتھ تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) "نیا سال" سے "اس بازار میں ایک شام" تک۔

(۲) "خواب گراں" سے "زندگی" تک۔

(۳) "نورجہاں کے مزار" سے "الجھن" تک

یہ تقسیم معنوی اعتبار سے کی گئی ہے۔ تاریخی لحاظ سے ان نظموں کی ترتیب یہ ہوگی۔

خلش تاثر۔ اس بازار میں ایک شام۔ نیا سال۔ رنگ وصوت۔ ناچ۔ بنی آدم۔ عشق گریزاں۔ برسات

بھکن - مجبوری - انجام - خزاں - خواب گراں - اپنی کہانی - جنگ - ترغیب - نور جہاں کا مزار - جوانی - صبح کاذب - بے لبسی
شام - داشتہ - حسن آوارہ - واپسی - آل - انجمن - نئی تحریکیں - زندگی -
دور اول کی نظموں میں " نیا سال " چند تشبیہوں کا مجموعہ ہے جن میں آخری بند کا عبرت انگیز تاثر اور عنوان وحدت تاثر
دیتے ہیں - رنگ و صوت اور خصوصاً برسات کی رات " میں اسی اسلوب کی ابتدائی شکلیں ہیں جن کی معراج ہمیں تیسرے
نظموں میں نظر آتی ہے - رنگ و صوت میں - مناظر فطرت میں شاعر کی معصومانہ دلچسپی اور حیرت قابل غور ہے - دراصل
شاعر کے بس میں رہی نہیں - اس کی اٹھان میں ایک جمالیاتی شان تھی - جو بعد میں قائم نہیں رہ سکی اور آخری دو بندوں میں
" عقلیت " کے سہارے نبھانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے - اسی طرح " برسات کی رات " میں بیان اتنا سپاٹ ہو گیا ہے
بند کے سوا وہ حسین معنویت کہیں بھی پیدا نہیں ہو سکی - جو تیسرے دَور کی نظموں میں ملتی ہے - گویا استعارہ کسی حد تک
ملا رہ گیا ہے - " عشق گریزاں " اور " اس بازار میں ایک شام " سیدھے سادے طریق پر جنسی تسکین کی بہیمیت اور اس
مقابلے میں روایاتی عشق کی برتری جتلائی گئی ہے - دراصل قیوم نظر جنسیات کا شاعر ہے ہی نہیں - اور اس کی وجہ وہی
بت کا توازن اور اعتدال پسندی ہے جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے - اگر جنس اس کا موضوع بنتی ہے تو
ن کے لباس میں - ایک مجبور بے بس لڑکی کے بھیس میں - یا تیتری کی رنگین شکل میں - لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ تیتری میں
ی جنسی رشک یا حسد کا نشان نہیں ملتا - اس نظم کا لہجہ حسرت بھرا نہیں جو شاعر کی جنسی بھوک کی غمازی کر سکے - بلکہ یوں محسوس
ہے کہ یہ نظم بھی اصل میں تیسرے دَور سے تعلق رکھتی ہے - اور اس کا محرک شاعر کا سیاسی یا معاشرتی شغف ہے - وہ اپنی تہذیب
ایک نئے کردار کو ابھرتے دیکھتا ہے - اور اس کے متعلق کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے - یہ میراجی کا " ہندی جوان نہیں جو اُسے
نسے لبریز " سمجھ کر ذہنی تعیش کے زیر اثر اس کے قریب کھنچتا چلا جائے - اگر اس میں کوئی تلخ آواز ہے جو ذاتی ردّعمل کی
بت کو ظاہر کر سکتی ہے تو وہ " کہنہ سال زاغ " ہے اور " آہ بھی نہ بدنصیب کر سکی " کی صورت میں نمودار ہوتی ہے - اس موقع
س کی نظم " مجبوری " کو بھی پیش نظر رکھئے - " مجبوری " کی ہیروئن غالباً خود شاعر کی بیوی ہے - اپنی مجبور دلہن کی بے کسی پر
ے دکھ کا اظہار کر کے ایک طرف وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ مرد ذات کی روایاتی جنسی خود غرضی سے وہ مبرا ہے
ر اس کے ساتھ ہی لڑکی کے منہ سے " نہیں " کہلوا کر وہ اپنے آپ کو ایک مظلوم ہیرو ثابت کرنا چاہتا ہے - اس کی تہ میں یہ
ل بھی کار فرما ہے کہ اس کی شادی نہ کرانے کی خواہش اپنی ذات سے باہر ایک سہارا تلاش کرنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ
ر اس کی منگیتر کی " نہیں " سے بڑھ کر موثر سہارا اور کوئی نہیں ہو سکتا - چنانچہ اس قسم کی ہمدردی پھر تیتری کے لئے بھی
اعر کے ذہن میں بیدار ہوتی ہے - دراصل قیوم نظر جنس مقابل سے ایک قسم کی مفاہمت اور باہمی ہمدردی پیدا کرنا چاہتا
ہے - اور یہ ایک معقول شخصیت کا احساس ہے - مجبوری میں کسی تخیل غم و الم کی جانکاہیوں کی بجائے ہمیں روزمرہ کے
الات و واقعات کا عکس نظر آتا ہے - مثلاً یہ بند -

اپنی پُرکاری سے تو جس کو سراہے گی کبھی
تیری مجبوری اسے چاہے تو چاہے گی کبھی
رہ سکے گا حسن کا یونہی وقار
جانتا ہوں ورنہ کیوں یوں رو رہی ہے آج تو دیوانہ وار

"خواب گراں" سے بعد کی نظموں میں داخلی رنگ گہرے ہوتے چلے گئے ہیں اور ان رنگوں پر ایک تاریکی غالب ہے۔ اندھیرا اس کی نظموں میں ایک مستقل کنایہ ہے اور اس اندھیرے کے ساتھ سردی اور تنہائی بھی وابستہ ہیں۔ مجبوری کے بعد روایاتی عشق اور درد کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے دل میں جذبات کی بیگوں موجوں کا رقص باقی نہیں رہا۔ اس کی جگہ ایک خلا نے لے لی ہے۔ جس پر سردی اور تاریکی مسلط ہیں۔ اس تاریکی اور سردی کی نوعیت کے متعلق خواب گراں میں دو نہایت واضح کنائے موجود ہیں۔ اس نظم کے آغاز میں "سرد بستر ہے کھلا روشندان" اور انجام پر "گرم بستر ہے قریب آجاؤ" سے کافی حد تک روشن ہو جاتا ہے کہ جنسی ناکامی اس کے ہاں ان استعاروں کا بھیس بدل کر ظاہر ہوئی ہے۔ گرمی اور نور جنسی آلودگی کے مستقل کنائے ہیں۔ جو نسل انسانی نے اپنے آبا سے ورثتاً پائے ہیں۔ خود کتاب کا عنوان "قندیل" اسی تاریکی سے فرار کی خواہش کا اظہار ہے۔ اپنی تخلیقات میں شاعر نے اس تاریکی کے خلاف جنگ کی ہے۔ اس خلوت اور تاریکی میں بھی ایک چیز روشنی کا مینار تھی۔ کسی وقت خارجی دنیا میں ایک وجود تھا جس کے باعث اس کے دل و دماغ گرمی اور نور کی آماجگاہ بنے رہے لیکن جس حادثہ کا "مجبوری" والی نظم میں ذکر کیا گیا ہے اس کے باعث یہ وجود شاعر سے چھن گیا۔ (شادی کے بعد محبوب سے سلسلہ عشق قائم نہ رہ سکا۔ شاعر کی اس بیوفائی کا شدید احساس ہے) اور اب وہ جس تاریکی کے سمندر میں غوطے کھا رہا ہے۔ اس میں یہی تخلیقی فعل تسکین کا کچھ سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ جنس اور فنی تخلیق کا غیر شعوری تعلق بھی اسی ضمن میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں "آل" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نظم میں اس کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کا پورا بیان آجاتا ہے۔ اندھیرے میں اس نے ایک نور سا دیکھ لیا ہے۔ جس کی نوعیت کے متعلق وہ صرف اتنا ہی سمجھ سکا ہے ؎

اور اُس درد کی لے کر قندیل
جس کو تاریکی میں رکھا اب تک
اپنے ہی سائے پہ چلنا ہے مجھے

اس سے پیشتر وہ اپنے جمود کے متعلق اسی نظم میں یہ بھی تو کہہ چکا ہے ؎

پھر مرے اُجڑے سکوں سے بھر لو
ہر طرف پھیلی ہوئی دنیا میں
نغمۂ گل نہ گلِ نغمہ تھا!

کیا یہ استعارے اس کی فنی تخلیقات کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ اور کسے خبر کہ اس نظم کے آخری بند میں "قندیل" کے لفظ ہی نے کتاب کے عنوان کی طرف رہنمائی کی ہو۔

"خواب گراں" میں جنسی آسودگی اور روایاتی عشق و وفاداری کی باہمی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ "شبہائے وصال" میں ایک سایہ رات کی تاریکی کے دامن سے ابھرتا ہے۔ اور شاعر کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ یہ بھیانک سایہ "داشتہ" اور "واپسی" میں بھی موجود ہے۔ البتہ "داشتہ" میں شاعر کے ہاں مجرمانہ انفعال کی بجائے ایک قسم کا احتجاج پایا جاتا ہے ؎

جانے لیگا مجھ سے کب تک انتقام
یہ حسنِ بام

اور اس کے بعد "دالیم" میں شاعر گویا اس سائے سے ایک گونہ بے نیاز ہو چکا ہے۔ "داشتہ" میں وہ ایک ناکام عاشق

روپ میں نظر آتا ہے۔ لیکن "واپسی" میں وہ ایک سیدھا سادا انسان ہے جو اوائل شباب میں فطری تقاضوں کے ماتحت
جنس ثانی کے ایک فرد کی طرف مائل ہوا تھا۔ لیکن بعد میں جب یہ فطری تقاضے آسودہ ہو چکے تو وہ اپنے اندر ایک تغیر محسوس
کرتا ہے۔ اس کی بدلی ہوئی فطرت عشق و رومان کے لئے موزوں نہیں رہتی ۔ اور اسی بدلی ہوئی فطرت کا واسطہ دے کر فریق
ثانی کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ جس چیز کے باعث وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے تھے جب وہی نہیں رہی تو پھر جھوٹی
وضعداری نبھانے سے کیا حاصل ؟

کون اس جھونکے کو سمجھائے
صحن چمن سے جو اٹھا ہے
سوکھے پیڑ کو چھیڑ رہا ہے

ارمان انگیز جذبات کے لئے اب اس کے سینے میں کوئی جگہ نہیں۔ لیکن اسی تغیر کو اس نے بآسانی قبول نہیں کیا۔ اور نہ
اس میں اس کی انفرادی مشکلات کا حل موجود ہے۔ چنانچہ ان واقعات کو بھولنے کے لئے جن کے باعث اس کی طبیعت سرد پڑ چکی ہے
وہ فطری مناظر کی طرف راغب ہوتا ہے۔ مگر ان واقعات کا ایک سایہ سا فطرت کی کسی خاص ادا کی اوٹ سے اسے جھانک کر
دیکھ ہی لیتا ہے۔ "داشتہ"، "واپسی"، "ترغیب"، "محرومی" وغیرہ میں فطرت اس کا غم غلط کرنے کی بجائے الٹا اسے ابھارتی ہے
گاہ کوئی گانے والا اور گاہ ستاروں کا دلکش حسن اسے محبوبہ کی یاد دلا دیتے ہیں ۔ البتہ بعض اوقات ان الفاظ میں ایک گہری
درد آمیز بے حسی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا ۔ اور یہ بے حسی بھی دراصل اسی کہنہ درد کی یادگار ہے ۔ فطری مناظر کی تسکین بخش اور رجال
پرور کیفیات اس کی روح کی بیتابی کو کم نہیں کرنے پاتیں۔ تاہم یہ رجحان نہایت واضح ہے کہ شاعر اپنی ہستی اور اپنے دکھ درد
کو فطرت میں گم کر دینا چاہتا ہے ۔ اس دور کی نظموں میں فنکاری کے نہایت لطیف نمونے نظر آتے ہیں: "ترغیب"، "بے بسی"
"تھکن"، "تال" وغیرہ میں ایک خارجی کیفیت کے اظہار میں مجرد احساسات کی جیتی جاگتی تصویریں ابھر آتی ہیں ۔ انہی نظموں
کے متعلق شاید بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہو کہ ان میں وہ دلکشی اور تاثیر نہیں جو یک بیک دل و دماغ پر چھا جائے ۔ لیکن قیوم نظر
کی متوازن شخصیت کے مدنظر یہ امید رکھنا ہی فضول ہے کہ اس کی نظموں میں ایک سیمابی کیفیت پیدا ہو گی ۔ وہ جذبات کہتا
ہے سنبھل کر اور رک رک کر کہتا ہے۔ ان نظموں میں جذبات کے طوفانی دھارے نظر نہیں آتے۔ لیکن ان میں ایک اتھاہ گہرائی ضرور ہے۔
بجلی کی تڑپ نہیں لیکن دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر بیٹھ جانے کی کیفیت ضرور ہے ۔ وہی بات جسے "فراق" نے حالی کے متعلق
"بدن چور" کے لفظ سے ادا کیا تھا۔ ان نظموں کا مقابلہ "خلش تاثر" اور "انجام" ایسی بیانیہ نظموں سے کیجیے تو ان کی شفاف
گہرائی میں جھانکتے وقت شاید ان کے عمق کا احساس ہو سکے ۔

تیسرے دور کی نظموں میں شاعر کی توجہ کا مرکز گرد و پیش کے حالات ہیں ۔ تاریخی اعتبار سے یہ نظمیں دورِ ثانی کی نظموں
کے ساتھ ساتھ کہی گئی ہیں ۔ اور ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ مناظر فطرت کو پیش کرتے وقت شاعر اپنی ذات کو نظر سے
اوجھل نہیں ہونے دیتا ۔ لیکن ان نظموں میں بظاہر اپنی ہستی اس قدر نمایاں نہیں ۔ یا یوں سمجھئے کہ وہ ایک جانکاہ احساس سے
بچنے کے لئے فطرت کی بوقلمونیوں میں کھو جانا چاہتا ہے ۔ لیکن یہ کوشش شاید شعوری ہے ۔ اور وہ احساس لاشعور میں برابر موجود
رہتا ہے جس سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے اور جہاں اسے موقع ملتا ہے ۔ فطری مناظر میں کسی معمولی مماثلت کا سہارا پاکر سطح شعور
تک رسائی حاصل کر لیتا ہے لیکن اصول ارتفاع کے ماتحت اس کے لاشعور نے کھوئی ہوئی محبوبہ کی جگہ ملک و ملت کو پیش کیا ہے ۔

ان نظموں میں اس کا اجتماعی احساس اس کے انفرادی احساس سے غلبہ پا لیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اس کا اجتماعی شعور بھی اس کی شخصیت کے زیرِ اثر ایک خاص سانچے میں ڈھل چکا ہے چنانچہ ان اجتماعی احساسات کی جڑیں بھی اسی سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہیں۔ جس سے اس کی انفرادی دکھ درد کی دھارا پھوٹ بہی ہے۔ "نور جہاں کا مزار" میں شاعر جس نسلِ تیموری کا ذکر کر رہا ہے کیا اس کے پردے میں خود شاعر کی ذات جھانکتی محسوس نہیں ہوتی ؎

سربرآوردہ، وضعدار، بلند

خوگرِ گرم و سرد، تند، حلیم،

بے نیازِ مآل، حسن پسند

صرف سودائے انتقام نہیں اپنے انجام کا غلام نہیں

"جنگ" اور "جوانی" موضوع کے اعتبار سے ایک ہی چیز کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن پہلی نظم میں شاعر اپنے لاشعور کی کیفیت کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔ وہ ایک لٹے ہوئے سہاگ، ایک کچلی ہوئی روح، ایک پامال تمنا کا ذکر کرتا ہے، لیکن وہ کردار جس سے یہ ساری چیزیں وابستہ ہیں پوری طرح سامنے نہیں آسکا۔ اس نظم کا آخری شعر قابلِ غور ہے جس میں رقیب کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی رقیب کی تعریف پہلے مصرع میں نہایت کاوش سے یُوں کی گئی ہے ——— "عدوئے دوست نما" ——— لیکن وہ احساسات جو اس نظم کی تحریک کا باعث بنے تھے اس کوشش میں پوری طرح آسودہ نہیں ہو سکے۔ "جوانی" میں ایک سپاہی کی بیوہ کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں اور یہ چیز اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ نوعی اور انسانی دکھ درد کے تاثرات نے شاعر کے ذہن میں اسی راہ سے بار پایا ہے جس راہ پر "مجبوری" کی بیکس حسینہ کے نقوشِ قدم سنگِ میل بنے تھے۔ قیوم نظر جنسی ردِ عمل، میراجی کی نیم شعوری تخلیقات اور راشد کی جنسی بھوک سے بہت دُور ہے۔ البتہ جس طریق پر فیض کے ہاں سیاست اور جنسی تحریکات نظم کا تار و پود بنتی ہیں اسی طرح قیوم نظر کے ہاں بھی یہ دونوں موضوع باہم دست و گریبان نظر آتے ہیں۔ "جنگ"، "شبخون"، "جوانی"، "صبح کاذب"، "نور جہاں کا مزار"، "حسن آوارہ" وغیرہ سب میں جنسی تحریک کا لطیف شائبہ موجود ہے (شبخون اور جنگ کے بعض کنائے تو جنسی ردِ عمل کی بعض نہایت اُلجھی ہوئی صورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جہاں "خونخواری" جنسی تسکین کا جزو بن جاتی ہے) فیض اپنے انفرادی غم اور قوم کے مجموعی دکھ درد کا تذکرہ ایک ہی سانس میں کر جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو کسی مقام پر بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کے ہاں غمِ عشق کے مقابلے میں غمِ روزگار کو محض ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن قیوم نظر کی ان نظموں میں جن میں سیاسی کنائے موجود ہیں۔ اس کی اپنی ذات ہمیشہ پس پردہ رہتی ہے۔ "صبح کاذب" صرف ایک نظم ایسی ہے جس میں "قوم کی آزادی" کے پیرو کے لئے "میں" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بیانیہ انداز جو اس کی ابتدائی نظموں میں ملتا ہے بعد میں خالص ڈرامائی انداز میں بدل گیا ہے جس کی پہلی خصوصیت ہی یہ ہے کہ شاعر اپنی ذات یا "انا" کو نظر انداز کر دیتا ہے مثلاً "جوانی"۔ اس طریقِ اظہار میں البتہ ایک دقت ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض چیزیں حذف کر دی جاتی ہیں اور انجان قاری کے لئے اکثر اس سے الجھاؤ پیدا ہونے لگتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف درمیانی واسطہ یعنی "شاعر کی ذات" کے موجود نہ ہونے کے باعث قاری اکثر اپنے آپ کو اچانک ایک نئے مقام پر محسوس کرتا ہے۔ جس تک گویا کسی دوسری ہستی نے اس کی رہنمائی نہ کی ہوتی اور ذہن میں کچھ اس قسم کی کیفیت بیدار ہو جاتی ہے جیسے اندھیرے میں اچانک شمعیں روشن ہو جائیں۔

اپنی کہانی۔ بنی آدم۔ نئی تحریکیں اور آندھی، مسلسل استعارہ کے فنکارانہ استعمال کی دلچسپ مثالیں ہیں۔ البتہ "اپنی کہانی" اور آندھی کے تاثر میں وہ گہرائی پیدا نہیں ہو سکی جو دوسری نظموں میں موجود ہے۔ اور اسی لئے ان میں سطحیت یا ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے کسی ادبی مماثلت کا سہارا لیا گیا ہو۔ ان نظموں کے متعلق یہ خصوصیت قابل غور ہے کہ ان میں عنوان گویا نظم کا ایک حصہ ہے جسے پوری توجہ دیئے بغیر نظم کی معنوی گہرائیوں کو پالینا کسی حد تک ناممکن ہو جاتا ہے۔

قیوم نظر اپنے فن کا بڑا سمت نقاد واقع ہوا ہے۔ وہ اپنے فنی وجدان کو اپنی تنقیدی صلاحیتوں سے کبھی آزاد نہیں ہونے دیتا۔ اسی لئے اس کی نظموں میں والہانہ شدت کی بجائے ایک سنبھلا ہوا اور سلجھا ہوا تاثر پایا جاتا ہے اور اسی لئے مطالعہ کے وقت قاری کو بھی بہت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات اس کے عنوانوں کی صحیح اہمیت کا اندازہ کئے بغیر اس کی نظموں کو سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ دوسری چیز اس کا ڈرامائی انداز بیان ہے۔ اس کی ابتدائی نظموں کا مقابلہ اگر آخری دور کی نظموں سے کیا جائے تو صاف طور پر نظر آجائے گا کہ بیانیہ انداز شروع ہی سے اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ "برسات کی رات" اور "رنگ وصوت" اس قبیل میں ابتدائی کوششیں ہیں۔ اور اس کے بعد بتدریج خواب گراں"۔ "ترغیب" "نورجہاں کا مزار"۔ "جوانی" میں یہ انداز نکھرتا چلا گیا ہے۔

جدید دور کے شعرا کے متعلق مخالفین کا یہ اعتراض کسی حد تک بجا ہے کہ قافیہ سے اغماض اور بعض دوسری پابندیوں سے گریز کی وجہ جدید شعرا کی تن آسانی اور بعض اوقات خامکاری ہوتی ہے۔ لیکن قیوم نظر اس اعتراض کی زد میں نہیں آتا۔ اس کی تخلیقات کی معنوی خوبیوں کے علاوہ جن سے فن کے متعلق ایک گہرے شعور کا پتہ ملتا ہے۔ سطحی حیثیت سے بھی قیوم نظر نے کسی مقام پر تن آسانی یا خامکاری کا ثبوت نہیں دیا۔ وہ نظم میں قافیہ کی نئی نئی سکیمیں استعمال کرتا ہے اور انھیں پوری کامیابی سے نبھاتا ہے۔ "اپنی کہانی" میں "جیسے" کی ردیف کو جس چابکدستی سے اس نے ہر دو مصرعوں کے بعد نبھایا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ قافیہ یا ردیف اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتے بلکہ نظم میں ایک ہم آہنگی اور وحدت و تاثر پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی طرح اس نے اپنے لئے کوئی مخصوص بحر مقرر نہیں کر رکھی۔ وہ ہر بحر میں نظم کہتا ہے۔ مروجہ بحروں میں کئی قسم کا ردّ و بدل کرتا ہے۔ چھوٹے بڑے مصرعوں کو مختلف سانچوں میں ڈھال کر ان سے تاثر کے زیر و بم کو اُجاگر کرتا ہے۔ "تھکن" اور "خلش تاثر" کی طویل بحروں سے کہیں بھی اظہار بیان میں ٹھہراؤ یا اُلجھن پیدا نہیں ہونے پاتی۔ نظم بدستور میدانی ندی کی نرم لیکن مسلسل روانی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ فطری مناظر کے انتخاب میں بھی اس نے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ باغ و راغ کی جگہ برف کے وسیع میدان اور بلبل و طاؤس کی بجائے مرغابیاں اور چیچے اس کے یہاں محض جدت پسندی کے تقاضے سے نہیں آگئے بلکہ جن ذہنی کیفیتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے یہ استعارے استعمال کئے گئے ہیں ان کے نقوش شاید ان کے بغیر اتنی خوبی سے اُبھر ہی نہ سکتے تھے۔ مثلاً "بے بسی" میں "چند سہمے ہوئے چیچے" جس کیفیت کو پیش کرتے ہیں اور ان کی موجودگی فضا کی اُداس تنہائی کو جس طرح مجسم بنا کر سامنے لے آتی ہے وہ ہر توضیح سے بے نیاز ہے۔

ریاض احمد

مطبوعات

راج محل پبلشرز جموں کی کتابیں

۱۔ روحِ صہبائی از اثر صہبائی۔ حسین چاندنی رات میں ڈل کے کنارے ایک کشمیری مغنیہ بربط بر ہاتھ رکھے نظروں کو جھکائے ایک ایسے نوجوان کو مسحور کر رہی ہے جو انگوروں کی بیلوں کے نیچے پیالہ لئے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ یہ ہے روحِ صہبائی کا سرورق۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصور اُس شراب سے باخبر نہیں ہے جس کیلئے اس نے ایسا سبُو تراشا ہے۔ اثر صہبائی ملک کے ایک بہت کہنہ مشق لیکن جوان دل و دماغ کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں اقبال کی شاعری کا رس جھلکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا مغنی محض کیفیت اور زمانے کا خالق نہیں ہو سکتا۔ جوانی میں ایک شعر ملاحظہ ہو

> خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
> ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا

روحِ صہبائی چار حصوں میں منقسم ہے۔ نغمہ و نالہ (۱۹۲۳–۱۹۳۳) بامِ رفعت (۱۹۳۴–۱۹۳۶) نور و نکہت (۱۹۳۷–۳۹) ذکر و فکر (۱۹۴۰–۴۵) شاعر نے ہر فن پارے کی تاریخ تخلیق سے ہمیں اس لئے مطلع کیا ہے کہ ہم اُنکی جولانیٔ فکر و نگاہ کا جائزہ لے سکیں۔ جناب اثر کا کلام کیفِ تغزل میں ڈوبا ہوا ہے ان کی غزلوں میں جہاں کیف و سرمستی ہے وہاں دل میں کھٹکتے ہوئے احساسات کی ترجمانی بھی ہے۔ دو چار شعر ملاحظہ فرمائیے۔

> حُسن اپنی جگہ، حسنِ نظر اپنی جگہ
> میں دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہا ہوں
>
> ترے تغافلِ بے جا پہ مرمٹے ہیں ہم
> تو مسکرا کے اگر دیکھتا تو کیا ہوتا
>
> یہ دیر و حرم والے دشمن تھے مری جاں کے
> اب پوچھنے آتے ہیں کیوں تیرا پتہ مجھ سے

ہر دور کی غزلوں کے ساتھ نظمیں اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ ”پسِ منظر“ میں مصنف نے اپنے حالاتِ زندگی سے اپنے کلام پر روشنی ڈالی ہے جو مطالعہ کے سلسلہ میں بہت مفید ہے۔ کتاب ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے کتابت و طباعت عمدہ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

۲۔ پنچم مدھم محمد عمر (نور الٰہی) یہ مجموعہ سات ڈراموں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے تین ریڈیو پر نشر ہوئے۔ تین ناپسند کئے گئے اور ایک ”زہر جوں“ میں شائع ہوا۔ جناب محمد عمر صاحب ڈرامے کے اُن محدود چند ناقدوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے اس میدان میں بیحد بصارت کا ثبوت دکھائی۔ منشی نور الٰہی (مرحوم) کی معیت میں انھوں نے ”ناٹک ساگر“ ایسی تصنیف پیش کی جس کا بدل آج تک اردو زبان میں نہیں مل سکا۔ ان ڈراموں کو دیکھتے ہوئے ہمیں زبان کی سلاست اور قدرتِ بیان کی داد دینا پڑتی ہے۔ تین ڈرامے دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ اور ہندوستانی لباس میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس صنفِ ادب کی ترویج کے لئے ہمارا خیال ہے کہ ایسی بہت سی تصانیف ملک کے سامنے آنی چاہئیں اور ہم بالخصوص اس نقطۂ نگاہ سے اس تصنیف کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات قیمت دو روپے۔

۳۔ نغمۂ جاوید از خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی ــــ گئے سال خان بہادر خواجہ دل محمد صاحب نے ”دل کی گیتا“ کے نام سے گیتا کا ترجمہ پیش کیا تھا۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔ زیرِ نظر تصنیف میں بھی اسی مقدس کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ حضرت اثر ہمارے بے حد مقبول اور بزرگ اہلِ قلم میں سے ہیں۔ گیتا کے ترجمے میں جس روانی اور سلاست سے آپنے کام لیا ہے۔ اُس کا جواب یقیناً بہت مشکل سے دیا جائے گا۔ آپ نے مثنوی کی بحر استعمال کی ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کام اور نام کی مناسبت سے یہ ترجمہ ”نغمۂ جاوید“ ثابت ہوگا۔ ہم مصنف کو اس کامیاب ترجمے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

(سید منظور حسین بخاری پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۳۶۲

قواعد

۱- "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔
مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے۔

۳- دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۴- جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع
یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصُورتِ دیگر دفتر "ہمایوُں"
خط و کتابت کا ذمّہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے۔

۵- "ہمایوُں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ
جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتہً مِل سکتا ہے۔

۶- منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے
اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصُورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔

۷- چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصُول ڈاک)، قیمت فی پرچہ آٹھ آنے۔

مینیجر "ہمایوُں"

۴۴- لارنس روڈ- لاہور

[illegible] نہیں ہوا پھر بھی
دو روز زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: یوسف ظفر، بی۔ اے

فہرست مضامین

جلد ۵۰

نمبر ۳

ہمایوں - بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۶ء

سالانہ چندہ	ششماہی	فی پرچہ
صہ	سے ۳	۸

جہاں نما

ہندوستان کی فلم سازی

آج سے پندرہ برس پہلے جب ناطق فلمیں ہندوستان میں رائج ہونا شروع ہوئیں تو علامہ اقبال رحؒ نے ارشاد فرمایا تھا ؎

سینما نہیں صنعت آذری ہے

صنعت آذری ہوتے ہوئے بھی اس نے بعض بہت مفید اقدامات کئے۔ راتوں کو سڑکوں پر گانے والے آوارہ مزاج لوگوں کو تفریح کا ایک سامان ہاتھ آیا۔ شرفا کی عورتوں اور لڑکیوں پر آوازے کسنے والے فلم کے نسوانی کرداروں پر لٹو ہو گئے۔ فحش گانوں کی جگہ فلمی گانوں نے لے لی۔ محدود ذہن کے انسانوں کے علم میں اضافہ ہوا۔ زبان جس پر "ہندی" کا لیبل لگا ہوتا ہے اگرچہ وہ نہ تھی جو ہندوستان بھر میں بولی جاتی تھی، لیکن مختلف صوبوں کی زبانوں پر اس کا رنگ چڑھا اور ان پڑھ جاہل لوگ ایک ایسی زبان سے آشنا ہو گئے، جو زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو الفاظ کے الٹ پھیر سے بنی تھی۔ یہ اور ان کے ساتھ بعض اور خوبیاں ایسی تھیں جو سینما کی وجہ سے وجود میں آئیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک کا ہر مفید ادارہ لالچ اور خود غرضی کا شکار ہو جاتا ہے اس ذہنیت کا علاج کیا ہو سکتا ہے، جو محض روپیہ کمانے کی دھن میں اپنے مقصد کو بھول جائے۔ کلکتے اور بمبئی کی دو چار کمپنیوں نے مفید موضوعات کو ہاتھ میں لیا۔ زندگی کے مختلف زاویوں پر نظر ڈالنا شروع کیا۔ اور ابتدا میں بعض بہت عمدہ نمونے پیش ہوئے۔ لیکن تجربے نے بتایا کہ اس ملک کے لوگ حسین تخلیقات کی قدر نہیں کر سکتے۔ گیتوں کے مصرعے بے معنی ہوں تو کیا، گانا اچھا ہو تو بہت کافی ہے۔ تاریخ کے مختلف کرداروں کی صورتیں مسخ کر دی جائیں تو کوئی حرج نہیں، لیکن ایکٹر خوش شکل اور ایکٹرس حسین ہو، چال اور انداز کے اعتبار سے بات بنتی ہو تو فلم اچھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہترین موضوع، عمدہ ترین کردار نگاری اور شستہ و رفتہ مکالموں کے باوجود بعض فلمیں ناکام رہیں، وہ لوگ جو بہت بلند مطمح ہائے نظر لے کر آئے تھے عوام کی سطح پر اترنے کے لئے مجبور ہو گئے، اور انھیں کے رنگ میں ڈوب گئے۔

یورپ اور بالخصوص امریکہ کی صنعت فلم سازی نے اس کو جو مقام دیا ہے وہ فنون لطیفہ کے معیار سے کسی طرح کم نہیں انھوں نے شاعری، سنگ تراشی اور موسیقی کے ساتھ فلم کو لا کھڑا کیا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہاں کے عوام ہمارے یہاں کے عوام سے مختلف ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ خدا وندان فلم سازی نے اپنی اہمیت کو محسوس کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ ملک کی دماغی صحت کے ذمہ دار ہیں فلم تعلیم کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے، بچے اس سے وہ درس حاصل کر سکتے ہیں جو انھیں زندگی بھر کے تجربے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی ناقص تفریح عوام کے پختہ اذہان کو پستی کی طرف دھکیل دے گی، اس لئے انھوں نے اس صنعت کے بہترین مصرف کو اپنا مقصد قرار دیا۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں کے وہ سرمایہ دار جو صنعت فلم سازی کے اجارہ دار ہیں، یا تو فلم کی زبان سے بے بہرہ ہیں، اور اس کی باگ ڈور ہر کس و ناکس کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں، یا اگر زبان سے واقف بھی ہیں تو بھی تعلیمی اعتبار سے بہت پست ہیں۔

یہاں کوئی فلم ایسی نہیں بن سکتی جس میں عشق و محبت کے عامیانہ اور لغو داستان نہ ہو۔ اس میں اس قدر بد مذاقی کی حد تک کمزور لمحاتی ہوتی ہے کہ صاحبِ ذوق دیکھنے والا کوستا رہ جاتا ہے۔ اس کے گانے اس قدر بے معنی ہوتے ہیں کہ ادبی مذاق پر گراں گزرتے ہیں۔ لیکن ہر صدائے احتجاج پر یہی جواب ملتا ہے کہ فلم بہت کامیاب ہے۔ اس لئے کہ اس سے خلاف توقع آمدنی ہوئی فلاں مقام پر ۲۷ ہفتے، تو فلاں مقام پر ۴۰ ہفتے چلی۔

ہمارے بعض ادیبوں نے اس روش کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور فلم سازوں نے اپنی بہتری اسی میں دیکھی کہ ان کا منہ سونے سے بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ہمارے مقبول ترین شاعر حضرت جوش ملیح آبادی تک کو گھسیٹ لیا گیا۔ لیکن ہوا یہی کہ ان حضرات نے ایسے ایسے گانے لکھے کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی۔ ترقی پسندی گل کھلا رہی تھی۔ افسانہ نگاروں میں سے کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، احمد عباس اور ڈرامانویسوں میں سے امتیاز علی تاج جیسے صاحبِ قلم حضرات اس میدان میں کسی انفرادیت کا نمونہ پیش نہ کر سکے ——— اس کا باعث ——— یہی کہ سرمایہ دار کو اپنا روپیہ عزیز ہے، اور وہ فن کار کو تجربوں کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہوا کے بہاؤ کے خلاف چلنا اسے معیوب نظر آتا ہے۔ اور وہ ازلی تثلیث ——— ہیرو ——— ہیروئن ——— رقیب کے گرد چکر کاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ ہمارے یہ فنکار اس وقت تک کمالِ فن دکھلاتے رہے جب تک انھیں فلم دیوی کے چرنوں میں جگہ نہیں ملی تھی۔ لیکن روپیہ ہاتھ میں آتے ہی ان حضرات کی ادبیت بھی خطرے میں پڑ گئی۔ اور یوں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ اب ادب کے لئے بھی کام کے نہیں رہے۔

یہ صنعت جسے ہمارے یہاں خالص تجارتی اغراض کے باعث فروغ دیا جا رہا ہے، اور جس کی منڈیاں ملک کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کی گئی ہیں تعصب اور اردو دشمنی کی ایک روشن مثال پیش کرتی ہے۔ فلم کی کامیابی ان لوگوں پر منحصر ہے جن کی زبان اردو ہے۔ لیکن گجراتی اور مارواڑی سیٹھ، بنگالی اور سندھی سرمایہ دار جو اس صنعت کے اجارہ دار ہیں ہندی کو جانے بغیر گاندھی جی راجگوپال اچاریہ، کے ایم منشی اور دوسرے حضرات کی طرح جو اردو اور ہندی دونوں سے بے بہرہ ہیں ہندی دوستی اور اردو دشمنی کے مظاہرے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے مغلیہ خاندان کے مختلف بادشاہوں کی مسخ شدہ صورتیں اور من گھڑت قصوں کی نمائش کی جاتی ہے تو کبھی اور موجودہ سماجی زندگی کی خام تمثیل نگاری کی جاتی ہے تو بھی زبان کے لحاظ سے ہندی کو نمایاں مقام دیا جاتا ہے۔ فلم کے چہرے پر ہندی کی مہر ثبت ہوتی ہے اور جا و بیجا طور پر ہندی گانے ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دو چار فلمیں ایسی بھی ہیں جن کے مکالمے خالص اردو زبان میں تھے۔ لیکن ان پر بھی یہی مہر تھی۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ قید حکومت کی طرف سے عاید کی گئی ہے کہ اردو کا نام تک نہ آنے دیا جائے۔ یا ان فلمی اداروں کو اردو کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اس ضمن میں ہم جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ ان اداروں کو مکالموں میں اردو کا استعمال کرنے اور فلم پر اردو کا لیبل لگانے پر مجبور کریں۔ اور اگر یہ لوگ اپنی روش سے باز نہ آئیں تو ان کے خلاف باقاعدہ طور پر اقدام کریں۔

دہلی میں ایک کل ہند فلم اور ریڈیو ایسوسی ایشن قائم کی گئی ہے۔ جس کے اغراض و مقاصد کچھ اسی نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کرے یہ انجمن ذاتی مفاد کے بہاؤ میں نہ بہ جائے۔ اور کئی دوسری انجمنوں کی طرح دو در روزہ کشاکش کے بعد سپر انداز نہ ہو جائے۔ زمانہ نازک ہے اور بے لوث و مخلصانہ خدمت کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔

دنیا ترقی کر رہی ہے، اور ہماری ایک پود نے پتھر دل کے زمانے سے جوہرِ بم کے زمانے تک کا سفر کر لیا ہے ——— کیا

یہ ہمارے ملک کے تاجر فلم ساز روپیہ بٹورنے کے ساتھ ساتھ اس ملک کے عوام کو خوش مذاق بنانے کی طرف توجہ نہیں دیں گے، اور اپنی جگہ پر ڈٹے رہیں گے؟ کیا ان کا فرض نہیں کہ سستی تفریح کی بجائے پاکیزہ دلچسپیوں سے اپنے معیار کو بلند کریں۔ کہانیوں میں تنوع، مکالموں کی زبان میں شستگی اداکاروں کو بامعنی ہونے دیں، تاکہ دنیا کے لئے ان کی کاوشیں باعث تضحیک نہ ہوں۔؟ ہمیں یقین ہے کہ وہ وقت آرہا ہے جب ملک کا بدلتا ہوا مذاق ان سے اس بے حسی کا انتقام لے گا۔

ہمایوں کا جوبلی نمبر

اس سے پہلے ہم جوبلی نمبر کے بارے میں دو اعلانات کر چکے ہیں۔ اب تک اس ضمن میں جو کام ہوا ہے، اور جن حضرات نے ہماری درخواست پر اس نمبر کے لئے مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے اُن کے اسمائے گرامی سے آپ کو مطلع کرتے رہنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

پچیس سالہ اردو ادب پر ایک نظر	جناب ڈاکٹر محمد دین صاحب تاثیر ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی
نظم آزاد کے پچیس سال	جناب کپٹن ن۔م۔راشد صاحب ایم۔اے
اُردو غزل کے پچیس سال	جناب حفیظ ہوشیارپوری صاحب ایم۔اے
اُردو افسانے کے پچیس سال	جناب پروفیسر وقار عظیم صاحب ایم۔اے
اُردو ڈرامے کے پچیس سال (سٹیج۔فلم اور ریڈیو)	جناب انصار ناصری صاحب ایم۔اے
اُردو رسائل کے پچیس سال	جناب شاہد احمد دہلوی بی۔اے (آنرز) مدیر ساقی
اُردو صحافت کے پچیس سال	جناب مولانا باری (علیگ)
پچیس سالہ اُردو ادب میں اشتمالیت	جناب ظہیر کاشمیری صاحب بی۔اے
پچیس سالہ اُردو ادب میں نفسیات	جناب کپٹن رفیع الزمان خاں صاحب ایم۔اے۔
پچیس سالہ اُردو ادب میں خواتین کا حصّہ	جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ایم۔آر۔اے۔ایس

ان کے علاوہ جو حضرات ادب کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہیں، وہ براہِ کرم ہمیں مطلع فرمانے کے بعد قدم اٹھائیں تاکہ ایک ہی موضوع پر بہت سی کاوشیں اکارت نہ جائیں۔

یوسف ظفر

ولی الدین یکن

مصر کا ایک ترقّی پسند شاعر

ولی الدین یکن بیسویں صدی عیسوی کے ان ترقی پسند عربی ادیبوں کی جماعت میں شامل تھے جنھوں نے مشرق و مغرب کے ادب کے امتزاج سے ایک نئی اور درمیانی شاہراہ ادب نکالی اور عربی ادب میں حریتِ افکار اور جذبات نگاری کا ایک نیا نمونہ پیش کیا۔ گو ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ظلم و استبداد کے فولادی پنجے نے ان کے جسم کو جکڑے رکھا، مگر ان کے دماغ، افکار و خیالات کو کوئی قید نہیں کر سکا۔ تقلید پرست زمانے نے بھی ان کی قدر شناسی نہ کی۔ مگر جس طرح غالب نے کہا تھا "شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"۔ اسی طرح وہ خود کہتا ہے۔

"اگر آج اہل زمانہ میرے مقالات سے روگردانی کر رہے ہیں تو کل ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کے فرزند میرے کلام پر فریفتہ ہوں گے۔"

ولی الدین یکن کے حساس دل و دماغ نے اگر ایک طرف سے ظلم و استبداد کے قصر کو مسمار کیا تو دوسری طرف سے بلادِ عربیہ میں قومیت و وطنیت اور مذاق سلیم کی روح پھونکی۔ افسوس یہ ہے کہ انھیں ناساعد حالات میں تھوڑی سی عمر میسر ہوئی ورنہ وہ عربی نظم و نثر میں بے مثل یادگاروں کا ایک معتد بہ ذخیرہ چھوڑتے۔ بہرحال ان کے مختصر حالات ہدیۂ قارئین ہیں۔

ابتدائی حالات محمد ولی الدین بک حسن سری پاشا کے بیٹے اور ابراہیم پاشا یکن کے پوتے تھے۔ ان کے دادا محمد علی پاشا خدیو مصر بانی خاندان شاہی کے بھانجے تھے۔ اس وجہ سے ان کا لقب "یکن" پڑ گیا تھا۔ جس کے معنی ترکی زبان میں بھانجے کے ہیں۔ ان کے بعد ان کی اولاد بھی اسی لقب سے مشہور ہو گئی۔ یہ خاندان اپنے کارناموں کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ کیونکہ ابراہیم پاشا یکن کے لشکر کے سپہ سالار تھے۔ اور ان کے بھائی محمد پاشا محمد علی پاشا کے عہد میں لشکر حجاز کے کمانڈر انچیف تھے۔

ولی الدین کی والدہ بھی ایک چرکسی سردار کی بیٹی تھیں۔ اس لحاظ سے ولی الدین موصوف نجیب الطرفین تھے۔

ان کی پیدائش آستانہ کے قریب بمقام سلیمانیہ ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ان کے والد اپنے خاندان کو لے کر مصر آ گئے۔ اور اپنے بیٹے کو عربی تعلیم دلانے کے لئے ایک خاص معلم کے سپرد کیا۔ مگر یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ زیادہ عرصہ ان کے سر پر باپ کا سایہ نہیں رہا۔ اور وہ چھ سال کے تھے کہ ان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد انھیں اور ان کے بھائیوں کو ان کے چچا علی حیدر پاشا یکن ناظر مالیات مصر نے اپنی پرورش میں لیا۔ اسی زمانے میں محمد توفیق پاشا شاہ مصر نے اپنے اور امراء مصر کے فرزندوں کی تعلیم کے لئے عابدین میں ایک خاص تعلیمی ادارہ کھول رکھا تھا۔ اور اس کے لئے مشہور اہل علم و فضل کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ یہ ادارہ ہمارے یہاں کے "چیفس کالج" کے نمونہ پر قائم تھا۔ ولی الدین بھی یہاں داخل کئے گئے۔ اور یہاں کی اور عربی زبان کے علاوہ انگریزی اور دیگر علوم کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک فرانسیسی عالم مارسیل کے مدرسہ میں فرنچ سیکھی۔ بعد ازاں وہ مدارس امیریہ میں داخل ہوئے، اس طرح انھوں نے عربی، ترکی، اور فرانسیسی زبانوں پر

ی مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ وہ انگریزی اور یونانی زبانیں بھی بقدر ضرورت جانتے تھے۔

انشاپردازی اور مضمون نگاری کا انہیں بچپن ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ بیس سال کی عمر سے پہلے انہوں نے مصری جرائد میں
ی سیاسی اور معاشرتی عنوانوں پر مختصر مقالات لکھنے شروع کر دیئے۔ ان کے یہ ابتدائی مضامین "القاہرہ"، "النیل" اور "المقیاس"
شائع ہوتے رہے تھے۔ آخر کار بعض اعزّہ کے اصرار پر کچھ عرصہ کے لئے سرکاری ملازمت بھی اختیار کر لی تھی، مگر تھوڑے عرصے کے
اپنے پیدائشی وطن کا اشتیاق انہیں کھینچ کر خلافت ترکیہ کے دارالخلافہ قسطنطنیہ لے آیا، جہاں وہ ۱۸۹۶ء میں پہنچے۔ یہاں
اپنے چچا محمد فائق بک بکن کے پاس رہے۔ جو مجلس شوریٰ (کونسل) کے ممبر تھے۔ خلیفہ سلطان عبدالحمید نے ان کے حسن لیاقت کا
اعتراف کرتے ہوئے "مرتبۂ ثانیہ" کا اعزاز انہیں عطا کیا۔ شاعر موصوف ایک سال تک یہاں کے ان رنگین و دلکش نظاروں سے اپنی
قوت متخیلہ کو لطف اندوز کرتے رہے، جن کا تذکرہ ان کے اشعار میں موجود ہے۔

صحافت نگاری | آستانہ سے واپس آکر ۱۸۹۷ء میں انہوں نے ایک اصلاحی اور سیاسی اخبار "الاستقامۃ" جاری کیا
س کے ذریعہ انہوں نے خلوص اور جرأت کے ساتھ ترکی سیاست کی اصلاح کے لئے نکتہ چینی شروع کر دی۔ مگر ترکی حکومت کو ان
تنقیدیں اور نکتہ چینی اس قدر ناگوار معلوم ہوئی کہ اس نے اپنے علاقوں میں اس کی اشاعت حکماً بند کرا دی۔ لہٰذا چار و ناچار
انہیں اپنے اخبار کو بند کرنا پڑا۔ اس پر بھی وہ ترکی سیاست میں حصہ لینے سے باز نہیں رہے اور بدستور "المشیر"، "المقطم"
اور "القانون الاساسی" میں سیاسی مقالات لکھتے رہے۔

آستانہ کا دوبارہ سفر | دوسرے سال انہوں نے آستانہ کا دوبارہ سفر اختیار کیا۔ جہاں وہ محکمۂ جنگی کی کمیٹی کے
ممبر مقرر کئے گئے۔ اس کے بعد وہ ترکی کے اعلیٰ سررشتۂ تعلیم کے ممبر منتخب کئے گئے۔ مگر خلیفہ عبدالحمید خاں کے ارباب اختیار کی
نظروں میں ان کے گزشتہ کارنامے اس قدر بھیانک نظر آتے تھے کہ وہ انہیں تخت خلافت کا مخلص اور وفادار خادم نہیں خیال
کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ان کے پیچھے جاسوس لگا دیئے۔ جنھوں نے یہ خبر دی کہ بیرون سلطنت کی جماعت احرار سے ان کے
تعلقات قائم ہیں۔ اور ان کے پاس ایسے خطوط و دستاویزات موجود ہیں جن کا مقصد سلطان عبدالحمید اور ان کی سلطنت
کا تختہ الٹنا ہے۔

خانہ تلاشی | لہٰذا پولیس کے افسر اعلیٰ تفتیش پاشا نے ۱۹۰۲ء میں پولیس کے چند آدمیوں کو ان کے گھر کی تلاشی لینے
کے لئے بھیجا۔ چنانچہ وہ ان کی عدم موجودگی میں ان کے گھر گئے۔ اور ان کی بیمار بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو ڈرا دھمکا کر ضروری
کاغذات تلاش کرکے لے گئے اور چار دن کے بعد وہ خود بھی آستانہ کے ایک بازار میں چلتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے۔ اس وقت
ولی الدین اپنی بیمار بیوی کی دوا لینے جا رہے تھے۔ مگر ان کی مشکلات کا کوئی احساس نہیں کیا گیا۔ اور مقدمہ چلائے بغیر انہیں
قیدخانہ میں ڈال دیا گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ایک نہایت تنگ و تاریک قیدخانہ منتخب کرکے انہیں وہاں بند کر دیا گیا

سیواس میں جلاوطنی | اس نئے قیدخانہ میں کچھ عرصہ تک مقید رکھ کر ادیب موصوف کو ایک جہاز میں نامعلوم مقام
پر لے جانے کے لئے بٹھا دیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید انہیں خلیج باسفورس میں غرق کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ بعض مجرموں
کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ تاہم کافی عرصہ کے بعد انہیں اطلاع ملی کہ اناطولیہ کے ضلع سیواس میں انہیں جلاوطن کرنے کا شاہی
حکم صادر ہوا ہے۔

آخر کار ابداز خزانی بہار آندھیوں، برف و باراں کے طوفانوں کی سختیاں جھیلتے ہوئے شاعر موصوف سیواس میں ۱۹۰۲ء

میں پہنچے۔ ان تمام مصائب اور جلاوطنی کی خبروں سے ان کے اہل وعیال بالکل ناواقف تھے۔ انھیں اس وقت صحیح اطلاع ملی جب شاعر موصوف نے اپنی جلاوطنی کی سرزمین پر پہنچ کر انھیں خبر دی۔ اور اپنے پاس اپنے اہل وعیال کو بلوا لیا۔ یہاں آنے پر حکومت ترکیہ نے جلاوطنی کی سزا دینے کے باوجود ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اسی بنا پر انھیں صوبہ کا "معاون خصوصی" یا اسسٹنٹ سکریٹری ۱۵ پونڈ ماہانہ پر مقرر کیا گیا۔ ان کا مشاہرہ انھیں باقاعدہ نہیں ملتا تھا۔ بلکہ جب حکومت چاہتی تھی تو ان کا مشاہرہ انھیں ہر مہینے مل جاتا تھا۔ مگر کبھی مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔

شاعر موصوف سیواس میں سات سال تک مقیم رہے۔ اس عرصہ میں انھیں کافی روحانی تکالیف سے سابقہ رہا۔ کیونکہ وہ اپنے تمام عزیزوں اور دوستوں سے الگ تھلگ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دانتوں کا درد بھی نمودار ہوا۔ تاہم ان کی والدہ، بیوی اور بچوں کی موجودگی کسی قدر باعث اطمینان تھی۔ سیواس کے باشندوں کے حسن سلوک اور ان کی مخلصانہ محبت نے بھی انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب "المعلوم والمجہول" میں کیا ہے۔

۱۹۰۸ء میں دستوری حکومت کے اعلان کے بعد انھیں اس جلاوطنی سے نجات ملی۔ رہا ہوتے ہی وہ آستانہ پہنچے، اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ مصر روانہ ہو گئے۔ مصر پہنچ کر انھوں نے دوبارہ مقالہ نگاری کا سلسلہ جاری کر دیا۔ مصر کے ادبی حلقوں میں ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ اس کے بعد ادیب موصوف نے اخبار "المقطم"، "الاہرام"، "المؤید" اور مجلہ "الزہور" میں زبردست مقالات لکھنے شروع کئے۔ کچھ عرصہ تک وہ جریدہ "الاقدام" کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔ چونکہ انھیں اس دفعہ فرصت کا کافی وقت ملا تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنے گزشتہ برسوں کے تجربات کو جمع کرنا شروع کیا۔ بعد میں یہ تجربات تحریری صورت میں "المعلوم والمجہول" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئے۔ اخبار "المقطم" میں جو مقالات انھوں نے شائع کرائے تھے وہ کتابی صورت میں "الصحائف السود" کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک اور مجموعہ "التجاریب" کے نام سے شائع ہوا۔ اسی اثنا میں انھوں نے "خواطر نیازی" کا ترجمہ بھی شائع کیا۔

چند برسوں کے بعد محکمہ وزارت حقانیہ (اوقاف) کے لیے ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء تک وہ اس منصب پر سرفراز رہے۔ اس کے بعد سلطان حسین کامل نے انھیں "دیوان کبیر السلطانی" کا عربی سکریٹری مقرر کیا۔ سلطان موصوف کو ان سے بے حد محبت تھی اور انھوں نے ادیب موصوف کو "تمغۂ نیل" سے بھی سرفراز کیا۔ یہ زمانہ ان کی زندگی کا خوشگوار ترین زمانہ تھا۔ انھوں نے اپنی اس نئی زندگی کو "زمانے کی طویل عرصے کی ترش روئی کے بعد ایک لطیف مسکراہٹ" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اس تقرر کے بعد اپنے دوست شیخ انطون جمیل کو ایک خط میں تحریر کیا تھا۔ مگر چونکہ وہ بدنصیبی کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے انھیں اندیشہ تھا کہ زمانہ جلد ان کی خوش نصیبی میں حائل ہو جائے گا۔ اور حقیقت میں ان کا یہ اندیشہ بجا تھا۔ کیونکہ بہت جلد ایک خطرناک مرض ان کے سینے میں جاگزیں ہونے لگا۔ اور سانس کی ایک ایسی بیماری ہو گئی جسے عربی میں "[illegible]" اور انگریزی میں Emphyzeme کہتے تھے۔ اس بیماری کی وجہ سے انھیں دن رات بے چینی رہتی تھی۔ اس پر مزید طرہ یہ تھا کہ خاندانی مصائب وحوادث کی بھی لگاتار بارش ہونے لگی۔ کیونکہ اس عرصہ میں یکے بعد دیگرے ان کی والدہ، ہمشیرہ اور منجھلے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ ان عزیز ترین افراد کے صدموں نے ان کی زندگی کو اور تلخ کر دیا اور رفتہ رفتہ ان کی زندگی لگاتار مصائب وحوادث کا مجموعہ بن گئی۔ زمانے نے ان کے ایک خندۂ شادمانی کی قیمت آنسوؤں کی جھڑی رکھی تھی۔ لہٰذا ان کا مرض بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ۱۹۱۹ء میں شاہی محل کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اور اپنے گھر مقیم ہو گئے۔ اس کے بعد مزید معالجہ کے سلسلے میں حلوان پہنچے۔ جہاں اُن کا

رنج ومصائب کی زندگی کا یہ سلسلہ اتوار کے دن ۱۹۳۱ء میں ختم ہوگیا۔

ولی الدین موصوف نے اپنی مصیبت کے دنوں میں " قرافتہ الامام" مصر میں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی، جوا[ن کے]
خاندان کا مدفن تھا۔ لہذا خداوند تعالے نے ان کی یہ آرزو پوری کی اور ادیب موصوف اپنے معزز خاندان کے افراد کے د[رمیان]
قبرستان مذکور میں دفن ہوئے۔ ان کے چہلم کے موقع پر ان کی یادگار منانے کے لئے ان کے اہل ادب احباب جمع ہوئے اور ان کے
کے قریب ایک ماتمی جلسہ منعقد کیا۔ ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ ایسے موقع پر اہل علم وادب کی ایک کافی تعداد ان کی آوا[ز پر]
لبیک کہے گی مگر ان کی یہ توقع ناکام ثابت ہوئی۔ کیونکہ ان کی ایک نہایت قلیل تعداد کے علاوہ اور کوئی شریک محفل نہیں [ہوا]
شرکائے محفل میں قابل ذکر ابراہیم رمزی، خلیل مطران، شیخ انطون جمیل اور جورج طنوس تھے۔ درحقیقت ادیب موصو[ف نے]
اس قسم کی پیشین گوئی پہلے ہی کردی تھی۔ جبکہ انھوں نے اپنے ایک مقالہ بعنوان "مشرق میں ادیب کیسے مرتے ہیں" :
بلیغانہ انداز میں یہ تحریر کیا تھا۔" ہمارے ادیب جب مرتے ہیں اس وقت خیالات ومعانی کی تجلیات ان کی عقلوں میں بجھ [چکی]
ہیں۔ ان کے گھر ویران اور ان کی قبریں شکستہ دکھائی دیتی ہیں "

اگرچہ ادبائے مصر نے ان کی قدرشناسی نہیں کی تاہم دنیائے عرب کے جرائد ورسائل نے ان کے مرثیئے شائع کئے اور ان [کی]
علمی، ادبی اور قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین ادا کیا۔

شخصیت اور اخلاق ولی الدین یکن میں ایک اچھے شاعر کی تمام شاعرانہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان [کی]
باریک بینی، نازک خیالی اور حساس طبیعت نے ان کو عربی زبان کا زبردست شاعر اور انشاپرداز بنادیا تھا۔ ان کی ذاتی قوت
شجاعت نے ان میں جرأت، اولوالعزمی، صبرواستقلال، حریت پسندی اور خوش مزاجی کے اوصاف بھی پیدا کردیئے تھے۔ ان [کی]
تمام عمر مصائب وآلام میں گزری مگر محفلوں میں ان کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی، لطیف ظرافت اور زندہ دلی میں کوئی کمی نہیں [آئی]
اس کے ساتھ ساتھ ان میں غیرت وخودداری کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ غرور وتکبر اور ظلم واستبدا[د کو]
بدترین خصلت سمجھتے تھے۔ اور اسی جذبۂ غیرت کے ماتحت وہ عام طور پر سلطان عبدالحمید خاں اور ان کی حکومت کے ظلم واستبد[اد]
کے خلاف مضامین اور نظمیں لکھتے رہے۔ علاوہ ازیں شاعر موصوف حب الوطنی کے جذبہ سے ہمیشہ سرشار رہے۔ اور اس [کا]
ثبوت ان کی وہ نظمیں ہیں جن سے ان کا اپنے وطن مصر سے سچی اور والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

ترقی پسندی ولی الدین یکن کے جذبۂ حریت وآزادی نے انھیں قدیم اور فرسودہ رسومات اور رجعت پسند[ی سے]
متنفر بنائے رکھا۔ بلکہ ان کے ترقی پسند جذبات ہی نے انھیں ہمیشہ مصائب وآلام اور خطرات میں مبتلا رکھا۔ کیونکہ وہ جس [چیز]
کو حق سمجھتے تھے اس کے کہنے اور کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کرتے تھے۔ خواہ اس چیز کا تعلق معاشرت سے ہو یا مذہب [و]
سیاست اور علم وادب سے۔ کیونکہ وہ ہر ایک شعبۂ زندگی میں مخصوص مسلک اور آزادرائے کے مالک تھے، چنانچہ اپنی قو[می]
وخاندانی روایات کے برخلاف اور خاندان کی مخالفت وناراضی کے باوجود ایک یونانی عیسائی خاتون سے شادی کی جس [کی]
بنا پر انھیں جلاوطنی نصیب ہوئی۔ ادب وانشاپردازی میں انھوں نے مقررہ قواعد کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا اور نثر نگ[اری]
میں قدیم خیالات اور مقفیٰ ومسجع عبارت آرائی کو ترک کرکے ایک خاص اسلوب بیان اختیار کیا جس کے لفظ لفظ سے ان [کی]
ذاتی شخصیت، صداقت اور حقیقت نگاری عیاں ہے۔ نظم میں یورپین نظموں کی طرز پر ہر قسم کے مسلسل خیالات ادا کے[ئے]
چنانچہ ان کی سیاسی، قومی، وطنی، معاشرتی، تاریخی اور رومانی نظمیں مغرب کے مشہور شاعروں کی نظموں کا مقابلہ کرتی ہ[یں]

عربی نثر میں غالباً وہ پہلے عربی ادیب ہیں جس نے رنگین اور لطیف پیرائے میں اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کی ترجمانی کی ہو اور اسی کے ساتھ ساتھ ادب کے ذریعے قومی و معاشرتی اصلاح کا کام لیا ہو۔

تصانیف | ولی الدین یکن کی تصانیف نظم و نثر میں طرز تحریر اور خیالات کے لحاظ سے یکسانیت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ان کی نثر نگاری بھی شاعرانہ رنگینیوں سے لبریز ہے۔ صرف قافیہ اور وزن نظم و نثر میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظمیں نثر کی طرح سادہ اور سہل ممتنع ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) **المعلوم والمجهول**، دو جلدوں میں ہے جس میں بچپن اور عالم شباب کے واقعات مندرج ہیں۔ بالخصوص وہ واقعات تحریر کئے ہیں جو جلا وطنی کے زمانے میں پیش آئے۔ نیز سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں سلطنت ترکیہ کے حالات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔ اور بعض معاملات کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(۲) **التجاريب**:۔ یہ کتاب چند معاشرتی اور اجتماعی مقالات کا مجموعہ ہے۔

(۳) **خواطر نیازی**:۔ یہ احمد نیازی کی تاریخ انقلاب عثمانی کا ترکی سے عربی میں ترجمہ ہے۔

(۴) **دیوان ولی الدین یکن**:۔ یہ دیوان ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی یوسف صمدی یکن نے مرتب کیا تھا اور ۱۹۲۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ تمام اشعار جمع کئے گئے ہیں جو مرتب کو دستیاب ہو سکے ہیں۔ بعض ناتمام اور نامکمل نظمیں بھی ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے دیوان کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) سیاسی نظمیں (۲) مرثیے (۳) مدح (۴) دہریات یا شہر آشوب (۵) ہجو (۶) غزل یا عاشقانہ نظمیں (۷) متفرق نظمیں اور قطعات۔

شاعر موصوف نے ایک معاشرتی ناول "ذکراں و رائف" کے نام سے بھی تحریر کیا تھا۔ اور مشہور مغربی ناول نگار پال بورجیہ (P. Boarget) کے ایک ناول کا "الطلاق" کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔

خصوصیات شاعری | ولی الدین کی سیاسی نظمیں حب الوطنی اور حریت و آزادی کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان مختصر اوراق میں ان کے شاعرانہ کمالات پر مفصل تبصرہ کرنا باعث طوالت ہوگا۔ اسی طرح ان کی چیدہ چیدہ بہترین نظموں کا ترجمہ کرنا بھی طوالت سے خالی نہیں ہے۔ لہٰذا چند نظموں کا عنوانات تحریر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جن سے مضامین کے تنوع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سیاسی اور وطنی نظموں کے چند عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

"مشرق"۔ "وطن کے ویرانوں میں"۔ "عصر الشوریٰ والحریۃ"۔ "عبرت زمانہ"۔ "خلیفہ عبدالحمید خاں کی معزولی پر"۔ "امیر الشعراء شوقی بک کے جواب میں ایک نظم تحریر کی گئی"۔ "تعصب ملک سے آزادی کا اخراج کرتا ہے"۔ "ان آثار قدیمہ پر سلام ہو جو مٹ گئے"۔ "اے میرے آبا و اسلاف کے گہوارے"۔ "اے وطن"۔ "مصر کی یادیں" (جلا وطنی کے زمانے میں تحریر کی گئی)۔ "آنے والے کا خیر مقدم اور جانے والے کو الوداع" (یہ نظم خلیفہ محمد پنجم کی تخت نشینی اور سلطان عبدالحمید خاں ثانی کی معزولی پر تحریر کی گئی)۔ "اپنے اخبار الاستقامۃ کو الوداع"۔ "تشدد کی حکومت"۔ "پریس کی آزادی"۔ "جنگ طرابلس"۔ "جنگ عظیم ۱۹۱۴ء"۔ "سیواس میں جلا وطنی کے زمانے میں"۔ "قصر چراغاں کی آتش زدگی" (یہ قصر چراغاں سلطان مراد پنجم کا محل تھا جہاں وہ معزول ہونے کے بعد اپنی وفات تک مقید رہا)۔ "خلیج باسفورس"۔ "آزادی کے زمانے میں غلامی"۔ "حکام خلافت عثمانیہ"۔

عاشقانہ اور رومانی نظمیں | "شاعر"۔ "رات اور خواب"۔ "مظلوم بادشاہ"۔ "شاعرہ شاعر کو داغ مفارقت دیتی ہے"۔

"دو مظلوم" "میری کتاب اور راز" "جب بہار جاتی رہے" "نامعلوم اُمید" "قلو بطرہ اپنی آخری گھڑیوں میں اپنی ذات کا محاسبہ کر رہی ہے" (یہ نظم ان کے آخری زمانے کی ہے اور عربی ادب میں ڈرامائی اور بیانی نظموں کے محاسن اور بہترین اوصاف کی حامل ہے) "وادیٔ نیل" "اندھی دوشیزہ" "میں کیا چاہتا ہوں" "شکسپیر" (یہ ان کی نامکمل نظموں میں سے ہے۔ اسی کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ جس میں انگریزی کے اس مایۂ ناز شاعر کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے) "ہمارا نیا زمانہ" "میرا کتا جوجو" "فلسطین فروق" "نرگس" "بلبل" "لیلتہ القدر" "ادھیڑ اور نوجوان عورت" "نکتہ چین کے عیب" "باپ اور شوہر دو وحشیوں کے درمیان" "غمگین رات" "حالِ مرض" "مرض کی سختی کے موقع پر" یہ ملحوظ خاطر رہے کہ شاعر موصوف کی یہ تمام نظمیں مسلسل خیالات کی حامل ہیں، اُردو فارسی کی غزلوں کی طرح غیر مسلسل اور مستقل اشعار عربی شعرا میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

نثر شاعر موصوف نے زیادہ تر اصلاح معاشرت و سیاست کا کام اپنی نثر نگاری سے لیا ہے۔ یا اپنی دکھ بھری کہانی بیان کی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی نثر میں زورِ جذبات کی شدت، صداقت و خلوص پایا جاتا ہے۔ ان کی نثر کے بہترین مضامین و مقالات کے چند عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

"آنسو سے لکھی ہوئی تحریر" "تکبّر اور اظہار نعمت" "غیرت" "عورت" "اپریل فول یا رمضان فول" (اسی مضمون میں رمضان شریف میں فضول خرچی و دیگر بے جا رسوم پر نکتہ چینی کی گئی ہے) "اسراف" "مشرق میں ادیب کیسے مرتے ہیں؟" "تید زمانے کی سرگزشت" "جلاوطنی میں داڑھ کا درد" ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

رشید احمد ارشد

غزل

(نعتیہ)

چشمِ غم اشکِ ندامت لئے شرماتی ہے — جب کبھی یاد گناہوں کی مجھے آتی ہے

راہ مشکل ہے بہت دُور ہے دل کی منزل — اب تو اُمید کی مشعل بھی بُجھی جاتی ہے

خواب دیوانے کا ہو کر جو کٹی عمر تمام — اپنی حالت پہ مجھے آپ ہنسی آتی ہے

سیّدیؐ آپ کی اُمت کا ہوں ادنیٰ سا غلام — یہی ڈھارس مجھے جنت کو لئے جاتی ہے

نہیں مقبول جہاں میں کوئی پُرساں اپنا
دیکھئے جس کو یہاں رندِ خرابا تی ہے

مقبول حسین احمد پوری

غزل

کھل گئے انتظار کے معنی
عہدِ بے اعتبار کے معنی

تیرگیٔ شبِ فراق سے پوچھ
دیدۂ اشکبار کے معنی

سوزِ پروانہ سے ہوا معلوم
شعلۂ حسنِ یار کے معنی

تُو ہی اے لغزشِ شباب بتا
رقصِ پروانہ وار کے معنی

عشقِ شکوہ طراز کیا جانے
نگہِ شرمسار کے معنی

پیکرِ حسن و ناز کیا سمجھے
دامنِ تار تار کے معنی

عقل کی سرکشی سے مخفی ہیں
عشقِ طاعت گزار کے معنی

اک شکستِ مذاقِ راہ روی
گلۂ نوکِ خار کے معنی

ایک فتحِ کمالِ جذبۂ دل
نگہِ لطفِ یار کے معنی

ق

کون آیا کہ ہو گئے روشن
مہرِ نصف النہار کے معنی

تیرگیٔ خزاں تمام ہوئی
جلوہ گر ہیں بہار کے معنی

مسلمِ بے دیار نے سمجھے
سطوتِ شہریار کے معنی

میگسارانِ مصطفیٰؐ پہ کھلے
غیر کے اقتدار کے معنی

اُس پہ نازاں قیادتِ عظمیٰ
اُس پہ قرباں وقار کے معنی

اُس نے سمجھے بڑی فراست سے
قوم کے انتشار کے معنی

اُس نے پوچھے کمالِ حیرت سے
بختِ ناسازگار کے معنی

اُس کی تکبیر نے لکھے دل پر
عظمتِ کردگار کے معنی

اُس کی تدبیر نے بدل ڈالے
گردشِ روزگار کے معنی

اُس کی تدبیر سے ہوئے ظاہر
بُرّشِ ذوالفقار کے معنی

اُس کی تنظیمِ گلستاں سے عیاں — آنے والی بہار کے معنی
اُس کی تردیدِ دشمناں میں نہاں — فطرتِ بُردبار کے معنی
اُس کی تکریمِ دوستاں گویا — اُلفتِ پائدار کے معنی
ہو گئی فکرِ آشیاں سازی — کُھل گئے اختیار کے معنی
پھر عیاں ہیں جنوں کے داماں سے — چشمِ خوں نابہ بار کے معنی
پھر جبینِ حیات پر ہیں رقم — عرصۂ کارزار کے معنی
مرحبا اے امینِ عزتِ قوم — مُسلموں کے وقار کے معنی
قلب کی جلوہ گاہ میں پائے — طُور کے جلوہ زار کے معنی
عشق سمجھا گیا نہ خنجر — سجدۂ کردگار کے معنی
جبر کی داستاں میں پوشیدہ — سربسر اختیار کے معنی
صبر کی سرگزشت میں پنہاں — عشقِ پروردگار کے معنی
ہائے اُس گُل کے اک تبسم میں — نالہ ہائے ہزار کے معنی
ہوش کھو کر عیاں ہوئے ہم پر — گیسوئے مشکبار کے معنی
شرحِ رعنائیٔ گُلِ تازہ — شبنمِ اشکبار کے معنی
آبروئے ضمیرِ نوعِ بشر — حُسنِ عفت شعار کے معنی
ہجرِ دریا میں نالۂ پیہم — نغمۂ جوئبار کے معنی
قصۂ دیدہ ریزیٔ مفلس — خلعتِ زرنگار کے معنی
کفِ اربابِ عیش کیا جانے — خنجرِ آبدار کے معنی
شرحِ تعزیرِ جُرمِ ناداری — جورِ سرمایہ دار کے معنی

خلشِ زخمِ دل سے پوچھ سروش
نوکِ مژگانِ یار کے معنی

سروش بختیاری

متوازی لکیریں

کمر سے اُٹھتا ہوا درد دونوں طرف سے گویا جکڑتا ہوا اس کی ٹانگوں کی طرف جا رہا تھا، وہ درد سے دوہری ہوتی جا رہی تھی۔ "یہ درد مجھے لے کے رہے گا۔ یہ اس کو بھی لے کے رہے گا۔ جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے گلا دبا رہا ہو! ظالم! اف، میرے خدا!" شکنتلا درد کی شدت سے چلا اُٹھی۔ اور جب درد کا دورہ ختم ہوا تو اسے اپنی آواز ہسپتال کی سنسان سی اداسی میں عجیب سی معلوم ہوئی۔

یوں تو ہسپتال کی فضا میں یہ خاموشی اور اداسی کسی حد تک ضروری عنصر ہیں۔ لیکن اس میٹرنٹی ہسپتال میں کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہیں۔ یہ ہسپتال شہر سے دور آبادی سے پرے بنایا گیا ہے۔ اور جب من میں اداسی ہو تو باہر کی فضا خواہ مخواہ اداس دکھائی دیتی ہے ——— ہسپتال کے ایک طرف ایک عالیشان مسجد ہے جس سے کوئی آواز نہیں آتی، وہ کچھ اتنی وسیع ہے کہ وہاں کتنے ہی لوگ جمع ہو جائیں، کیسا ہی ہنگامہ کیوں نہ ہو جائے ہسپتال میں اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ دوسری طرف پریڈ کا میدان ہے۔ جہاں سے صرف صبح کے وقت فوجی بینڈ وغیرہ کی آوازیں آتی ہیں۔ اس کے بعد شام تک اور پھر شام سے صبح تک وہاں ایک مسلسل اور بھاری سکوت چھایا رہتا ہے۔

"پتا تھا میری سہاگ کی رات ہسپتال کی یہ فضائیں میری قسمت میں لکھی تھی۔ دنیا جاگ رہی ہے، مگر یہاں ابھی تک نیند کا عالم، باہر زندگی کی چہل پہل ہوگی، یہاں موت کی سی خاموشی ہے ——— موت کی سی ———"

اُداس پھیکی پھیکی نظروں سے اس نے اپنے کمرے کو دیکھنا شروع کیا۔ حالانکہ صبح سے اس وقت تک وہ کئی بار اس کا جائزہ لے چکی تھی، اسے کمرے کے متعلق سب کچھ معلوم تھا۔ آنکھیں بند کر کے وہ بتا سکتی تھی کہ فلاں چیز کہاں تھی اور فلاں کس جگہ رکھی تھی ——— لیکن نظر ان ٹھوس دیواروں کو چیر بھی تو نہ سکتی تھی۔ ساتھ ہی ہسپتال کی میز پر ٹمپریچر چارٹ لٹک رہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا متوازی چل رہی ہیں یہ دو لکیریں، ایک نیلی، ایک سُرخ، لیکن آج کا کچھ پتہ نہیں، نرس بھی تو نہیں آئی۔ شروع شروع میں تو ایسے ہی ہوتا ہے اور پھر کسی دن یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور یہ لکیریں ایک دوسرے سے دور ہی دور ہوتی جاتی ہیں۔ اور..."

کسی کے قدموں کی چاپ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، کوئی اس طرف آ رہا تھا، اسے خیال گزرا کہ شاید ڈاکٹر ہو۔ لیکن بڑی دیر تک سے اسے محسوس ہوا کہ یہ کسی عورت کے قدموں کی چاپ تھی، شاید نرس ہو، شاید کانتا ہو ——— "کانتا ہی ہوگی۔" اس نے خود سے کہا۔ "کل اس نے وعدہ بھی تو کیا تھا آنے کا۔ شاید راجندر کا کوئی خط ہی لائی ہو۔"

قدموں کی بڑھتی ہوئی چاپ ایک مقام تک آنے کے بعد پھر گھٹتی گئی، اور شکنتلا کی اُمیدیں اور قیافے دھرے کے دھرے رہ گئے اس کے خیالات واپس سمٹ کر اس چار دیواری ——— اس کے کمرے میں آ گئے، اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس کمرے میں قید کر دی گئی تھی۔ یہ چھوٹا سا کمرہ بلکہ ایک پلنگ، خاموشی، اداسی، باہر کی فضا میں بھی، اور من کے اندر بھی، قید، واقعی قید ہی تو تھی،

اس نے پھر اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ کارنس پر رکھی ہوئی تصویر پر اس کی نظر رک گئی، راجندر مسکرا رہا تھا، اپنی مخصوص مسکراہٹ جو شکنتلا ہمیشہ ہی سے اس کے چہرے پر دیکھتی آئی تھی۔ لبوں اور آنکھوں میں ایک حسین جذبے کی نمود!

راجندر ابھی تک مسکرا رہا تھا، وہ ہمیشہ ہی کیوں مسکراتا رہتا ہے، شاید ــــ شاید اس نے خیال کیا اس کی بیوقوفی پر کئی بار راجندر نے اسے پگلی کہا تھا۔ جب وہ اسے اپنے ساتھ باہر سیر و تفریح کے لئے پارٹیوں اور کلب میں شرکت کی دعوت دیتا اور وہ انکار کرتی تو وہ اس کی کم عقلی پر ہنستا تھا۔ وہ اسے ایک قیدی کہا کرتا تھا، چار دیواری پر قانع ایک قیدی!

چار دیواری ــــــ اب بھی تو وہ اس چار دیواری میں قید تھی۔ مگر یہ اس کے خیالی گھر کی پرسکون چار دیواری نہ تھی، جہاں تھا، ان کے خیالی بچے تھے، یہ تو ہسپتال کا ایک پرائیویٹ کمرہ تھا۔ اداس، خاموش، جیسے ایک مقبرہ ہو، جہاں نہ راجندر تھا نہ بچے، جو سکون کی جگہ درد تھا ــــ درد جو کمر کے دونوں طرف سے اُٹھ کر اس کے جسم کے درمیان کی طرف بڑھتا تھا، جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے کسی کا گلا دبا رہا ہو ــــ!

ساتھ کے وارڈ میں گھڑی کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، وہ چپ چاپ گنتی رہی، ایک ــــ دو ــــ تین ــــ اس نے گیارہ گھنٹے گنے، تکیے کے نیچے سے اپنی گھڑی نکالی، اسے دیکھا اور پھر وہیں رکھ دی۔

"گیارہ بج گئے اور کوئی نہیں آیا ــــ ڈاکٹر نہیں آکاش ــــ کاشا بھی نہیں حالانکہ اس نے وعدہ کر رکھا تھا۔"

وعدہ! اس نے سوچا، اس کے اس دور میں، کاشا کی سی آزادی کی پرستار لڑکی کے لئے، ابھی تو وہ خوابوں کی دنیا میں رہتی ہوگی، عیش و مسرت سے بھرپور، سکھ کی زندگی کے خواب جو شاید کبھی پورے نہ ہوں، ابھی یہ دونوں لکیریں متوازی چل رہی ہوں گی۔ کم از کم اسے ایسے ہی دکھائی دیتی ہوں گی ــــ کسی محفل میں بیٹھے خوش گپیاں ہو رہی ہوں گی، ہنسی ہوگی، مذاق ہوں گے، قہقہے ہوں گے، وعدہ ذرا سے یاد بھی رہا ہوگا، شاید!

"اُف! آہ، میرے خدا، ایک اور درد، میرا جسم سرد ہوتا جا رہا ہے۔"

"کیا بات ہے شکنتلا بی بی!"

"کچھ نہیں! یہ درد، اف، یہ ذرا میرا کپڑا بدل دینا، اور یہ کمبل اوپر کو سرکا دینا، اوہ ــــ!"

"یہ تھرمامیٹر لگایئے، ذرا ٹمپریچر اور Pulse کا چارٹ (Chart) کر دوں، ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے یہ سب مکمل کرنا ہوتا ہے"

"کب آئیں گے ڈاکٹر؟"

"بس اب آنے ہی والے ہیں۔"

"گیارہ تو بج چکے ــــ! نرس میرے خون کا Matching ہوگیا کوئی Donor ملا؟"

"مجھے نہیں معلوم بی بی، ابھی رپورٹ ہاؤس سرجن کے پاس ہے۔"

"کل انھوں نے کیا کہا تھا؟"

"کل تو کوئی خاص بات نہیں کہی تھی، آج بتائیں گے، آپ یہ دوا پی لیجئے تھوڑی سی۔"

"پلا دو، لاؤ، لیکن یہ کچھ فائدہ بھی کرے گی؟"

"کیوں نہیں بی بی، ضرور کرے گی، آپ فکر نہ کیجئے۔"

"ذرا سنو تو اس Foetoscope سے کہیں وہ آوازیں بند تو نہیں ہو رہیں۔ گھڑی کی طرح کی ٹک ٹک ــــ کل ہاؤس سرجن نے بتایا تھا مجھے کہ ننھے دل کی حرکت کی آواز اس آلے سے یونہی سنائی دیتی ہے جیسے تکیے کے نیچے سے گھڑی کی آواز آئے ــــ!"

"بی بی، مجھے تھوڑا کام اور کرنا ہے ــــ اور پھر ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں، خود ہی دیکھ کر آپ کو درست بتائیں گے۔"

——آپ گھبرائیے نہیں۔ تسلّی رکھیے بی بی!"

"گھبرائیے نہیں! تسلّی رکھیے——" اس نے نرس کے فقرے کو دُہرایا اور کچھ ایسے لہجے میں کہ انھیں جھٹلانا مقصود تھا۔
اس کا دماغ ایک اُلجھن میں تھا۔ وہ کچھ سوچتی اور خود ہی اُس کی صحت پر شک کرتی، "کیا اس کا بچہ بچ جائے گا۔؟
اگر وہ بچ سکتا تو ڈاکٹر نے اسے کیوں نہ تسلّی دی تھی؟ نرس نے کیوں ٹال دیا تھا؟ شاید چھپا رہی تھی—— اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ اسے اپنی دنیا تاریک نظر آ رہی تھی۔ اس کا بچہ ہی روشنی کی ایک کرن تھا۔ کہیں یہ کرن بھی تو تاریکی کی زد میں نہیں آ چکی۔ کیا اُس کی آٹھ ماہ سے سنبھالی ہوئی دولت اس سے چھین تو نہیں چکی! اس کے خواب! آخر ڈاکٹر کیوں دیر کر رہا تھا، نرس کیوں ٹال گئی تھی——!"

"کہو شکنتلا، کیسی ہو، ڈاکٹر آئے تھے؟"

"اوہ! کانتا تم نے اس قدر دیر کر دی۔"

"دیر کیسی بھابی! تمھاری گھڑی تیز چل رہی ہوگی، ہاں رستے میں اشوک مل گیا، عرصے کے بعد نہ جانے کہاں سے آج نظر پڑ گیا۔ یاد ہے نا، وہی جو کسی زمانے میں تمھارا پارٹنر تھا، (mixed doubles) میں جس بار تم champion رہیں۔"

"یاد کیوں نہیں کانتا، اب تو وہ یادیں اور بھی زیادہ ابھرتی آ رہی ہیں، کیسا اچھا تھا وہ زمانہ۔ کیا کہہ رہا تھا وہ کھلنڈرا شوقین! کیسا تھا؟"

"بالکل ویسا ہی، وہی ہنستا ہوا چہرہ، وہی بے تکلفانہ انداز تھا گفتگو کا، ہاں وقت کے ساتھ جسم میں تھوڑی سی تبدیلی تو آ ہی جاتی ہے، کچھ سانولا ہو گیا ہے، اور کچھ کمزور۔"

روشن دان سے آتی ہوئی سورج کی کرنیں روشن لکیروں کی طرح صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں مٹی کے بیشمار ذرے چمک رہے تھے، ننھے منے، شوخ سے ذرے،—— جاننے والے کہتے ہیں کرنوں میں کوئی چمک نہیں، مٹی کے یہ ذرے ان متوازی روشن لکیروں میں چمک اٹھتے ہیں اور ہماری آنکھیں انھی کو چمکتے دیکھتی ہیں——

کانتا انھی کی طرف دیکھ رہی تھی، روشن ذرے اس کے خوابوں کی طرح، اس کے دماغ میں بے شمار خیال کروٹیں لے رہے تھے۔ اور ان میں سے کوئی کوئی خاموشی سے اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے—— اس کی نظریں ایک بار پھر پچھلے خیالات کی طرف جا رہی تھیں، وہ خود کو اپنے کالج کے احاطے میں چلتے پھرتے دیکھ رہی تھی، اس کی چال میں بیباکی تھی، اس کے خیالات بھی بیباک تھے——شکنتلا، مس شکنتلا، کالج میں بیڈمنٹن اور ٹینس کی سب سے اچھی کھلاڑی!

اشوک جھجکتا جھجکتا اس کے پاس آیا تھا اور سالانہ ٹورنمنٹ میں پارٹنر بننے کے لئے کہا تھا، اشوک بھی بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ شکنتلا اس کے ساتھ ایک بار کھیلی، اور اس بار وہ champion رہے تھے۔ مگر شکنتلا کو معلوم تھا وہ اس پارٹنرشپ کا متمنّی نہیں تھا، وہ اس سے بڑے کسی کھیل میں بھی پارٹنر بننا چاہتا تھا۔ لیکن شکنتلا کا خیال تھا وہ اس کے ظاہر سے متاثر ہوا تھا—— ایک بیباک کالج گرل، ایک مشاق کھلاڑی——! اس نے اسے ٹینس گراؤنڈ پر ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے دماغ تک رسائی نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اشوک کو اس کے خیالات کا علم نہ تھا، اور نہ اس کے خوابوں کا۔ سنہرے، سُکھ اور شانتی سے پُر خواب!

"ارے، تمھیں کیا ہو گیا شکنتلا، کس سوچ میں پڑ گئیں؟ کالج کا زمانہ یاد آ گیا، خواب! اسے بھی شاید وہ زمانہ یاد آیا تھا۔ تمھارا ذکر آیا تو وہیں سڑک پر کھڑے کھڑے اس نے اس زور سے قہقہہ لگایا تھا کہ مجھے اس کے حواس پر شک ہونے لگا تھا——

بولا۔ "شکنتلا میٹرنٹی ہسپتال میں ہے، اور راجندر جنگ میں ـــــ مجھے معلوم تھا ــــ" پھر کسی دن ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔
جھل! اسے معلوم تھا، اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا، پگلا ہے وہ بھی، یونہی جو منہ میں آئے کہہ دیتا ہے، یہ اس کی عادت ہے، بدلا نہیں وہ اب تک، راجندر جنگ میں ـــ!
"کانتا! تمھارے بھائی کا کوئی خط آیا؟ آنے کے متعلق کوئی اطلاع؟"
"نہیں! جو پتا جی کو آیا تھا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے چھٹیاں منسوخ ہو رہی ہیں، اور اس لئے شاید وہ نہ آسکیں۔"
"یہ تو مجھے بھی لکھا تھا انھوں نے! لیکن شاید!"
"اس شاید سے بھی تو بڑی اُمیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں ـــ"
"صرف شاید سے امید وابستہ کر لوں، کانتا تم بڑی بھولی ہو کانتا تم چپ کیوں ہو گئیں۔ تمھارے یہاں آنے کا فائدہ کیا ہوا؟ ہسپتال کی یہ اُداس خاموشی تو میری جان کھائے جا رہی ہے، یہ ہسپتال اتنا اُداس کیوں ہے؟ اسے شمشان کی طرح شہر سے اتنی دور کیوں بنایا گیا ہے؟"
"تاکہ نئی دنیا پرانی دنیا کے جھگڑوں بکھیڑوں سے نا آشنا رہے، مگر یہ تم کیا فضول سوچ رہی ہو، اتنا فکر، ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آرام تمھارے لئے بہت ضروری ہے۔ مکمل آرام جسمانی اور ذہنی ـــ خون کا نتیجہ matching کا کیا بنا؟"
"معلوم نہیں کیا بنا، تمھاری نئی دنیا کو خون کی ضرورت ہوگی، ڈاکٹر نے یہی کہا تھا، اور پتہ نہیں درست Donor ابھی ملا یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کانتا کہ ــــــ"
"پھر وہی بات، اب تم چپ رہو آرام کرو، ڈاکٹر آج بہت لیٹ ہو گئے، تمھاری رسٹ واچ کہاں ہے؟ یہ ٹائم پیس تو تیز معلوم ہوتا ہے۔"
"تکئے کے نیچے، خیر رہنے دو۔"
جیسے تکیے کے نیچے سے گھڑی کی آواز ننھے دل کی حرکت بھی، مگر یہ تیز کیوں، ڈاکٹر نے کہا تھا اگر تیز ہو تو خطرہ ـــ اُف!"
"اچھا میں ہاؤس سرجن کو دیکھتی ہوں، کرنل کے متعلق بھی پوچھتی ہوں۔"
"کانتا! اب وہ کریں گے بھی کیا، مجھے ڈر ہے اب وہ بیکار آئیں گے، اڑتالیس گھنٹے ہو گئے اس نزاش حالت میں، اسی ایک کمرے میں، اب تو مجھے بھی اس سے نفرت ہونے لگی ہے۔ یہ ٹمپریچر چارٹ، یہ ٹیبل، وہ ٹب کارنس پر رکھی ہوئی وہ بوتلیں، اور Foetoscope مجھے ڈر ہے یہ سب بیکار رہیں گے: میرا جسم سرد ہوتا جا رہا ہے ـــ ٹمپریچر دیکھنا صبح کا ـــــ"
"ٹمپریچر نارمل سے کم، نیلی لکیر نیچے جا رہی ہے، پلس تیز ہو رہی ہے، سرخ لکیر اوپر جا رہی ہے۔ پیڈ کے سرخ نشان بڑھ رہے ہیں۔ ــــــ دو متوازی لائنیں دور ہوتی جا رہی تھیں، اس نے سوچا اب شاید وہ اور دور ہی ہوتی جائیں گی یوں معلوم ہوتا تھا ان کی منزل بالکل مختلف تھی، یونہی شروع شروع میں متوازی جا رہی تھیں ـــ!
"نفرت، ڈر! کیوں اناپ شناپ باتیں کرتی ہو، تمھیں ہو کیا گیا ہے، کبھی تو ٹی ٹیبل پہ خوب شگفتہ کلامی ہوتی تھی ـــ اور اب ـــــ"
"ٹی ٹیبل، کانتا، مگر اس ٹی ٹیبل اور ہسپتال کی اس میز میں کتنا فرق ہے، یہ فضول سا کمرہ، اُلٹی سیدھی دوائیاں، وہ خام امید پہ رکھے ہوئے ٹب وغیرہ اور آلے ـــ یہ ٹمپریچر چارٹ، کانتا، یہ دو لائنیں جواب تک متوازی جا رہی تھیں، ایک دوسرے

سے جدا ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کا راستہ ہی بدل گیا ہے۔ میں نے سچ ہی تو کہا تھا: ڈاکٹر د آنا اب شاید بے کار ہوگا۔"

——— اور وہ کالج کے زمانے کی ٹی ٹیبل کو کوئی مناسبت تو ہو؟ وہ شگفتہ چہرے، خوش گپیاں اور مبارک قہقہے؟

شکنتلا خیالات کی اس رَو میں بہ نکلی۔ اس کی نظریں بے اختیار برسوں پیچھے کی طرف لوٹ گئیں۔ خود کو سالانہ سپورٹس کے بعد ایک ٹی ٹیبل کے گرد پایا جہاں کانتا نے پہلی بار راجندر سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اس نے نمستے کہا تھا، اور جھجکتے جھجکتے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔ اور اس کے پر رونق مردانہ چہرے پر وہ مخصوص مسکراہٹ دیکھی تھی۔ لبوں اور آنکھوں میں ایک موہ لینے والے جذبے کی نمود۔

کانتا نے بھی اس بار ایک کپ جیتا تھا، اور رجائی کے سامنے شیخی بگھار رہی تھی۔ راجندر نے اسے داد نہ دی، بلکہ مذاق میں بات اڑانا چاہی — کانتا چڑ گئی تھی، اور اس نے طعنہ دیا کہ اگر یہ معمولی بات تھی تو اس نے کبھی کوئی کپ کیوں نہیں جیتا۔

——— راجندر نے جب یہ کہا، یہ سب محض کھلونے تھے، بچوں کو بہلانے کے بہانے تھے، تو کانتا نے کہا تھا کہ وہ اس کے بچوں کو تحفے کے طور پر دے گی — تحفہ جو ان کے آبا حاصل نہ کر سکے۔

راجندر کے بچے ——— ایک ادر درد اٹھا، اور ساتھ واپس اسی فضا میں لے آیا، راجندر کا پہلا بچہ اس کے پیٹ میں تھا، اس کی امیدوں کا مجسمہ، ایک عزیز بوجھ جو وہ آٹھ ماہ سے لئے پھر رہی تھی۔ "خدا جانے اس کا کیا بنے گا۔ اوہ، یہ درد ضرور کوئی اس کا گلا گھونٹ دے گا۔"

"شکنتلا ——— تمھیں ہو کیا گیا ہے آخر، کن خیالوں میں کھوئی جا رہی ہو؟"

"کچھ بھی تو نہیں کانتا، تم نے اخبار دیکھنا شروع کر دیا تھا، میں کیا کرتی، اور پھر سوچنے کی عادت تو اب کافی پرانی ہو چکی ہے ——— ! ذرا نرس کو بلانا، ساتھ کے کمرے میں ہوگی۔ چارٹ پر ایک اور سرخ نقطہ زیادہ کر دے۔"

کانتا باہر گئی، اور اس نے پھر سے سوچنا شروع کر دیا۔ پگلی کانتا، سوچنا، سوچنا، سوچنا، تو آج سے بہت عرصہ پہلے شروع کر دیا تھا، شادی سے بہت عرصہ پہلے، جب وہ آج کی زندگی کے متعلق سپنے دیکھا کرتی تھی۔ ایک پرسکون گھر کے سپنے، جہاں ایک محبت کرنے والا جیون ساتھی اور ہنستے کھیلتے ہوئے ننھے منے بچے تھے ——— متوازی کرنوں میں ناچنے والے ننھے شوخ ذرّوں کے مانند حسین چمکتے ہوئے خواب!

——— اور جب بچے نے پہلی بار اسے اپنی ہستی سے آگاہ کیا تھا، اسے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی پنچھی اس کے اندر پھڑ پھڑا اٹھا، جیسے آئندہ کا سکھ بھرا زمانہ پر لگائے اس کی طرف اڑا آرہا ہو ——— پنچھی، سفید پروں والا، شٹل کاک کی طرح اس کی طرف اڑا آرہا تھا۔ ——— "بیڈمنٹن کی گراؤنڈ میں شٹل نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے —" شکنتلا نے سوچا تھا۔ "زندگی کے کھیل میں یہ شٹل بھی میرا ساتھ دیگی، میں ضرور جیتوں گی۔"

اس کے ننھے پروں کے لمس نے اسے ایک عجیب روحانی مسرت دی تھی، اس کا بچہ ننھا منا، گول مٹول، باپ کی طرح رسیلی آنکھیں، سیاہ بال، کنول سے ہاتھ پاؤں، جن کی حرکت اس نے بارہا محسوس کی تھی، جیسے شٹل کا ہیڈ ریکٹ پر لگے۔

اس نے جبھی اس کے متعلق خواب بنانے شروع کر دیئے تھے، اپنے بچے کے مستقبل کے متعلق، وہ ایک دوسرے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ اگر وہ لڑکا ہوا تو وہ اسے ایک خوبصورت جسم بنانے کے لئے کہیں گے، وہ اسے ایک ڈاکٹر بنانے کا ارادہ رکھتے تھے ——— "اور اگر وہ لڑکی ہوئی" راجندر نے کہا تھا۔ ——— تو شکنتلا کہہ اٹھی تھی، وہ اسے ایک آرٹسٹ

بنائیں گے، جو موقلم سے بے جان کینوس میں زندگی سموئے گی ۔ مصوّر! ایک خاموش شاعرہ!

شکنتلا کے خیال ہمیشہ ہی سے ایسے تھے، اس کے خیال میں یہ چیزیں ان کی محبوبیت میں اضافہ کرتی تھیں، اور وہ زندگی میں زیادہ سے زیادہ محبت اور سکون دیکھنے کی تمنا رکھتی تھی ——— سکون، اطمینان ——— لیکن اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی تھی کہ راجندر اس سے متفق نہیں تھا، وہ ان چیزوں کو بیکار سمجھتا تھا، فضول، بے مصرف، بے مقصد! اس بات پر پہلی بار انھیں اپنے اندر ایک اختلاف کی وجہ دکھائی دی تھی۔

"کل کو تم کہو گی ہم اسے ناچ سکھائیں گے، گانے کی تعلیم دیں گے، ناچ، راگ رنگ، آرٹ تمھارا تخیل کیوں اس طرف جاتا ہے، ان کے علاوہ تم اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتیں۔"

"عورت اور آرٹ کا تعلق ابدی ہے، ایک لطیف کام، اور لطیف جنس، کتنا قدرتی میل ہے، اور پھر یہ چیزیں اس کی محبوبیت میں اضافہ بھی تو کرتی ہیں۔"

"محبوبیت، تم عورت ہوتے ہوئے اس کی غلامی اور کمتری کو اس کے لئے بہتر سمجھتی ہو ———"

"میں اسے مرد کا کام کرکے اپنی فطرت کو جھٹلانے کے لئے نہیں کہتی، مرد اسے یہاں بھی اپنے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے ...."

پہلی بار ان کے خواب ٹکرائے ۔ شادی سے پہلے اسے اس بات کا خیال نہ تھا۔

"ابھی آرہی ہے نرس!" کانتا نے آتے ہوئے اُسے کہا۔ "ڈاکٹر کے متعلق بھی میں نے پوچھا تھا۔"

"ڈاکٹر! ہوں!"

"——— اور ہاں، یہ رہا تمھارے نام ایک خط، ابھی ڈاکیہ دے گیا ہے، راجندر بھیا کا معلوم دیتا ہے۔"

"لاؤ کانتا دیکھیں، تمھاری شادی میں جو امیدیں تھیں ان کا بھی فیصلہ ہو جائے۔"

"کیا لکھا ہے، کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔"

"——— اونہہ ——— وہ نہیں آسکتے، حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ منظور شدہ چھٹیاں بھی منسوخ ہو رہی ہیں۔ کیا سچ مچ کانتا کیا سچ مچ وہ نہ آسکیں گے۔"

"ہو سکتا ہے بھابی! اخباروں میں ان دنوں یہی پڑھا ہے، تین بڑوں کے ملنے کے بعد شاید اب کوئی اور حملہ ہوگا، اس کی سکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔"

——— نیا حملہ! شکنتلا کے دماغ کو ایک دھچکا سا لگا۔ نیا حملہ، کیا کوئی اور نیا حملہ باقی تھا، اس کے خوابوں پر ہر روز نئے نئے حملے ہوتے تھے، شادی کے بعد انہی سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ ——— راجندر اسے اپنے ساتھ محفلوں میں شریک ہونے کے لئے کہتا، وہ پارٹیوں اور کلبوں میں ساتھ چاہتا تھا۔ کانتا اس کے لئے تیار نہ تھی، اس کا خیال تھا کہ راجندر اس کے ان خیالات سے واقف تھا، دو بار ہائی ٹیبل کے گرد ان باتوں پر اس سے بحث کر چکی تھی، اور خود راجندر نے بھی بارہا کہا تھا کہ سماج کی کامیابی کا دار و مدار ایک کامیاب گھر تھا، اور سب جھگڑے اور دماغی پریشانیاں ایک غیر متوازن گھر کا نتیجہ تھیں ——— مگر راجندر کا خیال تھا کہ یہ اس کے دماغ کی رومانی (Romantic) رجحان کا نتیجہ تھیں، وہ اس کے خیالات کو وقتی سمجھتے ہوئے ان سب کی تائید کر رہا تھا، شکنتلا اسے پسند تھی اور وہ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا، ——— ٹینس اور بیڈمنٹن کی شائق، شگفتہ باتیں کرنے والی لڑکی، اس کا خیال تھا وہ جلد اس قسم کی باتوں سے اُکتا جائے گی، وہ اس کے خیالات اپنے موافق کر سکے گا۔ لیکن شکنتلا کے خیالات بہت گہرے تھے

باتوں کا یہ اختلاف جو انھیں پہلے معلوم نہ تھا — جھگڑا پیدا کرنے کا باعث ہو رہا تھا۔ اور یہ جھگڑا اس کے خوابوں پر ایک نیا حملہ ثابت ہوتا ——— شادی کے بعد کوئی دن ایسا نہ آیا جب اُسے حالات بہتر دکھائی دیتے ہوں۔ متوازی راستے آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے جیسے شادی ہی وہ مقام تھا جہاں انھیں علیحدہ ہونا تھا ——— اور پھر روز ان کے درمیان فاصلہ زیادہ ہی ہوتا گیا، دھیرے دھیرے اور کبھی اچانک!

جنگ شروع ہونے پر راجندر کو بھی بعض دوسرے لوگوں کی طرح روپیہ کمانے کا خیال ہوا۔ اس نے بارہا شکنتلا سے اس بات کا ذکر کیا، مگر شکنتلا کے خیال میں اس کی ضرورت نہ تھی، وہ جتنا کما رہا تھا اس کے خیال میں وہی کافی تھا، وہ ایک مطمئن گھر چاہتی تھی، اور وہ اس روپے میں بھی حاصل ہو سکتا تھا، یہ ذکر بھی ایک جھگڑے پر ختم ہوا۔ ایک اور حملہ ہونا تھا، ہو کے رہا ——— راجندر اس کی بات سن کے ناراض ہو گیا۔ "گھر، گھر، گھر، تمھیں تو ہر وقت اسی کی پڑی رہتی ہے ——— میں تو ضرور جاؤں گا۔ تم سنبھالے رکھنا اپنا گھر ———"

راجندر کا ارادہ نہ بدلا، شکنتلا نے اسے اس کے ہونے والے بچے کا واسطہ دیا۔ مگر راجندر نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ تو اور بھی اچھا تھا۔ اس کے گھر اور بچوں سے متعلق خواب بھی پورے ہو رہے تھے، اب اسے گھر رہنے کا مزید بہانہ مل رہا تھا ——— اور کیا چاہیے تھا؟ ———

راجندر کے جانے کے بعد اس کے خیالات اپنے بچے پر مرکوز ہو گئے ——— اگر وہ لڑکا ہوا ——— اگر وہ لڑکی ہوئی ——— وہ جو جاتے ہوئے کہہ گئے، اسے بتلانے گی، اس کا بچہ، اس کا اپنا بچہ ہوگا، ننھا منا گول مٹول، جو سفید پروں والے پنچھی کی طرح اس کی طرف اڑا آ رہا تھا، جیسے کنول کا پھول ہو۔ اس نے بارہا اس کے ننھے کنول سے سفید ہاتھ پاؤں کی حرکت اپنے اندر محسوس کی تھی ——— اسے یقین تھا وہ ضرور جیتے گی، اس کے خواب مکمل ہو رہے تھے، اس کے آئندہ سے متعلق خواب بھی ضرور پورے ہوں گے۔

"خواب! تمھارے خواب کب پورے ہو رہے ہیں؟" راجندر نے جانے سے پہلے اسے کہا تھا۔ یہ اس کا آخری حملہ تھا ——— "مگر! کہو نا تم نے مجھے حملے کا کیا کہا تھا، کیا ابھی کوئی اور حملہ باقی ہے؟"

"شاید!"

"شاید وہ نہ آ سکیں، کیا اس کا بچہ خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آ سکے گا، روشن دن سے آنے والی کرنیں ایک دوسرے سے جدا ہو رہی تھیں۔ ان میں وہ چمک نہ تھی، کوئی کوئی ذرہ صبح کے ڈوبتے ہوئے تارے کی طرح کبھی کبھی چمکتا۔

"ڈاکٹر نہیں آیا کا تنا، نرس بھی نہیں آئی، آج ہر شخص اس قدر دیر کیوں کر رہا ہے۔ آج شاید کوئی نہیں آئے گا ——— آئے گا کیوں نہیں، وہ ہاؤس سرجن آ رہی ہے ———"

"کیا حال ہے شکنتلا بی بی ——— کچھ فرق پڑا ———؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر، بلڈ کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

"وہ بلڈ گروپ match نہیں ہو سکے۔ مسز بھروچہ کو لکھا ہے، رپورٹ کا انتظار ہے۔"

"ڈاکٹر تھی کچھ نہ بتا سکی۔ وہ بیکار کیا پڑا Futo copue جیسے کوئی شل ہو۔ تم اس سے پھڑپھڑاہٹ سن سکتی ہو مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے پر ٹوٹ چکے ہیں کسی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا دیا ہے۔ اس کے پر توڑ دیے ہیں، اب کوئی پھڑپھڑاہٹ سنائی نہیں دیتی، سنسان خاموشی ہے جیسے کوئی سفید قبرہ ہو۔"

"کیا عجیب سوچتی ہو تم بھی، ابھی تک خلل اور ریکیٹ کی سوچ"
"ڈاکٹر! کل کرنل نے کیا کہا تھا۔"
"کچھ نہیں۔ یہی Expectant Treatment جاری رکھنے کو کہا تھا۔ صبح تک کہہ رہے تھے، اگر فرق نہ پڑا تو"
"تو کیا ہوگا؟"
"کچھ نہیں بی بی ـــــ ابھی کرنل خود آ رہے ہیں، وہی آپ کو درست بتائیں گے۔"
ہسپتال کی سنسان خاموشی اس کے خیالات پر برف بن کر جم رہی تھی، سورج کی کرنیں زرد پڑ چکی تھیں، ان میں اب کوئی ذرہ چمک نہ رہا تھا۔ نئی دنیا پرانی دنیا کے پیٹ میں بچے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ سب نئی دنیا پر امیدیں لگائے ہوئے تھے سب مل کر باتیں کر رہے تھے، چپکے چپکے خون بہہ رہا تھا۔ مگر نئی دنیا کا ابھی نام و نشان نہ تھا ـــــ
کیا نئی دنیا پیدا ہو سکے گی، دنیا کے خواب، اس کے اپنے خواب! وہ چونک اٹھی "کاش اگر یہ باتیں مکمل نہ ہو سکیں، یہ گفتگو ٹوٹ گئی تو کیا ہوگا؟"
روشن دان سے کوئی کرن کمرے کے اندر نہ آ رہی تھی، ایک ذرہ بھی ناچ نہ رہا تھا۔ ہر طرف سکوت تھا، مکمل سکوت جیسے یہ کوئی خاموش مقبرہ تھا!

صلاح الدین اکبر

غزل

کسی کی زلف نے یوں پیچ و خم قبول کیا
کہ بے ضرورتِ غم دل نے غم قبول کیا

غمِ حیات کی دلچسپیوں کے پیشِ نظر
مسرّتوں کو طبیعت نے کم قبول کیا

سمجھ کے دل نے تقاضا تری نگاہوں کا
بڑی خوشی سے محبت کا غم قبول کیا

بھرے جہاں میں کہیں بھی پناہ جب نہ ملی
کسی نے دَیر کسی نے حرم قبول کیا

یہ سوچ کر کہ کہیں تو خفا نہ ہو جائے
ترا ستم بھی برنگِ کرم قبول کیا

عدم کے خواب سے چونکا ہی تھا وجود ابھی
کہ پھر وجود نے خوابِ عدم قبول کیا

مرے مزاج کی پابندگی نے اے مضطر
جسے قبول کیا دم بہ دم قبول کیا

مضطر اکبر آبادی

پرواز کے بعد

دھواں دھواں ہے آسمان، الاماں!
ٹھٹک گیا ہے زندگی کا کارواں
بھٹک گئے ہیں قصرِ شب کے پاسباں
نگاہ گھومتی رہی کہاں، کہاں
نہ ماہتاب کا نشاں، نہ کہکشاں!

بس اب ہیں ذوق پر بلندیاں گراں
بس اب اُتر چلیں گے زیرِ آسماں
مگر مرے خیال! میرے راہ داں
مجھے نہ راس آسکیں گی پستیاں
وہ بستیاں جو اب نظر سے ہیں نہاں

یہ کون لے چلا مجھے کشاں کشاں!
وہ ایک گیند سی ہے کیا شرر فشاں؟
سنہری گرد چھا گئی جہاں تہاں
چھلک رہی ہیں چاندنی کی پیالیاں
یہ خلد ہی نہ ہو خلا کے درمیاں

نہیں نہیں نہ رک سکیں گے ہم یہاں
تجلیوں کی جھلکیں ہیں بے اماں
یہ کون ہو گئے ہمارے ہم عناں
ستارے، چاند، آفتاب، بجلیاں
مچلتے ناچتے ہوئے یہاں وہاں
زمین۔ اے زمین! اے مرے جہاں!
میں بہ گیا! بہک گیا، فغاں فغاں!
میں خود کہاں! مرا وجود ہے کہاں!
یہ کس کے نور کا ہے سیلِ بے کراں
رواں دواں، رواں دواں، رواں دواں
مجھے قبول ہیں زمیں کی پستیاں
مگر زمین و آسماں کے درمیاں
یہ ایک ذرۂ حقیر و ناتواں،
رہے گا کب تک آخر اس طرح تپاں
رواں دواں، رواں دواں، رواں دواں!

احمد ندیم قاسمی

اللہ بخشے

(بس کے دُور سے آنے کی آواز۔ رکتی ہے۔
سواریوں کا شور)

آواز نمبر ۱:۔ آداب عرض کرتا ہوں قبلہ۔

نمبر ۲:۔ اے حضرت ہمارا بھی سلام قبول ہو۔

نمبر ۳:۔ طبیعت تو اچھی ہے حضور کی۔

نمبر ۴:۔ بندگی ہے نواب صاحب جی۔

نمبر ۵:۔ اخاہ، نواب صاحب ہیں۔ تشریف رکھئے۔ آپ بس تکلف نہ کیجئے ...... ہوں، کہئے نواب صاحب مزاج تو اچھے ہیں۔

نواب:۔ ارے بھائی ہمارے مزاج کیا اچھے ہوں گے۔ اس گرمی اور جنگ کے عالم میں جینے کا کوئی حال ہے۔ نہ وقت اپنا ہے، نہ کائنات اپنی ہے۔ ہر چیز سرپٹ بھاگے جا رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی کو کسی نے ایڑ لگا دی ہو۔

نمبر ۵:۔ اے واہ نواب صاحب کیا بات کہی ہے۔ ایڑ لگا دی ہو۔ واہ واہ۔ واہ واہ!

نواب:۔ یہ مشاہدہ ہے بھائی محض شاعری نہیں ہے۔ اب تو ایسا زمانہ آیا ہے کہ ہر چیز پہ کنٹرول اور ہر شے کا راشن ہو گیا ہے۔ سونا جاگنا بھی غیر کی مرضی سے ہوتا ہے۔ ابھی ناشتہ بھی نیچے نہیں اُترپاتا کہ بس صاحب کی آمد کا وقت ہو جاتا ہے۔ اور یہ کچھ ایسی تیز مزاج اور ہرجائی واقع ہوئی ہیں کہ ذرا ان کے استقبال کو نہ پہنچو تو غراتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ اور صرف غبار ہی پیچھے رہ جاتا ہے۔

(قہقہے)

نواب:۔ ہمارے لڑکپن میں یکے ہوتے تھے۔ یہ سجے سجائے چھت پر آئینے۔ نیچے اجلی چاندنیاں۔ اکثر خوش وقتی کو جوان پھولوں کے گجرے بھی ٹنکا چھوڑتے تھے۔ معطر ہوا میں سانس لو اور سفر کرو۔ نہ کہ اس کمبخت بس کی طرح دنیا بھر کے گندے بیٹھ کر سفر کرو (المباس بیکی) ہر صبح سفر، ہر شام سفر، وہی ہم ہیں اور وہی بس ہے۔ اور وہی رستہ ہے دفتر کا — ہر روز۔

(موٹر رکتی ہے۔ سواریوں کا شور بلند ہوگا۔ بیک گراونڈ میں چلا جاتا ہے)

نواب:۔ ایں، رک کیوں گیا چھکڑا۔ اچھا بازار حسن آ گیا۔

نمبر ۴:۔ جی ہاں دیکھ لیجئے۔

نواب:۔ ارے میاں بابو جی، ہمیں کیا دکھاتے ہو کوئی غنچہ دہن۔ اب ہنس کے ہم کو کیا بنایئے گا۔ "بہاریں ہم نے دیکھی ہیں بڑی اگلی بہاروں میں"۔ اور سچ پوچھو اب وہ حسن کی دنیا تو لٹ چکی۔ اب تو کھنڈر رہی رہ گئے ہیں۔ طوائفوں تک سے وضعداری اُٹھ گئی۔ اللہ بخشے، ہمارے دادا کے ایک بھائی تھے ان کی رنگین مزاجی کے قصے آج تک ہمارے قصبہ میں ضرب المثل ہیں۔ یوں تو پھول پھول کی خوشبو سونگھنے کے قائل تھے۔ لیکن ایک بی نیلم سے خاص مراسم تھے۔ ہزاروں کا سلوک کیا۔ مرتے وقت نصف جائداد اس کے نام کر گئے۔ لیکن وہ بھی کوئی معمولی طوائف نہ تھی۔ وہ ان کی موت کے بعد انھیں نہ بھولی۔ ان کی بیٹی کا بیاہ ہوا تو دس ہزار کا تو صرف زیور ہی ڈال کر گئی۔ آج کل کی ٹکے ہائیوں کی طرح

نہیں کہ چاہے جان تک دے دو۔ مگر دم پان کا بیڑا
بھی مفت مُنہ پر نہ ماریں۔

نمبر ۵:۔ گستاخی معاف نواب صاحب، اجازت ہو تو ایک
بات پوچھوں۔ آپ کا بھی کبھی اس طرف گزر ہوا ہے۔

نواب:۔ ارے بھائی کیا پوچھتے ہو، بقول غالب ؎

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائے گرہ میں مال کہاں

نمبر ۵:۔ اے ہاں نواب صاحب یہ فرمائیے کہ شاعری کا آج
کل کیا حال ہے؟ کچھ عرصہ ہوا آپ نے ایک ادبی
محفل بھی تو قائم کی تھی۔

نواب:۔ برہم ہو گئی وہ۔ خیال تھا کہ دن بھر کے تھکے ہارے
دو گھڑی دل بہلا لیا کریں گے۔ لیکن اس دَور میں
ع فرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟ شروع شروع
میں تو دو ایک صاحبزادوں نے خوب گرم جوشی
دکھائی۔ لیکن یہ جوش جلد ہی سرد پڑ گیا۔ ہم نے
بھی سوچا، لعنت بھیجو کیا رکھا ہے آج کل کی شاعری
میں جیسے شاعر آوارہ ویسے ان کی شاعری آوارہ
ہے ہے۔ ظالم نے کیا سچ کہا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اب تو شاعروں کی شکل سے اُلجھن ہونے لگتی ہے
شومئی اعمال سے جو کبھی آپ کو دیکھ پائیں تو اپنی
نئی نظم سنائے بغیر تھوڑی رہیں گے۔ اور واہ صاحب
کیا نظم ہو گی۔ کلکتہ سے لاہور تک چلی جائے گی،
لیکن ختم اس پر ہو گی کہ ہنوز نامکمل ہے۔ اور حضور
والسرائے بہادر سے لیکر ماتا دین گھسیارے کی جورو
کے معاشقے تک سبھوں کا ذکر آ جائے گا۔

(قہقہے)

کوئی پوچھے کہ میاں کیا واہی ہو گئے ہو۔ کچھ عقل
کے ناخن لو۔ ہوش کی دوا کرو۔ شاعری ہے یا کباڑی
کی دُکان۔ لیکن نہیں صاحب، یہ تو جمہور کا زمانہ
ہے۔ مزدوروں کا دَور ہے۔ ہم تو ہتھوڑوں،
پھاوڑوں، اصطبلوں، گنگا دین کی بہو اور چمپو
چمار کی چھوری کے بارے میں ہی لکھیں گے۔ چاہے
نظم سے بُو آئے۔ اللہ بخشے والد مرحوم کو خدا
انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اکثر
مجھے اپنے ساتھ شعرا کی محفلوں میں لے جاتے تھے۔
ہے ہے آج بھی وہ نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے
اُجلا فرش ہے، شمع گردش میں ہے اور سفید پوش
وضعدار لوگ باری باری سلیقے سے اپنا کلام سناتے
ہیں اور حسب الحق داد پاتے ہیں۔ نہ یہ کہ آج کل
کے تُک بندوں کی طرح بادلوں کا بہروپ بھرے
مسخرا پن کر رہے ہیں۔ سخن فہمی اور داد تو خیر
دُور کی چیز ہے۔ یہاں تو گالی تک کا سلیقہ نہیں،
جی ہاں؟

کنڈکٹر:۔ آپ کہاں جائیے گا؟

نواب:۔ جی ہاں، ہر چیز سے بھونڈا پن ٹپک رہا ہے۔

کنڈکٹر:۔ (بلند آواز میں) آپ کو کہاں کا ٹکٹ دوں صاحب

نواب:۔ (چونک کر) اچھا کنڈکٹر صاحب۔ ارے میاں
کہیں کا بھی دے دو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر دوسری
دنیا کا ٹکٹ دے سکو تو بہت بہتر ہے۔

(قہقہے۔ ہارن)

اس بنیوں کی بستی سے تو اب ہمارا جی بہت اُچاٹ
ہو گیا ہے۔ اللہ بخشے ابا جان کہا کرتے تھے کہ بیٹا
اب تو ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ دنیا پر صرف نقد
نارائن مہاراج کا سکہ چلے گا۔ رواداری، بھائی
چارہ، شرافت سب ختم۔ ہمسایہ پیاسا مر رہا ہے تو
اس کے حلق میں پانی تک نہیں ٹپکایا جائے گا۔ نہیں

مین ہی ہو رہا ہے۔
[گاڑی رکتی ہے۔ انجن کی آواز بدستور رہی
ہے۔ بہت سے لوگوں کی اُترنے چڑھنے
کی آوازیں]
نمبر ۳:۔ سیٹ خالی کرنے کے لئے تیار ہو جائیے نواب صاحب!
نواب:۔ وہ کیوں، خیریت تو ہے؟
نمبر ۳:۔ وہ دیکھئے کچھ حسین سواریاں آ رہی ہیں۔ اس
کیبن کے پاس۔ ادھر ہی کا رُخ ہے۔
(قہقہہ)
نواب:۔ جل تو جلال تو۔ اللہ بخشے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ
نے کیا سچ کہا تھا ع
زمانہ آیا ہے بیحجابی کا عام دیدار یار ہوگا
اور اللہ بخشے اکبر الٰہ آبادی تو عمر بھر تہذیب نو کی
انھیں عنایات کا رونا روتے رہے۔ اللہ بخشے پیغمبر
پیغمبر، پیشگوئیاں کرتے تھے پیشگوئیاں، ایک
ایک حرف سچ ہو کر رہا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے
کہ یُوں کھلے بندوں اپنی نمائش کرتے پھرو۔ اگلے
وقتوں میں حسین لوگ پالکی نالکی میں نکلا کرتے تھے
اور عشاق کو انگشت حنائی یا عارض زیبا کی ایک
جھلک دیکھنے کے لئے پہروں انتظار دیکھنا پڑتا تھا
جب جا کر کہیں من کی مراد بر آتی تھی، اور پھر شاعری
ہوتی تھی۔ آج کل کی طرح نہیں کہ حسن کی سبیل لگی ہے
پیاس نہ ہو تو بھی دو گھونٹ پیتے جاؤ۔ اور آپ
جانتے ہیں کہ راہگیروں میں کم ظرف زیادہ ہوتے
ہیں۔ اور شکم سیر کم۔ پھر بدہضمی ہو جاتی ہے۔ ابخرات
سر کو جاتے ہیں۔ لوگ باگ ہذیان بکنے لگتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ یہ شاعری ہے
[قہقہے۔ ہمہمی]
کنڈکٹر اور دو تین آوازیں ادھر اُدھر سے:۔ لیڈیز سیٹ
خالی کر دیجئے گا صاحب۔ لیڈیز سیٹ خالی کر دیجئے
گا۔ سیٹ لیڈیز کے لئے راستہ چھوڑ دیا جائے۔ لیڈیز کے
لئے راستہ چھوڑ دو۔ جگہ خالی کر دیجئے گا صاحب!
نواب:۔ (آہستہ سے) اے توبہ! اتنے نقیب تو مغل بیگمات
کو بھی نصیب نہیں ہوتے ہوں گے۔
آواز:۔ (ہنس کر) اب تو اٹھتے ہی بنے گی نواب صاحب!
نواب:۔ (آہ بھر کر) ہاں میاں وقت وقت کی بات ہے
اللہ بخشے کیا زمانے تھے۔ اے آیئے صاحب!
آیئے، ہم لوگ اُٹھ رہے ہیں ..... یہ لیجئے۔
[کنڈکٹر سیٹی بجاتا ہے۔ بس چلتی ہے
تھوڑی دیر بعد پھر رکتی ہے]
نسوانی آواز:۔ معاف کیجئے گا.....
[لمحی وقفہ جس میں انجن کی دھب دھب
سنائی دیتی ہے]
آواز:۔ ذرا ادھر کو ہٹ جائیے گا نواب صاحب۔
نواب:۔ اوہ آپ یہاں اتریں گی، یہ لیجئے بندہ ایک
طرف ہٹ گیا۔
[لمحی وقفہ۔ سیٹی]
نواب:۔ ارے روکنا، بھئی روکنا ذرا روکنا۔ وہ مس صاحبہ
اپنی کتاب یہاں بھول گئی ہیں۔ (پڑھتے ہوئے)
Psychology of Sex by Havellock
Ellis (چلّا کر) اجی مس صاحب اپنی کتاب
تو لیتی جایئے۔
نسوانی آواز:۔ Thank you
نواب:۔ (موٹر چلتی ہے) Psychology of
Sex by Havellock Ellis اے توبہ
کیا زمانہ آیا ہے۔ اللہ بخشے ہماری بیگم بیچاری،
جب بیاہ ہوا تو ان کی معلومات صرف اتنی تھیں کہ
شادی زرق برق لباس پہننے کے لئے کی جاتی ہے

اور ایک یہ زمانہ آگیا ہے کہ کنواری لڑکیاں Sex پر کتابیں پڑھ رہی ہیں۔ اللہ بخشے اگر کہیں ہماری والدہ مرحومہ کے گھر میں ایسی لڑکی پیدا ہو جاتی تو گلا ہی گھونٹ دیتیں۔

[موٹر کی آواز۔ رکتی ہے]

کنڈکٹر:۔ گول ڈاکخانہ آگیا صاحب

نواب:۔ ایک تو میں اس گول کی بک بک سے تنگ آگیا گول مارکیٹ۔ گول ڈاکخانہ۔ یہ چوک گول۔ آسمبلی گھر گول۔ اس گول میں مجھے ضرور کچھ گول مال نظر آتا ہے۔ (قہقہہ) واللہ سر چکرانے لگتا ہے۔

نمبر ۵:۔ آہا سہیل صاحب ہیں۔ یہاں چلے آیئے نا۔ بہت جگہ پڑی ہے۔ کہئے مزاج تو اچھے ہیں۔ بہت دن میں ملاقات ہوئی۔

نووارد:۔ جی ہاں کوئی سال بھر تو ہو ہی گیا ہوگا۔

نمبر ۵:۔ اتنا عرصہ کہاں رہے؟

نووارد:۔ بمبئی میں تھا۔ فلم کمپنیوں کے ان پڑھ مالکوں کے ہاتھ اپنا دماغ فروخت کر رہا تھا۔

نمبر ۵:۔ (ہنس کر) جی ہاں یاد آگیا۔ کسی فلمی کہانی کے سلسلے میں آپ کا نام نظر سے گزرا تھا۔

نووارد:۔ بہت ممکن ہے۔

نمبر ۵:۔ کیا نام تھا؟

نووارد:۔ نواب دقیانوس بہادر۔

نمبر ۵:۔ خوب خوب سہے ہاں، آپ سے ملئے نا۔ نواب صاحب آپ میرے دوست ہیں سہیل صاحب۔

نواب:۔ مزاج بخیر۔

نووارد:۔ شکریہ۔

نمبر ۵:۔ اور آپ ہیں نواب فصیح الدین صاحب نواب صاحب پدرانہ کے عزیزوں میں سے ہیں۔ آج کل ہمارے دفتر میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں جنگ کے زمانے میں پہلے شخص ہیں جنہیں ہمارے یہاں Permanent کیا گیا ہے۔

نووارد:۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔

نواب:۔ اجی میں کس لائق تھا۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ خدا نے افسروں کے دل میں کچھ رحم ڈال دیا۔ اللہ بخشے مارگن صاحب کو۔ ان کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ ہمارے یہاں سکتر تھے ابھی پچھلے مہینہ ان کا انتقال ہوگیا۔ بندہ پر بہت مہربان تھے۔ اور ہمارا تو عقیدہ ہے کہ افسر مہربان ہو تو خدا مہربان بڑے خاندانی انگریز تھے اور خاندانی آدمیوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ فصیح الدین ہم تمہارے کام سے بہت خوش ہے۔ تم خاندانی آدمی ہے۔ تمہارے بزرگوں کا یہاں پہ راج تھا اور اگر ہم یہاں رہا تو تمہیں کوئی اچھی جگہ دلوائے گا۔ خدا ان کی روح کو فردوس بریں میں جگہ دے جو کہا تھا سچ کر دکھایا۔ اللہ بخشے!

(موٹر کا ہارن)

ابو سعید قریشی

گیت

رنگ دونا جیون کے کچھ پل!

پریم چبھن سے میں الجھن میں
امرت رس ہو کر تم برسو
اُترو ایک کرن بن من میں

پھر یہ شیش محل ہو جھل بل
رنگ دونا، جیون کے کچھ پل!

چنچل من تو چاہ سے پاگل

کون کرے پر را ہیں روشن
برہ کی اگنی تم ہی بھر دو
کر دو من میں چتائیں روشن

جیون میں پھر کر دو ہل چل
رنگ دونا، جیون کے کچھ پل!

مسعود حسین

گیت

اب آئے ہو تو آؤ مگر کیوں آئے ہو

اب سوئی ہوئی ہیں وہ لہریں جو پاؤں تمہارے چھو نہ سکیں
بیٹھی رہیں اُن کا عکس لئے یہ چاند ستارے چھو نہ سکیں

سو رہنے دو نہ جگاؤ
اب آئے ہو تو آؤ مگر کیوں آئے ہو!

ہر تپتی گھٹا کو ترستی رہی، وہ دُور ہی دُور برستی رہی
مُرجھانے پر اب اوس بھی کیوں، یہ بھی نہ رہی وہ بھی نہ سہی

آنکھوں میں نہ آنسو لاؤ
اب آئے ہو تو آؤ مگر کیوں آئے ہو!

جو پھول بہار کے ارماں تھے، مُرجھا کر پھر کبھی کِھل نہ سکے
یہ بجھتی شام کی پھیکی ہنسی، ہم مل کر بھی اب مِل نہ سکے

اب چھوڑو نہ یُوں تڑپاؤ -
اب آئے ہو تو آؤ، مگر کیوں آئے ہو!

ضیا جالندھری

تہذیب کی اجمالی حقیقت
شخصیت کی روشنی میں!

زندگی کے اس ہنگامی دور میں اگر کبھی یہ سوچنے کی فرصت مل جائے، کہ ہم کیوں جیتے ہیں اور ہماری روزانہ زندگی کے نظام کا عنوان و انداز کیسا ہونا چاہیئے، تو بجائے کسی بیباک اور شگفتہ شعور کے مایوسی ہوتی ہے۔ ہزاروں شکوک سمٹ کر ایک سوال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور سوال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انسان کی بستیوں میں تہذیب کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ بات کو آسانی سے سمجھنے کے لئے اگر ہم ایک مہذب شہری کی زندگی کا جائزہ لیں تو تہذیب کی وہ خصوصیات اجاگر ہو جائیں گی جن کا صدیوں سے انسانی خیر و برکت سے تعلق رہا ہے۔

ایک بات جو دنیا کی ہر بڑی تہذیب میں (مثلاً یونانی، چینی، آریہ ورتی) ایک مہذب شہری کا طرۂ امتیاز رہی ہے وہ اس کی سخن فہمی ہے، اس کا ذوقِ انتخاب ہے، ایک مہذب شہری اپنے ذوقِ انتخاب میں دوسروں سے زیادہ منطق اور وجدان کا ثبوت دیتا ہے، خوب اور ناخوب سے اس کی وابستگی کسی ایسے جمالیاتی شعور کی بنا پر ہوتی ہے، جو روایات کے صحت مند عناصر پر مبنی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے آدمی (شہری) میں تخلیق اور طبعزاد جستجو کی صلاحیتیں بھی ہوں، بس اتنا ہو کہ اس کے کام میں خوش سلیقگی، ترتیب اور تعمیری کلیت دوسروں کے کام سے کہیں زیادہ ہو، اس کی تخلیق پر انھیں آدرش کا چھاپ ہوتا ہے جو اس کی گھٹی میں پڑی ہو، یہ بہت ممکن ہے کہ اس کے کام اور کلام سے اس کے زمانے کی تاریخ مرتب کی جاسکے، اس کے کام اور کلام میں بکھرے ہوئے منکوں سے اس کے قوم اور ملک کی دیومالا بنائی جاسکے۔ مگر اس کی تخلیق میں ایک خاص جمالیاتی شعور کی جھلک کہیں نہیں ملے گی۔ (ایک فن کار کے لئے مہذب ہونا ضروری نہیں ہے، کچھ لوگ چونکیں گے مگر میر، نظیر سے زیادہ مہذب آدمی نہ تھے) اگرچہ ایک مہذب فن کار، اپنی نیکی، اپنے خلوص اور اپنے اعتماد خیر و برکت کا اپنے فن میں بڑا جیتا جاگتا مظاہرہ کرتا ہے، مگر یہ اس کے فن کی اہم ترین خصوصیت نہیں ہوتی۔ تخلیق بجائے خود تہذیب یا بربریت کی محتاج نہیں ہے، فن کے لئے تہذیب اور بربریت کے درمیان کوئی ایسی آہنی دیوار، کوئی ایسی حد فاصل نہیں، جو راہ میں حائل ہو سکے مگر سخن فہمی ایک سوجھی بوجھی، پرکھی ہوئی مہذب جستجو ہے، اشیا میں امتیاز کرنے کی قوت صرف تہذیب سے وابستہ ہے۔ وہ شخص جو سخن فہم نہیں، مہذب نہیں، کچھ بھی ہو، ایک مہذب شہری بغیر کسی جیتے جاگتے جمالیاتی شعور کے جو کبھی کبھی لاوے کی طرح پھوٹ نکلتا ہے، فقط آواز اور فقط رنگ کا خول رہ جاتا ہے۔ مگر فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ ایسے آدمیوں پر ہی دُنیا کی سیاسیات، سماج اور نظام تمدن کا بوجھ ہوتا ہے۔ بہر کیف ایک مہذب آدمی کی زندگی کی انتہائی مسرت اور سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ دنیا کے مختلف مسائل پر سوچ بچار میں وقت گزار سکے۔ ایسے تجربے کسی تخلیقی کاوش سے کم جان لیوا نہیں ہوتے۔ غور و فکر کے تجربوں میں جمالیات اہم ترین شعبہ ہے۔ اور اس شعبہ میں ایک مہذب آدمی کی رائے بڑا وزن رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں مہذب آدمی کا ذاتی تجربہ اس کے وجدان کا کم سے کم اثر قبول کرتا ہے۔ اس کی اپنی حیثیت

ایک تماشائی کی ہوتی ہے، اور تماشائی کی رائے ہمیشہ بازیگر سے زیادہ فیصلہ کن اور دیرپا ہوتی ہے، ایسے فیصلے اکثر ایک تو
شعور سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ فکری ہنگامے (میں نے اس لفظ کو بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے) مہذب قوموں
زندگی میں بڑی اونچی جگہ رکھتے ہیں، زندگی کی آتم کتھا لکھنے والوں کے ان نظریوں کے خلاف جو عملی زندگی کے نام سے م
مہذب آدمیوں کا جمالیاتی شعور ایک صدائے احتجاج ہے۔ مگر یہ بات بھی اس زمانے کی بتائی ہوئی قدروں پر جاتی ہے
زندگی کے ایسے عملی پہلو ہیں، جو انسانیت کو خیر کی منزل کی سمت چلنے میں نشانِ راہ کا کام دیتے ہیں۔ اور مہذب قومیں ا
پر گامزن بھی ہوتی ہیں۔ کچھ کھوتی اور کچھ پا بھی لیتی ہیں۔ مگر چونکہ ایک مہذب آدمی خود خیر کی ایک منزل بلاواسطہ دید و تجلی
لئے زندگی نے سینکڑوں کوہ طور سے صدائیں دی ہیں، اس لئے عملی زندگی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ جب اپنے وجدان کی
آگیں فضا میں کھو جانا، اس کی زندگی کا نصب العین، روپ کی پرستش اور تخلیق کی دھن اس کا شیوہ، حقیقت کی تلاش
زندگی کا مقصد، دنیا سے بے نیازی اور اس کے وجود کا صحیح ادراک اس کی منزل ہے، تو وہ ایسے فکری ماحول کو کیونکر
"کام کرو" والے نعرہ پر قربان کر سکتا ہے۔ اگر عمل زندگی کے لئے ضروری ہے تو وہ کام سے جی نہیں چرائے گا۔ کام کرتے
رہنا، یا کام کرنا اور زندہ رہنا، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، وہ جانتا ہے کہ یہ بات بھی خیر کا ایک ذریعہ ہے، اس کا
نہیں۔ عمل اپنے انتہائی کمال کو پہنچ کر بھی زندگی کی منزل نہیں ہے۔ صرف زادِ سفر ہے، توشہ ہے، عمل کو سب کچھ سمجھ لے
صحت کی بڑی اجاڑ اور ویران حالت کا پتہ دیتا ہے، عملی زندگی اپنی جگہ کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر اس کی سمیٹ میں سے
کے ایسے پہلو نہ پیدا ہو سکیں جو کسی جمالیاتی شعور کا دروازہ نہ کریں۔

یہ ماننے کی بات ہے، کہ عملی زندگی (یہاں عملی زندگی سے مراد کسی فرد کا پیشہ یا تجارت نہیں ہے۔ زراعت
رہنے والوں کا پیشہ ہے، مگر اس کو ان کی عملی زندگی سمجھ لینا غلط فہمی ہوگی) خیر کا ایک ذریعہ ہے، کم سے کم دوسرے
نقطۂ نگاہ سے ایک عملی انسان بہت بلند نظر آتا ہے، مگر کیا ایک حقیقی عملی انسان اپنی دستاویز پر دستخط کرانے کے لئے
دیکھتے بھاڑ میں صرف اس لئے جھونک دیتا ہے کہ یہ خیر کا ایک ذریعہ ہے، اکثر اس کی ایسی حرکات اپنی انفرادیت کا
کے لئے ہوتی ہے) "اللہ کے نشتر" جنھیں دنیا عملی آدمی کہتی ہے مسخ شدہ، روندے ہوئے، پامال اور مجروح حافظ
ہیں۔ ان کی مجروح انفرادیت راہ نہ پاکر چنگیزیت کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے، ان کے احساسات پر اظہار کی راہ
ہیں اور ان کے سڑے گلے احساسات، ان کے دماغ کا سکون اور دل کی نرمی مٹا دیتی ہے، آج بھی ہماری زمین کی یہ زلیل
کہ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں۔ روزمرہ زندگی کا خاموش نظام معمولی معمولی سچائی کو پالینے کی دھن تخلیق اور حسن میں
رازِ محبت۔ پیمانِ دوستی، کوئی ایسی شے انھیں تسکین نہیں دے سکتی۔ بس ایک طاقت کا جنون ہوتا ہے، کہ اپنے وجود
لامحدود چاہئیں اور یہ پودا ان کی کمزور انفرادیت کے بنجر میں اگتا ہے، اور خوب اگتا ہے۔ سکندرِ اعظم، نپولین اور چنگیز
اسی قسم کے لوگ تھے۔ ایسے لوگ تاریخ کے ہاتھوں اٹھائی ہوئی وہ دیواریں ہیں، جن کے سایوں میں زمین کی اندھی تم
کی ایک کرن کے لئے ترس گئی، حکومت کے آئین، سلطنت کے جاہ و حشم، جغرافیہ کا خون، ان کے ہر نفس بنتے بگڑتے آ
خاکوں میں ورنگ بھرتا رہا ہے۔ یہی زمین کے وہ دیوتا ہیں جن کی سرمایہ داری، بزدلی، سفاکی، بے ربط و بے آہنگ زنا
انجمن آرا رہی ہے۔ انھوں نے دنیا کی سچائی اور عافیت کو ایک سرے سے مٹا دیا۔ تہذیب کی آسائشوں سے خود دُور
نے اپنے پڑوسیوں سے نغموں کا وہ ذخیرہ بھی کھلے خزانے لوٹ لیا، جو کہ آگے مہذب آدمیوں کا کوئی تقاضا نہیں ہا

لوگوں کے وجود میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کے دیوتا سائز سے متاثر ہو کر لوگ بہک جاتے ہیں۔ آخر مہذب آدمیوں میں بھی دو چار ایسے ہوتے ہی ہیں جن کا یقین اپنی بنائی ہوئی قدروں میں پختگی کی حد تک نہیں پہنچتا، اور یہ لوگ قانون کے شکوہ و جلال کے جھیلے میں آجاتے ہیں۔ سکندر اور نپولین کی نسل کے لوگ وہ انسانی جونک ہیں، جو اپنے آپ کو پیغمبروں کی صف میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا کے نام ان کا پیغام ہوتا ہے "یہ کرو"۔ "وہ کرو"۔ جیسے "یہ کرنا" "وہ کرنا" کام کرنا بذات خود خیر ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ قانون اور حکومت کے آئین شمشیر و سناں کے سانچوں میں ڈھلنے لگتے ہیں، پولیس کی چوکی ان کے خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے، ان کی طاقت کے بیکراں سیل کی زد میں آکر ان اصولوں اور قدروں کو ماننا پڑتا ہے، جو زندگی سے یکسر حسن کا احساس مٹا دیتی ہیں۔ وہ دنیا کی متضاد کیفیتوں پر اپنی طاقت کا خول اس طرح چڑھا دیتے ہیں کہ حقیقت اکائی کی صورت میں نظر آئے، ہمیشہ یہ ہوا ہے، کہ غیر معمولی بیدار مغز اور اجنبی اشخاص کے جمالیاتی شعور کی موت ان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے آدمیوں کی تعداد مٹھی بھر ہوتی ہے۔ لیکن دنیا کی بہت بڑی آبادی انفعالیت پسند اور جاہل ہونے کے باعث ان کے سامنے جھک جاتی ہے۔ بس اسی لئے آج تک وہ سرخرو ہوتے رہے، ایک مہذب آدمی کی حکومت میں کوئی گنجائش نہیں،

مہذب آدمی پیدا نہیں ہوتا، بنتا ہے، سنورتا ہے، سنوارا جاتا ہے، وہ بڑی حد تک مصنوعی غیر فطری ہوتا ہے، ایک واضح تاریخی شعور کی مدد سے وہ اپنے ذوقِ نظر کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ تخلیق اور حسن کی پیدائش میں حصہ لے سکے۔ اس کے اس انتہائی غیر فطری شعوری ڈھانچے کے باوجود اس کی شخصیت کھلی ہوئی بیباک، نڈر اور آزادی پسند ہوتی ہے۔ اس پر چھائیاں نہیں پڑتیں۔ وہ مسخ نہیں ہو پاتی۔ ایسے آدمی کے رجحان میں نسائی جلاپا، بغض و حسد، تعصب اور خود پسندی کے بیمار عناصر کبھی پیدا نہیں ہوتے، اس کی شخصیت کا راز دوسروں سے بڑے ہونے میں نہیں، مختلف ہونے میں ہے، اور اس کی یہ اجنبیت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ لوگ اسے آوارہ و مجنون بھی سمجھتے ہیں۔ سقراط، لنکن، تالستائی اور ٹیگور اسی قسم کے لوگ ہیں۔ ایسا آدمی بگڑ بگڑ کر اس طرح سنورتا ہے کہ اس میں بگڑنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس بظاہر متضاد کیفیت کو ذہن نشین کرنے کے لئے دو علامتوں کو سامنے رکھئے، پہلی زندگی (تجربات اور حادثات کی صورت میں) جو ایک پر شکوہ دریا کی طرح اپنی روانی میں ادراک اور امنگ ہے، دوسری شخصیت یعنی وہ وادی جس میں اس دریا کے پیچ و خم اور رفتار کے کرشمے جلوہ ساماں ہوتے ہیں، مگر شخصیت کے متعلق ایک مشکل اور ہے، ہر تجربے، اس کی ترتیب اور اس کے نتیجے کو اپنا لینا، شخصیت کے جذب اور صلاحیت پر منحصر ہے کوئی بھی دو آدمی لیجئے۔ اپنی شخصیت کی بناوٹ میں یکساں نہیں ہوتے مگر تجربے کے اولیں دور میں ہر آدمی کی شخصیت تعلیم اور تنظیم کے ایسے حالات سے گزرتی ہے کہ اس کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، کیونکہ ابتدا سے زندگی کے غلط تصورات کا انبار اس کے سر پر منڈھا جاتا ہے، اس کی عادات و اطوار کے زاویئے پہلے پہل اس کے سامنے بھیڑ کی صورت میں آتے ہیں، روایتی تعاقب کے زیر سایہ اس کا فکری ماحول پیدا ہوتا ہے اس لئے اس کی شخصیت کا شاداب اور شگفتہ ہونا معلوم، کبھی کبھار یہ ساری باتیں کسی کلچر کی تنظیم میں بالکل بدل بھی جاتی ہیں، شخصیت کو خواہ زندگی اور اس کی طاقت کا شعور ہو یا نہ ہو، یہ وادی اپنی آغوش میں بہنے والی ندی کے گرم و سرد پیچ و خم رفتار و آہنگ کا پاس رکھے یا نہ رکھے۔ اس کی سیلاب زدہ موجوں کی سیّات سے آگاہ ہو یا نہ ہو، اپنی سطح پر جم جانے والی مٹی کو پرکھ سکے یا نہ پرکھ سکے۔ (اقبال نے شخصیت کی اسی زرخیز مٹی کو پہچان کر تہذیب سے وابستہ خیر و شر کی قدروں پر بڑا لطیف تبصرہ کیا ہے ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی)

مگر اس وادی کو ہموار ضرور ہونا چاہیئے' اکثر ایسا نہیں ہوتا ہے اور اس کا دکھ سب سے زیادہ ایک فن کار کو ہوتا ہے ؎

ذرا آہستہ لے چل کاروان کیف و مستی کو
کہ سطح ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

شخصیت تجربہ کی گزرگاہ ہوتی ہے۔ اس کا ہموار رکھنا منطق اور وجدان کا کام ہے، ہر شخص میں قبول شدہ روایات اور جذباتی فیصلہ پر صاد کرنے کی عجیب و غریب عادت ہوتی ہے۔ ایک وحشی اور نیم وحشی انسان پر تعصب کا آسیب چھایا رہتا ہے، مگر ایک مہذب آدمی کی زندگی میں یہ بات نہیں ہے۔ اس کی شخصیت تعلیم اور تنظیم کے بعد اپنی پیدائشی صورت سے مختلف بھی ہوتی ہے' اور خوبصورت تر بھی، کھوکھلی اور بے مغز روایات کی دیمک ایسے آدمی کو کبھی نہیں رکھ سکتی، خوف' بیمارانہ آرام پسندی تعیش اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ اس لئے ممکنات کی ایک وسیع دنیا اس کی نگاہ میں ہوتی ہے ؎

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

مہذب آدمی کی شخصیت کلی طور پر' ذاتی طور پر' انفرادی طور پر مرد مومن' زناری' پرولتاری، مجاہد فرنگی' یا چینی کی حیثیت سے نمایاں نہیں ہوتی' وہ دنیا کی ہر چیز سے دوچار ہوتی ہے، اور دنیا کی ہر چیز اس میں مل کر ایک کل ہو جاتی ہے، ایک جذباتی سکون کی خاطر یا اپنے گروہ کے رجحان کی اندھی تخلیق کے لئے وہ اپنی ذاتی خصوصیات کی قربانی نہیں کر سکتا۔ ہاں اس کی ذاتی خصوصیات اگر ایسی ہوں جو زندگی کو خیر کا ایک ذریعہ بنانے سے روکتی ہوں تو وہ ایسی ضروریات کے مطابق کہیں کہیں اور کبھی کبھی بدل سکتا ہے۔ وہ اپنے یک طرفہ رجحان کے خلاف زندہ رہنے کے لئے جان کی بازی لگا سکتا ہے' وہ جانتا ہے کہ وحشیانہ جذبے تپ دق کی طرح زندگی اور سکون کے دشمن ہوتے ہیں' دنیا کی صحت پر ان کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔ زندگی کے شور اور اس کی حقیقت کے درمیان حائل ہو کر جو لوگ ہنگامے بپا کرتے ہیں' ان کی اسے بالکل پروا نہیں ہوتی' ان سے بے نیاز رہنا اس کی زندگی کا ادرش ہے۔ وہ اپنے بہت سے وحشیانہ جذبے کو دفن کرکے ایک بہتر زندگی کا اکتساب کرتا ہے۔ ایک مہذب آدمی' اکتسابی اور مصنوعی ہوتا ہے' مگر اس کا تصنع فطرت کے سفاک اصولوں کے خلاف ایک مستقل پیکار رہے ؎

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

حامد عزیز مدنی

زیست کا مفہوم پوچھا تھا کہ اک جام آ گیا
ذوقِ استفسار کو تھوڑا سا آرام آ گیا
زندگی اور موت کے تیرہ معمے ہائے ہائے
اس دورا ہے پر چراغِ میکدہ کام آ گیا

حائل ہے عمر خضر و مسیحا کا فاصلہ
رفتارِ حادثات سے رفتارِ یار تک
اک نیم وا کلی میں ہے شبنم کی ایک بوند
اوقات دیکھنا ذرا صبحِ بہار کی

عدم

کاٹھ گودام سے بھوالی تک"......"

کتنی پُر پیچ ہیں کہسار کی راہیں ہمدم
کار ہر گام پہ بل کھاتی چلی جاتی ہے
سینۂ کوہ پہ درّاتی چلی جاتی ہے
کھوئی جاتی ہیں مناظر میں نگاہیں ہمدم

دامنِ کوہ میں وہ ندّی کنارے گاؤں
بام و دیوار پہ چھایا ہوا قرنوں کا جمود
زندگی پیٹ کے بل رینگ رہی ہے جیسے

. . . .

چیڑ کی چھاؤں میں گاتے ہوئے جھرنے کے قریب
جانے کیوں دیر سے بیٹھی ہے پہاڑی لڑکی
ملتجی نظریں ہیں بیگانۂ احساسِ شباب

. . . .

اس طرف ایک تنومند پہاڑی مزدور
بارِ ہستی سے جھکے جاتے ہیں شانے جس کے
ہانپتا کانپتا منزل کی طرف جاتا ہے

. . . .

دُور اُس وادیٔ شاداب میں وہ سیب کے باغ
دیکھ کر جن کو خجل ہوتا ہے باغِ رضواں
ان کو سینچا گیا انساں کے لہو سے صدیوں

کتنی پُر پیچ ہیں کہسار کی راہیں ہمدم!
کار ہر گام پہ بل کھاتی چلی جاتی ہے
سینۂ کوہ پہ درّاتی چلی جاتی ہے
کھوئی جاتی ہیں مناظر میں نگاہیں ہمدم

غلام ربانی تاباں

مسوری میں

وہ دیکھو سامنے۔ سامنے میرے بھائی، جہاں مسوری کی کہکشاں نظر آرہی ہے۔ کہکشاں نہیں جھمکے ـــ جھمکے نہیں۔ چلو جھمکے ہی سمجھ لو میرے بھائی۔ لیکن یہ جھمکے ان پہاڑی دوشیزاؤں کے نہیں ہیں، جو مسوری کی بیٹیاں ہیں، اور اس کی وادی میں پناہ گزیں ہیں۔ یہ جھمکے موٹر کاروں اور ساریوں والی دوشیزاؤں کے ہیں ـــ دوشیزائیں جو موسم گرما کے آتے ہی مسوری کی طرف اغوا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ایک دن بارش نہ ہو تو مسوری کی جانفزا اور فرحت انگیز ہوائیں پگھلنے لگتی ہیں۔

اس رکشا والے کو بھی دیکھو میرے بھائی۔ جس کی گردن پر ایک نیا جوڑا سوار ہے، اور جس کے سانس کی دھونکنی کسی خاموش آگ کو ہوا دیتی ہوئی معلوم دے رہی ہے۔ بڑے بڑے لیڈر اور مصلح آتے ہیں اور اس کی گردن پر سوار بے دھڑک گزر جاتے ہیں۔ کسی کو اس پل صراط کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا اکھڑا ہوا سانس، اس کی چال کا رعشہ، اس کی آنکھوں کا کھنچاؤ اور اس کا قبل از وقت زندگی کے موڑ پر آ کھڑا ہونا کسی کے لئے جاذب توجہ نہیں بنتا۔ انسان نے کتنی ترقی کی۔ باربرداری کے جانور سے ایٹم بم تک، لیکن فرعون کے وقت کی یہ فرسودہ رسم آج بھی جاری ہے۔ اس نئے جوڑے کے پروگرام میں یہ رکشا والا ایک نہایت ضروری عنصر دکھائی دیتا ہے، جو ہنی مون کے اس مختصر سے عرصہ میں زیادہ سے زیادہ لطف حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے بغیر ان کا ہنی مون کیا نامکمل اور پھیکا نہ رہ جائے گا۔

آخر ان سوکھی باتوں سے اکتا گئے، لیکن کیا کروں بھائی ان دنوں کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں، کچھ قنوطی سا ہو گیا ہوں۔ کیا کہا، حیاتین کی کمی ہے، ہاں ٹھیک ہے بھائی، جہاں آج ہم میں سے ہر دسویں آدمی کے لئے روٹی نہیں ہے۔ اور آنے والے قحط کے احساس نے ابھی سے ہماری آنکھوں کی روشنی جذب کر لی ہے وہاں حیاتین کہاں میسر آئیں۔ روٹی ہی مل جائے تو غنیمت جانو۔

چلو سامنے اس کتابوں کی دکان پر چلیں جس کا مالک بورنے نکلس کی کتاب مانگنے پر تمہاری طرف یوں دیکھتا ہے جیسے کہتا ہو، ڈنڈا ہی نہیں ہے ورنہ مزا چکھا دیتا۔ ایسا سنگین جرم اور اس کے جواز میں مس میو کی کتاب پیش کر کے نہ صرف اپنی بدذوقی کی نمائش کرتا ہے، بلکہ تمھیں بھی بدذوق بننے کی دعوت دیتا ہے، دام دے کر بدذوق بننا گوارا ہے۔ نہیں تو پھر چلو مال پر چلیں، شاید تمھاری طبیعت بہل جائے۔ وہ دیکھو سامنے چار قلی ایک میم صاحب کو ڈانڈی میں اُٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ جنازہ! ہاں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، انسانیت کی اقدار کا جنازہ، ہر وہ چیز جو انسان میں قابل قدر ہو سکتی ہے اس کا جنازہ، اور اس میم صاحب کی آنکھوں کو بھی تو دیکھ لو، ان میں بھی ہزاروں دیرینہ اور تشنہ کام آرزوؤں کا جنازہ ہے اور اب یہاں سے اس قوم کے اٹھتے ہوئے اقتدار کا جنازہ بھی تو ہے۔ وہ کیوں نہیں دیکھتے۔ اور سنو، ذرا غور سے سنو اُن چاروں قلیوں کے ملے جلے تیز سانس کی آواز کرب کی اُس آواز کی طرح معلوم دے رہی ہے جو مُردے کی آخری رسوم ادا کرتے وقت چند مقدس گیت گاتے ہوئے پیدا ہوتی ہے۔

ان رکشاؤں اور ڈانڈیوں کا قصہ چھوڑو بھائی۔ کوئی اور بات کرو۔ اچھا تو پھر وہ سامنے والی خاتون سے مل لو

وں نے لپ سٹک کی بجائے پان کی لالی سے اپنے ہونٹ رنگے ہیں، یا پھر اس بُرقعہ پوش خاتون کو دیکھو جس کے جلو میں
ن کی ایک کلبلاتی اور چنگھاڑتی ہوئی فوج چلی آرہی ہے، اور اس فوج کا نفیرچی جو اس کی گود میں ہے، باہر نکل نکل کر
ی ہستی کا ثبوت دے رہا ہے، اور اس بیچاری کو بار بار اسے اندر چھپا کر اپنا پردہ ٹھیک کرنا پڑتا ہے۔ کسی کلرک کی بیوی
علوم ہوتی ہے۔ ہاں شاید یہ ٹھیک ہو۔ کیونکہ کلرکوں بیچاروں پر دفتر میں ہیڈ کلرک اور گھر پہ بیوی خاص طور پہ مہربان
رہتی ہے۔

سامنے والے سیٹھ سے بھی ملے۔ جس نے اس پانچ سال کے عرصے میں بلیک مارکیٹ کی آمدنی سے دکانوں کا یہ پورا
ازار خرید لیا ہے۔ وہ اخبار لئے دکان کے چبوترے پر بیٹھا ساتھ کے دکانداروں سے حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہا ہے۔ اور
ہ سوچ بھی رہا ہے کہ ہندوستان میں پھر قحط پڑ رہا ہے، اور اب کی اشیائے خوردنی کے دس گنے نہیں تو آٹھ گنے تو بن ہی جائینگے
فع کی نئے منہ میں لئے ہوئے، بھرا ہوا صفاچٹ چہرا۔ بھئی ٹھیک کہنا، کیا اس وقت وہ بالکل چیچل نہیں معلوم ہوتا۔ پانچ
زاروں میں سے ایک، تو اچھا نہ ہوگا۔ تم کاہے کو ہاں کہو گے۔ تمہارے مطلب کی چیز ابھی تک ملی نہیں۔ چلو سامنے سیوائے
ہوٹل میں چلتے ہیں، یہاں کا سب سے بڑا اور عالیشان ہوٹل ہے۔ لیکن اکثریت وہاں غیر ملکیوں کی پاؤ گے، جو پانچ سال
سے یہاں پناہ گزیں ہیں۔ یہ لوگ یہاں ایسے آئے کہ بس یہیں کے ہو رہے۔ ہندوستان تو جنت نشان ہے ہی۔ یہاں نہ
ایران کی طرح شراب کی بوتل ڈیڑھ سو روپیہ کو ملتی ہے، اور نہ یونان کی طرح ایک دیا سلائی کی قیمت تین روپیہ ہے اور
پھر تم جانتے ہو کہ ہم ہندوستانی بہت ہی شریف واقع ہوئے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ متواضع، خود بھوکے رہ کر بھی مہمانوں
کی تواضع کرنا اپنا ایمان اور دھرم سمجھتے ہیں اور جنت یا سورگ کی اُن اَن دیکھی نعمتوں پر نظر لگائے رکھتے ہیں جو اس دُنیا
ہمارے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں۔ وہاں کھانے کے کمرے میں چلو، دیکھو کس چیز کی یہاں کمی ہے، کون سا کھانا ہے جو میز پر یہاں
چُن نہیں دیا گیا۔ وہ پلاؤ تو بالکل قصہ خوانی بازار کا سا معلوم ہو رہا ہے۔ وہ مچھلی بھی خوب تلی ہوئی ہے، اور وہ قورمہ تو
لاہور کے ہوٹلوں سے بھی زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، وہ ٹماٹر کا شوربہ، بس چپاتیں ہیں مکمل۔ کیا کسی گوشہ یا کونہ سے کہیں قحط
جھانکتا ہوا نظر آرہا ہے۔ نہیں میرے بھائی نہیں، بکتے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہندوستان میں قحط پڑ رہا ہے، اور اگر
ہے بھی تو ان بیچاروں کو کیا؟ یہ تو یہی جانتے ہیں کہ اگر ہندوستانیوں کو روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھا لیتے، یہ فوجی افسر
ہاں بھائی ان میں ہندوستانی بھی کافی ہیں، لیکن یہ غریب تو محض رخصت گزارنے کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں، ذرا تازہ دم
ہونے کے لئے۔ قحط سے انھیں کیا سروکار۔ یہ تو حکومت کے داماد بنے پھرتے ہیں، قحط ہو یا سیلاب، یہ تو کھائیں گے، اور حکومت
انھیں کھلانے کی ذمہ دار ہے۔ خدا بھلا کرے اس جنگ کا جس کی وجہ سے یہ لوگ وردیاں چمکائے، فرعون بے سامان بنے، ایک
خوبصورت سی بیوی بغل میں دبائے، جسے پہلے انھوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ سرگشت کرتے ہوئے کبھی ادھر جاتے
ہیں اور کبھی ادھر،

وہ سامنے بیٹھی ہوئی افرنگی حسینہ کو ذرا دیکھو، ذرا دیکھو کہ اُس کی آنکھوں میں سمندر کی نیلاہٹ اور جھاگ کی سفیدی
کس قدر حسین امتزاج پیدا کر رہی ہے، اور ایسی چمک پیدا کر رہی ہے جیسی جہاز کے عرشہ پر چاندنی رات میں ہوتی ہے۔ لیکن یہ
تمہارے لئے نہیں ہے بھائی! تم ایسے ہی ہونٹ مت چاٹو۔ اپنی میز پر بیٹھے ہوئے اس گورے فوجی افسر کو دیکھ لو۔ جس کی
مونچھیں انیوز فروٹ سالٹ کے اشتہار کی طرح ہیں، اور وہ اپنی اس فتح کی خوشی میں مونچھوں پر تاؤ دیئے جا رہا ہے، اور بس

کیا کہا۔ اس ہندوستانی افسر کی بغل میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو کہیں دیکھا ہے۔ سارے بھائی ضرور دیکھا ہوگا، اور ممکن ہے لاہور کے کسی کالج ہی میں دیکھا ہو۔ جب وہ صرف مس تھی۔ لیکن اب تو وہ ایک اعلیٰ افسر کی بیوی ہے اور تم وہی بدھو کے بدھو۔ ہاں نظم کبھی کبھی اچھی کہہ لیتے ہو۔ لیکن ان معاملوں میں وہ درخورِ اعتنا نہیں۔ چلتے چلتے اس بہرے کو بھی دیکھ چلو، جو بلانے پر سلیقہ اور نفاست سے سلام کرتا ہے۔ اور جس کی آنکھیں کھانے والوں کے چہروں سے زیادہ ان کے ہاتھوں کی طرف لگی رہتی ہیں کہ وہ اندر کی جیب میں بخشش کے لئے کب داخل ہوتے ہیں۔

اچھا تو بھائی چلو رقص گاہ میں چلیں۔ شاید وہیں کچھ مل جائے۔ رقص شروع ہو چکا ہے اور سب کی سب نشستیں پُر ہو چکی ہیں لیکن تم تو کہتے تھے کہ تمہاری نشست پہلے ہی سے مخصوص ہے۔ تو منیجر سے پوچھ لو بھائی شاید کچھ پتہ چل جائے۔ منیجر صاحب سے ملو جن کے مُنہ سے شراب پئے بغیر ہی سخت بُو آ رہی ہے۔ اور جگہ نہیں ہے، جگہ نہیں ہے، کہتے ہوئے جن کا لہجہ ہتک آمیز ہوتا جا رہا ہے۔ بھائی تم دیر سے پہنچے، اور وقت تو کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اور پھر یہ گورے، اور اس کے علاوہ تم بھی اس بہرے کو بھول گئے ہو جس سے سیوائے ہوٹل میں نے چلتے چلتے تمہاری ملاقات کرائی تھی، منیجر یہ بھی تو بیچارہ بہرا ہی ہے۔ چلو بڑا بہرہ سہی۔ ناچ دیکھنا چاہتے ہو تو یہاں بالکونی میں آ جاؤ۔

یہاں بھی اکثریت غیر ملکیوں کی ہے۔ اور خاص کر گوروں کی، تو میرے بھائی آخر انھیں حقارت سے کیوں دیکھتے ہو۔ ذرا سوچو کہ تمہارے ملک کو بچانے کے لئے دور دراز کا سفر طے کر کے آئے ہیں۔ اپنا ملک چھوڑ کر یہاں پردیسی بنے ہوئے ہیں اور پھر وہ دن رات کی جان توڑ محنت کے بعد اب ذرا اپنی روح کو سبکسار کر رہے ہیں۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ اپنے ملک میں یہ سڑکیں صاف کیا کرتے تھے۔ اور یہاں افسر بنے بیٹھے ہیں اور گندے ایسے کہ صبح سویرے بغیر منہ دھوئے اور کلی کئے چائے انڈیل لیتے ہیں اور مُنہ دھوتے وقت جس پانی میں مُنہ دھوتے ہیں اُسی میں تھوک لیتے ہیں۔ خدا کے لئے کسی وقت تو زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں سے مواد حاصل کیا کرو۔ ہر وقت حقیقت پسند بننے سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ پینے کے لئے تم اپنے لئے جو چاہو منگوا سکتے ہو، میں تو صرف لیمن سکوئش پیوں گا۔ وہ سامنے ہندوستانی لڑکی کو ایک گورے کے ساتھ ناچتے دیکھ رہے ہو، میں جانتا ہوں کہ تم اس لڑکی سے واقف ہو، اور اس نے آج تمہارے ساتھ ناچنے کا وعدہ بھی کیا تھا، لیکن پھر ——— پھر کیا تم دیر سے آئے، اور وہ بیچاری اس کے ساتھ ناچنے سے انکار کیسے کر سکتی تھی، ایسا کرنے میں وہ بداخلاق نہ گردانی جاتی۔ اسد اللہ کو جانتے ہو، آدمی تو اول جلول سا ہے لیکن بعض دفعہ پتے کی بات کہہ جاتا ہے۔ ایک روز کہہ رہا تھا کہ "وقت اور لڑکی کسی کا انتظار نہیں کرتے" کا محاورہ اب کچھ فرسودہ سا ہو چکا ہے، اس کی جگہ اب یوں ہونا چاہیئے کہ "بس اور مِس" کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ تم وہاں سیوائے ہوٹل میں اس افرنگی کی آنکھوں کی نیلاہٹ کو بس دیکھے ہی جا رہے ہو، اور چاہ رہے تھے کہ آج کے رقص میں وہ تمہارے ساتھ شریک ہو۔ تو کیوں اس ہندوستانی لڑکی کو موقع نہیں دیتے کہ وہ بھی اس بات پہ فخر کرے کہ اس کا بھی ایک انگریز دوست ہے۔ جس کے ساتھ ناچ کر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے احساسِ کمتری کو کم کر لیتی ہے۔

وہ سامنے سیاہ اچکن میں ملبوس ایک ہندوستانی نوجوان کو دیکھتے ہو۔ اس محفل سے خاصا بیزار دکھائی دے رہا ہے۔ اور لیمن سکوئش کو بھی خون کے گھونٹ سمجھ کر پیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے چہروں سے کچھ واقفیت ہے، اور میں اکثر چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے انسان کے جذبات کی تہ تک پہنچ جایا کرتا ہوں۔ اچھا بھائی اس نوجوان کے متعلق بھی بتاتا ہوں ذرا صبر سے کام لو۔ میرے خیال میں وہ کوئی سیاسی کارکن ہے، جو یہ سوچ رہا ہے کہ ایک طرف تو "ہندوستان چھوڑ جاؤ" "ہندوستان خالی کر دو" کی

قسم کے نعرے ہیں۔ اور دوسری طرف ہماری اپنی معزز خواتین بلا کسی شرم و لحاظ کے ان غیر ملکیوں سے بغلگیر ہوتی ہیں، ہنستی ہیں، مسکراتی ہیں اور قہقہے لگاتی ہیں، اور پھر اس پر فخر محسوس کرتی ہیں، اتنا زبردست تضاد، تو کیا ہوا، میرے بھائی، زندگی بذاتِ خود ایک تضاد ہے، ٹھہرو ذرا، وہی نوجوان کھڑکی سے باہر پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جہاں ایک طوفان اٹھتا ہوا نظر آتا ہے ایسا طوفان جو بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے، اور انھیں سرنگوں کر دے۔ اور تمام خس و خاشاک کو بہا کر لے جائے۔ اس کے اپنے ذہن میں بھی ایک ایسا ہی طوفان اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اور شاید اس کی شدت کو کم کرنے کے لئے ہی کبھی کبھی غیر ارادی طور پر یمین سکولش کے دو چار گھونٹ حلق سے اتار لیتا ہے۔ ارے بھائی اس کے خیالات تو بہت خطرناک ہیں۔ باغیانہ، سو فی صدی باغیانہ، تم نے ہالی وڈ کی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ جن میں ہیرو گھوڑے پر سوار ہاتھ میں پستول لئے اچانک کسی ہوٹل میں وارد ہو جاتا ہے اور ہوٹل کی صفائی کے بعد اپنی محبوبہ کو گھوڑے کی پشت پر ڈال کر غایب ہو جاتا ہے۔ وہ نوجوان بھی کچھ اسی قسم کی باتیں سوچ رہا ہے۔ کوئی یہاں بھی پستول لے کر اچانک وارد ہو جائے، اور بات توسب گوروں کو یہاں سے نکال دے۔ یا پھر ہندوستانی خواتین کو۔ اتنی سردی کے باوجود تمھارے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے ہیں۔ لو یہ یمین سکولش پیو۔ شاید اس سے کچھ فرحت حاصل ہو۔ اس لڑکی کا خیال جانے دو بھائی۔ وہ اس گورے کو چھوڑ کر اب تمھارے پاس نہیں آئے گی۔ تم خواہ مخواہ اپنی جان ہلکان کئے ڈالتے ہو۔ سامنے ان سردار صاحب کو دیکھو جو سردار ہونے کے باوجود بڑے مزے سے سگریٹ پی رہے ہیں اور ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ان کی یورپین بیوی ان کی اس وسیع النظری پر ان کی طرف زیر لب ہنسی پھینک رہی ہے، اور ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے گوشے تک مسکرا رہے ہیں، ذرا دیکھو، غور سے دیکھو، میرے بھائی۔ ہندوستان کی آزادی کی طرف ایک اور قدم اٹھ رہا ہے اور تمام تر تعصب و تنگ نظری رواداری اور اخوت میں تبدیل ہو رہی ہے۔

کافی دیر ہو گئی ہے، اچھا چلتے ہیں لیکن اس لڑکی کو بھی چلتے چلتے دیکھ چلو جس کے بالوں کا سیاہ چمکدار رنگ، اور اس کی آنکھوں کے شربتی ڈورے اس کے مکمل یورپین بننے میں حائل ہیں۔ اس کے چہرے کی ملاحت بھی اس کی رگوں میں ہندوستانی خون ہونے کی شہادت دے رہی ہے ذرا سنو کہ وہ لڑکی اپنے ساتھی سے کیا کہہ رہی ہے "مجھے گھر گئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اور یہ غلیظ ہندوستانی میں یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ پیارے اب کے تو تم مجھے خود ساتھ لے چلو گے نا۔ پچھلی مرتبہ بھی تم مجھے چھوڑ گئے تھے۔ میں کئی دن روتی رہی اور اب کے تو تم مجھے چھوڑ بھی نہیں سکتے ایک اور ننھی سی جان۔ بے تمھیں مجھے ساتھ لے جانے پر مجبور کرے گی۔" اور اس کے ساتھی کا چہرہ دودھ کی طرح سفید اور اس کی آنکھیں بے نور ہوتی جا رہی ہیں۔ لو سنو منیجر ایک آخری اعلان کرنے کیلئے کھڑا ہوا ہے کہ آج کی آمدنی کا کچھ حصہ وائسرائے کے قحط زدہ علاقوں کے امدادی فنڈ میں دیا جائیگا ہیر ہیر، تالیاں بج رہی ہیں اور نعرے لگ رہے ہیں۔ لو بس اور کیا چاہتے ہو، آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام، تم ان لوگوں کو کیسے بے حس کہہ سکتے ہو، اور انھیں کیسے ٹوڈی اور غدار گردانتے ہو؟ ہر انسان کے کام کرنے کا ایک حلقہ ہوتا ہے اور وہ اسی میں رہ کر کام کرنا چاہتا ہے۔ رات کافی بیت گئی، چلو اب چلیں۔ کیا کہا، رکشا لے لیں، میں تمھارے چہرے کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ جو جذبات سے بالکل عاری دکھائی دے رہا ہے۔ رکشا پر سوار ہونے سے تو بہتر ہے کہ بھائی مجھے کھڈ میں دھکا دے دو۔ وہاں کم از کم اپنے ضمیر پر ملامت کرنے والی کوئی چیز تو نہ ہو گی۔ چلو پیدل چلتے ہیں۔ دیکھو کتنا سہانا سماں ہے۔ چاند بھی نکل آیا ہے، اور اپنی ڈھلی ہوئی روشنی ہر ایک پر یکساں پھینک رہا ہے۔ اس بڑے ہوٹل پر بھی اور پلیگ زدہ چیونٹیوں کی طرح دکانوں کے چبوتروں پر پڑے ہوئے رکشا والوں پر بھی۔

یزدانی ملک

قطعات تاریخ!

جن کا ہر مصرع تاریخی ہے

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

۱۳۵۷ھ	سنتا ہوں اے ڈاکٹر اقبال یہ	اُٹھ گیا تو صدرِ نامی جانِ ہند	۱۳۵۷ھ
۱۳۵۷ھ	تو ہی تھا اقبال زیرک ہند میں	تجھ سے تھی اے جانِ شیریں شانِ ہند	۱۹۳۸ء
۱۳۵۷ھ	تو ہی اے اقبال تھا علمِ مُراد	تو ہی تھا اے محترم قربانِ ہند	۱۹۳۸ء
۱۹۳۸ء	درحقیقت تو ہی تھا مقصودِ بزم	فی الحقیقت تو ہی تھا پُرسانِ ہند	۱۹۳۸ء
۱۳۵۷ھ	تو ہی تھا اک ہند میں دورِ عمل	تجھ سے تھی اے عالم آرا آنِ ہند	۱۳۵۷ھ
۱۳۵۷ھ	تجھ کو اے اقبال تھا ادراکِ قوم	تو ہی تھا دمسازِ دیں درمانِ ہند	۱۳۵۷ھ
۱۳۵۷ھ	شادا لحاصل لکھے کیا تیرے وصف	تو ہی تھا بس روحِ عالم جانِ ہند	۱۳۵۷ھ

تاریخی سلام

(تیرہ سو سالہ یادگار حسینی میں)

۱۳۶۰ھ	السلام اے یارِ اُمت کامگارِ کربلا	مالک الملکِ امامت رازدارِ کربلا	۱۳۶۰ھ
۱۳۶۰ھ	کر گئے ہاں شوق سے طے نامدارِ کربلا	تھی عجب سنگِ بلا وہ رہگذارِ کربلا	۱۳۶۰ھ
۱۳۶۰ھ	آگئے وہ روح پرور گلشن زہرا کے پھول	بن گیا اب فطرتِ گل سبزہ زارِ کربلا	۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — میں کہوں تو کیا کہوں کچھ بات کہنے کی نہیں — لُٹ گئی بس دوپہر میں کل بہارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — حکمِ حق سے سب ہوئے حق پر فدا چھوٹے بڑے — دیکھنا کیا جانفزا تھی کارزارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — کم سنی میں بھی یہ ہمت چشمِ حق بیں دیکھنا — آگئے قاسم بھی ہونے کو نثارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — اہلِ ایماں خود سمجھ لیں یہ ہے رازِ معنوی — ہے جہاں میں موجِ رحمت یادگارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — تیرے قدموں کی مدد سے بڑھ گیا ہے اے حسینؑ — آج دنیائے قناعت میں وقارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — یوں تو ہونے کو ہوئے ہیں اور بھی انساں شہید — آپ ہیں اصلِ شہادت رازدارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — یہ شہیدِ کربلا کی ہے کرامت دیکھنا — جابجا خود ہو رہی ہے یادگارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — کیا کہیں ہوتا ہے کتنا بارِ اندوہ والم — سُنتے ہیں جب پُر بلا ہم حالِ زارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — میں اُسے رکھ لونگا دل میں حسرتا دل کیلئے — مجھکو مل جائے کہیں بھی کوئی خارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ — مرحبا اے شاد یہ حسنِ عقیدت ہے مزید — دل میں ہے یادِ حسینی جاں نثارِ کربلا — ۱۳۶۰ھ

تاریخی نعت

(جو ۱۳۶۰ھ میں بموقعہ عید میلاد لکھی گئی)

۱۳۶۰ھ — مبارکباد وہ مطلع لکھا نعتِ پیمبر میں — الٰہی شرم رکھنا اب مرے مطلع کی محشر میں — ۱۹۴۱

۱۳۶۰ھ — ازل سے بعثتِ احمد کا سودا ہے مرے سر میں — اسی پر ناز ہے لاریب مجھکو بزمِ محشر میں — ۱۳۶۰

۱۳۶۰ھ — نبی ہیں جو ہیں جلوے رحمتِ شانِ الٰہی کے — وہ ہیں ہر نوع بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ میں — ۱۹۴۱

۱۳۶۰ھ جھکے جاتے ہیں سرِ شاہانِ عالیجاہِ عالم کے — اثر کتنا ہے دیکھا نعرۂ اللہ اکبر میں ۱۹۴۱ء

۱۹۴۱ء طوافِ روضۂ والا کیا کرتے ہیں دائم — نہیں ہیں بے محل شمس و قمر دن رات چکر میں ۱۹۹۸ بکری

۱۳۶۰ھ کھڑا تھا با ادب میں تو لوائے حمد کے نیچے — شفاعت ڈھونڈنے آئی کہاں بازارِ محشر میں ۱۹۴۱ء

۱۳۶۰ھ دلِ مسکیں کی میرے آرزو بیشک جبھی نکلے — ڈبوآؤں میں اک دن جا کے سیدہا حوضِ کوثر میں ۱۹۹۸ب

۱۹۴۱ء مرادعویٰ ہے ان سے آتشِ دوزخ بجھا دونگا — بھرے ہیں قلزمِ اشکِ ندامت دیدۂ تر میں ۱۹۹۸ ب

۱۳۶۰ھ کبھی تو جا ہی پہنچوں گا درِ پاکِ مدینے تک — لکھا ہوگا اگر اے شادؔ یہ میرے مقدر میں ۱۳۶۰ھ

تاریخ وفات نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی

۱۹۴۵ء بُود سائل بے تکلف شاعرِ نازک خیال — بود آں کنزِ فصاحت زینتِ حسنِ زبان ۱۳۶۴ھ

۱۳۶۴ھ بود آں اے چشم حق بیں شرحِ اوصافِ کلام — بود آں شکلِ قدامت یادگارِ رفتگاں ۱۹۴۵ء

۱۹۴۵ء درحقیقت بود آں رکنِ ادب گنجِ سخن — بُد او نجمِ معانی شمعِ بزمِ شاعراں ۱۳۶۴ھ

۲۰۰۲ ب بود آں در بادہ خوارانِ معانی دستگیر — بود آں در محفلِ دورِ ادب پیرِ مغاں ۱۹۴۵ء

۱۳۶۴ھ از حیاتش بود افزوں رونقِ حسنِ ادب — از وفاتش رفت لطفِ حسنِ معنیٰ بیاں ۱۹۴۵ء

۱۳۶۴ھ آہ شد آں جانِ دہلی رکنِ بزمِ شاعری — حیف شد مشہورِ دوراں سائلِ شیریں بیاں ۱۹۴۵ء

۱۳۶۴ھ تا کجا اے شادِ محزوں آہ و نالہ دل شکن — رفت از دارِ حزیں آں عرفیٔ ہندوستاں ۱۹۴۵ء

۱۹۴۵ء من زہر مصرع بگفتم بے گماں سالِ وفات — سائلِ شیریں زباں شد شمعِ ایوانِ جہاں ۱۳۶۴ھ

سید انور علی شادؔ

سنتری

میں اپنے فرائض کے سلسلے میں رات کو جس کمرے میں سوتا ہوں وہاں حفاظت کے لئے ایک سنتری پہرہ پر رہتا ہے۔ایک رات کا ذکر ہے۔ جاڑوں کی طول طویل اندھیری رات چاروں طرف ایک مسلسل سکوت۔ میں لیٹا ہوا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کتاب دلچسپ تھی، لیکن نہ معلوم میری طبیعت اس میں کیوں نہ لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے میز پر رکھ دیا۔کوئی کمرے میں آیا۔ کواڑ کھلے۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا داخل ہوا، اور معلوم ہوا کسی نے برف کی ہزاروں سوئیاں چہرے میں گھونپ دیں۔ میں نے کمبل کو گردن تک اوڑھ لیا اور داہنی طرف کروٹ لے لی۔

بارہ کا گجر بولا۔ پہرہ تبدیل ہوا۔ اور دوسرا پہرہ دار اپنی جگہ آکر سلام کرکے چپکا کھڑا ہو گیا۔ میں سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا، لیکن نیند کوسوں دور تھی، میں نے پھر کروٹ لی اور پہرہ دار کی طرف دیکھا، وہ بالکل خاموش کھڑا تھا، چہرہ اداس اور غمگین، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے میز پر سے سگریٹ کیس اٹھا کر ایک سگریٹ نکال کر جلایا۔ تھوڑی دیر تک منہ سے دھوئیں کے چھلے بنا کر ہوا میں اڑاتا رہا۔ پھر وقت گزارنے کے لئے پہرہ دار کی طرف دیکھا۔

"کتنی سرد رات ہے!"

اس نے کچھ اور جواب نہ دیا صرف "جی" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔ کچھ دیر یونہی سکوت مسلط رہا۔ میں نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

"ہاں بھائی، تمھارا نام کیا ہے؟ شاید اسی بھلی میں آئے ہو۔"

وہ بولا۔"جی!...... نام تو سب خدا کے ہیں، یہ دنیا جگہ ہی ایسی ہے کہ کسی کو اپنے پرائے کی ٹھیک پہچان نہیں — بھائی بھائی کو، باپ بیٹے کو، بیٹی ماں کو، دوست دوست کو غرضکہ ایک دوسرے کو کوئی نہیں پہچانتا۔ البتہ بطور نشانی نام رکھ لئے ہیں۔ تاکہ دنیا کے اتنے بڑے میلے میں اگر کوئی اپنے مطلب سے کسی کو پکارے تو "او بھائی" یا "او ہوت" کہنے کے بجائے اس کو کسی مخصوص نام مثلاً مقصود خاں، شام گوپال وغیرہ کہہ کر پکارے تاکہ وہی آئے جس سے مطلب ہو۔ غرض کہ یہ دنیا محض مطلب کی ہے۔ دنیا ہے اور مطلب، مطلب ہے اور دنیا!"

میں اس کا یہ گہرا فلسفہ سن کر حیران رہ گیا۔ اور یہ کہہ کر وہ گردن نیچی کئے، رائفل ہاتھ میں لٹکائے اس کونے سے اس کونے تک آہستہ آہستہ مارچ کرتا ہوا چلا گیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس آہستہ سے بھری، جو معلوم ہوتا تھا اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی اور میرے دل میں اتر گئی۔ جب وہ تین چار منٹ ٹہل کر اپنی جگہ پھر کھڑا ہو گیا۔ تو میں نے کچھ دیر کے بعد کہا۔

"تم نے تو نہ معلوم کیا کیا کہہ دیا، میں نے تو تمھارا نام پوچھا تھا۔"

"میاں نام ہی کیا۔ جب کوئی اس دنیا میں نام پیدا ہو تو نام بھی ہو۔ بس سنتری ہی سمجھ لیجئے۔ اگر آپ کسی مطلب سے پکاریں تو یہی نام کافی ہوگا۔"

"کیوں کیا تمھارے والدین نہیں ہیں نہ اور کوئی رشتہ دار؟ شادی تو ہو گئی ہوگی تمھاری۔"

"ماں باپ کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ رہی شادی تو شادی کرکے کیا لینا ہے۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی جائیں گے۔ اب اس کی تمنا ہی نہیں رہی۔ لڑائی پر گیا تھا اور بچ کر چلا آیا۔ اچھا ہوتا اگر کوئی گولہ میرے سر پر پھٹ پڑتا۔ مگر ہم جیسوں سے تو موت بھی پاس آتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

"بہت دکھی معلوم ہوتے ہو تم۔ ذرا کچھ میں بھی تو سنوں۔"

"کیا کیجئے گا سن کے میرے دکھے ہوئے دل کی کہانی کو۔ آپ اسے قصہ سمجھ کر آج سنیں گے کل بھول جائیں گے، یا زیادہ سے زیادہ افسانہ سمجھ کر لکھ ڈالیں گے، یہی تو کر سکتے ہیں نا آپ۔ میرا زخم بجائے بھرنے کے اور ابھرے گا۔"

"نہیں سنتری! مجھے تمھارے ساتھ ہمدردی ہے۔ شاید تمھاری آپ بیتی سے میں کوئی سبق لے سکوں۔"

"میاں کس خیال میں پڑے ہو۔ چھوڑیئے بھی ان باتوں کو۔ رات زیادہ ہونے کو آئی۔ اب آرام کیجئے۔"

"تمھارا حرج کیا ہے۔ لیکن بھائی نہیں سنانا چاہتے تو نہ سناؤ۔"

"اگر آپ کا حکم ہے تو یونہی سہی .... اچھا نہ کیجئے گا .... خیر۔ آپ کی مرضی۔"

"میں گاؤں کے سکول کے چھٹے درجہ میں تھا کہ ماں کا ہیضہ سے انتقال ہوگیا۔ باپ تو بچپن میں ہی منہ موڑ چکا تھا جس کی یاد کا دھندلا سا نشان باقی ہے۔ ماں نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیل کر پالا پوسا، تعلیم دلائی، لیکن وہ بھی نہ رہی۔ عزیزوں نے بات تک نہ پوچھی۔ ٹوٹا پھوٹا جو سامان تھا وہ سب بک بکا گیا۔ صرف میں بدنصیب دربدر کی ٹھوکریں کھانے کو رہ گیا۔ میرا دنیا میں صرف ایک دوست تھا۔ گاؤں کے مہاجن کا لڑکا۔ اس نے ہر چند چاہا کہ میں اس کے ہاں رہ جاؤں۔ اس کے باپ کا کاروبار وسیع تھا۔ اس میں میرے لئے گنجائش ہو سکتی تھی۔ اس نے یہاں تک کہا کہ کھانے پینے کے علاوہ وہ ایسا انتظام کرا دے گا کہ میری پڑھائی بھی جاری رہے۔ لیکن .... میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ ہاتھ جو کسی کے سامنے نہ پھیلا ہو ایک دوست کے سامنے دراز ہو۔ اور اس کی نگاہوں میں میری سبکی ہو۔

میں نے سکول چھوڑ دیا۔ تھوڑی بہت مزدوری کر لیا کرتا تھا۔ اس کے بدلے میں اناج مل جاتا تھا اور میں اُلٹی سیدھی تھوپ کر کھا لیتا۔ کبھی کبھی تھوڑے پیسے بھی ہاتھ آ جاتے۔ غرضکہ دن گزرتے گئے اور میں مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتا رہا۔ نوکری بھی تلاش کی۔ لیکن اس مہاجن کے علاوہ گاؤں میں اور کوئی اس قابل نہ تھا کہ مجھے نوکر رکھتا۔

ایک دن میں ایک کسان کے مکان میں جوار کے گٹھوں کا بوجھ لے کر گیا۔ بوجھ صحن میں رکھنے کو تھا کہ کسی نے نہایت باریک آواز سے کہا۔ "اچھا ہوتا اگر اس کو چھپر کے اندر رکھ دیتے۔" میں نے مڑکر دیکھا، کوئی پندرہ برس کی ایک لڑکی کوٹھے پر گاگر رکھے بڑے ناز سے کھڑی کہہ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ شرما سی گئی۔ اور دروازے تک آہستہ آہستہ جا کر ایک دم تیر کی طرح بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ تھوڑی دیر تک اس کے جھانجھن کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ میں نے بوجھ چھپر کے اندر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ راستہ میں پنگھٹ پڑتا تھا۔ چرخ کی رُوں رُوں کی آواز دُور سے سنائی دے رہی تھی۔ میں نے پنگھٹ کی طرف دیکھا۔ لڑکیاں پانی بھر کر واپس جا رہی تھیں۔ جب میں وہاں پہنچا تو مینڈ پر وہ اکیلی کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے پیاس محسوس ہونے لگی۔ میں دھیرے دھیرے اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مدھم سُروں میں الاپ رہی تھی۔ "آ مورے شام سانجھ بھئی!" وہ ڈول کھینچ کر مڑی۔ بین گر یا میں پانی ڈالتے ڈالتے جھجک سی گئی۔ پھر بولی۔ "پانی پیو گے کیا؟ لو پیو، ہاتھ بڑھاؤ۔" میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیکن آنکھیں چار ہوتے ہی اس کی

نگاہیں نیچے جھک گئیں۔ پانی بہت میٹھا اور برف کی مانند سرد تھا۔

اس کے بعد میں اکثر اسی پنگھٹ پر اپنی پیاس بجھاتا۔ دن گزرتے گئے، میرے دل میں ایک نامعلوم سی کسک ہر وقت رہنے لگی۔ وہ بھی جب مجھے دیکھتی غنچہ کی طرح مسکرا دیتی۔ پھول کی طرح بکھر جاتی۔ کبھی کبھی ہم دونوں جامن کے درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔ جب وہ دوپہر کو اپنے باپ کی روٹی لے کر کھیت کو جاتی، میں اکثر اس کے ساتھ کھیت تک باتیں کرتا ہوا چلا جاتا۔ جس دن اتفاق سے مجھے دوپہر کو آنا نہ ہوتا، وہ روٹھ جاتی، مجھے اس کے منانے میں بڑا لطف آتا۔ وہ اٹھلاتی ہوئی آتی اور ایک شان بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھ جاتی۔ میں اس کا دامن پکڑ لیتا، وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی اور کہتی "ہٹو بھی، تم بڑے وہ ہو۔ مرد ذات ہو نا!" میں کہتا "معاف کر دو۔ اب روز آؤں گا۔" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑتی اور ہم پھر گھل مل جاتے۔

یوں ہی دن گزرتے گئے، ہم دونوں کی محبت ترقی کرتی گئی۔ لیکن نہ تو کبھی اس نے اور نہ ہی میں نے اس کا اظہار کیا۔ ہماری روزانہ کی ملاقاتیں جاری رہیں۔

ایک دن صبح کو وہ پنگھٹ پر پانی بھرنے نہ آئی۔ میرے دل میں طرح طرح کے شبہات اٹھنے لگے.. کیا وہ بیمار ہے؟ یا کسی نے اس کو مجھ سے ملتے دیکھ لیا ہے.. یا کچھ اور... نہ جانے کیا بات ہے... شاید کوئی کام ہو گیا ہو۔ مگر پہلے کبھی تو ایسا نہیں ہوا، غرض اسی طرح کی ہزاروں باتیں میں اپنے دل سے کرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی، وہ نہ آئی۔ دن ڈھلنے لگا، سائے لمبے ہو گئے۔ سورج ڈوب گیا۔ کھیتوں سے کسان بھاری ہل اپنے کاندھوں پر رکھے دن بھر کی محنت سے تھک کر واپس ہونے لگے۔ گائیوں، بکریوں کے ریوڑ چراگاہوں سے اپنے اپنے تھان پر لوٹ کر آنے لگے۔ اندھیرا ہو گیا۔ رات کی سیاہی ہر طرف پھیل گئی۔ اکا دکا تارے ٹمٹمانے لگے۔ کتوں، گیدڑوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کی ملی جلی آوازیں ایک خوفناک سماں پیدا کرنے لگیں۔ میں تھک کر پریشانی کے عالم میں گھر کو واپس چلا گیا۔ تمام رات کروٹیں بدلتے آنکھوں میں کاٹی، نیند نہ آئی، صبح ہو گئی، میں جامن کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ کسان اپنے کھیتوں کو چلے گئے۔ دھوپ پھیل گئی، گاؤں کی لڑکیاں پنگھٹ پر آئیں اور پانی بھر کر واپس چلی گئیں، لیکن وہ نہ آئی، دن خوب چڑھ گیا۔ دوپہر ہو گئی، بھوک پیاس سے میری زبان باہر نکلی پڑتی تھی، آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں۔ پپوٹے بوجھل ہو گئے۔ تمام بدن درد سے ٹوٹا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے آنے کی آس اب بھی بندھی ہوئی تھی۔

جھن جھن کی آواز سے میں چونک پڑا۔ وہ آ رہی تھی، بہت دھیرے دھیرے۔ اُس کی چال میں شوخی نہ تھی، قیامت کی سی آمد نہ تھی، آج وہ اٹھلاتی ہوئی نہیں آ رہی تھی، اس کی چال میں تھکن سی تھی، چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔ منہ ذرا سا نکل آیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر میرا دل بیقرار ہو گیا۔ وہ میرے قریب آ کر بے جان پتھر کے مورت کی طرح بے حس و حرکت خاموش کھڑی ہو گئی، میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ میرے دل کی دنیا میں طوفان برپا ہو گیا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے صبر کا پیالہ چھلک پڑا۔ آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی، نڈھال ہو کر اس نے اپنا سر میرے کاندھے پر ٹیک دیا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے، اتنی پریشان کیوں ہو؟" میرے دل کی حالت اُس وقت خدا ہی جانتا تھا۔ وہ بولی — "پرسوں رات باپو ماں جی سے کہنے لگے" للّی کا بیاہ کر دینا چاہیے۔ اور میں اپنی شاجادی (شہزادی) کا بیاہ ایسے سے کروں گا جو ہزار روپیہ نقد، ایک کھیت اور پندرہ جانور دے گا۔" میں یہ سب لیٹی ہوئی سُن رہی تھی۔ ماں نے کہا۔ "میں تو ابھی چار پانچ سال تک للّی کی شادی نہ چاہوں گی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، ذرا ہوش کی باتیں

کرو ... " پھر نہ معلوم اور کیا کیا باتیں ہوئیں، میں زیادہ نہ سن سکی۔ بھلا تمھارے پاس ......" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔ دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ اپنی بیکسی اور بے بسی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ مجھے اپنی قسمت پر رونا آنے لگا۔ تمام عمر اگر جوڑوں تب بھی تو اتنی دولت جمع نہ ہو سکتی تھی۔ کیا کروں، کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ کون ہے جو مدد کرے ماں تھی وہ مر گئی، باپ تھا وہ۔ ہاں ایک دوست ضرور ہے۔ لیکن اس سے اتنی بڑی رقم کیسے مانگوں جس کی واپسی کی کوئی شکل نہیں غرض کہ جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گیا، اور وہ تھوڑی دیر بعد واپس چلی گئی۔

میں نے دوسرے روز مصمم ارادہ کر لیا کہ لڑائی پر چلا جاؤں اور ضلع میں جا کر اپنا نام لکھا دیا۔ تین چار دن کے بعد جب میں واپس آیا اور دیکھا تو وہ روٹی لے کر کھیت کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے آواز دی، اس نے مڑ کر دیکھا لیکن بغیر رُکے آگے بڑھ گئی، میں نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کہاں رہے اتنے دن؟" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے جواب دیا "فوج میں نام لکھا لیا ہے۔ سوچا چلتے وقت تم سے بھی ملتا چلوں۔ کچھ دنوں بعد بہت سا روپیہ لیکر آ جائیں گے۔ ہزار کیا پانچ ہزار بھی اگر کوئی کہے گا تو نکال کر دکھا دیں گے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے اور وہ کچھ کہے بغیر چل دی۔ گو ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جب میری آنکھوں سے بالکل اوجھل ہو گئی تو میں چلا آیا۔

چلتے وقت میرے دوست نے بہت سمجھایا اور کہا جو تم کہو میں تمھارے لئے کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ اس نے وجہ پوچھی۔ میں نے اپنے اس عزیز دوست پر بھی جو ہر طرح میری مدد کرنے کو تیار تھا اپنا راز محبت ظاہر نہ کیا اور روانہ ہو گیا۔

میں چلا گیا، سمندر پار، دُور بہت دُور۔ افریقہ۔ وہاں طرح طرح کی تفریح کا سامان مہیا تھا کھانے، پینے، پہننے اوڑھنے غرض کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ لیکن میرا دل کسی بات میں نہ لگتا۔ ہر وقت گاؤں کی یاد۔ پنگھٹ کی ملاقاتیں، جامن کے درخت تلے کی صحبتیں، یہ سب باتیں یاد آتیں اور مجھکو آٹھ آٹھ آنسو رُلاتیں۔ لیکن پھر جب یہ خیال آتا کہ ایک دن لوٹ کر جاؤں گا۔ ہزاروں روپیہ میرے پاس ہوگا اور اس سے شادی کروں گا تو تمام افکار دُور ہو جاتے اور میرے دل کو کچھ تسلی سی ہو جاتی۔

ساڑھے تین سال کے بعد میں اپنے گاؤں کو واپس لوٹ رہا تھا۔ گاؤں سٹیشن سے ایک میل پر تھا۔ قلی اسباب اٹھائے میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میرے بٹوے میں روپیہ اور نوٹ کافی تعداد میں بھرے تھے۔ میں خوش تھا اور بہت خوش۔ میرا دل سینے میں بلیوں اچھل رہا تھا۔ ہزاروں اُمیدیں، لاکھوں تمنائیں، میرے دماغ میں چکر لگا رہی تھیں، اب وہ مجھے مل جائے گی۔ میں اس کی ہر خواہش پوری کر دوں گا۔ اس کے والدین کو اپنے ماں باپ سمجھوں گا۔ ان کی اتنی خدمت کروں گا کہ ان کا رواں رواں دعا دے۔ ساس کو بہترین کپڑے بنوا دوں گا۔ اور عمدہ سے عمدہ زیور .... انہی خیالات میں گم میں جامن کے درخت ..... اپنی محبت کی واحد یادگار کے نیچے سے گزرا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اس کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔ میں نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "ہوں!" کہہ کر اس نے پھر اس طرح کہنا شروع کیا۔ "میرا دوست اپنے گھر کے دروازے پر ایک چھوٹے خوبصورت بچے کو گود میں لئے کھڑا تھا۔ اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ اور بے اختیار میری طرف دوڑا اور بچے کو زمین پر بٹھا کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"ارے میرے یار! پہچان میں بھی تو نہیں آتے۔ خوب جچ رہے ہو اس وردی میں۔۔۔۔!" وہ محبت بھرے لہجہ میں بولا۔
بچے کی طرف دیکھ کر میں نے ہنس کر پوچھا "یہ کس کی حماقت ہے؟" وہ مسکرایا اور بولا۔ "آؤ چلو اپنی بھاوج سے تو مل لو" اُس نے
بچے کو پھر گود میں اٹھالیا اور میں اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا اس کے ساتھ اس کے مکان میں داخل ہوا۔ وہاں دالان
میں ایک عورت صاف ستھرے کپڑے پہنے پکانے کے لئے ترکاری صاف کر رہی تھی۔ بھاوج کو مُنہ دکھائی دینے کے لئے میں نے کچھ نوٹ
بٹوے میں سے نکالنے چاہے، لیکن وہ بولا "پہلے صورت تو دیکھ لو لینا دینا بعد میں ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔ انھیں سلام کرو، یہ میرے بڑے
بھائی ہیں"۔ اس نے دلھن سے کہا۔ میں صورت دیکھنے کو جھکا۔ یکا یک میرا دل ڈوب گیا۔ ہاتھ تھرتھرائے۔ بٹوا ایک جھنکار کے
ساتھ زمین پر گر پڑا۔ قدم ڈگمگائے، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں چکر کھا کر پلنگ پر گر پڑا"۔
اس کی آپ بیتی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن میں پھر بھی ہمہ تن گوش تھا۔ سگریٹ سارا جل گیا اور میری انگلیوں کو اس کی حرارت
محسوس ہونے لگی۔ کمرے میں موت جیسا سکوت طاری تھا۔ "آئز رائٹ" کی آواز سے ہوا میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ میں چونک
پڑا۔ گھنٹے نے ٹن ٹن دو بجائے۔ سنتری کی بدلی ہو رہی تھی، وہ چپکا سر جھکائے، آنکھ میں آنسو بھرے گارڈ افسر کے ساتھ مارچ کرتا
ہوا چلا گیا۔ دیر تک اس کے بھاری بوٹوں کی آواز میرے کانوں میں آتی رہی۔۔۔۔۔۔!!

خواجہ تہور حسین

غزل

رعبِ ساقی دل پہ ایسا چھا گیا
میری توبہ کو پسینہ آگیا

خوب ٹالا اس تجاہل کیش نے
میرا قصہ ہو گیا آیا گیا

کیف پرور تھا وہ جلوہ کس قدر!
روح پر مستی کا عالم چھا گیا

اس دلِ ایذا طلب کا کیا علاج
لطفِ پیہم سے بھی جو اُکتا گیا

پھوٹ نکلے ہیں مری آنکھوں سے اشک
کیا کسی پہ ٹوٹ کر دل آ گیا

ہجر میں سیرِ چمن بھی شاق ہے
بوئے گل سے ناک میں دم آگیا

ہو گئی جس سے محبت ہو گئی
آگیا جس پہ مرا دل آگیا

مختصر سی ہے یہ گل کی داستاں
شاخ پر جھوما، کھلا، مُرجھا گیا

اس گلِ رعنا کے جلوے کا خیال
قیس! میری رُوح کو مہکا گیا

امر چند قیس

کلکتے کا جو ذکر کیا......

آج اُفقِ زار پہ پھر رنگِ شفق لہرایا
خون کی دھوپ میں اشکوں کے ستارے چمکے
موت کے رقص میں تحلیل ہوئے زہد و گناہ
آتشِ کفر سے مذہب کے اِدارے چمکے
شعلے اُن چہروں کو پہچان رہے ہیں جن سے
چاند کے آئینے تاروں کے غبارے چمکے

ہاں بہے خون کہ اجداد کی میراث ہے یہ
بربریت کی حفاظت ہے تمہارا حصّہ
ننگِ اسلاف نہیں تم کہ تمہیں یاد نہ ہو
آج دوہراؤ ہلاکو کا پُرانا قصّہ

اپنے بچوں کا لہو پی کے جیئے ہیں آبا
زندہ رہنے کے لئے آج تمہیں پینا ہے
آج کُتّوں کی طرح نوچ کے کھا جاؤ انہیں
کیوں؟ بُرا کیا ہے؟ جیو، تم کو یونہی جینا ہے

کل یہی راگ یہی نغمہ تھا یورپ کیلئے
چاندنی ڈھونڈتی پھرتی تھی شبستانوں میں
کوئی انسان — کسی شہر — کسی جنگل میں

آہ انسان! کہ انسان ہے افسانوں میں
چاندنی ڈھونڈتی پھرتی تھی ملا کیا اس کو
جسم جُھلسے ہوئے "ذرّے" کے گریبانوں میں

تم نے کب مل کے محبت کا چمن سینچا تھا
خون میں اور ابھی تیغِ حقارت کو بجھاؤ
کوئی زندہ نہ رہے۔ عورتیں بوڑھے بچّے
کوئی زندہ رہے! کیوں زندہ رہے؟ تیغ اٹھاؤ

کل یہی عورتیں بنتی تھیں ستی، آج نہ ہوں
زندہ ان بچّوں کو تم گاڑ دیا کرتے تھے
یہی ایوان تھے روما میں جنہیں آگ لگی
اور تم ساز لئے رقص کیا کرتے تھے

آج ان نعشوں پہ تم رقص کرو شیر ہو تم
تم پہ انسان کا اطلاق ہو، ناممکن ہے
ہاں خدا ساتھ ہے معبد کے منارے توڑ دو
کل تو تھا بھوک کا دن۔ آج تمہارا دن ہے،
آج ہر گھر کا مقدر ہے چراغاں ہونا

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا (غالب)

یوسف ظفر

ایک ملاقات

دلِ حزیں کی فضا جن سے جاگ اُٹھتی تھی
تلاشِ منزلِ گم کردہ میں ہے محو ہنوز

فضا میں کھو گئیں رعنائیاں نگاہوں کی
کھُلی جو آنکھ ہوائے نشاط یوں بدلی

تری سپردگیِ بیکراں کی آگاہی
وہ دل پذیر جزا و سزا کے ہنگامے

تھکے ہوئے سے تنفّس پہ ہے فسانۂ دوش
غم و نشاط کے کھلتے ہوئے دریچوں سے

یہ سرکشی بھی گوارا نہیں تجھے شاید
بس اک نگاہ تامّل وفا کی بات نہیں

حکایتیں وہ جنونِ وفا کی خواب ہوئیں
وہ آرزوئیں جو محرومِ آب و تاب ہوئیں
وہ ایک بابِ تمنا جو تجھ پہ بند ہوا
وہ یاد جس سے عبارت ہے زندگی تیری
وجود اس کا مری جان زہر خند ہوا
ترے پیامِ نہاں بھی ہیں جرم اب تیرے
تبسّموں کے جنازے ہیں اور لب تیرے
ہر اک نفس ہے ترا مرگِ بیکسی کی دلیل
تصوّرات کی دُنیا میں خاک اُڑتی ہے
ہوا کی زد پہ ہے خوابوں کی ضو فشاں قندیل
جو قرب و بُعد کے احساس کو مٹا نہ سکی
نگاہ کھیل کے جن سے سکون پا نہ سکی
جفائے عمرِ گریزاں پہ خندہ زن ہے ابھی
گزشتہ شام و سحر کی اداس ویرانی
تری حیاتِ جنوں خیز کا کفن ہے ابھی
یہ جاگتا سا بدن ہے کہ محوِ سرگوشی
پکارتی ہے کسی کو تری یہ خاموشی،
نگاہ اب کوئی جادو جگائے یا نہ جگائے
وہ یادگاریں ہیں نم دیدہ اور خاک بسر
جنوں کے مدفنِ پارینہ پر چراغ جلائے
ہم آج اپنی خلاؤں پہ ہنس بھی سکتے ہیں
اُداسیوں کی فضاؤں پہ ہنس بھی سکتے ہیں
یہ شام شہر کے دامن میں ڈوب جائے گی
بہت دنوں میں یہ فرصت جو راس آئی ہے
خیالِ رہبر و رہزن میں ڈوب جائے گی

مطبوعات

ہیّا ہیّا از سید مطلبی فرید آبادی۔ بعض ادیبوں کو سیاست ادب کا دامن چھڑا دیتی ہے۔ اور بعض سیاست کو ادب کے دامن میں سمو دیتے ہیں۔ مطلبی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ تین قسم کی نظموں پر مشتمل ہے ٹھیٹ بول چال کی اُردو میں شاعر نے مزدوروں کی کشاکش کے چند پہلو پیش کئے ہیں۔ اس کے بعد بعض ایسی سیاسی نظمیں ہیں جو مستقل تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور شاعر کے انداز نظر کی شاہد ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں ہنگامی اور وقتی نظمیں ہیں جو خاص سیاسی حالات پر روشنی ڈالتی ہیں اور تاریخ دان حضرات ہی کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں، ان میں وہ نظمیں بھی ہیں جو غیر ملکی اور بالخصوص روسی تاریخ سے متعلق ہیں۔ ابتدائی نظمیں جو ٹھیٹ اُردو میں ہیں یقیناً اُردو ادب میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں ہیّا ہیّا کشتی کھینچنے والے مزدوروں کا گیت اور " جیل چلا ہے دیش سپاہی رانی تجھ کو چھوڑ " بہت مقبول ہو چکی ہیں۔ ان نظموں کی زبان مزدوروں کی زبان ہی کو نہیں ان کے ماحول اور اسلوب کو بھی پیش کرتی ہے۔ سرورق کی پشت پر راجندر سنگھ صاحب بیدی نے مطلبی کو اُردو کا سب سے پہلا عوامی شاعر قرار دیا ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں، اس لئے کہ اس میدان میں نظیر اکبر آبادی آج سے سوا سو سال پہلے آ چکا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان نظموں کا شاعر نظیر سے عوامیت کے اعتبار سے پیچھے نہیں؟

مجموعہ ہر اعتبار سے ایک نہایت خوبصورت پیش کش ہے۔ جس سے ناشران کے حسنِ ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ پتہ:۔ سنگم پبلشرز لمیٹڈ لاہور

۱۹۴۵ء کی بہترین نظمیں مرتبہ حلقہ ارباب ذوق لاہور۔ "اس مجموعے میں شامل ہونے والی نظموں سے ان کے لکھنے والوں کی آمد و رفت اور ہست و بود کا بھی پتہ چلتا ہے اور ہم انسانی کاوشوں سے اُن کے عروج و زوال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔" یہ ہے اس مجموعے کا جواز جو قیوم نظر صاحب نے پیش لفظ میں دیا ہے۔ ۱۹۴۱ء سے اب تک حلقہ ارباب ذوق نے ہر سال اسی نوعیت کا ایک مجموعہ پیش کیا ہے۔ جس کی مقبولیت کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ بہت سے تجارتی اداروں نے تقلید کے طور پر مجموعہ سازی شروع کر دی لیکن جو کاوش اور بالغ نظری اس مجموعے سے ٹپکتی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ اس مجموعے میں ہمیں نہ صرف نئے انداز کے مشہور نوجوان شاعروں کے نام نظر آتے ہیں بلکہ ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن کے شاعر ابھی ابتدائی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ اس مجموعے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہم ان رجحانات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں جو موجودہ شعرا کے ذہنی پس منظر میں اُبھر رہے ہیں اور ہم کسی ایک مجموعے یا ماہ نامے کے مستقل مطالعہ سے بھی اس کا پتہ نہیں چلا سکتے۔

یہ مجموعہ بھی ایک نہایت خوبصورت پیش کش ہے۔ کتابت بہتر ہوتی تو اچھا تھا۔ شعرا کے مختصر حالات اس سال شامل کئے گئے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ قیمت دو روپے۔ پتہ:۔ سنگم پبلشرز لمیٹڈ۔ لاہور

(سید منظور حسین بخاری پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر ۳۲۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۳۶۲

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔
مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ۔

۳ - دل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۴ - جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع
یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے بصورتِ دیگر دفتر "ہمایوں"
خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ۔

۵ - "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ
جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتاً مل سکتا ہے ۔

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے
اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے بصورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۔

مینیجر "ہمایوں"

۳ - لارنس روڈ لاہور

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بیادگار علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
معاون مدیر: یوسف ظفر بی اے

چندہ سالانہ ۶ روپے — ششماہی ۳ روپے — فی پرچہ ۸ آنے

جہاں نما

پائیدار امن کے امکانات

دَورِ شہنشاہیت میں دنیا بے شمار ریاستوں میں منقسم تھی جس کے راجے مہاراجے اور بادشاہ آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے تو بھی اُس کے اثرات عالمگیر نہ ہوتے تھے۔ اور ان کی جنگیں ذاتی اغراض پر محمُول ہونے کے باعث اپنی شان و شوکت میں اضافہ کرنے پر مبنی ہوتی تھیں۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے پہلے تک ایک سکندر اور دوسرے تاتاری دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے کو تہ و بالا کرنے کے ذمے وار تھے۔ لیکن اب جبکہ شہنشاہیت نے جمہوریت کے ہاتھوں میں اپنی باگ ڈور سونپ رکھی ہے اور ہم تہذیب و تمدّن کے اس عروج کے مدّعی ہیں جس پر ہمارے مؤرّخ سابقہ تمدّن کو لانے کے لئے تیار نہیں ہماری حرص و ہوس اور جنگ و جدل کی خواہش تمام سابقہ خونیں معرکوں پر سبقت لے جانے پر تلی بیٹھی ہے۔ حالانکہ دنیا نے ابھی ابھی ایک عالمگیر جنگ سے گلو خلاصی کرائی ہے —— ایک ایسی جنگ جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ روپیہ جو انسانیت کی بہبود کے لئے صرف ہونا تھا اس خونی دیوتا کی بھینٹ چڑھایا گیا۔ وہ انسان جنھیں ایک عظیم الشان مستقبل کی تعمیر کرنا تھی جنگ کی بھٹی کی نذر ہوئے۔ جنگ کو ختم ہوئے ایک سال ہوا۔ ایک سال پہلے انسان نے اطمینان کا سانس لینا چاہا، لیکن ماحول سازگار نظر نہیں آیا۔ بدامنی اور قحط سالی مُنہ پھاڑے کھڑی تھی۔ قتل و غارت کے حربوں نے ایک ایسے مقام پر دم لیا جہاں انسانیت تو کیا دنیا کی ہلاکت یقینی نظر آتی تھی —— جوہری بم —— جاپان اس کی ایک ضرب کاری کا لوہا مان گیا تھا۔ ایسے حالات میں انسان اطمینان کا سانس کہاں لے سکتا تھا۔ چنانچہ وہ عنان اختیار اپنے آمرین کے سونپ کر تن بہ تقدیر خاموش ہو رہا۔

اس ایک سال کے دَوران میں فاتح ممالک نے امن کے منصوبے بنانے شروع کئے —— لیکن شکست سے زیادہ فتح کو سنبھالنا مشکل ہے۔ یہ طاقتیں مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں ذاتی مفاد کے لئے کوشاں ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کے پاس جوہری بم ہے اور وہ اس کا راز کسی قیمت پر افشا کرنا نہیں چاہتے۔ روس کے پاس بے انتہا طاقت ہے اور وہ اس کا استعمال جانتا ہے۔ یہی وہ طاقتیں ہیں جنھوں نے جرمنی اور اُس کے اتحادیوں کی بے پناہ فوجی قوت کی بیخ کنی کی ہے، اور اب یہی طاقتیں ایک نئی جنگ عظیم کی داغ بیل ڈال رہی ہیں۔ دنیا کا انسان وطن کے نام پر لڑتے لڑتے تھک چکا ہے۔ انفرادی اور گھریلو زندگی میں بڑے بڑے شگاف رونما ہو چکے ہیں۔ لاکھوں بیوائیں اور یتیم ملک کی بدحالی کے ضامن ہیں۔ لیکن ہمارے آمرین طاقت کے اندھے اور دولت کے بھُوکے ہیں۔ پیرس میں فاتحین کی مجلس امن گزشتہ ایک سال سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کیفیت پر برطانیہ کے سابق وزیر خارجہ مسٹر انتھنی ایڈن کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ "موقع کی نزاکت کو محسوس نہ کرنا حماقت کے مترادف ہوگا۔ پیرس کی مجلسِ امن کی کارروائیوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہفتے آپس کی بددلی اور خصومت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جس کا فوری نتیجہ ایک اور جنگ عظیم ہے۔ مستقل تعلقات کے لئے ایک ہی بنیاد ہے، وہ خانگی ہوں یا بین الاقوامی اور وہ ہیں خوش فہمی پر مبنی مخلصانہ مراسم۔ یہ امر یقیناً ہر ایک پر روشن ہوگا کہ ہم ان نتائج کے بغیر جو ہر ایک کے لئے مہلک ثابت ہونگے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کے لئے ایک نئی روح اور ایک نئی معاملہ فہمی کی ضرورت ہے۔ فاتح طاقتوں کو وہی احساس بیدار کرنا چاہئے جس نے انھیں متحد کر دیا تھا تاکہ وہ جان سکیں کہ ایک اور عالمگیر جنگ دنیا کے تہذیب و تمدّن کو مٹا دے گی۔ اس نکتے سے چل کر

انہیں اور دوسری حکومتوں کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ اس مقصد کے لئے کیا کر سکتی ہیں، دوسروں کے مفاد کے لئے اپنے مفاد کی کہاں تک قربانی دی جا سکتی ہے اور دوسروں کے شبہات کو کہاں تک رفع کیا جا سکتا ہے، تمام دنیا کا یہ حق ہی نہیں فرض بھی ہے کہ وہ ان حکومتوں کو اس پر مجبور کریں۔ انسانیت کو اس کی اشد ضرورت ہے۔ مغربی یورپ کی اقوام کے جنھوں نے اس جنگ میں مل کر حصہ لیا ہے، سیاسی اور اقتصادی مفادات ایک ہیں جن کے پیش نظر اگر یہ اقوام متحد ہو جائیں تو بہت سی مصیبتیں رفع ہو سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔

امریکہ کی افواج کے کمانڈر جنرل آئزن ہاور نے حال ہی میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا ہے :- "مجھے یقین ہے کہ دنیا ایک اور عالمگیر جنگ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور جہاں تک میں محسوس کر سکتا ہوں ایک ہی طاقت اس خطرے کو دور کر سکتی ہے اور وہ ہے تعلیم، کوئی بھی جنگ نہیں چاہتا۔ ہر ملک کے عوام اس سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں اس نفرت کو تقویت دینی چاہیئے تاکہ آئندہ جنگ کے امکانات نہ رہیں۔ دنیا کے لوگوں کو اس حقیقت کا احساس دلانا چاہیئے کہ جنگ کا خیال کرنے سے ہمیں کس قدر نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ہمارے ملک کی کس قدر آمدنی جنگی اغراض کے لئے صرف کی جاتی ہے۔ جس کا حصول کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میں عوام کی آواز کا بیحد معتقد ہوں بشرطیکہ یہ آواز امن کے حق میں ہو۔ ہم سب امن چاہتے ہیں اور ہونا یہ چاہیئے کہ ہر شخص اس امن کو لبیک کہے اور اس کی تعمیر کے لئے حتی الامکان کوشش کرے۔ تاکہ ایک اور جنگ کے امکانات باقی نہ رہیں۔"

روس کے مرد مجاہد اور آمر اعظم جنرلزیمو اسٹالین نے برطانوی اخبار نویسوں کے نئے ذیل کا بیان دیا ہے۔ "ایک نئی جنگ کی خبریں بے بنیاد ہیں۔ ان سے جنگی اخراجات کو بڑھانا اور فوجی تخفیف میں مزاحمت مقصود ہے۔ مجھ کسی اور جنگ کے فوری خطرے میں یقین نہیں کچھ فوجی افسر اور سیاسی دکاندار جنگ چاہتے ہیں۔ اس میں اُن کا فائدہ ہے۔ وہ اپنے سیاسی مخالفین کو جنگ کے نام پر ڈرا دھمکا کر انھیں اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کچھ دیر اور ان کے ملک کے جنگی اخراجات میں کمی نہ آنے پائے۔ وہ افواج میں تخفیف نہ ہو تاکہ ملک میں بے روزگاری سے بد امنی اور بے چینی نہ پھیل جائے۔ یہ وجوہ ہیں جن کے باعث یہ لوگ ہر روز جنگ کے نعرے لگا کر رہے ہیں ان افواہوں اور جنگ کے صحیح خطرات میں جو ابھی تک وجود میں نہیں آئے تمیز کرنی چاہیئے۔"

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا آپ سوویٹ یونین اور مغربی جمہوریتوں میں دوستانہ اور مستقل مراسم کے امکانات پر جبکہ سیاسی نقطۂ نظر کا نمایاں اختلاف موجود ہے یقین رکھتے ہیں یا نہیں ؟ آپ نے فرمایا " یقیناً ، میں بالکل یقین رکھتا ہوں۔"

جب آپ سے پوچھا گیا کہ "کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ امریکہ کا جوہر بم کے راز پر کلی اختیار امن پر مستقل خطرے کا ضامن ہے۔ تو آپ نے کہا "میں نہیں مانتا کہ جوہر بم اتنی ہی کاری طاقت ہے جتنی بعض سیاستدانوں کے خیال میں ہے۔ جوہر بم بزدلوں کو گھبرانے کیلئے ہیں۔ لیکن جنگوں کی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ وہ اس مقصد کے لئے ناکافی ہیں۔ امریکہ کا اس پر پورا اختیار ایک دھمکی ضرور ہے لیکن اس کے دو علاج ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ راز دیرپا نہیں اور دوسرے یہ کہ جوہر بم کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے گا۔"

اس بیان کے دوسرے دن روس نے اعلان کیا کہ اس کے یہاں بھی جوہر بم کے تجربے مستقبل قریب میں کئے جائیں گے۔ ان حضرات کے کردار و اقوال کو پرکھنے کا یہ وقت نہیں، وقت خود اس کا فیصلہ کرے گا۔

یہ حقائق ایک عام انسان کی آنکھیں کھولنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ سائنس کی دریافتوں نے جہاں کرۂ ارض کو ایک چھوٹی سی ریاست کی حیثیت دے دی ہے، اور اب اس کی آنکھیں سیاروں اور ستاروں کو فتح کرنے پر لگی ہوئی ہیں، وہاں اُس کے اپنے تمدن کو ایک لمحے میں ختم کر دینے کے تمام سامان بھی مہیا کر دیئے ہیں۔ فی الحال خطرہ تو یہ ہے کہ یہ فاتح طاقتیں آپس ہی میں برسرپیکار نہ ہو جائیں اور محض چند مراعات کے لئے لاکھوں معصوم انسانوں کی جانیں نہ ضائع جائیں۔ لیکن کیا یہ بعید از قیاس ہے۔ اگر جوہری ... کسی قیمت پر قائم بھی ہو گیا

تو وہ ممالک جن پر اس فتح کی بنیاد رکھی جا رہی ہے تشدّد اور ظلم کا ردِّ عمل بن کر نہیں اٹھیں گے، اور یہی ذہن جن میں منافرت کے بیج بوئے جا رہے ہیں مخالف گروہوں میں تقسیم ہو کر صف آرا نہیں ہوں گے؟

دُنیا ایک تماشہ گاہ بنی ہوئی ہے۔ وہ لوگ جو فرشتوں پر ایمان نہیں رکھتے کم از کم اب تو ان کے وجود کو تسلیم کر لیں کہ آج انسان کے کھوکھلے پن پر ہنسنے والا کوئی نہیں۔

وائسرائے کی نئی کونسل اور اُردو

[سیاسی مسلک سے بے نیاز ہو کر ہم نے کانگرس کی اُردو سے متعلق پالیسی کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ گاندھی جی اور ان کے کاٹھیاواڑی مشیران کار زبان سازی کے زعم میں اُردو کو ملیامیٹ کرنے کی فکر میں ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ادارہ یا جماعت جس کی زندگی اُردو کی زندگی سے وابستہ ہو اور جس کا منتہائے مقصود اُردو کو دنیا کی عظیم ترین زبان کی حیثیت دلانا ہو کسی فرد یا ادارے کی مخالفت کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ ہمیں یہ لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ پچھلے دنوں ہمارے بعض اہل قلم حضرات نے جو کانگرس کے سیاسی نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہیں ہماری اس مخالفت پر ہمیں لکھا ——]

کانگرس نے حکومت کے ساتھ تعاون کر کے وائسرائے کی کونسل میں شرکت کی تو ہمارے کانگرسی دوستوں نے اُردو دشمنی کا کھلے بندوں اعلان کر دیا۔ اخبارات میں ہر روز ریڈیو اور سرکاری دفاتر کی زبان پر اعتراضات کئے جا رہے ہیں، اور کانگرسی ممبران اسمبلی کی توجہ اس طرف دلائی جا رہی ہے کہ وہ اُردو کی بیخ کنی کرنے میں تساہل سے کام نہ لیں۔ لاہور ریڈیو کی زبان پنجابی، لکھنؤ کی زبان ہندی، کلکتے کی زبان بنگالی، مدراس کی زبان مدراسی اور دہلی کی زبان ہندوستانی ہونی چاہیئے۔ گویا ان حضرات کے برسرِکار آنے کا مطلب یہ ہے کہ اُردو کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔

ہم آنریبل ممبر انفرمیشن و براڈکاسٹنگ کی خدمت میں عرض کئے دیتے ہیں کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے اور اگر اس کو نقصان پہنچانے کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو اُردو کے خدام جو مذہب و ملت کی قید نہیں رکھتے اس کو برداشت نہیں کریں گے۔ اُردو بیچاری پر آج تک جو ستم روا رکھے جا چکے ہیں اور کانگرس کے ہاتھوں رکھے جا رہے ہیں ان کے ہوتے ہوئے اس تازہ احسان کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ملک کو منافرت سے بچائیں گے اور اسے متحد کرنے کے لئے اسی زبان سے کام لیں گے جس سے مغلوں نے اسے ایک نیا کردار دیا تھا —— اُردو زندہ باد!

جوبلی نمبر

ہمیں مسرت ہے کہ جوبلی نمبر کے لئے ہم مندرجہ ذیل مضامین مزید فراہم کر سکیں گے۔ ان کو گذشتہ اعلان کی روشنی میں دیکھتے ہوئے قارئین اس نمبر کی ہمہ گیر افادیت کا فیصلہ خود فرما سکتے ہیں:۔

۱۔ اُردو کی پچیس سالہ نظم کے محرکات	جناب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ایم۔ اے
۲۔ اُردو کی پچیس سالہ نظم اور رفتار	جناب قیوم نظر صاحب بی۔ اے
۳۔ اُردو کے پچیس سالہ گیت	جناب ڈاکٹر مسعود حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
۴۔ اُردو کی پچیس سالہ طنز و مزاح	جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر ایم۔ اے
۵۔ اُردو کی پچیس سالہ تنقید	جناب پروفیسر رئیس احمد صاحب ادیب ایم۔ اے

یوسف ظفر

اردو ادب پر ماں کے احسانات

ماں، باپ اور بچے کی تثلیث نے ایک ابدی کشمکش اور دوامی الجھن پیدا کر دی ہے۔ جس نے ہمیں لازوال ادبی خزانے عطا کئے ہیں۔ کہنے کو تو یہ نہایت معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ لڑکا اپنی ماں سے محبت کرتا ہے اور لڑکی اپنے باپ کی طرف سے کشش محسوس کرتی ہے مگر اس کے نتائج نہایت دوررس اور اہم ہیں۔ شعوری اور غیر شعوری نفسی اعمال کے زیر اثر اس کلیئے میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کی اہمیت کا اندازہ محض اتنی سی بات کہہ دینے سے نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ عام طور پر لڑکا ماں کی طرف اور لڑکی باپ کی طرف سے کشش محسوس کرتی ہے مگر یہ صرف عام طور پر ہی صحیح ہے۔ کیونکہ بہت سے نفسیاتی عناصر اس توازن کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں اس جگہ ہم اس کلیہ کا اطلاق اُردو ادب پر کریں گے اور پھر مستثنیات سے بحث کر کے یہ دیکھیں گے کہ ماں کی محبت کن کن صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے؟

"جنت ماں کے پاؤں تلے ہے" یہ بات آخر کسی آدمی ہی نے تو کہی ہے۔ اگر عورت کہتی تو وہ "ماں" کی بجائے "باپ" کہتی۔ اسی طرح کسی شاعر کا مجموعہ کلام اٹھا کر دیکھ لو "والدہ مرحومہ" کے عنوان سے کوئی نہ کوئی نظم مل ہی جائے گی۔ اور انتساب بھی اکثر ماں کے نام ہی نظر آئے گا۔ اور مرثیہ بھی لکھیں گے تو "والدہ ماجدہ" کا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تو اور کیا ہے کہ انہیں "باپ" سے زیادہ "ماں" سے محبت تھی۔ حالانکہ ان کی تعلیم و تربیت اور تشکیل زندگی میں "باپ" کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا "ماں" کا۔

ماں باپ کی محبت و نفرت کا رُخ کسی بھی شخص یا چیز کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔ عام تجربہ کی بات ہے کہ لڑکا اپنے باپ سے متنفر ہونے کی بجائے چچا یا ماموں سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ یا اس نفرت کا رُخ جس کا منبع درحقیقت باپ ہے وہ اپنے استاد یا کسی دوسرے بزرگ کی طرف پھیر دیتا ہے۔ عصمت چغتائی کا افسانہ "دوزخی" اس بارے میں بے نظیر حیثیت رکھتا ہے اس میں بھائی نے باپ کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور یہاں شروع سے آخر تک وہی محبت و نفرت کی باہمی کشمکش قائم ہے جس کے ہم سب زندگی بھر کسی نہ کسی صورت میں اسیر رہتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم ایک ہی شخص سے بیک وقت محبت بھی کر سکتے ہیں اور نفرت بھی۔ ہماری شعوری محبت غیر شعوری نفرت کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ اور اس کے برعکس ہماری انتہائی نفرت کسی غیر شعوری محبت کا مظہر بن سکتی ہے۔ "دوزخی" میں کبھی نفرت محبت پر غالب آجاتی ہے اور کبھی محبت نفرت پر کیونکہ اس وقت عصمت جیسا کہ وہ خود بتاتی ہے ایک بہن کی نظر سے نہیں بلکہ ایک عورت کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی۔ یہ عورت کے احساسات جذبات کی ایک مکمل اور صحیح تصویر ہے اور نفسیاتی طور پر یہ افسانہ "لحاف" سے کسی طرح بھی کم درجہ نہیں رکھتا۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے ماں باپ کی محبت و نفرت کئی صورتوں میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ "ماں" کبھی علم عورت کے پردے میں ہماری زندگی کی بہتی دھارا میں طوفان بپا کر دیتی ہے اور کبھی "بھارت ماتا" بن کر اپنی پرستش کرواتی ہے۔ اُردو ادب میں اس کی بہترین مثال یوسف ظفر کی نظم "بیگمہ" ہے۔ اس نظم میں بھی وہی ماں، باپ اور بیٹے کی تثلیث قائم ہے۔ ظفر نے اپنی ذات کو بیگمہ کی ذات میں مدغم کر دیا ہے۔ اور بیگمہ کی شخصیت میں بچے کا پارٹ بخوبی ادا کیا ہے۔ اس حیثیت سے تمام

شاعر اور ادیب اس کے بھائی ہیں۔ "مادرِ ہند" ایک ماں کی جگہ ہے اور "غیر" باپ کی تصویر ہے۔ تاثر کے لحاظ سے یہ نظم دو حصوں
تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلا حصہ دو بندوں پر منحصر ہے۔ اس میں بچے کو جسے باپ سے رقابت ہے ماں پر غصہ آ رہا ہے۔ وہ کچھ
نہیں کر سکتا۔ سوا اس کے کہ وہ اُسے "ماں" کہتے ہوئے بھی عار محسوس کرتا ہے۔ اس کی وجہ وہ خود ہی بتاتا ہے ا۔

جا! کہ اغیار سے وابستہ ہے دامن تیرا
بوئے غیر آتی ہے اب تیرے پسینے سے مجھے

مگر اس کا غصہ یہی کہہ کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس سے زیادہ طعنہ زنی پر اُتر آتا ہے اور کہتا ہے۔

تو بجس ہے تری عصمت تری غیرت کیا ہے؟

اتنا بہت کچھ کہہ لینے کے بعد اچانک اس کے احساسات پلٹا کھاتے ہیں۔ ضمیر اسے ملامت کرتا ہے اور اسے "احساس گناہ"
ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ "ماں" کا اس کے نزدیک کیا درجہ ہے۔ اس کے اخلاقی معیار اور عمرانی تصورات اس پر
حاصل کر لیتے ہیں اور وہ اقرار گناہ کر لیتا ہے۔ یہاں سے نظم کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے ؂

مجھ پہ ناراض نہ ہو ماں میں ترا بیٹا ہوں
بھول تھی میری کہ میں نے تجھے اتنا کوسا

ماہرین تحلیل نفسی کے لئے یہ روزانہ مشاہدے کی بات ہے کہ ایک بچے پر چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی جب وقتی طور پر ماں دشمن
یا باپ دشمنی غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو جلد ہی اسے "احساس گناہ" ہو جاتا ہے۔ جس کے زیر اثر وہ خود کو شرمسار نہیں بلکہ قصور وار گردا
لگتا ہے اور بہت افسردہ اور غمگین ہو جاتا ہے۔ انھیں احساسات کی تصویر یوسف ظفر نے اس نظم میں اتاری ہے اور اس میں
وہ پوری طرح کامیاب ہے۔

بعض اوقات محبت و نفرت کا یہ کھیل کنایوں اور اشاروں میں ادا کیا جاتا ہے۔ یہ اشارے کائناتی بھی ہوتے ہیں اور
ذاتی بھی۔ کائناتی اشاروں سے میری مراد ایسے نشان ہیں جن کا مطلب ہم سب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سفید رنگ
بے داغ زندگی اور معصومیت کا نشان ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔ مگر بعض اوقات یہ اشارے اتنے مبہم اور غیر واضح ہو جاتے ہیں
کہ انھیں شاعر کے علاوہ بہت کم اشخاص سمجھ سکتے ہیں۔ میراجی کے اشارے اور کنائے اکثر ذاتی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر میراجی
کی نظم "اونچا مکان" کنایہ ہے عورت یا اس کے جسمانی اعضاء سے۔ میراجی کی تمام شاعری زیادہ تر ذاتی اشارات و کنایات کا نمونہ ہے
اسی طرح یوسف ظفر اپنی نظموں میں "سڑک" سے اکثر "عورت" مراد لیتا ہے۔ علاوہ ازیں "ستارہ" "بُت" "سائے" یہ سب ایسے
اشارات ہیں جنھیں وہ بار بار استعمال کرتا ہے اور ان کے ذریعہ اپنا مفہوم ہم تک پہنچاتا ہے۔ اگر ان اشارات کا مطلب پا لیا جائے
تو یوسف ظفر سے اعادہ اور ابہام کا الزام دُور ہو جاتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میرے اکثر احباب نے ظفر کے مجموعہ کلام "زندان"
کو محض اس لئے مبہم اور ایک ہی مضمون کا اعادہ پایا کہ انھوں نے ظفر کی شاعری میں "سڑک" "بُت" "ستارہ" اور ایسے دوسرے اشارات
کے مخفی مفہوم کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اسی طرح ظہیر کاشمیری کی شاعری، طرز و طریق اور اس کے علمی تصورات اور اشتراکی خیالات یہاں
تک کہ اس کی تمام زندگی ایک مظہر ہے ایک ناقابل تسکین اور دوامی نفسی کشمکش کا۔ اس کی سوسائٹی سے بغاوت اور اشتراکیت کی محبت
سب کچھ اسی نفسیاتی الجھن کے مختلف مظاہر ہیں جو ماں باپ اور بچے کی تثلیث کے ناگزیر نتائج میں سے ہیں۔ اور جس کے ہم
تم اور سب اسیر ہیں۔

ا؎ ملاحظہ فرمایئے نظم "پازیب" صفحہ ۶۳۳

خوابوں میں بھی ہم ایسے ہی اشاروں سے کام لیتے ہیں۔ بھائی اور بہنیں خوابوں میں اجنبی اشخاص اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ماں باپ اکثر ملکہ اور بادشاہ کا چولا بدل کرتے ہیں۔ خواب میں جب کبھی ہم ملکہ دیکھتے ہیں تو اس سے اکثر ماں مراد ہوتی ہے۔ اختر شیرانی کی نظم "بورسائنس" اسی حقیقت کی وضاحت ہے۔ بغیر ہچکچاہٹ کے محبت کے رنگ الاپتا ہے۔ وہ افلاطونی یا شہوانی محبت میں غیر ضروری تفریق نہیں کرتا۔ اور اگر کرتا ہے تو بہت کم اور یہ ہے بھی درست کیونکہ ان میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ اول الذکر میں اس کی جنسی غرض کو دبا دیا گیا ہے۔ جب کہ موخر الذکر میں اس کی جنسی غایت ظاہر ہے۔ اختر شیرانی کی اس نظم میں آخری شعر کے سوا کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بچہ اپنی ماں کا ذکر کر رہا ہے۔ یہ نظم روایات سے کافی دُور ہٹ کر لکھی گئی ہے۔ یہاں ماں سے متعلق بچپن کی یادوں کی نہایت صحیح اور واضح تصویر اتاری گئی ہے۔ آخر بچے کو ماں کے بستر، اس کی لازوال جوانی اور مشکیں تنفس کے علاوہ بہت کم چیزیں یاد رہتی ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کا شعوری طور پر احساس غائب ہو۔ یہی بات ہمیں ہمارے خواب بتاتے ہیں اور ہماری نظمیں بھی تو آخر ہمارے خواب ہی ہیں۔ جو حقیقی زندگی میں بہت کم پورے ہوتے ہیں۔

جب شاعر کے احساسات تیز ہوتے ہیں تو وہ ہمارے عمرانی اور اخلاقی معیار سے برسرپیکار ہونے لگتے ہیں۔ جتنی یہ کشمکش بڑھتی جاتی ہے، اتنا ہی رمز یا کنایہ کا استعمال زیادہ ہونے لگتا ہے۔ اور اس طرح شاعر اپنے تاثرات کو الفاظ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک تو ماں کی محبت کے اظہار کی سوسائٹی نے اجازت دے دی ہے۔ جس کی وجہ سے ان احساسات کو الفاظ کے گورکھ دھندوں میں چھپانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اب ہم ان نظموں کو پرکھتے ہیں کہ جہاں تاثرات زیادہ تیز ہیں اور شاعر سوسائٹی کے ڈر سے انھیں چھپا چھپا کر بیان کرتا ہے۔ ایسی نظمیں ہمیشہ دو مفہوم رکھتی ہیں۔ ان کا خارجی مفہوم تو وہی ہوتا ہے جو نظم کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ مگر داخلی مفہوم ان بظاہر "معصوم" اور "بے ضرر" نظموں کے اندر اشاریت کے ذریعہ یا تاثرات کو ضروری جگہ سے غیر ضروری جگہ پر منتقل کر کے ادا کیا جاتا ہے۔ یہ داخلی مفہوم نہایت ہوشیاری سے نظم کے خارجی مفہوم میں چھپا دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر یہ سب کچھ جان بوجھ کر کرتا ہے، یہ اس کے علم کے بغیر خود بخود ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو شاعر کی توجہ اس طرف دلانے پر اسے خود اچنبھا سا ہوتا ہے۔

داخلی مفہوم کے اندر شاعر سوسائٹی کے مقرر کردہ قیود کے باوجود اور اخلاقی قیود سے دست و گریبان ہوتے ہوئے اپنے غیر شعوری جذبات کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ مگر یہ جذبات ہمیشہ اشاریت کے دبیز پردوں میں چھپے رہتے ہیں۔ ان اشاروں کو اگر حل کر لیا جائے تو نظم کے یہ دونوں مفہوم ——— خارجی اور داخلی ——— واضح ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں یوسف ظفر کی نظم "بین السطور" پیش کرتا ہوں۔

آہنی سڑکوں پہ ہزاروں انساں روز و شب شام و سحر چلتے ہیں

سانس لیتی ہوئی لمبی سڑکیں

دھوپ میں لیٹی ہوئی جلتی ہوئی

موڑ پہ مڑتی ہوئی چلتی ہوئی

دوڑتی رہتی ہیں تنہا چپ چاپ ———

شام کی شعلہ فشاں رقاصہ

ان پہ پھیلاتی ہے یہ دامن اپنا
یہ سڑک جاتی ہے راوی کی طرف
پھاند کر پل کو چلی جاتی ہے
ایک سنسان سی ویرانی میں
اور کھو جاتی ہے پیڑوں میں کہیں
کئی انسانوں کا بیکار ہجوم
اپنے قدموں سے مسلتا ہے اسے
انھیں انسانوں میں وہ جنس بھی ہے
جو کبھی ماں ہے کبھی بیوی ہے
جس کی بیچارگیٔ زیست کا راز
اس کے معصوم خد و خال میں ہے
مسکرا دیتی ہے ہر ٹھوکر پر
ہر شکست اس کی مسرت بہ کنار
اس کی انگڑائی میں ہے وہ مستی
جو کسی بادۂ رنگیں میں نہیں
اس کی خود بینی جہاں بینی ہے
اور عالم نگری، خود بینی —
اُس کی تسکین کا ساماں کیا ہے؟
اُس کے ارمانوں کے گہوارے میں
دلِ ناکام پڑا جھولتا ہے
اُس کے ملبوس کی آرائش میں
جتنے اسبابِ دل آرائی ہیں
دعوتِ قلب و نظر ہوں کہ نہ ہوں
ایک بات اُس کی عیاں ہے مجھ پر
جس قدر داغ ہیں اس کے دل کے
اس کے دامن پہ چمک اٹھتے ہیں —
دونوں اک رنگ و ہم آہنگ ہیں دیکھو!
یہ سڑک اور یہ غم گیں عورت
موڑ پہ مڑتی ہوئی چلتی ہوئی

اپنے سینے پہ اُٹھائے انساں ـــ

اس نظم میں شروع سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ سڑک سڑک نہیں کچھ اور شے ہے۔ کیونکہ یہ سانس لیتی ہے، لیٹی رہتی ہے پھاند کر پُل پار کر لیتی ہے۔ غرضیکہ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو زندہ مادے میں ہونی چاہئیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے ظفر کی نظموں میں سڑک سے اکثر مراد عورت ہوتی ہے۔ مگر یہ کون سی عورت ہے۔ ظفر اس کے متعلق خود اشارتاً بتاتا ہے۔

کئی انسانوں کا بیکار ہجوم
اپنے قدموں سے سلتا ہے اسے

نظم کے اس حصے تک پہنچ کر غیر شعور محسوس کرتا ہے کہ جتنا کہنا چاہئے تھا اس سے زیادہ کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ شاعر جانتا ہے کہ ہماری سوسائٹی آسانی سے اسے قبول نہیں کرے گی، دوسرے غیر شعوری طور پر وہ خود بھی اس تلخ حقیقت سے دوچار نہیں ہونا چاہتا۔ جلد ہی شاعر ان تاثرات کا رخ غلط طرف کو موڑ دیتا ہے۔ وہ ہمیں تقریباً بتا ہی چکا تھا کہ عورت سے مراد "ماں" ہے ہاں وہی ماں جس کو ظفر کے نزدیک سجدہ بھی روا ہے ـــ وہ سجدہ جو خدا کو بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ نفس غیر شعور درمیان میں حائل ہو جاتا ہے۔ اور یہاں سے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کیا جاتا ہے۔ بچہ یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی ماں کسی دوسرے بھائی یا بہن کے لئے بھی وہی درجہ رکھتی ہے جو اس کی نظروں میں ہے اور وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ماں کی آغوش اُس کے کسی بہن یا بھائی کے لئے بھی وقف ہو۔ جبھی تو وہ کہتا ہے۔

کئی انسانوں کا بیکار ہجوم
اپنے قدموں سے سلتا ہے اسے

یہاں بہن یا بھائیوں سے غیر شعوری رقابت ظاہر کر کے جلدی سنبھلتا ہے اور ماں کو ہی "انسانوں کے بیکار ہجوم" میں وقتی طور پر گم کر دیتا ہے۔ مگر یہ محض تاثر کا انتقال ہے۔ یہ احساسات "سڑک" یعنی عورت سے وابستہ ہیں مگر سوسائٹی کے ڈر سے یا اپنے اندرونی خوف سے شاعر ان تاثرات کا رخ اپنی جگہ سے بدل کر غلط طرف موڑ دیتا ہے۔

ظفر کو بھی ہر آدمی کی طرح اپنی بیوی میں ماں کی آغوش کی تلاش ہے۔ وہ بیوی میں اپنے اس گم گشتہ نصب العین کو تلاش کرتا ہے جو کبھی اس نے ماں کی صورت میں مکمل دیکھا تھا۔ اسے اُس نصب العین تک پہنچنے میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے یہ تو وہ خود ہی بتا سکتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جو نصب العین اس نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے اور جسے وہ بیوی میں مجسم دیکھنا چاہتا ہے وہ بچے کو ماں ہی میں نظر آ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معیار پر بچے کی ماں ہی پوری اُتر سکتی ہے بیوی نہیں۔ اور جہاں بیوی اس معیار سے کم نظر آئی ـــ جو یقینی ہے ـــ تو شاعر کو ایک صدمہ پہنچتا ہے اور وہ دنیا سے بیزار ہو کر جھنجھلا اٹھتا ہے۔ اور حقیقت سے منہ موڑ کر "تخیلات کے پر جوڑتا ہوا" از سرِ نو اپنے نصب العین کی تلاش میں کھو جاتا ہے۔ "زندان کے انجام" سے میرے اس نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ظفر کی نظموں میں سڑک سے مراد عورت ہوتی ہے، اور عورت سے اُس کی مراد ماں ہے اگر یقین نہ ہو تو اس کے الفاظ سے تصدیق کر لیجئے۔

دونوں یکرنگ و ہم آہنگ ہیں دیکھ
یہ سڑک اور یہ غمگیں عورت

مگر یہ غمگیں عورت کون ہے؟

موڑ پر مُڑتی ہوئی چلتی ہوئی
اپنے سینے پہ اُٹھائے انساں

ظاہر ہے کہ یہ کوئی عام عورت نہیں، اُس کی نظموں کی محرک، اُس کے خوابوں کی شہزادی، اُس کی زندگی کا نصب العین
یعنی اُس کی ماں کی تصویر ہے۔

اس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح آدمی اپنی ماں کی تلاش میں ساری عمر سرگردان رہتا ہے۔ اکثر فنکاروں کے لئے اس کی
ایک ایسا نصب العین ہوتا ہے جو اس کی رسائی سے ہمیشہ دُور رہتا ہے۔ اس کے لئے ہر عورت پہلے ماں ہوتی ہے یعنی مجسم نصب العین
اسے ہر عورت سے ماں ایسی محبت کی توقعات ہوتی ہیں۔

جب تک کوئی عورت اس کے اس غیر شعوری نصب العین کے قریب رہتی ہے وہ خوش رہتا ہے۔ لیکن جہاں اس کے معیار سے کوئی ع
ذرہ برابر ادھر اُدھر ہوئی وہ چیخ اٹھتا ہے۔ اسے ایسا صدمہ ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ وہی عورت جو کبھی ایک مثالی عورت یعنی ماں
درجہ رکھتی تھی، اس کی نظروں سے گر جاتی ہے۔ اور وہ ایک بازاری عورت — بلکہ اس سے بھی ذلیل تر عورت بن کر رہ جاتی ہے۔ اس ذہ
کشمکش کو اختر شیرانی نے اپنی نظم "ایک شاعرہ کی شادی پر" میں پیش کیا ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیے۔

اے کہ تھا اُنس تجھے عشق کے افسانوں سے — زندگانی تری آباد تھی رُومانوں سے
شعر کی گود میں پلتی تھی جوانی تیری — تیرے شعروں سے اُبلتی تھی جوانی تیری
رشکِ فردوس تھا ہر حسن بھرا خواب ترا — ایک پامال کھلونا تھا یہ مہتاب ترا
نکہتِ شعر سے مہکی ہوئی رہتی تھی سدا — نشۂ فکر میں بہکی ہوئی رہتی تھی سدا
شرکتِ غیر سے بیگانہ تھے نغمے تیرے — عصمتِ حور کا افسانہ تھے نغمے تیرے
شعر کی خلوتِ رنگیں تھی پری خانہ ترا — مست خوابوں کے جزیروں میں محل کاشانہ ترا
غائب از چشم تھی جنت کی بہاروں کی طرح — دستِ انساں سے تھی محفوظ ستاروں کی طرح
صحبتِ غیر سے گھبراتی تھی تنہائی تری — آئینے سے بھی تو شرماتی تھی تنہائی تری
صبح کی طرح سے دوشیزہ تھی ہستی تیری — بُوئے گل کی طرح پاکیزہ تھی ہستی تیری
نغمہ و شعر کی فردوس میں تو رہتی تھی — یکسر الہام و ترنم تھا جو تو کہتی تھی
تیرے اشعار تھے جنت کی بہاروں کا ہجوم — تیرے افکار تھے زرّین ستاروں کا ہجوم
دردِ شعری کے تاثر سے تو مغموم تھی تو — آسماں کا گر اک غنچۂ معصوم تھی تو

موجِ کوثر کا چھلکتا ہوا پیمانہ تھی
غیر ہونٹوں کے تصور سے بھی بیگانہ تھی

اب گوارا ہوئی کیوں غیر کی صحبت تجھ کو — کیوں پسند آ گئی ناجنس کی شرکت تجھ کو
اوجِ تقدیس کو پستی کی ادا بھا گئی کیوں — تیری تنہائی کی جنت پہ خزاں چھا گئی کیوں
شعر و رومان کے وہ خواب کہاں ہیں تیرے — وہ نقوشِ گل و مہتاب کہاں ہیں تیرے

کون سی طرفہ ادا بھا گئی اس دنیا میں ‏ ‏ خلد کو چھوڑ کے کیوں آگئی اس دُنیا میں؟
ہوگئی عام تو نورِ مہِ تاباں کی طرح ‏ ‏ آہ کیوں جل نہ بجھی شمعِ شبستاں کی طرح
اپنی دوشیزہ بہاروں کو نہ کھوتا تھا کبھی ‏ ‏ وہ کلی تھی تو جسے پھول نہ ہوتا تھا کبھی
عفتیں مٹ کے جوانی کو مٹا جاتی ہیں ‏ ‏ پھول کمھلاتے ہیں کلیاں کہیں کمھلاتی ہیں
بلبلِ مست نوا دشت میں کیوں رہنے لگی ‏ ‏ نغمۂ تر کی جگہ مرثیہ کیوں کہنے لگی؟
ہوس آلودہ ہوئی پاک جوانی تیری ‏ ‏ غیر کی رات ہے اب اور کہانی تیری
کس کو معلوم تھا تو اس قدر ارزاں ہوگی ‏ ‏ زینتِ محفل و پامالِ شبستاں ہوگی
جذبِ عفت کا میسر تھا جو عرفاں تجھکو ‏ ‏ کیوں نہ مرغوب ہُوا شیوۂ جاناں تجھکو
تیرگی حرص کی حوروں کو بھی بہکا ہی گئی ‏ ‏ تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی
اب نہیں تجھ میں وہ حوروں کی سی عفت باقی ‏ ‏ حور تھی تجھ میں گئی، رہ گئی عورت باقی!
ہاں وہ عورت جسے بچوں کا فسانہ کہیئے ‏ ‏ بربطِ نفس کا اک فحش ترانہ کہیئے
جس میں ہے زہرِ عفونت کا وہ پیمانہ کہیں ‏ ‏ اک گناہوں کا بھبکتا ہوا میخانہ کہیں

سوگوار اپنی جواں موت کا ہونے دے مجھے
مسکرا تو مگر اس حال پہ رونے دے مجھے

اس نظم میں شاعر کا رویّہ ایک لاڈلے بچے کا سا ہے جو اپنی ماں کی محبت میں کسی اور کو شامل نہیں کر سکتا۔ وہ حد درجہ حاسد اور بدظن ہے۔ جب تک "محبوبہ" اس کی ہے اس وقت تک وہ اس کے لئے ایک مثالی عورت کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ اس کا نصب العین ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنی شخصیت کو اس کی شخصیت میں کھو دیتا ہے۔ شاعر نے ایک ایسے ہی بچے کے تاثرات کو نظم میں پیش کیا ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں یہ شاعرہ "گوشت پوست رکھتی ہوئی بھی غیر مرئی ہے۔ وہ ایک ایسا نصب العین ہے جس کا حصول ہی شاعر کی زندگی کا حاصل ہے۔ وہ حور ہے عورت نہیں۔ بچے کے نزدیک ماں کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس میں وہ اُس کی زندگی کی ملکہ اور اس کی روح رواں ہوتی ہے جب ماں اس کے لئے زندہ ہوتی ہے اور اُس کی زندگی ماں کے لئے وقف ہوتی ہے۔ دوسرا پہلو وہ ہے جب ماں باپ کی بن کر رہتی ہے اور بچّے سے اغماض کرتی ہے، اس وقت کی ماں ایک عام عورت ہو کر رہ جاتی ہے جس کے لئے بچے کے پاس نفرت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ وقت کی بات ہے بچے پر کبھی ماں کا ایک پہلو غالب ہوتا ہے اور کبھی دوسرا۔ بعض اوقات ایک ہی پہلو عمر بھر چھایا رہتا ہے اور زندگی میں وہ ایک ہی رنگ میں زنگار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر جس بچے کیلئے ماں غیر شعوری طور پر ایک فرشتہ خصلت انسان ہے وہ بچہ کسی عورت سے صرف اس وقت تک ہی محبت کر سکتا ہے جب تک وہ اس کے غیر شعوری معیار پر پوری اُترتی ہو اور یہ معیار اس کی ماں کی ذہنی تصویر مقرر کرتی ہے مگر جس وقت شکست نصیب ہوتا ہے تو شاعر کو زبردست صدمہ پہنچتا ہے جتنا بلند معیار ہوگا اتنا ہی صدمہ شدید ہوگا۔ نتیجہ ہوتا ہے کہ شاعر دیوی کو مجسم شیطنت سمجھنے لگتا ہے یہی نہیں بلکہ تمام صنفِ مخالف اس کے نزدیک انسانیت کے درجے سے گر جاتی ہے، مرد کی اسی ذہنی کشمکش سے متعلق تو کسی عورت نے کہا تھا کہ "اگر آدمیوں کا بس چلے تو وہ اپنی ماؤں کو دوشیزہ ہی رکھیں"۔ اس بحث سے پتہ چلتا ہے کہ ماں، باپ اور بچے کی اس ابدی تثلیث کا شاعری میں کتنا دخل ہے۔ ہماری اکثر فنی تخلیقات اور ادبی جواہر پارے اسی محبت کا کرشمہ ہیں جس کا مرجع ماں ہے۔ ہماری حب الوطنی، ہماری شاعری، ہمارے اخلاقی اقدار، ہماری سائنس اور اس سے وابستہ تمدنی ترقی سب اسی کے زیرِ احسان ہیں۔

رفیع الزّمان خاں

غزل

ہے میری وفا پہ خندہ زن دوست — دل خاک بڑھائے دل شکن دوست

کیوں چاند جگا رہا ہے جادو — میرا بھی ہے ایک سحر فن دوست

اب "نغمہ گری" ہے امرِ فطری — نیچر کی عطا ہے گلبدن دوست

ہے فرض پرستش اس کی مجھ پر — بت میرے لئے ہے "کم سخن" دوست

یہ بوالعجبی غضب خدا کا — یزداں طلب اور "اہرمن" دوست

انساں ہیں بھانت بھانت کے یاں — زر دوست، زمین دوست زن دوست

افراط ہے ایسے دوستوں کی — کم لوگ وطن میں ہیں "وطن دوست"

شاعر نہ وطن کا گیت گائے — بلبل تو ہو فطرتاً "چمن دوست"

دھوکا یہ نہیں تو اور کیا ہے — جملہ ارکان انجمن دوست

وہ دوست، یہ دوست، توبہ توبہ — ملتا ہے کہاں جناب من! دوست

پیماں شکن اجنبی سدھارے — جی بھر کے لڑیں گے ہم وطن دوست

"تلخی کا ہے راز "حسنِ شیریں" — آپس میں ہیں شیخ و برہمن دوست

ہیں شور فگن صباحتیں بھی — خوش وضع ہیں کتنے بدچلن دوست

دل میرا بڑھا رہے ہیں گویا!
منظور۔ یہ حوصلہ شکن دوست

علی منظور

پلومپ

"پلومپ، پلومپ"... وہ حسب معمول پانی میں چھوٹے چھوٹے گول پتھر پھینک رہا تھا۔ اس کے کان اس آواز کی ہر سُر کو علیحدہ علیحدہ پہچاننے لگ گئے تھے۔ یہ مختلف پیاری سُروں کا گلدستہ اس کی آنکھوں کو بے تاب اور کانوں کو مترنم کر دیتا تھا۔ پچھلے دنوں سے تو گویا اس آواز نے اس پہ جادو سا کر رکھا تھا۔ یہ آواز کس قدر پُر سکون اور خواب آور سے لبریز تھی وہ پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا تو سیدھا ——— شاید کشاں کشاں ——— اس جگہ پہ آ بیٹھتا جہاں دریا کے پانی نے مٹی کو اپنی آبی زبان سے چاٹ چاٹ کر کنارے کے اندر ایک ننھی پُر سکون جھیل سی بنا رکھی تھی۔ جھیل کی ساکت سطح کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ خود بخود گرم ریت میں گھس کر چھوٹے چھوٹے سنگریزے نکال لاتا اور ہر روز کی طرح پلومپ پلومپ کا گیت چھڑ جاتا۔

ملائم سنگریزے پانی کی چکنی سطح پہ ایک ننھا سا گڑھا بنا کر غایب ہو جاتے۔ جیسے کبھی کے حیران ہو کر اپنے نرم گال پر انگلی رکھنے سے ایک حسین گڑھا پڑ جائے اور انگلی ہٹا لینے سے پھر غایب ہو جائے۔ یہ گڑھا اس کے دل میں کسی بھولی ہوئی یاد کو تازہ کر دیتا۔ اس نے کسی کے گال میں ہنگامِ تبسم گڑھا پڑتے دیکھا تھا۔ اور باوجود ایک زبردست خواہش کے پھر نہ دیکھ سکا گڑھا پڑنے سے پہلے ایک بیدبو چدار قہقہے کی گونج، جو پلومپ سے ملتی جلتی تھی، اس کے کانوں میں ابھی تک موجود تھی۔ وہ سوچتا کہ یہ کب اور کہاں ہوا تھا۔ مگر جوں جوں اصرار کے ساتھ وہ دماغ سے پوچھتا توں توں اس کا دماغ زیادہ زور سے انکار کرتا چلا جاتا یہ ذہنی کشمکش اس کی پڑھائی میں حارج ہو جاتی اور اس کو فیل ہونے کا ڈر لگنے لگتا ——— پھر وہ اس خیال سے اپنے آپ کو تسلی دے لیتا کہ "فیل ہو جاؤں گا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ چندہ برس کی عمر میں میٹرک نہ پاس کیا پندرہ کی عمر میں سہی"

"پلومپ" اس کا جی چاہتا کہ دن رات وہاں بیٹھا رہے۔ اور دنیا بھر کے سنگریزے ایک ایک کر کے اس حسین گڑھے کی نذر کر دے۔ اندھیرا ہو جانے پر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑا ہوتا، لوٹتے وقت کبھی کبھی پانی کی ایک تازہ لہر زیر آب داخل ہو کر سطح پر ایک موہوم سا گڑھا بنا دیتی جیسے یونہی کوئی خیال کسی کے دل میں چپکے سے آ کر گدگدی کر دے۔ اور آبی گال پہ ہلکا سا گڑھا بنا دے۔

یہ گڑھا اس کے لیے ایک ابدی سکون، چین اور راحت کا گہوارہ تھا، اس کا دل چاہتا کہ خود بھی ایک چھوٹا سا گول پتھر بن کر اس کی سکون بخش آغوش میں چلا جائے اور اس تگ و دو کی دنیا کو خیرباد کہہ دے۔ وہ سوچتا کہ اس کا دنیا سے بس اتنا ہی تعلق ہے، جتنا کہ اس جھیل کے پانی کو دریا سے، یہ پانی بالکل ایک اس مسافر کی طرح ہے جو تھکن، بھوک اور پیاس سے مجبور قافلے کی راہ سے ہٹ کر رستے کے کنارے پہ ستانے کے لیے بیٹھ گیا ہو اور بیٹھ کر اٹھنے کے لیے تیار نہ ہو، وہ خود بھی تھکا ہوا تھا۔ وہ زندگی کی طویل راہ کی پہلی ہی چند منزلیں طے کر کے تھک گیا تھا۔ اور اس کو اپنی اس فقدان ہمت پر ذرہ بھر شرم بھی محسوس نہ ہوتی تھی، اس کے لیے دنیا کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ اس مقابلے کی دوڑ کے قابل نہ تھا۔ نہیں بلکہ وہ اس دوڑ میں حصہ لینے کے لیے پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ وہ یہ خیال کرتا کہ دنیا والے پاگل ہو گئے ہیں، پھولی ہوئی سانسیں، منہ پر جھاگ ——— دوڑ رہے ہیں۔ دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ محض دوڑنے کی خاطر، یہ سب کہاں جا رہے ہیں ———؟ وہیں جہاں سے آئے تھے؟ تو پھر کیوں آئے تھے؟ وہ خود

کیوں آیا تھا؟ شاید اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ تو پھر یہ بھی سب بری الذمہ تھے۔ مگر پھر بھی ان کو اس دن رات کی دوڑ پر کون مجبور کر رہا ہے۔ سارے کے سارے یوں بھاگ رہے ہیں جیسے لاکھوں خونی بھیڑیئے تعاقب میں ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ بھیڑیوں کے خون آلود دانت ان کی ٹانگوں میں نہیں بلکہ ان کے ہمراہیوں کی ٹانگوں میں پیوست ہو جائیں اور وہ ہانپتے اور چیختے ہوئے گر جائیں، اور باقی دوڑنے والوں کے پاؤں تلے روندے جائیں ـــــ اس کا نحیف جسم اس دھکا پیل کے لئے تیار نہ تھا۔

جھیل کا یہ پانی بھی اس کی طرح دریا کی روانی سے شکست کھا کر پرے ہٹ گیا تھا۔ ایک طرف، راستے سے دور، تاکہ دھکم پیل کی روانی میں مخل نہ ہو، تاکہ دوسروں کے پاؤں تلے روندا نہ جائے۔ اس کو اس پانی کی سطح ایک تھکے ماندے مسافر کے سینے کی طرح اوپر نیچے ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ اس خیال سے اُس کی سانس پھول جاتی جیسے تھکن سے چُور ہو گیا ہو، اور سانس کی تنگ نالی اس بڑھتے ہوئے سیلاب کی متحمل نہ ہو سکتی ہو، ایسے ہی اس کو محسوس ہوتا کہ اس کا گلا گھٹ رہا ہے۔ اور سانس رک رہی ہے۔ مگر جونہی وہ ایک سنگریزہ جھیل کی پرسکون سطح پر پھینکتا، پلومپ کی آواز سن کر اور گڑھا دیکھ کر اس کی سانس اصلی رفتار پر آجاتی۔ اور وہ ایک دفعہ پھر ننھی جھیل کی طرح مطمئن ہو جاتا۔

یہ خیال کہ وہ سکول کے دوسرے لڑکوں کی طرح خوش نہیں رہتا، شرارتیں نہیں کرتا، اچھلتا کودتا نہیں، اس کو کبھی تکلیف نہ دیتا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ اپنی فطرت میں ابدی اُداسی اور جمود لے کر پیدا ہوا ہے۔ ماں جب کبھی کہتی "بیٹا تم بھی دوسرے بچوں کی طرح ہنسا کھیلا کرو۔" تو اس کو یوں معلوم ہوتا کہ اس کو کسی ارتکاب جُرم کے لئے کہا جا رہا ہے۔ وہ ماں کی طرف اس طرح دیکھتا جیسے اس کی بات نہ سمجھ سکتا ہو۔ کیا اس کی اپنی اُداسی اس کی ماں کی اُداسی کا عکس نہ تھی؟ جب وہ پیدا ہوا تو اس کا باپ مر گیا۔ گویا اس کے باپ کی زندگی آہستہ آہستہ اس کے جسم میں حلول کر گئی تھی۔ ایک یہی جائداد تھی جو اس کا باپ ورثہ میں اس کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ اگر زندگی ایک تھی تو جینے والے دو کیسے ہو سکتے تھے۔

وہ جب کبھی اپنی ذات کا مطالعہ کرتا تو محسوس ہوتا کہ اُس کی ماں کی حسرتیں کبھی پوری نہ ہوں گی۔ وہ زندگی میں کامیاب نہ ہو سکے گا وہ دلھن بیاہ کر نہ لائے گا۔ پوتے دادی کی گود میں کبھی نہ کھیلیں گے۔ وہ اگر سکول بھی جاتا تھا تو یہ امر مجبوری ماں کا دل رکھنے کے لئے۔ جو اس کے سکول کے اخراجات پورے کرنے کے لئے دن رات محنت مزدوری کرتی۔ وہ اگر اب تک ہر کلاس میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا تھا تو اپنے ذہن کے بل بوتے پر۔ اس کو یقین تھا کہ وہ ماں کی خواہشات کی کومل کلیوں کو پھول بننے سے پہلے ہی روند دے گا۔ اس لئے نہیں کہ یہ ارادہ اس بھیانک فعل کا باعث ہوگا، بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی ساخت میں ایک ایسا اساسی نقص پاتا جو دُور رکئے دُور نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے خمیر میں زندگی کش جراثیم رینگ رہے تھے جو گھن کی طرح آہستہ آہستہ اس کے کمزور جسم کو کھائے جا رہے تھے۔ بھلا ماں کی محبت بھری نگاہیں جن میں آئندہ اُمیدوں کی جھلک پائی جاتی تھی ان خطرناک جراثیم کو کہاں ہلاک کر سکتی تھی؟

"پلومپ، پلومپ . . . " کیا وہ پاگل تو نہیں تھا جو اس ننھی سی جھیل سے درسِ زندگی لے رہا تھا۔ آخر بہتا ہوا دریا بھی تو اس کے پیشِ نظر تھا۔ اس کی لہریں پکار پکار کر زندگی کی جانب بلا رہی تھیں۔ جینے اور جی کر کامیاب ہونے کی دعوت دے رہی تھیں۔ دریا کا یہ کشادہ پاٹ کئی ہزار میل مردہ زمین کو زندگی بخشنے کا ذمہ دار ہوگا۔ اور یہ ننھی جھیل تو زندگی کا گھن تھا جو ہر لحظہ کنارے کو کھائے جا رہا تھا۔ آخر ایک دن کنارہ پانی میں گر جائے گا، یہ کہاں تک ان مسلسل چرکوں کا متحمل ہو سکے گا ـــــ اس نے زور سے ایک سنگریزہ دریا کے پاٹ پر پھینکا۔ چند قطرے مچل کر فضا میں اچھل گئے اور پھر دریا سے ہمکنار ہو کر رواں ہو گئے۔ نہ پلومپ سنائی دیا، نہ گڑھا دکھائی دیا ـــ

نہیں نہیں، اس تنگ و دو کی زندگی میں لطف نہیں۔ سوچ کر اس نے ایک سنگریزہ جھیل کی سطح پر پھینکا، جو شاید پہلے ہی اس چھیڑ کی منتظر تھی، پلومپ قہقہہ بلند ہوا اور پرسکون گزرتا — یہ ہے زندگی،

وہ صبح ناشتہ کرکے بغل میں دو چار کتابیں دبائے گھر سے نکل آتا، تاکہ تنہائی میں دریا کے کنارے اُگے ہوئے درختوں کی چھاؤں میں مطالعہ کرے۔ عموماً وہ اپنے آپ کو مجبور کرکے کتابوں کی جانب متوجہ رہتا۔ پڑھنے کے دوران میں بھی پلومپ اس کو اپنی جانب کھینچتی رہتی۔ پڑھتے پڑھتے اس کی نگاہیں جھیل کی جانب اٹھ جاتیں۔ اس کو محسوس ہوتا کہ کوئی دریا کے کنارے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے، اس خیال سے وہ جلدی جلدی سبق ختم کرنے کی کوشش کرتا، بغیر کچھ سمجھتے ہوئے، اس کو تو دس صفحے ختم کرنے ہوتے تھے۔ کچھ یاد ہو، نہ ہو، وہ سورج کے افق پر جانے کا منتظر رہتا تاکہ وہ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پلومپ کے پاس پہنچ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے اور کانوں کو سیراب کرے۔ وقت قریب آتا تو کتاب خود بخود بند ہو جاتی، اور قدم بے اختیار اس جانب اٹھ جاتے۔ وہ قریب پہنچتا تو اس کے قدم لڑکھڑا جاتے۔ سانس تیز ہو جاتی اور آنکھیں جھک جاتیں جیسے وہ کسی منتظر حسینہ سے شرما رہا ہو۔ وہ حسبِ معمول کنارے پر بیٹھ جاتا اور کچھ دیر جھیل کی پرسکون سطح کو گہری نظروں سے دیکھتا۔ پھر اس کا ہاتھ خود بخود گرم ریت میں گھس جاتا اور... "پلومپ" جیسے وہ روز کی طرح چھیڑ رہا ہو اور روز کی طرح چھیڑ کے جواب میں لوچدار قہقہہ اور پرسکون گزرتا پڑ رہا ہو۔ "پلومپ" پانی کے صاف اور شفاف قطرے سطح سے اوپر اس طرح اچھل جاتے جیسے چھیڑ چھاڑ کے دوران میں سفید موتیوں کی مالا ٹوٹ جائے اور موتی بکھر جائیں۔

اس نے دیکھا کہ جھیل روز بروز اس کے قریب آ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ اپنی پلومپ کہنے والی زبان سے مٹی چاٹ چاٹ کر، پانی کی دو ننھی ننھی شاخیں تو بالکل اس کے قریب آگئی تھیں، دو پھیلے ہوئے سیمیں بازوؤں کی طرح جو دونوں محبت سے اُس کے پاؤں چھو لینا چاہتے ہوں۔ اس نے سوچا کہ اس بظاہر پرسکون اور مطمئن جھیل میں بھی حرکت پائی جاتی ہے، دریا کا تیز رَو پانی بہا جا رہا تھا، اس کا اثر کنارے پر قطعاً نہیں تھا۔ مگر یہ چھوٹا سا بے ضرر آبی ٹکڑا کس طرح کنارے کو کھائے جا رہا تھا۔ زندگی کش جراثیم کی طرح، جو اس کے جسم کے اندر بھی موجود تھے، اور جو آہستہ آہستہ مگر بالیقین اس کے جسم کو کھائے جا رہے تھے۔

وہ فیل ہو گیا، تو اس کو قطعاً شرم محسوس نہ ہوئی، وہ یہ خبر سن کر دریا کے کنارے پہنچا۔ اپنی "پلومپ" کو ملنے کے لئے بیتاب — مگر وہاں نہ تو ننھی منی جھیل تھی، نہ پھیلے ہوئے سیمیں بازو، کنارہ گر کر دریا کا ایک حصہ بن چکا تھا، پلومپ کا پرسکون سکن مٹ چکا تھا اور اس کی جگہ اضطراب نے لے لی تھی۔ دریا کی تیز لہریں آ آ کر کنارے کے ساتھ ٹکرا رہی تھیں اور ٹکرا کر پھر دریا سے ہم آغوش ہو رہی تھیں۔ حدِ نظر تک ایک مسلسل اور لامحدود حرکت ہی حرکت تھی۔ کہیں کہیں جہاں پانی کنارے کے اندر تک چلا گیا تھا وہاں بھی بھنور بے قرار تھے۔ دریا کے پاٹ پر لہریں اُچھل اُچھل کر ایک دوسری سے آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروفِ پیکار تھیں — حرکت — حرکت، یہاں وہاں، ادھر اُدھر، دنیا گھوم رہی تھی، بے حد تیز رفتار سے۔ ہزاروں انجنوں کے پوری رفتار سے چلنے کی آواز آ رہی تھی، کھٹا کھٹ، چھکا چھک، زمین کی تہ میں لاوا ابھر گیا تھا، جس کی حدت سے زمین ہلنے لگ گئی تھی زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکلی جا رہی تھی، بھاگی جا رہی تھی، دریا کا پانی زمین کی ہمرکابی کے شوق میں پوری شدت سے رواں دواں تھا۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی اس کے کانوں میں کہہ رہی تھی، "بھاگو بھاگو، آؤ آؤ" وہ اس عام حرکت میں زیادہ دیر جم کر نہ کھڑا رہ سکا۔ اُس کے قدم خود بخود اُٹھ گئے، اور وہ تیزی سے چلنے لگا۔ سب کچھ بھاگا جا رہا تھا، اس کو پیچھے نہ رہنا چاہیے وہ بھاگنے لگا، بے حد تیزی سے، گویا پر لگ گئے ہوں۔ ہوا اس کے کانوں میں شائیں شائیں کرتی ہوئی پیچھے کی سمت جا رہی تھی

نہیں وہ ہوا کو پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا ——— وہ مقابلے کی دوڑ میں دوڑنے والا امیدوار تھا ——— اس کو اوّل آنا چاہیئے ——— وہ اوّل آ کر رہے گا۔

وہ ہانپتا ہوا گھر پہنچا تو اس کی دل شکستہ ماں جو حوصلہ شکن خبر سن چکی تھی اپنے بیٹے کے انتظار میں اس کی راہ تک رہی تھی وہ ہانپتے ہوئے بولا ——— "ماں میں فیل ہو گیا ہوں"۔ مگر کچھ اس لہجہ میں کہ خوشخبری سنا رہا ہو۔ ماں کا چہرہ گلاب کی طرح کھِل گیا، اس نے اپنے بیٹے کے چہرے پر کبھی اتنی رونق نہ دیکھی تھی ——— اور نہ آنکھوں میں اتنا یقین، ——— اس کا بیٹا زندگی کے امتحان میں پاس ہو چکا تھا۔

مسعود شاہد

غزل

پھر سرِ شام نئے جام درخشاں ہوں گے
پھر یہ افسردہ در و بام درخشاں ہوں گے

رنگ افروزِ لب و عارضِ سیمیں کے طفیل
آج پھر موردِ آلام درخشاں ہوں گے

پھر انہیں مست نگاہوں سے یہ رنگیں چہرے
صورتِ بادۂ گلفام درخشاں ہوں گے

جن کی رخشندہ نگاہی کو ہے بیتاب نظر
وہ ستارے بھی لبِ بام درخشاں ہوں گے

اک جھکتی ہوئی تہمت کا سہارا لے کر
حسن پر عشق کے الزام درخشاں ہوں گے

صبحِ امید سے چھٹ جائے گی شب رنگی یاس
اور لمحاتِ سیہ نام درخشاں ہوں گے

مختصر یہ کہ وہ آئیں گے بصد ناز و خرام
نقشہائے غم ایام درخشاں ہوں گے

کیف عرفانی

رُباعیات

اک آہ بھی کارگر نہیں ہو سکتی — اک سانس بھی معتبر نہیں ہو سکتی
پروردۂ برق ہے نظامِ ہستی — تسکینِ دل و نظر نہیں ہو سکتی

برسات میں برگ و بار دُھل جاتے ہیں — گلشن نہیں کوہسار دُھل جاتے ہیں
ایسی بھی کوئی گھٹا برستی اے کاش! — جس سے دل کے غبار دُھل جاتے ہیں

سوتی ہوئی زندگی کو چونکانا ہے — بھٹکے ہوئے دل کو راہ پر لانا ہے
شعلوں پہ بھی احتساب کرنا ہوگا — بجھتی ہوئی آگ کو بھی بھڑکانا ہے

سینہ مہ و کہکشاں کا شق ہو جائے — سورج کی جبیں عرق عرق ہو جائے
انسان کا غم اگر کہیں ظاہر ہو — تنظیمِ جہاں ورق ورق ہو جائے

ہر ذرہ حریفِ ماہ بن جاتا ہے — ہر نقش دلیلِ راہ بن جاتا ہے
دل ہو جو غنی تو ملک و دولت کے بغیر — درویش بھی کجکلاہ بن جاتا ہے

اے دوست مصیبتوں سے گھبراتا ہے — اللہ کی نعمتوں کو ٹھکراتا ہے

معلوم ہے سوزِ غم کی گرمی پاکر — انساں کا ضمیر تک نکھر جاتا ہے

دنیا کی ہَوا بدل رہی ہے ساقی — اخلاق کی شاخ جل رہی ہے ساقی
کیا ظلم ہے اس جہاں کی اک اک نیکی — سانچے میں بدی کے ڈھل رہی ہے ساقی

چلتی ہیں خنک خنک ہوائیں ساقی — اُٹھی ہیں وہ جھوم کر گھٹائیں ساقی
میخوار ہی مدح خواں نہیں ہیں تیرے — بوتل کی زباں پہ ہیں دعائیں ساقی

برسات میں بھی عجب کشش ہے ساقی — سبزے کا عمل روش روش ہے ساقی
پھولوں کی جبیں پہ جھلملاتی شبنم — تتلی کے لئے یہی رَمَش ہے ساقی

انسان تمام عُمر رو سکتا ہے — تقدیر کے داغ کون دھو سکتا ہے
اُمید کی جستجو میں جینے والے — سایہ بھی کہیں اسیر ہو سکتا ہے

چھُوٹے ہوئے تیر پھر نہیں مُڑ سکتے — زخمی ہوں جو بال و پَر نہیں اُڑ سکتے
تسکین سے قلب شادماں کیا ہوگی — ٹُوٹے ہوئے آئنے نہیں جُڑ سکتے

جس نے اپنی خودی کو پہچانا ہے — اللہ کو جانا ہی نہیں مانا ہے
بے سوزِ یقیں یہ زندگی ہے لعنت — دُنیا کو یہی سبق تو سمجھانا ہے

ماہر القادری

نقشِ رنگیں

(تمثیلچہ)

(چار پانچ بچوں کی آوازیں جو ریل گاڑی بناکر کھیل رہے ہیں)
ب - (انجن کی سیٹی کی نقل اتارتے ہوئے) کُو وو وو۔
سرا - چھک - چھک
سرا - گاڑی چل پڑی - چھک - چھک - چھک چھک - پھر د
آوازیں ایک ساتھ - کُو وو وو وو ---)
شیدہ - بھابی بھابی، دیکھو یہ فوج پھر اندر گھس آئی۔
ابی - (فاصلہ پر سے) ارے او جگو نالائق - سنتا ہے نکل
یہاں سے - گدھا کہیں کا - تو سب کا سرا ہے - بنا
پھرتا ہے رِنگ لیڈر - میں نعمی کو نہلا لوں - ابھی تیری
خبر لیتی ہوں - ناک پونچھ جوجی کی - سنتا ہے -
یدہ - ہائے میرے دوپٹے سے ناک پونچھ دی - چھوڑ دے
دوپٹہ - بدتمیز - کہاں سے لے آتے ہیں یہ کپڑے نکال
کر - صبح سے ڈھونڈ رہی تھی - تمھارے بچے تو آفات
ہیں بھابی - ناس کر دیا میرے دوپٹے کا - ابھی کل ہی
لگایا تھا کلف -
ابی - رشیدہ، یہ میرے بچے نہیں - تمھارے بھائی کے بچے ہیں
وہ بھی تو بچپن میں آسمان میں تھگلی لگاتے تھے -
یدہ - شرارت اور چیز ہے بھابی - بدتمیزی اور باجی پن
اور چیز ہے - لوگوں کے بچے دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں
شائستہ - باتمیز .....
ابی - کاہے کو میں نے دیکھے ہیں لوگوں کے بچے - میں تو بھاڑ
جھونکتی رہی ہوں - بول جگو کے بچے دوپٹہ کون لایا
تھا - لوا، تو تاکو، (رشیدہ ...)

جگو - محسن کہتا تھا لے آ - ڈرامہ ڈرامہ کھیلیں گے -
بھابی - (ہنسی سے) ڈرامے کا بچہ - بڑا آیا آغا حشر - چل
جا کر قمیص بدل -
رشید - آپ کے اسی لاڈ پیار نے تو ان کا ستیہ ناس کر دیا ہے
بھابی - میرے لاڈ پیار نے نہیں، ان کے باپ کے چونچلوں
نے بگاڑا ہے انھیں - سارا دن تو دیکھتی ہو ڈانٹ
ڈپٹ کرتی رہتی ہوں اور کیا کروں خون بہا دوں
ایک آدھ کو سنکھیا دے دوں -
رشیدہ - جو مرضی میں آئے کرو میں تو چلتی ہوں (جاتے جاتے
آہستہ سے) چلی بچوں کو اب سنکھیا دینے بھوری رانی -
یہ فوج ہی کیوں جنی تھی پہلے - (وقفہ)
بھابی - محسن وہ تولیہ دینا مجھے - ارے یہ تیل کی بوتل کیوں
اٹھائے پھرتے ہو - کیا اسے توڑنے کی صلاح ہے -
جگو - سر میں تیل لگا دو امی!
بھابی - لگا دیتی ہوں، کیوں مرا جا رہا ہے - پہلے جا کر اپنی
نکر اٹھا لا - باہر الگنی پر پڑی ہے - اور ہاں شرارتن
سے سرمہ دانی بھی لے آیو، اس نے صبح رکھی تھی کہیں
چاند سا مکھڑا نکل آیا میری ناجو کا - چل میری ناجو تیار
ہو گئی - کتنا اچھا کرتا پہنا ہے میری ناجو نے - تو اب
ادھر آ جوجی، تیری ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے - اب
اگر تم نے رومال کہیں گم کیا تو دیکھنا یہی ناک کاٹ ڈالوں گی
تمھاری - سے نغراک ہیں، ادھر کر بازو ادھر (تنک کر)
ادھر - چل میری طرف منہ کر کے بال بنوا - چل جا

تو آمحسن اب - ارے پگلے دوسرے بوٹ میں پاؤں
ڈال، دایاں پاؤں بائیں پاؤں کے بوٹ میں ڈال
رہا ہے -

جُجو - یہ لو سرمے دانی اتی -

بھابی - مجھے دو - ارے جُجو سرمہ تو ڈلوا لے - ٹھہرا بھی نہیں،
تم نے اب اگر قمیص میلی کی تو دیکھنا تمھاری کس طرح
مرمت کرتی ہوں - سنتے ہو محسن تم سے کہہ رہی ہوں،
کس طرح بھیگی بلّی بنا کھڑا ہے - اور جوجی اگر تم نے
اپنے فراک کو دانتوں میں چبایا تو میں چبا جاؤں گی
تجھے - سنتی ہو، ادھر آ آنکھوں میں سُرمہ ڈلوا - چل جا
ٹھہرو - ادھر آؤ سب، سنو رشیدہ پھپھی کی سہیلیاں
آرہی ہیں آج - تم میں سے کوئی ان کے کمرے میں مت
جائے - سنتے ہو جُجو -

جُجو - جی ہاں،

بھابی - کیا کہا ہے میں نے ؟

جُجو - چھوٹی پھپھی کے کمرے میں کوئی نہ جائے -

بھابی - نہ کوئی کمرے میں جائے نہ کوئی جھانکے - سنا - جب
میں بلاؤں یا رشیدہ بلائے تو اندر جانا ہے - اگر کوئی
بن بلائے گیا یا اُدھم مچایا کسی نے تو دیکھنا پھر - اور
اگر کسی نے کوئی چیز مانگی یا ضد کی، تو اس کی خیر نہیں
آج، جاؤ اب باہر جا کر کھیلو -

(وقفہ)

رشیدہ - سلیمہ لو چھ بھی بج گئے - وِدیا تو نہ آئی -

سلیمہ - میں کہتی ہوں رشیدہ اب اس کا انتظار فضول ہے
تم بتاؤ اس نے وعدہ پورا کب کیا ہے -

رشیدہ - تو پھر منگوا لوں چائے -

سلیمہ - منگوا لو - اب اور کوئی کتنا انتظار کرے کسی کا -
ہاں وہ شاید نہ آئے - اُس کی تو جیجی اور بچے آئے
ہوئے ہیں - آج کل ان کے گھر میں تو بچوں کا راج ہے،
میں ایک روز گئی تھی - جو حالت کر رکھی تھی اس کے کم
کی ان بچوں نے توبہ ......

رشیدہ - یہ بچے تو واقعی ایک مصیبت ہیں سلیمہ - میری بھابی ایک
مہینے سے آئی ہوئی ہیں - یقین جانتا ان بچوں سے ناکوں
ناک آچکی ہوں میں تو - گھر کی سب چیزیں اُلٹ پلٹ
ہر جگہ غلاظت، بدبو، صاف کراتے کراتے تھک جاتی
ہوں، گھر کی بھنگن بھی تو تنگ آگئی ہے - اب یہ کہیں
گھر جائیں تو سارا گھر فینائل سے دھلواؤں - یقین جانو
ان جُجو - جوجی - دو جی کا پیشاب گزوں فرش میں دھنس
گیا ہوگا فینائل سے اگر بدبو نہ مری تو دو دو چار چار فٹ
فرش نہ کھدوانا پڑے مجھے - توبہ کوئی بچے ہیں، ایک
آفات ہیں -

سلیمہ - (ہنسی سے) رشیدہ، یہ تو شادی کی پہلی خوشی ہے - گھر کی
پہلی برکت ہے - کیا ارادے ہیں تمھارے ؟

رشیدہ - بھاڑ میں جائے ایسی شادی - میں تو کبھی نہ کراؤں -
(آواز دیکر) بڑی بی - چائے لے آؤ -

سلیمہ - نکہت نے کرا لی - آمنہ بال بچوں والی ہوگئی - اور پھر
مزا یہ ہے کہ دونوں سے پہلے ثروت کی ہوئی جو سب سے
زیادہ شادی کی مخالفت کیا کرتی تھی - یاد ہے کیا کیا
کچھ کہا کرتی تھی ؟

رشیدہ - کیا ؟

سلیمہ - یہی کہ شادی کے بعد تمام طلسم ٹوٹ جاتا ہے - سپنوں کے
محل آنِ واحد میں گر پڑتے ہیں ......

رشیدہ - اس میں تو شک نہیں سلیمہ - کہتی تو ٹھیک تھی وہ - کمرے
صاف کرو - فرش دھوؤ - آگ جلاؤ - روٹی پکاؤ - خاوند
کے آگے پیچھے آئیں بائیں کرتے پھرو - اس کی مرضی پر جیو
اُس کی مرضی پر مرو -

سلیمہ - اور بچوں کی ایک فوج بھی ساتھ لئے پھرو -

رشیدہ - ہاں بچوں کی ایک فوج بھی لئے پھرو - اگر انھیں

مصیبتوں کا نام شادی ہے تو خدا بچائے۔

سلیمہ۔ اس سے تو واقعی بہتر ہے کہ عورت شادی نہ کرے۔ او
کچھ نہیں رات تو کسی کے تصور میں گزر جاتی ہے نا؟

رشیدہ۔ اور وہ تصور کتنا پر کیف ہوتا ہے سلیمہ۔ اپنی پسند کا مکان
اپنی پسند کا خاوند۔ اپنی پسند کا آرام۔

سلیمہ۔ گویا ہر چیز اپنی پسند کی، یوں سمجھو کہ ایک مثالی گھروندا

رشیدہ۔ بالکل!

سلیمہ۔ اور جب وہ پسند کا مثالی گھروندا گر کر ٹکڑے ٹکڑے
ہو جاتا ہے تو عورت ضرور پاگل ہو جاتی ہوگی۔

رشیدہ۔ پسند کے گھروندے گر کر پاش پاش ہوتے تو دیکھے
ہیں۔ مگر......

سلیمہ۔ عورت پاگل ہوتی نہیں دیکھی۔ یہی نا۔

رشیدہ۔ ہاں یہی، اب تم صوفیہ ہی کو لے لو۔ وہ کیا چاہتی تھی
اور اُسے کیا ملا؟

سلیمہ۔ اری صوفیہ، اہاہاہا۔ وہ تو بہت مسخری تھی۔ ابھی کل
ملی تھی، مجھ سے کہنے لگی، ہائے وہ کالج کے دن، وہ سپنوں
کی دُنیا کہاں غایب ہو گئی۔ پھر کہنے لگی، شادی نہ کرانا
سلیمہ سب تصورات تہس نہس ہو جائیں گے۔ اب تو
کوئی مسکرا کر بھی نہیں دیکھتا۔ میں نے کہا دیکھے بھی تو
کس طرح۔ شوہر ساتھ ہیں۔ گویا تمھارے مُنہ پر لکھا ہے
"یہ سیٹ بُک ہے"۔

رشیدہ۔ لو بڑی بی چائے لے آئی۔ تم ذرا ادھر ہو بیٹھو سلیمہ۔ ٹھہرو
بڑی بی میں میز پوش بچھا لوں۔ یہ مٹھائی وغیرہ اس
تپائی پر رکھ دو۔ بس اب تم جاؤ بڑی بی۔

سلیمہ۔ اس میں تو کسی کو شک نہیں نا کہ تم ہو بہت نفاست
پسند۔ ہر چیز کو اچھے طریقے اور سلیقے سے استعمال کرنا
تم پر ختم ہے۔

رشیدہ۔ بھلا وہ کیسے؟

سلیمہ۔ یہی دیکھو نا، یہ میز پوش ہے معمولی کپڑے کا مگر تم نے اس
نفاست سے اس پر پھول کاڑھا ہے کہ اس کی شان کہیں
سے کہیں جا پہنچی ہے۔ اور پھر میں دیکھتی ہوں کہ تمھاری
چیز کوئی ادھر سے اُدھر ہو جائے جب تک تم اسے قرینے
سے رکھ نہ لو تمھیں چین نہیں آتا۔

رشیدہ۔ یہ تو تم نے واقعی سچ کہا سلیمہ! ابھی کل کی بات ہے،
میرا بھتیجا۔ جگو میرے بستر کی چادر کا ایک کونا کھینچ کر نیچے
لٹکا گیا۔ میں اُس وقت ایک ضروری خط لکھ رہی تھی یقین
جانا خط لکھنا میرے لئے مصیبت بن گیا۔

سلیمہ۔ (چھوٹی سی ہنسی ہنس کر) کیونکہ چادر کا ایک کونا لٹک رہا تھا۔

رشیدہ۔ ہاں اٹھ کر چادر کو چاروں طرف سے برابر کیا۔ اس کی
سلوٹیں درست کیں۔ تب کہیں جا کر میں خط لکھنے کے
قابل ہوئی۔

سلیمہ۔ فریدہ اور نجمہ سچی ہیں جنھوں نے تمھارا نام "نقش رنگیں"
رکھ چھوڑا ہے۔ کتنا موزوں نام ہے نقش رنگیں۔

رشیدہ۔ خیر یہ تو ان کا مبالغہ ہے۔

سلیمہ۔ میں کہتی ہوں وہ شخص کتنا خوش نصیب ہوگا رشیدہ جس
کی قسمت میں تم جیسی صفائی پسند اور نفیس مزاج لڑکی
لکھی ہوگی۔ تمھارے تو پیر دھو دھو کر پینے چاہئیں
تمھارے بنّے کو۔

رشیدہ۔ اچھا کو نہیں۔ بولو کتنی چینی ڈالوں؟

سلیمہ۔ بس بس دو چمچے — ایں یہ باہر چیخ کون رہا ہے؟

رشیدہ۔ یہ میرے بھائی جان کی سب سے چھوٹی بچی ہے۔ ابھی
تو بسم اللہ کی ہے اس نے۔ یہ چیخنا چلانا آہستہ آہستہ
بڑھے گا۔ یہاں تک کہ یہ ننھی منی سی گڑیا آسمان سر پر
اٹھائے گی (ہنس کر) ہے نا جیسے کوئی بھینسا چیخ رہا ہے۔

سلیمہ۔ ارے یہ تو بس ہی نہیں کرتی۔

رشیدہ۔ تم چائے کی طرف دھیان دو۔ میری بھابی جان کی مُنیا
کم از کم دو گھنٹے اسی طرح روئے گی۔ پھر روتے روتے سو جائے گی
اور جب اٹھے گی تو پھر رونا شروع کر دے گی۔

سلیمہ۔ مگر اس طرح کیوں؟
رشیدہ۔ بس قسمت ہماری۔ اور ہم سے بڑھکر ہمارے بھائی جان کی۔
سلیمہ۔ وہ کیسے؟
رشیدہ۔ اس لئے کہ یہ ہماری بھابی، اور ہمارے بھائی جان کی گھروالی ہیں۔ بچوں کی پرورش کا دارومدار تو ماں پر ہوتا ہے۔ اگر ماں ہی الٹ پلٹ لاڈ پیار سے بچوں کو بگاڑ دے تو باپ کا اس میں کیا قصور۔
سلیمہ۔ تو تمھاری بھابی کے بچے بگڑے ہوئے ہیں؟
رشیدہ۔ لفظ بگڑنا ان کے لئے نرم لفظ ہے۔ اگر یہ بچے یہاں تشریف لے آئیں تو تیری کیا مجال کہ تو یہ سموسہ منہ میں ڈال سکے۔
سلیمہ۔ (ہنسکر) اچھا اس حد تک۔
رشیدہ۔ کوئی دس دن ہوئے ہیں خالو ابا کے ہاں میلاد شریف پر جانا تھا۔ منجھلی لڑکی جو ضد پر آئی تو رو رو کر گھر بار کو پریشان کر دیا۔
سلیمہ۔ کیا نام ہے اُس کا؟
رشیدہ۔ نام تو خیر سے ناز بیگم ہے۔ لاڈ سے ناجو ناجو کہتے ہیں، لیکن اگر یہ ذات شریف رونے پر آجائیں تو مجال ہے، چپ کر جائیں۔ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیں گی۔
سلیمہ۔ رونے اور ضد کرنے کی اسی کو عادت ہے، یا سب....
رشیدہ۔ کمال کرتی ہو تم بھی سلیمہ۔ میں نے کہا ہے بڑے سے لیکر چھوٹے تک سب برابر ہیں۔ اگر کہو تو کسی ایک کو بلواؤں؟
سلیمہ۔ نہ بابا، چائے تو آرام سے پی لینے دو۔ ہاں بھابی کو بلواؤ یہ باہر تمھاری بھابی بول رہی ہیں؟
رشیدہ۔ ہاں!
سلیمہ۔ کتنی پاٹ دار آواز ہے۔
رشیدہ۔ خاک۔ اگر اس آواز کو پاٹ دار آواز کہتی ہو تو کرخت آواز کو کیا کہوگی۔ یہ سنو تو کس کرختگی سے بول رہی ہیں۔ سلیمہ تم نے میرے بھائی جان نہیں دیکھے؟
سلیمہ۔ نہیں۔
رشیدہ۔ اُن سے ملو تو دیکھو ان کی آواز میں کتنی ملائمت ہے۔ ان سب بچوں کی بھونڈی آواز ماں پر گئی ہے۔
سلیمہ۔ شکل صورت؟
رشیدہ۔ ان بچوں کی؟
سلیمہ۔ ہاں!
رشیدہ۔ ماں پر۔ ہمارے بھیا تم نے دیکھے نہیں بڑے خوش شکل ہیں ہاں ان بچوں میں ایک محسن ہے جس کا چہرہ مہرہ بھیا پر ہے
سلیمہ۔ کتنے بچے ہیں تمھارے بھائی جان کے؟
رشیدہ۔ پانچ ہیں، عنقریب چھ ہو جائیں گے۔
سلیمہ۔ (ہنسکر) بہت شریر ہو تم۔
رشیدہ۔ ہر سال ایک بچہ
سلیمہ۔ سچ؟
رشیدہ۔ ہاں ہاں، ابھی اس روز بھابی سے چچا ابا کہہ رہے تھے کہ اگر یہی رفتار رہی تو کیا بنے گا؟
سلیمہ۔ تمھاری بھابی کی صحت کیسی ہے۔ بلواؤ ذرا دیکھوں تو۔
رشیدہ۔ کیا دیکھوگی؟ موٹی سی ہیں پھدر پھدر چلتی ہیں۔ ہمارے بھیا سے کہیں بڑی لگتی ہیں۔
سلیمہ۔ یہ جو چق کے سامنے سے بھاگ کر گیا ہے، کون تھا یہ۔
رشیدہ۔ یہ سب سے بڑا لڑکا ہے مجو۔ یہ بڑے میاں جب غصے میں آتے ہیں تو اپنا کرتا دانتوں میں چبا چبا کر دھجیاں اُڑا دیتے ہیں۔
سلیمہ۔ اوں۔ ہیں اب دو اور بھاگے ـــ یہ مٹھیوں میں کیا لے جا رہے ہیں؟
رشیدہ۔ سان کی رگ کو میں نے ہی پایا ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتیں، مٹھیوں میں چینی بھری ہوئی ہے۔ یہ باہر جا کر پھانکی جائیگی
سلیمہ۔ او تو یہ۔ خوب پہچانا تم نے۔ لو پھر چینی کی مٹھیاں بھر کر باہر گئے۔ رشیدہ بھابی سے کہتی کیوں نہیں کہ بچے چینی کی مٹھیاں بھر بھر کے جا رہے ہیں۔
رشیدہ۔ مجھے ایک گھڑی تو چین سے بیٹھ لینے دے سلیمہ۔ میں

تو ان بچوں کی عادتوں سے تنگ آچکی ہوں۔ سارا
سارا دن ناک بہتی رہتی ہے۔ ڈانٹو ڈپٹو تو پوچھو ہیں گے
ورنہ نہ بچوں کو ہوش ہے، نہ ان کی ماں کو۔ اب
تمہارے ماموں کی بچی ہے۔ کیا نام ہے اُس کا؟

سلیمہ۔ لبنہ!

رشیدہ۔ ہاں لبنہ، ابھی چھوٹی سی ہے۔

سلیمہ۔ ڈیڑھ ایک برس کی ہے۔

رشیدہ۔ ہاں اتنی ہی ہوگی۔ کتنی اچھی عادت ہے۔ ناک بہے تو
ماں کے پاس آجاتی ہے۔ اور پھر اوں آں کرکے کسی نہ
کسی اشارے سے بتا دیتی ہے کہ پیشاب آیا ہے۔ مگر
ہمارے یہاں تو یہ حال ہے کہ ان بچوں کا اونٹ جتنا
قد ہونے کو آیا مگر پیشاب ہوگا چارپائی پر اور بچھونے
تو پاخانہ سے لت پت ہی رہتے ہیں۔ انھوں نے تو
سارے گھر بار کو سنڈاس بنا رکھا ہے۔

(موسیقی کی اُداس تانیں جن سے کسی کی شکست
کا اظہار ہو)

رشیدہ۔ سلیمہ تجھے کیا ہوگیا، تو تو پہچانی نہیں جاتی۔ پنجر نکل
آیا تمہارا تو، نہ وہ بھرے بھرے بازو۔ نہ وہ رنگ و
روغن۔ شادی کیا ہوئی تمہارا تو حلیہ ہی بگڑ گیا۔

سلیمہ۔ رشیدہ بہن، ڈیڑھ پسلی کی تو پہلے ہی تھی میں۔ اوپر
سے یہ اولاد کا غم کھا گیا۔ ان سات برسوں میں پانچ
بچے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میرا ہی جگر تھا جو یہ غم پی گیا

رشیدہ۔ جبھی تو یہ حال کر لیا تم نے۔ کاٹو تو لہو نہیں۔

سلیمہ۔ تمہارے بھائی علاج کر کر کے ہار گئے پر میں ہوں کہ
بارہ مہینے کی مریض.....

رشیدہ۔ اچھا خدا کرے اب کے ہونے والا بچہ عمر خضر پائے۔

سلیمہ۔ تیرے منہ میں گھی شکر۔

رشیدہ۔ مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ تم یہاں ہوتی ہو۔ باتوں باتوں
میں بھابی سے معلوم ہوا کہ آج کل بھائی جان یہاں ہیں

اور تمہاری طبیعت بھی.....

سلیمہ۔ میں سوچ رہی ہوں رشیدہ۔ بڑے عرصے کے بعد ہماری ملاقات ہوئی

رشیدہ۔ اک زمانہ ہوگیا۔

سلیمہ۔ ساؤ کتنے بچے ہیں؟

رشیدہ۔ چھ ہیں خیر سے۔ پانچ لڑکیاں ایک لڑکا۔

سلیمہ۔ پانچ لڑکیاں؟

رشیدہ۔ ہاں تمہارے بھائی جان کو بے حد پیاری ہیں۔

سلیمہ۔ اور لڑکا بڑا ہے؟

رشیدہ۔ وہ تو اب ہوا ہے پانچ لڑکیوں کے بعد۔

سلیمہ۔ کس عمر کا ہے؟

رشیدہ۔ ڈیڑھ برس کا ہے تو جھروا اسا گریہ ہیں کہ لئے پھرتے ہیں

سلیمہ۔ اپنا خون ہے۔ لئے کیوں نہ پھریں۔ اللہ کی دین ہے
جیتے رہیں۔ (لڑکی روتی ہوئی آتی ہے)

رشیدہ۔ اری کیا ہوا تجھے روتی کیوں ہے۔ ایں ایں تیا بھی روئے
جا رہی ہے۔ آلّو نے مارا ہے کیا؟ (آواز دے کر)
الّو تو پھر ستاتی ہے اسے۔ باز آجا۔

آلّو۔ (باہر سے) نہیں امی میں نے نہیں مارا۔ اس نے اپنی
نکر میں مُوت دیا ہے۔

رشیدہ۔ (جھوٹی ہنسی ہنس کر) پھر کیا ہوا، جا باہر جا کر اپنی نکر
اُتار دے۔ آلّو بڑی آئی میری مُنیا کو دھمکانے والی۔
جا بٹیا نکر اتار دے باہر۔ (بچی جاتی ہے) دیکھ منیا کرتا
دانتوں میں مت چبا۔ سنتی نہیں مت چبا کرتا دانتوں میں

سلیمہ۔ آلّو سب سے بڑی ہے نا؟

رشیدہ۔ ہاں۔ آلّو اندر آؤ۔

آلّو۔ کیا ہے امی؟

رشیدہ۔ اری نگلی اپنی خالہ کو سلام کیا ہوتا۔ دیکھ یہ فراک تم نے
پھر میلا چکٹ کر لیا۔ سو مرتبہ کہا ہے مٹی سے نہ کھیلا کرو

آلّو۔ نہیں امی شوشو نے مجھ پہ چائے گرا دی ہے اور اب
آپ ہی رو رہی ہے۔

رشیدہ۔ اچھا جاؤ باہر جاکر کھیلو۔ شبّی کا خیال رکھنا۔ (لڑکی کے رونے کی آواز) کیا ہوا تمھیں شبّی۔ دیکھو زمین پر لیٹ رہی ہو۔ اٹھو مردنی، میں ماروں گی یاد رکھنا۔

اَنّو۔ (باہر سے) امی جُھنیا نے شبی کا تھوڑا سا سموسہ چھین لیا تھا

رشیدہ۔ چپ رہو شبّی۔ اٹھو، ادھر آؤ میرے پاس (لڑکیاں چیخیں مارتی ہوئی اندر آتی ہیں) بس بس چپ رہو۔ لیٹا نہیں کرتے اچھے لڑکے زمین پر۔ خالہ کیا کہیں گی میں نیا سموسہ دے دوں گی چپ رہ (لڑکی چپ ہو جاتی ہے)

سلیمہ۔ یہ شوشو سے چھوٹی ہے یا بڑی؟

رشیدہ۔ چھوٹی، اَنّو سے چھوٹی شوشو، شوشو سے چھوٹی یہ۔ اس سے چھوٹی مُنیا، مُنیا سے چھوٹی جُھنیا۔

سلیمہ۔ (ہنسکر) تم نے نام خوب چُن کر رکھے ہیں۔ اور جُھنیا سے چھوٹا؟

رشیدہ۔ اَلّو!

سلیمہ۔ دکھاؤ تو اَلّو۔ کہاں چھپا رکھا ہے اپنا لال تم نے؟

رشیدہ۔ اَنّو بیٹا، اَلّو کو لانا، خالہ دیکھیں گی، آرام سے لانا۔

اَنّو۔ (باہر سے) اچھا امی۔

سلیمہ۔ رشیدہ تم تو بھابی کا مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔ خدا را اس رفتار کو کم کرو۔

رشیدہ۔ (ہنسکر) یہ تو اللہ کی دین ہے سلیمہ (لڑکی پھر سے چیخیں مارنا شروع کرتی ہے) (ڈانٹ کر) چُپ رہ۔ چُپ جاؤ اَنّو اَلّو کو لینے گئی ہے جاؤ اَلّو کو لاؤ (لڑکی چپ ہو جاتی ہے)

سلیمہ۔ تم تو دن بھر ان بچوں سے جُٹی رہتی ہو گی۔ کیوں رشیدہ؟

رشیدہ۔ کچھ نہ پوچھو سلیمہ۔ ان بچوں نے تو زندگی کا ستیاناس کر دیا ہے۔

سلیمہ۔ میں کہتی ہوں بیماری شماری انسان کے ساتھ ہے خدا نہ کرے کبھی بیمار ہو جائیں تو.....

رشیدہ۔ (ہنسکر) بس ہسپتال سمجھو۔ کسی کی ٹانگ دبا رہی ہوں کسی کو سکور رہی ہے۔ پتیلیوں سا گودا نہ بکتا ہے۔ پھوڑے پھنسی کے موسم میں مرہم کا خرچ دال روٹی سے زیادہ ہوتا ہے۔ جدھر جاؤ تم مرہم کے غلیظ چیتھڑے پھاہے۔

اَنّو۔ لو اَلّو آیا۔ اَلّو آیا۔ اَلّو آیا۔

رشیدہ۔ ارے یہ اَلّو کے پیچھے پیچھے ساری لام ڈوری کیوں آ گئی۔ اری ناک تو پونچھ جُھنیا، سو دفعہ کہا ہے تمھیں ناک پونچھا کرو اپنی۔ تو بھی پونچھ اپنی ناک شبّی۔

سلیمہ۔ یہ تو بہت کمزور ہے رشیدہ۔

رشیدہ۔ دانت نکال رہا ہے۔

سلیمہ۔ معلوم ہوتا ہے بہت لاڈ پیار ہوتا ہے اَلّو کا۔ دیکھنا رشیدہ شوشو کس طرح اس کے گال سہلا رہی ہے۔

رشیدہ۔ شوشو اور مُنیا بے حد پیار کرتی ہیں اسے۔

اَنّو۔ اور میں امی جو دن بھر اٹھائے پھرتی ہوں۔

رشیدہ۔ تُو تو اَلّو میاں کی آپا ہوئی نا۔ لو اسے ادھر برآمدے میں لے بیٹھو۔ یہ بسکٹ کھلاؤ۔

سلیمہ۔ رشیدہ تمھیں تو ملنا بھی دوبھر ہو رہا ہے۔ میں حیران ہوں شادی نے تمھارا کیا حلیہ بنا دیا۔ تم تو پہلوان معلوم ہو رہی ہو۔ یہ گردن یہ بازو۔ یہ کولھے، یہ مٹاپا کہاں بکتا ہے۔ مجھے بھی بتاؤ۔ (رشیدہ کھسیانی ہنسی ہنستی ہے) تمھاری وہ صراحی دار گردن مور کی سی نپی تلی چال، وہ متناسب بدن کیا ہوا؟ وہ نقش رنگیں کہاں اُڑ گیا؟

بھابی۔ (داخل ہوتے ہوئے) دھبہ بن کر رہ گیا۔

(سلیمہ اور بھابی کے ہنسنے کی آواز)

سلیمہ۔ (ہنسی میں) آئیے بھابی جان خوب ہیں آپ بھی آپ کہاں تھیں؟

بھابی۔ پہلے چائے تیار کرائی۔ پھر رشیدہ کے ننھے کا پنگھوڑا دھلوایا۔

سلیمہ۔ کیوں؟

بھابی۔ صبح سے عذاب لگے ہوئے ہیں (تمسخر کا انداز) یقین جانو سلیمہ رشیدہ کے اَنّو شوشو مُنیا جُھنیا شبّی کا پیشاب گز بھر فرش میں دھنس گیا ہو گا فینائل سے اگر دھلوایا نہ جاتا تو مجھے چار فٹ فرش کھدوانا پڑے۔ توبہ کوئی بچے ہیں ایک آفات ہیں۔

آغا بابر

(پشاور ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوا)

پازیب

تو نے جب عہدِ جوانی میں قدم رکھا تھا
کئی شعلے ترے سینے میں بھڑک اٹھے تھے
تو نے سلگی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا تھا

چوٹ کے ساتھ اُجالا ہوا ارمانوں میں
کپکپاتی ہوئی تخئیل نے دیکھا جیسے
برق سے آگ لگا دی گئی طوفانوں میں

چھم چھا چھم کی صدا کان میں لہرا سی گئی
تیری کھوئی ہوئی پازیب کہیں بجتی تھی
'تیری پازیب کہیں اور؟ - حیا آ سی گئی'

میری خود رنگ طبیعت میں جلال آنے لگا
شاہزادی سے غرض؛ مجھکو مری شے سے غرض
یوں شہنشاہ کے ناموس سے ٹکرانے لگا

جرمِ انصاف میں جب طوق و سلاسل کا اسیر
کوچۂ سرد سے گزرا تو ادھر چلمن سے
ٹمٹمانے لگی جلتے ہوئے اشکوں کی لکیر

تجھ سے پہلے تری پازیب کو حاصل کر لوں
مجھ کو الزام نہ دے فرض سے مجبور ہوں میں
سیل کے واسطے تیاریٔ ساحل کر لوں

ڈھونڈ لوں وقت کی اُلجھی ہوئی رفتاروں میں
تاکہ تو جب بھی مرے سامنے ہو محوِ خرام
روح لہرائے لرزتی ہوئی جھنکاروں میں

ذہن کی لوح پہ اب بھی تو نظر آتے ہیں
تیری شبتاب جوانی کے شعاعی خد و خال
'تیری پازیب مگر... تیر چبھے جاتے ہیں'

ظہیر کاشمیری

افلاطون کا نظریۂ فن

ہیئت

ادب کی ہیئت کے ضمن میں افلاطون دو چیزوں پر بحث کرتا ہے۔ (الف) سادہ سادہ واقعہ نگاری، اور (ب) تقلید۔ واقعہ نگاری یہ ہے کہ اس میں شاعر کی اپنی حیثیت صاف ظاہر ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ کسی دوسرے کے تجربات کو اپنے انداز میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً "اس شخص نے یہ محسوس کیا" یا "اس نے فلاں کام کیا"۔ تقلید کی حیثیت یہ ہے کہ ادیب یا شاعر دوسرے کے جذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسے کہ وہ شخص خود بول رہا ہو۔ مثلاً "میں نے یہ محسوس کیا" ڈرامہ اس کی ایک مثال ہے۔ لیکن تقلید کو وہ دو معنوں میں استعمال کرتا ہے، ایک نقل کلام کے معنوں میں اور دوسرے ذہنی و عملی تقلید کے معنوں میں۔ دوسرے معنی وسیع ہیں۔ اور نقل کلام اس کا محض ایک اہم پہلو۔

تقلید کے جلد اور گہرا اثر کرنے کی خصوصیت کا افلاطون کو پورا احساس ہے۔ اسی لئے وہ ادب کو فرد کی تربیت کے لئے اتنی وقعت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ نقالی انسان کی فطرت میں گوندھ دی گئی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو ماحول کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ جو چیز اس کے سامنے آتی ہے وہ اس کی ذہنی طور پر تقلید کرتا ہے۔ وہ اس کی شخصیت پر انمٹ اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ بعد میں یہی اثرات اس کی شخصیت کا مستقل حصہ بن جاتے ہیں۔

واقعہ نگاری اور نقل کلام کی تشریح اور اس کی اہمیت کی توضیح کے بعد افلاطون اس چیز کا جائزہ لیتا ہے کہ آیا فرد واحد بہت سی چیزوں کا ایک کامیاب مقلد بن سکتا ہے۔ اس کا جواب وہ نفی میں دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح ایک کاریگر صرف ایک ہی فن کا ماہر ہو سکتا ہے اسی طرح شاعر صرف ایک ہی چیز کا مقلد بن سکتا ہے۔ طربیہ نگاری اور حزنیہ نگاری دونوں پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔

لیکن افلاطون اس چیز کا فیصلہ نہیں کرتا کہ آیا شاعر کو تمثیل نگار ہونا چاہیئے یا نہیں۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ ہونے والے والیان ریاست کے سامنے ایسا ادب پیش نہ کیا جائے جس میں بُرے لوگوں کا کردار بلا واسطہ اور براہ راست دکھایا گیا ہو۔ خواہ اس کا مقصد تذمیم ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ یہ چیز ان کی شخصیت پر اثر انداز ہو گی۔ جس سے ان کا اخلاق بگڑ جائے گا۔ ادب میں صرف اس چیز کو قبول کیا جائے جس میں شریف اور بلند کردار دکھایا گیا ہو۔

نقل کلام سے گزر کر افلاطون اداکاری کی طرف آتا ہے اور مندرجہ بالا چیزوں کی بنا پر اس کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ اداکاری میں انسان کرتا تو نقل ہے۔ لیکن دراصل وہ جس چیز کی نقل کرتا ہے۔ اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتا ہے۔ لہذا ہونے والے والیان ریاست کو ایسے لوگوں کا پارٹ ادا نہیں کرنا چاہیئے جس سے ان کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے اور جس سے ان کی شخصیت میں بگاڑ پیدا ہو۔ ان کا واحد کام ملک و وطن کی حفاظت اور آزادی کے لئے جدوجہد ہے۔ یہی کام ان کے لئے کافی ہے اور ان کا فرض اسی میں کمال حاصل کرنا ہے۔ چونکہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ فرد واحد ایک ہی فن میں کمال حاصل کر سکتا ہے لہذا اگر ہونے

والے والیانِ ریاست اپنی حرکات کو شرافت، وقار، تدبّر، جرأت اور ایسی ہی عمدہ صفات کے سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ دوسرے سانچوں میں بھی ڈھالنے کی کوشش کریں گے تو وہ ان کی شخصیت کو مختلف اور متناقض خصائل کا ایک بے ہنگم سا مرکب بنا کر ان کے اخلاق کو بگاڑ دیں گے انھیں چاہیئے کہ اپنی حرکات و گفتگو کو مہذب، شرافت، متانت اور جرأت کے سانچے میں ڈھالیں۔ لیکن کمینہ حرکات اور گفتگو کی نقالی سے باز رہیں۔ اس طرح افلاطون ان چیزوں کو یکے بعد دیگرے گنتا ہے جن کی نقالی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

(۱) عورتوں، مصیبت زدہ، مغموم اور شاکی لوگوں، عاشقوں، مزدوروں، غلاموں، گالیاں دینے والوں، منہ چڑانے والوں، غیر مہذب گفتگو کرنے والوں، شرابیوں اور پاگلوں وغیرہ کی اداکاری سے۔

(۲) کسی دوسرے پیشہ کے لوگوں مثلاً کشتی بانوں، چپو چلانے والوں وغیرہ کی نقل سے۔

(۳) جانوروں یا قدرتی طاقتوں مثلاً گھوڑوں، بیلوں، دریاؤں، سمندروں اور بجلی وغیرہ کی آوازوں کی نقل سے۔

ان چیزوں کی بحث کے بعد افلاطون کہتا ہے کہ ایک اچھا انسان کسی کہانی یا واقعے کو بیان کرتے وقت کرداروں کی شریفانہ حرکات و گفتگو کا کہیں کہیں تتبع کرے گا۔ لیکن جہاں کہیں ان لوگوں کے مرض، محبت یا نشے یا کسی اور وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھنے کا ذکر مقصود ہوگا تو اسے عام الفاظ میں بیان کرکے بے پروائی سے آگے گزر جائے گا۔

افلاطون اداکاری کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اس میں گوناگوں کرداروں کی نقالی کی وجہ سے بہت سے آہنگ و نوا اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ جو اخلاق کو بگاڑتے ہیں۔ برعکس اس کے واقعات کا سیدھا سادا بیان اس نقص سے آزاد ہے اور افلاطون کے نزدیک قابلِ ترجیح۔

اداکاری کے متعلق افلاطون کا نظریہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جس چیز کی تقلید کرتا ہے وہ اس کے افعال و عادات کا مستقل حصہ بن جاتی ہے۔ جو کچھ میری ذات اس وقت ہے، وہ میری ارثی خصوصیات اور ماحول کے متفقہ عمل کا نتیجہ ہے۔ ماحول نے ارثی خصوصیات پر اثر ڈال کر انھیں بیدار کیا۔ انھوں نے بیدار ہو کر اپنی جبلّت اور ماحول کے تقاضے کے مطابق کچھ عمل کیا۔ اس عمل نے جو کچھ خود ان کی خصوصیات بیداری کا نتیجہ تھا انھیں اور زیادہ جِلا دے کر میری شخصیت میں کچھ جگہ حاصل کرلی۔ یہ عمل بار بار دہرایا گیا تو جو اعمال میں ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے کرتا رہا۔ وہ میرے اخلاق کا مستقل حصہ بن گئے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میری موجودہ ذات، میری ارثی خصوصیات اور میرے پچھلے تمام اعمال کے چھوڑے ہوئے اثرات کا مرکب ہے اور میرے آئندہ اعمال اس موجودہ شخصیت کا نتیجہ ہوں گے تو اس میں شک کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

اداکاری کی اہمیت اسی حقیقت کی کسوٹی پر پرکھی جا سکتی ہے اداکاری میں کچھ اعمال عادے اور تواتر کے باعث عادت بن جاتے ہیں۔ اور عادت کو افراد و اقوام کی زندگی میں جو دخل ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ ایسے اعمال جن کی نقالی کسی اصول اور اچھائی کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہو شخصیت اور اعمال کو منظّم بنا دیتے ہیں۔ اور وہ اعمال جن میں کوئی رابطہ نہیں اسے بگاڑ دیتے ہیں۔ لیکن ایکٹنگ کو پیشے کے طور پر اختیار کرلینا، خواہ اس میں اچھے ہی اعمال کی تقلید کیوں نہ ہو تصنع اور سطحیت پیدا کر دیتا ہے۔ افلاطون شریفانہ حرکات کی تقلید کی ضرورت اس لئے محسوس کرتا ہے کہ عمدہ چیزوں سے جبلّی لگاؤ پیدا ہو جائے۔ تاکہ آگے چل کر عقل ان کا علم آسانی سے حاصل کر سکے۔

یہاں اداکاری کے ساتھ ادب اور اس کی ہیئت کا ذکر ختم ہوتا ہے۔

Process of Action[1]

پچھلی تمام سطور سے عیاں ہو گیا ہوگا کہ افلاطون ہر چیز میں سادگی اور آہنگ کا طالب ہے۔ سادگی کو وہ دو معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ پہلے یہ کہ کسی کو دیکھتے ہی یا محسوس کرتے ہی انسان اس کی حقیقت کو سمجھ جائے اس میں پیچیدگی کا نام تک نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی چیز میں ہم آہنگی ہو۔ ایک ایسی چیز جس میں ہزار پیچیدگیوں کے باوجود ہم آہنگی ہے اور جس کا ایک ایک جزو کسی وحدت میں مربوط ہے افلاطون کے نزدیک سادہ ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں وہ حسین کہتا ہے اور یہی اُس کے نزدیک حُسن کا معیار ہے۔ جس چیز کے اجزا میں ہم آہنگی نہیں، جس کے حصص کسی تناسب اور نظام میں بندھے ہوئے نہیں، وہی اس کے نزدیک غیر سادہ اور غیر حسین ہے۔

افلاطون کائنات میں بحیثیت مجموعی حسن دیکھ رہا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کا ایک ایک ذرّہ اجتماعی طور پر ایک جمیل نظام میں منسلک ہے اس میں ایک وحدت اور توازن قائم ہے۔ ایک عدل اور آہنگ ہے، اور اس عدل اور آہنگ، اس توازن اور وحدت، اور اس تناسب اور نظام کے ساتھ ساتھ اور اس کی تہ میں ایک اصول کام کر رہا ہے جو کسی عقل کے ماتحت چل رہا ہے۔ فن کار کا کام ہے کہ وہ اس حسن کو ہمارے سامنے آشکار کر دے اور اس وسیع عالم میں اس کا کھوج لگا کر جہاں کہیں اسے پائے ہماری آنکھوں کے سامنے لا رکھے۔ وہ جو کچھ ہمارے سامنے پیش کرے قباحت و کراہت سے مبرّا اور حسن و جمال کا حامل ہو۔

ان تمام چیزوں کو بیان کرنے کا مقصد افلاطون کے نزدیک اخلاقی و ذہنی حُسن جو کہ ایک ہی چیز ہے، پیدا کرنا ہے۔ حسنِ فطرت کا علم زیادہ تر دو راہوں سے آتا ہے آنکھ اور کان سے یعنی دیکھنے اور سننے سے۔ روح ان دو راہوں سے بیرونی جمال سے آشنا ہو کر اسے اپنا لیتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے انسان کی حرکات جسمانی اور اس کی گفتگو سے انسان کی حرکات اور گفتگو، اس کے اندرونی آہنگ و نوا، اس کے ذہنی جمال اور اس کے اخلاق اور روحانیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس بنا پر کہ یہ چیزیں انسان کی اندرونی کیفیات اور اس کی ذات کی مظہر ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نوا و آہنگ اور اخلاق میں ایک رابطہ و تعلق ہے۔

ان باتوں کو سمجھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اگر فن کار بہترین فن پیش کرے گا تو اس بہتر فن کے زیرِ اثر ہم اپنی روح کو اسی سانچے میں ڈھال لیں گے۔ کیونکہ فن روح کا مظہر ہے اور انسان کے ذہنی روابط کو ظاہر کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ روح کا مظہر ہے وہ ایک دوسری روح کو اپنے ہی رنگ میں اپیل کرتا ہے۔ کیونکہ انسانی روحیں ایک ہی اصل رکھتی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر فن میں آہنگ اور سادگی ہے تو وہ ہمارے اخلاق کو ہم آہنگ اور سادہ بنا دے گا۔ یہی سادگی، اخلاق افلاطون کے پیشِ نظر اس وقت تھی جب اس نے موادِ تعلیم کی توضیح کی۔ خدا کو اس نے اچھے، سادے، سچے اور غیر متغیر کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش کیا۔ عظماء کے بارے میں اُس نے اس بات پر زور دیا کہ انھیں متین اور ضبطِ نفس کرنے والوں کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ کیونکہ جس شخص میں ضبطِ نفس نہیں اس کی روح میں ہم آہنگی اور توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی ہم آہنگی اس کے نزدیک سادگی اور حسن ہے۔ سادہ سادہ واقعہ نگاری کو نقلِ کلام پر ترجیح دینے اور اداکاری کی مخالفت کرنے کے وقت بھی افلاطون کے پیشِ نظر یہی چیز تھی اور اب جبکہ وہ گیت اور فنونِ شبیہہ کی طرف آتا ہے تو اسی چیز کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

گیت

گیت کے لئے افلاطون ایسے سادہ سادہ ساز تجویز کرتا ہے جو صرف دو راگنیاں بجا سکیں۔ یعنی مصیبت اور جنگ میں بہادری اور امن میں شرافت اور حلم کے جذبات پیدا کرنے والے، ایسے ساز جن میں بہت سے تار ہوں۔ یا جو پیچیدہ گیت پیدا کریں۔ اس کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔ اسی طرح وہ ایسے نواؤں کو باقی رکھنے کی ہدایت کرتا ہے جو یہ مقصود پورا کریں۔

فنونِ شبیہہ

فنونِ شبیہہ بھی اُسی صورت میں قابلِ قبول ہیں جب وہ ایسے ہی عمدہ جذبات کی پرورش اور اخلاق کی نشوونما کریں۔ یہاں ادب، گیت اور فنونِ شبیہہ کے متعلق افلاطون کا نظریہ ختم ہوتا ہے۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ افلاطون حسن کو ایک خارجی حقیقت تصور کرتا ہے۔ اگرچہ عیاں طور پر حسن کی خارجیت کے مسئلہ کو زیرِ بحث نہیں لاتا۔ شاعر اور فن کار کا کام محض اس خارجی حسن کی تقلید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون نے کہا تھا کہ فنکار اشیا کے محض عکس پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی پیش کی ہوئی چیز حقیقت سے دور رہ جاتی ہے۔ موجودہ فن کار حسن کو عموماً ایک داخلی حقیقت سمجھتے ہیں۔ پچھلی صدی میں ایک فن کار نے کہا تھا کہ فطرت اور زندگی بذاتِ خود غیر حسین بلکہ نسبتاً قبیح ہیں۔ یہ فقط فنکار کا ذہن ہے جو اس میں حسن پیدا کرتا ہے لیکن ان دو نظریات کے علاوہ ایک تیسرا نظریہ ہے جس کے مطابق حسن خارجی اثرات اور داخلی کیفیات کے کیمیاوی عمل کا نتیجہ ہے۔ حسن داخلی نہیں، نہ ہی وہ خارجی ہے۔ لیکن چونکہ ایک خاص قسم کی شے ہی حسین ظاہر ہو سکتی ہے اور ایک خاص حالت میں ہی ذہن اس شے کو حسین دیکھ سکتا ہے اس لئے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ حسن خارجی اور داخلی حقائق کے مشترکہ عمل کا نتیجہ ہے۔ میں اس چیز کا فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہوں۔

ریاضت

جسمانی ورزشوں کا مقصد بھی روح کی تربیت اور بہتر اخلاق کی تربیت ہے۔ اس لئے افلاطون سادہ ورزشیں اور سادہ خوراک تجویز کرتا ہے۔ تاکہ زندگی میں سادگی اور اس سادگیٔ حیات سے معقولیت، صحت اور ضبطِ نفس پیدا ہو۔ افلاطون پیشہ ورانہ ورزشوں کے خلاف ہے کیونکہ ان سے جسم میں سستی اور غنودگی پیدا ہوتی ہے جو فرد کو چاق چوبند سپاہی بننے سے روکتی ہے۔

یہاں افلاطون کا نظریۂ فن ختم ہوتا ہے۔

پچھلی تمام سطور سے ایک چیز عیاں ہے۔ وہ یہ کہ افلاطون فن کو کسی جمالیاتی نقطۂ نظر سے نہیں پرکھتا بلکہ اسے زندگی کے مجموعی مقصد کے مطابق پرکھتا ہے۔ وہ فن کے سامنے ایک معیار رکھتا ہے جو اس سے باہر ہے۔ فن کی اپنی حیثیت کچھ نہیں۔ اُسے زندہ رہنے کا حق اس بیرونی معیار سے حاصل ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فن کی ایسی ہی حیثیت ہے؟ بلاشبہ اگر زندگی کا بلند ترین مقصد اس سے مختلف ہے تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے۔ لیکن وہ زندگی کا بلند ترین مقصد کیا ہے؟ وہ خیرِ محض اور مقصودِ اعلیٰ کیا ہے؟ فن برائے زندگی کے کیا معنی ہیں؟ زندہ رہنے کا صحیح ڈھنگ اور طریقہ کیا ہے؟ اور اس طریقے کی صحت کا معیار کیا ہے؟ غالباً ایک فنکار کے نزدیک زندگی کا مقصودِ اعلیٰ تخلیقِ حسن کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اور اگر ایسا ہے تو افلاطون کا "فن برائے زندگی" کا نظریہ بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ حسن کی تخلیق کیونکر خیرِ محض ہے؟ اس کا جواز کیا ہے؟ اور پھر خود حُسن کے کیا معنی ہیں؟ تو ایسی مشکلات پیش آتی ہیں جن کا حل فن کار کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ بھی ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ منتہائے حیات محض علم کی تحصیل ہے۔ کیونکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز کا علم مقصودِ حیات ہے؟ کون سی راہیں ہیں جن پر علم کی جستجو صحیح معنوں میں علم کی جستجو ہے؟ خود علم کیا چیز ہے؟ اور اس کا معیار کیا ہے؟

علیٰ ہذا القیاس زندگی کے اور مجوزہ مقاصد بھی اسی طرح غیر تسلی بخش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسی ہی مشکلات ہیں جو اشیا کی بنیادی ماہیت کو سمجھنے اور جاننے میں پیش آتی ہیں اور جو ستا رہ ہو کر بعض اوقات انسان کو اس قدر مایوس کر دیتی ہیں کہ وہ تمام جہان کو

ایک غیر حقیقی اور بے معنی سی چیز سمجھنے لگتا ہے۔

تو پھر کیا کیا جائے؟ ہمیں بہر صورت رہنا ہے۔ ہم کیسے رہیں؟ اور کیا کریں؟ کیا انسان کی ہر سعی کا آخری نتیجہ یاس کے سوا کچھ نہیں؟ کیا اس کا انجام بے نتیجہ بے ٹکریں مار مار کر بالآخر ختم ہو جانا ہی ہے؟ کیا اس ہیبتناک کائناتی نظام میں اس کا کچھ کرنا یا نہ کرنا واقعی مساوی ہے؟ کیا زندگی کا کوئی مقصد نہیں؟ لیکن یہ فیصلے بھی اسی وقت ہو سکتے ہیں جب فطرت کا مکمل اور حاوی علم حاصل ہو لیکن چونکہ جب تک یہ علم حاصل نہیں ہوتا ہمیں کوئی نہ کوئی راہ اختیار کرنا ہے اس لئے پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس دوران میں کیا کیا جائے؟

میرے نزدیک ایسی دقتوں کا قطعی حل اس وقت ناممکن ہے۔ لیکن جب تک قطعی حل نہیں ملتا۔ انسان کے لئے مناسب طریق عمل یہ ہے کہ وہ اپنی حسِ مشترکہ پر بھروسہ کرے وہ اس حسِ مشترکہ سے کام لے کر ان مشکلات کو بقدر ہمت حل کرنے کی کوشش کرے زندگی کے قیام اور اس کے زیادہ سے زیادہ استحکام کی دُھن میں لگ جائے۔ علم معرفت کے حصول کے لئے امکانات پیدا کرے۔ کبھی فن پر قیود لگا کر اور کبھی اُسے آزاد کر کے موافق حالات پیدا کرے۔ کبھی سماجی اصلاحات، کبھی شخصی حکومت، کبھی جمہوریت اور کبھی اشتراکیت کے تجربات کرے اور اس کے سامنے وقتی طور پر یہ مقصد ہو کہ حقیقت کو معلوم کرنا ہے۔ رازِ فطرت کا علم حاصل کرنا ہے۔ مقصودِ آخر کا پتہ لگانا ہے۔ زندگی اور کائنات کے معنی معلوم کرنا ہیں۔ سترِ فطرت کو بے نقاب کرنا ہے۔ سچائی کا کھوج لگانا ہے۔ وہ اس سچائی کی جستجو میں سرگرداں ہو جائے۔ وہ اس کی تلاش میں کائنات کا ذرہ ذرہ چھان مارے۔ وہ اسے ریت کے ریزوں اور پانی کے قطروں میں ڈھونڈے۔ وہ اُسے غاروں میں دبی ہوئی ہڈیوں اور جھیل کی دلدل میں دیکھے۔ سورج کی کرنوں اور کوئلے کی قوت میں دیکھے۔ بیضائے طیور کے اجزا اور انیم کی بہتی لہروں میں دیکھے۔ سمندر سے اٹھتی ہوئی ہواؤں اور فضا میں بکھرے ہوئے گیسوؤں میں دیکھے۔ وہ اس کی تلاش میں زمین کی گہرائیوں میں اور ستاروں کی بلندیوں پر پہنچے۔ وہ اسے دل کی گہرائیوں اور کہکشاں کی رفعتوں میں ڈھونڈے۔ وہ اس کی خاطر دریاؤں اور سمندروں تک پانیوں کو کھنگال ڈالے۔ وہ فطرت کے پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھاتا چلا جائے کہ آخر جب وہ اچانک اپنا رخ اوپر اُٹھائے تو محبوبۂ حقیقت اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ کر کھڑی مسکرا رہی ہو۔ انسان خوشی کی چیخ مار کر اس سے لپٹ جائے اور اُس سے ہمیشہ کے ہمکنار ہو جائے۔

سید غلام سرور

عبدالباری آسی مغفور کی یاد

"عبدالباری مرحوم و مغفور" بزمِ یاراں مغموم و مہجور

۱۹ ۶ ۴۶

رآحل مغموم[1]

[1] حُسنِ اتفاق ہے کہ "راحل مغموم" سے بھی آسی مرحوم کا سنِ وفات ۱۳۶۵ھ نکلتا ہے۔ (ا-ہ)

گیت

پریت کی ریت نبھاؤ
آؤ
پریت کی ریت نبھاؤ

بانکی چیتون الھڑ جوبن
چھب البیلی، درشن موہن
ان کی خاک اڑاؤ
آؤ
پریت کی ریت نبھاؤ

ہنس مکھ چندا ہنس مکھ تارے
جگمگ جگمگ کرتے سارے
ان کے دیئے بجھاؤ
آؤ

پریت کی ریت نبھاؤ

آشاؤں کے محل سجیلے
لاکھوں سپنے رنگ رنگیلے
ان کو آگ لگاؤ
آؤ
پریت کی ریت نبھاؤ

ان ہونی میں ہونی چمکے
ٹوٹیں پل میں پھندے غم کے
یونہی عمر بتاؤ
آؤ
پریت کی ریت نبھاؤ

قیوم نظر

قسطنطین

کہتے ہیں کہ چوتھی صدی عیسوی میں سلطنت روما کا ایک بادشاہ تھا جو شہر بازنطیم[۱] میں رہتا تھا۔ اس کا نام مسکن تھا۔ اور وہ تمام ملک میں اپنے علم کی وسعت اور عقلمندی کے لئے مشہور تھا۔ ایک رات وہ بھیس بدل کر اور صرف ایک ہمراہی ساتھ لے کر شہر میں گشت کرنے کے لئے نکلا اور مختلف گلیوں میں پھرتا پھراتا ایک ایسے مکان کے سامنے سے گزرا جہاں نیچے کی منزل میں ایک عیسائی عورت دردِ زہ میں مبتلا تھی اور اس کا خاوند بالاخانے پر بیٹھا بلند آواز سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ لیکن وہ خاص بات جس نے بادشاہ کو رک جانے اور مزید حالات دریافت کرنے پر مجبور کیا یہ تھی کہ ایک دفعہ وہ شخص نہایت لجاجت سے دعا کرتا کہ اللہ اس کی بیوی کو جلدی فارغ کردے اور دوسرے ہی لمحہ کہنے لگتا کہ ابھی نہیں، ابھی نہیں، یا اللہ ابھی میری بیوی کے بچہ نہ ہو۔

بادشاہ وہاں ٹھہر گیا اور جب بچہ پیدا ہو چکا تو باپ کو بلا کر دریافت کیا کہ اس کے مختلف دعائیں مانگنے کی وجہ کیا تھی۔ اُس نے جواب دیا کہ جناب مجھے علم نجوم میں دخل ہے۔ اور میں ستاروں کی حرکات اور انسان کے پیدا ہونے کے وقت ان کے اثرات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جس وقت میں دعا کرتا تھا کہ بچہ نہ ہو میں جانتا تھا کہ اگر ان لمحوں میں ہو گیا تو بہت بڑا مجرم ہوگا اور عمر بھر میں کوئی نیک کام نہیں کرے گا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وہ اس منحوس وقت میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ ایسے وقت پیدا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قسمت کا ستارہ بہت بلند ہوگا۔

بادشاہ نے پوچھا کہ اس سے زیادہ بھی کچھ تفصیل بتا سکتے ہو تو نجومی نے کہا۔ "جی ہاں! یہ جوان ہو کر بادشاہ کی لڑکی سے شادی کرے گا اور اس کے بعد خود اس ملک کا بادشاہ ہو جائے گا۔"

بادشاہ یہ سن کر پریشان ہوا کہ ایک عیسائی لڑکا اس کی لڑکی سے شادی کرے گا اور پھر بادشاہ ہو جائے گا۔ اب تک اس کے اولاد نہ تھی۔ لیکن ملکہ حاملہ تھی اور تھوڑے عرصہ میں اس کے یہاں بھی بچہ ہونے والا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر لڑکی ہوئی تو ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکا اس کا خاوند بنے۔ اس لئے وہ خاموشی وہاں سے ہٹ گیا۔ لیکن محل میں پہنچ کر اپنے ہمراہی سپاہی کو واپس بھیجا کہ جس طرح ہو سکے اُس بچے کو اُٹھا لائے لیکن یہ کسی کو خبر نہ ہو کہ کون لے گیا ہے۔ سپاہی نے حکم کی تعمیل کی۔ نجومی کے گھر میں وہ اور ایک دائی اس کی بیوی کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ بچہ کپڑوں میں لپیٹ کر ایک طرف سلا دیا گیا تھا۔ سپاہی اس کمرے میں چوری چوری داخل ہوا اور بچہ اُٹھا کر لے آیا۔

بادشاہ نے چھری لی اور بچے کے سینے سے لے کر ناف تک شگاف دے دیا۔ پھر سپاہی سے کہا کہ ہاتھ ڈال کر اس کا دل نکال دے۔ سپاہی نے عرض کیا کہ یہ کام حضور کے شایانِ شان نہیں۔ بچہ ویسے ہی تھوڑے عرصہ میں مر جائے گا۔ مزید احتیاط کے طور پر مجھے اجازت دیں کہ اسے سمندر میں پھینک دوں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی اور سپاہی گھوڑے پر سوار ہو کر بچے کو سمندر میں پھینکنے چلا۔ لیکن کنارے پر پہنچ کر حوصلہ نہ ہوا اور اسے لپٹا لپٹایا ایک چٹان پر رکھ کر واپس چلا آیا اور بادشاہ سے کہہ دیا کہ سمندر میں پھینک دیا ہے۔

سمندر کے کنارے وہ جگہ بالکل ویران تھی۔ سوا اس کے کہ تھوڑے فاصلے پر چند عیسائی تارک الدنیا راہبوں نے اپنے رہنے اور

---

[۱] Byzantium، جسے بعد میں استنبول، قسطنطنیہ اور Constantinople کے نام دیئے گئے۔

عبادت کرنے کے لئے ایک مکان بنا رکھا تھا - رات کو جب وہ عبادت میں مشغول تھے تو ایک ننھے بچے کے رونے کی آواز آئی - اور جب بڑے راہب نے باہر نکل کر تلاش کیا تو چٹان پر اس بچے کو کپڑوں میں لپٹا ہوا پایا - وہ اسے اٹھا کر مکان میں لے گیا اور دیکھا تو کپڑے خون میں لت پت ہیں اور پیٹ تمام کٹا ہوا ہے - ان راہبوں میں دو ایک ایسے بھی تھے جو حکمت اور جراحی میں کمال رکھتے تھے انھوں نے بڑی احتیاط سے علاج کرنا شروع کر دیا اور چند دنوں میں زخم بھر کر بچہ تندرست ہو گیا۔

اور اٹھارہ برس گزر گئے ! ـــــــــ

اس عرصہ میں راہبوں نے اس بچے کو جس کا نام انھوں نے قسطن رکھا تھا ہر قسم کی تعلیم دی - اس زمانے میں عیسائی خانقاہوں کے راہب علم و فضل میں عوام کی نسبت بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوتے تھے - اور چونکہ انھیں وقتاً فوقتاً حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف لڑنا بھی پڑتا تھا اس لئے ہتھیاروں کا استعمال خوب جانتے تھے - قسطن جوان ہو کر نہایت خوش شکل نکلا - ورزشی کھیلوں میں سب سے بازی لے جاتا اور فن سپہگری میں تو اس کا ہم عمر کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا مقابلہ کر سکے ۔

اب ایسا اتفاق ہوا کہ بادشاہ کو ایک دور دراز مہم پیش آئی اور وہ فوج ساتھ لے کر بڑی شان و شوکت سے روانہ ہوا - راستے میں شہر سے چند میل کے فاصلے پر اس راہب خانہ سے قریب سے گزرنا تھا جہاں قسطن نے پرورش پائی تھی - راہب خانہ کے بڑے پادری نے سوچا کہ اس موقع پر بادشاہ کو سلام کر کے راہب خانہ کی امداد کی طرف توجہ دلائی جائے - چنانچہ وہ چند ہمراہیوں کو ساتھ لے کر جن میں قسطن بھی تھا راستے میں کھڑا ہو گیا اور جب بادشاہ وہاں پہنچا تو نہایت ادب سے سلام کیا اور راہب خانہ کی زمین کی پیداوار میں سے کچھ خوراک کا سامان فوج کی ضروریات کے لئے تحفتہً پیش کیا - بادشاہ نے پیشکش قبول کی - مہم سے واپس آ کر راہب خانہ کی امداد کا وعدہ کیا اور روانہ ہو جانے کو تھا کہ اس کی نظر پادری کے ہمراہیوں میں قسطن پر پڑی جو سب میں زیادہ قد آور اور ممتاز شکل و صورت رکھتا تھا - بادشاہ کے دریافت کرنے پر کہ یہ کون ہے پادری نے اس کے زخمی حالت میں سمندر کے کنارے چٹان پر پڑا ہوا پائے جانے کا تمام قصہ بیان کر دیا - اور اس کی عادات و اطوار اور علمی قابلیت کی بہت تعریف کی - بادشاہ کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا - چونکہ سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی بچہ ہے جسے اس نے اپنے خیال میں قتل کر دیا تھا - پھر پادری سے کہنے لگا کہ یہ جوان ہمیں دے دو - ہم اسے اپنے خاص ملازموں میں رکھیں گے - پادری نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے یہ بات منظور کر لی اور قسطن بادشاہ کے خاص ملازموں میں شامل ہو گیا -

دارالحکومت سے چند منزل اور دُور پہنچ جانے کے بعد بادشاہ نے قسطن کو بلا کر ایک فرمان دیا کہ اسے بائزنٹیم کے حاکم کے پاس لے جائے جسے وہ اپنی غیر موجودگی میں حکومت کا ذمے دار مقرر کر کے چھوڑ آیا تھا - قسطن اس فرمان کو لے کر چلا اور چند دن کی مسافت کے بعد شہر میں پہنچ گیا - لیکن ایسے وقت جب حاکم بعد دوپہر آرام کیا کرتا تھا - اس لئے وہ تھکا ہوا تو تھا ہی بادشاہ کے محل کے باہر باغ میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹ گیا - وہاں نیند نے اس پر غلبہ پا لیا اور سو گیا -

تھوڑی دیر میں بادشاہ کی لڑکی اس باغ میں ہوا خوری کے لئے ایک سہیلی کے ساتھ نکلی - دیکھا تو درخت کے نیچے ایک نہایت خوش شکل جوان گہری نیند سو رہا ہے - اسے شرارت سوجھی اور اپنی سہیلی سے کہا کہ لباس سے یہ شخص نامہ بر معلوم ہوتا ہے - شاید بادشاہ کی طرف سے پیغام لے کر آیا ہے تم چپکے سے اس کے تھیلے میں اگر کوئی کاغذ ہو تو نکال لاؤ مزہ آئے گا تو اس کی پریشانی کا لطف اٹھائیں گے - سہیلی نے نہایت چالاکی سے قسطن کا تھیلا کھولا اور اس میں سے فرمان نکال کر شہزادی کے پاس لے آئی - وہ بادشاہ کی اکلوتی بیٹی اور نہایت لاڈلی تھی - جانتی تھی کہ وہ کچھ بھی کرے بادشاہ ناراض نہ ہوگا - اس نے فرمان کو کھول کر پڑھا - لیکن پڑھتے ہی ہکا بکا رہ گئی - کیونکہ اس میں

لکھا تھا کہ حکم دیکھتے ہی نامہ بر کو قتل کر دیا جائے۔

شہزادی نے اپنی عمر میں اس سے پہلے قسطن جیسا خوبصورت اور رعنا جوان کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور حالات ایسے تھے کہ اس کے دل میں ہمدردی بھی پیدا ہو گئی اس لئے فوراً اس نے ایک تجویز سوچی اور جو فوراً عمل میں آ گئی۔ بادشاہ نے جانے سے پہلے چند ایک سادہ فرمان اپنے دستخط اور مُہر سے مزین کر کے لڑکی کو دیئے تھے کہ اگر کسی وقت ضرورت پیش آئے تو استعمال کر سکے۔ شہزادی نے ان میں سے ایک سادہ فرمان لے کر اس پر لکھوایا کہ نامہ بر ایک ممتاز نسل سے ہے اور ہر طرح نہایت قابل ہے اس کے ساتھ شہزادوں کا سا سلوک کیا جائے۔ اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہماری شہزادی کے ساتھ کر دی جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ یہ شہزادہ ہمارا ولیعہد ہوگا ــــ اور اس فرمان کو لفافے میں ڈال کر سہیلی کے ذریعہ قسطن کے تھیلے میں رکھوا دیا۔

قسطن بیدار ہوا تو شام کا وقت قریب تھا۔ وہ اپنے اس طرح بے خبر سو جانے سے سخت پریشان ہوا۔ دوڑا ہوا حاکم شہر کے پاس پہنچا اور بادشاہ کا فرمان تھیلے میں سے نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ حاکم نے فرمان دیکھتے ہی قسطن کی نہایت ادب سے آؤ بھگت کی۔ خاص محل میں ٹھہرایا۔ ہر قسم کا لباس مہیا کیا۔ خوراک کے لئے مکلّف کھانا تیار کرایا اور نوکر چاکر مقرر کر دیئے۔ پھر فرمان لیکر شہزادی کے حضور میں حاضر ہوا اور بادشاہ کے حکم سے اطلاع دی۔ شاہزادی نے کہا کہ حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن بہتر ہوگا کہ بادشاہ کی مشیروں کی کونسل کو یہ فرمان دکھا کر ان کی رائے بھی لے لی جائے تاکہ کسی قسم کا اعتراض باقی نہ رہے۔ چنانچہ کونسل طلب کی گئی۔ سب نے فرمان دیکھا اور اتفاق رائے سے اس پر کاربند ہونے کا فیصلہ دیا۔ فوراً تیاری شروع ہو گئی اور دوسرے ہی دن بڑی دھوم دھام سے قسطن کی شادی شاہزادی کے ساتھ کر دی گئی اور یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ قسطن بادشاہ کا ولیعہد ہوگا۔

دو تین مہینے کے بعد جب بادشاہ کے مہم سے واپس آنے کی خبر آئی تو حاکم شہر اس کے استقبال کے لئے شہر سے ایک منزل کے فاصلے پر پہنچا۔ بادشاہ نے اسے دیکھتے ہی حالات دریافت کرنا شروع کئے اور پہلی ہی خبر سن کر کہ شاہزادی مع ولیعہد بہادر کے نہایت خرم ہے سخت حیران ہوا۔ لیکن نہایت ہوشیاری سے دریافت کرنے پر یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شادی خود اسی کے فرمان کے مطابق ہوئی تم خاموش ہو گیا اور دیگر معاملات کا ذکر چھیڑ دیا۔

شہر پہنچ کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا وہ فرمان منگایا جس کی رُو سے شادی ہوئی تھی۔ دیکھا تو اس کے اپنے دستخط اور مُہر موجود تھی۔ اب غور کرنے پر سمجھ گیا کہ اس میں خود شاہزادی کا ہاتھ ہے۔ اور پہلے تو قسطن کو مروا دینا چاہا لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ شاہزادی اس کی اکلوتی بیٹی ہے اور یہ کام اگر اس نے اپنی خوشی سے کیا ہے تو قسطن کے مارے جانے سے اُسے سخت صدمہ ہوگا اور اس کا اثر ممکن ہے دیر تک رہے۔ اور یہ بھی خیال کر کے کہ اگر تقدیر میں یہی ہونا تھا تو اس کے خلاف کوشش کرنا بیکار ہے اس نے کوئی کارروائی نہ کی۔

اپنے وقت پر قسطن تخت کا مالک ہو گیا۔ یہی سلطنت روما کا پہلا عیسائی شہنشاہ تھا۔ اور اسی کا ذکر کانسٹنٹائن (Constantine) تھا جو تدبیر سلطنت اور عقلمندی کے لئے دنیا بھر کی تاریخ میں مشہور ہے۔ ان دونوں ہی کے نام پر عرب والے بائزنٹیم یعنی استنبول کو قسطنطنیہ کہنے لگے اور یورپ والے (Constantinople) کہتے ہیں۔

(ماخوذ)

عطاء الرحمٰن

پچھلے پہر

رات کی وادیٔ تاریک میں دُنیا گم ہے
جانے کس سوچ میں جاتا ہے یہ مہتاب تمام
سانولی رات کے پُرکیف نظارے میں خموش
خواب کی گود میں سوئی ہے فضاؤں کی دلہن
کتنا چپ چاپ اندھیرا ہے درختوں کے تلے
جیسے اک مرگ نما خواب کا خاموش نزول

ماہ تاباں کی لچکتی ہوئی نازک کرنیں
کھیلتی جاتی ہیں مرمر کی روش پر بیکار
کھیلتے کھیلتے کچھ دیر میں سو جائیں گی
اور پھر کھیل کے انجام پہ پچھتائیں گی

ماہ و انجم کی زبانوں پہ سکوتِ جاوید
دیکھ کر جن کی نگاہوں کی گراں خوابی کو
درد کی آگ میں شعلہ سا بھڑک جاتا ہے
جھلملاتے ہوئے تاروں کی درخشاں کرنیں
قلبِ افسردہ میں نشتر سے چبھو دیتی ہیں

یاد کے نرم دریچوں سے ترا روئے حسیں
جانے کس طور سے اُبھرا ہی چلا آتا ہے
دیکھ کر نُور سے معمُور ستاروں کے نقوش
تیرا تاروں بھرا آنچل مجھے یاد آتا ہے
کہکشاں کا یہ لچکتا ہُوا اندازِ حسیں
تیرے خم کھائے ہوئے لب کا خیال آتا ہے

بھیگتی رات کے جادو سے جہاں ہے مسحور
آہ لیکن مری آنکھوں میں ابھی خواب کہاں
ان دریچوں کے جھلکتے ہوئے آئینوں سے
جیسے یہ رقص کناں بوندیں پھسل جاتی ہیں
یونہی آنکھوں سے نکلتے ہوئے خاموش آنسو
آپ ہی آپ ڈھلکتے ہوئے گر جاتے ہیں
گُل ہوئے جاتے ہیں مایوس اُمیدوں کے نجوم
سانس تھک تھک کے مری چُور ہوئی جاتی ہے
بے خبر رات سحر ساتھ چلی جاتی ہے

اشعر ملیح آبادی

ہماری تہذیب کے خزانے

تاریخ ہندوستان کا مواد

ہم اکثر اخباروں اور رسالوں میں پڑھتے ہیں کہ یورپ میں فلاں مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ دستیاب ہوا اور اُسے کسی بڑے عجائب خانے میں محفوظ کر لیا گیا۔ فلاں شاعر کی ایک نظم کسی کاغذ کے پرزے پر لکھی ہوئی مل گئی، اور اُسے فلاں رئیس یا ادیب نے ہزاروں پونڈ دے کر خرید لیا۔

ہم یہ چیزیں دیکھتے ہیں اور بعض اوقات تعجب کرتے ہیں کہ آخران کاغذ کے پرزوں اور کرم خوردہ بوسیدہ کتاب کے اوراق میں کون سی شے پوشیدہ ہے جس کے لئے لوگ اس کے یوں فریفتہ ہو رہے ہیں، اور تعجب ہونا بھی چاہیئے اس لئے کہ ہم لوگ دنیا کے کاروباری ترازو میں دولت کو دولت سے تولنے کے عادی ہیں۔ ظاہر کو دیکھنے والی آنکھ چیزوں کا ظاہری ٹھاٹھ دیکھتی ہے۔ لین دین میں، سودے کی جانچ پڑتال، جنس کی پرکھ، اشیاء کا استعمال اور مصرف یہ تمام باتیں دیکھنے کی ہیں۔ اگر کوئی شے ناقص ہے، کارآمد نہیں تو اس پر ہزاروں روپئے خرچ کرنا بے فائدہ ہے۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اشیاء کی قیمت کا اندازہ محض ان کے مادّی استعمال اور فائدوں سے نہیں لگایا جاتا۔ جو لوگ ان پھٹے پرانے کاغذ کے پرزوں کو خریدتے ہیں، وہ کاغذ کے لئے نہیں خریدتے، وہ ان چند حرفوں کے لئے بھی نہیں خریدتے جو ان پرزوں پر سالہا سال گزر جانے سے دُھندلے پڑ گئے ہیں، اور اگر انھیں پڑھنا ہی ہے تو انھیں چھپی ہوئی بہتر حالت میں پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ ہزاروں اور لاکھوں روپئے خرچ کرنے والے لوگ اس جذبے کی قدر کرتے ہیں جو بے شمار دولت لٹانے سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔

یہ جذبہ علم کی محبت کا جذبہ ہے۔ اور فقط علم کی محبت کا نہیں بلکہ وطن اور ملک کی محبت کا جذبہ بھی ہے۔ جو لوگ ان پرانی یادگاروں کو خریدتے ہیں وہ محض پرانے ادب یا لٹریچر کی خاطر نہیں خریدتے بلکہ انھیں اپنے بزرگوں کے کارناموں سے محبت ہوتی ہے اور وہ اپنے وطن کی قدیم روایات کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کے بزرگوں کی یادگار ہے اور اس یادگار کو زندہ رکھنا اُن کا فرض ہے۔

ترقی یافتہ اور بیدار قوموں کے افراد کے قدم صرف موجودہ زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ نہیں اُٹھتے بلکہ وہ لوگ اپنے ماضی اور اپنی گزشتہ روایات کو بھی سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔ وہ محض اپنے بزرگوں کی پیدا کی ہوئی دولت ہی کے وارث نہیں بنتے بلکہ ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ کوششوں کے نتائج کو بھی زندہ رکھتے ہیں۔ ان کوششوں میں ان کی پیدا کی ہوئی دولت، حکومت، تجارت، ان کی بنائی ہوئی عظیم الشان عمارتیں، ان کی لکھی ہوئی بیش بہا کتابیں سبھی کچھ شامل ہیں۔ اگر ایک وراثت میں ان کا حصہ ہے تو دوسری میں بھی وہ برابر کے شریک ہیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں اس جذبے کی سخت کمی ہے۔ ہم لوگ گزشتہ تاریخی روایات پر فخر کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے قدیم تہذیب و تمدّن پر ناز ہے۔ لیکن ہم نے اپنی تاریخ و تہذیب کی ان روایات کو زندہ رکھنے کے لئے کبھی وہ کوشش نہیں کی جو ہماری تاریخ و تہذیب کے شایانِ شان ہو۔

قدیم عمارتوں اور دوسری یادگاروں کو چھوڑیئے۔ ہماری پرانی قلمی کتابیں، جن میں شعر و سخن، تاریخ، فلسفہ، دینیات،

ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابیں بھی شامل ہیں ابتر حالت میں پڑی ہیں۔ ان میں سے بیشتر ضائع ہو چکی ہیں اور جو باقی ہیں ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کا کوئی مستقل انتظام نہیں۔ جس سے ان کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اور اس بارے میں ہم سخت بے پروائی اور بے اعتنائی سے کام لے رہے ہیں۔

ہماری قلمی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تو حکومت بدلنے کے ساتھ ہی تلف ہو گیا تھا۔ کچھ حصہ یہاں سے نکل کر غیر ملکی کتب خانوں میں جا پہنچا اور وہاں کے عجائب خانوں کی زیب و زینت بنا۔ کچھ حصہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آیا جنھوں نے اسے تجارت کا آلۂ کار بنا کر ذاتی منفعت کا ذریعہ بنا لیا۔ غیر ملکوں کے سوداگر اور اہلِ شوق آنے شروع ہوئے۔ اور ان کے آنے کا سلسلہ اب بھی ختم نہیں ہوا اور یہ دولت ہمارے ہاتھوں سے چھین کر لے گئے۔ اور اس طرح بہت سی قابلِ قدر، ضروری اور مفید کتابیں ہمیشہ کے لئے غایب ہو گئیں۔

جن ہاتھوں میں اب تک یہ خزانے ہیں وہ کئی طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جنھیں سرے سے ان کی قدر و قیمت کا پتہ نہیں۔ خاندانی طور پر وہ اس چیز کے وارث بنے ہیں۔ بالکل اس نااہل نوجوان کی طرح جس کا باپ لاکھوں روپے چھوڑ جاتا ہے اور وہ اُسے محفوظ رکھنا یا خرچ کرنے کا سلیقہ بھی نہیں جانتا۔ کچھ ایسے ہیں جنھیں ان کی اہمیت کا پتہ نہیں ہے۔ اور طبیعت میں بے پروائی اور سہل انگاری ہے۔ اس لئے وہ ان کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ زندگی کے دوسرے کام اور معروفیتیں ان کے لئے بہت زیادہ ہیں۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ان خزانوں پر سانپ کی طرح جمپٹ کے بیٹھا ہے۔ وہ نہ تو خود فائدہ اُٹھاتا ہے اور نہ دوسروں کو فائدہ اُٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ اُس نے کبھی ان پرانے اوراق کو اُلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ ان میں کیا ہے۔ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کی سی ہے جو کسی مزار پر مجاور بن کر بیٹھے ہوں۔ اور خود ان کے دل میں اس مزار میں سونے والے بزرگ سے عقیدت ہو نہ ہو ان کا شیوہ یہ ہے کہ دوسروں کو اس مزار تک نہ پہنچنے دیں۔ اور اسی کو اپنا طرۂ امتیاز خیال کریں۔

ایک جماعت اُن پڑھے لکھے لوگوں کی ہے جو ایسے خزانے کی قدر و اہمیت کو بخوبی جانتے ہیں۔ لیکن انھوں نے ان خزانوں کے محفوظ رکھنے کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا۔ اور ایسا کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ میں نے ذاتی طور پر بہت سے گھرانے دیکھے ہیں جہاں ایسی کتابوں کی اہمیت گودام میں ڈال دینے والے ٹوٹے پھوٹے سامان سے بھی زیادہ نہیں سمجھی جاتی۔ پھر ایسے بھی ہیں جو انھیں محفوظ کر لینے کے بعد سمجھتے ہیں کہ وہ ہر طرح کے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس حالت میں اگرچہ ان علمی خزانوں کا محفوظ رہنا بھی بہت کچھ غنیمت ہے۔ لیکن جب تک ان سے کوئی علمی فائدہ حاصل نہ ہو یہ محفوظ ذخیرہ اس عمارت کی طرح ہوگا جس کی حفاظت کا ذمہ محکمہ آثار قدیمہ نے لے لیا ہو۔

ان کتابوں سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ذرا ان لوگوں کے دل سے پوچھئے جو ان ذخیروں کو حاصل کرنا تو در کنار خود ان کو دیکھنے کے لئے بھی ترس رہے ہیں۔ یا پھر ان قدر دانوں سے پوچھئے جو خوش قسمتی سے ایسے ملک میں پیدا ہوئے ہیں جہاں کا ہر فرد بشر اپنے فرض کو پورے طور پر محسوس کرنے کا عادی ہے۔ اور پھر ملک اور قوم کی خاطر ہر ممکن کوشش بھی کرتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسی شئے اس کے پاس ہے جس سے ملک کی قدیم ادبی، سماجی یا سیاسی تاریخ تعمیر ہو سکتی ہے تو وہ اُسے قومی وراثت سمجھتا ہے۔ اور اسے قوم کے لئے وقف کر دیتا ہے۔

کتابیں ادبی ہوں یا تاریخی، ان میں شاعروں کا کلام ہو یا لوگوں کے تذکرے ان کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر کتاب اپنی جگہ مفید ہوتی ہے۔ اور کتاب کے مضمون کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کا ہماری تاریخ اور تہذیب و تمدن سے گہرا تعلق

ر تاریخ - اگر ہم اپنی قدیم تاریخ اور تہذیب کو براہ راست دیکھنا چاہیں تو ہمیں ان کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑے گی جو قدیم عہد ر قدیم معاشرت کی آئینہ دار ہیں - اور جن میں ہمارے آباؤ اجداد کی زندگی جھلکتی نظر آتی ہے - یہ کتابیں اگر برباد ہو گئیں تو یوں سمجھئے کہ وہ زندگی اور تہذیب ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی -

کسی ملک کو ترقی کرنے کے لئے جہاں آگے قدم اٹھانا ضروری ہے وہاں اپنی قدیم تاریخ کے مٹتے ہوئے نقش ابھارنا اور سنوارنا بھی ں کا فرض ہے - ہم ہمیشہ اس بات کے شاکی رہے ہیں کہ ہمارے ملک کی تاریخ غلط انداز میں لکھی گئی ہے - ہم اور ہمارے بچے گزشتہ اقعات کو ہمیشہ دوسروں کی بنائی ہوئی عینک لگا کر دیکھتے رہے ہیں - واقعات کی بگڑی ہوئی صورت نے ہم میں طرح طرح کی غلط ہمیاں پیدا کر دی ہیں - موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ یہ غلط فہمیاں جلد از جلد دور کر دی جائیں - اور وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے پرانی کتابوں اور اصل سودوں سے ہندوستان کی تاریخ از سر نو لکھی جائے اور جب تک یہ پرانا اور اصلی مواد محفوظ نہیں ہوتا اور ایسے تھوں میں نہیں پہنچتا جو اس سے صحیح فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس وقت تک یہ کام بن نہیں سکتا -

کچھ عرصے سے ہندوستان میں تاریخ نگاری کا کام بڑی خوش اسلوبی سے ہونے لگا ہے - یونیورسٹیوں کے بعض پروفیسروں ، یورپ کی پیروی کرتے ہوئے ہندو - سلاطین اور مغلیہ عہد کے تاریخی واقعات کو از سر نو ترتیب دیا ہے - بعضوں نے الگ الگ مرانوں اور بادشاہوں کے حالات بھی لکھے ہیں اور اس سے مختلف تاریخی دور اس سلسلے میں آنے لگے ہیں - یہی نہیں خود ادبیات تاریخ بھی نئی دریافت شدہ قلمی کتابوں کی مدد سے لکھی جا رہی ہے - جس سے ہمارے بہت سے ادبی اور تاریخی نظریئے ل گئے ہیں -

حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" اور پروفیسر لومی سیری ایٹ کی کتاب "تاریخ گجرات" کی دو کتابیں اس امر افی شہادت ہیں - چند سال ہوئے مجھے پروفیسر موصوف سے احمد آباد میں ملنے کا اتفاق ہوا - گفتگو کے دوران میں ان سے معلوم ہوا ان کی کتاب کا بیشتر مواد ان شاہی فرمانوں سے لیا گیا ہے جو مغلیہ تاجداروں نے وقتاً فوقتاً جاری کئے - اور جو آج کل گجرات ٹھیاواڑ کے ایک پرانے جینی خاندان کے پاس محفوظ ہیں - ان فرامین کے مطالعہ سے مغلیہ خاندان کی تاریخ اور بالخصوص اورنگ زیب عہد کے واقعات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - اور ہمیں اپنے پرانے نظریئے اور عقیدے بدلنے پڑتے ہیں - اگر یہ فرمان پروفیسر موصوف کے ہاتھ نہ آتے تو ان کا کام ادھورا رہ جاتا اور تاریخ گجرات لکھنے کا مقصد فوت ہو جاتا - لیکن ابھی تک جس قدر کام ہوا ہے زیادہ تر یونیورسٹی اور دیگر کتب خانوں تک محدود رہا ہے - یا ان لوگوں کی کتابوں تک جنھوں نے بڑی فراخدلی سے ایسے علمی ذخیروں تاریخی ریسرچ کرنے والوں کے حوالے کر دیا -

خیال کیجئے کتنے بے بہا خزانے ہوں گے جن کا ہمیں کوئی علم نہیں - پھر ان میں کتنی نایاب کتابیں ہوں گی جن کے نام سے ہم ابھی آشنا نہیں - اور اگر آشنا ہیں تو ہم سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ ضائع ہو چکی ہیں - جب تک ان کتابوں کا سراغ نہیں ملتا ، اور صرف سراغ ہی جب تک یہ کتابیں محفوظ نہیں ہو جاتیں اور محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی باقاعدہ فہرست مرتب ہو کر اہلِ علم کے سامنے نہیں آتی اس وقت تک ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے -

محکمہ آثار قدیمہ کی طرح کوئی سرکاری محکمہ ایسا نہیں جو پرانی اور خستہ عمارتوں کی طرح قدیم قلمی کتابوں ، نسخوں ، فرمانوں ر دیگر ضروری اور اہم کاغذات کو محفوظ کرنے کا ذمہ لے یا ان کی حفاظت کو قانون کے تحت لے آئے - مردست انڈین ہسٹوریکل یکارڈ کمیشن کی بدولت ہندوستان کے قدیم تاریخی مواد کو محفوظ رکھنے کا احساس تیز تر ہو گیا ہے - کمیشن نے اپنے کام کو سرگرمی

سے سرانجام دینے کے لئے مختلف صوبوں میں اس کی بنیاد رکھنے کی اپیل کی۔ اور صوبائی حکومتوں کو اس بارے میں ہاتھ بٹانے کیلئے کہا سب سے پہلے پنجاب نے قدم اُٹھایا۔ اب کم و بیش ہر صوبے میں ایک انجمن بن گئی ہے۔ جو ریجنل کمیٹی کے نام سے مشہور ہے اور جس کا پورا نام "Regional Committee for survey of historical Records" ہے۔ اس کمیٹی کے فرائض یہ ہیں کہ صوبے بھر میں ایسے قدیم علمی ذخیروں کا سراغ لگائے۔ اور سراغ لگنے پر اسے محفوظ رکھنے اور اُس سے علمی فائدہ حاصل کرنے کی تجویزوں پر غور کرے۔ جن حضرات کے پاس ایسے کتب خانے ہوں ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لئے مفید مشورے دے لئے اگر یہ لوگ امداد کا ہاتھ بڑھائیں تو ان کتابوں کی فہرست بھی مرتب کرے۔ تاکہ پبلک اور علمی دلچسپی رکھنے والے اصحاب اُن کے ناموں سے آشنا ہو سکیں۔

لیکن یہ کمیٹیاں اس وقت تک کوئی مفید کام نہیں کر سکتیں جب تک ہم میں سے ہر شخص یہ محسوس نہ کرے کہ یہ بظاہر حقیر سی پرانی بوسیدہ کتابیں ایک بیش بہا خزانہ ہیں جن کا محفوظ رکھنا ایک قومی فرض ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر ہوا) صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

غزل

گلشن میں تھے مگر مرے پیشِ نظر نہ تھے — تیرے خیال سے تو یہ گُل بیشتر نہ تھے

اک شرحِ غم میں ہم نے گزاری ہے زندگی — وہ کیا فسانے ہونگے کہ جو مختصر نہ تھے

یہ اجنبی نظر کہ مجھے جانتے نہیں، — یہ بے رُخی کہ جیسے مرے ہمسفر نہ تھے

دامن میں خار ہیں جو نگاہوں میں تھے کنول — شاید یہی ہوا کہ ہم اہلِ نظر نہ تھے

احساسِ زندگی ہی کہاں تھا ہمیں، مگر — قصے تری جفا کے بہت معتبر نہ تھے

فرصت نہ دی کشاکشِ پیہم نے عمر بھر — لیکن یہ ہم کہ تجھ سے کبھی بے خبر نہ تھے

وہ کیا کرے کہ جس کو قفس بھی ہوا آشیاں — بیٹھا ہے یوں کہ جیسے کبھی بال و پر نہ تھے

یہ التفاتِ دوست ظفر خیریت تو ہے،
اُس کی نظر میں تھے تو، مگر اس قدر نہ تھے

یوسف ظفر

غزل

نگاہِ عشق کی گرمی سے سنگِ خارہ گداز
جنوں کی ضرب سے کھلتے ہیں کائنات کے راز

جہاں کا شور و شغب ہے صدائے بے ہنگام
ترے ضمیر میں پنہاں ہے رُوح کی آواز

خراب درگہِ سلطاں ہے بچۂ شاہیں
نہیں تو بازوئے جبریل ہے پرِ پرواز

نہ ہو حریف، خرد ہو دل و نظر کی ندیم
تمام سُر جو ہم آہنگ ہوں تو ساز ہے ساز

کھُلا یہ راز کہ ہے زندگی یقین و عمل
نہ ہو یقین تو بے سود ہمتِ تگ و تاز

قدم اُٹھا کہ منازل ہیں سخت تر آگے
خیال خام ترا وقفۂ عمل ہے دراز

جہاں نہ پھونک دے آتش تجلّیِ حق کی
فضائے دہر تجلّی کے واسطے ناساز

ابھی تو پختگیٔ فکر ہی کے ساماں کر
کمالِ فکر کے آگے ہے عشق کا آغاز

نہ چھوڑ دامنِ مردانِ باخدا جاوید
یقیں فروزِ دلِ باخبر کا سوز و گداز

جاوید صدیقی

ایش ٹرے

صوفے پر بیٹھے ہوئے اُس نے سگرٹ سُلگانے کے لئے دیا سلائی کو جلایا۔ایک چنگاری سی نکلی —— چنگاری یوں تو حالات موافق دیکھ کر بڑے بڑے کام کر سکتی ہے۔لیکن وہ گیلے سگریٹ کو نہ سلگا سکی۔صرف ہلکا سا دھواں کمرے کی فضا میں پیچ کھاتا ہوا تحلیل ہو گیا —— اس نے دیاسلائی کو تپائی پر رکھے ہوئے ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

آج تمام دن وہ بارش میں بھیگتا رہا تھا۔ایک جنون سا سوار تھا اس کے سر پر جو اسے آبادی سے دُور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ویران و پرخوف جگہوں میں گھومنے پر مجبور کر رہا تھا۔ بارش کو دیکھ کر نہ جانے وہ کیوں پاگل سا ہو جاتا۔سردیوں کی اکثر گھنیری ابر آلود راتیں وہ گھر سے باہر گزارا کرتا۔بادلوں کا گرجنا اور بجلی کا کڑکنا اسے سکون دیتا تھا۔بجلی کی چمک سے جب اس کے اردگرد کی چیزیں ایک لمحہ کے لئے جگمگا اٹھتیں تو ایک نامعلوم سا اضطراب اس کے دل کی گہرائیوں میں نشتر چبھونے لگتا۔اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے —— وہ بجلی کی روشنی میں ان چمکتے ہوئے آنسوؤں کو گیلی زمین پر گرتے ہوئے دیکھتا۔اور اسے یوں محسوس ہوتا کہ درخشندہ تارے بھی آسمان کی بڑی سی آنکھ کی پلکوں پر جمے ہوئے آنسو ہیں۔جب کبھی یہ آنکھ جھپکی تمام تارے ٹوٹ کر گر جائیں گے۔آخر ایک نہ ایک دن آنکھ کا جھپک جانا لازمی ہے۔طوفان کے یہی خوفناک مناظر دیکھتے دیکھتے اس نے زندگی کا بہت سا حصہ گزار دیا تھا۔لوگ اسے شرابی سمجھتے تھے۔آوارہ عورتوں کی دہلیز پر ماتھا رگڑنے والا ناکام انسان۔محلے دار اسے جوئے باز اور بدمعاش خیال کرتے تھے۔لیکن شراب کی ایک بھی بوند اس کے حلق کے نیچے نہ پہنچی تھی۔کسبیوں کے بار بار بلانے پر بھی وہ ان کی طرف راغب نہ ہوا تھا۔اس نے کبھی جُوا نہیں کھیلا تھا۔زندگی کے اتنے بڑے جوئے میں بار بار ہار کر اب اُسے کوئی اور جُوا کھیلنے کی خواہش ہی نہ تھی —— وہ لوگوں کی اس غلط فہمی پر ہنستا۔وہ سمجھتا کہ اپنی شخصیت کا کسی کی سمجھ میں آجانا ہی حقیقی معنوں میں موت ہے۔ وہ الجھاؤ کو زندگی سمجھتا تھا —— زندگی بھی تو دکھ سکھ کے تاروں کے ایک کبھی نہ سلجھ سکنے الجھاؤ کے سوا کچھ نہیں۔ —— پھر کیوں لوگوں کو سلجھا ہوا دکھائی دیا جائے ؟

وہ ایک بڑی جائداد کا واحد مالک تھا۔یہ جائداد اس کی اپنی پیدا کی ہوئی نہیں تھی۔اس کے بزرگوں کی محنت کا پھل تھا۔خود تو وہ کسی بنی ہوئی چیز کو بھی نہ سنبھال سکتا تھا۔نئی چیز بنانا تو دور کی بات تھی۔کئی لوگ اپنی لڑکیاں اس کے ساتھ بیاہنے کے لئے تیار تھے۔یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایک شرابی اور جوئے باز ہے۔ایسا کیوں کرتے تھے وہ —— ؟ یہ سب جائداد کے لئے تھا۔گھر کے فرنیچر، ٹرنکوں میں بند زیوروں اور الماری میں سجے ہوئے خوبصورت قیمتی برتنوں کے لئے —— یہ تمام بے جان چیزیں انسان سے زیادہ وقعت رکھتی ہیں۔انسان ان سب سے گھٹیا ہے۔اور بعض دفعہ اسے خیال آتا کہ وہ ان تمام چیزوں کو توڑ دے۔گھر کو آگ لگا دے۔اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں لوگوں کی ان ہیچ خواہشوں کو جلتے ہوئے دیکھ کر قہقہے لگائے —— بیوقوف لوگ !

اس نے پھر سگرٹ سلگانے کی کوشش میں دیا سلائی کو مسالے پر رگڑا۔پھر ایک ننھی سی چنگاری اور ہلکا سا دھواں —— رفتہ رفتہ چنگاری کی طرح دھواں بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔اس نے پھر کوشش کی، اس دفعہ بھی وہ ناکامیاب رہا۔لیکن وہ

جھنجھلایا نہیں، وہ شکستوں اور ابھاؤ سے محبت کرنے والا انسان تھا۔ اس لئے نہیں کہ ہر شکست ایک نئی فتح کی تمہید ہے اس لئے کہ ہر شکست زندگی کے گرد لپٹے ہوئے متعدد غلافوں میں سے ایک غلاف کو کم کر دیتی ہے۔ ہر شکست حقیقت کا انکشاف ہے۔

کئی دیاسلائیاں ایش ٹرے میں پھینک دی گئیں۔ آخر ایک دیاسلائی نے اس کے گیلے سگریٹ کو سلگا دیا — اور دیاسلائی کو اس کے ہم جنسوں کے قریب رکھتے ہوئے اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کاکش لگایا۔ دھوئیں کے خوبصورت سیاہ کچھ عرصہ کمرے میں چکر کاٹ کر کہیں چلے گئے۔ شاید ایش ٹرے میں پڑی ہوئی دیاسلائیوں کے ملبے سے دھوئیں کی کھوج میں — ہر دیاسلائی سگریٹ کو کیوں نہیں سلگا سکتی؟ مسالے کی ہر رگڑ سے کیوں چنگاری پیدا نہیں ہوتی؟ کوئی خاص دیاسلائی ہی کیوں سلگا سکتی ہے؟ — یہ سوالات اس کے دماغ میں نہ جانے کہاں سے آ گئے۔ اس کے لمبے لمبے گیلے بالوں سے پانی کی ایک بوند ٹوٹ پر گری اور پھسل کر قالین پر آ رہی — سمندر — بخارات — آسمان — پہاڑ — بارش — طوفان دریا — سمندر — اس نے پھر دھوئیں کے دائروں کو دیکھنا شروع کیا۔ قدرتی چیزوں کا ازلی تسلسل اور چکر — وہ آہستہ آہستہ بکھرنے لگا۔ اور ایک ہیولیٰ ڈھانچہ بنتے بنتے آخر انسانی شکل میں تبدیل ہو گیا — لانبا قد، خوبصورت خد و خال، بیچدار سیاہ بال، ایک جانی پہچانی صورت اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ جانے کس مصوّر نے خلا کے پردے پر یہ تصویر اُ دی تھی — ایک عورت — نوجوان خوبصورت عورت —

"نینی!" وہ آہستہ سے بڑبڑایا، اور آج سے آٹھ سال پہلے کے دُھندلے سے خاکے اس کے ذہن میں اُبھرنے لگے خاکے جن سے وہ کوئی محل تعمیر نہ کر سکا تھا۔ وہ تنکے جن سے کوئی آشیاں مکمل نہ ہو سکا — وہ چنگاریاں جو شعلے نہ بن سکیں۔ جو طوفان بننے سے پہلے فنا ہو گئے۔ اور اسے یُوں محسوس ہوا کہ وہ انسانی پیکر حرکت کر رہا تھا۔ وہ اس کے نزدیک سرک،

"نینی" جو آج سے آٹھ سال پہلے اس کی اپنی تھی اب نہ جانے کہاں تھی؟ شاید اب وہ دو تین بچوں کی ماں ہو، اس کے ہ رنگینی اور گالوں کی چمک پہلے سے زیادہ گہری ہو گئی ہو، شاید وہ بھی کسی عالی شان مکان میں رہتے ہوئے اپنے خاوند کے سلگانے پر کبھی سوچتی ہو۔ ایش ٹرے میں پڑی ہوئی ہر دیاسلائی کیوں سگریٹ کو نہیں سلگا سکتی؟ کوئی خاص دیاسلا ایسا کر سکتی ہے؟ — یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی جھونپڑی میں پڑی اپنے یتیم بچوں کو اپنا خون پلا پلا کر جسم و روح قائم رکھنے میں مدد کر رہی ہو۔ اور اس کے ہونٹوں کی رنگینی اور آنکھوں کی چمک حادثات کے غبار میں تڑپتی ہوئی سی ہو — اور — اور شاید وہ کوئی بھی نام لیوا نہ چھوڑ کر اپنی ان تمناؤں کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہو جو دھوئیں مرغولوں کی طرح آہستہ آہستہ بکھر کر جانے کہاں چلی جاتی ہیں۔ اور اُس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں اضطراب کے نشتر محسوس کئے۔ وہ نشتر جن سے وہ سردیوں کی طوفانی راتوں میں متعارف ہوتا تھا —

"کل میوزیکل کانسرٹ میں تم نے بہت اچھا ستار بجایا۔ سامعین جھوم جھوم اُٹھے تھے۔ تاروں کی جھنجھناہٹ کس پرور تھی۔ کتنی نفاست ہے تمہارے ہاتھوں میں بیٹا!" نینی کے پتا کے یہ الفاظ وقت کا اتنا طویل سفر طے کرتے ہوئے طرح آج اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"آپ جیسے بزرگوں کی ہی اشیرباد ہے پتا جی!"

"اچھا بیٹا سکھی رہو۔ نینی کو بھی بڑا شوق ہے سنگیت کا۔ اگر کبھی وقت نکال سکو تو اُسے بھی اپنا کوئی گُن

بلاتے ہوئیں ماسٹر رکھنے کے ــــــــــــــ"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ سکھانے میں کبھی گریز نہ ہوگا ـــ" کہنے کو تو وہ الفاظ کہہ گیا۔ لیکن جو کچھ اس نے پنڈت جی سے سنا تھا اس پر اسے یقین نہ آیا۔ نینی کالج میں پڑھنے والی تمام لڑکیوں سے زیادہ معصوم، سادہ اور حسین تھی۔ محلے دار ہونے کی حیثیت سے اسے نینی کے گھر کی مالی حالت کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو تھا۔ لیکن نینی ہمیشہ اُسے افق کے قریب جھلکتا ہوا شام کا ستارہ نظر آئی تھی۔ جسے حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اور آج وہ خود اُس کے نزدیک آتی معلوم ہوتی تھی ـــ وہ گھر جا کر سارے معاملے پر دیر تک سوچتا رہا تھا۔

دوسرے ہی دن وہ نینی کے گھر چلا گیا۔ شاید وہ کچھ دن اور سوچتا اور پھر کوئی فیصلہ کرتا۔ مگر وہ ڈرتا تھا کہ کہیں پنڈت جی اُسے مغرور نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس لئے اس نے ذرا بھی توقف نہ کیا۔

"جانتی ہو نینی بیٹی ان کو ــــ؟" اور دو جھکی جھکی آنکھیں ایک بار اس کی طرف اُٹھیں۔ جیسے ہوا کے ہلکے سے جھونکے نے جنت کے دریچے کھول دیئے ہوں۔ پلکیں پھر جھک گئیں۔

"جانتی ہوں پتا جی!" ایک مدھم سا نغمہ جاگا۔ اور دونوں فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گئے۔

"اب تم ایک اچھی آرٹسٹ بن جاؤ گی بیٹا ـــ پارس کے ساتھ چھو جانے سے لوہا بھی سونا ہو جاتا ہے ـــ" اور پنڈت جی مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

ستار کو کیسے پکڑا جاتا ہے؟ گانا سیکھتے وقت بیٹھنا کیسے چاہیئے؟ مضراب کون سی انگلی میں پہنی جاتی ہے؟ یہ سب باتیں بتا کر ستار کے تاروں کو چھیڑ دیا گیا۔ تاروں کی لرزشوں سے شاید نینی کے ہاتھ بھی کانپنے لگے تھے۔

گائن ودیا سیکھی جانے لگی۔ کچھ دیر گانا سیکھ کر نینی اسے بھی ستار بجانے کو کہتی۔ وہ ستار بجاتا۔ تاروں پر تیزی سے حرکت کرتی ہوئی لمبی لمبی انگلیاں نینی کو اپنے دل پر رقص کرتی ہوئی بجلیاں محسوس ہوتیں۔ بجلیاں جن میں جلن کی جگہ سکون اور ٹھنڈک تھی۔ وہ بجلیاں جن سے آشیانے بنائے جاتے ہیں۔ وہ مدہوش سی ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی۔ اور کئی دفعہ وہ پوچھ بیٹھتی۔

"ہر تار سے ہر قسم کا نغمہ کیوں نہیں نکل سکتا راجن بابو؟"

"اس لئے کہ ہر تار ہر نغمے کے لئے نہیں ہوتا، جیسے ہر پھول ہر ہار کے لئے۔ جیسے ہر کشتی ہر طوفان کے لئے، اور جیسے ہر انسان ہر انسان کے لئے نہیں نینی ـــــ!" اور نینی کے خوبصورت گورے چہرے پر ہلکی سی سیاہی پھیل جاتی ـــــ شام کا تارہ بادل کی ہلکی سی اوٹ میں آ جاتا۔

ایک سال گزر گیا نینی کو ستار سیکھتے ہوئے ـــ اب وہ خود بھی تاروں سے کھیل کر نغمے پیدا کر سکتی تھی۔ لطیف نغمے دل کی گہرائیوں سے پھوٹ کر بہنے والے سوتے۔ تاروں کی جھنکاریں۔ دو دلوں کے میل سے پیدا ہوئے راگ تھے۔ دھڑکنیں انسان کی زندگی کے ثبوت اور زندگی۔ محبت کے در پر اس کو جگانے والی خوبصورت جوگن۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ بہت ہی قریب ـــ لیکن اچانک وہ جدا ہو گئے ـــ نہ جانے کس نے خوبصورت جوگن کو دروازے سے ہی دھتکار دیا تھا۔

یہ ذہنی رفاقت نینی اور راجن کو زندگی کے بہترین ساتھی بنا سکتی تھی۔ لیکن پنڈت جی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے

بڑے گھرانے سے ناطہ کرنے کی درخواست کرتے۔ اچھے تعلقات کا انجام شادی ہی ہو کوئی ضروری بات تو نہیں۔ اور احساس کمتری نے ایک تقریباً مکمل ہو چکی ہوئی تصویر پر آڑے ترچھے خطوط ڈال کر اسے بگاڑ دیا۔ اور راجن شکستوں سے پیار کرنے والا انسان اپنے لئے نینی کو نہ مانگ سکا۔ وہ اپنے لئے کچھ نہ بنا سکتا تھا، وہ کسی قابل بھی نہ تھا۔ مرتے وقت بھی شاید وہ کسی سے پانی کی بوند نہ مانگتا۔ اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو لوگ اسے شرابی اور آوارہ کیوں سمجھتے؟ وہ کیوں شہر سے دور ویران جگہوں میں گھومتا اور کڑکتی ہوئی بجلیوں کو پیار کرتا ——— اور اس نے ایک رومان انگیز غنایئے کو دردناک المیے میں تبدیل کر دیا۔ ایک دن اچانک اس کے کان میں نینی کی شادی کی بھنک پڑی۔ اب وہ سمجھا کہ شاہراہ زندگی کا وہ موڑ آگیا جہاں ان دونوں کو جدا ہو جانا چاہیئے، اور اس کے بعد وہ پنڈت جی کے گھر نہیں آیا۔ وہ کہیں چلا گیا۔ اپنے شہر سے دُور ——— اپنی بوڑھی بیوہ ماں کو بتائے بغیر ———

تین ماہ کے بعد کسی طرح اُسے اپنی ماں کی موت کی خبر ملی۔ وہ اس کے انتظار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی تھی ——— راجن سمجھا کہ ایک عزیز ترین ہستی کو اس سے چھین کر اسے ایک اجنبی ماحول میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس کے سامنے بہت سی الجھی ہوئی تاریک راہیں تھیں۔ لیکن وہ کسی پر بھی چلنے کے قابل نہ تھا۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے اور وہ تھک کر نڈھال ہو چکا تھا ——— وہ تمام دن کمرے میں گم سُم بیٹھا رہتا۔ جوں جوں گھر کا پرانا نوکر اسے سمجھاتا اس کی حالت اور بگڑتی جاتی ——— اس کی تسلیاں اسے نشتر محسوس ہوتیں روح کی گہرائیوں میں اُترنے والے نشتر ——— ایک دن جانے کس خیال سے وہ دوستار اٹھا لایا۔ اُس نے سوچا شاید اس کا مالک راگ میں محو ہو کر اپنے غم کو بھول جائے۔

"راجن بابو! یہ دوستار نینی نے سسرال جانے سے پہلے یہاں بھیجے تھے ———"

"چل، دفع ہو جا ——— نکل جا کمرے سے ———" اور بوڑھا نوکر ستار میز پر رکھ کر باہر چلا گیا۔ اُس نے ان دونوں ستاروں کو ایک دفعہ غور سے دیکھا۔ پہچانا اور باری باری زور سے زمین پر پٹک دیا۔ دونوں تار ٹوٹ گئے۔ کمرے میں ایک بے آہنگ سی جھنکار پیدا ہوئی ——— انسانی دلوں کے دو ساز ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئے تھے۔ بجلی ایک دفعہ زور سے کڑکی اور راجن کو محسوس ہوا کہ تاروں کی درخشندہ محفل میں پڑا ہوا خوبصورت ستار نیچے گر کر چور ہو گیا ہے۔ اُس نے حیران سا ہو کر کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ سگرٹ کا دھواں جانے کب کا بکھر کر ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ انگلیوں میں گیلا سگریٹ بجھ چکا تھا۔ اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے پر پڑیں۔ وہ جلی ہوئی دیا سلائیوں سے اٹی پڑی تھی۔ نہ جانے کتنے دنوں سے اسے صاف نہیں کیا گیا تھا ——— اور اسے یُوں محسوس ہوا کہ اُس کی اپنی زندگی بھی ایک ایش ٹرے ہے اور اس کی ناکام آرزوئیں اس میں پڑی ہوئی دیا سلائیاں۔ بیشمار اجڑی ہوئی خوبصورت اُمیدیں ——— وہ دیر تک تپائی پر رکھی ہوئی ایش ٹرے کو دیکھتا رہا ———

اُسے خیال ہوا کہ جب تک وہ ایش ٹرے کی تمام تر دیا سلائیوں کو باہر نہیں پھینک دیتا۔ وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اس کی زندگی کا انحصار ایش ٹرے کے خالی ہو جانے پر ہے ——— اس کے لئے اپنے آپ کو ضبط میں رکھنا مشکل ہو گیا ——— اُس نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر ایش ٹرے کو اُلٹ دیا ——— بجلی ایک دفعہ پھر چمکی۔ راجن کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور بجلی کی تیز روشنی میں چمکتی ہوئی سڑک پر بکھری ہوئی دیا سلائیوں میں جا گرے۔ اُس کی مُردہ اُمیدوں پر ——— بجھا ہوا سگرٹ ابھی تک اس کی انگلیوں میں تھا۔

——— کشمیری لال ذاکر

غزل

ابھی ابھی کوئی اس رہگذر سے گذرا ہے
کہ ایک عالمِ حیرت نظر سے گذرا ہے

جو دل پہ گذری ہے اُس کی خبر تو کیا ہوتی
خیال ہے کوئی شاید ادھر سے گذرا ہے

اسیرِ دیدہ و دل ہے کوئی محبت میں
کوئی حدودِ خیال و نظر سے گذرا ہے

نئی ہے اس کے لئے اب بھی رہگذر تیری
جو بار بار تری رہگذر سے گذرا ہے

شبِ فراق جو نیند آ گئی، تو خواب آیا
کہ سیلِ نور مرے بام و در سے گذرا ہے

غبارِ کاہکشاں گردِ راہ ہے کس کی
یہ کون منزلِ شمس و قمر سے گذرا ہے

سحر ہوئی بھی تو اس کو یقیں نہ آئے گا
جو بد نصیب اُمیدِ سحر سے گذرا ہے

یہ آہٹیں سی رگ و پے میں بے سبب تو نہیں
کوئی ضرور دلِ بے خبر سے گذرا ہے

تمھیں یہ فکر، پریشاں ہے میرا حال بہت
مجھے یہ غم کہ تمھاری نظر سے گذرا ہے

حرم ہو، دیر ہو، راہیں ہیں ایک منزل کی
کوئی اِدھر سے تو کوئی اُدھر سے گذرا ہے

کئی مقامِ طرب عشق کا مقدّر ہیں
ابھی تو غم کی رہِ پُرخطر سے گذرا ہے

نویدِ گردشِ پیمانہ و نظر کے لئے
ہزار گردشِ شام و سحر سے گذرا ہے

غمِ فراق ابھی دم بہ دم بڑھے گا حفیظؔ
کہ حُسن جلوہ بہ جلوہ نظر سے گذرا ہے

حفیظ ہوشیارپوری

دسترس

وقت کا ہاتھ تری آنکھوں سے ہونٹوں پر
وقت کے پاس نئے چاند نئے تارے ہیں
نئی تصویریں ہیں یادوں کو بھلانے کیلئے
نئے جلوے نئے اُمیدوں کے ہرکارے ہیں

تُو اگر بھول گئی تازہ تصوّر پا کر
میں اگر کہہ نہ سکا حسرتِ گفتار لئے
زندگی پھر بھی اُمیدوں سے لگی بیٹھی ہے
آرزو پھر بھی نگاہوں میں ہے اظہار لئے

فاصلہ شدّتِ احساس سے کم ہوتا ہے
قُرب اک لمسِ تصوّر ہے خیالات کا ساز
جسم دیتا ہے محبّت کے حسیں نغموں کو
اور آتی ہے ہر اک دا ز میں تیری آواز

شب کا پردہ در و دیوار پہ آویزاں ہے
ہاتھ کی ایک ہی جنبش سے سرک جائے گا
زندگی ایک ہی محور پہ نہیں رہ سکتی
وقت کا ہاتھ تری آنکھوں پہ تھک جائے گا

یہ شب و روز کی دُوری بھی کوئی دُوری ہے
فاصلہ کیسے کہے مجھ سے کہ بھُولوں تجھکو
رات کی اُنگلیاں دامانِ سحر تک پہنچیں
اب جو تُو ہاتھ بڑھائے تو میں چھُولوں تجھکو

یوسف ظفر

مطبوعات

حیاتِ محمد علی جناح از رئیس احمد جعفری۔ محمد علی جناح مسلم لیگ کے قائد اعظم ہیں۔ انھوں نے گزشتہ آٹھ دس سال میں مسلمانوں کو ایک نیا مطمحِ نظر دیا۔ انھیں ایک مرکز پر لا کھڑا کیا اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ یہ عظیم المرتبت شخصیت جس نے تن تنہا اتنا بڑا معرکہ سر کیا ہے دشمنوں تک سے اپنے کمالِ فہم و فراست کا لوہا منوا چکی ہے۔ یہ تصنیف جناح کی شخصیت کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کی تاریخ اور اس قائد کی سرکردگی میں اس کی تمام و کمال کارگذاری کا احاطہ کرتی ہے۔ اور مسلمانوں کو اپنے قائد کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے تیار کرتی ہے۔ مصنف نے پاکستان کے مسئلہ کو ہر طبقے کے اصحاب الرائے کی عینکوں سے دیکھا ہے۔ اس نے لیگ اور کانگریس کے اختلافات پر مبسوط تبصرہ کیا ہے اور قدم بہ قدم چلتا ہوا آج کے اہم ترین مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلم لیگ کے قائد اعظم کی زندگی اور پاکستان کے مسئلے پر یہ تصنیف حرفِ آخر ہے۔ تاج آفس بمبئی نے جس خوبی اور عمدگی سے اُسے پیش کیا ہے وہ بھی تحسین کی مستحق ہے۔

ضخامت ۸۶۴ صفحات۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے۔ پتہ تاج آفس بمبئی نمبر ۳

علامہ راشد الخیریؒ مرتبہ پروفیسر وقار عظیم۔ آنجہانی ایچ۔ جی ویلز نے ایک مرتبہ لکھا تھا۔ "آدمی کا غذ پر بڑا بنایا جاتا ہے" یعنی یہ کہ زندگی میں اُس کی خاطر خواہ قدر نہیں کی جاتی اور مرنے کے بعد اس کی تحریروں کے ایسے پہلو نمایاں کئے جاتے ہیں جن کی طرف شاید مصنّف کی نظر بھی نہ گئی ہو۔ اس کلیے سے غالبؔ تک مستثنیٰ نہیں۔

علاّمہ راشد الخیری نے اُردو ادب کو زبان ہی نہیں دی اُسے زندگی بھر کی بیشمار کاوشوں سے مالا مال بھی کیا۔ اگر یہی اظہارِ عقیدت علامہ مرحوم کی زندگی میں انھیں میسر آتا تو شاید ان کی تحریر میں اور زیادہ حدّت پیدا ہو جاتی۔ مقامِ شکر ہے کہ اب ہم اپنے گرانقدر ادبا کو بھول نہیں جاتے بلکہ انھیں زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ گیارہ مستند اہلِ قلم حضرات کی نگارشات کا مجموعہ ہے۔ جنھوں نے علامہ مرحوم کی تحریروں کا ہر پہلو سے جائزہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس محسنِ ادب کے کمالِ فن کے معترف حضرات اس مجموعے کو آنکھوں سے لگائیں گے اور اس مجموعے کو مصنف کی تصانیف کے پہلو میں جگہ دیں گے۔ کتابت و طباعت عمدہ ضخامت ۲۲۸ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ پتہ:۔ خاتون کتاب گھر، اُردو بازار دہلی۔

اقبال اُس کی شاعری اور پیغام از شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ آج سے چودہ برس پہلے اسی مصنف نے اقبال کے کمالِ فن و فلسفہ کا اعتراف انگریزی زبان میں کیا تھا جو اس موضوع پر اوّلیت کا درجہ رکھتا ہے یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی لیکن مرحوم کی نئی تصانیف نے اس کتاب کی اکملیت میں فرق آگیا اور وہ نظریے جو مصنف نے قائم کئے اس تازہ کلام کی روشنی میں پھیکے پڑ گئے۔ زیرِ نظر تصنیف میں مصنف نے کسی مفکر یا فلسفی کے روپ میں آنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مشرق کے اس عظیم المرتبت شاعر اور فلسفی کے تمام تر کلام کو سامنے رکھنے کے بعد اس کے حسن کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں حسنِ عقیدت کے ساتھ حسنِ نظر سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے دیباچہ جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب نے تحریر فرمایا ہے ہمیں یقین ہے کہ اقبال کے ہشت پہلو کلام کو سمجھنے میں اس تصنیف سے بہت مدد ملے گی۔ اور ملک اس کی خاطر خواہ قدر کرے گا۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ ضخامت ۲۴۴ صفحات مجلد قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ پتہ:۔ کمال پبلشرز ۲۶ مال روڈ۔ لاہور۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری "نام ونگ" کا تعارف لکھتے ہوئے فرماتے ہیں

نام ونگ

عبدالمجید بھٹی

"عبدالمجید بھٹی نے بینتیس برس تک زندگی کی ہے۔ زندگی کرنا اور زندگی گ[illegible] دو مختلف باتیں ہیں۔ وہ ایسے ماحول میں ہے۔ جہاں کشمکش حیات کا دھارا اپنے زور پر ہے۔ مسائل جو زندگی خود پیدا کرتی ہے اس کے سامنے ہیں۔ وہ ان مسائل کا [illegible] بتاتا۔ وہ کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ وہ ہمہ تن سوال ہے اور آج ہمہ تن سوا[illegible] ہی شاعری ہے۔" ——— قیمت تین روپے

● سات کھیل	راجندر سنگھ بیدی	چار رو[illegible]
● سماج کا ارتقاء	کلیم اللہ	چار رو[illegible]
● گائے جا ہندوستان	دیوندر ستیارتھی	چار رو[illegible]
● ھیّا ھیّا	سید مطلبی فرید آبادی	اڑھائی رو[illegible]
● ۱۹۴۵ء کی بہترین نظمیں	حلقۂ اربابِ ذوق	دو رو[illegible]
● سحر ہونے تک (ناول)	مترجمہ ابنِ انشا	دو رو[illegible]
● پُل پر (ناول)	مترجمہ شیر محمد اختر وناجو	اڑھائی رو[illegible]

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر (دہلی)

سنگم پبلشرز لمیٹڈ ● ۱۳ (اے) نسبت روڈ ● لاہور

ہماری کتابیں مکتبہ جامعہ دہلی، بمبئی اور لکھنؤ سے بھی مل سکتی ہیں

(سید منظور حسین بخاری پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر چٹان ۳۲ لارنس روڈ سے شائع کیا)

جامعہ نگر (دہلی)

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔ مسوّدے کا نہایت صاف اور خُوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ۔

۳ - دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۴ - جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے بصُورتِ دیگر دفتر "ہمایُوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ۔

۵ - "ہمایُوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ مرف قیمتاً مِل سکتا ہے ۔

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چِٹ پر پتے کے اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصُول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

مینیجر "ہمایُوں"

[illegible]

نہیں ہوا پھر بھی

چال قیامت کی چل گیا

یادگار علامۂ عصر آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

جلد ۵ — نمبر ۵

فہرست مضامین

ہمایوں، بابت ماہ نومبر ۱۹۴۶ء

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	بزم ہمایوں	یوسف ظفر	۶۵۸
۲	جہاں نما	یوسف ظفر	۶۵۹
۳	حالی کی شاعری اور اُس کا ردِ عمل	جناب پروفیسر عبدالقیوم صاحب حسرت نعمانی ایم۔ اے	۶۶۲
۴	غزل	جناب ضمیر اظہر صاحب بی۔ اے	۶۷۳
۵	رباعیات	حضرت جوش ملیح آبادی	۶۷۴
۶	تکمیل (افسانہ)	جناب پیرزادہ احمد ندیم قاسمی صاحب بی۔ اے (آنرز)	۶۷۵
۷	تکمیل (نظم)	یوسف ظفر	۶۸۲
۸	خوش فکرے (ڈرامہ)	جناب کالیداس صاحب	۶۸۴
۹	غزل	جناب حباب ترمذی صاحب	۶۹۴
۱۰	عربی ذہن کا احیاء	جناب نذیر حسین صاحب بی۔ اے	۶۹۵
۱۱	فرض ناشناس (نظم)	جناب پروفیسر انجم رومانی صاحب ایم۔ اے	۶۹۸
۱۲	گھاؤ (افسانہ)	جناب شیر محمد صاحب اختر	۶۹۹
۱۳	غزل	حضرت اختر ہوشیارپوری بی۔ اے ایل ایل بی	۷۰۶
۱۴	مطبوعات		۷۰۷
۱۵	اشتہار		۷۱۰

چندہ سالانہ — ششماہی ۳ — فی پرچہ ۸

بزمِ ہمایوں

چار اشاعتوں کے بعد ہمایوں پھر اخباری کاغذ پر حاضرِ خدمت ہو رہا ہے۔ یہ طلب ہے اس مجبوری کا نتیجہ ہے جو ملک میں کاغذ کی قلت سے پیش آ رہی ہے۔ مسلسل تگ و دو کے بعد بھی جب اچھا کاغذ دستیاب نہ ہوا تو ہم نے حکومتِ ہند کا دروازہ دوبارہ کھٹکھٹایا اور طویل تحریر کر کے اپنا اعتراض اور پسندیدہ حیثیت سے دست بردار ہو گئے۔ ہمایوں کے پیشِ نظر شروع ہی سے حسنِ طباعت و نفاست پیش کش رہی ہے جو اب بھی اسے عزیز ہے لیکن زندگی عزیز تر ہے۔ اور اگر موجودہ حالات کی نامساعدت اس کی اجازت نہیں دیتی تو ہم کسی اور لیکن بہتر موقع کا انتظار کریں گے تاکہ اپنے قدر دان ناظرین کی کاوشوں کو مناسب اہتمام کے ساتھ شائع کر سکیں اور آپ کی نظریں اس اخباری کاغذ سے مجروح نہ ہوں۔ ماہنامے اور روزنامے میں فرق ادب کی پابندی کا ہے جو بہتر لباس کا متقاضی ہے۔ ہمیں اس کے شدید احساس کے ساتھ یقینِ کامل ہے کہ یہ حالت دیرپا نہیں اور وہ دن قریب ہیں جب ہم آپ کے محبوب مجلے کو سابقہ حسن و خوبی اور ظاہری دلکشی میں ڈھال کر پیش کر سکیں گے۔

دو ماہ کے بعد جوبلی نمبر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں ہم کئی اعلانات کر چکے ہیں۔ ہمارا تخمینہ ہے کہ اس نمبر کی ضخامت تین سو صفحات ہو گی۔ جن حضرات کے مضامین متوقع ہیں ان کے اسمائے گرامی سے ہم آپ کو مطلع کر چکے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم ان کی فہرست دوبارہ شائع کر دیں۔ اعلان کے مطابق "اردو رسائل کے پچیس سال" پر جناب شاہد احمد صاحب دہلوی کو لکھنا تھا لیکن ان کی معذوریوں کے پیشِ نظر اس موضوع کو جناب پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب ایم۔ اے اپنے ذمے لے رہے ہیں۔ فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

موضوع	مصنف
پچیس سالہ اردو ادب پر ایک نظر	جناب ڈاکٹر محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
نظمِ آزاد کے پچیس سال	جناب کیپٹن ن۔ م۔ راشد صاحب ایم۔ اے
اردو غزل کے پچیس سال	جناب حفیظ ہوشیارپوری صاحب ایم۔ اے
اردو افسانے کے پچیس سال	جناب پروفیسر وقار عظیم صاحب ایم۔ اے
اردو ڈرامے کے پچیس سال	جناب انصار ناصری صاحب ایم۔ اے
اردو رسائل کے پچیس سال	جناب پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب ایم۔ اے
اردو صحافت کے پچیس سال	جناب مولانا باری (علیگ)
پچیس سالہ اردو ادب میں اشتمالیت	جناب ظہیر کاشمیری صاحب بی۔ اے
پچیس سالہ اردو ادب میں نفسیات	جناب کیپٹن رفیع الزماں خاں صاحب ایم۔ اے
پچیس سالہ اردو ادب میں خواتین کا حصہ	جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس
اردو کی پچیس سالہ نظم کے محرکات	جناب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ایم۔ اے
اردو کی پچیس سالہ نظم اور قاری	جناب تیغ ظفر صاحب بی۔ اے
اردو کے پچیس سالہ گیت	جناب ڈاکٹر مسعود حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
اردو کی پچیس سالہ طنز و مزاح	جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر ایم۔ اے
اردو کی پچیس سالہ تنقید	جناب [illegible] صاحب ایم۔ اے

ان حضرات سے جن کے مضامین ابھی تک موصول نہیں ہوئے ہم [illegible] کو جلد از جلد رسالہ [illegible] تاکہ بروقت اشاعت پذیر ہو سکیں —— ان مضامین کے ساتھ [illegible] ہوں گے لیکن [illegible]

جہاں نما

فلسطین کا مسئلہ

جنگِ عظیم کو ختم ہوئے اور قتل و غارت کے ہیبت ناک طوفان کو تھمے ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن وہ چار آزادیاں جو اخوت اور انسانی برادری کی پُرسکون جنت کی طرف اشارہ کرتی تھیں اور جن کا اشتہار دورانِ جنگ میں ہر اکسانے والے رہنما کے چہرے پر آویزاں تھا ابھی تک کہیں نظر نہیں آتیں۔ اس کے برعکس شہنشاہیت کی ہوس ملک و مال ایک تیسری عالمگیر جنگ کا سنگِ بنیاد رکھ رہی ہے۔

آج کی دانائی منظم اور ڈری ہوئی انسانیت کے کان کئی آنے والے طوفانوں سے بج رہے ہیں اور اگر ان میں سے ایک گردباد بھی کوئی سلگتی ہوئی چنگاری ہمارے دنیا کے بارود خانے میں چھوڑ گیا تو یقین ہے کہ سائنس کی جدید ترین دریافتیں اور جوہر بموں کی ہلاکت آفریں طاقتیں انسانی تہذیب کے تابوت میں آخری میخ گاڑنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

مشرقِ وسطیٰ بدقسمتی سے ایک ایسا ہی مرکزِ بادگرد ہے۔ اس ملک کے تازہ ترین شواہد و واقعات دنیا بھر کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر رہے ہیں۔ فلسطین میں یہودیوں کے دہشت پسندانہ اقدامات، قاہرہ میں یہودیوں کے مخالف عناصر کی تنظیم اور مظاہرے، سکندریہ، دمشق، بیروت اور بغداد میں برطانوی افواج کی تعیناتی کے خلاف ہنگامے بے معنی اور بے مصرف نہیں، اور یہ نظر آرہا ہے کہ پریذیڈنٹ ٹرومین کی بے جا دخل در معقولات اس ملک کے حصے بخرے کرنے میں کامیاب ہو کر اسے میدانِ کارزار میں تبدیل کر دے گی۔ اگر یوں ہوا تو یہودیوں اور مسلمانوں کی کشمکش جو گل کھلائے گی وہ دنیا بھر کو دعوتِ جنگ دینے کے مترادف ہو گی اور بھوکے بھیڑیے جو اپنے مقاصد کے لئے ہر وقت گھات میں رہتے ہیں میدان میں کود پڑیں گے۔

امریکہ اور انگلستان مشرقِ وسطیٰ کے معاملات میں کیوں دخل دے رہے ہیں؟ یہ سوال ہی دراصل اس تمام خون خرابے کی جان ہے۔ ان ملکوں کی شہنشاہیت پسندی اور سرمایہ پرستی اس تمام فساد کی جڑ ہے، ہندوستان، آسٹریلیا، چین اور دوسرے ممالک پر اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان ملکوں کو اپنے بس میں رکھا جائے۔ ورنہ یہ ملک امن و سکون کے حامل ہو کر ان کی اجارہ دارانہ ذہنیت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں۔ مشرقِ وسطیٰ درحقیقت مغرب اور مشرقِ بعید و قریب کا درمیانی سلسلہ ہے۔ اور ان طاقتوں کا مفاد اسی میں ہے کہ اس شہ رگ کو اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ملک تجارتی نقطۂ نظر سے خام مواد کی فراہمی اور پختہ اشیا کی فروخت کے لئے مغربی تجار کا مرکزِ زندگی ہیں۔ تیسری یہ کہ ان ملکوں کی پسماندگی فالتو سرمایہ کی کھپت کے لئے بہترین منڈی فراہم کرتی ہے۔ اور ایک اور وجہ جو فوجی اعتبارِ خیال سے بعد فادیت کی حامل ہے یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں ہوائی اڈوں پر قبضہ فضائی اقتدار و عظمت کا زبردست آلۂ کار ہے۔

اب ہم ذرا فلسطین کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس ملک کی تاریخ عربوں اور یہودیوں کی جنگوں کے مناظر لئے بیٹھی ہے۔ مذہبی اور ثقافتی اختلافات [illegible] لیکن تازہ ترین واقعات ان اختلافات سے کہیں زیادہ دوسری بنیادوں کی خبر دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مشرقِ وسطیٰ [illegible] اپنے پنجے پوری طرح سے گاڑ رکھے ہیں اور اس کی طاقت و اہمیت مسلمہ ہے چنانچہ مصر میں [illegible] منقولہ جائیداد غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔ فلسطین میں تین اقتصادی منصوبے [illegible] ہے۔ شام کا حال قدرے بہتر ہے لیکن عراق کے تمام تر صنعتی

[illegible] اب مصر، ایران کے تمام [illegible] ان میں سے آدھی انگلستان کے، سولہ امریکہ کے اور پانچ فی صدی فرانس کی ملکیت ہیں۔ دنیا کی طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لیے یہ [illegible] ملک کس حد تک اہم ہیں۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ خلیج میکسیکو سے تیل کی برآمد کا سلسلہ توڑ کر خلیج فارس میں منتقل کیا جا رہا ہے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ غیر ملکی سرمایہ ان ممالک کو کہاں تک نقصان پہنچا رہا ہے۔ ہندوستان ہی کی طرح ان ملکوں سے سستے داموں خام مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ اور پھر انہیں کی منڈیوں میں پختہ مال کی فروخت بہت بڑی منافع بازی کے بعد ہوتی ہے۔ اگر مشرق وسطیٰ کو اقتصادی آزادی حاصل ہو جائے تو یہاں صنعتی انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ لیکن یہی امر تو مغربی سرمایہ داروں کے مفاد کے خلاف ہے۔ اور وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ وہ یہاں سے دوہرا منافع کماتے ہیں اور کسی قیمت پر اپنے شکار کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ وہاں کے عوام کو زیادہ سے زیادہ غربت زدہ رکھا جاتا ہے تاکہ وہ ہر قیمت پر اپنے خام مواد کو فروخت کرنے پر مجبور رہیں۔ اور وہاں کے مزدور کم سے کم روزینے پر کام کریں۔ اس قسم کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کے زیر عاطفت ایک سرمایہ دار جماعت پرورش پاتی ہے جو اس کے تحفظ کے ساتھ اپنی ذات کی بقا وابستہ کر لیتی ہے۔ لیکن جب یہ جماعت اپنے قدموں پر کھڑی ہوتی ہے تو غیر ملکی سرمایہ دار کو اس سے اپنے نقصان کا احتمال ہونے لگتا ہے اور لیڈروں کے ان دو گروہوں میں ٹھن جاتی ہے۔ اسی اثنا میں ملک کی اقتصادی حالت بے حد گر جاتی ہے اور وہاں کے عوام پر اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی آشکار ہو جاتی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار اس انقلابی رَو کو غلط راستوں پر ڈال دیتا ہے اور اس طرح اس دیرپا اور کارآمد اصول پر کاربند ہوتا ہے کہ "اختلاف سے شہنشاہیت کا تحفظ کرو۔"

اس تجزیے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فلسطین کی موجودہ حالت کا باعث سرمایہ داری کی جہد للبقا ہے۔ فلسطین کی خندقوں میں سرمایہ داری اپنی موت کے خلاف سرگرم عمل ہے۔ لارڈ بالفور کا یہ فیصلہ کہ یہودیوں کی ساعی پہلی عالمگیر جنگ میں اتحادی طاقتوں کے لئے بے حد مفید تھیں جن کے عوض میں انہیں فلسطین میں آباد کرایا جائے' ہمارے خیال کے دھارے کو ایک اور طرف موڑ دیتا ہے۔ ہٹلر نے یہودیوں کو اپنے ملک کے خلاف گردانا۔ اس نے دیکھ لیا کہ یہ قوم سرمائے کے مقابلے میں وطن' قوم' عزت اور انسانیت کے تمام جذبات کو پرکاہ کے برابر جانتی ہے۔ چنانچہ اس نے ان پر اپنے سفاکانہ مظالم پوری شدت سے روا رکھے۔ وہ جانتا تھا کہ جرمنی نے میدان جنگ میں مخالف طاقتوں سے اتنی شکست نہیں کھائی جتنی اس سرمایہ پرست اور خون چوسنے والی قوم کے ہاتھوں اُسے نصیب ہوئی۔ جرمنی سے نکلے ہوئے یہودی انگلستان اور امریکہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ آٹھ دس سال کے عرصہ میں انھوں نے وہاں کی اجارہ داری اور صنعتی کاروبار میں کہاں تک دسترس حاصل کر لی۔ اس کا ثبوت ان ممالک کی موجودہ روش ہے۔ جس کے پیشِ نظر یہ لوگ اس قوم کو مرکوز کر کے اپنے ملکوں سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ ان ملکوں نے بھی وہی نتائج اخذ کئے جو آج بیس سال پہلے ہٹلر نے کئے تھے۔ لیکن فرق عمل کا ہے۔ جہاں اس نے ظالمانہ اقدامات روا رکھے۔ وہاں ان ملکوں نے چالبازی سے کام لینا شروع کیا ہے۔ فلسطین کو یہودیوں کا مذہبی وطن قرار دے کر یہ ملک انھیں اپنے گھروں سے دھکیل رہے ہیں۔ اور اس قوم کی ذلت آمیز سرمایہ پرستی کا رُخ غریب فلسطینی عربوں کی طرف پھیر رہے ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد بے شمار یہودی فلسطین میں جا آباد ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیس سال کے عرصہ میں انھوں نے وہاں کے چالیس فی صدی تجارتی اور صنعتی کاروبار پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ بقیہ ساٹھ فی صدی میں سے غیر ملکی سرمایہ داروں کے پاس ساڑھے ترپن (۵۳.۵) فی صدی کاروبار ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ساڑھے چھ فی صدی سرمایہ عربوں' اور غیر یہودی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔
یہودی سرمایہ داری کے لئے یہ منڈی بنا کر مغربی سرمایہ داری کو نقصان تو ہوا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ملک بہت حد تک اس خطرناک قوم کے اثرات سے پاک ہو گئے۔ جس کے لئے یہ لوگ ہر ممکن قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ یہودی سرمایہ دار انگریز اور امریکی

سرمائے کے سائے میں پھل پھول رہے ہیں۔ اور غریب فلسطینی عرب دوگونہ عذاب میں مبتلا ہے۔

دنیا بھر کے عوام سرمایہ داری کے خلاف یک جہتی اور سرگرمی سے عمل پیرا ہیں۔ وہ اپنی اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی بدحالی کے وجوہ پر نظر کر رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں کہ جب تک سرمائے کے اشاروں پر وہ کٹھ پتلی کی طرح ناچتے ہیں۔ ان کی فلاح و بہبود کی تمام کوششیں اکارت جائیں گی۔ یہ بھوک اور افلاس کے مارے ہوئے لوگ اُس جُوئے سے خبردار ہیں جسے سرمایہ دار قومیں ان کی گردنوں میں ڈالنا چاہتی ہیں۔ اور وہ وقت قریب آچکا ہے جب یہ لوگ ان جونکوں کو اپنے جسموں سے الگ کر کے کچل دیں انسانوں کا یہ ہجوم اب اندھا نہیں۔ اُس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے کہ اس پر صدیوں سے مظالم روا رکھنے والی طاقت کا نام "قسمت" نہیں بلکہ ان سرمایہ داروں کی ہوسناکی ہے۔

مغربی دُور اندیش اور سیاس نے مشرق وسطےٰ کو کمزور تر کرنے کے لئے یہودیوں اور عربوں میں مناقشت کا باب وا کر دیا ہے۔ عربوں میں آج بھی اتنی سکت ہے کہ وہ کسی وقت دنیا کی سیاسیات میں اپنی طاقت کا لوہا منوانے لگیں۔ لیکن یہودیوں کے سامنے کوئی سیاسی مقصد نہیں۔ وہ اپنے آرام کے لئے دنیا بھر کو بھوکا مارنا گوارا کر سکتے ہیں۔ اس لئے مغربی طاقتوں کو ان سے کوئی بھی سیاسی خطرہ لاحق نہیں۔ وہ آنحالیکہ فلسطینی عرب' مصر' ایران' اور دوسرے اسلامی ممالک سے گٹھ جوڑ کرنے کے بعد مشرق وسطیٰ میں مشرق و مغرب کے درمیان ایک بڑی قوت بن سکتے ہیں۔ اس لئے فرانسیسی سیاست شام اور لبنان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑوا رہی ہے۔ اور برطانوی شہنشاہیت نے جہاں فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کی رزم گاہ بنا رکھا ہے۔ وہاں عراق میں عربوں اور شامیوں کے درمیان مناقشت پھیلا رکھی ہے۔

ہندوستان سیاسی آزادی کی راہ میں ایک بہت بڑا قدم اُٹھا چکا ہے۔ اُسے اپنا مستقبل روشن نظر آرہا ہے۔ لیکن مغربی سیاست کی ان چالوں سے ہشیار رہنے کی ضرورت جس قدر اب ہے شاید کسی زمانے میں نہیں تھی۔ سیاسی اقتدار ختم کرنے کے بعد کیا غیر ملکی سرمایہ دار ہندوستان کو بدستور خام مواد اور پختہ مال کے فروخت کی منڈی نہیں بنائے گا۔ اور اگر بنائے گا تو کیا اپنے مفاد کے لئے یہاں کی اقتصادی حالت کو بد تر بنانے کے لئے مذہب اور ثقافت کے نام پر پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ —— یہ سوال ہمارے سامنے ہیں —— اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم فلسطین کے درد کو اپنا درد سمجھنے پر مجبور ہیں۔

—————— یوسف ظفر

حالی کی شاعری اور اُس کا ردِّ عمل

جدید شاعری کی بنیاد سے قبل حالی قدیم رنگ میں فکرِ شعر کرتے تھے۔ جس کی طرف لوگوں نے بالکل توجہ نہیں کی ہے۔ اور اُردو کی بدنصیبی سے اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے حالی کو صرف مسدس کا شاعر جانا اور انھیں قومی مرثیہ گو کی حیثیت سے زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ مگر ان کے اوّل دور کا کلام دیکھئے تو جس طرح ظرافت سے قطع نظر اکبر کی سنجیدہ شاعری انھیں شعرائے قدیم کی صفِ اوّل میں پہنچا دیتی ہے۔ قدیم شاعری میں حالی کا مقام بھی بہت بلند نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں میر کا درد۔ آتش کی تیزی۔ مومن کی نازک خیالی و جذبات نگاری غالب کی "نفسیاتِ محبت" اور داغ کی شوخی ساری باتیں آکر جمع ہو گئی ہیں۔ البتہ تعجب کی بات یہ ہے کہ غالب کی شاگردی کے باوجود حالی کے کلام میں میرزا کی دقت پسندی اور ان کے خیالات کی پیچیدگیاں نہیں پائی جاتیں۔ بلکہ اس کے برعکس بے تکلفی، روانی، سادگی اور لطافت جس نے کلام میں بڑی تاثیر اور تاثیر میں بیساختگی پیدا کر دی ہے حالی کا خاصۂ شاعری ہے۔ اور یہ سب نواب شیفتہ کی صحبت کا فیض ہے جس نے حالی کے ذوق کی معقول تربیت اور صحیح رہنمائی کی۔ اُس وقت شیفتہ کی سخن فہمی کی تمام ملک میں شہرت تھی حتیٰ کہ خود میرزا غالب ان کی نکتہ سنجی کے ایسے قایل تھے کہ انھوں نے اپنے اشعار کے حسن و قبح کے جانچ کی کسوٹی شیفتہ کی پسندیدگی و ناپسندیدگی کو بنا رکھا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

غالب بفنِّ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او

ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

اور سچ تو یہ ہے کہ مصطفےٰ خاں شیفتہ نے جہاں حالی کی شاعری کو سنوارا وہاں میرزا غالب کی مشکل پسندی کی بھی جو میرزا کے ابتدائی دور کی شاعری میں نمایاں تھی، اصلاح کی۔ شیفتہ اپنے معیارِ پسندیدگی کے متعلق کہتے ہیں ؎

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ

معنی شگفتہ، لفظ خوش، انداز صاف ہو

چنانچہ ان معنوں میں حالی نے شیفتہ کی، جن کے رنگِ تغزل سے حالی کے تغزل کو خاص مناسبت تھی، پوری پوری پیروی کی ہے ان کے اشعار سادگی و صفائی کی خصوصیت کے ساتھ بعض مرتبہ اس طرح احساسات میں ڈوبے ہوتے ہیں کہ سُننے کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بُلبل کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت

ذوق سب جانتے رہے جز ذوقِ درد اک یہ لپکا دیکھئے کب جائے گا!

یوں ہی گزرے تو سہل ہے لیکن فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں

کوئی دلسوز ہو تو کیجے بیاں سرسری دل کی واردات نہیں

خواجہ میر درد کا ایک شعر ہے ؎

دیدوا دید ہوئی دُور سے میری اُس کی پر جو میں چاہا تھا سو بات نہ ہونے پائی

گو صفائی اور لطافت بیان کی خصوصیت کے ساتھ حالی کے شعر سے جو حسرت و بیکسی ٹپکتی ہے درد کے انداز میں نہیں پائی جاتی۔
حالی کہتے ہیں ؎

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

اسی طرح غالب کا مشہور شعر ہے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

گر دونوں میں فرق یہ ہے کہ غالب کے انداز میں تلخ افسردگی ہے اور حالی کے شعر میں بے بسی و بے زبانی، اس کے علاوہ حالی محتاط ہیں۔ وہ غالب کی طرح عشق کا نام نہیں لیتے ہیں بلکہ "واقعاتِ دہر" کی مبہم ترکیب کے پردے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔
حالی کا ایک دوسرا شعر ہے ؎

گل و نسریں تو کیا فرقت میں جی بھی چھوٹ جاتا ہے ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیرِ گلستاں میں

اسی قسم کا ایک شعر جناب وحشت بھی فرماتے ہیں ؎

بزمِ نشاط سے کبھی مجھکو بھی تھی مناسبت آج ہوئی ہے چشمِ تر ابرِ بہار دیکھ کر

وحشت کے ایک اور شعر کا بھی تیور ہے ؎

توجہ کے کبھی قابل تھی اپنی پارسائی بھی کبھی ہم کو بھی ملتی تھی جگہ ساقی کی محفل میں

اور ان دونوں بزرگوں کے شعروں میں جو لذت اور کسک ہے اُسے اہلِ دل اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔
حالی نے اکثر خواجہ میر درد کی طرح چھوٹی چھوٹی بحروں میں غزلیں کہی ہیں۔ جن کے اشعار درد ہی کی طرح اثر میں ڈوبے ہونے کے علاوہ ضرب المثل سے ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل غزل ملاحظہ ہو ؎

قلق اور دل میں سوا ہو گیا دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
نہیں بھولتا ان کی رخصت کا وقت وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
ہوا رُکتے رُکتے دمِ آخر فنا مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

اسی طرح خواجہ میر درد فرماتے ہیں ؎

جب نظر سے بہار گزرے ہے جی پر افتاد بار گزرے ہے

مگر —— ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا —— کے ابہام میں بے ساختگی کے ساتھ جو گنجِ معنی پنہاں ہے اُس کا جواب درد کے یہاں کہاں پایئے گا۔
اسی غزل کے دو اور اشعار ہیں ؎

ٹپکتا ہے اشعارِ حالیؔ سے حال　　　　کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

شوخی و بے تکلفی کے ساتھ شیرینی و لطافت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ حالیؔ کا پیرایۂ بیان کتنا اچھوتا ہوتا ہے

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام　　　　گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
رات ان کو بات بات پہ سو سو دیئے جواب　　　　مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　　　اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور　　　　عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے　　　　پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ　　　　ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

حالیؔ کے بعض اشعار ہمیں اس طرح متاثر کرتے ہیں جیسے ان کے احساسات منتقل ہو کر ہمارے دلوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہوں۔ اور ہم ان سے ایک لذیذ قسم کی کسک محسوس کرتے ہیں۔ وہ بعض مرتبہ ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو اگرچہ ہمارے لئے نئی نہیں ہوتی۔ اور ہم بھی اُسے محسوس کرتے ہیں البتہ ہمیں اس کے اظہار پر قدرت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن حالیؔ کا پیرایۂ بیان ایسا اچھوتا اور معصومانہ ہوتا ہے کہ سننے کے بعد ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ——— گویا یہ بھی میرے دل میں تھا ——— مگر اسی احساس کے سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت خود ہم میں نہ تھی۔ چنانچہ مولانا حالیؔ کا یہ مشہور شعر دیکھئے کس طرح دل میں اُترتا جاتا ہے۔

عشق کہتے ہیں جسے لوگ یہی ہے شاید　　　　خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

یہی مضمون خواجہ میر دردؔ کے یہاں اس طرح ادا ہوا ہے

کیا جانئے کیا دل پہ مصیبت یہ پڑی ہے　　　　اک آگ سی کچھ ہے کہ وہ سینے میں گڑی ہے

مگر اس میں حالیؔ کی معصومیت اور بھولا پن بالکل مفقود ہے۔ میر دردؔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تجربہ کی بات کہہ رہے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حالیؔ کو اس شعر کا فیضان شیفتہ کے درج ذیل شعر سے حاصل ہوا ہے جو حالیؔ ہی جیسی سادگی و ناتجربہ کاری کا حامل معلوم ہوتا ہے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　　　اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

حالیؔ نے بعض نفسیاتی حقائق کا اعتراف جس حُسن سے کیا ہے ملاحظہ ہو۔ اصلیت و حقیقت نگاری کی ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم　　　　ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

بیچ ہے یاں شرم گنہ شوق بھلا دیتا ہے　　　　توبہ ان کی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے

بیقراری تھی سب اُمید ملاقات کے ساتھ　　　　اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

[illegible] کی گئی ہے

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

اور کتنا معنی خیز ہے یہ شعر ؎

مجھے کل کے وعدہ پہ کرتے ہیں رخصت — کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے

پھر وہ کس طرح بھانپ جاتے ہیں کہ ؎

خط آنے لگے شکوہ آمیز اُن کے — ملاپ اُن سے گویا ہُوا چاہتا ہے

ذرا ان کا حسن طلب ملاحظہ ہو۔ محبوب کو کتنی لطیف قسم کی دھمکی دیتے ہیں ؎

وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک — دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

ان کی طبیعت میں لطیف قسم کی شوخی اور بذلہ سنجی بھی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ان کے مجموعہ میں اس قسم کے اشعار بھی موجود ہیں ؎

چپ چپاتے انھیں دے آئے دل اک بات پہ ہم — مال مہنگا نظر آتا تو چُکایا جاتا

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار — اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

اور یہی تھی حالی کی اصل شاعری۔ ورنہ پھر ان کی طبیعت میں ایسا انقلاب آیا کہ وہ شعر و سخن سے متنفر ہو گئے اور اُن کی شاعری بالکل مغلوب ہو کر رہ گئی۔ حتیٰ کہ اخیر وقت میں انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ قدیم رنگ کی لذّت، سوز اور اُمنگ سے بالکل خالی ہے۔ چنانچہ مجموعہ غزلیات اور چند مخصوص نظموں کے علاوہ ان کی بیشتر قومی نظمیں بالکل خشک، بے کیف و اثر اور روکھی پھیکی ہیں۔

حالی کی طبیعت میں انقلاب کا سبب

پروفیسر عبدالقادر سروری شاید حالی کے اس قول سے کہ شیفتہ شاعری میں اصلیت کے حامی تھے اور قدیم طرز کی شاعری کو ناپسند کرتے تھے، یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شیفتہ کی صحبتوں ہی سے حالی کی شاعری میں انقلاب آیا۔ مگر مجھے ان کے اس خیال سے، ایک تو اس سے اتفاق نہیں ہے کہ شیفتہ خود ہمیشہ قدیم رنگ ہی میں شاعری کرتے رہے۔ البتہ شعر میں وہ قدیم انداز مبالغہ و تصنّع کو ناپسند کرتے تھے۔ اور یہ اثر حالی نے بھی ان سے لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری میں تصنع و مبالغہ کی کمی ہوگئی اور اس کی جگہ حقیقت نگاری و اصلیت جسے حالی لازمہ شعر کہتے ہیں زیادہ پیدا ہوگئی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شیفتہ کی صحبت میں حالی کا عاشقانہ رنگ اپنی سادگی و اصلیت کے سبب زیادہ پُر اثر اور گہرا اور ان کا قدیم رنگ تغزل معایب سے پاک ہو کر اور چوکھا ہو گیا ؎

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — جی چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں

بیقراری تھی سب اُمید ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

چنانچہ قدیم رنگِ تغزل کو نہ تو شیفتہ نے چھوڑا اور نہ ان کی زندگی میں حالی کے دل میں اس سے بغاوت کا خیال پیدا ہوا۔ دوسرے انھوں نے لاہور کے نئے طرز کے مشاعرہ کی شرکت سے قبل خود کہیں اپنے مزاج میں تبدیلی کا ذکر کیا ہے اور نہ قدیم طرز سخن سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ ان کی طبیعت میں انقلاب دراصل شیفتہ کے بعد نمایاں ہوا۔ اُن کی زندگی میں تو دراصل حالی کی دُنیا ہی اور تھی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] کو شاید صدمہ پہنچا جس سے ان کی طبیعت میں بددلی پیدا ہوگئی۔ اور نہ صرف قدیم رنگ تغزل بلکہ [illegible] کے بعد کو دنوں تک حالی کو پریشانی رہی۔ مگر پھر

انھیں شیفتہ کی سرپرستی حاصل ہوگئی تو ان دونوں کے ساتھ ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ حالی کے جوانی کے دن تھے چنانچہ شیفتہ کی محبت میں انھیں کنگھی چوٹی، حسن وعشق، ہجر و وصال اور طنز و شکایت وغیرہ کے مضامین سے دلچسپی رہی اور شاید یہی وہ زمانہ تھا جس کی یاد مولانا کے دل میں کبھی اس طرح چٹکیاں لینے لگی ؂

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت   پر جوانی مجھ کو یاد آئی بہت

مگر جب حالی کا یہ سہارا چھن گیا تو وہ بد دل ہو کر لاہور چلے گئے۔ جہاں گورنمنٹ بکڈپو میں ان کو ایک اسامی مل گئی اور وہ انگریزی کتب سے اردو میں ترجموں کی اصلاح کی خدمت پر مامور ہوئے۔ لیکن یہاں کے لیل و نہار ہی دوسرے تھے۔ لاہور آ کر حالی کی دنیا ہی بدل گئی۔ صحبت یاراں چھوٹ گئی، وہ وقت سے پہلے اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگے۔ عمر سے زیادہ طبیعت میں سنجیدگی آگئی اور ان کی ساری زندہ دلی ختم ہوگئی۔ چنانچہ وہ اپنے "دل زندہ" کا ان الفاظ میں ماتم کرتے ہیں ؂

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی   بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا   ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

لاہور میں نئے طرز کے مشاعرہ کا قیام

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد آزاد نے لاہور میں ایک مشاعرہ قائم کیا جو بقول حالی "اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ جس میں مصرعوں کے بجائے کسی مضمون کا عنوان دے دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم کریں"۔ چنانچہ انھوں نے بھی چار مثنویاں ایک برسات پر، دوسری امید پر، تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔ اور یہیں سے ان کی بیانیہ شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ وہ اس مشاعرہ کا ذکر پھر دوسرے مقام پر اس طرح کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کو قدیم مشرقی شاعری میں کس قدر خامیاں نظر آتی تھیں۔ "اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ در دست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اُس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے۔ اور اُس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔ یہ تحریک اگر پندرہ سال قبل شروع کی جاتی تو شاید کوئی ثمرہ مترتب نہ ہوتا کیونکہ جو لوگ ہندوستان میں اُردو نظم پر تھوڑی بہت قدرت رکھتے تھے وہ عشقیہ مضامین کی ممارست سے شاعری کو عاشقی کا مرادف جانتے تھے۔ وہ واقعہ نگاری اور تصویر حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے۔ انھوں نے مغربی انشا پردازی کا کوئی نمونہ بھی اپنی زبان میں نہیں دیکھا تھا جس پر وہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھنے کے قابل ہوتے۔ لیکن یہ تحریک خوش قسمتی سے ایسے وقت میں ہوئی جبکہ اُردو زبان میں مغربی خیالات کی رُوح پھونکی جا رہی تھی۔ اور لٹریچر میں بہت سی کتابیں اور مضامین انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہو گئے تھے چنانچہ اس کے سبب اُردو میں بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا"۔

الغرض اس نئے طرز کے مشاعرہ نے فضا میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کر دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالی نے جو پہلے ہی سے بد دل ہو رہے تھے قدیم مذاق کے مشاعروں میں شرکت ترک کر دی اور جب لوگوں نے اصرار کیا اور بد دلی کا سبب پوچھا تو "مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر" کے عنوان سے ایک نظم لکھ ڈالی جس میں رنگِ قدیم کی اس طرح پھبتی اُڑائی گئی ہے ؂

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر حیف   طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں   جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

اب نہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ   سر ہے سودائے تمنائے عشق سے دل ہے خالی

گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل ہے آخر   نہ رہی جیسے وہ مضمون نبھاتے نالی

آپ بیتی ہو نہ جو ہے وہ کہانی بے لطف ‌ ‌ گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کھینچئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں ‌ ‌ لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر ‌ ‌ کیجئے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح ‌ ‌ وہ ہُوا جس سے دماغ اپنا ہُوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہ پھر اپنی بھی وہی ہو نہ مثل ‌ ‌ قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

اور رفتہ رفتہ شعر گوئی ہی سے ان کو نفرت ہو گئی۔ خصوصاً قدیم طرز کے اشعار کی کوئی افادیت ان کی نظر میں باقی نہ رہی۔ حتیٰ کہ ایک وقت اپنے متعلق انھیں اس احساس سے بڑی تکلیف ہونے لگی کہ اتنی عمر جو قدیم رنگ کی شاعری کی پرورش میں گزری وہ ساری کی ساری ضائع ہو گئی۔ چنانچہ وہ اپنے مسدس کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اس ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے۔ مگر جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں ؎

شکست رنگِ شہاب و ہنوز رعنائی ‌ ‌ درآں دیار کہ بُودی ہنوز آنجائی"

بایں ہمہ حالی شاعری کا مادّہ چونکہ فطرت کی طرف سے لے کر آئے تھے 'وہ ہزار شعر کی بُرائی کریں' اس مادّہ کو دبا نہ سکے۔ چنانچہ وہ پھوٹ پڑا اور اب اسے کسی طرف رجوع ہونا ہی تھا۔ خواہ وہ جدید اصلاحی رنگ ہی میں سہی۔ مگر شاعری سے طبعی لگاؤ کے سبب وہ اس سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ البتہ اب ان کا ـــــــ وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی ـــــــ چنانچہ وہ فرماتے ہیں "زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھتے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے اُبھاروں سے دل بڑھتا تھا۔ نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا۔ مگر ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے بخارات درونی جن کے رُکنے سے دم گھٹا جاتا تھا دل و دماغ کو متلاطم کر رہے تھے۔ اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔ قوم کے ایک سچے بہی خواہ نے آکر ملامت کی۔ غیرت دلائی اُس کی جادو بھری تقریر دل میں گھر کر گئی۔ برسوں کی بُجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ باسی کڑھی میں اُبال آیا۔" مسلمانوں کی اخلاقی و معاشرتی حالت اُس وقت نہایت پست و ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ ان کی اصلاح کے خیال سے سرسید نے ہمت دلائی اور حالی کے دل میں مسدس کی شکل میں ملت کا مرثیہ لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اور اس طرح شعر کہنے کی بیچین خواہش نے تسکین پائی۔ اس کے بعد وہ اُردو طرزِ سخن کی اصلاح کی طرف رجوع ہوئے اور مقدمہ شعر و شاعری لکھ ڈالا۔ جو شروع سے اخیر تک مغربی اثرات کے ماتحت مرتب کیا گیا ہے۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ اس کا کوئی صفحہ بھی ان حضرات کی نظر سے نہیں گزرا ہے جو اپنے جذبۂ عقیدت کے سبب حالی کو پیروئی مغرب کے الزام سے بری کرنے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔ حالی نے اس کتاب میں شعر کی جو مذمت شروع کی ہے تو اپنے خیال کی تائید میں شاید افلاطون سے ناواقفیت کے سبب شاعری کے متعلق اس کے خیالات کی غلط ترجمانی کر دی ہے اور مشرقی شاعری کے نقائص بیان کرنے کے بعد شعر کا اصلاحی معیار بنا کر پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ہم حالی کی نظم "شعر سے خطاب" کے چند اشعار انتخاب کر کے ذیل میں درج کرتے ہیں جس سے حالی کے نظریۂ شاعری کی کسی حد تک نمائندگی ہوتی ہے۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تُو تو غم نہیں ‌ ‌ پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تُو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ‌ ‌ ہاں! سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تُو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں ‌ ‌ تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تُو

چُپ چاپ اپنے پیچ سے کٹ جاؤ ان میں گم
اونچا ابھی ذکر علم اختیار کر
عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان اپنے کو گر ہے ایاز تو

چنانچہ آہستہ آہستہ ان کے مزاج میں عجیب قسم کی تبدیلی ہونے لگی۔ اور انھیں جب یہ محسوس ہونے لگا کہ ——— اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں ——— تو وہ ——— خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا ——— کے احساس سے بیگانہ ہو کر ——— بس اگلے فسانے فراموش کر دو ——— کا درس عمل دیتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ؎

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

سرسیّد سے عقیدت

غدر کا ردِ عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ حالی کی معاشرتی و اصلاحی سرگرمیاں بڑے شدومد سے جاری تھیں۔ وہ سرسید کی رہنمائی میں چاہتے تھے کہ ملک میں ذہنی انقلاب برپا کر دیں۔ اور وقت کا بھی تقاضا تھا کہ تم ہمارا ساتھ دو، ہم تمھیں صحیح منزل تک پہنچا دیں گے۔ دل کا حال کوئی نہیں جانتا مگر قولاً و فعلاً حالی سرسید احمد کو جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ ؎

بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے منزل کا نشاں یارو
پہنچنے دو سلامت تا بمنزل کارواں یارو

مجدد قوم کی حیثیت سے متعارف کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مذہبی، سیاسی اور معاشرتی عقاید میں وہ کس حد تک سرسید کے ہم خیال تھے۔ حالی بعض اوقات کچھ ایسے معمہ بن جاتے ہیں کہ محض اُن کی تحریروں سے انھیں سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر حال ان کے عقاید کی حقیقت جو بھی ہو مگر وہ وقت کے تقاضے کے سبب ہوا کے رُخ کو پہچاننے اور زمانہ کی رفتار سے سمجھوتے کے لئے مجبور ہو گئے۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارا
کہ ہے آشتی ہی میں اپنا گزارا
نہیں ہے جنھیں میری صحبت گوارا
مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارا

سدا ایک ہی رُخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

مغرب و اہلِ مغرب اور اُن کے ادب و تہذیب سے وارفتگی

مولانا حالی کی تحریروں سے اتنا تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر میں مشرقی شاعری کس قدر ذلیل و پست ہو گئی تھی۔ مگر یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ہر چند اُنھوں نے مغربی ادب و شعر کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا تاہم تنہا محض مغرب سے انتہائی غلو کے سبب مغربی لٹریچر کو وہ بہت بلند درجہ دیتے تھے۔ چنانچہ وہ "مقدمہ" میں مغربی نظریہ شعر کے مقابلہ میں اپنی کمتری کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔ "مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ اس کے علاوہ اُردو جیسی نامکمل زبان میں مغربی شاعری کا پورا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ البتہ کچھ تو طبیعت مبالغہ اور اغراق سے (جو قدیم شاعری کا خاصہ ہے) اس طرح نفور تھی اور کچھ نئے (جدید شاعری یعنی طرز مغرب کے انداز شعر کے) چھیچھنے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا

اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقہ کے ترک کرنے کا الزام عاید ہو۔"

اس اقتباس کے آخری جملہ سے ممکن ہے قدامت پسندوں کی جماعت کو جو حالی کی پیروئی مغرب کے منکر ہیں۔ یہ غلط فہمی پیدا کرنے کا موقع مل جائے کہ حالی نے نہ تو تقلید مغرب کی اور نہ طرز مشرق کو چھوڑا۔ حالانکہ حالی کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ وہ مشرقی شاعری سے اظہار نفرت کے ساتھ مغربی شاعری کی برتری کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ باوجود سعی بلیغ وہ انگریزی شاعری کے تتبع کا صحیح حق ادا نہ کر سکے اور اس کا ایک سبب تو مغربی شاعری کے اصول سے لاعلمی کو اور دوسرا اُردو زبان کی بے مائگی کو بتاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک مقالہ "قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار" میں انھوں نے اس بات کو زیادہ وضاحت سے لکھا ہے۔

"ہم قدیم شاعری کے مخالف ہیں اور نہ جدید شاعری کے مزاحم' بلکہ ایک لحاظ سے جدید شاعری کے مؤید ہیں۔ لیکن ہماری رائے میں نئی شاعری کو ترقی دینے کا مقام بجائے قومی جلسوں کے نئی طرز کے مشاعروں کو جن کا نمونہ ایک دفعہ لاہور میں قائم ہو چکا ہے قرار دینا چاہیئے۔"

مگر وہ اپنی کلیات کے مختصر مقدمہ میں تو کھل کر تقلید مغرب کی کوشش میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہیں کہ: ـــــــ "میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے ہیں معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعہ میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہ ہو سکا۔ اور ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اُردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ کی ہونہار اور مبارک ہستیوں کا کام ہے جن سے اُمید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہیں چھوڑیں گے۔

پارۂ درخاک معنی تخم سعی افشاندہ ایم
بو کہ بعد از ما شود ایں تخم نخلِ باردار

لیکن تعجب ہے کہ ان ساری باتوں کے باوجود حالی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "وہ مغربی شاعری سے ایک حد تک متاثر ضرور رہیں۔ لیکن مغربی تمدن اور مغربی انداز فکر کے ہرگز معترف نہ تھے (بلکہ) انھوں نے مغربیت کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔" لیکن ان کے متعلق اس قسم کا حسن ظن حقیقت پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ حالی نہ صرف ؎

کرنی ہے فتح گر نئی دُنیا تو لے نکل   بیڑوں کے ساتھ چھوڑ کے اپنے جہاز کو

کا نعرہ بلند کر کے شعر کو مغربی سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے بلکہ وہ سارے ہندوستان میں مغربی فضا پھیلانا چاہتے تھے۔ اور غلط یا صحیح طور پر مغرب کی تقلید ہی میں مسلمانوں کی نجات سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں   رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں
علم کو کر دو کو بکو ارزاں   ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

. . . .

کہئے دُنیا کا جس کو باغ جناں   ہے فرانس آج اور انگلستاں

یہ کیونکر کہوں کہ مولانا کو اس کا بھی علم نہ تھا کہ مشرقی معیار اخلاق کی نظر سے یہ مقامات بداخلاقی کا جہنم کہے جانے کے مستحق ہیں لیکن

بڑا ہو عقیدت کا کشش کی آنکھیں کیوپڈ کی آنکھوں کی طرح اندھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کو مغربی تمدن اور مغربی افراد دکھیں پرہ پوچھئے تو پرستش کی حد تک عقیدت تھی۔ اور وہ ہر ہندی مسلمان کو اہلِ مغرب سے ذہنی و معاشرتی حیثیت سے متاثر و مشابہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن بڑی حسرت کے ساتھ علم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں مشرق کو وہ فیض اے علم تجھ سے نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کی طرح! رہتی ہیں شعاعیں تیری محدود وہیں

اسی طرح ان کے مضامین نظم و نثر دونوں میں جہاں دیکھئے آپ مغرب کی عظمت و بزرگی کا تذکرہ پائیں گے۔ جہاں کے باشندوں کے متعلق انھیں یہ حسنِ ظن ہو گیا تھا کہ ؏ مدار آدمیت کا ہے اب انھیں پر

یوں تو حالی کے متعلق یہی گمان ہو سکتا ہے کہ انھوں نے انگریزوں کی تہذیب و معاشرت اور ان کے رہن سہن کے متعلق اظہارِ خیال میں شاید ناواقفیت کے سبب زیادہ حسنِ ظن سے کام لیا ہے۔ مگر بغور مطالعہ کیجئے تو ظاہر ہوگا کہ وہ یورپ سے اس طرح مسحور تھے کہ نہ صرف انھیں معایب مغرب بھی محاسن ہی نظر آتے تھے بلکہ تمام اہلِ یورپ ان کی نگاہ میں فرشتوں کی طرح معصوم دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون "مزاح" میں ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کی اخلاقی پستی کی مذمت کے بعد مغرب کے آگے اس طرح سر نیاز خم کر دیتے ہیں :۔

"یورپ کی قوموں نے جس طرح اور تمام اخلاقی برائیوں کی اصلاح کی ہے اسی طرح انھوں نے اس برائی کو بھی مٹایا ہے۔ ان کے یہاں فحش و ابتذال اسی طرح مفقود ہے کہ لغت کی کتابوں میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا ہے" کاش حالی نے انگریزی ادب کا بنظرِ امعان مطالعہ کیا ہوتا اور ایسے غیر ذمہ دارانہ الفاظ ان کی زبان سے نہ نکلتے۔ یا کاش وہ اس زمانہ میں موجود ہوتے اور اردو میں فرائیڈ ذہنیں جمالیس کے مقلدین سے اپنے اس عقیدہ کی داد طلب کرتے۔

لیکن یہیں حد نہیں ہو جاتی ہے، حالی کو شاید ایسا نظر آتا تھا کہ تعلیمات اسلامی کا عملی و مثالی نمونہ دنیا میں صرف انگریز و اہلِ مغرب ہیں۔ چنانچہ جہاں انھوں نے اپنے مسدس کے چھ بند انگریزوں کی مدح سرائی میں وقف کر دیئے ہیں وہاں ان سے ان الفاظ میں اظہار عقیدت کیا ہے

شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے
وہ لیجا کے سب اہلِ مغرب نے جوڑے

یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے ساتھ ان کے جذبۂ اخلاص و وفا کی شدت کا یہ عالم نظر آتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے مسٹر مارٹین کی روانگی انگلستان کے وقت سارے ہندی مرد و زن کو ان کے آگے سربسجود کر کے ان کی زبان سے یہ کلمۂ عقیدت پڑھوا دیا تھا کہ

؏ خیر کے پتلے ہیں انگلش قوم کے سب مرد و زن

چنانچہ وہ مغرب کی برکتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک قصیدہ میں دعوت دیتے ہیں کہ لوگ علی گڈھ آئیں اور ؎

مسیحی پوشیں دیکھیں مسلمانوں کے بچوں کی،
مسیحی کو مسلمانی قبا زیب بدن دیکھیں

اور خیر یہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ مگر حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ اس قصیدہ کا شروع سے اخیر تک ایک ایک شعر انگریزوں کی مدح سرائی میں رطب اللسان ہے اور یہ بات اصلیت پسند و حقائق نگار حالی کے قطعی شایانِ شان نہیں ہے۔

لعہ میں وہ اس ذہنیت کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس	یاں غلام آکر کرامت ہے یہ انگلستان کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے رکھا جونہی قدم	دور کٹ کے پاؤں سے اک ایک بیڑی گر پڑی
یکن ——— قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا	کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزادیاں آزاد رہ سکتا نہیں	وہ رہا ہو کر غلام اس کی ہوا جس کو لگی

حالی کا جدید رنگ اور اُس کا ردِّ عمل

اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حالی مشرقی شاعری سے بہ سبب مبالغہ و اغراق اظہار نفرت کرتے تھے۔ اور مغربی لٹریچر اُن نگاہ میں ان عیبوں سے پاک تھا۔ مگر اس کے برعکس یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ حالی کی قدیم طرز کی شاعری تو شیفتہ کے اثر کے بب واقعی اغراق و غلو سے پاک ہوتی تھی اور اس میں حقائق و واقعات کا زیادہ بیان رہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں حالی کو ھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے نفرت بھی تھی۔ البتہ ان کے آخری دور کے کلام یعنی جدید رنگ شاعری ں جس کا نمونہ ہم گزشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں بہت زیادہ آورد و تصنع کی جھلک نظر آتی ہے اور اغراق و مبالغہ کا جہاں تک تعلق ہے انگریزوں کی مدح سرائی میں انھوں نے مشرقی سلاطین کے یہاں دربارداری کرنے والے قدیم شعرا سے کم مبالغہ اور حاشیہ آرائی سے کام یں لیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بھی اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں افلاطون کی طرح شاعری کو نقالی سے تعبیر کرتے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان کے جدید رنگ کو ہم مغرب کی نقالی کے سوا اور کیا کہیں گے؟

اور یہ بھی محض مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ حالی کے مقالات و خطبات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا بلہ و کعبہ لندن تھا۔ اور وہ اس ذہنیت کے اظہار کے لئے مجبور تھے کیونکہ جس فضا میں وہ سانس لے رہے تھے اُس کا یہی تقاضا ہے ر حیرت اس لئے ہوتی ہے کہ ان ساری باتوں کے باوجود حالی کو نیشنلسٹ اور آزادی پسند شاعر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اور نہیں ا جا سکتا کہ یہ کہاں تک درست ہے! بلاشبہ حالی کے دل میں قوم کا درد تھا۔ مگر اس سے زیادہ انھیں اپنے "رہنمائے قوم" سے محبت و قیدت تھی جس کی جائے پناہ سرکارِ برطانیہ تھی اور دین و ایمان مغربیت تھا اور ظاہر ہے کہ جو نیت امام کی تھی وہی مقتدی کی تھی چنانچہ وہ بھی اپنے مرشد و آقا سرسید کی طرح انگریزوں کو ماویٰ و ملجا سمجھتے تھے۔ جس کا اپنے مضامین نظم و نثر میں وہ ہر جگہ اعتراف کرتے رہتے ھے۔ اور ان کی یہی انتہا پسندی اردو ادب کی دنیا میں جدت پسندی کی وہ ابتدا تھی جس کی انتہا آج نئے ادب والوں کی خوش ہمیوں میں نمایاں ہو رہی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کے اس انداز کو ہندوستان کی اکثر غیور طبیعتوں نے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ شی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر "اودھ پنچ" نے پھبتی کسی کہ ؎

سید کی سرگزشت کو حالی سے پوچھئے
غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے

مولانا شبلی نعمانی کو بھی جو اگرچہ بطریق "خذ ما صفا و دع ما کدر" مغرب سے مستفید تو ضرور ہیں مگر حالی کی طرح مرعوب نہیں یں۔ حالی کی یہ سید پرستی کورانہ تقلید مغرب اور ذہنی غلامی بُری معلوم ہوئی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم	اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار

اکبر — حالی کا ردِ عمل

مولانا شبلی اور منشی سجاد حسین کے علاوہ جو مذہب و سیاست میں ترقی پسند ہونے کے باوجود سوشل معاملات میں بڑی حد تک روایت پسند تھے دوسرے لوگوں کو حالی کی مغرب پرستی پسند نہ آئی۔ اور حالی اگرچہ ان نتائج سے بالکل بے خبر تھے جس کے مستقبل بعید میں رونما ہونے کا خدشہ تھا۔ مگر دُور بین نگاہیں اُسے تاڑ رہی تھیں چنانچہ جب حالی کے اس جذبۂ مغرب پرستی نے شدت پکڑی تو اُس نے اکبر (الہ آبادی) کی طنزیہ ظرافت کی شکل میں اپنا ردِ عمل پیدا کیا اکبر کو اس بات کا احساس تھا کہ ہم ہزار مغرب کی نقالی کریں مگر جب تک ہم اور ہمارا ایشیا مغرب کا غلام ہے اس وقت تک ہم میں مغربی کمالات پیدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

حکومت ایشیا پر قسمتِ مغرب میں ہے جب تک — کمالات ان کے جو ہیں ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے

دوسری جگہ وہ غالباً حالی کی نقالیِ مغرب کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

رفتارِ ترقی یہ کہیں ناچ نہ ہو جائے — یہ قرأتِ مصری کہیں کھماچ نہ ہو جائے

توحید کی تحریک سے زندہ ہے ترا دِل — مغرب کی مگر کوک سے یہ وارح نہ ہو جائے

درج ذیل اشعار میں "مریدِ دہر" اور "زمانہ دیکھ کے" ان دو لفظوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا اشارہ شاید سرسید کی "دہریت" نابرانی اور حالی کی "سید مریدی" و "مغرب پرستی" کی طرف ہے ؎

"مریدِ دہر" ہوئے وضعِ مغربی کر لی — نئے جنم کی تمنا میں خود کشی کر لی

نگاہِ نازِ بتاں پر نثار دل کو کیا — "زمانہ دیکھ کے" دشمن سے دوستی کر لی

اکبر گمراہ کن پیروئ مغرب سے اسی کو بہتر سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی قدیم تہذیب و معاشرت کے تحفظ کی کوشش کریں جو تکلف و تصنع سے ہر طرح پاک ہے چنانچہ حالی کی تحریک تقلیدِ یورپ پر ایک لطیف طنز ملاحظہ ہو ؎

بے ہنر ہو کر جو بیٹھو طعنۂ حالی سُنو — باہنر ہو کر جو چمکو قوم کی گالی سُنو

ہم کو تو پیرِ طریقت نے یہی دی ہے صلاح — قصۂ منصور دیکھو اور قوالی سُنو

اقبال کی تخلیق

چنانچہ جب ہم سرسری نظر ڈالتے ہیں تو حالی شاید مغرب کے مقابلہ میں احساسِ کمتری کے باعث اپنے عقیدہ ترقی پسندی میں بڑے تنگ نظر و قدامت پرست اور اس کے برخلاف اکبر اپنی قدامت پسندی کے باوجود اپنے عقاید میں بیحد فیاض نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کی طبیعتوں کے ماحولی اثرات اور اُس کے امتزاج سے اقبال کی تخلیق ہوئی۔ اقبال نے ابتدا میں ہرچند اکبر کی تقلید میں بھی اشعار لکھے تھے مگر پھر حالی و اکبر دونوں کے انداز کے درمیان ایک سمجھوتے کی صورت پیدا کر لی۔ وہ مغرب سے مستفید ضرور ہوئے مگر حالی کی طرح یورپ سے مغلوب و شکست خوردہ نظر نہیں آتے۔ انھوں نے مشرقی وقار کو قائم رکھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کی شہرت کے ساتھ ان کا یہ رنگ اس قدر مقبول ہوا کہ ہر کس و ناکس نے اس کی پیروی شروع کر دی۔ مگر لوگوں کو کامیابی کم نصیب ہوئی۔ البتہ جو لوگ سمجھ اور صلاحیت رکھتے تھے انھوں نے اس سے اپنے لئے نئی راہیں نکال لیں اور اپنا ایک خاص رنگ پیدا کر لیا۔ مگر اکثریت محض نقل بنانے والوں کی جماعت اور اقبال کی کیریکچرسٹ (Carecaturist) بن کر رہ گئی اور پھر اسی طرز میں جب لوگ بھکنا شروع ہوئے اور انھیں کہیں سہارا نہ ملا تو انھوں نے قدیم وقار و شعار کو لٹا کر مغرب کے دامنِ تخیل و تہذیب میں پناہ لی۔ مگر مشرقی و مغربی مذاق کے درمیان اقبال نے جو توازن پیدا کیا تھا اُسے کھو بیٹھے اور

جس کی ترغیب اس شعر میں دی گئی ہے ؎

حالیؔ اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ کر چکے

اور کچھ لوگوں پر اس کا لازمی ردِ عمل یہ ہوا کہ انھیں نہ صرف لفظ ترقی پسندی سے ضد ہو گئی بلکہ وہ حالیؔ کی پیروئ مغرب ہی کے منکر ہو گئے۔ اور ان کے اس شعر کی نئی تاویل کی تلاش میں شاید "اسماء الرجال" کی چھان بین کر کے مغربی نامی ایک گمنام شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ جس کا تصوف میں کوئی پایہ تھا اور نہ شاعری میں۔ مگر اُس کی شخصیت کو کافی رنگ آمیزی اور مبالغہ کے ساتھ پیش کر کے حالیؔ کی ارادت اُن سے منسوب کر دی اور ان کے اس شعر کو عقاید تصوف کا ترجمان بتا کر ان کو مصلحتاً صوفی بنا دیا۔ چنانچہ اگر آج حالیؔ زندہ ہوتے تو اپنے شعر کی عجیب و غریب تفسیر سُن کر یقیناً سر دھننے لگتے۔ یا روح کو بقا حاصل ہے تو عجب نہیں کہ ان کی رُوح اُردو کی دُنیائے تحقیق میں یہ نیا ہنگامہ برپا دیکھ کر کسی دل جلے شاعر کا یہ شعر دہرا رہی ہو ؎

ایں کلام صوفیائے شوم نیست   مثنوئ مولوئ روم نیست

حسرت نعمانی

غزل

فضائے دل بہت بے کیف سی معلوم ہوتی ہے   جفائے دوست میں گویا کمی معلوم ہوتی ہے
کہاں ہے اے غمِ ہستی سہارا دے ذرا آ کر   کہ مجھکو موت میں اب دلکشی معلوم ہوتی ہے
یہ مُرجھائی ہوئی سی شام غربت کی فضاؤں پر   نصیبِ راہرو کی تیرگی معلوم ہوتی ہے
یہ پچھلی رات پژمردہ فلک پر مضمحل تارے   مری رودادِ غم بکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے
قدم رکھا ہے جب سے رہگزارِ عشق میں میں نے   ہر اک مانوس منزل اجنبی معلوم ہوتی ہے
نہ جانے کیا مصیبت آنے والی ہے بہاروں پہ   چمن حیراں، فضا سہمی ہوئی معلوم ہوتی ہے
کبھی جس محفلِ اُمید پر سو ناز تھے ہم کو   وہ محفل اب فریبِ زندگی معلوم ہوتی ہے

کہاں سے تو نے اے اظہرؔ یہ سوزِ عاشقی پایا
تری ہر بات درسِ زندگی معلوم ہوتی ہے

ضمیر اظہر

رُباعیات

دل کانپ رہا ہے التجاؤں میں ہنوز
اک کیف ہے بھگتی کی صداؤں میں ہنوز
آکاش پہ دم توڑ چکا ہے بھگوان
گاندھی مصروف ہیں دُعاؤں میں ہنوز

راہِ ایماں میں پیچ بے حد نکلے
ہر موڑ پہ سو شکستہ مرقد نکلے
جب دین کے شجرۂ نسب کو جانچا
تو حضرتِ خوف جدِّ امجد نکلے

"معبوُد! یہ نورِ کرم اور میری جبیں!!"
"تو مستحق اس کا ہے مرے عبدِ مُبیں"
"لیکن تیرے غریب لاکھوں بندے"
"کیا تُو نے کہا؟ زور سے کہہ" "کچھ بھی نہیں"

یہ وقت نہیں وقتِ خروش و طوفاں
یہ وقت متاعِ دل ہے، سرمایۂ جاں
انسان رواں ہوا ہے اپنی جانب
چُپ ہو اے اہرمن خموش اے یزداں

جوش ملیح آبادی

تکمیل

اُس نے اپنے خیالوں کے دامنوں کو کئی بار جھٹک کر ماضی کے ذرّوں کو الگ کرنا چاہا مگر یہ عجیب ذرّے تھے جو تھوڑی پر چپکے ہوئے ان گنت مردہ ذرّات میں گھل مل جانے کے بجائے فضا میں منڈلانے لگتے تھے، اور یہ عجیب دامن تھے، جو بار بار ان ذرّات کی تلاش میں پھڑ پھڑا کر اپنی آغوش وا کر دیتے تھے — "میں مصروف ہوں، میں بُری طرح مصروف ہوں" — اُس نے کانوں کے قریب گونجتے ہوئے ماتھے سے لپٹتے ہوئے، گلے میں گھستے ہوئے، ان جیتے جاگتے سوچتے سمجھتے ذرّوں کو خبردار کیا، مگر ایک بگولا سا تھا جو اُس کی جھڑکی سے بوکھلا کر اس کے ذہن کے کناروں پر گھومنے لگتا تھا۔ اور پھر موقع پاتے ہی اُس کے دماغ کے عین وسط میں، اس کے دل کے عین مرکز میں ایسا شدید گھماؤ پیدا کرتا تھا کہ اُسے چکر آنے لگتے۔ اور اُس کی خوشدامن آس پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کے جھرمٹ پر پل پڑتی۔ "کیسی جھکی پڑتی ہو میری گلزار پر، جیسے گڑ کی بھیلی پر کھیاں جمع ہوتی ہیں۔ واسطے خدا کے کھُلی کھُلی بیٹھو — دیکھو تو دلھن کانپ رہی ہے مارے گھبراہٹ کے!"

عورتیں سرک کر دیواروں سے لگ جاتیں، اور نئے نئے گلابی کپڑوں کے اس ڈولتے سے ڈھیر کو دیکھ کر سرگوشیاں کرتیں۔ خوشدامن دلھن کی مزاج پرسی کے لئے ہاتھوں کو کمر پر رکھے کمان کی طرح جھک جاتی اور گلزار زیوروں کی گھنگھرؤں کو سنبھالنے کی کوشش میں پے بہ پے نرم نرم جھنکاریں سی پیدا کر بیٹھتی۔

دلھنوں کے ریشمی گھونگھٹوں میں بھی پہلے روز جو ایک سکون سا ہوتا ہے، ایک ٹھہراؤ سا، وہ گلزار کے گھونگھٹ میں نہ تھا، اور ایک گھونگھٹ ہی پر کیا موقوف تھا، اس کے سارے جسم پر پڑی ہوئی گلابی شال میں لہریں اٹھ رہی تھیں، اور شال سے پرے گلزار کے ذہن میں بھی لہریں اُٹھ رہی تھیں، خیالوں میں شکنیں پڑ رہی تھیں اور احساسات لچک رہے تھے۔ خوشدامن نے ایک مرتبہ اس پر عرق گلاب چھڑکا۔ پھر رخصت پر آئے ہوئے ایک فوجی سپاہی کے گھر سے عطر خانے آئی اور اُسے جگہ جگہ شال پر مل دیا۔ پھر ایک نائن چھوکری کو دلھن کی ہتھیلیاں اور تلوے ملنے پر مامور کیا۔ مگر دلھن نے ہاتھ کھینچ لئے اور تلوے چھپا لئے۔ عورتیں باہر صحن میں جا بیٹھیں اور دلھن کی بیقراری کی تاویلیں کرنے لگیں۔ دلھن کے مائیکے ایک میراثن چھوکری کو دوڑایا گیا کہ گلزار کو اس حالت میں کیا پلانا چاہیے۔ اور دولھا کو کہلا بھیجا گیا کہ ریکارڈ بجانے بند کر دو دلھن کے سر میں درد ہو رہا ہے۔

مگر گلزار کی بیقراری زیادہ گہری اور بعید از فہم تھی۔ بیاہ کے شور و غوغا نے ردّ عمل کی صورت میں اُسے اپنے ماضی کے چپ چاپ مُرجھائے ہوئے خیابانوں میں لا ڈالا تھا۔ اور وہ ان لمحوں میں دو زندگیاں گزارنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کنوارپنے کی دھڑکتی ہوئی شیرینی اور بیاہتا زندگی کے پہلے روز کا لہراتا ہوا بے ذائقہ پن — ماضی اور حال میں ٹکروں پر ٹکریں ہو رہی تھیں۔ خیالات کی ٹیالی اور سپید بدلیاں آپس میں متصادم ہو کر بجلی کی سی کڑک پیدا کر کے اس کے سارے وجود کو جھنجھوڑ جاتی تھیں۔ اور وہ باوجود کتنی ہی مایوسانہ کوششوں کے اپنے آپ کو نئی زندگی کے اس دلآویز اجنبی پن سے مانوس نہیں کر سکی تھی جو ہر عورت کی زندگی کے جھٹپٹے میں شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوا کرتا ہے۔

"شادی کے دن کسی کے بھی سر درد کی پروا نہیں کی جاتی خالہ بی!" باہر صحن میں کوئی اُس کی خوشدامن سے جھگڑ رہا تھا۔ "آپ کیا جانیں کہ ہم کہاں کہاں منہ ڈھانکے پھرے تب کہیں جا کر ریکارڈ جمع ہوئے۔ اور اب ٹھیک پہ سارا گانا فل جمع ہے کہ آپ کی وہ لنگڑی الجھن آ پہنچی

ہوئی اور سارے گاؤں کے سامنے منہ پھاڑ کر کہہ دیا کہ نکاٹ بند کرو۔ دلھن کے سر میں درد ہو رہا ہے۔

"ہائے ہائے نگوڑی جہنم جلی! یہ کیا کہہ دیا۔"

"تو اور کیا کہتی"۔ لنگڑی میراثن کی آواز آئی۔ "بھئی ہیں، ہیرا پھیری کی باتیں آتیں تو آج اپنی نندتاجو کی طرح کلکتے کے بازاروں میں نہ
تی پھرتی۔"

"چپ مُردار" بڑھیا نے اسے جھڑک دیا۔ "اندر میری گلزار کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ جائے تو کیا کہے کہ پھپھے رونے پیٹنے والیوں
ں کا قصہ چھیڑ دیا۔ نوج دیدوں کا پانی کچھ ایسا ڈھلا ہے کہ اچھی بُری بات کی تمیز ہی اُٹھ گئی۔ بھرے گھر میں تاجو چڑیل کا ذکر۔ ایسی
ہی شوق ہے تو کلکتے کیوں جاتی ہو۔ یہیں لائل پور، لاہور میں ننگی ہو بیٹھو۔ کئی مل جائیں گے ــــــ"

"کیا بکواس ہو رہی ہے۔" ڈیوڑھی میں سے خسر میاں بانجھ گھٹا کی طرح گرجے۔

"یہ اللہ ماری لنگڑی ــــــ"

"بُری ہے۔ بیوقوف ہے۔" نوجوان نے ڈیوڑھی کو خالی دیکھ کر کہا۔ "چلو بگیاں، تم قبول کر لو سارے خطاب۔ لنگڑی سے تو بہتر ہی ہو
خالہ بی دیکھئے اجازت دے دیجئے۔ ورنہ بڑی سبکی ہوگی۔ دوسرے محلے کے گبرو ٹھوکے چلا رہے ہیں اور آنکھیں میچ رہے ہیں اور بیچارے
ن بھیا کو کسی پہلو قرار نہیں۔ کہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے تو میں اُس میں سما جاؤں۔ بگیاں نے اسے کہیں کا نہیں رکھا۔"

"اللہ اللہ یہ دماغ تمھارے!" بڑھیا کی آواز تیز ہو گئی۔ "میں کہتی ہوں اندر دُلھن پھڑکتی رہے اور تم اپنی ذرا سی سُبکی لئے بیٹھے رہو
لیو اگر آسمان ہی سے حکم آیا ہے کہ ریکارڈ ضرور بجیں تو بجاؤ، مگر ذرا ہولے ہولے۔"

نوجوان ہنستا دھپ دھپ پاؤں پٹختا چلا گیا۔ اور بڑھیا پھر بگیاں کے پیچھے پڑ گئی۔ "عمر گزار دی بھاڑ جھونکتے پر یہ پتہ نہ چلا کہ
ی ناف کہاں ہوتی ہے، چل ہٹ مردود اب ادھر بیٹھک کی طرف نہ جائیو، ورنہ میرے دیکھتے پر قہقہے پڑیں گے۔"

"کون ہوتا ہے میرے راجے پر قہقہے لگانے والا۔" بگیاں اب خوشامد پر اُتر آئی تھی۔ "جنگاریوں کی مٹی چھڑک دول گے ہیں۔ وہ نگوڑا
حبیب ذرا اُسے چڑھا ہے سب کے۔ سب سے پہلے اسی نے یہ یہ آنکھیں نکال کر اور گال پھُلا کر کہا تھا "چل تو جلال تو"۔ میں تو بی
اری بیٹھک کی لاج کو چپ ہو رہی، ورنہ سب جانتی ہیں اللہ رکھے پرانے راجوں مہاراجوں کی اولاد ہوں ــــ"

عورتیں ہنسنے لگیں۔ "موئی مسخری"۔ بڑھیا نے غصہ تھوک دیا سا اور پھر اپنے ہدف کی طرف بڑھی۔ "یہ موئے ریکارڈ بجے تو نہیں
رہے میری رانی کو۔" اس نے گلزار کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر کہا۔

گلزار خاموش رہی، تو بیبی بھی دندناتیں تو اسے تصور کے ان خوابوں سے نہیں چونکا سکتی تھیں جو قطار اندر قطار اُس کے آس پاس
لنڈوں کے جھنڈوں میں سے گزرتی ہوئی ہواؤں کی طرح سرسرا رہے تھے اور جو تہ بہ تہ اُس کے گرد و پیش اُبھرتے ہوئے شور پر اُترتے
تھے اور جمتے جا رہے تھے۔ لیکن لنگڑی بگیاں کے ایک ہی بول نے اُسے جھنجوڑ کر چھوڑ دیا تھا ــــ اچھا تو حبیب حسب وعدہ اس کے
ہ کی ساری رسموں میں شامل ہو رہا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو برات کے ساتھ وہ پہلی مرتبہ اس کے پرانے گھر میں بھی آیا ہوگا۔
ی عجیب بات ہے۔ جیسے انار کاٹا جائے اور اندر سے سنترے کی پھانکیں نکل پڑیں۔ مگر سچ مچ وہ ضرور آیا ہوگا وہاں، اور بیٹھا رہا ہوگا
ت بھر۔ اور جب اس کی "شہ بالی" نے شیرین کے شہ بالے کو "بیڑی گھوڑی" میں گھی سے چپڑے ہوئے کٹورے اُلٹنے کو کہا تھا اور اس کی انگلیوں
جوڑوں پر کنگنوں سے چوٹیں لگائی تھیں تو ہنستے لوٹتے نوجوانوں میں حبیب بھی موجود ہوگا ــــ اتنی بڑی بات اس کی سمجھ میں نہیں
[illegible]

اور شیرن کی جوڑی پھلے پھولے — ڈولی کے آس پاس کہیں کہاروں کے قریب بھی — ہائے ری — اس کی ڈولی کے قریب ہی۔
اور شاید دھوپ میں اس کا سایہ بھی ڈولی پر پڑا ہو، اور شاید ڈولی پر پڑی ہوئی ریشمی شال نے پھڑپھڑا کر اس کے ہاتھ کو بھی چھوا ہو —
اور وہ بے خبر رہی، اب تک بے خبر رہی، اس وقت وہ ایک دیوار پرے بیٹھک میں بیٹھا ریکارڈ سُن رہا ہے، اور لوگوں کے مذاق اُڑا رہا
ہے، اور اس کے دل میں وہم تک نہ گزرا، اس کی آنکھ تک نہ جھپکی، اُس کی نبضیں تک نہ رُکیں! — اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس کے
کمرے کی چھت فرش بن گئی ہے، اور فرش اُلٹ کر چھت بن چکا ہے، اور وہ چھت اور فرش کے درمیان لڑھکتی، بکھر رہی ہے! — اس نے
گھبرا کر ٹانگیں پھیلا دیں، پائنتیں بیچ اٹھیں اور نوجوان نائن اس کی پنڈلیاں دبانے لگی۔

گردن کو ایک طرف جھکا کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں، — اُس نے کہا تھا، "گلزار یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی، لیکن ہے
بالکل صاف، ایسی صاف جیسے اوپر آسمان پر چاند چمک رہا ہے، یا تمہارے چہرے پر دو آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اتنی سی بات ہے کہ شیرن
نورج میں مومیدار ہے اور میں مدرسہ میں منشی ہوں، اُس کی تنخواہ ہر مہینے سیکڑوں تک جاتی ہے اور میں مرمٹ کر تیس سے آگے نہیں بڑھتا
اور غریب دولھے کبھی کسی لڑکی نے آج تک پسند نہیں کئے، غریب داماد تو ہے ہی دُور کی بات، وہ تو ان بھکاریوں کو بھی منظور نہیں جو
چراغ کی جگہ راتوں کو کٹیاؤں میں جھاڑ جھنکاڑ جلاتے ہیں، اور جن کا کھانا گھر گھر کے سڑے بسے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے — اب رہ گئے
ہم تم، تو پیاری گلزار! ہماری تمہاری کون سنتا ہے اس زمانہ میں، جب کہ ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں کی کوئی نہیں سُنتا۔ جانتی ہو،
انگریز ہمارا حاکم کیوں ہے؟ تم نہیں جانتیں، بڑے بڑے عالم بھی نہیں جانتے کہ انگریز صرف اس لئے اب تک ہمارا حاکم چلا آ رہا ہے کہ وہ بہرہ
ہے، وہ ہندوستانیوں کی کوئی بات نہ سُن سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے، اور اس لئے — گر میں کہاں چلا گیا!"

یہ باتیں میں نہیں سمجھ سکتی، لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اُس کی باتوں میں صدیوں کا دکھ تھا اور اس کے چہرے پر عمروں کی نامرادیوں
کی سرسوں پھول رہی تھی، اس کے ہونٹ نرم پتیوں کی طرح کانپ رہے تھے اور جب اُس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا تھا تو جیسے مجھ پر
اچانک کوئی چٹان ٹوٹ پڑی ہے، اور اُس کی انگلیوں کی پوریں جو میری گردن کو چھو رہی تھی کتنی بھیگی بھیگی اور پسیجی پسیجی تھی، اور وہ
کیسے دھڑک رہی تھیں! — اور اُس کی آواز بالکل خالی خالی تھی۔ جیسے درختوں کے کھوکھلے تنوں میں ہنکارے بھرتی ہیں۔

اب لڑکیاں کھانے پینے سے فارغ ہو گئی تھیں صحن کے ایک گوشے میں ڈھولک کی دھمک دھما شروع ہو گئی تھی اور سب چیخ رہی تھیں

پٹ دی چادر اُتے اسمانی رنگ ماہیا ٥
پتلی بدلی لشکے چن دا انگ ماہیا[1]

"سلیقے سے سلیقے سے"۔ لنگڑی بیگاں نے ہانک لگائی۔ "جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش اور باتیں رنگ اور انگ کی — کیا اندھیر
مچ رہا ہے زمانے میں۔ بیری بور نہیں اُٹھاتی کہ لال بیر جھڑنے لگتے ہیں، توبہ ہے!"

"گانے دو گانے دو" خورشید من نے گھرک دیا۔ "کیا گائیں آخر بیچی تو ہیں شادی کے گیت۔"

"کیا گائیں؟" جیسے بیگاں کی کوئی دکھتی رگ چھیڑ دی گئی۔ "مجھ سے پوچھتی ہو بی بی؟ بابا آدم سے لیکر اب تک جتنے گیتوں نے رواج پکڑا
وہ سب یاد ہیں اس لنگڑی ماری کو۔ اور بی بی اس سے پوچھنے چلی ہیں کہ آخر کیا گائیں۔ میں بتاؤں کیا گائیں؟ اری سنو جھوکر لو۔

پھُل پئی چندی یار چنبے دی بوٹی آ[2]

[1] میرے ماہی نے آسمانی رنگ کی ریشمی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ میرے ماہی کا جسم اس ریشمی چادر سے یوں جھلکی مار رہا ہے جیسے پتلی بدلی میں چاند
جھلملا رہا ہے۔ [2] میں پھُول چن رہی ہوں کیونکہ میرا محبوب چنبے کا پودا ہے۔

اور ع کلیاں دے بند کھل گئے پھل ہاسے ہسدے ہیں[1]

اور یہ
آؤ ہولا انہاں ما ہاں تے
متھا گھت دیواں بوہڑ دی چھاں تے
سوواں تیری بانہہ تے[2]

اور ..... "

"بس بس" بوڑھی خوشدامن کی آواز میں ماضی کی یاد نے جلترنگ کا ساز زیر و بم بھر دیا تھا۔ انھوں نے سن لیا تو چوٹی کاٹ لیں گے:

"چوٹی کا کیا ہے بی بی" بیگاں لنے بی بی کی کمزوری بھانپ لی تھی۔ "گھر کی کھیتی ہے آج کٹی تو کل اُگ کر بڑھے گی۔ واہ شہزادہ راجہ کی شادی ہو اور کوئی کھل کر بات ہی نہ کرے؟ کیوں؟ میں تو خود گاتی ہوں، ہاں!"

اور وہ اپنے لنگڑے پن کو بہت نمایاں کرتی ڈھولک کی طرف چلی، پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ گاتی ہوئی لڑکیاں چہکنے لگیں۔ بیگاں نے ان سے ڈھولک چھین کر گود میں رکھ لی اور ایک دلآویز تال پر ایک گیت کا پہلا بول اٹھایا۔

میری ساری جوانی تیری   مینوں اک ———،

اور بی بی نے چھاج اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ چھاج کو سر پر جمائے لمبے لمبے ڈگ بھرتی میم صاحب بن بیٹھی — "ہم لہور سے آیا ہے، ہم میم لوگ ہے، ہم ایک بنگلہ مانگتا، بنگلے کے بیچ میں دو کرسی مانگتا، ایک کرسی کے بیچ میں خود بیٹھنا مانگتا، دوسری کرسی کے بیچ میں ایک صاحب لوگ بیٹھنا مانگتا، اور جب وہاں ہم تھک جانا مانگتا تو صاحب لوگ کی گود ———"

دھپ سے "بی بی" نے اس کے سر پر دوسرا چھاج دے مارا۔ قہقہے خوشی کی چیخوں میں بدل گئے کیونکہ لنگڑی بیگاں موت کا بہانہ کئے خاک پر لیٹی ہوئی بڑبڑا رہی تھی۔ "ام لوگ ولائت میں دفن ہونا مانگتا" قہقہوں میں ریکارڈوں کی آواز بھی دب گئی تھی۔ مگر گلزار کے ذہنی چکر پر ایک عجیب سا ریکارڈ سوار تھا۔ کہ نہ یاد کی سوئی گھستی تھی، نہ گزری ہوئی محبت کی کوک ختم ہوتی تھی، اور نہ حبیب کے گیت رُکنے میں آتے تھے — "بات یہ ہے گلزار کہ ہم اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب رُوح مٹ گئی اور جسم باقی رہ گیا۔ جب خوشبو اُڑ گئی اور کاغذ کے پھولوں سے گلدستے سجائے جانے لگے۔ اب تاروں کو دیکھ کر دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہتا کہ فرشتوں نے چاندی کے قطروں کا چھڑکاؤ کر دیا ہے یا کسی حور کا ست لڑا ہار موتی موتی ہو کر بکھر گیا ہے۔ یا ہم سے بچھڑی ہوئی روحیں جنت کے جھروکوں میں مسکرا رہی ہیں۔ اب تو سفید لوگوں کی بڑی بڑی دوربینوں نے ان ستاروں کے اندر خوفناک غار اور آگ اگلنے والے پہاڑ اور برف کے تودے دیکھ لئے ہیں۔ اب ستارے ستارے نہیں رہے انگورے بن چکے ہیں۔ میں نے تمھیں گلزار سمجھ کر چاہا، مگر اب زمانہ مجھ سے کہتا ہے کہ میں تمھیں صرف زمیندار کی بیٹی سمجھوں۔ بہت اچھا یہی کر لوں گا، کرنا پڑے گا، اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو بھول جانا پڑے گا کہ میری زندگی کی اندھیری رات میں — کئی جگ بیتے — ایک چاند نے نور اور سرور کی پھواریں چھوڑ دی تھیں — میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے اس چاند کو اُفق پر سے لپکتے ہوئے کالے کالے بھدے بھدے ڈراؤنے گدگدے — سونے کے کڑوں سے مزین ہاتھ — دُور کھینچے لئے جا رہے ہیں۔ اور چاند بہت بلند ہے، اور میرے پاس اُڑنے کے لئے پر نہیں۔ اور اگر پر بھی ہوں تو کیا فائدہ چکور بھی تو اُڑتا ہے، اور پھر اگر چکور اُڑتا ہی چلا جائے تو چاند کو ڈوبنا بھی تو ہے — اگرچہ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ چاند ڈوبتا نہیں۔ یہ ہر گھڑی ہر پل دنیا کے کسی نہ کسی حصے پر ابھر

---

[1] کلیوں کے بند قبا کھل گئے (کلیاں چٹکیں) اور پھول قہقہے مار کر ہنسنے لگے! [2] میرے محبوب کبھی ان راہوں پر بھی آ۔ میں تجھے ایک ہری چھاؤں میں پلنگ بچھا دوں اور پھر تیرے بازو پر سر رکھ کر سو جاؤں۔

رہا ہوتا ہے۔ چاند کو ڈوبنا آتا ہی نہیں۔ جب چاند یہاں ڈوبتا ہے تو وہاں اُبھر رہا ہوتا ہے۔ اور میرا چاند یہاں ڈوبے گا تو وہاں ضرور اُبھرے گا۔ مگر میرے لئے اس کا نیا طلوع بے فائدہ ہوگا۔ کیونکہ میری قسمت میں اندھیرے ہوں گے۔ اور میں بھی اُن دیکھی راہ پر چلتا رہوں گا اور چمگادڑیں پھڑ پھڑا کر میرے سر کے قریب سے گزرتی رہیں گی۔ اور فراش کے درخت میرے ارد گرد جھونکتے رہیں گے اور میں جھینگر کی دھاری کی سی تنی ہوئی لگرون پر لڑکھڑاتا اور ——"

"گلزار بیٹا!" خورشید امن کی آواز آئی۔ اور گلزار نے یوں محسوس کیا جیسے اس کا حبیب ایک خوفناک چوٹی پر سے گر کر نیچے کھڈ میں لڑکھڑاتا لڑھکتا جا رہا ہے۔ گردن کو ایک ہرتی جھٹکے سے دوسری طرف ڈال لیا اور بند پپوٹوں کے نیچے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے بے تحاشہ بے مقصد گھومنے لگے۔

"گلزار بیٹا! —— آج حلوہ بھی پکا ہے اور چاول بھی۔ اور سوّیاں اور کلیجی اور وہ کیا نام ہے قورمہ۔ کیا کیا لے آؤں تیرے لئے ——

گلزار ——!"

——

"گلزار بیٹا!" یہ پکار کے بجائے سرگوشی تھی۔ "سو رہی ہے گلزار بیٹا۔ سونے دو۔ تم بھی باہر چلی آؤ نائن۔ دن بھر کی تھکی ماندی ہے رات کو پھر جاگنا پڑے گا۔ سونے دو۔"

"اور میری گلزار —— میرے چاند —— میرے ڈوبتے چاند ——" گرقوالی کے ریکارڈ نے واویلا مچا رکھا تھا اور ساتھ ڈھولک پھر بجنے لگی تھی۔ حبیب کی آواز اس ہنگامے میں دُور ہوتی چلی گئی۔ اور پھر بہت دُور جا کر ایک دم قریب آ کر اُس کے کانوں میں گرج کو نجتی گھس گئی۔ "میں آؤں گا۔ میں ایک بار ضرور آؤں گا۔ کوئی اچھا سا موقع تم ہی میں کسی شام کے اندھیارے میں تمہارے پاس آؤں گا ضرور آؤں گا —— جب تم اکیلی ہوگی —— مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے!"

دفعتاً سینے میں اُٹھتے ہوئے غباروں گلے میں پھنستی ہوئی سانسوں اور آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں نے صبر و ضبط کے سارے بند توڑ ڈالے۔ خورشید امن اور نائن اور میراسن اور سہیلیاں اور ننھی لڑکیاں پازیبیں چھنکاتیں اندر گھس آئیں اور سرگوشیوں کی بین الگ ری بیگاں گلزار کے بے حس و حرکت جسمانی ڈھیر کو گھور کر بولی —— "کوئی بات نہیں۔ نیند میں روئی ہے دُلھن رانی۔ نیند میں دلہنوں کو رونا آ ہی جاتا ہے۔ ہم پر بھی بیت چکی ہے ——" اور سب باہر چلی گئیں۔

"میں اکیلی ہوں" —— اُس نے ایک مرتبہ پھر خالی کمرے میں ناگن کی سی پھنکار بھری۔

"میں اکیلی ہوں نا" —— دوسرے دن صبح کو اس نے دروازہ بھیڑ کر جاتے ہوئے دولہا کو دیکھ کر کہا۔

"میں اکیلی ہوں نا" —— وہ بار بار پکاری اور ایک شام کو جب دولہا میاں کسی دوست کے یہاں گاؤں میں مدعو تھے۔ اور بوڑھا سو چکا تھا اور بڑھیا دیوار کے سوراخ میں پڑے ہوئے چراغ کو بجھانے سے پہلے ہی کھاٹ پر دراز ہو گئی تھی تو اس کی تنہائی نے ایک نہایت شدید صورت اختیار کرلی۔ اس کے کمرے میں جلتی ہوئی لالٹین پر پتنگوں کی اُڑانوں نے ایک گول مول سا جالا بُن دیا تھا۔ وہ زیور اُتار کر صندوقچی میں رکھنے لگی۔ پاؤں کے انگوٹھوں سے چھلّے اُتار کر اُس نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ہونٹوں کی سُرخی کو رگڑ دیا۔ مانگ سے ستّل کو کھرچ ڈالا۔ اور پھر اچانک چونک کر گلابی دوپٹے کو پلنگ پر پٹخ دیا۔ اور سیاہ رنگ کی ایک چادر اوڑھ لی۔ دہلیز سے لگ کر باہر صحن میں جھانکنے لگی۔ جہاں چراغ کی مری مری روشنی سے پار اندھیرا سنسنا رہا تھا۔ باہر گلی کے کسی گڑھے میں مینڈک ٹرّا رہے تھے۔ اور

بہت جگہ رسالدار کا نیتی کتا کٹے کی شین کے تسلسل سے بھونک رہا تھا۔

اس نے ایک پلنگ پر بچھی ہوئی چادر کی شکنیں دُور کیں۔ فرش پر سے چند بکھری چیزیں اٹھا کر باہر پھینک آئی۔ لالٹین کو دروازے کے قریب ہی ایک کیل سے لٹکا دیا۔ پتنگوں کا دائرہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اور پھر زیادہ تیزی سے لالٹین کے اردگرد گھومنے لگا۔ باہر جا کر اس نے دیا بجھا دیا۔ جھینگروں کی آواز بلند ہو گئی اور کتا جیسے ہوا میں اڑ کر آیا اور اس کی چھت پر بھونکنے لگا۔ آسمان جیسے چراغ کی روشنی نے بہت بلند کر رکھا تھا اپنے ستاروں کو معمول سے زیادہ چمکاتا جیسے اس کے آنگن پر جھک آیا اور بوڑھا نیند میں اس زور سے کھانسا جیسے اُس نے حلق میں طبلہ پھنسا رکھا ہے۔

حویلی کے دروازے پر جا کر وہ چپ چاپ گلی میں کوئی آواز سننے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے سامنے سے دو بلیاں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی گولیوں کی طرح سَن سے گزر گئیں۔ چوکیدار نے گلی کے نکڑ پر خبردار کا نعرہ لگایا اور پلٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مسجد کے مولوی صاحب "ربنا ظلمنا انفسنا" بلند آواز میں پڑھتے گلی کے دوسرے سرے پر غائب ہو گئے۔ مسجد میں عشا کی نماز بھی ادا کی جا چکی تھی!____

تو شاید وہ نہیں آئے گا ____ وہ آج بھی نہ آیا تو آخر کب آئے گا؟ ____ مگر شاید وہ اب نہیں آنے کا ____

وہ آئے گا ___ تاریکیوں کی تہوں میں ایک چنگاری سی کلبلا کر پکارتی، مگر پھر دب کر رہ جاتی، سنسان گلی میں بھگدڑ سی مچ جاتی۔ قدموں کی آہٹیں کڑکتے ہوئے گولوں کی طرح فضا میں گونج اٹھتیں، اور وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گرتی۔ ہانپتے ہانپتے تھک جاتی تو ایک گہری سانس لے کر اُٹھتی۔ دبے پاؤں حویلی کے دروازے پر جاتی، اور جب اس کی ہتھیلیاں بھیگ جاتیں اور ماتھا مین کے تیرے کی طرح تپ جاتا تو بوڑھوں کی موجودگی سے بے پروا ہو کر بھاگتی اور صاف پلنگ پر شکنوں کا جال بچھا دیتی۔

اور پھر تھا اس کے چہرے کے خطوط تن گئے ہونٹ بھینچ گئے، آنکھوں میں نمی کی جگہ شرارے نے لے لی۔ شادی کے سبز بکس کی تہہ پر سے اس نے ہاتھی دانت کا ایک ننھا سا سنگاردان اٹھایا اور اسے بغل میں دبا کر دہلیز تک آئی تو جیسے ہوا میں تیرتے ہوئے کسی وجود نے اسے دھکا دے دیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی پرلی دیوار تک چلی گئی۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر وہ دروازے میں سے یوں نکلی جیسے لوہے کی چادر میں شگاف ڈالنے چلی ہے صحن کو عبور کرتی باہر گلی میں آ گئی۔ گلی کے سرے پر سے باہر چوکیدار نے "خبردار" کا نعرہ لگایا۔ اور پھر وہیں بیٹھ کر ایک اُداس سا گیت گانے لگا۔ پلٹ کر اس نے گلی کے دوسرے سرے کا رُخ کیا۔ پانی کے گڑھے کے قریب سے گزری تو مینڈک خاموش ہو گئے۔ ایک دیوار پر سے غراتی ہوئی بلیاں گیندوں کی طرح اچھلتی کہیں دُور نکل گئیں۔ رنڈوے مولوی جی اپنے صحن میں بکری سے باتیں کر رہے تھے گلیاں عبور کرتی، موڑ کاٹتی، چُپ چاپ ماحول میں ایک اُداس سرسراہٹ بکھیرتی وہ بڑھتی چلی گئی، اس کی نظریں اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں جیسے کسی تاریک ترین نقطے پر جم گئی تھیں۔ اُس کی رفتار تیز اور قدم متوازن تھے۔ رسالدار کا کتا چھت پر سے دُور تک اُسے بھونکتا چلا آیا ___ اور پھر وہ ایک گلی کے نکڑ پر اچانک ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

سامنے کے مکان کی ایک کھڑکی کھلی تھی۔ سلاخوں کے پرے ایک کیل سے ایک میلی لالٹین لٹک رہی تھی ___ وہ اپنے گھر میں ہے ___ اُس نے سوچا ___ مزے سے کہانیاں پڑھ رہا ہوگا، یا وہ شعر جو اُس نے بہت سمجھے، گر سارے کے سارے سُنے، یا شاید اپنی ہونے والی منگیتر کے نام خط لکھ رہا ہو۔

کاش وہ خود بھی لکھ سکتی۔ کاغذ کے ایک ننھے سے پُرزے پر صرف یہ الفاظ لکھ دیتی ___ "میں تمہارا سنگاردان تمہیں واپس کرنے آئی ہوں، یہ اپنی منگیتر کو بھجوا دو۔ جس کا خوشبو میں بسا ہوا ایک خط تم نے مجھے دکھایا تھا ___ اور میرا گلابی ریشم کا رومال مجھے واپس دے دو، جس پر میں نے تمہارا نام کاڑھا تھا۔ میں تمہارے نام کے دھاگے نکال کر اُسے اپنے دولہا کو پیش کر دوں گی۔ مجھے ادھ کچی

نہیں بہاتیں"

اُس نے سیاہ چادر کے نیچے سے سنگاردان نکالا۔ دبے پاؤں کھڑکی کے پاس گئی۔ اور دھیرے سے ہاتھوں کو سلاخوں کے درمیان سے نکال کر سنگاردان کو دیوار سے لگی ہوئی کھری کھاٹ پر رکھ دیا۔ اُس نے یہ بھی تو نہ دیکھا کہ حبیب کہاں ہے؟ وہ کونے میں پڑا ہوا سٹول پر بیٹھا اونگھ رہا ہے یا لالٹین کے نیچے پلنگ پر پڑا کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ یا باہر آنگن میں ٹہل رہا ہے۔ سنگاردان رکھ کر وہ ایک بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہو گئی۔ اُس کے خیالوں کے دامن پر ماضی کی گرد کا ایک ذرّہ تک باقی نہ رہا، ہاتھ مل کر وہ ڈیوڑھی اور سیدھی گلی کی طرف ہو لی۔ اس کا ہر قدم پہلے قدم سے بے صبر اور اس کی ہر سانس پہلی سانس سے زیادہ تیز ہوتی گئی۔ اُسے یہ بھی تو محسوس ہوا کہ جوالا رام کی دکان کے پاس دو آدمی بیٹھے کھسر پھسر کر رہے ہیں اور اُسے دیکھ کر دیوار سے چمٹ گئے ہیں اور بہت آگے جھیورروں کے دروازے پر ایک ننھا سا کتا اُچھل اُچھل کر اُس پر جھپٹنا چاہتا ہے۔ آخری نکڑ پر سے ہوا کی سی تیزی سے مڑتے ہوئے وہ ایک آدمی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ جو افیونیوں کی طرح اونگھتا چلا آرہا تھا۔ سامنے اس کے کمرے کی لالٹین کی زرد زرد روشنی سے پڑوسیوں کی منڈیر چمک رہی تھی۔

ایک بگولے کی طرح وہ حویلی میں گھسی، گھڑونچی سے بچ کر دھڑام سے اپنے کمرے کی دہلیز پر گر گئی اور جب اُٹھی تو اُس کے ہاتھ میں گلابی ریشم کا ایک رومال تھا جو لالٹین کی روشنی اور ہوا کے جھونکوں میں شعلے کی طرح ناچ رہا تھا —— ڈوبتے ہوئے چاند کی طرح!

احمد ندیم قاسمی

اب میں واپس نہ آؤں گا

اب میں واپس نہ آؤں گا، گلشن میں سیر کے لئے، گھنے سائے کے نیچے مے پینے کے لئے، تیری نرم و نازک لَے سے ہم کنار ہونے کے لئے۔ کیونکہ اب میں جان گیا۔ وقت محض وقت۔ جگہ محض جگہ ہے اور حُسن دھوکا ہے، فریب ہے، سراب ہے!

باغ کا پتّہ پتّہ خزاں کی ستم کاری کا شکار بن جائے۔ تند و تیز ہوا ساغر و مینا کو پھوڑ دے، سریع الرفتار زمانہ اپنے پاؤں سے تیرے چہرے کی رعنائیوں کو مَسل دے۔ مگر مجھے غم کیوں ہو ——؟

کیونکہ اب میں واپس نہ آؤں گا!

میں جا رہا ہوں —— وہاں —— جہاں رہرو سفر سے نجات پا کر اپنی منزل کو پہنچ جاتا ہے، جہاں ایک ابدی کیف طاری ہو جاتا ہے، جہاں چھوٹی چھوٹی ندیاں بے پایاں سمندر سے ہم کنار ہوتی ہیں —— اب میں واپس نہ آؤں گا!

سعید

تکمیل

فسردگی ترے جلوؤں کے ہمرکاب رہی

ہزار پھول کھلے لاکھ آفتاب جلے

کہاں کہاں نہ مری زندگی کے خواب جلے

مگر نگاہ تری وقفِ پیچ وتاب رہی

بجھا سکی نہ تری پیاس کو وفا میری

ترے لئے مرے شام وسحر نے رقص کیا

اثر پذیر ہوئی ایک ہی دُعا میری

کہ تیرے قدموں میں شمس وقمر نے رقص کیا

نصیبِ عشق! تجھے پا کے درد کم نہ ہُوا

مری ملول نگاہی کا تجھ کو غم نہ ہُوا

بدل گئے ترے غم سے مری نگاہ کے طور

میں تیرے پہلو میں رہ کر بھی تجھ سے دُور رہا

نہ اب وہ دل میں تقاضا نہ رُخ پہ نور رہا
گزر گئے اسی عالم میں میری زیست کے دو

جمی رہی مرے چہرے پہ گردِ فکرِ حیات
بجھا رہا میرے سینے میں آرزو کا چراغ
نہ سرخوشی کی تمنّا، نہ ہاو ہُو کا دماغ
نہ اب وہ آنکھ میں شوخی رہی نہ باتیں بات

ہوا کچھ ایسی چلی، تیرے رُخ پہ نُور آیا،
تری خوشی کا پیام آیا۔ کتنی دُور آیا!
تری نگاہ اُٹھی، حُسن کا ہجُوم لئے
ترے جمال نے کیوں میرے پاؤں چوم لئے
یہ چند سکّے! — محبت نہیں!! — وفا بھی نہیں!!!
تری خوشی، مری حسرت کی انتہا بھی نہیں

یوسف ظفر

خوش فکرے

ایک ایکٹ کا ڈرامہ[1]

افراد

شہباز —— بائیس چوبیس سال کا لمبا تڑنگا نوجوان۔ گندمی رنگ
خاکی نیکر، پوری جرابیں اور سویٹر پہنے ہوئے۔

بختیار —— عمر اٹھائیس سال۔ رنگ سیاہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں
نوک دار مڑی ہوئی ناک

نظر —— عمر تیس بتیس سال۔ گندمی رنگ۔ ناک اور نتھنے موٹے اور بڑے

عطا —— عمر چونتیس سال، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ سر کے بال
لمبے لمبے جن میں مدّت سے تیل نہیں ڈالا گیا۔

سرور —— بیس بائیس سال کی عمر کا ملازم

ڈاکٹر —— ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر

منظر

(نئی دلّی میں چھوٹا سا ایک سرکاری کوارٹر جو بختیار نے اپنے رہنے کے لئے حاصل کیا ہوا ہے۔ کچھ دنوں سے شہباز اور عطا بھی اسی میں رہتے ہیں
یہ مہینوں اور نظر صرف دو چار دن کے لئے تفریحاً وہاں آیا ہوا ہے۔ آپس میں بے تکلّف دوست ہیں۔ مکان کے درمیانی کمرے میں بختیار اور عطا سوتے
اور اُٹھتے بیٹھتے ہیں جگہ کی قلّت کے باعث بختیار، عطا اور نظر رات کو اسی ایک کمرے میں سوتے ہیں۔ کمرے کے پہلو دائیں اور سامنے کی جانب ایک
ایک دروازہ ہے۔ سامنے کے دروازے کے اوپر دیوار کے ساتھ ایک بڑا کلاک لگا ہوا ہے جس میں نو بجنے کو ہیں اسی دیوار سے لگی کھونٹیوں پر
پہننے کے کچھ کپڑے لٹک رہے ہیں۔ ان دو دروازوں کے درمیان عطا کمبل اوڑھے آڑی بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹا ہے۔ چارپائی کے ساتھ
چھوٹی سی ایک تپائی دھری ہے۔ تپائی پر شراب کی ایک بوتل جس میں ابھی چند گھونٹ شراب باقی ہے پڑی ہوئی ہے۔ شراب کی ایک اور خالی
بوتل تپائی کے نیچے رکھی نظر آتی ہے۔ سامنے کے دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک کرسی پڑی ہے۔ دائیں دروازے کی بغل میں ایک لیدر گیر الماری ہے
کے جنگلے کی جانب [illegible] والی ایک کھڑکی ہے جس میں [illegible] کر ایک
پلنگ بچھا ہوا ہے جس پر بختیار [illegible] بیٹھا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ان کے
سرہانے کی طرف کتابوں کا ایک ریک ہے جس پر چار کتابوں کے اوپر ایک درمیان سے کھلی ہوئی کتاب رکھی ہے۔ پلنگ کے نیچے ایک
صندوق اور اس کے پاس چار خوب پالش کئے ہوئے جوتوں کے جوڑے رکھے ہیں۔ پائنتی کی سمت ایک کرسی رکھی ہے جس کی پشت سے

---

[1] ڈرامہ کو سٹیج کرنے سے پہلے مصنّف یا جائنٹ ایڈیٹر رسالہ "ہمایوں" سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ کالیداس،

ایک کروٹ لو بیاں ہے۔ عطا کا چہرہ ویسا ہے جس سے درد و کرب اور ایک المناک کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ گہرے حلقے ہیں جو اس کے پریشان بالوں سے مل کر دہشت کے آثار پیدا کرتے ہیں۔ اس کی آواز نحیف اور صدرجہ لڑکھڑائی ہوئی ہے۔ پردہ اٹھنے پر وہ بوتل منہ سے لگائے شراب کا ایک گھونٹ پیتا نظر آتا ہے اور پھر سر کو جھٹکتے ہوئے بوتل تپائی پر رکھ دیتا ہے۔

عطا ۔ (نحیف شرابی آواز میں) سرور! —— او سرور —— کہاں ہو تم؟

سرور (کمرے کے باہر سے آواز کو لمبا کرکے) جی!

عطا ۔ ادھر آؤ۔

سرور ۔ میں ابھی آیا۔ ڈبل روٹی والا باہر کھڑا ہے۔ ڈبل روٹی لے لوں۔

عطا ۔ پہلے میری بات سنو! میری بات —— ادھر آؤ۔

(سرور دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے)

سرور ۔ جی!

عطا ۔ کیا کر رہے ہو؟

سرور ۔ آگ جلا رہا تھا چائے بنانے کے لئے۔

عطا ۔ سنتے نہیں تھے کیا (باہر دروازے پر دستک ہوتی ہے) وہ دیکھو اس نے پھر کواڑ کھٹکھٹایا۔

سرور ۔ (زور سے) آتا ہوں بھائی ذرا دم لو (لہجہ بدل کر) اُسے معلوم ہے ہم دیر سے اُٹھتے ہیں۔ اسی لئے ذرا زیادہ ہی کھٹ کھٹ کرتا ہے۔

عطا ۔ (سنجیدگی اور وثوق کے ساتھ) لیکن میں سویا ہوا نہیں تھا۔

سرور ۔ جی، مجھے معلوم ہے۔ دراصل آج رات آپ —— (لہجہ بدل کر) میں ڈبل روٹی لے لوں۔

عطا ۔ ہاں۔ آج —— سنو۔

سرور ۔ جی!

عطا ۔ جانتے ہو آج ہمارے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔

سرور ۔ جی ہاں!

عطا ۔ تو یہ کتنے آدمی ہیں؟

سرور ۔ تین۔

عطا ۔ اور ہم؟

سرور ۔ تین۔

عطا ۔ (لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں) تو تین اور تین چھ ہوئے۔ —— بس تین اور ایک چار —— ہاں ٹھیک ہے چار چار ڈبل روٹیاں لے لو۔

سرور ۔ چار ڈبل روٹیاں کیا کریں گے؟

(دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے)

عطا ۔ دیکھو یہ مہمان ہیں۔ ممکن ہے کھانا دیر میں ملے۔ اگر ناشتہ اچھی طرح سے کیا ہوگا تو بہتر رہے گا۔

سرور ۔ اچھا جی۔

عطا ۔ اور سنو چار بڑی ٹکیاں مکھن کی —— چار

سرور ۔ چار؟ چار تو بہت زیادہ ہیں!

عطا ۔ تمہیں معلوم نہیں ان تین مہمانوں میں دو بلانوش ہیں

سرور ۔ پھر کیا ہوا؟

عطا ۔ میرا مطلب ہے کھانے پینے کے معاملہ میں دونوں بہت سخت ہیں۔

(دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے)

بختیار ۔ (جھلاکر) بھئی یہ بڑی لعنت ہے۔ او سرور!

سرور ۔ جی!

بختیار ۔ جی کے بچے جلتے مرتے کیوں نہیں جاؤ سونے دو۔

(کلاک ٹن ٹن نو بجاتا ہے)

بختیار ۔ (حیران ہوکر) یہ گھڑی ہے کیا؟

سرور ۔ جی۔

بختیار ۔ کیا وقت ہوا ہے؟

سرور ۔ نو بج رہے ہیں۔

بختیار ۔ نو؟ بکومت (آہستہ سے) روز کہتا ہوں اس کا وقت درست کردو۔ لیکن یہاں کسی کی کوئی سنے بھی!

(سرور چپ چاپ باہر چلا جاتا ہے)

شہباز۔ (کمرے کے باہر سے) او بختیار!

(شہباز سامنے کے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

بختیار۔ کیا ہے بے؟

شہباز۔ ابے کلوے اُٹھ بیٹھے ہو کیا؟

(عطا شراب کی بوتل کو منہ سے لگا کر آخری گھونٹ پیتا ہے اور بوتل بدستور تپائی پر رکھ دیتا ہے)

عطا۔ (چٹخارہ لیتے ہوئے) وہ مارا۔

شہباز۔ (عطا کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے ابھی ہوش میں ہو۔

عطا۔ یہ پولیس کہاں سے آ گئی؟

بختیار۔ بچہ صبح سیر کو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں جہاں جاتا ہے۔ بُری طرح پٹے گا کسی دن۔

شہباز۔ چپ رہ بے کلوے۔ آئینہ دیکھ کے بات کیا کر۔

بختیار۔ کیا دیکھوں آئینے میں۔ تمہاری لمبی تھوتھنی، لٹکا ہوا ہونٹ یا بگلے کی سی گردن۔

شہباز۔ یہ چیزیں تمہیں کیوں پسند آنے لگیں۔ میاں تم دیکھو اپنا رنگ۔ جامن سی آنکھیں۔ طوطا سی ناک۔

(سرور بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے)

سرور۔ بختیار صاحب!

بختیار۔ (سختی سے) کیا ہے؟

سرور۔ انڈے دیجئے — چھ آدمیوں کے لئے۔

بختیار۔ تم بہت تنگ کرتے ہو۔ میں باز آیا ایسی منیجری سے وہ میرے کوٹ کی جیب سے الماری کی کنجی نکال کر لے لو کتنے انڈے چاہئیں تمہیں؟

سرور۔ جتنے آپ دیں۔ ایک ایک کافی رہے گا۔

(سرور کرسی پر پڑے ہوئے کوٹ کی جیب سے کنجی نکال کر الماری کو کھولتا ہے)

بختیار۔ ہاں! لیکن میں نہیں کھاؤں گا۔ مجھے ڈاکٹر نے منع کیا تھا۔ میرا معدہ خراب ہے۔

شہباز۔ اور مجھے کون ڈاکٹر نے زیادہ انڈے کھانے سے کہا ہے۔ میرا رنگ سیاہ ہو رہا ہے۔

بختیار۔ بیٹا اب انڈے نہیں ڈنڈے کھایا کرو گے۔ یہاں آئے تو ہو دیکھو کیا کیا ملتا ہے۔

(سرور انڈے لے کر باہر جاتا ہے)

شہباز۔ بھئی بختیار دیکھو کالا رنگ ہونا کوئی گناہ نہیں۔ مانا یہ سیاہی تمہارے حصے میں ذرا زیادہ آئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہم خوش رنگوں سے بات بات پر بگڑو۔

بختیار۔ (ہنستے ہوئے) بھئی غضب ہے۔ کیا رنگ ہے واہ وا۔

شہباز۔ واہ کیا بات کی ہے۔ کیا کھسیانی ہنسی ہے۔

بختیار۔ دیکھو آہستہ بولو۔ اگر خان جاگ اٹھا تو سمجھو۔

(نظر پہلو بدلتا ہے اور کمبل میں سے سر نکالتا ہے)

نظر۔ چائے کے ساتھ کھانے کو کیا ملے گا؟

بختیار۔ جیتے ہو۔ جاگ اٹھے ہو؟

نظر۔ جی ہاں! کہئے کیا ارشاد ہے۔

بختیار۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ نظر ہی کیا ہوا جو کھانے کے مسئلے پر ایک لمحہ بھی غافل ہو جائے۔

(نظر اپنے جسم کو کمبل میں لپیٹ کر آلتی پالتی مار کر پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے)

نظر۔ میں دیکھوں گا کہ تم کس طرح کچھ نہیں کھاتے۔

شہباز۔ بھئی بختیار بات تو ٹھیک ہے۔ اگر ہم کھاتے ہیں تو۔

بختیار۔ لو اور سنو۔ ہم — واہ رے ہم۔

شہباز۔ اچھا اگر تمہیں ہم پر اعتراض ہے تو ہم نہ سہی۔ لیکن —

بختیار۔ کس کافر کو اعتراض ہے تمہارے اس ہم پر۔

شہباز۔ تو پھر چلاتے کیوں ہو، سنتے کیوں نہیں،

بختیار۔ اللہ اکبر، کچھ سننے کے لئے ہو بھی۔

شہباز۔ تو پھر سنو۔ ہم —

بختیار۔ خدا کے لئے چھوڑو یہ ابہام ـــ سیدھی طرح کہو میں یا اگر
میں نہیں تو پھر کہو بس۔
شہباز۔ بھئی تم سے ذلیل ہو تم میرے عزیزوں کے طعنے مجھے
دیتے ہو۔
نظر۔ بختیار! یہ تمہیں ہُوا کیا ہے۔ اللہ، خدا، رسول، ان
کو کیوں درمیان میں لاتے ہو؟
بختیار۔ یاد ہو، کون کافر درمیان میں لاتا ہے۔
نظر۔ درمیان میں نہیں لاتے تو کیا کنارے پر کھڑا کرتے ہو
بختیار۔ اگر یہ حالت ہے تو میں چپ ہوں۔ تم لفظوں سے جس
طرح چاہو کھیلو۔ میں خاموش ـــ
شہباز۔ نظر! حسرت کے اس شعر کا دوسرا مصرع کیا ہے۔ ۶
جب عاشقوں سے صدمۂ ہجراں نہ اُٹھ سکا۔
بختیار۔ کہہ جو دیا تم لوگ جو چاہو کہو میں ـــ
نظر۔ بھئی تمہارا واقعی نفسیاتی علاج ہونا چاہیے۔ یہ تمہیں
کیا بیماری ہے؟ ہر بات کو تم اپنی ہی طرف کیوں منسوب
کرتے ہو۔ آخر اس سے تمہیں کیا تکلیف ہوئی۔
شہباز۔ بات یہ ہے اگر منڈیر پر کوا بھی کائیں کائیں کرتا ہے
تو بختیار کو خیال گزرتا ہے کہ وہ دراصل اس کی ہنسی
اُڑاتا ہے۔ اور اسے کوفت ہوتی ہے۔
نظر۔ بھئی ناک نقشہ اور رنگ و روغن وغیرہ کا تذکرہ بند کرو
(سرور دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے)
سرور۔ بختیار صاحب۔ چائے تیار ہے۔
شہباز۔ بھئی سرور۔ ہم سے پوچھو، وہ بات نہیں کریں گے۔
ہاں لے آؤ چائے۔
بختیار۔ بیٹا بہت جلد چھٹکے اور خوب چھٹ گئے۔
شہباز۔ چپ رہیے۔
بختیار۔ پھر وہی بیہودگی ـــ اٹھو وہ تپائی پکڑو۔
شہباز۔ لیکن وہ اس کی شراب کی بوتل۔
بختیار۔ باہر پھینکو اس کو۔ میں تو تنگ آگیا ہوں۔

شہباز۔ ابھی اس میں ایک دو پیگ نظر آتے ہیں ـــ لیکن تھو تھو
ـــ یہ تو خالی ہے ـــ یار ابھی تو اس میں شراب
تھی ـــ کب پی ہے ظالم نے ـــ بھئی کمال ہے۔
بختیار۔ کوئی کمال نہیں، روز یونہی ہوتا ہے۔
نظر۔ سو رہا ہے۔ میرے خیال میں اب اُسے جگا لینا چاہیے۔
بختیار۔ کون کافر سو رہا ہے۔ ساری رات نہیں سویا۔ پیتا
رہا ہے اور رو رہا ہے۔ روتا رہا ہے اور چیختا رہا ہے
ہاں ساتھ والے کمرے میں ان دو مُردوں کو جگاؤ۔
ـــ عجیب لوگ ہیں یار، دس بجنے کو آئے ہیں اور
ابھی تک سو رہے ہیں (زور سے) او ظفر! ـــ ابے
او انور خاں!
شہباز۔ کیوں ہنگامہ پیدا کرتے ہو؟
بختیار۔ اور کیا کروں۔ آخر یہ مصیبتیں چلی جائیں گی یا نہیں؟
بار بار کون چائے تیار کرے گا ان کے لئے؟
شہباز۔ میں کہتا ہوں سوئے رہنے دو ان کو۔ اگر آج یہ ناشتہ نہ
کریں گے تو مر نہ جائیں گے۔
بختیار۔ ناشتہ نہ کرنے کی بھی ایک ہی رہی۔ جانتے ہو۔ آج کل یہ
چائے کے سیٹ بہت مہنگے ملتے ہیں۔ مجھے اس سیٹ کو
چکنا چور نہیں کرانا۔
شہباز۔ کتنے بزدل ہو تم؟ کس کس طرح تمہیں احساس کمتری نے
جکڑ رکھا ہے۔ کبھی تو اپنے آپ کو جوانمرد محسوس کیا کرو۔
بختیار۔ پھر لگے ہو بکواس کرنے۔
نظر۔ بھئی شہباز باز آؤ۔ بہتر ہے تم انور اور ظفر کو لحاف
سے باہر نکالو۔
شہباز۔ (ہنستے ہوئے) میں انھیں لاتا ہوں، کیوں بختیار؟
(شہباز سامنے کے دروازے سے باہر جاتا ہے)
نظر۔ اور میں اس تیسرے مُردے کو ہوش میں لاتا ہوں۔
بختیار۔ ہاں ظالم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا (بلند آواز سے)
او سرور، اب لاؤ بھی نا چائے۔

(نظر پلنگ پر سے اٹھ کر عطا کی چارپائی کے قریب کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

نظر۔ عطا۔ عطا اب اٹھو بھی،

بختیار۔ ارے میاں اس کو ذرا جھنجھوڑ کر جگاؤ۔ جو شخص تمام رات پیتا رہا ہو وہ اب کیا محض آوازوں سے ہوش میں آئے گا۔

(نظر کرسی سے اٹھ کر عطا کا شانہ ہلاتا ہے)

نظر۔ عطا۔ عطا۔ بھئی اٹھو چائے پیو۔ اٹھو بابا۔

بختیار۔ پانی ڈالو اس کے مُنہ پر

نظر۔ سردی ہے بیچارہ ٹھٹھر جائے گا۔

بختیار۔ پھر تم اُسے جگا چکے۔

نظر۔ دیکھو ابھی جاگتا ہے۔

بختیار۔ تم ابھی کل آئے ہو، تمھیں کیا معلوم یہاں کیا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں تو تیس دن یہی معمول ہے۔

(نظر عطا کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے)

نظر۔ میں نے کہا اس کا جسم تو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ دیکھو تو اس کی نبض کہاں ہے؟

بختیار۔ اس کی نبض شراب میں۔

نظر۔ میں مذاق نہیں کرتا۔ اُٹھ کر دیکھو نا ذرا۔

بختیار۔ مجھے تو ضرورت نہیں، او سرور! چائے کیوں نہیں لاتے۔

سرور۔ (کمرے کے باہر سے) بس لا رہا ہوں جی۔

نظر۔ چائے بھی آجائیگی۔ پہلے اٹھ کر اسے تو دیکھو۔

بختیار۔ کیا دیکھوں اسے، رات بھر شراب پیتا رہا شام کا کھانا کھایا نہیں۔ اس صورت میں دیسی شراب انتڑیاں نہ کاٹے گی تو کیا کرے گی؟

نظر۔ لیکن اس نے کھانا کیوں نہ کھایا۔

بختیار۔ اب کیا لگے ہو مغز چاٹنے۔ جانتے تو ہو تم،

نظر۔ دیکھو اطمینان سے بات کرو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

(سرور ایک کشتی میں چائے وغیرہ لئے دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے)

سرور۔ چائے پی لیجئے۔

بختیار۔ وہ تپائی اٹھا کر ادھر کرو، اور اس پر چائے رکھو۔ او دیکھو توش سینکے نہیں تم نے کیا؟

سرور۔ جی نہیں۔

بختیار۔ جا انھیں سینک کر لاؤ۔

سرور۔ اچھا۔

بختیار۔ بلکہ یہ مکھن بھی لے جاؤ انھیں لگا کر لاؤ۔ جلدی کرو۔ دیر ہو گئی پہلے ہی۔

(سرور توس اور مکھن لے کر باہر چلا جاتا ہے۔ نظر عطا کو زور سے جھنجھوڑتا ہے)

نظر۔ عطا! آنکھیں کھولو، ہوش کرو۔ اٹھو چائے پیو۔

عطا۔ ہوں!

نظر۔ ہاں ہاں اٹھو۔

عطا۔ ہوں۔

نظر۔ لو چائے کی ایک پیالی پیو۔

عطا۔ تم کون۔ نظر

نظر۔ ہاں ہاں اُٹھو۔

عطا۔ نہیں، اب میں نہیں اُٹھوں گا۔

نظر۔ کیوں؟

عطا۔ دنیا پر بوجھ ہو رہا ہوں۔

نظر۔ خیر وہ تو ہم بھی ہیں۔

عطا۔ نہیں تم ابھی نہیں ہو۔ تم کبھی نہیں ہو۔

نظر۔ اسی طرح تم بھی نہیں ہو، اُٹھو اور ذرا بیٹھو۔

عطا۔ میرا ہاتھ پکڑو۔

نظر۔ لاؤ۔ لو اٹھو۔ میں کمر کو سہارا دیتا ہوں۔

(نظر عطا کو اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے)

عطا۔ دیکھو۔ اُٹھاؤ۔ اُٹھا۔

نظر۔ ذرا سنبھلو۔

عطا۔ آہ! چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔

بختیار۔ میاں اس کے اندر کچھ ڈالو ـــــ ورنہ یہ خون تھوکے گا

عطا۔ آہ!

بختیار۔ دو بوتلیں اکیلے نے رات بھر میں خالی کر دی ہیں۔ اور بغیر نقل کے ـــ بلکہ بغیر پانی کے۔

نظر۔ لیکن اس نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟

بختیار۔ پوچھو اس سے۔ مجھے کیا معلوم؟ میں تو تمہارے ساتھ آیا تھا

نظر۔ مگر مجھے یاد ہے تم کھانے کے بارے میں اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ دراصل مجھے اس وقت نیند آ رہی تھی۔

بختیار۔ مجھ سے کہتا تھا کہ میں اس کے لئے کھانا کیوں ساتھ نہیں لایا۔ مجھے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ اس شام کو اُسے گھر میں کھانا کھانا تھا جیسے مجھے الہام ہوتا ہے یا میں اس کی بیوی ہوں کہ اس کے لئے کھانے کا بندوبست کرتا پھروں۔

نظر۔ تو کیا شام کا کھانا تم ساتھ لایا کرتے ہو؟

بختیار۔ میاں کیوں انجان بنتے ہو۔ شام کا کھانا ہم سب ہوٹل میں کھاتے ہیں۔

نظر۔ کس ہوٹل میں؟

بختیار۔ جہاں جس کا جی چاہے۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ آنجناب صرف شراب کی دو بوتلیں ہی لے کر گھر میں بیٹھے ہیں۔ رات جس وقت ہم یہاں پہنچے، تم جانتے ہو کوئی ایک بج رہا تھا۔ اس وقت میں کھانا کہاں سے لاتا؟

(شہباز سامنے کے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

شہباز۔ بختیار صاحب! میں نے آپ کے مہمانوں کو جگا تو دیا ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ چائے کی میز پر پہنچیں گے یا نہیں (ذرا لہجہ بدل کر) کیوں کیا بات؟ تم لوگ خاموش کیوں ہو گئے ہو۔ یہ عطا ابھی اٹھا نہیں کمال ہے یہ شخص بھی۔ اگرچہ رنگ و روغن میں چمگادڑ سے قطعاً مشابہت نہیں رکھتا۔ لیکن عادتیں ویسی ہی ہیں اُلٹے لٹکے جان بوجھ کر نہیں کہا کیونکہ دماغ اس کا یقیناً بہتر ہے ـــ بھئی تم لوگ بولتے کیوں نہیں۔ آخر ہوا کیا ہے؟

(کرسی کو ذرا گھسیٹ کر اس پر بیٹھ جاتا ہے)

بختیار۔ (سنجیدگی سے) عطا نے رات کھانا نہیں کھایا۔

شہباز۔ پھر کیا قیامت آ گئی۔ کس نے اسے کہا تھا کہ کھانا نہ کھائے۔ اسے چاہئے کہ اپنے کھانے پینے کا خود خیال رکھے۔ (لہجہ بدل کر) معاف کیجئے پینے کا خیال تو ضرور رکھتا ہے۔ مجھے صرف کھانا کہنا چاہئے تھا۔

نظر۔ شہباز کبھی تو زبان کو لگام دیا کرو۔ معاملے کی نزاکت کا تمہیں احساس ہی نہیں ہوتا۔

شہباز۔ بھئی بختیار، نظر کو تو بیماری ہے۔ یہ تو خواہ مخواہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں کے گوشوں کو ذرا سمیٹ کر اور چوڑی پیشانی پر دو ایک شکن ڈال کر بات کو اہم بنا دیتا ہے۔ ذرا دیکھو اب اس کا منہ کس طرح پھول رہا ہے ـــ او بندۂ خدا پہلے ہی تمہارے نتھنے دھونکنی سے کم نہیں اب کیوں ان پر اور ستم کر رہے ہو۔ پھٹ جائیں گے یہ۔

بختیار۔ شہباز! بکواس بند کرو۔ چائے پیو۔

شہباز۔ تم لوگ پی بیٹھے ہو کیا؟ جبھی تو ہوش غائب نظر آتے ہیں یہ نظر ـــ خدا اس سے بچائے۔ اور تم ـــ تم تو خیر کھاتے ہی نہیں ہو۔

بختیار۔ بھئی واقعی تم مردود ہو۔ تمہاری اس بکواس کا جواب۔

شہباز۔ یوں آؤ نا۔ یہ کیا کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے داغ کی غزل کا ردیف و قافیہ بن کے بیٹھے ہو۔

بختیار۔ اور خنجر تمہارے ہاتھ میں ہے کیا؟

(سرور داخل ہوتا ہے)

سرور۔ یہ توش لیجئے۔ چھری تو نہیں چاہئے آپ کو؟

شہباز۔ شاباش! کیا بات ہے سرور کی۔ میں نے کہا سرور

بختیار۔ اب اس سے شروع ہو جاؤ۔

سرور۔ جی!

شہباز۔ (حیرانی سے) یہ کتنی ڈبل روٹیاں تھیں؟ اور اس قدر

مکھن کہاں سے مل گیا تمہیں؟

سرور۔ عطا صاحب نے صبح کہا تھا کہ مہمانوں کے لئے زیادہ لے لوں۔ یہ چار ڈبل روٹیاں کافی ہیں۔

شہباز۔ لیکن یہ ناشتہ ہے یا دوپہر کا کھانا۔ بختیار میاں ہمارا کیا ہے ہم تو جوں توں کر کے انھیں کھا لیں گے۔ مگر یاد رکھو تمھارا دیوالہ بیس تاریخ سے پہلے ہی نکل جائے گا۔ اور دیکھو ہمیں زیادہ خرچ کرنے کے لئے ادھار ملنے کی بھی اُمید نہیں ہے۔ اور یار نظر سے کہو کہ یہ مصنوعی سنجیدگی ذرا اتار پھینکے۔

بختیار۔ جاؤ بھئی نظر چائے پینے سے پہلے ہاتھ مُنہ دوبارہ دھولو شاید فرق پڑ جائے۔

نظر۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا اس لئے کہ میں اب ایک عجیب سوچ میں ہوں۔

بختیار۔ الحمدللہ، ارشاد۔ سرور میاں تم جاؤ۔

(سرور جاتا ہے)

نظر۔ ایک شخص انتہائی نشے اور تکلیف کے عالم میں ہم لوگوں کے ناشتے کے بارے میں سوچ رکھتا ہے۔ لیکن اپنے کھانے کے مسئلے سے کیوں اتنا بے پرواہ ہے۔ اور پھر ہم بھی اُس کے کھانے کے متعلق نہیں سوچتے۔

بختیار۔ کیوں معتبر بننے کی کوشش کرتے ہو۔ چھوڑو ان باتوں کو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ادھر دیکھو کھانڈ کے کتنے چمچے ـــــ ایک؟

نظر۔ دو۔

شہباز۔ (ہنستے ہوئے) تم بھی سوچ میں جا ہو گم ہو جاؤ۔ لیکن ایک بات کبھی نہیں بھول سکتے۔

نظر۔ میں جانتا ہوں ـــ میں چائے میں شکر زیادہ استعمال کرتا ہوں۔

بختیار۔ نظر ـــ! لو یہ پیالی اُسے دو۔

نظر۔ لیکن وہ کہیں اٹھ سکے تو بات ہو۔

بختیار۔ میاں! سے اچھی طرح سہارا وغیرہ دے کے اُٹھاؤ تو وہ اُٹھے

ورنہ تم جانتے ہو جس شخص کے پیٹ میں صرف تیزاب ہو اس کی انتڑیوں کا حال کیا ہوگا۔

شہباز۔ تم کیوں نہیں اٹھاتے؟

بختیار۔ اور تم کیوں نہیں اُٹھاتے۔

شہباز۔ میں تو لعنت بھیجتا ہوں اس زندگی پر۔ یہ کوئی شرافت ہے

بختیار۔ اور تمھارا مطلب ہے میں ہی ذلیل ہوں۔

نظر۔ لڑو اور خوب لڑو۔ سمجھ میں نہیں آتا اس میں ذلت اور شرافت کی کیا بات ہے۔

بختیار۔ میاں ہم تو روز اس کی یہ ناز برداری کرتے ہی ہیں آج ایک دن تم کر لوگے تو مر نہ جاؤ گے۔

نظر۔ دیکھو یہ ناز برداری کا مسئلہ نہیں۔ میرے خیال میں اُس کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر وہ یونہی پڑا رہا تو ظاہر ہے کہ بغیر ہماری مدد کے یونہی پڑا رہے گا۔ کیونکہ اس میں اب اتنی ہمت بھی نہیں کہ وہ اپنا ہاتھ بستر سے خود اٹھا سکے۔ شہباز تم جب انور کو جگانے ساتھ کے کمرے میں گئے تھے تو میں اُسے اٹھانے کی کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔ اس کا جسم سرد ہو رہا ہے۔ اور نبض ـــ میں تو اُسے ٹٹول نہیں سکا (سوچ کر) ہاں تو بات ہو رہی تھی کیا؟

بختیار۔ لو جی اس شخص کا دماغ بھی جواب دے گیا۔

شہباز۔ تم کہہ رہے تھے اگر یہ یونہی پڑا رہا تو ـــ در اصل تم کبھی افسانہ نگار نہیں بن سکتے۔

بختیار۔ اور تم نے جو قلعے سر کر لئے ہیں، وہ ہم جانتے ہیں ایک تشبیہ جو بڑا بھائی انگریزی سے لیتا ہے اُس پر تین چھوٹے بھائی قبضہ کرتے ہیں اور اس طرح کہ ایک دوسرے کو خبر نہ ہو۔ مگر وب رو ـــ بڑے بنے ہیں افسانہ نگار۔

شہباز۔ ارے اس کالی چڑی کو کیا ہوا۔ اگر ہم چاروں بھائی افسانے اور اچھے افسانے لکھتے ہیں تو دنیا کے پیٹ

میں کیوں مردہ اُٹھتے ہیں۔ تم جو گنگا جمنی نظمیں لکھتے ہو
ان کو بھی زمانہ جانتا ہے۔
نظر۔ دیکھو بھئی شہباز۔ یہاں تم غلط ہو۔ بختیار کی نظموں کو زمانہ
نہیں جانتا بلکہ ملاں سبطین حلوائی کے گھی کو زمانہ
جانتا ہے۔
بختیار۔ (قہقہہ مار کر) مان لیا۔ لیکن اب اس مُردے کو اُٹھاؤ۔
یا اگر وہ نہ اُٹھے تو پیچھے سے اُس کے ۔۔ میں چائے ڈالو۔
ورنہ معاملہ ٹیڑھا ہوتا نظر آتا ہے۔
شہباز۔ پہلے ایک گھونٹ شراب کا اور پھر کچھ اور۔ دیکھو بدشگونی
نہ کرو۔
نظر۔ نہیں کرتے، تو ادھر آؤ۔ اٹھو۔ اسے مل کر اٹھائیں۔
شہباز۔ اتنا ہی بوجھل ہے کیا۔ تم اکیلے نہیں اُٹھا سکتے ہو اس کو۔
بختیار۔ ابے گاودی اُٹھو۔ کبھی کوئی کام بھی کیا کرو۔ یارو لاش
دیکھو ان کی، کیا درشن ہیں۔ لیکن کام کرنا ـــ بس
موت ہے۔ خدا سمجھے ان لوگوں کو ـــ آخر ہم کہاں کہاں
سر کھپائیں۔ کس کس کو سہارا دیں۔ ہم بھی تو انسان ہیں
ہمارا جی نہیں چاہتا کیا آرام کرنے کو۔
شہباز۔ پھر وہی وعظ۔ اُٹھ کے اسے اٹھاؤ بھائی!
نظر۔ عطا .... او عطا!
بختیار۔ اس طرح نہیں اُٹھے گا۔ منشی میراں بخش کہہ کر جگاؤ۔
نظر۔ تم کیوں شرماتے ہو، عطا اٹھو۔ میں نے کہا بختیار۔
بختیار۔ ہوں۔
نظر۔ یہ دیکھو یار اس کی تو انگلیاں اینٹھی ہوئی معلوم ہوتی
ہیں۔ ٹھہرو اس کی آنکھوں کے پپوٹوں کو کھول کر دیکھیں
بختیار۔ کیا بکنے لگے ہو۔ کمزوری ہے ـــ مار رکھا ہے
ٹھرے نے۔
(بختیار لحاف پرے پھینک کر اُٹھتا ہے اور عطا کی چارپائی
کے قریب جاتا ہے)
نظر۔ یہی تو خدانخواستہ میں بھی کہہ رہا ہوں۔ شہباز دیکھو
ناتم بھی،
شہباز۔ ڈاکٹر میں نہیں، میرا بھائی ہے۔ اور وہ یہاں نہیں ہے،
نظر۔ میرے بھائی چھوڑو ان باتوں کو۔
بختیار۔ نظر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ چائے کی پیالی اور یہ چمچہ
مجھے دینا۔
نظر۔ ہاں!
شہباز۔ ذرا گردن اوپر اُٹھاؤ اس کی عطا ـــ عطا ـــ
نظر۔ یہ چائے کا گھونٹ پیو۔
بختیار۔ کہیں نظر کہیں ایڈگر ایلن پو والی بات ہی صحیح ہو جائے۔
نہیں دل تو حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔
شہباز۔ ایڈگر ایلن پو والی بات کیا؟
نظر۔ میرے خیال میں چائے کی بجائے سرد پانی کا ایک گھونٹ
اس کے حلق میں جانا چاہئیے۔
شہباز۔ پھر وہی [illegible] بننے کی کوشش۔ زیادہ باتیں نہ کرو
چائے کا چمچہ ہی اس کے مُنہ میں ڈالو کہ اس کے جسم
میں کچھ گرمی پہنچے۔
نظر۔ اچھا یونہی سہی۔
شہباز۔ ہاں تو وہ پو والی کیا بات تھی بختیار۔
بختیار۔ بھئی بات کیا ہونی ہے ـــ جانتے نہیں ہو ایلن پو
کس طرح مرا تھا؟
شہباز۔ زیادہ شراب پینے سے۔
بختیار۔ بس یہی بات اس کے متعلق نظر نے آج سے چار سال پہلے
کہہ رکھی ہے۔ لیکن اس [illegible] کا [illegible] تھا ـــ
نظر۔ یہ چائے تو جیسے اس کے حلق کے نیچے اُترتی ہی نہیں،
ذرا اور اونچی اُٹھاؤ اُسے۔
بختیار۔ اُس وقت سے میں [illegible] نظم کی تلاش میں ہوں جانے
کہاں ہے؟
شہباز۔ ہمارے پرانے شاعروں کے معشوق کی کمر ہاتھ نہیں آیا
کرتی تھی۔ اس کے بارے میں تو بہت سے شعر مل جائیں گے

لیکن نبض پر معلوم نہیں بختیار کے سوا کسی اور نے کیوں

دھیان نہیں دیا۔ اور سچ پوچھو تو مضمون بھی برا نہیں۔

نظر۔ میرے خیال میں ڈاکٹر کو بلا لینا چاہیے۔

شہباز۔ بختیار! اب اس کا چہرہ دیکھو۔ کتنا مضحک

بنا ہوا ہے۔ میں اس شخص سے بہت تنگ ہوں عجیب

شے ہے۔ اگر تم رونا چاہو تو یہ مضحکہ خیز باتیں کرے گا۔

اور اگر تم ہنسنا چاہو تو یہ الو کی طرح دانا نظر آئے گا۔

میاں بلوا لو ڈاکٹر کو۔ یہ قریب ہی ہے۔

نظر۔ (بلند آواز سے) سرور..... سرور.....

(سرور دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے)

سرور۔ جی۔

نظر۔ میاں ذرا لپک کے ادھر آنا۔

شہباز۔ بختیار! نظر کو یہ بھی سمجھا دو۔ ڈاکٹر کی فیس یہاں دس

روپے ہے جو اسے خود ہی ادا کرنی ہوگی۔

سرور۔ جی۔

نظر۔ بھئی یہاں قریب ہی جو ڈاکٹر صاحب ہیں۔ انہیں جا

کر بلا لاؤ۔ عطا صاحب ہوش میں نہیں آرہے۔

سرور۔ ابھی صبح تو ٹھیک معلوم ہوتے تھے۔ مجھ سے باتیں کرتے

رہے۔

شہباز۔ (طنزاً) ابھی صبح کی بات چھوڑو۔ اب وہ ہوش میں

نہیں ہیں۔ ڈاکٹر کو فوراً لاؤ کیونکہ (نظر سے لہجہ بدل کر)

آجاتے ہیں کہیں سے۔ ٹھنڈا پانی دو۔ چائے نہ دو

سر ادنچا کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔

بختیار۔ سرور جاؤ لے آؤ ڈاکٹر کو

(سرور سامنے کے دروازے سے باہر جاتا ہے)

نظر۔ کتنی دور ہے یہاں سے؟

بختیار۔ یہاں سے چوتھے مکان میں۔

شہباز۔ آج اپنا خدا ہی حافظ ہے۔ اچھا تم لوگ ذرا دلی

صورت بنا کر بیٹھو۔ میں چائے پیتا ہوں لیکن چائے

تو کم بخت خوشی کی ہوگی جو سب مزا لے گا۔ ہاں خوب

یاد آیا۔ وہ ابھی پھالی بات میں تم مزے کا ایک

چٹکلا سنانے لگے تھے۔

بختیار۔ چھوڑو وہیں قصے کو چائے بناؤ تینوں کے لئے۔

شہباز۔ نظر نہیں پئے گا؟

نظر۔ پیوں گا۔

بختیار۔ بڑے مردود ہو تم دونوں۔

شہباز۔ دیکھو مردود کا لفظ اس وقت استعمال نہ کرو۔ اس

سے نظر کو تکلیف ہوتی ہے۔

بختیار۔ وہ کیسے؟

شہباز۔ سیدھی سی بات ہے۔ مردود کی آواز میں مُردے کی

آواز کا بڑا حصہ شامل ہے اور میراں بخش کا مُردہ

سامنے رکھا ہے۔

بختیار۔ (قہقہہ مارتے ہوئے) آج تو یار غضب کر رہے ہو بڑی

دُور کی کوڑی لاتے ہو۔ کس طرف کو گئے تھے آج

سیر کے لئے۔

نظر۔ میرے خیال میں ہمیں اس وقت مذاق نہیں کرنا چاہیے

(لہجہ بدل کر ہنستے ہوئے) ہمیں اس وقت صرف چائے

پینی چاہیئے۔

شہباز۔ یوں سرد۔ خواہ مخواہ ہر بات کو اہم بنا دیتے ہو۔

اس طرح تو ہماری زندگی یہاں اجیرن ہو جائیگی۔

نظر۔ یہ اجیرن کیا؟

بختیار۔ (منہ بنا کر) نیا لفظ سیکھا ہے۔

شہباز۔ (ہنستے ہوئے) نہیں! بات دراصل یہ ہے کہ شجاع الدین

سے جب بھی میری ملاقات ہوتی ہے وہ یہ لفظ ضرور

استعمال کرتا ہے مجھے یہ لفظ بہت بھلا معلوم ہوا ہے

اسی لئے استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

نظر۔ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہو یا نقل کرنے کی؟

شہباز۔ تیار ہے چائے آ گیا ہے۔

شہباز۔ چلو ہوٹل میں چلتے ہیں۔ آج صبح کا سارا مزا کرکرا ہوگیا ہے۔

بختیار۔ (تنگ آکر) اب اس کا کہیں جنازہ اٹھے تو اٹھیں۔

شہباز۔ نہیں کیا حرج ہے۔ نظر یہاں بیٹھا ہے۔ ڈاکٹر سے فارغ ہوکر یہ بھی وہیں آجائے گا۔ آخر ڈاکٹر کی فیس بھی تو اسی کو ادا کرنی ہے۔

بختیار۔ میاں ہم بھی تو پتہ کریں، جیتا ہے کہ مرتا ہے۔

شہباز۔ مرتا نہیں۔ ابھی نہیں۔ اس سے بہت کام لینا ہے۔ اگر یہ آج مرگیا تو وہ فلم کمپنی جو ہم نے اگلے سال قائم کرنی ہے اس کی چوکھٹ پر بیٹھ کر کون شراب پئے گا۔ اور پھر اس کی نالی میں پڑا ہوا کون پایا جائے گا۔

بختیار۔ (خوش ہوکر) بس یہی بات نظر بھی کہتا ہے۔

شہباز۔ تو پھر اس میں تم مرنے کا کون سا پہلو نکالتے ہو۔

بختیار۔ ابے گدھے اس میں مرنے کا پہلو یہ ہے کہ یہ بات اس کے تحت الشعور میں بیٹھ گئی ہے۔ چنانچہ وہ رات کو شراب گھر لاکر پیتا ہے کہ اگر مرے بھی تو بستر میں پایا جائے نالی میں نہیں۔

نظر۔ کیا پتے کی بات کہی ہے۔ خدا تمہیں غارت کرے۔

(سرور اور ڈاکٹر سامنے کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ سرور نے ڈاکٹر کا ہینڈ بیگ اٹھایا ہوا ہے)

بختیار۔ ڈاکٹر صاحب! یہ ہمارے منشی میراں بخش آج کچھ زیادہ ہی اوندھے ہوگئے ہیں۔ دیکھئے ناکس عالم میں ہیں۔

ڈاکٹر۔ کوئی حرج نہیں۔ دیکھتے ہیں۔

نظر۔ ہاں حرج تو کوئی نہیں اگر سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو تو۔

(ڈاکٹر کرسی پر بیٹھ کر ذرا دم لیتا ہے۔ پھر اٹھ کر عطا کو دیکھتا ہے)

ڈاکٹر۔ ہوں۔

شہباز۔ نظر کے وہم کی بھی انتہا نہیں۔ اندیشہ ہائے دور و دراز شاید اسی کو کہتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ ہیں ہیں — یہ کیا؟

(سب غور سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہیں)

بختیار۔ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟

ڈاکٹر۔ ٹھہریئے۔ ذ... ر... ا...

شہباز۔ بختیار!

بختیار۔ ڈاکٹر۔

ڈاکٹر۔ (سر جھکائے ہوئے) بس ختم ہوچکے۔

نظر۔ (گھبرا کر) کیا کہا آپ نے؟

شہباز۔ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ کافی دیر ہوچکی ہے انہیں مرے ہوئے۔

بختیار۔ نہیں ڈاکٹر ہم ابھی اسے چائے پلا رہے تھے — ہم اس کی شراب —

شہباز۔ ہم مُردے سے کھیل رہے تھے۔

نظر۔ یوں نہ کہو۔

(ڈاکٹر اپنا ہینڈ بیگ اٹھائے سامنے کے دروازے سے باہر جاتا ہے)

شہباز۔ (سر کو تھام کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے) ؎

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہوگیا

(شعر پڑھنے کے دوران میں پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

کالیداس

(حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھا گیا)

غزل

چمن سے جاتے ہوئے چمن کو طلسمِ حیرت بنا گئے تم
وہاں وہاں پھر خزاں نہ آئی جہاں جہاں مسکرا گئے تم

نگاہ ملتے ہی معجزہ سا یہ آج کیسا دکھا گئے تم
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے شعر پہ چھا گئے تم

کبھی بہ یک دم مشاہداتِ نظر کے ٹکڑے اڑا گئے تم
کبھی بہ یک لحظہ ہر فسانے کو اک حقیقت بنا گئے تم

ارے غضب ارتباطِ باہم خوشا یہ ناز و نیاز باہم
مری نگاہوں میں کیا سمائے تمام عالم پہ چھا گئے تم

تڑپ نہ تھی نبضِ زندگی میں خلش نہ تھی روحِ آدمی میں
مگر یکایک حجاب اٹھا جمال اپنا دکھا گئے تم

خرد پریشاں ہے عقل حیراں نہ جانے یہ کون سی ہے منزل
دماغ اس کا بھی عرش پر ہے جسے نظر سے گرا گئے تم

فضائے گلشن ہے مست و بیخود خموش نغمے برس رہے ہیں
قدم قدم پر ٹھہر ٹھہر کر یہ آج کیا گنگنا گئے تم

ادا ہو کس طرح شکرِ نعمت بہ یک نگاہِ تمام رحمت
حجابؔ سے نقشِ بے حقیقت کو غیر فانی بنا گئے تم

حجاب ترمذی

عربی ذہن کا احیاء

عربی تمدن جو ازمنہ وسطیٰ کی اسلامی تہذیب کے زوال کے بعد خوابیدہ اور مُردہ ہو چکا تھا اب پھر زندگی حاصل کر رہا ہے۔ نئی زندگی کا مرکز قاہرہ ہے، جہاں اشاعت کی بڑی آسانیاں ہیں اور مطالعہ کی شائق پبلک بڑی تعداد میں پائی جاتی ہے۔ دوسرا ادبی مرکز بیروت ہے، جو کلچر کے لحاظ سے عیسائی اور مغربی ہے۔ دوسرے مرکز ان دونوں کے مقابلے میں کم اہمیت کے حامل ہیں۔ بغداد نے اگرچہ کئی قابل ذکر شعرا پیدا کئے لیکن اس کو نئی کلچر کا مشکل سے مرکز کہا جا سکتا ہے۔ دمشق اور یروشلم قومی بقا کے مسائل میں اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں کہ دوسری چیزوں کی طرف توجہ نہیں دے سکے۔ جزیرہ نمائے عرب کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن جب کوئی عربی ممالک میں جاتا ہے تو وہ چھوٹے شہروں اور پسماندہ علاقوں میں بھی شائق علم نوجوانوں کے گروہ پاتا ہے جو یورپی اور مصری رسائل و مطبوعات کا مطالعہ کر رہے ہوں گے اور حوصلہ شکن حالات میں بھی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھ رہے ہوں گے۔

تعلیم — عربی دنیا کی بیداری نپولین کے حملۂ مصر سے شروع ہوتی ہے۔ محمد علی پاشا نے مصر میں اور محمود ثانی نے ترکی میں جو اصلاحات شروع کیں ان کے لئے تربیت یافتہ افسروں، منتظموں، ڈاکٹروں اور کاریگروں کی ضرورت تھی اس لئے پہلے قاہرہ میں اور بعد میں قسطنطنیہ میں ان کی تربیت کے لئے درسگاہیں کھولی گئیں۔ یورپی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اور ترکی سے تعلیمی مشن فرانس بھیجے گئے۔ لیکن اس تحریک سے ایک محدود طبقہ نے فائدہ اٹھایا۔ تعلیم عیسائی مشن سکولوں نے عام کی جو محمد علی پاشا کے حملہ شام سے تعداد میں بڑھتے گئے۔ ان سکولوں کو کیتھولک مشن والے چلاتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ امریکی، جرمنی، روسی اور انگریزی سکول بھی تھے۔ ان سکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن مسلمان بھی ان سکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ آہستہ آہستہ سرکاری نظام تعلیم پھیلتا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد لبنان، شام اور عراق میں تعلیم مضبوط بنیادوں پہ قائم ہو گئی۔ جزیرہ نمائے عرب میں موجودہ قسم کے سکولوں کا وجود عدم کے برابر ہے۔

عربی یونیورسٹیاں — اعلیٰ تعلیم کے لئے سات یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں تین قاہرہ میں ہیں۔ (۱) جامعہ فواد الاوّل جس کی عنانِ انتظام گورنمنٹ کے ہاتھوں میں ہے۔ (۲) نیم اصلاح یافتہ الازہر (۳) امریکن یونیورسٹی۔ اسکندریہ میں جامعۂ فاروق الاوّل ہے۔ جس کی عنان اقتدار وزارت معارف کے ہاتھوں میں ہے۔ بیروت میں دو یونیورسٹیاں ہیں۔ سینٹ جوزف کی یونیورسٹی جو فرانسیسی سرمایہ سے چل رہی ہے۔ دوسری مشہور و معروف امریکن یونیورسٹی۔ دمشق میں ایک جزوی ترقی یافتہ سرکاری یونیورسٹی ہے۔ خرطوم کا گارڈن کالج جلد یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے والا ہے۔ بیت المقدس میں مشہور و معروف گورنمنٹ عربک کالج ہے۔ عبرانی یونیورسٹی میں بھی عرب طالب علم ہیں۔ لیکن ان کا عربی ادبی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ان سب میں قاہرہ کا جامعۂ فواد الاوّل مشہور و معروف ہے۔ اساتذہ مصری اور یورپین دونوں ہیں۔ لیکن علمی معیار اتنا اونچا نہیں جتنا کہ ہونا چاہئے۔ بیروت کی امریکن جامعہ سب سے منظم ہے اور شہری اور اجتماعی ذمہ داریوں کی طرف زیادہ توجہ دیتی ہے۔ سینٹ جوزف کی یونیورسٹی مشرقی شعبہ کے باعث ممتاز ہے۔

عربی زبان — عربی دنیا میں مغربی تہذیب سکولوں ہی کے ذریعہ سے نہیں عام ہوئی بلکہ اس میں سیر و سیاحت اور تجارت

کو بھی بڑا دخل ہے پچھلی صدی سے کہ اب تک تقریباً ۸ لاکھ شامی شمالی اور جنوبی امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے قصوں اور کہانیوں کی حیثیت ابتدائی ہے۔ ان میں سب سے قابل ذکر عربی زبان کی قوت بیان کی وسعت ہے۔ اگرچہ عربی زبان قرآنی قواعد کا تتبع کر رہی ہے۔ لیکن اس کے ذخیرہ الفاظ میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ اور اس کے الفاظ و محاورات تھوڑی سی تبدیلی سے دقیق سے دقیق خیالات کو بآسانی ادا کر سکتے ہیں۔ عربی زبان کے احیا نے قدیم عربی ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ ان کوششوں کا سہرا ان یورپی اور امریکی مستشرقین کے سر ہے جنہوں نے قدیم عربی کتابوں کو ڈھونڈ کر تہذیب اور تصحیح سے شائع کیا۔ اس سلسلہ میں مطبع "بولاق" کا نام قابل ذکر ہے۔ جس کو نپولین نے قائم کیا تھا۔ اس مطبع نے عربی کی نایاب کتابوں کو عام کر دیا ہے۔

عربی رسائل واخبارات ۔ عربی زبان کے احیا کے ساتھ ساتھ مغربی زبانوں خاص کر فرانسیسی اور انگریزی کا علم بھی ترقی پذیر ہے۔ ہر تعلیم یافتہ ان دو زبانوں میں سے ایک زبان ضرور سیکھتا ہے۔ بہت سے سکولوں میں ذریعہ تعلیم ابھی تک فرانسیسی یا انگریزی زبان ہی ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی مصنفین عربی دنیا میں اچھی طرح متعارف ہیں اور جرمنی اور روسی کم۔ اب قاہرہ میں عبدالرحمان بدوی نے جرمن ادبی اور فلسفیانہ تصنیفات کا دور یافہ میں نجاتی صدقی نے روسی ادب العالیہ کے تراجم شروع کر دیئے ہیں۔ عربی زبان کی نشاۃ ثانیہ میں شامی عیسائیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

بطروس بستانی نے عربی میں انسائیکلو پیڈیا لکھی اور یعقوب صروف اور فارس نمر نے قاہرہ جا کر المقتطف نکالا۔ المقتطف ابھی تک شائع ہوتا ہے اور اس میں سائنس علم الاجتماع اور فلسفہ پر مضامین ہوتے ہیں۔ اسی طرح جرجی زیدان نے الہلال نکالا۔ پچھلے دو سالوں میں المختار جو (Readers Digest) کا عربی لباس ہے تمام رسائل سے بازی لے گیا ہے۔ الاہرام اور المقطم دو مشہور عربی روزنامے ہیں۔ موجودہ زمانے میں مصری رسائل نے بڑی ترقی کی ہے۔ ان میں سے دو ادبی رسالے الثقافت اور الرسالہ قابل ذکر ہیں۔ بیروت۔ دمشق اور بغداد میں کئی فروغ یافتہ رسائل اور اخبارات ہیں۔ اسی طرح عربی نو آبادیات اور خاص کر نیو یارک میں بھی۔ الطارق بیروت میں اور صوت الدہالی بغداد میں (Ahmed Alaka) "بایاں بازو" کے خیالات کے ترجمان ہیں۔

نثر کے ساتھ عربی شاعری کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ عربی شاعری فرانسیسی زبان سے زیادہ متاثر ہے۔ شعرا میں شوقی اور ابراہیم مصری ہیں۔ الزہاوی اور الرصافی عراقی۔ ناصیف یازجی اس کا بیٹا ابراہیم۔ خلیل مطران اور بشارالخوری لبنانی ہیں۔ نئی نسل کے شاعروں کا بڑا مرکز لبنان ہے۔ لبنانی مہاجرین نئی دنیا میں عربی شاعری کا مذاق بھی ساتھ لے گئے ہیں (Elia Madey) ایلیا مادے نیو یارک سے عربی کا اخبار نکالتا ہے۔

عربی ادب ۔ علم ادب اور ادبی انتقاد عربی ادب کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ مصر کی علمی زندگی کے روح رواں ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہیں۔ آپ نے ازہر سے فراغت کے بعد پیرس میں بھی تعلیم پائی ہے۔ آپ نے عربی جاہلیت کی شاعری۔ سیرت رسول اللہ صلعم اور دوسرے عنوانوں پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ الایام کے نام سے ایک دلدوز اور دلچسپ خود نوشت سوانحعمری بھی لکھی ہے۔ جس کا انگریزی میں ترجمہ "مصری بچپن" کے نام سے ہو چکا ہے۔

ناول نے عربی ادب میں ابھی تک پوری ترقی نہیں کی۔ جرجی زیدان کے تاریخی ناول اگرچہ فن کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن انھوں نے عربوں کے تاریخی افکار کے بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں مصری مصنفین کا ایک گروہ پیدا ہوا ہے جن کا مقصد مصر کی دیہاتی زندگی کی نقاشی ہے۔ توفیق الحکیم موجودہ دور کا مشہور ناول نگار ہے۔ اس کا ناول "یومیات نائب فی الریف" ہی عربی ادب کا واحد ناول ہے جس سے مغربی دنیا دلچسپی لے سکتی ہے۔ توفیق الحکیم نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ڈرامہ اگرچہ عربی ادب کیلئے

نیا ہے۔ لیکن فلمی صنعت (فلم اور نشری) کے تعلق سے اس کا مستقبل شاندار نظر آتا ہے۔

خالص ادبی تحریک سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ اور ان کے شاگرد سید رشید رضا کی پروردہ ہے۔ ان بزرگوں کا مقصد علوم اسلامیہ کا احیا، شریعت اسلامیہ کی ترویج، عربی نصاب کی اصلاح اور مذہب اسلام کی مدافعت تھی۔ اس تحریک کا ترجمان المنار ہے۔ حقوق نسواں کی تحریک پچھلی صدی کی پیداوار ہے اور امین قاسم کے پرزور قلم کی مرہون احسان۔ عرب عورتیں اخبار بھی نکالتی ہیں ان میں شامی مے زیادہ (May Ziadeh) اور مصری ملک حفنی ناصیف کے نام قابل ذکر ہیں۔ جماعتی اصلاح کے ساتھ ساتھ قومی تعمیر اور ملی احساس کی بیداری ہے۔ پروفیسر ذُریاک (Prof. Zurayk) کا مجموعہ مضامین قومی احساس انہی خیالات اور احساسات کا حامل ہے۔ عربوں کی قومی تحریک کے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں مثلاً الرافعی کی مصری قومیات کی تاریخ اور جارج انٹونیس کی عربوں کی بیداری۔ آخر الذکر کتاب بڑی چھان بین کے بعد غیر جانبداری سے شگفتہ اور سلیس انگریزی میں لکھی گئی ہے۔

لبنانی عیسائیوں کا ایک گروہ ہے جو عربوں کی قومی تحریک سے الگ ہے۔ ان کا مرکز فکر ہی علیحدہ ہے۔ اس گروہ پر بحیرۂ روم کی کلچر کا اثر زیادہ ہے۔ بیروت میں بعض شامی اہل قلم اور شعرا اپنے خیالات کا اظہار فرانسیسی زبان میں کرتے ہیں۔ لیکن عیسائی اہل قلم کی بیشتر تعداد اپنی تہذیب کے دونوں ڈانڈوں عربی اور عیسوی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔ عرب عیسوی تہذیب کی مشہور ادبی پیداوار خلیل جبران کی تصنیفات ہیں۔ خلیل جبران نے اپنی زندگی لبنان، ولایت متحدہ امریکہ اور فرانس میں گزاری۔ یہ جوانی میں قصے کہانیاں اور نظمیں لکھا کرتا تھا۔ لیکن اس کا نام انگریزی تصنیفات کی بدولت زندہ رہے گا۔

تاریخ اور سائنس — عربی تاریخ نویسی کی روایات پھر نشو و نما پا رہی ہیں عرب عالم مغربی تنقید کی روشنی اپنے ماضی پر ڈال رہے ہیں۔ عربی تاریخ پر معیاری تصنیف پروفیسر ہٹی نے پیش کی ہے۔ جو لبنانی الاصل ہیں اور پرنسٹن یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیہ کے صدر ہیں۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کی تاریخ اے۔ ایس۔ عطیہ نے لکھی ہے علوم طبعی میں تجربات قاہرہ اور بیروت کی یونیورسٹیوں میں ہو رہے ہیں۔

موسیقی اور فنون لطیفہ — ازمنۂ وسطیٰ میں موسیقی اور فنون لطیفہ پر کم کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن اب موسیقی اور فنون لطیفہ سے دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ قاہرہ میں تربیت یافتہ فن کاروں کا ایک گروہ ہے جو اگرچہ کوئی قابل ذکر کارنامہ پیش نہیں کر سکا لیکن اس کی بدولت مغربی موسیقی کا شوق بڑھ رہا ہے۔ امریکہ کا مشہور نغمہ نگار انیس فلیحان (Anis Fuleyhan) لبنان ہی کا رہنے والا ہے۔

فلسفہ — سب سے زیادہ قابل ذکر عربی فلسفیانہ افکار کی نئی تحریک ہے جو یورپ بالخصوص جرمن مابعد الطبیعیات سے فیضان لے کر عربی ثقافت کی زندگی کے ہر شعبہ پر گہرا اثر ڈال رہی ہے۔ اگرچہ اس تحریک نے اپنے نتائج افکار کسی کتابی صورت میں پیش نہیں کیے لیکن اس کی حامل دو ایسی عظیم شخصیتیں ہیں جن پر عربی ثقافت کے مستقبل کا انحصار ہے۔ وہ ہیں عبدالرحمٰن بدوی اور چارلس مالک لبنانی عیسائی۔ چارلس مالک وائٹ ہیڈ اور ہائیڈیگر کے شاگرد اور آج کل واشنگٹن میں لبنانی سفیر ہیں۔ اگرچہ دونوں کئی باتوں میں مختلف المذاق ہیں لیکن ایک بات پر متفق ہیں اور وہ ہے فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ خاص کر یونانی افکار کے شاہکاروں کا۔ فلسفیانہ خیال کے دو اثر عربی کلچر پر ہوں گے۔ اگر ایک طرف موجودہ مسائل کے بخوبی سمجھنے میں مدد ملے گی تو دوسری طرف مستقبل کی عربی کلچر کا مقصد سمجھنے میں۔ اسلام کے ساتھ کئی مسائل تعلق رکھتے ہیں مثلاً اعتقادات اور اسلام کی اخلاقی اور جماعتی تعلیم اور اس کا موجودہ تہذیب اور عیسائیت سے رشتہ۔ یہی عربی [illegible] کے احیاء کے بھی مسائل ہیں ان کا مغرب اپنے ماضی سے تعلق اور عالم اسلامی برادری سے رشتہ۔ ہو سکتا ہے کہ خاندان۔ نظام اجتماعی معاشی اور سیاسی نظاموں پر تنقید [illegible] ایک صحیح اور [illegible] فلسفہ جہاں ان ہنگامی مسائل کی سمجھنے کی استعداد کو بڑھائے گا وہاں اس انحصار کو ظاہر کرے گا جو خدا اور بندے کے مسائل [illegible] کی ذہنیت اپنے مقامی مسائل اور ہنگامی مصروفیتوں میں تمام کائنات کو نظر انداز نہ کرے گی اور نہ [illegible] (اقبال)

نذیر حسین

فرض ناشناس

میں نے تاریکی میں آنکھیں کھولیں
میں نے تاریکی میں چلنا سیکھا
مجھکو تاریکی نے وہ رنگ دکھائے جو کسی نے اب تک
روشنی میں بھی نہ دیکھے ہوں گے

میں نے تاریکی میں آنکھیں کھولیں
اک دھڑکتے ہوئے دل نے مرا دامن تھاما
اک پلٹتے ہوئے آنسو نے مری حوصلہ افزائی کی
اور میں دُھن میں مگن بڑھتا گیا، بڑھتا گیا

پھوٹتی کرنوں کی کیا بات کہوں؟
پھوٹتی کرنیں تھیں تاریکی میں ایسے، جیسے
روتے روتے کوئی بچہ سو جائے
اور پھر خواب میں دیکھے کہ ہزاروں چڑیاں
پھول بن بن کے اُڑی آتی ہیں
اس کے دامانِ تمنا کی طرف

میرا دامن تو ہے صد چاک، مری راہ میں تھیں
سیکڑوں جھاڑیاں، جن سے مجھکو
یاد رہتی تھیں پلٹتے ہوئے اشکوں کی امنگیں ہر وقت

اور حالات بدلنے پہ جب آتے ہیں تو بے طرح بدل جاتے ہیں

حال بن بن کے ہزاروں لمحے
دامنِ ماضی سے جا لپٹے ہیں
اور اک لمحہ اُڑا آتا ہے
یہ بھی لو! حال بنا
دامنِ ماضی سے، لو! جا لپٹا
اور دُور ایک دھڑکتا ہوا دل اور بھی بے چین ہوا

انجم رومانی

گھاؤ

جب مریض نے آنکھیں کھولیں تو اُس نے اپنے تئیں ایک عجیب سی جگہ میں پایا۔ اُسے نامانوس سی بُو آ رہی تھی۔ ایک کشادہ کمرہ، صاف اور شفاف سفید دیواریں، کمرے میں بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔

ایک مترنم آواز سنائی دی — "ڈاکٹر!"

مریض کی نگاہیں چھت اور دیواروں سے ہٹ کر اپنے پہلو میں گھومنے لگیں۔ اُس کے قریب ہی ایک سرخ و سفید نرس سفید لباس میں کھڑی تھی۔ اُس نے "ڈاکٹر" پکارا تھا۔ نرس کی آواز میں تعجب تھا، مسرت تھی اور ترنم، وہ ابھی ابھی ہوش میں آیا تھا۔ اسی لئے نرس نے ڈاکٹر کو بلایا۔ اُس نے پھر آنکھیں میچ لیں، وہ اس مترنم آواز کو اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے دماغ پر زور ڈالنے لگا۔ وہ کہاں تھا؟ یہ سفید اور مرمریں مجسمہ کس کا تھا؟ ڈاکٹر؟ کیسا ڈاکٹر؟ کون ڈاکٹر؟ یہ آواز؟ اس نے ایسی آواز کبھی پہلے بھی سنی تھی؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

اچانک اس نے اپنی کلائی پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ نرم نرم ہاتھ، اُس نے آنکھیں کھولنی چاہیں۔ مگر وہ رک گیا۔ اُسے جرأت نہ ہوئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیاں اُس کی جلتی کلائی پر رکھی تھیں۔ پھر یہی ہاتھ اُس کی پیشانی پر گیا۔ اُسے ڈاکٹر کی کرخت آواز سنائی دی۔ کرخت اور مترنم آوازیں باتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ انگریزی میں باتیں کی جا رہی تھیں۔ وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

قدموں کی چاپ نے اسے بتایا کہ وہ جا چکے تھے۔ اُس نے پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اسے سر میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا اس کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک بازو میں بھی درد تھا۔ اور پنڈا گرم، اس نے بازو ٹٹولا۔ اس پر بھی پٹی بندھی تھی۔ اُس نے آنکھیں پھر بند کر لیں، وہ زیادہ دیر تک آنکھیں کھلی نہ رکھ سکا۔

اسے کمرے میں کبھی کبھی کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ جان گیا کہ میں ہسپتال میں ہوں۔ وہ یہاں کیسے آیا —؟ وہ سوچنے لگا مگر سوچنے سے اس کے سر کا درد زیادہ ہو گیا۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ اُسے پیاس لگ رہی تھی۔ وہ کس سے پانی مانگے؟ اس نے آنکھیں کھولیں، وہی مرمریں مجسمہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے پانی مانگنا چاہا۔ مگر الفاظ لبوں پر آ کر رک گئے۔ وہ جھجک گیا۔ جانے پانی مانگنے سے وہ سفید مجسمہ ناراض ہو جائے۔ وہ ایک معمولی آدمی تھا اور وہ مجسمہ "میم صاحب" اس کے لب کانپے اور اس کے کانوں میں مترنم آواز گونجی "پانی پیو گے"۔ وہ بول نہ سکا صرف اس کے لب ہلے۔ وہ مجسمہ بجلی ایسی تیزی سے دوائیوں کی الماری کی طرف بڑھا۔ ایک آن میں اُس کے لبوں کے ساتھ گلوکوز ملا شیریں پانی کا گلاس تھا سفید ہاتھ اس گلاس کو تھامے ہوئے تھا

پانی کے یہ چند گھونٹ پی کر اس نے ایک فرحت محسوس کی۔ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ وہ اب زیادہ غور سے کمرے کو دیکھنے لگا۔ عجیب سی بُو اس کی ناک میں آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کمرے میں چارپائیوں کی دو رویہ قطاریں لگی ہیں، ان پر جو لوگ لیٹے ہیں سب کا لباس ایک ایسا ہے۔ سب کے بستر سفید تھے۔ ان پر سُرخ کمبل پڑے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک میز رکھی تھی۔ اس کا رنگ بھی سفید تھا۔ چند سفید عورتیں مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں مسکراتی اور بھاگتی ہوئی عورتیں۔ خود سفید اور ان کا لباس سفید۔

اس نے کروٹ بدلنا چاہی۔ اس کا بازو ہل گیا۔ اُسے درد محسوس ہوا۔ مُنہ سے ہائے نکل گئی۔ مرمریں ہاتھ اس کے بازو کو درست

کررہے تھے۔ نیسے عالیشا رہوٹ لب و لہجہ کتنا نرم تھا۔ الفاظ نے درد کی شدت کو کم کر دیا۔

اس کے پاس والا مریض بُری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کے سر اور آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ اسے اپنا دکھ بھول گیا۔ وہ اُس کی آواز میں گم ہو گیا۔ اس کمرے میں سارے دکھی تھے۔ دکھ کا خیال آتے ہی وہ پھر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس دکھ کی نگری میں کیوں آگیا تھا۔ اس کی زندگی پہلے ہی کب زیادہ سکھی تھی۔

کراہنے کی پھر آواز آئی۔ "ہائے رام"

دکھ میں خدا ہی یاد آتا ہے۔ اس کی زبان پر بھی خود بخود خدا کا نام آگیا۔ اس نے زیر لب دعائیں مانگنی شروع کر دیں جو اُسے یاد تھیں۔ اس سے اُسے تسکین اور تسلی سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے یہ دکھ بھی خدا کی راہ میں جھیلا تھا۔ اُس کے ذہن میں خیالات کے دُھندلے نقوش اُبھرنے لگے ——— صبح صبح جب وہ دکان کھولنے لگا تو لوگوں نے اسے روک دیا۔ ہڑتال تھی، ہڑتال کیوں تھی۔ اس کا اسے کچھ علم نہ تھا۔ وہ صرف اس قدر جان سکا کہ مسلمانوں کے حقوق پائمال کئے جا رہے تھے، اس لئے یہ ہڑتال ہوئی۔ مسلمانوں کے حقوق کیا تھے؟ وہ کیسے پائمال ہو گئے؟ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ دکان نہ کھول سکا، وہ مجبور تھا، ہڑتالیوں میں شامل ہو ہی گیا۔

"چلو بھئی جلوس میں شامل ہونے چلیں" ایک دکاندار نے جو اپنی دکان کے باہر تختے پر بیٹھا تھا۔ اسے دعوت دی۔

"ہاں چلو!" آخر وہ بے کار کیا کرتا۔

وہ جلوس میں شامل ہو گیا۔ وہاں نعرے لگائے جا رہے تھے۔ انسانوں کا ایک بے پناہ ہجوم تھا۔ جلوس کے آگے نوجوان طالب علم تھے۔ ان کے بعد ہڑتالی دکاندار اور دوسرے لوگ جا رہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ وہ طبعاً شور و شر سے دور رہنے کا عادی تھا۔ مگر وہ کیوں شامل ہو گیا، وہ نہ جانتا تھا، اس نے ہجوم دیکھا، نعرے سُنے اور ایک کشش تھی جو اُسے اندر لے گئی۔ اب وہ بھی باقی لوگوں کی طرح دیوانہ وار نعرے لگانے لگا۔ اسلام زندہ باد ——— اللہ اکبر ——— یہ جلوس اُسے اس کے ساتھی نے بتایا مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے سلسلے میں نکالا گیا تھا۔ دین خطرے میں تھا۔ خیالات کی روانی کے ساتھ ساتھ وہ بتر بتر دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں جلوس کا ہنگامہ خیالات کی شدت بن گیا۔ نرس نے اس کی کھلی کھلی آنکھیں دیکھیں تو ان میں ایک خطرہ پایا۔ وہ فوراً اس کی طرف آئی ——— نزدیک آکر اُس نے مریض کی زیر لب آواز سنی: "اسلام زندہ باد ——— زندہ باد۔"

"سو جاؤ ——— نمبر بائیس سو جاؤ۔"

اور نمبر بائیس خیالات کے ہجوم میں گم تھا۔ وہ نرس کی بات نہ سن سکا۔

نرس نے اس کی آنکھیں اپنے دونوں سے بند کر دیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نرم نرم ہاتھ۔ اسے کتنی راحت محسوس ہوئی۔ ذہن کا ہنگامہ لمحہ کے لئے رک گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، وہ چاہتا تھا کہ دونوں ہاتھ اُس کی آنکھوں پر عمر بھر رہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ پر نازک نازک لمبی لمبی انگلیاں ——— اس کا بدن بدستور گرم تھا۔

قدموں کی چاپ سنائی دی، نرس جا چکی تھی، مگر وہ ابھی تک انگلیوں کا سرد لمس محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں خیالات پھر رینگنے لگے۔ ہنگامہ تھم گیا۔ جلوس رک گیا۔ ایک نوجوان تقریر کرنے لگا۔ وہ ہجوم کے آخری حصے میں تھا۔ وہ تقریر نہ سن سکا۔ مقرر کی آواز راستے میں کھو کر رہ جاتی۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ نعرے بار بار بلند ہوتے۔ اللہ اکبر، اسلام زندہ باد!

اتنے میں سامنے سے پولیس نمودار ہوئی۔ ان کی لال پگڑیاں، وہ لاٹھیاں اٹھائے تھے۔ چند سپاہیوں کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ پولیس نے جلوس روک دیا ——— ایک ہلچل مچ گئی ———

مریض نمبر ۱ کیس پھر کراہنے لگا ۔ "ہائے رام" "ہائے رام" اُس نے نرس کے قدموں کی چاپ سُنی ، وہ نمبر ۱ کیس سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی ۔ اُس نے سوچا وہ کتنی اچھی ہے ۔

پولیس کا ایک افسر آگے بڑھا ۔ وہ نوجوان مقرر سے باتیں کرنے لگا ۔ ہجوم میں سے چینی پھیل گئی ۔ باتوں کا شور تھا اور ان میں تلخی ۔ پھر یہ تلخی بڑھتی گئی ۔ اتنے میں کسی نے ہجوم پر ایک پتھر پھینک دیا ۔ گویا پٹرول کے تالاب کو دیا سلائی دکھا دی گئی ۔ ایکا ایکی ہجوم بپھر گیا ۔ دیوانہ ہو گیا ۔ اب تو پولیس کی بھی پیش نہ گئی ۔ انسان درندے بن گئے ۔ جو سامنے آیا پٹ گیا ۔ ہوا میں پتھر تیرنے لگے ۔ اس ہنگامے میں پولیس کے آدمی بھی زخمی ہو گئے ۔

شور و غوغا ، نعرے اور ہجوم بڑھتا ہی گیا ۔ یہ بھی ان میں تھا ۔ آج تک اس نے کبھی کسی سے لڑائی نہیں کی تھی ۔ جھگڑا نہیں کیا تھا اُسے ان چیزوں سے نفرت تھی ۔ وہ جھگڑے فساد کی باتوں کو بُرا سمجھتا تھا ۔ بہت ہی بُرا ۔ اس کے نزدیک ہندو مسلمان سب ایک تھے بچپن میں وہ ہندوؤں کے گھروں میں آتا جاتا رہا تھا ۔ گاؤں میں اس کے والد کے دوست ہندو بھی تھے ۔ وہ لوگ کتنے اچھے تھے ۔ سب کتنا پیار کرتے تھے ۔ دکانداری نے اُسے اور بھی بُردبار بنا دیا تھا ۔ اسے سب سے کاروبار کرنا پڑتا تھا ۔ مگر اب اس کے اندر بھی ایک جوش تھا ۔ وہ بھی نعرے لگا رہا تھا ۔ اس نے بھی پتھر پھینکے تھے ۔

اس نے ایسا کیوں کیا ؟ اب اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا ، اس نے دماغ پر زور ڈالنا چاہا ۔ مگر سر زیادہ درد کرنے لگا ۔ خیالات کی لہر مدھم ہو گئی ۔ اس میں اتنا جوش کہاں سے آ گیا تھا حالانکہ وہ ہمیشہ اس سے احتراز کیا کرتا تھا ۔ یہ شاید اس ہجوم کا اثر تھا ، جس نے اُس کے اندر یہ جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا ۔

پھر ایکا ایکی کسی نے ایک مکان کو آگ لگا دی ۔ آگ بھڑک اٹھی ۔ مکان کے اندر ایک شور برپا ہوا ۔ بچے چلانے لگے ۔ عورتیں رو رہی تھیں ۔ مرد بیچارے سراسیمگی کے عالم میں سامان باہر پھینکنے لگے ۔ ہجوم نعرے لگاتا آگے بڑھنے لگا ۔ پھر پولیس نے لاٹھی چلا دی ۔ مگر لوگ منتشر نہ ہوئے ۔ پھر فائر کی آواز ! اسے گولی لگی تھی ۔ اور اس کے بعد ـــــ اُسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا ۔

نمبر ۱ کیس پھر کراہا "ہائے رام" ۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا ۔ اُس کے پاس والا مریض کراہ رہا تھا ۔ اپنے خدا کو پکار رہا تھا وہ بھی اپنے خدا کا نام لے کر سارا دن نعرے لگاتا رہا ۔ پتھر پھینکتا رہا اور جلتے ہوئے مکان کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا ـــ کیوں ؟ ـــــ کیوں ایک لاینحل سوال بن کر اس کے سامنے ناچنے لگا ۔ اس کا درد بڑھ رہا تھا اس نے کروٹ بدلنی چاہی ۔ پھر باز و دکھ گیا اور وہ درد سے چلّا اٹھا ۔

چند خوش پوش لوگ اندر داخل ہوئے ۔ اُن کا لباس اُن کے مرتبے کا پتہ دے رہا تھا ۔ وہ اُس کی چارپائی کے قریب آ کر رُک گئے ۔ ڈاکٹر ان کے ساتھ تھا ۔ ان لوگوں نے اس کی چارپائی کے گرد گھیرا ڈال لیا ۔ اُس پر مختلف سوالات کرنے لگے ۔ اُسے تسلّی دینے لگے ۔ وہ اُس کی بہادری کی تعریف کر رہے تھے ۔ اس نے ایک قومی فرض ادا کیا تھا ۔ وہ اسے سمجھاتے رہے کہ قوم کی راہ میں جو خون بہایا جائے وہ ضایع نہیں ہوتا بلکہ وہ قومی سرمایہ بن جاتا ہے ۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ جلوس میں یہ لوگ شامل تھے ؟ یہ لوگ کیوں زخمی نہیں ہوئے ؟

" یہ کون ہے ؟ " ان آنے والوں میں سے ایک نے ڈاکٹر سے پوچھا ۔ اس کا اشارہ ساتھ والے مریض کی طرف تھا ۔

" یہ بھی اسی ہنگامے میں زخمی ہوا ہے ۔ "

نمبر ۱ کیس چلّایا " ہائے رام "

آنے والوں کے چہرے سکڑ گئے ۔ وہ اس تبدیلی کو دیکھ کر حیران رہ گیا ۔

نمبر ۱ کیس پھر چلایا " ہائے رام " یہ چلّانا اس کے دل میں نشتر چبھو گیا ۔ اور وہ زیادہ پریشان ہونے لگا ۔ نمبر ۱ کیس اُس کی

طرح وارڈ میں زخمی ہوا تھا۔ اسے دیکھنے والوں کا یوں چہرے پیکر نا بہت برا معلوم ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ سب لوگ چلے جائیں۔ اُسے ان کے چہرے کتنے بدنما دکھائی دینے لگے۔ یہی چہرے ابھی کتنے خوبصورت تھے۔ مگر اب کتنے بھدے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کا دل ان سے ڈرنے لگا۔ اس کا چہرہ اور زرد ہو گیا۔ ڈاکٹر نے انگریزی میں کچھ کہا اور وہ لوگ چلے گئے۔

وہ چلے گئے اور اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ سو جانا چاہتا تھا۔ اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ اس کا بدن جل رہا تھا مگر خیالات تھے کہ چلے ہی آرہے تھے۔ اس نے نرس کو دیکھنا چاہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے دیکھتا ہی رہے۔ ہنستا مسکراتا چہرہ، مگر آنکھیں زیادہ دیر تک کھلی نہ رہ سکیں۔ وہ بند ہو گئیں۔ اُس کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"ہائے رام!"

اندھیرے میں روشنی کے ذرّات ناچنے لگے۔ ایک ہجوم رینگ رہا تھا۔ ایک پتھر بجلی کی طرح کوندا۔ پتھر۔ اینٹیں، آگ کی ایک چنگاری اور پھر شعلے۔ مکان جل رہا تھا۔ پھر لاٹھیاں برسنے لگیں۔ لہو بہنے لگا۔ پھر فائر تڑاتڑ تڑ تڑ تڑ۔ اس کے بعد — یکایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ یہاں اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا۔ بے یار و مددگار، اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ وہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ شہر سے کئی سو میل دُور ایک گاؤں۔ نمبر اکیس کا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ ورنہ کوئی آتا۔

کوئی آ بھی گیا، وہ نرس تھی، اس نے دونوں کو دوا پلائی۔ وہ غنودگی محسوس کرنے لگا۔ وہ گہرے غار میں چلا جا رہا تھا، چلا جا رہا تھا — اب "ہائے رام" کی آواز بھی ختم ہو گئی —

جب وہ جاگا تو اُس نے دیکھا کمرے میں گھپ اندھیرا ہے۔ کمرے کے وسط میں میز پر بجلی کا ایک لیمپ جل رہا ہے۔ جس کے گرد سبز کپڑا لپٹا ہے۔ روشنی صرف میز پر پڑ رہی ہے۔ تاریک کمرے کو روشنی کا یہ دھبّا اور بھی زیادہ تاریک کر رہا ہے۔ مریض سو رہے ہیں۔ کراہ رہے ہیں۔ اور ایک سفید سایہ ہر کراہنے والے کے پاس بجلی کی طرح لپکتا ہے۔ ڈھارس بندھاتا ہے، تسلی دیتا اور دوا پلاتا ہے۔

اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ سُرخ سُرخ کمبلوں کی ایک قطار تھی۔ بےجان لوگ، آج تک اس نے کسی کو یوں سوتے نہیں دیکھا تھا۔ بلا کی خاموشی تھی۔ کمرے میں مریضوں کے خرّاٹے اور ہائے ہائے کی آوازیں بہت بھیانک معلوم ہوتیں۔ اس کی روح پر ایک غم چھانے لگا۔ ایک موہوم خوف اس کا گلا دبانے لگا۔ اس کو خیال آیا کہ اگر وہ مر جائے تو — موت کے خیال سے وہ کانپ اُٹھا۔ ابھی اسے مرنا نہیں تھا زندہ رہنا تھا۔ زندہ رہنا چاہئے تھا۔ اس کا باپ جوانی میں مر گیا، وہ ابھی چھ سال کا بچہ تھا۔ وہ، ایک ننھی سی بہن اور بیوہ ماں باقی رہ گئے تھے۔ ماں نے اُسے بڑی محنتوں سے پالا۔ جب وہ بارہ برس کا ہوا تو ایک شخص کے ہمراہ اسے شہر میں نوکری کے لئے بھیج دیا۔ اس نے آٹھ برس ایک دکاندار کے پاس کام کیا اور اب اس نے خود ایک چھوٹی سی دکان نکال لی تھی۔ وہ بہت کفایت شعار تھا۔ وہ کچھ روپیہ جمع کر رہا تھا۔ اس کی بہن جوان ہو چکی تھی۔ اسے اس کی شادی کرنی تھی — اس کی بیچاری ماں — اگر وہ مر گیا تو — اس نے موت کا خیال دل سے نکالنا چاہا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا — وہ اس خیال کو دماغ سے نکال رہا تھا۔

"ہائے رام" نمبر اکیس پھر پکارا۔

رات کی تاریکی اور کمرے کی اس بھیانک فضا میں یہ الفاظ کتنے دردناک معلوم ہوئے۔

اُسے تنہائی کا خیال ستانے لگا۔ وہ اس وقت بے یار و مددگار تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی سے باتیں کرے — اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ اُسے اپنی ماں یاد آئی۔ بہن کا خیال آیا۔ اس نے چاہا کہ وہ زور زور سے چلّائے "ماں! ماں!!!" — اگر اس وقت اس کی ماں موجود ہوتی تو وہ اُس کا سر گود میں رکھ لیتی۔ بہن سر دباتی۔ اس کا درد کم ہوتا — اور اب ماں تھی وہاں اور نہ بہن — اس کے دل میں

اس وقت ایک عورت کا خیال کروٹیں لینے لگا۔ اُسے ایک عورت کی ضرورت تھی۔ موت کی اس وادی میں وہ ایک عورت کا سہارا چاہتا تھا ایک عورت، وہ ماں ہو، بہن ہو، یا محض ایک عورت ــــ اس کے دل میں ایک جذبہ بیدار ہوا۔ اسے اپنا ماتھا اور جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بخار سے اس کا بدن پھنک رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے پانی مانگا۔ "پانی! پانی!!" اور ایک آن میں نرس پانی لے کر موجود تھی۔

پانی کا گلاس اس کے لبوں کے ساتھ تھا۔ اور اس کا ہاتھ نرس کے ہاتھ پر۔ پھر اُس نے نرس کا ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ دیا۔ ٹھنڈا ہاتھ گرم ماتھے پر کتنا آرام دہ تھا۔ گلاس اس کے لبوں کے ساتھ تھا۔ اس نے چاہا کہ کاش ایسا ہو سکے کہ یہ گلاس عمر بھر یہیں رہے اور اس نرس کا ہاتھ اس کی گرم گرم پیشانی پر۔ رات کی تاریکی، عورت کا ہاتھ، حسین ہاتھ، اسے اس وقت ایک عورت کے سہارے کی بھی ضرورت تھی۔ وہ ایک عورت تھی۔ حسین، جوان، رات کی تاریکی میں یوں ایک عورت کا ہاتھ۔ نہیں، نہیں، وہ محض عورت نہیں تھی، وہ ماں تھی، اُس نے ماں کے ہاتھوں ایسی شفقت محسوس کی، لیکن اس کی ماں تو اب بوڑھی ہو رہی تھی۔ یہ تو جوان تھی۔ لب ہلے اور بند ہو گئے۔ ہاتھ ابھی تک ماتھے پر تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس عورت کو ۔۔۔ چاہتا تھا۔ اور پھر الفاظ خود بخود لبوں سے پھسل گئے، خاموش فضا میں تیرنے لگے، بہن، بہن، لب ہلے جا رہے تھے۔

نرس مسکرائی، اس نے اندھیرے میں بھی اُس کی مسکراہٹ کو دیکھ لیا۔ نرس نے اُسے تھپکی دی۔ "ہمت کرو بھائی ــــ سو جاؤ ہاں سو جاؤ ــــ اچھے بھائی، سو جاؤ ــــ" تھپکی سے اُسے ماں یاد آگئی، اور وہ ایک بار پھر اسے ماں کی گود میں تھا۔ لوری لے رہا تھا ــــ "سو جا، راج دُلارے سو جا ــــ سو جا لاڈ کے پلے سو جا۔" اور وہ سونے لگا۔ نرس مسکرائی۔ اس کے لب بدستور ہل رہے تھے۔ بہن۔۔۔۔۔

دوسرا دن طلوع ہوا۔ صبح اُسے پوری طرح ہوش تھا۔ کمرہ روشن تھا۔ چاروں طرف زندگی پھیل چکی تھی۔ کمرے میں نرسیں پھرتی سے صفائی میں مصروف تھیں۔ مریضوں کے مُنہ دھلائے جا رہے تھے۔ بستر درست کئے جا رہے تھے۔ پھر ڈاکٹر آیا، ایک ایک مریض کا حال دریافت کیا۔ یہ سارا ماحول نیا تھا۔ رات کی تاریکی ختم ہو چکی تھی۔ نرس جا چکی تھی، اس کا خوف جا چکا تھا۔ موت کی جگہ زندگی رواں دواں تھی۔ اسے بھی ہوش تھا۔ بخار کم ہو گیا تھا۔ اکیس نمبر کو بھی اب درد کا افاقہ تھا۔

اُس کے خیالات میں بھی تبدیلی آگئی۔ اب وہ موت کی جگہ زندگی کی باتیں سوچنے لگا۔ نرسوں کی مستعدی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا گورے گورے ہاتھ کالے اور گندے مُنہ دھو رہے تھے۔ وہ کس پیار سے کام کر رہی تھیں۔ اُن کے لبوں پہ مسکراہٹ کھیلتی جاتی اور وہ اپنا کام کئے جاتیں۔

وہ پھر اسی دائرے میں سوچنے لگا۔ وہی چکر جس میں وہ کل رات گھومتا رہا۔ یہ عورتیں بھلا کیوں یہ کام کرتی ہیں۔ وہ مسلمان تھا اور نرسیں عیسائی۔ ایسا کام! اسے ایک کہانی یاد آگئی۔ جو اس نے پانچویں جماعت میں پڑھی تھی۔ اس میں مس نائٹ انگیل کا ذکر تھا۔ دوسرے انسانوں کی خدمت کا جذبہ ــــ انسان، دوسرا انسان! نمبر اکیس بھی انسان تھا، دوسرا انسان، کل وہ لوگ اسے دیکھ کر کیوں مُنہ بنانے لگے تھے۔ وہ بھی انسان تھا۔ اس ایسا انسان، وہ بھی فساد میں زخمی ہوا تھا۔ زخم کے خیال سے اسے پھر درد محسُوس ہونے لگا۔ "ہائے اللہ!" کے الفاظ خود بخود اُس کی زبان پر آگئے۔ پھر اسے اپنے ساتھی کا خیال آیا۔ وہ بھی زخمی تھا۔ یہ زخم لاٹھی کا تھا یا پتھر کا۔ پتھر! اسے اپنا ہاتھ دکھائی دیا، وہ ایک پتھر اٹھا رہا تھا۔ پھر وہی پتھر ہوا میں تیرا، ایک انسان کے سر پہ لگا، خون بہنے لگا۔ سرخ خون، سُرخ کمبل، خیالات گڈمڈ ہونے لگے۔ نمبر اکیس ہندو تھا، ہندو! اُسے وہ چہرے یاد آگئے جو کل نمبر اکیس کو دیکھ کر سکڑ گئے تھے۔ بھدے ہو گئے تھے۔

"نمبر بائیس! لو دوا پیو۔"

وہ چونکا۔ اس کا مُنہ خود بخود کھُل گیا۔ نرس نے دوا اس کے حلق میں انڈیل دی۔ اُس نے دوا کو حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے پوچھا۔

"نمبر اکیس کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے — تم لیٹے رہو" مسکراتا چہرہ آگے بڑھ گیا۔

"بھائی! کیا حال ہے؟" اُس نے آہستہ سے نمبر اکیس کو مخاطب کیا۔ جواب میں خاموشی رہی۔

"بھائی کیا حال ہے؟" اس نے دُہرایا۔

"تھیں کیا —؟" نمبر اکیس نے تھوک دیا۔

تھوک دیا۔ اس نے محسوس کیا گویا نمبر اکیس نے اس کے مُنہ پر تھوک دیا تھا۔ اس کے مُنہ پر، اُس نے اُسے بھائی کہا اور جواب میں تھوک کر اُسے بہت صدمہ ہوا۔ اُس نے سوال ہی کیوں کیا، اس نے شدتِ غم سے آنکھیں بند کر لیں، اس کا خون جلد جلد حرکت کرنے لگا۔ حرارت بڑھ گئی وہ خاموش ہو گیا، آنکھیں بند کر لیں۔ رات اُس نے ایک بدیشی عورت کو بہن کہا، وہ مسکرانے لگی تھی، ایک سمندر پار عورت، انگریز عورت وہ اُسے تھپکیاں دیتی رہی، لوریاں دیتی رہی اور وہ آرام سے سو گیا تھا۔ مگر یہ شخص — نمبر اکیس، اس کا بھائی، ایک ہی زمین کے بیٹے ایک ہی دیس کے بسنے والے، ایک جیسے کالے، ایک جیسے غریب، اور ایک ایسے زخمی، اس نے بھائی کا جواب کیا دیا؟

اُس کے کان بجنے لگے۔ اُس نے محسوس کیا گویا کوئی نعرہ لگا رہا ہے، جس کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ کان بند کر لے، یہی وہ آواز تھی، اُس نے اسے جوش دلایا۔ وہ ہجوم میں مل گیا، وہ دیوانہ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں پتھر تھا۔ کہیں نمبر ۲۱ ہی اس کے پتھر سے زخمی تو نہیں ہوا۔ لیکن اُسے کیا معلوم کہ اس نے پتھر مارا تھا۔ اس کی آنکھیں تو بند ہیں، اس نے اتنی نفرت کا اظہار کیا، تھوک دیا۔ نفرت کیوں؟ نمبر اکیس بے جان پڑا تھا، ایک لاش، نفرت کی لاش،

نفرت، لاش، زندگی، موت، تاریک کمرہ، نرس، بہن، لوری، نیند — واقعات ذہن کے فلم پر ناچ رہے تھے۔ اس نے پھر آنکھیں کھولیں، کمرہ روشن تھا، چاروں طرف زندگی رواں دواں تھی، اسے اپنا خیال آیا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اُس کی بوڑھی ماں تھی، جوان بہن تھی، انھیں اس کی ضرورت تھی، مگر اس وقت اُس کے قریب نفرت لیٹی تھی، — ایک لاش، نمبر ۲۱ لاش ہی تھی، بند آنکھیں، وہ زندگی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے اسے زندگی سے نفرت تھی۔ اس نے ایک زندہ انسان کے زندہ لفظ کو ٹھکرا دیا۔ بھائی — زندگی کا سہارا — ایک ماں کا جایا بھائی۔ ایک خون، ایک دیس، ایک ایسا زخمی،

اس کی آنکھوں کے سامنے پھر وہ منظر پھرنے لگا — ایک گھر جل رہا تھا، صرف اس لئے کہ وہ ایک ہندو کا گھر تھا۔ ہندو، مسلمان کیا جب آگ نے ہندو مکینوں کو اپنی لپیٹ میں لیا تو انھیں دُکھ نہ ہوا؟ دُکھ، زخم — اُسے زخم آئے تھے۔ نمبر اکیس کو زخم آئے تھے۔ وہ بیتاب تھا۔ نمبر اکیس بیتاب تھا، آگ، زخم، ہندو، مسلمان، سب برابر تھے، سب برابر تھے، — خیالات بہت تیز ہو گئے۔

نرس ایک اور مریض کو پیار کر رہی تھی، پیار — ایک انگریز عورت، سات سمندر پار کی عورت، نہ اس کی زبان ہندوستانی، نہ اُس کا دیس ہندوستانی وہ حاکم قوم سے تھی — انگریز — ان کے خلاف ہی تو جلوس تھا، وہ ہندوؤں کے دوست تھے — اور — اور اس کے دل میں بھی نفرت اُبھرنے لگی — لیکن اسے نفرت سے نفرت تھی، وہ نفرت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ انگریز عورت ہے تو کیا —؟ اب تو وہ اس کی بہن تھی۔ بہن۔ اس نے پچھلے دنوں ہمایوں فلم دیکھا تھا، بابر کی مُنہ بولی بیٹی — ہمایوں کی مُنہ بولی بہن — ایک ہندو راجپوت لڑکی ہی تو تھی ہمایوں کی بہن۔ بہن کوئی ہو، ہندو، مسلمان، انگریز، بہن ہے — لیکن بھائی؟ نمبر اکیس نے اسے دھتکار دیا۔ اس کے مُنہ پر تھوک دیا — نرس مسکرا دی تھی، بہن،

نمبر اکیس کی حالت پر اُسے رحم آنے لگا۔ وہ کیوں نفرت کرتا تھا، — اس کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا — ہمایوں نے اپنے جانی دشمن راجے کو آخر اپنا لیا تھا۔ راکھی باندھ کر — خون — نفرت کو دُور کرنے کے لئے خون کی ضرورت ہوتی ہے

وہ اُسے کیسے اپنائے۔ اُن کے درمیان نفرت کا ایک آتشیں سمندر تھا۔ وہ اسے کیسے عبور کرے، وہ اُس کا بھائی تھا، ہندوستانی،

دکھی، زخمی، دونوں باہر کی دنیا سے کٹ چکے تھے، اب ان کی دنیا محدود تھی، پیار کی دنیا، یہاں کوئی نعرے لگانے والا نہ تھا، یہاں کوئی لیڈر نہ تھا، یہاں کوئی اخبار نہ تھا، یہاں ایک دکھ تھا جو سب میں مشترک، اور یہاں ایک محور تھا جس کے گرد سب گھومتے تھے، وہ محور پیار تھا ـــ اس کا دل بھر آیا، وہ رونا چاہتا تھا۔ مگر وہ بچہ نہ تھا ـــ نمبر اکیس نے آخر اس کے منہ پر تھوک کیوں دیا تھا؟ وہ کچھ نہ سمجھ سکا، سوچتا رہا۔ دن کی زندگی میں سوچتا رہا، رات کی موت کا سا تاریکی میں سوچتا رہا، سوچتا رہا، نفرت، پیار، نفرت ـــ ایک لاش جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی، رات، تاریکی، اور اسی تاریک رات میں نرس پیار بن کر روشنی دکھاتی اور پھر آہستہ آہستہ یہ روشنی دن میں تبدیل ہو کر زندگی بن جاتی، یہی زندگی پیار تھا وہ اسی محبت کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا تھا۔ نمبر اکیس کا اس نے کیا بگاڑا تھا۔ اس کے گاؤں میں اس کے ہندو دوست بھی تھے۔ وہ اپنے باپ کے ہندو دوستوں کو چاچا کہا کرتا تھا ـــ مگر یہ منہ پر تھوکنا ـــ؟ اس کا سر چکرانے لگا۔ نفرت ابھرنے لگی۔

لیکن محبت کیلئے قربانی کی ضرورت تھی، ہمالیوں نے کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں، وہ ایک انسان کے دل سے نفرت کو دور کرنا چاہتا تھا، دور تاکہ نفرت آگ بن کر کسی اور کے گھر کو نہ جلا سکے۔ بند آنکھیں کسی مسلمان کے بچوں کو آگ میں جلتا دیکھ کر نعرے نہ لگا سکیں، ہندو، مسلمان، یہ کتنے خوفناک الفاظ تھے، ان میں آگ تھی، خون تھا، اور پھر آنکھیں بند ہو جاتی تھیں ـــ زندگی ختم ہو جاتی تھی، نفرت بھائی ایسے مقدس رشتے کو دھتکار دیتی ہے اور وہ اب اس نفرت کو مٹا کے رہے گا۔ خیالات کی بےچینی کے ساتھ اس کی طبیعت بھی خراب ہوتی گئی ـــ وہ نمبر اکیس کے دل سے کیسے نفرت دور کرے؟ اب تو خود اس کے دل میں نمبر اکیس کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کا دل کڑھتا ـــ بخار تیز ہونے لگا۔ سر کا درد بڑھ گیا۔ اس کے چارٹ پر سبز اور سرخ لکیریں تیزی سے رینگنے لگیں، نرس کی توجہ اس پر زیادہ ہو گئی۔ وہ بار بار آتی، اس کو دلاسا دیتی، پیار کرتی، بھائی کہتی، جتنا وہ زیادہ پیار کرتی۔ اتنا ہی اسے دکھ ہوتا۔ وہ بھی پیار کرنا چاہتا تھا۔ نمبر اکیس سے، اپنے بھائی سے۔ وہ اب کیا کرے۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا ـــ اس کی حالت اور خراب ہوتی گئی۔ وہ کتنا دکھی تھا ـــ کاش وہ یہاں نہ آتا۔

وہ تنگ آ گیا۔ خیالات نشتر بن بن کر اس کے جگر میں چبھ رہے تھے۔ بھلا وہ کیوں نمبر اکیس سے پیار کرے؟ وہ ہندو تھا، اس نے دماغ سے ان خیالات کو نکالنا چاہا مگر خیالات تھے کہ پھیلتے ہی گئے۔ تیندوے کی طرح اسے جکڑ رہے تھے ـــ وہ مجبور تھا، سوچتا رہا، سوچتا رہا، اس کے خیالات میں کتنی شدت آ گئی تھی۔ بخار بھی اور تیز ہونے لگا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا، اس کو اپنا جسم آگ میں جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، چارٹ پر سرخ لکیریں اور تیزی سے رینگنے لگیں۔ اسے بوڑھی ماں کا خیال آنے لگا، بہن کی فکر درد کو زیادہ کرنے لگی، اس کی آنکھوں کے سامنے نفرت کی لاش پڑی تھی۔ اس کے دل میں نفرت کروٹیں لے رہی تھی، وہ خود بھی ایک لاش تھا، اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرہ گھومنے لگا ہے۔ نرس گھوم رہی ہے۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ چارٹ پر سبز لکیر رینگتے رینگتے ۱۰۴ تک جا پہنچی۔ اب وہ اول فول بکنے لگا ـــ نعرے لگانے لگا۔ اللہ اکبر ـــ اسلام زندہ باد ـــ پکڑو، پکڑو، جلنے دو ـــ ماں ـــ فاطمہ ـــ فاطمہ ـــ تھو، تھو، ـــ نرس اس کے سر پر برف کی تھیلی رکھے تھی۔ وہ پریشان تھا ـــ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔

نمبر اکیس چڑھ گیا ـــ نمبر بائیس بک رہا تھا، اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا، ایکا ایکی نفرت انگارے بن کر اس کے چہرے پر نمودار ہوئی ـــ اس کا بس چلتا تو وہ نمبر بائیس کا گلا دبا دیتا ـــ نمبر بائیس کی حالت خطرناک ہو گئی۔ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

ہسپتال کے باہر سے جنازہ اٹھا۔ ہزاروں کا ہجوم تھا۔ نعرے بلند ہو رہے تھے، اللہ اکبر، شہیدِ قوم زندہ باد، اسلام زندہ باد۔ نعروں کی آواز کمرے میں سنائی دی ـــ سارے مریض سہم گئے ـــ نمبر اکیس زور زور سے ہنسنے لگا۔ قہقہے لگانے لگا۔ دیوانہ وار قہقہے ـــ باہر سے ہجوم کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ "فدائے ملت زندہ باد" ـــ "شہیدِ قوم زندہ باد"۔

شیر محمد اختر

غزل

بہت دنوں میں یہ عقدہ کھلا محبت پر
کہ زندگی کا بھی احساں ہے غم کی دولت پر

تو اس طرح تو نہ دیکھ ان وفا کے ماروں کو
یہ لوگ وہ ہیں جنہیں بس نہیں تھا قسمت پر

یہ اور بات ہے راس آ سکی نہ تیری وفا
مجھے گماں تو بہت تھا تری محبت پر

ترا خیال مجھے زندگی ہے، اے غمِ دوست
مگر یہ کیا، کہ ہے اک بار سا طبیعت پر

یہ سوتی جاگتی فصلِ بہار ہی کیا ہے
ابھی کچھ اور بھی عقدے کھلیں گے فطرت پر

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
گزر رہی ہیں گماں کیوں تری مشیت پر

تو اس طرح تو نہ لے مجھ سے وعدہ ہائے وفا
کہ حرف آتا ہے یوں عشق کی صداقت پر

نہ فرشِ گل، نہ ستارے، نہ انجمن، نہ چراغ
گزر گیا ہے وہ عالم بھی شامِ غربت پر

کبھی تو تیری بھی آنکھوں میں آئے ہونگے اشک
کبھی تو غور کیا ہوگا میری حالت پر

اختر ہوشیارپوری

مطبوعات

نام ونگ از عبدالمجید بھٹی

اُردو شاعری کے موجودہ دور میں بہت سے تجربے کئے جا رہے ہیں جن میں سے بعض کامیاب ہیں اور بعض ناکام لیکن اس کا فیصلہ ابھی قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ نام ونگ کی نظمیں خیال اور اسلوب کے تجربوں کی حامل یہ مجموعہ دو قسم کی نظموں پر مشتمل ہے۔ ایک وہ جن کی زبان ہندی آمیز ہے اور دوسری وہ جو اُردو میں ہیں۔ ہندی آمیز نظیر کی نظموں سے یقیناً زیادہ وزنی ہیں۔ دیباچے میں ابوالاثر حفیظ جالندھری فرماتے ہیں "عبدالمجید بھٹی کی شاعری تھوڑی ہی مدت بزم احباب، مشاعرہ، ریڈیو، رسائل کے مراحل طے کرتی ہوئی اب اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں اُس کو ہمارے ادب میں ایسی جگہ دینی پڑے گی جس پر پُرانے اور نئے شعرا اور اُن کے ناقدین بہت کچھ کہیں گے لیکن چار و ناچار نہ صرف اس طرز شعر کو گوارا کریں بلکہ اس راستے پر چلنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پائیں گے —" یہ خوش فہمی ایک مبارک فال ہے۔

سرورق، جلد، کاغذ اور طباعت بہترین — کتابت البتہ ناقص ہے اور سادہ اوراق پچیس تیس نظموں کو ضخیم کی کوشش کے غماز ہیں۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت تین روپے۔ پتہ:۔ سنگم پبلشرز۔ نسبت روڈ لاہور

تارو از ہنسراج رہبر

اُردو ادب کے جدید رُجحانات نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر مختصر افسانے کی طرف توجہ دی تو کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اِکّا دُکّا ناول اگر کہیں نظر بھی آتا ہے تو اس میں حقیقت سے گریز اور کردار نگاری میں اتنی خامیاں نظر آتی ہیں کہ جی بیزار ہو جاتا ہے۔ بعض اچھے ناولوں میں زبان قابل داد ہے تو خیال مغربی ادب سے مستعار ہے رہبر ہمارا نوجوان افسانہ نگار ہے جس نے زندگی کی بہت سی کڑی مہمیں سر کی ہیں اور اس کے ساتھ سیاسیات میں بھی پوری طرح لیا ہے۔ وہ ریاست میں پیدا ہو کر راجہ نہیں بنا — قیدی بنا اور یہی انگریزی علاقے میں اُسے مقدر ہوا۔ اس ناول میں اُس ریاستوں کے راجوں مہاراجوں کی محلاتی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ اسے اُس نے جیل میں لکھا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ کے رنگین تصوّرات سے اُس نے اپنے زندان کی تاریکیوں میں چراغاں کیا ہے — تارو ایک ایسی دیہاتی دوشیزہ کا کردار ہے دیہاتی نوجوان کے لئے پیدا ہوئی۔ لیکن اُس کے حُسن نے اسے رانی بنا کر محلوں میں پہنچا دیا۔

زبان اگرچہ کہیں کہیں قابل اصلاح ہے لیکن روانی کے اعتبار سے خوب ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، گرد پوش وغیرہ ضخامت ۲۷۴ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ پتہ:۔ اُردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور

مختصر نظمیں از مخمور جالندھری

بعض اوقات شاعر کے سامنے ایسے واقعات رُونما ہوتے ہیں اور اس کے ذہن میں ایسے خیالات بیدار ہوتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ ایک شعر یا چند مصرعوں پر پھیل سکتے ہیں اور اگر ان کو فنکار پھیلانا چاہے تو ان کی اہمیت میں فرق آ جاتا ہے۔ مخمور جالندھری کا یہ مجموعہ ایسے ہی خیالات پر مشتمل ہے۔ بعض خیالات نغمے میں ڈھلے ہیں اور نغمے کی قید سے آزاد اپنی اہمیت کو اُجاگر کر سکے ہیں۔ کہیں یہ شاعر فلسفی معلوم ہوتا ہے اور کہیں طنز سے کام لیتا ہوا مسکرا دیتا ہے پر لکتے ہوئے کہتا ہے ؎

آسماں سے تو یہ گنبد اچھا
جس سے باتوں کا جواب آتا ہے

یہ نظمیں یقیناً ہمارے جدید ادب میں اضافہ ہیں۔ ان خطوط میں رنگ بھرنا قاری کا اپنا کام ہے اور یہ تصنیف اہل...

کی متلاشی ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ناشر: مکتبہ کارواں جالندھر شہر

شب تاب از اسرار الحق مجاز۔ ہندوستانی ادیبوں کی بدقسمتی ہے کہ انہیں خدمت ادب کا صلہ پوری طرح نہیں ملتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اوچھے ہتھیار وں پر اتر آئیں اور اپنی تصانیف کے نام بدل بدل کر لوگوں کو دھوکہ دیں۔ فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کے مقدموں اور چند نظموں اور غزلوں کے اضافوں کے ساتھ مجاز کا پہلا مجموعہ "آہنگ" جو دوبار شائع ہو چکا ہے شب تاب کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس زیادتی میں ناشران بھی مصنف کے ساتھ ارتکاب جرم میں برابر کے شریک ہیں۔

مجاز کی یہ نظمیں بہت مقبول ہو چکی ہیں اور ہر قسم کے تبصرے سے بے نیاز ہیں۔ شاعر کی شبیہ کا خاکہ بھی شامل کتاب ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ ضخامت ۱۴۴ صفحات قیمت دو روپے چار آنے۔ ناشر ہندوستانی پبلشرز دہلی۔

مجھے خرید لو از شوکت تھانوی۔ اس مصنف کا نام سامنے آتے ہی یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ مزاحیہ نگار ہے اور اس کی متعدد تصانیف کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اپنے فن میں ایک ہے۔ دس مزاحیہ ڈراموں کا یہ مجموعہ اس کے مزاح کو ایک نیا پہلو دیتا ہے جہاں وہ مزاح کے ساتھ ساتھ زبان اور نفسیات دونوں سے کام لیتا چلا جاتا ہے۔ نام کی رعایت ہی سے نہیں ویسے بھی کتاب کا تقاضا یہی ہے "مجھے خرید لو"۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ کتابت طباعت خاصی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ ناشر ہندوستانی پبلشرز دہلی۔

ناہید آغا شاعر قزلباش دہلوی۔ آغا شاعر مرحوم نے زبان اور ادب کی کس حد تک خدمت کی ؟ یہ سوال اس کتاب کو دیکھتے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مرحوم نے جہاں غزل رُباعی نظمیں تراجم اور دوسری یادگاریں چھوڑی ہیں وہاں نثر میں بھی بعض بیش بہا اور غیر متوقع تصانیف سے اُردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔ ناہید آپ کا ایک ناولٹ ہے جس میں دوسری خصوصیات سے قطع نظر زبان اور اسلوب بیان کے وہ پہلو ہیں جو مرحوم کے نام سے وابستہ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ناولٹ آغا شاعر مرحوم کی بقائے دوام کے لئے ایک ایک اور یادگار ثابت ہوگا۔

ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ناشر ہندوستانی پبلشرز دہلی

ایک حمام میں از خواجہ محمد شفیع۔ دہلی کے اہل زبان اہل قلم میں خواجہ محمد شفیع کا نام پیش پیش ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خاندانی روایات کو اپنی تصانیف میں برقرار رکھا ہے۔ خواجہ صاحب کی نظر کہیں کہیں روایاتی حدوں کو توڑ کر آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے یعنی جگہ جگہ وہ بدنام ترقی پسندی کی حدوں کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ ناول زبان اور کردار نگاری کے اعتبار سے مطالعہ چاہتا ہے۔

ضخامت ۲۰۸ صفحات کتابت طباعت عمدہ قیمت دو روپے۔ ناشر ہندوستانی پبلشرز دہلی

گمنام خطوط از فراق اعظمی۔ ناول کو خطوں کے ذریعہ پیش کرنا انگریزی میں ایک قدیم طرز انشا ہے۔ اُردو میں بھی اس کے چند ایک نمونے معرض وجود میں آچکے ہیں۔ ان خطوط کو دیکھتے ہوئے خط کم اور مضمون نگاری زیادہ نظر آتی ہے کہیں کہیں تو فلسفی بننے کی کوشش کی ہے ویسے طرز تحریر خاصہ شگفتہ اور پاکیزہ ہے۔

ضخامت ۲۰۶ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ناشر ہندوستانی پبلشرز دہلی

موسیٰ از شہاب الدین یداللہی۔ حضرت موسیٰ کے حالات زندگی۔ فرعون کی ان سے ٹکر اور بنی اسرائیل کی رہنمائی پر ۳۱ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔ اس پمفلٹ کی غرض وغایت اور قیمت درج نہیں۔

شمسیہ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

اچھے خیالات مرتبہ راج سنگھ۔ ۹۶ صفحات میں مرتب نے دنیا کے مشاہیر کے اقوال کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کو قلمبند کیا ہے۔ اس قسم کی تصانیف انگریزی میں عام ملتی ہیں۔ اور ہر مذہب میں انھیں خیالات کو چراغ ہدایت بتلایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ راج سنگھ صاحب کی یہ کوشش ہمارے نوجوانوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر سکے گی۔ اور ملکی آزادی کے ساتھ ذہنی اور سماجی قرب کے لئے مد ثابت ہوگی۔ قیمت ۸ٓ پتہ:۔ امریکن بک ڈپو قلعہ گجر سنگھ لاہور

دنیائے شہرزاد از آنسہ محمودہ رضویہ۔ نکھرے ستھرے الفاظ میں مصنفہ نے اپنے سفر عراق کی تاریخ مرتب کی ہے جس میں نہ صرف حالات سفر درج کئے ہیں بلکہ قدیم اور جدید عراق کی پوری تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے انداز بیان نہایت سلجھا ہوا ہے اور واقعات نگاری سے پوری طرح کام لیا گیا ہے۔ اسلامی ممالک کی ترجمانی کے سلسلے میں یہ تصنیف مفید ثابت ہوگی۔ کتابت طباعت عمدہ۔ ضخامت ۲۶۷ صفحات قیمت دو روپے ناشر:۔ شعاع اُردو دارالاشاعت ہاسا سنگھ اڈرن سٹریٹ کراچی ۳

بچّوں کی کتابیں

پھلجڑیاں مخمورؔ جالندھری۔ ہندوستان کے بچے جہاں اور بہت سی ضروری دلچسپیوں سے محروم ہیں وہاں ادبی ذوق کی تربیت کے لئے بھی انھیں بہت کم مواد ملتا ہے۔ مخمور جالندھری ادبی حلقوں میں بڑی نامی کی حد تک مشہور ہیں۔ لیکن انھوں نے اس مجموعے کو پیش کر کے ایسا کام کیا ہے جو ہمارے ملک کے اکثر شاعروں سے نہیں ہو سکا۔ اس مجموعے کی نظمیں دس سے چودہ سال کے بچوں کے لئے معلومات آفریں ہی نہیں بلکہ زبان کے سلسلے میں بھی بہت سے نئے الفاظ دیتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مجموعہ بچوں کی تربیت کے سلسلے میں بہت کارآمد ثابت ہوگا اور بچوں میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل کرے گا۔

ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ پتہ:۔ مکتبہ کاروان۔ جالندھر شہر

بونوں کا قلعہ ۸ٓ **راجکماری چمپا** از راجہ مہدی علی خاں ۸ٓ **ہمارے آس پاس** ۸ٓ از غوث انصاری۔ یہ تینوں کتابچے بچّوں کیلئے لکھے گئے ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں بچّوں کی کتابوں کے لکھنے کے سلسلے میں بہت مشہور ہیں۔ پھول کے ادارے سے منسلک ہونے کی وجہ سے آپ کے قلم نے بچّوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ یہ دونوں کتابچے ان کے مخصوص انداز کی حامل ہیں۔ "ہمارے آس پاس" کا انداز بھی بہت اچھا ہے اور دس مختصر کہانیوں پر مشتمل ہے ہم بچّوں کے مطالعہ کے لئے ان کتابچوں کو بہت مفید سمجھتے ہیں۔

ناشر:۔ راج محل پبلشرز جموّں (کشمیر)

زردہ۔ بالوشاہی۔ قلاقند۔ گرم حلوا یہ چاروں کتابچے سید ابوتمیم فریدآبادی کی تصنیف ہیں جو بچّوں ہی کے لئے نہیں بڑوں کے لئے بھی مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں۔ ان میں موصوف نے مزاح کے ساتھ ساتھ اصلاحی پہلو بھی پیش نظر رکھے ہیں اور زبان کا چٹخارہ جو ان کی خصوصیت میں داخل ہے یقیناً قابل قدر ہے بچّوں کے لئے یہ تحفے دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہر ایک کی قیمت ۵ٓ ہے۔ اور بک ڈپو انجمن ترقی اُردو دہلی سے مل سکتی ہیں۔

نئی کتابیں!

روس انقلاب کے بعد

ازم، م، جوہر

زندگی کا مادی فلسفہ جب مذہب اور اخلاق کے ضابطوں سے آزاد ہو جائے تو وہ کتنا خونخوار اور سفاک ہو جاتا ہے اور انسانیت پر اس کے ہاتھوں کیا گزرتی ہے اس کو پوری تفصیل سے جناب م، م، جوہر نے اس کتاب میں پیش کیا ہے، روس میں انقلاب کے بعد کیا ہوا اسٹالن نے اپنے مخالفوں کو کس بیدردی سے تہس نہس کیا اور دیوِ استبداد مزدوروں کی ... میں کس طرح سرگرم کار رہے یہ سب حقائق جن کو روس کے حامی سختی سے ظاہر نہیں ہونے دیتے اور آج جنھیں جاننے کی اشد ترین ضرورت ہے اس کتاب میں اُن پر سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

لینن

ازم، م، جوہر

روس کے اشتراکی انقلاب کی روحِ رواں دراصل لینن کی شخصیت تھی لینن نے اس انقلاب کا منصوبہ سوچا ... پر چار کیا۔ اس کے لئے ساتھی ڈھونڈے اور آخر میں اس انقلاب کو کامیاب کر کے روس میں اشتراکی نظام قائم ... دنیا کی تاریخ میں روسیوں کا یہ کارنامہ آپ اپنی مثال ہے اور اس انقلاب میں لینن نے جو کچھ کیا وہ انسان کے یقین محکم، عمل پیہم اور بے پناہ محبت کا ایک ایسا نمونہ ہے جس پر انسانیت جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ یہ کتاب اس بے نظیر انقلاب کا ایک اجمالی مرقع ہے بمصنف کو انقلاب روس پر محض عبور نہیں بلکہ اُس سے حد درجہ خلوص بھی ہے اور وہ دل ... چاہتے ہیں کہ دنیا اس انقلاب کی لازوال خصوصیت کو سمجھے اور ان کی قدر پہچانے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے عہ

مولانا محمد علیؒ کے یورپ کے سفر

مرتبہ پروفیسر محمد سرور

مولانا مرحوم چھ بار یورپ تشریف لے گئے تھے۔ یہ کتاب ان کے اپنے لکھے ہوئے حالاتِ سفر کا مجموعہ ہے اس میں کہیں جہاز کے ساتھیوں کا تعارف ہے۔ کہیں مصر سے گزرتے ہوئے وہاں کی سیاسی تاریخ پر تبصرہ کر جاتے ہیں۔ دیارِ غیر میں خود کو تنہا پاتے ہیں تو اہلِ وطن کی بے مہریاں یاد آجاتی ہیں اور قلم سے خونِ دل کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں۔ لندن کی آزاد فضا میں اپنے ملک کی غلامی اور خود اپنی بے کسی ستاتی ہے تو دل میں ہوک سی اٹھتی ہے اور اپنا دردِ دل سنائے بغیر نہیں رہتے۔ یہ زندگی کے رنگین مناظر دیکھتے ہیں تو ان کی تصویر کشی میں بھی مطلق باک نہیں ہوتا۔ سادہ زبان، برجستہ فقرے، دلکش بیان اور پھر مضمون میں اتنا تنوع۔ ان چیزوں نے اس سفرنامے کو نہایت دلچسپ ادبی مرقع بنا دیا ہے قیمت دو روپے آٹھ آنے

ناشر جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر (دہلی)

سوشلزم اور اسلام

سوشلزم اور اسلام میں کون کون سی باتیں آپس میں ملتی ہیں۔ مسلمانوں کو کیوں سوشلزم کی طرف ... چاہیئے۔ سوشلزم اسلام کا منافی ہے؟ ان مسائل پر مشہور اہلِ قلم کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ۔

مرتبہ عبداللطیف اعظمی بی۔ اے قیمت ایک روپیہ

معاشیات قومی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں عہ، آدمی اور مشین ترجمہ محمد عاقل ایم۔ اے عہ، مشین اور مزدور ...

ہندوستان کا مستقبل ڈاکٹر راجندر پرشاد عہ، ہندوستان میں اجنبی راج پنڈت لال موہن عہ، ہندوستان کا مستقبل پنڈت لال موہن

چند دن لینن کے ساتھ میکسم گورکی ... عہ، مارکس اور ہندوستان کارل مارکس عہ، اجرتی محنت اور سرمایہ کارل مارکس

سندھ ساگر اکادمی۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور

Beautiful LAKES

The wide, green valley, studded with lakes, embedded in the lofty ranges of the Himalayas, gives to the poet, painter and philosopher background, inspiration & repose.

VISIT

KASHMIR

TRAVEL PARTICULARS FROM
THE DIRECTOR VISITORS' BUREAU, SRINAGAR

K7

سید منظور حسین بخاری پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲ - علمی وادبی، تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔
مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ۔

۳ - دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۴ - جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصُورتِ دیگر دفترِ "ہمایوں" خط وکتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ۔

۵ - "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتہً مِل سکتا ہے ۔

۶ - منی آرڈر اور خط وکتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چِٹ پرچے کے اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصُورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصُول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۔

مینیجر "ہمایوں"

۳۰۔ لارنس روڈ - لاہور

نمبر ۱۹ سکلہ

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: یوسف ظفر، بی۔ اے

بزمِ ہمایوں

یہ شمارہ سالِ رواں کا آخری شمارہ ہے اور یہ امر ہمارے لئے باعثِ عزّ و افتخار ہے کہ آئندہ شمارہ جوبلی نمبر ہوگا یعنی یہ کہ "ہمایوں" اپنی زندگی
یا سال پورے کرچکا ہوگا۔ کسی ادارے کی عمر بالخصوص جب اُس کے پیشِ نظر مخلصانہ خدمت اور جذبۂ ایثار ہو، پچیس سال تو کیا دس سال بھی
نان کے لئے ایک عجیب واقعہ ہے۔ یہاں کے انسانوں کی اوسط عمر پچیس چھبیس برس ہے چہ جائیکہ اس کا ایک ادبی ماہنامہ اس سن کو پہنچے۔ بہرکیف
ن قسمتی پر "ہمایوں" نازاں ہے کہ اس نے زندگی کی اتنی بہاروں میں حتی الامکان خدمت اور سرگرمی سے کام لیا اور ایک دن بھی تاخیر سے
ہوا۔ اس کی یہ باقاعدگی بھی ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر اس ملک کے اکثر ادارے پیش نہیں کرسکتے۔

آئندہ شمارہ جوبلی نمبر ہے۔ حکومتِ ہند ہمیں اس کی اجازت دے چکی ہے۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ کاغذ کے لئے ہماری درخواست
لردی گئی اور حکم ہوا کہ جتنا کاغذ ایک عام شمارے کے لئے صرف میں آتا ہے اس نمبر کے لئے اتنا ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کا
ہم پہنچایا جائے کہ ہم زیادہ کاغذ استعمال نہیں کریں گے۔ ہماری صدائے احتجاج کا جواب ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ لیکن ہمیں یقین ہے
ل حکومت کی آنکھیں نہیں تو کان ضرور ہیں اور ہم ناکام نہیں ہوں گے۔ اس نمبر کو کامیاب بنانے کے لئے سرتوڑ کوشش کی جارہی ہے۔ گوشتہ
ہنوں سے ہم برابر اعلان کرتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ مضامین تو اکثر وبیشتر وہی ہوں گے جن کی اطلاع آپ کو دی جاچکی ہے۔ نظمیں، غزلیں،
ے اور ڈرامے —— ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ جب تک ہم یہ نہیں جان لیتے کہ حکومت ہمیں کاغذ کتنا
لے ہم پہنچاتی ہے، ہمارا ہر اعلان قبل از وقت ہوگا۔ البتہ یہ امر یقینی ہے کہ ہم تمام ممکن مساعی سے اس نمبر کو ہر اعتبار سے حسین، اور
ررعنا بنائیں گے۔ تاکہ یہ یادگار دیرپا اور زندگی بخش ثابت ہو۔ ہمایوں کی عصر آفرینی مثالی بن چکی ہے اور اس کی نقرئی جوبلی اسی قدر عصر آفریں
بدقسمتی سے ہم حکومت کی شریعت کے پابند ہیں ورنہ ہمیں یقین تھا کہ ہم اس نمبر کے ساتھ ساتھ ہمایوں کا پچیس سالہ انتخاب بھی شائع کرتے
ابھی تک حوصلہ نہیں ہارا اور حالات کے ساعد ہوتے ہی اس کارِ نمایاں کی طرف متوجہ ہوں گے۔

دو اور مضامین کا ذکر بھی جو اس نمبر کے لئے خاص طور پر لکھے جارہے ہیں ہمارے قارئین کے لئے باعثِ مسرت ہوگا۔ ہمارے محترم سر
اِلقادر صاحب بالقابہ نے ہماری درخواست پر "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے اُردو ادب کے بعض مرحوم ادیبوں کی زندگیوں کو اپنی ملاقاتی
سے دیکھ کر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی یہ کاوش اس نمبر کے حسن و پائندگی کو استقامت دینے میں اعانت کرے گی۔ ہمارے نوجوان ادیب
ر محمد عثمان صاحب ایم۔ اے (اُردو) ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اُردو کی پچیس سالہ زندگی پر نظر ڈال رہے ہیں۔ یہ مضمون
یات آفریں ہوگا۔

نظموں میں حضرت جوش ملیح آبادی۔ حضرت فراق گورکھپوری۔ حضرت علی منظور۔ حضرت اکبر القادری۔ جناب احمد ندیم قاسمی۔ حضرت
ری۔ حضرت قیوم نظر۔ حضرت حفیظ ہوشیارپوری اور دوسرے شعرائے کرام کا کلام موصول ہوچکا ہے۔ بعض دوسرے مشہور شعرا
ی توقع ہے۔

ہمیں کامل وثوق ہے کہ یہ نمبر ادبِ اُردو کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل کرے گا۔

یوسف ظفر

جہاں نما

نئی مرکزی حکومت سے ہماری توقعات

مغلیہ خاندان کے زوال سے آج تک ہندوستان کی تاریخ میں جو واقعات رُونما ہوئے انھیں ہمارے مورخین ہماری عقلی کم مائگی اور ذہنی پستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان کے لئے غیر ملکی حملہ آوروں کو ذمہ دار بتاتے ہیں۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ ملک کی اندرونی مخاصمتیں، مرہٹوں کی جواں ہمت اور مغلوں کی زوال پذیر طاقت کی ٹکر، احمد شاہ ابدالی کا حملہ، انگریزوں کی تجارتی اغراض کا شہنشاہیت کے روپ میں پنپنا، سلطان ٹیپو کی شکست، ۱۸۵۷ء کا انقلاب اور ملک میں جہالت اور پس ماندگی کا دور دورہ ایسے ہی واقعات کا آئینہ دار بنتا ہے جو ہماری تاریخ کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ کچھ مغرب کا اثر اور کچھ مشرقی علم و ادب کا احیا، اس ذہنیت کا خالق ہے جو اب ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں ہمارے ملک نے ایک کروٹ لی اور سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ ہندوؤں نے مغلوں کی محکومی پر انگریزوں کی محکومی کو ترجیح دی۔ اور فوراً اس کے اشاروں پر چلنے لگے۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں جب انگریزی تعلیم دی جانے لگی تو مسلمان اپنی شکست خوردہ ذہنیت کا احساس لئے اس کی طرف مائل نہ ہوئے۔ اور ہندوؤں نے مدرسوں اور مکتبوں کا رُخ کیا اسے سرسیدؒ کی دوررس نگاہوں کا کرشمہ سمجھئے کہ انھوں نے وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے اکسایا اور ایک ایسے مکتبِ خیال کی داغ بیل ڈالی جس نے مسلمانوں کے رجعت پسند اور لکیر کے فقیر طبقے کو شکست دی۔ ان سیاسی جماعتوں کی کشاکش ایک مبسوط تاریخ کی طالب ہے۔ ہمارے سامنے اس کشاکش کے نتائج ہیں جن سے ہمیں اس وقت سروکار ہے۔ بین الاقوامی سیاست یا ملک کے حالات اور سیاسی کروٹ نے کچھ بھی ہو، غیر ملکی حاکم کو وہ مراعات دینے پر مجبور کیا ہے جو اس وقت ہندوستان کو حاصل ہوئی ہیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ جو کچھ ہندوستان کو انگریز حاکم سے ملا ہے وہ ساٹھ ستر سال کی لگاتار محنت کا قرار واقعی ثمر ہے یا نہیں؟ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اب جو کچھ ہمیں ملا ہے اس کا بہترین مصرف کیا ہے اور وہ سیاسی جماعتیں جو برسرِ اقتدار آئی ہیں اس بدقسمت ملک کو دنیا کے متمدن ممالک کی صف میں کیسے لاسکتی ہیں۔ چنانچہ ہم اپنی توقعات کو ان کے سامنے لاتے ہوئے اُمید کرتے ہیں کہ وہ کام جس کی توقع ہمیں غیر ملکی حکمرانوں سے نہیں ہو سکتی اُن سے ہوگا اور ہمارے ملک کا مستقبل زیادہ روشن اور پائیدار ہوگا۔

ہر انسان کی طرح ہر قوم اور ہر ملک کا ایک شعور ہوتا ہے جسے سیاسی اور علمی نظر جلا دیتی ہے۔ ہندوستان کی تعلیمی حالت بے حد ناقص ہے۔ چنانچہ اس کا قومی و ملکی شعور بھی اسی اعتبار سے ماند ہے۔ ہمارے لوگ بھیڑ چال کے عادی ہیں اور جنھیں کچھ ایک معتبر انسان کا ضمیر کہتا ہے اس پر وقتی طور پر کاربند ہو جاتے ہیں۔ ایسی قوم میں ایک دوراہے پر کھڑی ہوتی ہیں جو کامرانی یا نامرادی کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسے وقتوں میں یا تو قوم انتہائی قعرِ مذلت میں گر جاتی ہے جہاں سے صدیوں تک اس کی صدائے بازگشت نہیں آتی یا ایسے بلند مقاصد کی طرف گامزن ہو جاتی ہے جو صدیوں تک اُسے زوال کی طرف رُخ نہیں کرنے دیتے۔

ہندوستان کے عوام اس وقت اندھیرے میں ہیں۔ یہ کام اُن اہلِ بینش کا ہے کہ وہ انھیں روشنی بہم پہنچائیں۔ جو نہ صرف

صحت عامہ دماغی صحت کا پیش خیمہ ہے۔ مرکزی حکومت کو بہتر انسان کی جستجو میں یہ پہلو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ بڑے بڑے شہر
ماں کو لعض قسم کے جراثیم جسموں میں سانسوں کے ذریعے داخل ہوتے ہیں۔ وہاں ناقص اور ملاوٹی خوراک ان کے باشندوں کو موت
سے قریب تر کر دیتی ہے۔ دوسرے ممالک میں جہاں انسان کی اوسط عمر ساٹھ اور ستر برس سے متجاوز ہے وہاں ہندوستان میں پچیس
چھبیس سال کی عمر اوسط ہے کیونکہ بیماری بڑھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ملک میں چالیس ہزار باشندوں کے لئے ایک ڈاکٹر میسر آئے وہاں
کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ سرکاری ہسپتالوں کے ساتھ ساتھ موجودہ ہسپتالوں پر ایک گہری نظر کی ضرورت ہے جہاں سرمایہ داروں کے لئے
مراعات روا رکھی جاتی ہیں اور غربا کے ساتھ بے مہری اور سوتیلے پن کا سلوک کیا جاتا ہے۔

یہ اور ایسے ہی مسائل ہندوستان کی مجموعی حالت کو بہتر بنانے کے لئے فوری طور پر ضروری ہیں۔ اس ملک کا کوئی ایک شعبہ
ایسا نہیں جس سے اطمینان حاصل ہو سکے۔ تعلیم۔ صحت عامہ۔ زراعت۔ صنعت و حرفت، معدنیات، تعمیرات، ذرائع آمد و رفت
غرض تمام پہلو ایک نئی زندگی کے طالب ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مرکزی حکومت جسے عوام کی تمام تر ہمدردیاں حاصل ہیں ملک کے لئے
مسیحا نفس ثابت ہوگی۔ ہندوستان کو چھوٹے پیمانے پر ایک برّاعظم کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نئی حکومت کا فرض ہے کہ اس برّاعظم کو ہر
ممکن طریقے سے خود کفیل اور خود نگر بنائے۔ اس کے باشندوں کو مذہبی رواداری اور ربط و تعاون کی تعلیم دے اور اسے وہ امن و
سربلندی نصیب ہو، جس کے افسانے تو سننے میں آتے ہیں۔ لیکن وجود عنقا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں ورثہ
میں وہ جہالت عطا کی گئی جس کا کفارہ ابدی غلامی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

یوسف ظفر

آہ صاحبزادہ محمد عمر!

ناٹک ساگر کی تصنیف کے شریک اور اردو ڈرامہ کے احیاء کے شریک غالب صاحبزادہ محمد عمر نے
۳۰ اکتوبر کو اپنے معبود کی دعوتِ وصال کو لبیک کہا اور اپنے رفیق کار منشی نورالٰہی (مرحوم) سے جا ملے۔ منشی جی
کی معیت میں انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اور ان کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک خاموش رہے۔ آخر العمر میں
انہوں نے پھر ادب کی طرف رجوع کیا اور اپنے ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ صاحبزادہ مرحوم بہت خوش خلق اور
یادگار زمانہ اصحاب میں سے تھے اور اُن سے مل کر حالی کا یہ مصرع یاد آ جاتا تھا۔ ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ہمیں مرحوم کی وفات سے دلی رنج ہوا۔ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں لے اور اُن کی اولاد
کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔

قدیم اُردو (دکھنی) میں تاریخ کا ذخیرہ

اگرچہ قطب شاہی، عادل شاہی اور عہد آصفی کے قدیم مورخوں نے اپنی تاریخی کتابیں فارسی نثر میں قلمبند کی ہیں۔ لیکن اس کے دکھنی یا قدیم اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی ہم کو تاریخ کا بیش بہا ذخیرہ ملتا ہے۔ نظم اور نثر دونوں قسم کی کتابیں ہوتی ہیں۔ اولاً ہم تاریخ اور سوانح کی ان کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو نظم میں لکھی گئی ہیں۔

واضح ہو کہ تاریخ اور سوانح کا موضوع ایسا ہے جس کے لئے نثر ہی زیادہ موزوں ہے۔ لیکن موزوں طبعی اُس کو نظم کر کے ہی لذت گیر ہوتی ہے۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ دکھنی شعرا کے پیش نظر فارسی تاریخی نظموں کا نمونہ موجود تھا۔ لیکن وہ اپنی عشق کی مثنویوں کی طرح ان کا ترجمہ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کو تاریخ کے لئے اپنے اپنے خیالات نظم نا تھے۔ یہ امر قابل تحسین ہے کہ ا اس قسم کی کوشش ابتدا ہی سے شروع کر دی تھی۔ گو یہ صحیح ہے کہ ان کی ابتدائی کوشش نقش اوّل ہونے کے لحاظ سے بہت کچھ کی حامل ہے اور صحیح طور پر تاریخی مصالحہ پیش نہیں کرتی۔ لیکن اس کے بعد جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ تاریخی حیثیت سے بھی رکھتی ہیں۔

تاریخ اور سوانح سے متعلق اس وقت تک جو مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں ان میں سے مشہور یہ ہیں۔

ابراہیم نامہ۔ علی نامہ۔ تاریخ سکندری۔ توصیف نامہ۔ اسرار عشق۔ روضۃ الانوار۔ اعجاز احمد۔ روضۃ ا ریاض مسعود۔ ہشت بہشت۔ محبوب القلوب۔ ریاض الجنان وغیرہ۔

اب ہم ان میں سے بعض کا تعارف کراتے ہیں۔

(۱) ابراہیم نامہ ——— یہ مثنوی بیجاپور کے شاعر عبدل کی تصنیف ہے اور ۱۰۱۳ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ اس مثنوی عادل شاہ کے زمانہ کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ نقش اوّل کی حیثیت ہے اس لئے پوری تاریخ نہیں ہے۔ بلکہ صرف چند کئے گئے ہیں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جس طرح قصیدہ نگاری ہوتی تھی اسی طرح مثنوی میں قصیدہ لکھا گیا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کی ا اس کی سخاوت کا حال، درباری شان و شوکت شہر بیجاپور کی تعریف، اس کی آراستگی، رقاصاؤں کی جلوہ گری، نورس محل کی ابراہیم عادل شاہ کا شکار کو جانا ہاتھیوں اور گھوڑوں کی تعریف سلحداروں کا حال باغ کی تعریف، موسم بہار کا تذکرہ، بادشاہ کی سالگرہ کے حالات اور ملازمین حرم کا مہ

اس طرح اگرچہ یہ مثنوی ایک قصیدہ کی طرح زیادہ تر بادشاہ کی تعریف و توصیف پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے ابرا شاہ کے زمانہ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے تاریخ سے موسوم کرنا بیجا نہیں ہو سکتا۔

(۲) علی نامہ ——— اس مثنوی کے متعلق ہم نے رزمیہ مثنویوں کے ضمن میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ طرح رزمیہ مثنوی ہونے کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اس طرح تاریخی حیثیت سے بھی اس کو اہمیت حاصل ہے۔ اس میں علی ثانی کے زمانہ کی جنگوں اور فتنہ و فساد کا حال نہایت تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اور جو تاریخی مسالہ اس مثنوی میں ملتا ہے وہ تاریخی کتابوں سے کم درجہ کا نہیں ہے۔ بلکہ ایک حیثیت سے اس کو اہمیت بھی حاصل ہے۔

علی عادل شاہ ثانی جب ابراہیم کے انتقال پر ۱۰۷۰ھ میں صرف اٹھارہ سال کے سن میں بیجاپور کی مسند حکو

ء بنا تو یہں کی سلطنت کے حدود نہایت وسیع تھے ۔ بحرِ عرب سے خلیج بنگال تک عادل شاہی قلمرو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف بمبئی علاقے کنارا اور دھارواڑ تھے تو دوسری طرف میسور کا بہت بڑا حصّہ عادل شاہی سلطنت میں شامل تھا۔

بادشاہ کو نوجوان دیکھ کر اگر ایک طرف مغلیہ حکومت نے بیجاپور کا رُخ کیا تو دوسری طرف خود بیجاپور کے پروردہ سیواجی نے عت سے انحراف کیا اور عادل شاہی قلمرو پر دست درازی شروع کر دی۔ ان کے علاوہ خود عادل شاہی امیروں کے مُنہ میں بھر آیا۔ نوجوان بادشاہ کو دیکھ کر حسد اور رقابت کی آگ شعلہ زن ہو گئی۔ بغاوت اور شورش پھیل گئی۔ مگر یہ علی عادل شاہ ہی لی تھا کہ اس نے ان تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا اور نہ صرف ان مقابلوں میں کامیاب ہوا بلکہ نئے اتنے بھی فتح کئے اور اپنی سلطنت کو وسیع تر کر لیا۔

نصرتی نے "علی نامہ" میں ان تمام واقعات کو نہایت کامیابی سے نظم کیا ہے۔ "علی نامہ" کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نعات کا اظہار نہایت صداقت سے کیا گیا ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کے متعلق مولانا ڈاکٹر عبدالحق کے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں۔

> "تاریخ سے واقعات کو ملا لیجئے کہیں فرق نہ پایئے گا۔ بلکہ بعض باتیں شاید اس میں ایسی ملیں گی جن کے بیان سے تاریخ قاصر ہے۔ باوجود اس کے واقعات کی تفصیل۔ مناظرِ قدرت کی کیفیت، رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ کمالِ فصاحت و بلاغت اور صناعی سے کھینچی ہے۔"

غرض کہ علی نامہ کو تاریخی حیثیت سے بلند درجہ دیا جانا چاہیئے۔

(۳) تاریخ اسکندری ـــــ اس تاریخ میں سکندر عادل شاہ کے ابتدائی حالات درج ہیں۔

علی عادل شاہ کے مرنے پر اُس کا لڑکا سکندر جو صرف چار سال کا تھا بیجاپور کی مسندِ حکومت پر متمکن کیا گیا۔ خواص خاں اور لول خاں کا جو عادل شاہی اُمراء تھے آپس میں نفاق ہو گیا۔ ان میں سے ہر ایک نے اس امر کی کوشش کی کہ حکومت کی باگ پنے ہاتھ میں رہے۔ سیواجی بغلی دشمن تاک ہی میں تھا۔ یہ عادل شاہی قلمرو میں گھُس کر قلعے پر قلعے فتح کرنے لگا۔ بہلول خاں نے یواجی کا مقابلہ کیا۔ سیواجی ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی شکست کھا کر فرار ہو گیا۔

تاریخ اسکندری میں ان ہی واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔

سوانح عمری کی حیثیت سے کئی ایک مثنویاں قابلِ تذکرہ ہیں۔

(۱) توصیف نامہ ـــــ یہ گولکنڈہ کے شاعر فیروز کی تصنیف ہے۔ اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے کچھ حالات۔ مناقب ور کرامات کا تذکرہ ہے۔

(۲) اسرارِ عشق ـــــ یہ ضخیم مثنوی میاں عبدالمومن کی تصنیف ہے اور ۱۰۹۲ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ اس میں سید محمد (جونپوری) بانی فرقہ مہدویہ کے حالات نظم کئے گئے ہیں۔ یہ مثنوی اس حیثیت سے اہم ہے کہ اس کے پہلے کوئی مثنوی ایسی ضخیم سوانح عمری کے متعلق دکھنی زبان میں مرتب نہیں ہوئی ہے۔ یہ مثنوی سید محمد جونپوری کے حالات و واقعات میں معتبر قرار دی جاتی ہے۔

(۳، ۴) روضۃ الاطہار اور اعجازِ احمد ـــــ یہ دونوں مثنویاں حیدرآباد کے مشہور شاعر رشید کی تصنیف ہیں۔ ان رشید کو دکنی ادب کی دکھنی زبان کی سب سے آخری کڑی قرار دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بعد جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ دکھنی زبان میں نہیں بلکہ شمالی ہند کی اُردو میں ہیں۔

روضۃ الاطہار ——— میں زمرِ شہدا کے واقعات کا ذکر ہے بلکہ بعض پاک کی ولادت [illegible] واقعات بھی نظم کئے گئے۔ معجزوں کا بھی بیان ہے۔ شیدا نے اس کو کسی فارسی مثنوی سے ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ یہ اُس کی تصنیف ہے۔

روضۃ الاطہار کے بعد شیدا نے اعجاز احمد تصنیف کی۔ یہ مثنوی آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک پر مشتمل ہے۔ واضح ہو کہ عربی میں سیرت نگاری کی ابتدا امام زہری سے ہوئی جو بنی اُمیہ کے دور حکمرانی میں تھے۔ عربی میں جو ذخیرہ سیرت مقدسہ کا ہے کسی اور [illegible] کے متعلق کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ عربی مورخین نے تاریخ کے متعلق جو جانچ پڑتال کی اسی طرح انہوں نے بھی حدیثوں کی جانچ کا طریقہ اختیار کیا تھا مگر دکھنی زبان کی ابتدائی سیرتوں میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ واقعات کے بیان کرنے میں غیر معتبر حدیثوں سے کام لیا گیا ہے۔ جس طرح اس زمانے میں نظم میں داستانیں لکھی جاتی تھیں اسی نہج پر اس کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیرت مقدس میں یہ تصنیف اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۵) روضۃ الانوار ——— یہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔ اس میں بھی زیادہ تر ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن میں افسانہ کی طرح دلچسپی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے شعرا بھی اسی قسم کے واقعات پیش کرتے تھے۔ جس سے عام طور پر دلچسپی لی جاتی تھی۔

(۶) ہشت بہشت ——— یہ بھی آنحضرت کی سیرت مبارک پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ مثنوی باقر آگاہ کی تصنیف ہے۔

باقر آگاہ ارکاٹ کے مشہور و معروف شاعر تھے جنھوں نے دکھنی زبان میں متعدد مثنویاں لکھی ہیں اور قصاید و غزلیات وغیرہ بھی اپنی یادگار میں چھوڑا ہے۔ ان کی تصنیف شدہ کتابوں کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔

آگاہ نے اپنے زمانہ کے ماحول کے خلاف قصہ کہانیوں کی کتابوں کے بجائے عقاید، فقہ، اور سوانح عمری کو اپنا موضوع قرار دیا تھا اور ان ہی عنوانوں پر کئی مثنویاں مرتب فرمائیں۔

ہشت بہشت کے علاوہ محبوب القلوب اور ریاض الجنان بھی سوانح عمریاں ہیں۔ ایک میں شیخ عبد القادر جیلانی کے حالات اور دوسری میں اہلبیت رسالت اور ازواج نبی کے حالات کا تذکرہ ہے۔

ہشت بہشت کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں غیر معتبر حدیثوں کو پیش نہیں کیا گیا ہے اور پھر سیرت مقدس کے بیان میں زیادہ تر آپ کے اسوۂ حسنہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جنگوں کے حالات نہایت مختصر لکھے ہیں۔ اسوہ نبی کو اہمیت دے کر اس کا حال شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔

آگاہ اس امر سے واقف تھے کہ سیرت رسول میں آپ کے اخلاق و عادات ہی اُمت کے لئے چراغ ہدایت ہیں۔ ان کی پیروی کا لحاظ اور عمل بہترین زندگی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

دکھنی نثر کی تاریخی کتابوں میں حیدر نامہ اور جنگ نامہ قابل تذکرہ ہیں یہ دونوں کتابیں حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے متعلق ہیں ان ہی کے حالات اور واقعات پر مشتمل ہیں۔

دکھنی زبان کے تاریخی ذخیرہ پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ نثر کی بہ نسبت نظم کی کتابیں زیادہ ہیں اور یہ کتابیں واقعات [illegible] کے حالات کے ساتھ ساتھ سوانح پر بھی مشتمل ہیں۔ تاریخ یا سوانح سے جو مثنویاں متعلق ہوتی ہیں ان میں واقعہ نگاری اور [illegible]

نگاری اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نگاری کے لحاظ سے کہاں تک پوری اترتی ہیں اور ان میں کس طرح حقیقت نگاری کی گئی ہے۔ دکھنی مثنویوں کو اس نقطہ نظر سے جانچا جائے تو ہمیں ناکامی نہیں ہوتی۔ کئی مثنویاں اس حیثیت سے قابل ستائش ہیں۔

جو مثنویاں سیرت سے متعلق ہیں ان کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے مصنف اپنے ماحول سے متاثر ہیں۔ انھوں نے روایت اور درایت کا لحاظ نہیں کیا۔ اور پھر اس زمانہ میں یورپین طرز پر سیرت نگاری نہیں ہوتی تھی۔ تنقید کا پہلو نظر انداز ہوتا تھا۔ حدیثوں کے متعلق پوری تحقیقات دکھنی زبان کے مصنف نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود باقر آگاہ کی تصانیف سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اس زمانہ کے خلاف ایک جدت کی تھی اور اپنی مثنویوں میں جداگانہ طرز سیرت نگاری اختیار کیا تھا۔ چونکہ آگاہ عربی اور فارسی کے زبردست عالم اور ان زبانوں کے شاعر بھی تھے اس لئے انھوں نے سیرت کی تصنیف میں عربی کتابوں سے مواد فراہم کیا ہے۔ انھوں نے اس امر کا تذکرہ کر دیا ہے کہ ان سے پہلے شیدا اور ولی ویلوری نے جو کتابیں سیرت کے متعلق لکھی ہیں وہ غیر معتبر حدیثوں اور غلط واقعات پر مشتمل تھیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں عربی کی معتبر کتابوں کو ماخذ بنایا ہے۔ آگاہ کی تصنیف زمانہ دراز تک کئی مرتبہ شائع ہوئی ہے اس کی یہ مقبولیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ آنحضرت کی سیرت نگاری کا جو کام آگاہ نے شروع کیا تھا اس کو ان کے خاندان کے دوسرے فرد مولوی صبغۃ اللہ المخاطب قاضی بدرالدولہ نے اپنی تصنیف کے ذریعہ جو نثر میں ہے تکمیل کو پہنچایا ہے۔ چونکہ یہ کتابیں دکھنی زبان میں نہیں بلکہ زمانہ مابعد کی زیادہ فصیح اور صاف زبان میں ہیں۔ اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

بہرحال دکھنی زبان میں جو تاریخی ذخیرہ ہمدست ہوتا ہے وہ ناقابل التفات نہیں ہے اور ان کو غیر معتبر قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مورخین اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اور ان کو اُن سے دکن کی تاریخ کے لئے اچھی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

تنہائی

کوئی خواہش کوئی حسرت ہی نہیں ۔!
اک سکوں ۔۔ ایک جمود
چھا گیا وسعتِ احساس کی حد بندی پر ۔!
قبر تاریک کی مانند شبستانِ وجود
بے نیازِ شبِ تاریک ہے، بیگانۂ تنویرِ سحر ۔۔!!
اب بھی اٹھتی تو ہے ہر منظرِ رنگیں پہ نظر ۔!
صرف باقی ہے شعور ۔۔
جیسے جذبات میں شدت ہی نہیں،
کسی اقدام کی جرأت ہی نہیں ۔۔!!
ہچکیاں آنے لگیں ۔!
رو رہا ہے کوئی احساس کی حد بندی سے دُور ۔۔!!!

کمال احمد صدیقی

باقیات

مٹا داغِ ہستی، نشاں رہ گیا — بجھی آگ باقی دھواں رہ گیا

اُڑا لے گئی ہوش بانگِ جرس — کہاں میں، کہاں کارواں رہ گیا

کھلا پرفشانی سے میرے یہ گل — قفس اُڑ گیا، آشیاں رہ گیا

بہت رازِ ہستی کے درپے رہے — مگر یہ نہاں کا نہاں رہ گیا

ہُوا طے کسی سے نہ یہ مرحلہ — یہاں کوئی، کوئی وہاں رہ گیا

کسی کو خموشی نے ٹھنڈا کیا — کوئی ہو کے گرمِ فغاں رہ گیا

ہوئی حشر میں بھی نہ کچھ بازپُرس — مرا آج بھی امتحاں رہ گیا

گئی زندگانی جوانی کے ساتھ — تماشائے وہم و گماں رہ گیا

مگر اپنی ہستی تھی حرفِ غلط — مٹا نام باقی نشاں رہ گیا

نہیں کوئی وعدہ وفا کے لئے — فقط اب تو لطفِ زباں رہ گیا

ہوئی بزمِ جاناں میں اُس کی طلب
تپش آج جانے کہاں رہ گیا

تپش (مرحوم)

غزل

میرے افکار پریشاں ہیں دبستانوں میں
میرے اشعار پرافشاں ہیں پری خانوں میں

یہی قندیل سرِ گور دھواں دیتی تھی
یہی قندیل کہ روشن ہے شبستانوں میں

اس کے بادصف کہ شبنم کی ہے بارش پیہم
آتشِ لالہ سُلگتی ہے بیابانوں میں

شاید ایسے میں تصور کا کنول روشن ہو
سائے گھرے ہوئے جاتے ہیں خیابانوں میں

تیشۂ فکر کے جوہر میں نہاں تھا وہ صنم
ڈھونڈتا تھا میں جسے جا کے صنمخانوں میں

شمع کہتی ہے مجھے ذوقِ تجلّی کی قسم
سوز کمیاب ہے اس دور کے پروانوں میں

ابھی پنہاں ہے کسی گوشۂ دل میں تیری یاد
ابھی ہلکی سی کسک ہے مرے افسانوں میں

میری پلکوں کے در و بام یونہی بند نہیں
تیری تصویر ہے آنکھوں کے سیہ خانوں میں

عمر بھر تیری خدائی کا رہا میں منکر
نہ بٹھا داورِ محشر مجھے انسانوں میں

سید عابد علی عابد

قیدی ملاقات کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پیچھے تلے قدم اُٹھاتا وہ کچھ سوچ رہا تھا اس کے چہرے پر بیتابی کے آثار تھے ——— وہ
ـــ اُلجھن میں تھا۔

ملاقات کا کمرہ جیل کی بڑی ڈیوڑھی میں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے کے عین سامنے تھا، ڈیوڑھی کے بڑے آہنی دروازوں پر دونوں
ہر وقت سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا۔ کوئی شخص بلا اجازت اندر آجا نہ سکتا تھا — اکثر تو کوئی شخص سپاہیوں کی معیت میں اندر لایا
یک دروازہ کھلتا اور بند ہو جاتا، پھر دوسرا دروازہ کھلتا اور قیدی کے پیچھے بند ہو جاتا، قیدی جیل کے وسیع احاطے میں
اتا۔ کسی چھوٹے سے غلیظ سے کمرے میں بند کر دیئے جانے کے لئے، جہاں خدا جانے اسے کس وقت تک رہنا ہوتا ——— تین
وہ بھی ایک ایسے ہی کمرے میں تھا۔ کئی بار اس کے سامنے یہ دروازے کھلے اور بند ہو گئے، اور جیل کا احاطہ کئی انسانوں کو
کر جاتا، پہلی دفعہ کے بعد وہ صورتیں نظر ہی نہ آئیں ——!

صبح ہی اُسے بتایا گیا تھا کہ کوئی عورت اُسے ملنے آرہی تھی اور وہ صبح سے یہی سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کون عورت ہو سکتی تھی۔ یہی
اُلجھن کا باعث تھا۔ وہ اپنے دماغ پر زور دے رہا تھا۔ اپنی یادداشت کے پرانے ذخیرہ کو کرید رہا تھا۔ لیکن اس کی مشکل حل
۔ اسے کوئی ایسی عورت یاد نہیں آرہی تھی جو اسے جیل میں ملنے آسکتی ہو۔ اور پھر ان دنوں کسی کو ملنے کی اجازت بھی تو نہ تھی پچھلے
ں اس کے اپنے رشتہ داروں کی درخواست نامنظور ہو گئی تھی —— ان سب باتوں کا فیصلہ اگرچہ جیل کے باہر ہوتا تھا، مگر کسی نہ کسی
ن سلاخوں کے اندر بھی پتہ چل ہی جاتا تھا ——— مگر اب، یہ عورت!

"ایک عورت!" اس نے دل میں یہ لفظ دہرایا، جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو۔ اس کی زندگی میں عورتیں ہی کتنی داخل ہوئی تھیں،
ئی اسے ملنے آتا، وہ فطرتاً کچھ کم آمیز واقع ہوا تھا۔ اس کے تعلقات بھی محدود تھے۔ اور یہ سب اس کے اپنے خیالات کی وجہ سے
شروع ہی سے ایک بات اس کے ذہن میں چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ تھی ایک سیاسی زندگی، مشکلوں، مصیبتوں اور قید و بند سے
زندگی میں اس کا مقصد تھا، وہ اپنی زندگی کو پابندیوں سے نجات دلانے کیلئے وقف کر چکا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ آیا۔ اور اپنے کمرے میں چلا گیا، جہاں وہ عورت انتظار کر رہی تھی۔ اسے وارڈر نے یہی بتایا تھا کہ وہ سپرنٹنڈنٹ
ے میں تھی۔ اس نے آنے والی کے متعلق وارڈر سے پوچھا تھا کہ وہ کس قسم کی عورت تھی ——— "سیاہ سے رنگ کی، دُبلی پتلی عورت!"
ر اس سے زیادہ کچھ بھی نہ بتا سکتا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کون تھی، اور اسے اجازت کیسے مل رہی تھی؟

"سیاہ سے رنگ کی، دبلی پتلی عورت!" اُلجھن اور زیادہ ہوتی جا رہی تھی، اس کے ماتھے پر شکن آگئے۔ اس کی آنکھوں میں اُس کے
ب کا اظہار تھا۔ آخر اس عورت کو کیا ضرورت تھی کہ اس کے پاس آتی، یہ سب مصیبت مول لیتی۔ وہ اس کا جواب
ڈھونڈنے سے قاصر تھا ———

"ضرورت!" اس کے دماغ میں ایک خیال سا لہرا گیا، 'عورت' 'سیاست' —— ! سیاست میں عورتوں کو اکثر استعمال کیا گیا تھا۔ اسے
ایسی عورتوں کی داستانیں یاد آرہی تھیں —— ہو سکتا ہے وہ بھی کوئی ایسی ہی عورت ہو جیسے —— جیسے ماتا ہری تھی۔ آخر اسے

اجازت کس طرح مل رہی تھی، ضرور کوئی بات تھی، ——— لیکن خود ہی دماغ اس کے خیالات کو جھٹلا دیتا۔ ماہری، وہ خوبصورت رقاصہ جس کے جسم کے ہر خم نے سیاسیات وقت کا رُخ پلٹ دیا۔ جس کے تھرکتے ہوئے جسم نے سیاسیات میں ہلچل بپا کر دی ——— وہ حسین عورت! مگر وہ بھی در تو کہہ رہا تھا کہ یہ سیاہ سے رنگ کی عورت تھی۔ دُبلی پتلی، ایک لفظ بھی تو اُس نے ایسا نہ کہا تھا، جس سے ظاہر ہوتا کہ اس میں ذرا سا بھی حسن تھا اور پھر اس سے کسی راز کے افشا ہونے کا امکان تھا۔

وہ ایک غریب خاندان کا فرد تھا، غریبی اور دست نگری کے دکھوں کا اسے خوب اندازہ تھا۔ اُس کی زندگی بہت سے تلخ واقعات اور داستانوں کا مجموعہ تھی ——— اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنی خداداد قابلیت اور محنت کے سہارے ایک کامیاب زندگی گزار سکے گا۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ یہ سہارے کمزور تھے۔ جس راہ پر وہ چل رہا تھا، وہ شاہراہ نہ تھی، اس منڈی میں ان سکوں کی ضرورت نہ تھی، جن پر وہ اترا رہا تھا۔ اس سے کہیں کمتر اور نالائق شخص اس پر بازی لے جاتے۔ اور وہ ان کا منہ تکتا رہ جاتا۔ حیران! آخر کیوں؟ وہ سوچتا اپنے والدین کے تعلقات کی بنا پر، سفارش، پہنچ ——— اور ایسی ہی باتیں جنھیں وہ قابل اعتراض سمجھتا تھا ——— ہر واقعہ۔ ہر ٹھوکر اس کے احساسات پر تازیانہ ثابت ہوتی، آخر اس نے اپنے سے تمام لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے کا عزم کر لیا۔ اس نے اپنی زندگی ایسے نظام کے قیام کی کوشش میں صرف کر دینے کی ٹھانی، جس میں اُس کے سے انسانوں کو بھی بڑھنے، پھولنے کی اجازت ہو۔ اُس نے اپنی زندگی کا ایک پروگرام بنا لیا۔

لیکن یہ اُس کی شخصیت کا صرف ایک رُخ تھا۔ تمام تر شخصیت، نہ تھی۔ وہ ایک زرخیز تخیل کا مالک تھا۔ اس کا دماغ حسین خیالوں کا مرکز بھی تھا۔ اور یہ خیالات کبھی کبھی ساتھیوں سے گفتگو کے دوران میں ظاہر ہو جاتے۔

"ایک سیدھی لکیر پر چلتے رہنے سے زندگی ممکن ہے اچھی گزر جاتی ہو، بغیر کسی حادثے کے مگر اس میں حسن نہیں، بل کھاتے ہوئے راستے کتنے آرٹسٹک معلوم ہوتے ہیں۔

کالج کے دنوں میں کچھ وقت کے لئے اس کی شخصیت کا یہ پہلو اس پر غالب آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں سویا ہوا ایک شاعر جاگ اُٹھا۔ اس نے اپنے اردگرد ہر چیز کو حسین محسوس کیا۔ شاید شاعر بہار ہی میں پیدا ہوتے ہیں جب ہر شے خوبصورت ہوتی ہے۔ اس شاعر کا تخیل اسے کہیں کا کہیں لے جاتا۔ اُس نے اپنے مستقبل کے متعلق خواب بنانے شروع کئے۔ حسین و دلفریب جال، ایسی زندگی کے خواب جہاں اسے ہر وہ چیز حاصل تھی۔ جس سے وہ اب محروم تھا۔ رہنے کے لئے ایک عالی شان جگہ، بہترین کار، خوبصورت سجے ہوئے کمرے۔ ایرانی قالین، صوفے، ریشمی پردے، اور اس کے خیالوں کی ایک ہستی، کسی شاعر کا تخیل، کسی مصور کا کوئی ماڈل ——— اپنے آپ کو بھی وہ ان خیالوں میں ایک سیدھا سادا غریب انسان نہیں، متمول آرٹسٹ تصور کرتا۔ عظیم الشان سٹوڈیو میں شاعرانہ انداز میں سوچتا ہوا، دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک انسان ——— !

کچھ وقت کے لئے وہ اسی میدان میں چل نکلا۔ مگر اس کی سماجی حیثیت کا احساس اسے اپنی جگہ واپس لے آیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ راستہ بھول رہا تھا۔ اس کے بھٹکے ہوئے خیالات پھر اپنے محور کے گرد گھومنے لگے۔ اسی مرکز کی طرف جہاں وہ بھٹک رہا تھا ——— !

آہنی پھاٹک میں شگاف سا پیدا ہوا۔ ایک کھڑکی کھلی اور ایک قیدی سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ اندر چلے گئے اور اس نے ان کی طرف سے نظر ہٹا کر جیل کے باہر کے احاطے کی طرف پھیر دی ——— دروازے کے پٹ کھلے تھے، مگر سلاخیں اپنی جگہ قائم تھیں، وہ ان سلاخوں کے پیچھے سے احاطے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

کھلے احاطے کے بائیں ہاتھ کوارٹر تھے۔ جیسے چھوٹے چھوٹے ڈربے ہوں، جیل کے سپاہی اور دوسرے لوگ جو وہاں کام کرتے تھے

انھی کوارٹروں میں رہتے تھے۔ وہ [illegible] جیل کے اندر [illegible] ——— [illegible]
کو اطلاع دیتا۔ اور وہ چپ چاپ قیدیوں کی طرح جیل کے اندر گھسنے کے لئے تیار ہو جاتا ——— [illegible] کوارٹروں
میں بند رہتے۔ کبھی کبھی کوئی عورت اپنے دروازے پر لگے ہوئے ٹاٹ کے پردوں یا چق کی تیلیوں سے جھانکتی ہوئی [illegible] دیتی۔
اور خاوند کو نزدیک پاکر دبک کر اندر چلی جاتی۔

کوارٹروں کے مقابل بائیں طرف سبزیاں بو رکھی تھیں۔ احاطے پرے سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی تھی۔ جسے جیل کے قیدی ڈیوٹی پر کے
والے سپاہی، احاطے میں کھیلنے والے بچے اور شاید چقوں کے پیچھے سے جھانکنے والی عورتیں ڈپٹی صاحب کا بنگلہ کہتے تھے۔ ان کھیتوں میں
کام کرنے والے سب مجرم تھے۔ ان میں جو کچھ اُگتا وہ ان کے لئے نہیں تھا، ان کا بہترین حصہ دوسروں کے لیے تھا۔

سپاہی ایک قیدی کو لئے جا رہے تھے۔ اُس کے دونوں ہاتھ بندھے تھے۔ اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ کنوئیں کے پاس پہنچ کر وہ
پانی پینے کے لئے جھکا۔ مگر ہاتھ آزاد نہیں تھے۔ اور اُس نے جھک کر اپنا منہ پانی کی نالی پر رکھ دیا۔ جیسے وہ کوئی جانور تھا ——— جانور
——— اسی جانورپن سے نجات دلانے کے لئے تو وہ یہاں تک پہنچا تھا اور اس جگہ بھی! ——— وہ کمرے کے اندر سلاخوں کے پیچھے پیچ و تاب کھا کر
رہ گیا۔ اس نے اس طرف سے نظر ہٹالی اور کمرے کی چاردیواری دیکھنا شروع کر دی۔

——— ملاقات کا کمرہ ایک یونہی سا کمرہ تھا جس کا ایک دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے کے عین سامنے، اور
دوسرا جس میں سلاخیں تھیں جیل کے بیرونی احاطے کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ صبح کی خوشگوار ہوا کے جھونکے فضا میں رقصاں تھے۔ صبح کے وقت
جیل میں بھی کچھ زندگی کے نقش ہوتے ہیں ——— ایک نئے دن کا طلوع ——— نہ سورج کی کرنیں جیل کی دیواروں پر آکے رکتی ہیں اور نہ
ہوا اور بارش کمرے کی حدبندیوں کی پروا کرتی ہے۔ جیل کے ارباب حل و عقد عزیزوں سے ملاقات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ان کے
مراسلات کو روک سکتے ہیں۔ مگر قدرت کے ان ہمدردانہ پیاموں کو نہ جیل کی سلاخیں روک سکتی ہیں اور نہ ارباب حل و عقد ——— !

کمرے کی دیواریں مٹی سے اَٹی پڑی تھیں۔ جہاں دو دیواریں ملتی ہیں وہاں قطار در قطار سفید سفید سیپیاں لگی ہوئی تھیں، اور
چھت کے کونوں سے مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ سلاخوں کے باوجود روشنی کی کرنوں میں جالے کے نازک تار چمک رہے تھے۔ کیا عجیب
سا جال بُن رکھا تھا مکڑی نے ——— نازک، باریک، مگر عمدہ، ——— مکڑی ان نازک تاروں کے پیچھے اپنے بھدے بھدے قدم اٹھا رہی تھی دوسرے
حصے میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرف، جو اس کی چمک سے فریب کھا کر ادھر چلی آئی تھی ——— "فریب!" ——— اُسے تازیانہ سا لگا۔

"ہوتا یہ سب فریب ہی ہے، زندگی سے فرار" ایک لڑکی نے آرٹ کے متعلق کہا تھا، اُسے معلوم ہوا کہ زیر بحث وہ خود تھا۔

"لیکن عذرا! ہم ان لوگوں کی دماغی کاوشوں کو یوں کیوں ٹھکرا دیں۔ آخر ان کے لئے بھی محنت چاہئے۔ لیاقت اور ہمت!"

"مگر کسی دوسرے میدان میں شکست کھا کر وہ یوں اپنی نمائش کر کے خود کو فریب دیتا ہے۔"

فریب ——— جال ——— سیاست ——— عورت ——— ! وہ جھنجھلا اٹھا۔ وہ اس عورت کو ملنے سے انکار کر دے گا، آخر اسے اس عورت
سے کیا اُمید ہو سکتی تھی۔ پھر وہ خواہ مخواہ کیوں اُلجھن میں پڑے۔

پھر اُسے خیال آیا کہ یوں بھی تو اس کے دماغ کو سکون نصیب نہ ہوگا۔ وہ اسی ادھیڑبن میں رہے گا کہ آخر یہ معمہ کیا تھا اور وہ
عورت کون تھی، اور پھر وہ بچہ تھوڑا ہی تھا کہ اس کا فریب کھا جائے گا۔ اس کے جال میں پھنس جائے گا ——— !

سلاخوں کو تھامے وہ پھر باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ موٹے موٹے ٹاٹ کے مٹیالے سے رنگ کے کپڑے پہنے جن پر سیاہ سی موٹی
موٹی لکیروں کے نشان تھے جیسے سلاخیں ہوں، جن کے اندر وہ قید تھے، قیدی نہایت انہماک سے کام کر رہے تھے۔ جیسے یہ ان کے

اپنے کھیت تھے — ان کی ساری پیداوار ان کی اپنی ہوگی۔ سپاہیوں کے بچے کھیل رہے تھے، ایک لڑکے کے پیچھے بہت سے اور — شاید چور اور سپاہی کا کھیل، ان کے خیال میں شاید سب قیدی چور ہوتے تھے — چور، ڈاکو، رہزن،

"کمال ہے! البتہ تو صاحب کے یہاں سبزی چھوڑنے نہیں گئے —" داروغہ نے کہا۔ پرانے قیدی جیلخانے کے چوہدری ہو جاتے ہیں — کمال! وہ سیدھا سادا نوجوان سا شخص جو پہلے دنوں انھیں کام کے لئے ملا تھا، انھیں تعجب تھا کہ وہ جیل میں کیوں تھا۔ وہ جیل میں کیسے آ گھسا تھا۔ فرمانبردار بے زبان سا شخص — سب کام خاموشی سے کئے جاتا، آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا، اس لئے اس سے سب سے زیادہ کام لئے جاتا تھا۔ جمعدار اسی پر سب سے زیادہ برستا تھا ——— قیدی مشغول رہے ———!

"بیوقوف!" اس نے سوچا، یہ اس سے پہلے جیل میں کیوں نہیں تھا۔ جیل سے باہر بھی وہ یونہی کام کرتے تھے، اور ان کا پھل بھی — شاید ان سلاخوں لگے پنجروں میں بند ہونے سے پہلے بھی وہ قیدی تھے۔ خدا جانے کن سلاخوں کے پیچھے ——— اور وہ ان کو دیکھ رہا تھا جیل سے باہر بھی وہ انھیں دیکھتا رہا تھا۔ جیل کے اندر — جیل کے باہر آخر اس کی زندگی میں کیا فرق تھا۔ اس کی اپنی زندگی میں فرق —!

"احمد!" ایک نسوانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی — وہ گویا خواب سے چونکا، اس سے پہلے اس کی آنکھیں ہی نہیں، اس کے کان اس کا حافظہ، سارے کا سارا وجود کسی خیالی دنیا میں یا خواب کی حالت میں یہ جانی پہچانی آواز اسے بیداری کی جانب گھسیٹ رہی تھی۔ اس کی مانوسیت سے اس کے ذہن کے بہت سے تار لرز اٹھے۔

"احمد!" موسیقی اس کے کانوں میں پھر لہرائی، خلوص اور عقیدت اس آواز میں نہ جانے کہاں سموئے ہوئے تھے — اس نے آنے والی کی طرف نظریں اٹھائیں اور دو آنکھوں کو اپنے چہرے پر کانپتا پایا، اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے کچھ بھی نہ دیکھ سکیں۔ ذہن میں رینگتے ہوئے خیال بجلی کی سی تیزی سے دوڑنے لگے۔ اسے سینکڑوں واقعے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے نظر آئے۔ خلط ملط جیسے کسی نے فلم کو تیز رفتار سے الٹا چلا دیا ہو ——— اور آخر یہ فلم ایک جگہ پر آ کر رک گئی، وہ خلط ملط تصویریں ایک حسین نکتے پر ختم ہوئیں۔

"نجمہ!" اس نے بے اختیار کہا، نجمہ اس کی ایک پرانی کلاس فیلو ——— اور پھر وہ فلم جو اس نکتے پر آ کر ختم ہوئی تھی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی ———

"مگر عذرا! تم ان کی ذہنی کاوشوں کو یوں ٹھکرا نہیں سکتیں۔ اس کے لئے لیاقت اور ہمت چاہیئے۔ اور پھر اس کے لئے تو الوہیت کے ایک شرارے کی ضرورت ہے —" یہ نجمہ ہی نے کہا تھا۔

"پھر بھی یہ ہوتے فرار ہی ہیں"

"اگر یہ فرار کسی حسین چیز کی تخلیق کر سکیں — ہر شخص اقلیدس کے فارمولوں سے زندگی کو جزویات میں تقسیم کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ مجموعی زندگی کے نقشے بھی کچھ کم اہم نہیں —" عذرا کے جواب میں نجمہ نے یہ دلیل دی تھی۔

"آپ ہی سے پوچھ لیجئے" اسے قریب ہی پا کر اس نے کہا تھا۔

"یہ فرار اتنی لطیف چیز نہیں، جتنا آپ سمجھتی ہیں۔ ان رنگین نقشوں میں خون جگر کی سرخی ہوتی ہے" اس کے دماغ کے کسی کونے میں جو شاعر دبکا بیٹھا تھا، نجمہ کی آمد نے اسے بیدار کر دیا۔ اس نے نجمہ کے جسم اور شخصیت میں کشش محسوس کی، نجمہ جو اکثر انسانوں کے لئے ایک یونہی سی لڑکی تھی۔ جس میں کچھ بھی جاذب نظر نہ تھا، مگر اس کا شاعر، یہ اسی شاعر کی آنکھ تھی جو نجمہ میں وہ خصوصیتیں دیکھتی تھی جو دوسروں کو نظر نہ آ سکتی تھیں ——— وارڈر نے کہا تھا کہ وہ میاہ سے رنگ کی ہے ———

"کمال سے پوچھو یہاں میں ہے کیا؟" اس کے ایک ساتھی نے اسے کئی سال پہلے بھی کہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نجمہ کی طرف متوجہ تھا

نکالی سی، اس کا رنگ منرو سلونا ہے مگر سانولے رنگ میں تو زندگی ہوتی ہے، حرارت، زندگی اور [illegible] ایک آہٹ
اس کے جسم کے خطوط جیسے کسی مصور نے دھند میں ایک حسین پیکر کو رقصاں دیکھ پایا ہو — اور پھر اس کا دماغ، اس کی شخصیت!

بجمہ پر بنیاد رکھ کے اس نے اپنے دماغ میں ایک ہستی کو جنم دیا۔ اسے اپنی تخلیق سے محبت تھی، وہ اس کے آرٹ کی خالق تھی، اس کا
ٹ اس ہستی کا مرہون منت تھا — بجمہ کی آمد سے پہلے اس کی شخصیت کا فنکارانہ پہلو تشنہ تھا، اس کی آمد سے یہ کمی دور ہو گئی۔ اگر
اور بجمہ ایک ساتھ چل سکتے ——— اس نے سوچا تھا ——— "ساتھی، محض ایک ساتھی"۔ بجمہ نے بھی ایک بار اس مسئلہ پر بات کرتے
ہوئے کہا تھا، اور اس نے من ہی من میں بے شمار باتیں سوچیں، اپنی آئندہ زندگی کے متعلق جو اس نے خیال ہی خیال میں بجمہ کی معیت
میں گزاری ——— وہ اکثر اپنے خوابوں میں گھرا رہتا، لیکن کبھی کبھی اس کے یہ خواب رک جاتے، انھیں ایک دھچکا سا لگتا اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ آخر اسے اپنی زندگی کے متعلق بھی تو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے زندگی میں کن کن مرحلوں سے
گزرنا ہو گا ——— وہ کسی اور کو خاص کر جسے وہ عزیز سمجھتا ہو، کس طرح ایک غیر متیقن زندگی میں ساتھ آنے کی دعوت دے سکتا تھا
——— اور پھر بجمہ کی زندگی کے اور پہلو بھی تو تھے۔ وہ ایک امیر لڑکی تھی، شاہانہ زندگی بسر کرنے کی عادی۔ شاید وہ ایسے ہی ساتھی کا
خواب دیکھ رہی ہو، جو اسے امیرانہ زندگی دے سکتا ہو۔ "ساتھی! —" اور آخر ساتھ بھی تو برابر کے انسانوں ہی میں ہو سکتا ہے۔
پھر ہو سکتا ہے کہ یہ سب اس کا اپنا ہی خیال ہو، اس کے دماغ میں بیٹھے شاعر کی سوچ ہو ———

شاعر کی سوچ! بجمہ سچ مچ ایک شاعر کا تخیل ہی تو تھی۔ اس کے جسم کے خطوط جیسے چغتائی کی لکیریں ہوں، موہوم لیکن دلکش، کبھی شاعر
کا تخیل بھی سچ ہوا، کبھی مصور کی لکیروں میں بھی زندگی ناچی ——— اس نے محسوس کیا کہ بجمہ کا خیال کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا
رخ ہی بدلنا ہو گا۔ اسے شاید اپنے تمام خیالات، اپنے سارے کے سارے پروگرام کو چھوڑ کر ایک عام انسان کی طرح راحتوں اور آسائشوں
کے پیچھے بھاگنا ہو گا۔ اسے ایک بہتر زندگی کا پیام دینے کے لئے ——— اور آخر بجمہ اس کی فنکارانہ شخصیت (Artistic Self) کا ایک تخیل ہو کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ سے جو ایک میٹھی سی کسک اس کے دل میں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ احساسِ محرومی
کی خلش میں تبدیل ہوتی گئی ———!

قلم کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔ کئی واقعے تیزی سے گزر گئے۔ حافظے کی پہچان کی قوت سے بھی تیز۔ سیاسی زندگی، ہنگامے، جیل، اور یہ
ملاقات کا کمرہ، اس کی الجھن اور اسے پھر سے اپنے اردگرد کا احساس ہونے لگا۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ ملاقات کے کمرے میں تھا۔

"بجمہ! اگر میں نے ملنے سے انکار کر دیا ہوتا، جانے کیا کیا وہم و گمان میرے دل میں پیدا ہوئے تھے ——— ہاں بجمہ! جیل
والوں کو اجازت نہ ملی تھی، اس کے بعد یہ ملاقات میرے لئے اچنبھا سا تھی، مجھے خیال تک نہ تھا کہ ....."

"تمھیں خیال تک نہ تھا کہ میں بجمہ —!"

"آج تمھیں ایک عرصے کے بعد دیکھا ہے اور ایک احساس محرومی جو آج سے بہت عرصہ پہلے میرے دل میں پیدا ہوا، اور جسے میں
نے ایک اور بہت بڑے احساس میں کھو دینا چاہا تھا، پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔ میرے سامنے ایک پروگرام تھا، ساری زندگی کا ایک نقشہ
کھینچ رکھا تھا۔ تمھارا خیال اس سوچ کی راہ میں حائل نظر آیا۔ تمھارا تصور مجھے اس راستے سے دور لے جانا چاہتا تھا —"

"کتنا غلط تصور! محض ایک شاعر کی سوچ، تمھارے لئے مجھے یہ پروگرام بھی عزیز تھے۔"

اس نے پھر بجمہ کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ اس کے سلونے جسم میں ابھی تک زندگی کی وہی حرارت تھی، اس کی حسین آنکھوں میں وہی
شوخی و شرارت تھی جو اس کے شاعر کا تصور بن کے رہ گئی تھی — اسے محسوس ہوا شاید بجمہ سچ مچ ایک مصور کا شاہکار تھی جو کبھی تبدیل

نہ ہوگی۔ وہ ازل سے ابتک اتنی ہی دلکش رہے گی۔

قلم رک گیا، پردے پر روشنی ہی روشنی تھی۔ اب کوئی تصویر نظر نہ آتی تھی۔ اس کا دماغ خالی تھا، اس کی نظریں خلا میں گھور رہی تھیں —— خلا، جس کے ہر طرف بجھ تھی —— !

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کڑی کا جالا ہوا میں لہرایا، اس کے نازک تار تھرتھرائے اور بکھر گئے —— کڑی ایک نازک سے تار سے جھول رہی تھی —— باہر میدان میں کام ویسے ہی جاری تھا۔ گاما سبزی کی ٹوکری اٹھائے صاحب کے بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔ اسی مٹیالی سی وردی میں ملبوس جس پر سرخ سلاخیں بنی ہوئی تھیں، اسے پھر خیال آیا جیسے وہ ہمیشہ سے ایک قیدی تھا —— اور وہ خود، اس کے موہوم خدشات اور توہمات کی کمزور سلاخیں اسے جیل سے باہر بھی قید کئے رہیں۔ وہ انھیں اپنے راستے سے نہ ہٹا سکا —— اور اب وہ ان سلاخوں کے پیچھے سے بجھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو جیل کی سلاخوں سے باہر کھڑی اس کی طرف عجیب انداز سے دیکھ رہی تھی —

(حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا گیا)

صلاح الدین اکبر

نہیں! کوئی نہیں!!

جوانی کے نشہ میں سرشار جیسے
دمکتا ہوا چاند بدلی سے نکلے
شگفتہ شگفتہ خراماں خراماں
چلے آ رہے ہیں ——

دلِ زار تجھکو تو سودا ہوا ہے
ہر آواز پر چونک کر دیکھتا ہے
یہ ساون کی شہائے طوفاں بداماں
کوئی اور ہوگا ——

ذرا ان کے پائل کی جھنکار سننا
میں پہچانتا ہوں وہ رفتار سننا
بہر گام صد رنگ فتنے جگاتے
چلے آ رہے ہیں ——

انوکھی ہے اُمید کی سحر سازی
فریبِ مسلسل ہے الفت کی بازی
زمانے ہی بیتے انھیں آتے آتے
کوئی اور ہوگا ——

انھیں کھینچ لایا ہے جذبِ محبت
وہی ہیں تبسم بلب حسبِ عادت
جلو میں لئے نور و نکہت کے طوفاں
چلے آ رہے ہیں ——

کبھی ان کا وعدہ بھی ایفا ہوا ہے
دلِ زار کیوں تجھکو سودا ہوا ہے
ترے خواب ہیں خوابہائے پریشاں
کوئی اور ہوگا ——

ابن انشاء

انقلابِ احمر

اُتر رہی ہیں بہاریں فلک کے دامن سے

فضا میں تالیاں بجنے لگیں فرشتوں کی
نگہ میں آگئیں رنگینیاں بہشتوں کی
اُٹھیں گے لالہ و گُل اب زمیں کے مدفن سے

انھیں بہاروں میں آتا ہے مُنہ چھپائے ہوئے
چراغ خون کے رگ رگ میں پھر جلائے ہوئے
وہ انقلاب جسے دیکھتے تھے چلمن سے

وہ انقلاب جو طوفانِ رنگ و بُو سے نہیں
وہ انقلاب جو پیمانہ و سبُو سے نہیں
وہ انقلاب جو آتا ہے خون و آہن سے

وہ پَل رہا تھا بہاروں کی گود میں اب تک
چمن میں لالہ عذاروں کی گود میں اب تک
نکل پڑا ہے مگر آج اپنے مسکن سے

اسی کا رنگ جھلکتا ہے کچھ پھریروں میں
نئے اشارے ہیں گنگ و جمن کے جلووں میں
وہ اُٹھ رہا ہے دُھواں کارگاہِ لندن سے
اُتر رہی ہیں بہاریں فلک کے دامن سے

مسعود حسین

نیا مکان

کردار

آپا - چوبیس سالہ نوجوان جذباتی عورت -
بھائی جان - اس کا بھائی - ادیبانہ مزاج اور خود پسند
بھابی - بھائی جان کی بیوی
نمبر ۱، نمبر ۲ - دو آدمی **تانگہ** **وقت** - سات بجے شام

آپا - آخر بھائی جان آپ بتاتے کیوں نہیں کہ یہ مکان آپ کو کیسے ملا؟

بھائی جان - بھئی تم لوگوں کو اس سے کیا - تمھیں پیڑ گننے سے مطلب ہے یا آم کھانے سے - یہ جان لو کہ اس زمانے میں مکان ملنا ناممکن ہے - لیکن تم جانتی ہو تمھارے بھائی جان پھر تمھارے بھائی جان ہیں -

بھابی - جانے کب تک آپ ایسی باتیں کرتے رہیں گے - آدھ گھنٹے سے تانگہ چل رہا ہے - اور آپ کے مکان کی کوئی خبر نہیں - شہر ختم ہونے پر آیا - آخر یہ مکان ہے کہاں؟

بھائی جان - بس تمھیں تو ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں - ہر معاملے کو کھٹائی میں ڈالوگی - میرے لئے تو تمھاری یہ چڑچڑی طبیعت مصیبت بن گئی ہے - خیر کوئی بات نہیں، دو دن یہاں رہوگی تو ٹھیک ہو جاؤگی - اچھا مکان، اچھی آب و ہوا اور اچھا ماحول - تین باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں - ہاہا، تین باتیں - اب آئیں گے مزے شاعری کیا کریں گے -

آپا - تو بھائی جان یہ مکان ہے کہاں - یہ سیدھی سڑک یوں معلوم ہوتا ہے کہ قیامت تک نہیں رکنے کا - کیا چابک اس گھوڑے کو نہیں کہ اور تیز کرے -

بھائی جان - ہاں بھائی تانگے والے ذرا جلدی کرو - بس دو قدم کی تو بات ہے -

تانگے والا - چل تو رہا ہے - میں خود تو اڑ کے بھاگ نہیں سکتا - بچارے جانور کی جان کیوں ہلکان کروں -

بھائی جان - اچھا بھئی تمھاری مرضی - چلو جھگڑا لینے سے کیا فائدہ یہ لو آ گیا مکان - (بھابی سے) بیگم دیکھا کیا سب سے الگ تھلگ مکان ہے - دیکھتے ہی روح خوش ہوتی ہے - ہر طرف سکون، خاموشی، نہ کسی سے لینا نہ دینا مکان دیکھو گی تو روح خوش ہو جاؤ گی - یہ دیکھا آگے کھلا کپاؤنڈ - شام کو بیڈمنٹن کھیلو - تندرست رہو اور ڈاکٹر کی فیس بچاؤ - یہ لو تالا کھلا - اندر سے ٹھنڈی ہوا نے خوش آمدید کہا - یہ دو کمرے نیچے ایک مردانہ اور ایک زنانہ - ایک نوکر کا کمرہ - اوپر چلو - سیڑھیاں دیکھیں صاف ستھری - چار کمرے، یہ سونے کا - خیر، اب تم جانو اور تمھارا کام، میں سامان لینے چلتا ہوں بچو میری راہ دیکھ رہا ہوگا -

آپا - مکان تو بہت اچھا ہے - لیکن آپ کو ملا کیسے؟

بھابی - مکان تو مجھے بھی پسند آیا - خیر آپ جلدی جائیں - بچو آپ کا انتظار کر رہا ہے - اور مکان ہے بھی کالے

کوسوں دُور۔ قیمتی سامان آج آجائے تو اچھا ہے۔ مجھے
تو اپنے ہمسایوں سے ڈر لگتا ہے۔ کتنی منحوس صورتیں
ہیں ان کی۔ مجھے تو چور دکھائی دیتے ہیں۔ خیر گزری کہ
اتنے دن کٹ گئے۔

آپا۔ ان غریبوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے بھابی! ہاں تو بھائی
جان آتے ہوئے میرا بکس ضرور لے آیئے گا۔

بھابی۔ میری مشین ذرا احتیاط سے رکھئے گا۔ دیکھئے کہیں ٹوٹ
نہ جائے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی مشین ملنے کی نہیں۔

بھائی جان۔ تم لوگ مجھے بچہ سمجھتی ہو۔ سب کچھ لاؤں گا۔
کیوں پریشان کرتی ہو۔

بھابی۔ بچہ نہیں تو اور کیا ہیں۔ پہلا مکان چھوڑا تو میرے
صوفے کے بازو توڑ دیئے اور رنجو بچارا مفت میں
پٹا۔ دوسرے مکان میں گئے تو چارپائیاں زخمی ہوئیں
اور پھر یہ گھمنڈ کہ آپ بچہ نہیں ہیں۔

آپا۔ چھوڑیئے بھابی ان قصوں کو۔ ابھی مکان کو جھاڑنا پونچھنا
ہے۔ بھائی جان کو دیکھئے لال پیلے ہو رہے ہیں غصے
سے۔ چھوڑیئے بھائی جان، بڑے آدمی ذری ذری سی
باتوں پر غصے میں نہیں آجاتے۔ ہاں تو اب وقت
کیا ہوا ہوگا۔

بھائی جان۔ ساڑھے سات، لیکن تم ہر وقت اس کی باتوں
میں بیچ بچاؤ کیوں کرتی رہتی ہو۔ مجھے تو بے حد
تکلیف ہوتی ہے اس کی بے وقت کی راگنی سے مکان
وہ دلوایا ہے کہ یاد کرتی رہے۔ اور پھر پچیس روپے
کوئی کرایہ ہوتا ہے آج کل کے دنوں میں۔ ایک تو مکان
مل گیا ہے اور پھر اتنا سستا۔ مگر اس کی اُلٹی کھوپڑی
میں کچھ سمائے بھی۔

بھابی۔ آپ کوستے جائیں اور آپ کا کام ہی کیا ہے۔ جایئے
رنجو کا بچہ گھبرا رہا ہوگا۔ پھر ڈھونڈتے پھریں گے اُسے
ان نوکروں سے خدا سمجھے۔ آج کل سر پر چڑھ گئے ہیں

ہاں کہیں بھاگ نہ جائے۔

بھائی جان۔ جا تو رہا ہوں تم لوگ ذرا مکان کو اچھی طرح دیکھ لو

آپا۔ ہم دیکھ لیں گے۔ آپ جایئے۔

(بھائی جان جاتا ہے)

بھائی جان۔ (دور سے) اور ہاں بھئی فیصلہ یہی ہے نا کہ میں
اور رنجو وہاں ٹھہریں اور تم لوگ یہاں رہو۔ آج کل
چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ ذرا سمجھ سوچ کر
قدم اٹھانا چاہیئے۔

آپا۔ ہاں بھائی جان ٹھیک ہے۔ آپ جایئے ہماری فکر نہ
کیجئے۔ (چلتا ہے)

آپا۔ بھابی! یہ اوپر جانے کی سیڑھیاں ہیں۔ ذرا اوپر چل کر
دیکھیں۔ مکان تو کھلا اور ہوادار ہے۔ مجھے تو
پسند آیا۔

بھابی۔ پسند تو مجھے بھی آیا ہے۔ ہاں ذرا کوٹھے پر چل کر
دیکھیں۔ (سیڑھیاں چڑھتی ہیں) لیکن حیرت تو اس
بات پر ہے کہ یہ مکان انھیں مل کیسے گیا۔ اتنا اچھا
مکان، پوری کوٹھی ہے۔ باہر کمپونڈ، اندر کھلے صاف
ستھرے کمرے۔ دالان۔ برآمدے۔ اونچی چھتیں،
اور کل پچیس روپے کرایہ۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا
کالا نظر آتا ہے۔ خدا خیر ہی کرے۔

آپا۔ سامان میں قرآن شریف لے آئی ہیں نا آپ۔ سب سے
پہلے گھر میں قرآن شریف رکھنا چاہیئے تاکہ مکان
بلیات سے محفوظ رہے۔

بھابی۔ ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ میرا خیال تو ہے کہ میرے بکس
میں رکھا ہے۔ ہیں یہ کیا؟ یہ مکان کے پچھواڑے میں
کیا ہے۔ مجھے تو قبرستان سا معلوم ہوتا ہے۔

آپا۔ قبرستان سا کیا، یہ تو ہے ہی قبرستان، اے مرے
اللہ ۔۔۔ جبھی تو ۔۔۔ اوہ ہو ہو ۔۔۔ یہ مکان
جبھی یونہی خالی پڑا تھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ کوئی بات

منحوس ہے - قبرستان میں ہے یہ مکان، میں تو یہاں ایک دن نہ رہوں گی - ایک دن نہیں رہوں گی - ہوں، ہوں، نہ بھئی مجھے تو اپنی جان عزیز ہے - بھابی آپ رہیں تو رہیں - مجھے تو کاٹنے کو دوڑے گا یہ مکان!

بھابی - نہیں تم نہیں رہو گی تو مجھے کیا بادوے کتے نے کاٹا ہے - میں یہاں بھلا کیوں رہنے لگی - میں اس اجاڑ بیابان میں نہیں رہوں گی - سُنا نہیں تم نے قبرستانوں میں رات بھوت میں ناچتی گاتی رہتی ہیں - اور اگر کوئی مکان پاس ہو تو اس میں بھی بسیرا کر لیتی ہیں - مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے مجھے تو پاگل سمجھتے ہیں - میں نے پوچھا مکان کیسے ملا تو لگے اپنی بڑائی ہانکنے - بھلا ایسے زمانے میں کون سر پھرا ایسے مکان خالی چھوڑ جائے گا -

آپا - بھابی رات سر پر آ رہی ہے - چلو نیچے چلیں - مجھے تو ڈر لگ رہا ہے نہ جانے بھائی جان کب آئیں - چل کر نیچے بیٹھتی ہیں -

بھابی - لیکن اپنے ساتھ ہم لوگ بلب بھی تو نہیں لائے، ان کا کیا ہے، ادیبانہ مزاج، جی میں آئی تو یونہی خالی ہاتھ ٹہلتے ٹہلتے چلے آئیں - وہ بھی بلب، نہ لائے تو کیا، اندھیرے میں ساری رات بیٹھے رہیں گے، اور پھر جاتے ہوئے یہ دھمکی بھی دے گئے ہیں کہ رات پرانے مکان میں رہیں گے ہم دونوں کو اکیلے یہاں رہنا ہوگا - جیتے جی قبرستان میں میں تو نہیں رہوں گی -

آپا - لیکن بھابی جان ہمیں نیچے چل کر بیٹھنا چاہیئے - کھلے کوٹھے پر قبرستان کے پاس بیٹھنا مجھے تو پسند نہیں آتا جانے دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے - بھائی جان تھوڑی دیر میں آ جائیں گے - اور پھر کھلی سڑک کے پاس مکان ہے ادھر اُدھر مکان بھی کچھ دور نہیں - لیکن —— یہ قبرستان —— مجھے تو یہاں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری باتیں کوئی سُن رہا ہے - یہاں سے چلو بھابی خدا کے لئے چلو -

بھابی - لیکن نیچے اندھیرے میں کمرے کاٹنے کو دوڑیں گے میرا تو اندھیرے میں دم گھٹنے لگتا ہے - نہ بھئی!

آپا - بھابی خدا کے لئے نیچے چلو - بس میں تو چلی - یہ کھلی فضا بھی کچھ کم زہریلی نہیں - کمرے بند کر کے بیٹھ رہیں گے - لیکن یہاں کھلی فضا میں تو مجھے ہول آ رہا ہے - میرے اللہ مجھے تو یوں معلوم ہو رہا ہے - کہ یہ گہرے نیلے رنگ کی شام میرے سانسوں میں حل ہو کر میرے اندر جذب ہوئی جا رہی ہے - میرے خون میں پارہ سا تڑپ رہا ہے —— (سانس پھول جاتا ہے) بھابی بھابی، وہ دیکھو، قبروں کی طرف —— ہر قبر —— اوئی میرے اللہ —— ہر قبر میرے دل کی طرح دھڑک رہی ہے —— ابھی ان قبروں کے مُنہ کھُل جائیں گے ابھی ان قبروں سے نکلتے ہوئے مردے سفید سفید کفنوں میں لپٹے ہوئے ناچنے لگیں گے —— ہاں بھابی - میری اچھی بھابی - یہ مردے ابھی قہقہے لگائیں گے - اور —— اور —— بھابی —— میرا کلیجہ مُنہ کو آ رہا ہے —— میں مری ——

بھابی - ہائے میرے اللہ! کس بُری طرح مجھ سے لپٹی جا رہی ہو - کمبخت یہ تمھارے ہاتھ تو زنبور بن کر میرے جسم میں کھُبے جا رہے ہیں —— اری چھوڑو تو —— اُف اُف —— بھئی چلتی ہوں —— تمھارے ساتھ —— یہ ویران سنسان جگہ —— کہاں لا کے مارا ہے ہمیں —— ہائے میرے اللہ - نیچے اندھیرے میں! —— کوئیں میں —— کالے کوئیں میں —— ان قبروں کے پاس —— اس سنسان جگہ پر —— میرا تو دم ہی نکل جائے گا -

آپا - بھابی —— بھابی —— کسی کی آہٹ —— کسی کی آواز —— دور ان قبروں کے پاس —— وہ درخت کے پیچھے ——

کسی کی آنکھیں — دیکھیں تم نے چراغوں کی طرح جل رہی ہیں — (التجا کے ساتھ) نیچے چلو بھابی — بھابی۔

(دونوں نیچے آنے لگتی ہیں)

بھابی ۔ ہاتھ میں ہاتھ دیئے رہو۔ تم آگے آگے چلو۔ مجھے تو ان دیواروں میں کوئی سانس لیتا سنائی دیتا ہے۔ اری بائیں ہاتھ کو، اس کمرے میں — لیکن — لیکن یہاں کہاں بیٹھیں — کہاں جائیں — کہاں — کہاں

آپا — بھابی گھبرائیں نہیں۔ آپ گھبرائیں گی تو میرا دم ہی نکل جائے گا۔ یہ دروازے بند کرلیں۔

بھابی ۔ نہیں نہیں۔ خدا کے لئے نہیں، یہ دروازے بند نہ کرنا۔ وہ کمرے کے اندر ہوا تو۔

آپا — کون کمرے کے اندر ہوا۔

بھابی ۔ شی (آہستہ سے کان میں کہتی ہے) بھوت۔ کوئی روح دیکھتی نہیں کمرے کے اندر سے کڑکڑانے کی آواز آرہی ہے۔ جیسے .... جیسے یہ دیواریں بول رہی ہیں .... اور .... ہاں مجھے پانی دو .... میرا دل .... ہائے .... ہائے میرا دل .... اری .... اری کہاں چلیں مجھے اکیلا چھوڑ کر تم کہاں چلی تھیں۔

آپا — آپ ہی نے تو پانی مانگا تھا۔ پانی نہیں پئیں گی آپ؟

بھابی ۔ نہیں .... نہیں .... میں پانی نہیں پیتی .... مجھے تنہا نہ چھوڑو تم .... مجھے پانی نہیں چاہئے۔ یہ جان لو تمہارے جاتے ہی میری جان نکل جائے گی۔ .... ہاں .... سن لیا نا .... مجھے تو پسینہ آرہا ہے .... اس موسم میں .... اُف اُف .... (خوف زدہ ہوکر) یہ کھڑکی کے پیچھے کیا چمک رہا ہے۔ یہ دیوار پر کسی کا سایہ ....

آپا — کچھ نہیں بھابی۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ سامنے سڑک کی روشنی شیشے پر پڑ رہی ہے اور اس کا عکس یہاں پر بھی آرہا ہے۔ چلو کچھ ننھی سی روشنی کمرے میں آئی تو ہے۔ اچھا ہوا، یا اللہ اندھیرا تو کسی کو بھی نہ دکھایئے۔

بھابی ۔ میرے ساتھ لگ کر بیٹھی رہو۔ اور جلدی نہیں۔ جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرو۔ (وقفہ خاموشی .... دور سے گانے کی آواز آنے لگتی ہے۔ دور کسی مکان میں ریڈیو لگا ہوا ہے)

آپا ۔ روحیں گا رہی ہیں۔ قبرستان روحیں اور گانا۔ بھابی! بھابی!!

بھابی ۔ اوہو ... ہوں (زیر لب جل تو جلال تو جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو ورد کرنے لگتی ہیں) ریڈیو پر Announcement یہ لاہور ہے۔ ابھی ابھی آپ) اری یہ تو ریڈیو تھا (اطمینان کا لمبا سانس) اُف اُف تم نے تو جان ہی نکال دی میری۔ اب کوئی بات سناؤ۔ (دور سے گھنگھروؤں کی آواز آنے لگتی ہے)

آپا ۔ روحیں ناچ رہی ہیں۔ ناچ رہی ہیں بھابی .... لیکن .... لیکن .... بھابی یہ گھنگھروؤں کی آواز تو لحظہ بہ لحظہ قریب آرہی ہے۔ پاس آرہی ہے .... ناچتی ناچتی .... کسی کی روح .... اماں بھی تو اسی قبرستان میں ہیں .... اور اگر وہ .... اماں .... میری پیاری اماں .... اب .... اس اندھیرے کمرے میں .... ناچتی ناچتی اپنی جیتی بیٹی سے ملنے آجائے .... تو .... تو .... بھابی .... آپ .... آپ کیا کر رہی ہیں۔

بھابی ۔ میں اپنے جینے والوں کو روز ہی روتی ہوں۔ کس مصیبت میں جان ہے۔ ایک وہ ہیں کہ اس ویرانے میں لا مارا ہے اور ایک تم ہو کہ ڈرا ڈرا کر جان نکال رہی ہو۔ اس خوف کی موت سے تو اچھا ہے کہ یونہی دم نکل جائے۔ میں تو باز آئی اس جینے سے دیکھا .... اماں جی ناچتی ہوئی آرہی ہیں۔ اری تانگہ ہے آپا جانی .... لیکن .... لیکن .... یہ یہاں آکر کیوں رک گیا ہے۔ آگئے ہیں شاید شکر ہے خدایا۔

آپا۔ نہیں یہ بھائی جان تو نہیں۔ (آواز بہت مدھم) جانے کون ہیں۔ مکان کو گھور رہے ہیں۔

بھابی۔ سُن تو سہی کیا کہہ رہے ہیں۔ (فاصلے سے دونوں کی آواز آرہی ہے)

نمبر ۱۔ بھئی مکان تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت کون دیکھے گا اسے۔ کل صبح آئیں گے۔ میں تو اسے کبھی نہ چھوڑوں۔

نمبر ۲۔ صبح سویرے مالک سے بات پکی کر لی جائے۔ لوگ بھی کتنے وہمی ہوتے ہیں۔ ایسے مکان کو آسیب کے ڈر سے چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن یار عورتوں کا کیا کروگے قبروں سے تو وہ بھاگیں گی ضرور۔

نمبر ۱۔ واہ میرے یار۔ عورتوں کی بھی ایک ہی کہی۔ اُن کا کیا ہے۔ جہنم میں پیچھے پیچھے چلی جائیں۔ یہ تو قبرستان ہے ہاں اتنی بات ہے کہ سرِ شام آنا پڑے گا گھر میں....

نمبر ۲۔ اور سینما چھٹ جائے گا جناب کا۔

نمبر ۱۔ پہلے کون سا ہر روز دیکھتا ہوں۔ یہ مکان مل گیا تو ایک اور نوکر رکھ دینگا۔ چلو بھئی۔

(تانگہ چلا جاتا ہے)

بھابی۔ (طنز سے) عورتوں کا کیا ہے! جیسے عورتیں لگے بندھوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔ جہنم تک پیچھے پیچھے چلی جائیں بس اسی بات نے تو ان مردوں کو شہ دے رکھی ہے۔ کہنا مانو تو سر پر چڑھ جاتے ہیں اور نہ مانو تو گھر بھر کو سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہ ہے مرد ذات کی فطرت۔ اب ان کو دیکھو۔ کیا مزے سے قبرستان میں لا پھینکا ہے۔ اور اب کچھ کہوں گی تو مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔

آپا۔ بھائی جان کب تک آئیں گے بھابی؟ میرا دل تو بُری طرح دھک دھک کر رہا ہے۔ یہ تنہائی خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اور پھر یہ ویران سنسان جگہ۔ جانے کس کو سوجھی تھی یہاں گھر بنانے کی۔

بھابی۔ کوئی اور بات کرو۔ میرے جسم پر تو خوف کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ ضبط کئے بیٹھی ہوں۔ خدانخواستہ کوئی بات ہو گئی تو دم نکل جائے گا میرا۔ بس یہ سمجھ لو۔

آپا۔ نہ بھابی، یوں نہ کہو۔ بس ابھی آیا ہی چاہتے ہیں بھائی

(ہوا تیزی سے چل پڑتی ہے۔ پتوں کا شور)

بھابی۔ ہائے میرے اللہ! ایک اور مصیبت، ہوا کس زور سے چل پڑی ہے۔

آپا۔ بھابی کہتے ہیں کہ جب روحیں کسی گھر میں آتی ہیں تو پہلے آندھی چلتی ہے۔

بھابی۔ (چلا کر) خدا کے لئے آپا رحم کرو میرے حال پہ رحم کرو۔ تم لوگ میری جان کے لاگو کیوں ہو رہے ہو (سینہ ... کر تیزی سے) اُف میرے اللہ دل کس بُری طرح دھک دھک کر رہا ہے۔ مانو ابھی حرکت بند ہو جائے گی۔ آ.... آپا... میرے پاس بیٹھی رہو۔ مجھے تمہارے ہاتھ سے ایک تسکین سی ہو رہی ہے۔ میں بھول جانا چاہتی ہوں کہ میں کہاں ہوں۔ میں یہاں نہیں ہوں۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ ہائے ہائے، میری جان نکل رہی ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ ماتھے پر ٹھنڈے پسینے آرہے ہیں۔ آپا — آپا — کہاں ہو — تم — تم —

آپا۔ (رونے لگتی ہے) بھابی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ بھا... میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔ میں نے۔ میں نے تو ... (سست سی آواز سے سرگوشی کے لہجے میں) بھابی دروازے بج رہے ہیں۔ سارے گھر کے دروازے قہقہے لگا رہے ہیں۔ دیواریں ملتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔

بھابی۔ (چپ ہے)

آپا۔ بھابی تم بولتی کیوں نہیں۔ بھابی کیا ہو گیا ہے تمہیں بھابی خدا کے لئے کچھ کہو..... یہ تنہائی، یہ تیز ہوا یہ قبرستان ..... یہ بجتے ہوئے پٹ ..... میری بھابی

میری اچھی بھابی ...... بولو ...... کچھ تو بولو بھابی۔

[illegible]) مجھے دلھن بنایا جارہا ہے۔ میرے ہاتھوں کو مہندی لگائی جارہی ہے۔ کتنی ٹھنڈی ہے یہ مہندی دل کو کتنا سکون ہورہا ہے۔ ہاہاہا۔ میں پھر سے دلھن بن رہی ہوں۔ ہوہوہو ...... آپا ...... دیکھو میں ان کپڑوں میں کتنی بھلی دکھائی دے رہی ہوں، یہ سُرخ جال کا دوپٹہ ...... یہ ...... یہ ...... (رونے لگتی ہے)

کہتی چلی جاؤ جو تمھارے دل میں آئے۔ بھابی جو جی میں آئے کہو — بے معنی باتیں کرو۔ لیکن باتیں ضرور کرتی رہو۔ تمھاری باتوں سے مجھے قرار سا آرہا ہے۔ جیسے کوئی زخموں پر پھاہے رکھ رہا ہو۔ ہاں شادی کی باتیں کرو۔ لیکن یہ تم رونے کیوں لگیں؟

[illegible]) ۔ تمھیں معلوم ہے کل سکندر آرہا ہے۔ میں اور سکندر ...... ہاہاہا ...... ہم دونوں ایک ساتھ کھیلے۔ ایک ساتھ بڑھے۔ مجھے اس سے کتنا پیار تھا۔ پیار تھا! ...... نہیں پیار ہے۔ مجھے اس سے کتنا پیار ہے۔ نہیں کوئی سُن لے گا۔ تو کیا کہے گا۔ اس نے مجھ سے کہا، اگر میں تمھیں حاصل نہ کرسکا تو تمام عمر اکیلا رہوں گا۔ (روتی ہوئی) وہ تمام عمر اکیلا رہے گا۔ میرے لئے ...... اور میں ...... میں بھی تو اکیلی ہوں۔ میری کوئی نہیں سنتا۔ میری کون سنتا ہے، اتنے بھرے گھر میں ...... آوازیں دیئے چلی جارہی ہوں۔ پیاس سے گلے میں کانٹے اُگ آئے ہیں اور کوئی پانی نہیں پوچھتا۔ میری کون سنتا ہے سکندر ...... سکندر تم آج چپ کیوں ہو؟

[illegible] یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم سکندر کو چاہتی ہو ...... میری بھابی ...... ہیں بھابی ...... تمھاری شادی کو آج چار سال ہوگئے اور ابھی تک سکندر کی یاد تمھارے دل میں ہے۔ سکندر؟ کون ہے سکندر بھابی۔ یہ آج تم کیسی باتیں کررہی ہو ...... جیسے پاگل ہوگئی ہو۔ پاگل ......

بھابی۔ ہاہاہا۔ سکندر سنا تم نے ...... یہ مجھے پاگل کہتے ہیں ...... یہ لوگ۔ یہ اندھے لوگ — جو چہروں کو پہچانتے ہیں دل کو نہیں پہچانتے ...... دل ...... لیکن میرا دل تو ڈوب رہا ہے۔ تم جارہے ہو ...... کہاں جارہے ہو سکندر ...... تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے ...... اچھا جاؤ ...... ہوں ...... ہوں ...... ہوں۔

آپا۔ تم سکندر کو چاہتی ہو بھابی۔

(دروازہ زور سے بجتا ہے دونوں اچھل پڑتی ہیں)

بھابی۔ (دبی آواز میں) ہائے — ہائے — ہائے — یہ — یہ — یہ کیا تھا۔ یہ کیا تھا۔

آپا۔ ہائے اماں، کس مصیبت میں پھنس گئے ہم لوگ۔ جان بھی تو کمبخت نہیں نکلتی۔ (روتی ہے۔ سسکیاں)

بھابی۔ روتی ہو۔ روؤ۔ جی بھر کے روؤ۔ رونے سے دل کو اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان۔ اگر دو منٹ اور یہی حال رہا تو میں نہیں بچنے کی۔ سر گھوم رہا ہے۔ ٹکریں مارنے کو جی چاہتا ہے۔ کوئی آفت سی آفت ہے۔

(دروازے میں سے دو بلیاں لڑتی ہوئی داخل ہوتی ہیں۔ اور دونوں چیخ مار کر بیہوش ہوجاتی ہیں)

(وقفہ)

بھائی جان۔ جانے کہاں مرگئیں یہ دونوں۔ گھنٹہ بھر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ لیکن کوئی سنتا ہی نہیں (دروازہ کھولنے کی آواز) ارے او نجّو!

نجّو۔ جی —

بھائی جان۔ کہاں ہے ٹارچ۔ ذرا گھوم کے دیکھ تو کہاں ہیں دونوں کہیں فرش پر سو تو نہیں گئیں ہمنے مکان کی خوشی میں کس کی سُنیں گی یہ —!

یوسف ظفر

حشرِ جذبات

ہم پہ ساقی تری نظر نہ ہوئی
میکدے میں کبھی سحر نہ ہوئی

شوقِ بے حد نے کر دیا خاموش
بات بھی مجھ سے مختصر نہ ہوئی

ہجر کی شب تو کیف افزا تھی
مجھ سے یہ رات بھی بسر نہ ہوئی

زیست کا خود ہی اختصار کیا
شبِ فرقت کی جب سحر نہ ہوئی

قصۂ دل کسے سُناتے ہم
یہ کہانی بھی مختصر نہ ہوئی

جن سے اُمّید تھی وفا کی اُنھیں
میرے مرنے کی بھی خبر نہ ہوئی

تیرگیٔ قفس معاذ اللہ
فصلِ گل کی مجھے خبر نہ ہوئی

رہ گئی شرم نامرادیٔ غم
بیخودی میری پردہ در نہ ہوئی

اس طرح زندگی کٹی میری
مجھکو اپنی بھی کچھ خبر نہ ہوئی

میری پرواز باوجودِ قفس
کبھی مجبورِ بال و پر نہ ہوئی

ہو گیا حُسن جب سے زیرِ نقاب
میری دُنیا میں پھر سحر نہ ہوئی

حُسن سے میں ہُوا نہ شرمندہ
آہ منت کشِ اثر نہ ہوئی

عشق ثاقب ہے رائیگاں اُس کا
جس کے غم میں وہ آنکھ تر نہ ہوئی

ثاقب کانپوری

تصورِ بحر و مصرع

یوں تو عربی میں بحر کے معنی سمندر وغیرہ کے ہیں لیکن اصطلاحِ عروض میں ایسی چند معینہ و مقررہ تعدادِ اصواتِ مختلفہ کی ایک خاص ترتیب کو کہتے ہیں جس سے غنا، یا ایقاع پیدا ہو جائے۔ اس بحر کے اجزا میں سے ایک جزو کا نام مصرع ہے جو درحقیقت مذکورہ معینہ و مقررہ تعدادِ اصوات کی تقسیم ہے۔ صدیاں گزریں کہ موجدانِ بحر پیوندِ خاک ہو چکے۔ اور آج ہم یہ جھگڑا لے بیٹھے کہ مصرع پہلے وجود میں آیا یا بحر' یعنی موجدانِ بحر نے مصرع سے تعدادِ اصوات معین و مقرر کی یا تعدادِ اصوات مقرر کر کے اس کے ٹکڑے کئے۔ جن میں سے ہر ایک کا نام مصرع رکھا۔ اصلیت کا حال تو جبھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی روحیں عالمِ بالا سے اتر کر پھر مقیدِ قفسِ عنصری ہوں اور بتائیں کہ انھوں نے مصرع سے بحر بنائی یا بحر سے مصرع، لیکن قدیم مدونانِ عروض جو کچھ کر چھوڑ گئے ہیں اسی کی روشنی میں عقل آرائی کی جا سکتی ہے۔

سنسکرت کے سب سے پہلے مدونِ عروض پنگل رشی ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف پنگل سوتر (पेंगलछन्द:सूत्रम्) باب دوم کے پہلے سوتر میں فقط لفظ چھند (छन्द:) لکھنے پر قناعت کی ہے۔ لیکن اس کے شارح "ہلایدھ بھٹ" نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔ छन्द:शब्देनाक्षर संख्या वच्छन्दोऽत्राभिधीयते। یعنی لفظ چھند سے مراد تعدادِ حروفِ الفاظ ہے۔ اس کے بعد باب چہارم کے دسویں سوتر میں کہتے ہیں۔ पादश्चतुर्भाग: ہلایدھ بھٹ نے اس کی جو شرح لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے "ہر چھند کے چار حصوں میں سے ایک حصہ کو "پاد" (पाद = مصرع) کہتے ہیں۔ مثلاً گاتیری میں ۲۴ حرف ہوتے ہیں اس لئے چھ حرفوں کا ایک مصرع ہوگا وغیرہ وغیرہ"۔ سنسکرت کا مستند لغت امرکوش لفظ "پاد" (مصرع) کے معنی دو جگہ بتاتا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے۔ पाद:पादस्तुरीयोभाग: "یعنی "پاد" چوتھائی حصے کا نام ہے"۔ دوسری جگہ کہتا ہے۔ पादा रश्म्यङ्घ्रितुर्यांशा: یعنی "کرن۔ پاؤں، چوتھائی"۔ یہ تصنیفات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ تصورِ بحر کو تصورِ مصرع پر تقدم حاصل ہے۔ تقسیم کے لئے اس سالم شے کا وجود مقدم ہے جس کی تقسیم کی جائے۔

پنگل رشی کی تصنیف میں زیادہ تر دو طرح کی بحریں ہیں۔ دینی (लौकिक) اور دنیاوی (अलौकिक) ان کے مطالعے سے یہی مستنبط ہوتا ہے کہ تصورِ بحر کے بعد تصورِ مصرع وجود میں آیا۔ بحروں کے نام سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن پہلے ہر بحر کے حرفوں کی تعداد بتانا اور پھر یہ کہنا کہ چوتھائی حصہ کا نام مصرع ہے اور ہر مصرع میں یہ تعدادِ حروف ہوگی اور ان میں کوئی ترتیب ہوگی یا نہ ہوگی' اس سے وہی نتیجہ نکل سکتا ہے جو یہاں نکالا گیا ہے۔ اگر تصورِ مصرع کو تقدم حاصل ہوتا تو شاید یہ کہا جاتا کہ مصرع میں آٹھ حروف ہوں گے اور اتنے مصرعوں سے فلاں بحر بنے گی۔ اس سے انکار نہیں کہ بعض بحریں ایسی بھی ہیں کہ جن میں محض تین ہی تین مصرع ہیں لیکن اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ بحر کی تقسیم اور اس تقسیم سے حاصل شدہ جزو کا نام رکھنے کے بعد جب کسی بحر کے اجزا کے ذکر کا موقع آیا تو کوئی نیا لفظ نہ بنایا گیا بلکہ جو لفظ بنایا جا چکا تھا اس کے معنی میں توسیع کی گئی۔ یعنی بحر کے چوتھائی حصے کو مصرع کہنے کے یہ معنی ہیں کہ لفظ اپنے معنیٔ وضعی میں مستعمل ہے اور بحر کے تہائی حصے کو اس نام سے موسوم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کا استعمال معنیٔ مجازی میں ہوا ہے۔

حدود ہند کو پار کر کے جب ہم سرحد ایران میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں بھی جو کچھ نظر کے سامنے آتا ہے وہ اسی خیال کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔ اگر ایرانی اور ہندی ایک ہی بابا آدم کی اولاد ہیں اور کسی زمانے میں ایک ہی سرزمین سے اٹھے تھے تو ان کے طریق تخیل میں یکسانی ہونا طبعی و فطری ہے۔ ڈاکٹر ای۔ وی آرنلڈ اپنی تصنیف Vedic Meter in its Historical Development میں کہتے ہیں۔

"اوستا کے ابتدائی حصوں کا تقابل ظاہر کرتا ہے کہ شروع شروع کے زمزمہ سنجانِ وید کا دور اس زمانے کے قریب ہی تھا جب کہ نظم کی تقطیع یا وزن کا اندازہ محض تعداد حروف سے کیا جاتا تھا۔"

ایرانیوں کی قدیم ترین تصنیف گاتھا نظم میں ہے۔ مگر ان کا عروض معدوم ہو چکا۔ مستشرقین یورپ نے اس کی بحروں کی تعیین کی سعی ناکام کی ہے اور دعاوی کا دارومدار اسی پر ہے۔ کیونکہ تا ان کر انھوں نے اسے وزن میں رگوید سے ملا دیا ہے۔ ان کی تصنیفات سے استفادہ کر کے پور داؤد ایک ایرانی عالم نے گاتھا کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام سرود زرتشت رکھا ہے۔ چنانچہ انھیں کی سند پر دیباچے میں کہتا ہے۔

"ان قطعات منظوم کو جو نثر کے درمیان آئین گاتھا کہتے ہیں۔ زبانِ اوستا میں جو گاتھا ہے حقیقتہً وہ بھی ایک ایسی ہی چیز ہے۔ اس کے موزوں ہونے کے باعث ہی اس کا نام گاتھا یعنی سرود و نظم و شعر پڑا۔ لیکن یہ شعر زمانۂ حال کے ایران کے شعروں سے نہیں ملتے جلتے جن کا عروض عربی پر دارومدار ہے۔ بلکہ تمام اقوام ہند یورپی کے شعروں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً برہمنوں کی مقدس کتاب "رگوید" بیتوں اور آوازوں (Syllables) کی مدد سے چند شعروں کے قطعات بنائے گئے ہیں اور ہر بیت میں جو مقررہ مقامات پر سکتے مقرر کئے گئے ہیں وہ قطعاتِ وید کی یاد دلاتے ہیں۔ اس میں تردید کی گنجائش نہیں کہ گاتھا اور وید دونوں کی اساس و بنیاد ایک ہی ہے۔"

گاتھا میں پانچ باب ہیں اور ہر باب میں چند قطعات اور ہر قطعہ مصرعوں میں منقسم۔ ایک پارسی عالم کانگا نے گاتھا کی گجراتی تحریف (Transliteration) کر کے اس کی شرح لکھی اور بتایا ہے کہ ہر باب کے قطعات کے مصرعوں میں کہاں کہاں سکتہ آیا ہے۔ اس نے بھی مستشرقین یورپ کی تقلید کی ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ پہلے باب کے ہر قطعے کے ہر مصرع میں سولہ سولہ حرف ہیں۔ اور ساتویں حرف کے بعد سکتہ یا وقفہ (Caesura) ہے۔ وہ اتنا ہی کہہ کر چپ ہو جاتا ہے لیکن اس کی مدد سے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بحر شاید "رِشبھ گج وِلستا" ہے۔ جس کی تعریف پنگل رشی نے یہ کی ہے ऋषभगज विलसितं भरौ नौनगौ स्वरनवकौ اور شرح یوں ہے یادی भकारो फौ नकारास्त्रयो गकारश्च तत्र वृतं ऋषभगजविलसितं नाम स्वरभिर्नवभिश्च यतिः

جس کے ہر مصرع میں بھگن۔ رگن۔ تین نگن ہوں اس کو "رِشبھ گج وِلستا" کہتے ہیں۔ وقفہ یا سکتہ اس کے سات اور نو حرفوں کے درمیان آتا ہے۔ دراصل گاتھا کے اس قطعے کی کون سی بحر ہے اس سے بحث نہ کی جائے گی کیونکہ یہ طول امل ہے اور مقصد زیر بحث سے اس کا تعلق نہیں۔ قطعات کا مصرعوں میں منقسم ہونا اگر کسی بات پر دلالت کرتا ہے تو اس پر کہ بحر ہی مقدم ہے۔

لیکن ایشیا سے نکل کر جب ہم یورپ پہنچتے ہیں تو اس کا عروضی آمادۂ تردید نظر آتا ہے۔ یہ محض فریب نظر ہے۔ عروضی موکد اور غیر موکد اصول سے ارکان (Feet) بناتا یعنی ایقاع (Rhythm) کی حدود معین کرتا یا یوں کہئے کہ ایقاعی وحدتیں (Rhythmic units) گھڑتا ہے۔ پھر انھیں ایقاعی وحدتوں کی ایک خاص تعداد سے (Meter)

ں ہیں دو رکنوں کا ہونا لازمی ہے۔ عرضِ وجود میں لاتا ہے۔ بحر کے نام کے لئے وہ بے صفت [illegible]
دِ ارکان اور تخفیفِ جزو یا آخر دیا جائے تو اسے زحاف کہہ لیجئے) کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مثلاً اس نے ایک [illegible] ایک
وِ کد اصول سے ایک ایقاعی وحدت بنائی اور ایسی ایسی چار وحدتوں سے جن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا بحر
س کا نام رکھے گا *Trochaic dimeter acatalectic* جس کا پہلا لفظ نوعیتِ رکن، دوسرا تعدادِ ارکان
تیسرا اس کا سالم ہونا ظاہر کرتا ہے۔ بالکل یہی حال عربی کا ہے۔ مثلاً بحر متدارک مثمن سالم میں پہلا لفظ (متدارک) نوعیتِ رکن
سرا تعدادِ ارکان اور تیسرا ان ارکان کا آفاتِ زحاف سے مامون و مصئون ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مغربی عروضی مصرع یا سطر
وم (*Verse or Metrical line*) کے بعد قطعات (*Stanzas*) کی طرف توجہ کرتا ہے۔ ان قطعات کیا
بنی یکساں یا مختلف بحریں یا سطورِ منظوم چاہتا ہے رکھ دیتا ہے۔ سمجھ لیجئے کہ اس نے قطع میں پانچ سطریں رکھ دیں تو وہ
ں یا بند *Pentastich* ہوگا۔ عروضِ مغرب میں ایک لفظ *Hemistich* ملتا ہے۔ مگر اسے مصرع کا مرادف نہیں کہا
سکتا۔ جب کسی وجہ سے بحر ادھوری چھوڑ دی جاتی ہے یعنی اس میں ارکان معینہ سے کم رکن رکھے جاتے ہیں تو اسے اس نام سے
وم کرتے ہیں۔ یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ مغرب تصورِ مصرع سے عاجز و قاصر رہا۔

لگے ہاتھوں عروضِ عربی پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔ اس کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے کہ بحر مقدم ہے۔ یہاں بیت کے دو
ے کئے گئے ہیں اور ٹکڑے کا نام بیت کے معنی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ مصرع کے معنی ہیں دروازے کا ایک پٹ،
ں آدھا دروازہ۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے شاعر نے شعوری یا غیر شعوری حالت میں اپنا وجدان لفظوں میں ظاہر کیا اس کے بعد
ار وایقاع کے تجزیہ و تحلیل کی جستجو شروع ہوئی۔ اس نے آوازوں کی نوعیت اور ترتیب کی طرف توجہ دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
بیع کے لئے اصول (*Syllables* - اکشر) اور ارکان (ترکھ گن) ایجاد ہوئے۔ سب سے آخر میں ان آوازوں سے ایقاع و غنا،
اندازہ لگایا گیا یہی وجہ ہے کہ بحریں چھوٹی بڑی ہیں۔ کہیں کسی رکن کی آٹھ اکائیاں نکلیں، کہیں کم و بیش، اس لئے بحروں کے نام
ں تعدادِ ارکان کو بالخصوص دخل ہے۔ مثلاً بحرِ متدارک مثمن سالم یہ بتاتی ہے کہ اس میں ایک خاص طرح کے آٹھ رکن ہیں۔ بحرِ متدارک
مسدس بتاتی ہے کہ وہ چھ رکنوں پر مشتمل ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

آر، ڈی، بدلشیں

غزل

ارباب وفا بھی دنیا میں اک طرفہ تماشا ہیں گویا
تکمیل خرد جب ہوتی ہے، دیوانے بنتے جاتے ہیں

ہے خوب نظامِ قدرت بھی جلنا ہے کسی کا جی اٹھنا
جب شمعیں جلتی جاتی ہیں پروانے بنتے جاتے ہیں

کیا جانئے اس خاموشی کو یہ پگلی دنیا کیا سمجھی
ہم جتنا چپ چپ رہتے ہیں افسانے بنتے جاتے ہیں

اس پیکرِ رنگ و مستی کے آنے کا نظارہ کیا کہئے
فردوس صفت اجڑے اجڑے کاشانے بنتے جاتے ہیں

کیا لطف ہے ایسے جینے میں جب کوئی نہیں مونس اپنا
ہم جن کو اپنے سمجھتے تھے بیگانے بنتے جاتے ہیں

حافظ وہ محبت کا حاصل ہے ساقی بھی میخانہ بھی
ان مست آنکھوں کے کھلتے ہی پیمانے بنتے جاتے ہیں

[illegible]

غزل

ملتا ہے کچھ اس ڈھب سے خود کام و وفا دشمن
محسوس نہیں ہوتا یہ دوست ہے یا دشمن

عنوانِ شرارت ہے اک ہو شر با ظالم
موضوعِ عداوت ہے اک دوست نما دشمن

گلشن ہی میں پھولوں کی ہو جائے صبا دشمن
ساون میں بھی جھولوں کی بن جائے گھٹا دشمن!

مستِ مئے خود کامی فی الحال ہر انساں ہے
جب دوست نہ کام آئے کام آئیں گے کیا دشمن

اے کاش نہ ملتا میں ان مُردہ ضمیروں سے
روزانہ مرے در پر دیتے ہیں صدا دشمن

احباب کی کثرت کیوں یکسو مجھے رہنے دے
پیدا تو انھیں میں سے ہوتا ہے بنا دشمن

میں شیر دل انساں ہوں کیوں شیر سے گھبراتا
وہ میرا کھلا دشمن میں اُس کا کھلا دشمن

ہر چال قیامت ہے چلتا ہے نئی چالیں
روباہ صفت انساں ہے سب سے بڑا دشمن

انساں کا عدو انساں! حیراں میں اسی پر تھا
بندہ بھی خدا کا ہے کیا کوئی "خدا دشمن"

یہ "با ہمہ" عارف کیا وہ "بے ہمہ" صوفی کیا
ہیں سارے بنی آدم بے دشمن و با دشمن

گردش نے زمانہ کی اک نقطہ مٹا ڈالا
آگے تھی قضا دشمن ہے آج فضا دشمن

دربار میں ملتا ہے روزانہ عروج ان کو
سرکار سے پاتے ہیں ہر روز صلہ دشمن

دشمن کے خمستاں میں احباب کریں نالے
احباب کے گلشن میں ہوں نغمہ سرا دشمن!

یارانِ وطن شاید منظور یونہیں خوش ہیں
تُو دوست نہ بن ان کا اُن کو نہ بنا دشمن

علی منظور

رقص

دھم - دھم - دھما دھم - دھم - موت کی دیوی کا رقص جاری ہے - اور وہ اپنے رقص کا دائرہ دم بدم وسیع تر کرتی چلی آ رہی ہے اس کے رقص کی رفتار جس کے لوازمات میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے، تیز تر ہوتی جا رہی ہے - دھم - دھما دھم - وہی طبلے کی تھاپ، ایک بہت بڑے طبلے کی تھاپ جس پر تمام کائنات رقص کر رہی ہے - لیکن ڈر دیے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے - ہر سو اندھیرا چھایا ہوا ہے، گہری تاریکی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا - قدرتی اندھیرے سے نہیں، بلکہ انسان کے خود ساختہ اندھیرے کی وجہ سے - دھوئیں کے بے پناہ بادلوں کی وجہ سے جو آگے بڑھنے کی خاطر آڑ لینے کے لئے پھیلا دیئے گئے ہیں - یہ ران پر کا زخم تو کمبخت خاص طور پر تکلیف دے رہا ہے - کسی کل چین نہیں - گولیاں ہیں کہ سنسناتی ہوئی پاس سے گزر رہی ہیں - توپوں نے اپنے دہانے کھول دیئے ہیں - اور آگ اگل رہی ہیں - ہوائی جہاز اوپر ہواؤں سے آگ اور آگ نما انسان نیچے پھینک رہے ہیں - نیچے ٹینک اور سرنگیں انسانوں کے پرخچے اڑانے میں مصروف ہیں - اور میں اوندھے منہ اس پہاڑی پر پڑا سوچ رہا ہوں کہ زمین کے اس چھوٹے سے قطعے کو حاصل کرنے کے لئے کتنی جانیں ضائع کی گئیں - کتنا خون بہایا گیا - کتنی دفعہ ہم نے اس قطعہ زمین پر قبضہ کیا اور پھر کتنی دفعہ ہماری جان توڑ مزاحمت کے باوجود یہ قطعہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا - اور ہم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے - میرے اردگرد ہر طرف لاشوں کے انبار لگے ہیں - میرے اپنے زخموں سے خون جاری ہے اور ایک طرح کی کمزوری اور نقاہت غلبہ پاتی جا رہی ہے - لیکن اس حالت میں بھی تم مجھے یاد آ رہی ہو - مصیبت میں خدا یاد آتا ہے - لیکن اس وقت تو بس تمہاری یاد ہے - جس نے باقی تمام یادوں پر غلبہ پا لیا ہے - چھن چھنا چھن - یہ رقص کی آواز، یہ گھنگھروؤں کی صدا کدھر سے آ رہی ہے - یہ روح افزا موسیقی جو میرے مضمحل حواس میں پھر سے زندگی بھر رہی ہے -

پھر وہی پرانی باتیں، گزرے ہوئے واقعات - یادوں کے گہرے دھندلے نقوش پھر سے اجاگر ہو رہے ہیں - تمہارے متعلق وہ تمام باتیں جو اب تک ایک مدفون خزانے کی طرح محفوظ تھیں - ان پر سے مٹی کی تہہ اٹھتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے - تمہارے وہ نازک اور لطیف پاؤں اور ان نقرئی ٹخنوں پر ننھے ننھے سے گھنگھرو جیسے پھولوں سے لدی شاخ، اس روز نہر کے کنارے ریت پر ایسے پڑے تھے جیسے چاندنی کی خاموشی میں گھاس پر شبنم، اور ان گھنگھروؤں کی نقرئی مدھم سی صدا پر پانی کی سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں بنتیں اور بگڑتیں - نہر کا پانی آگے بڑھ بڑھ کر کسی عقیدت مند پجاری کی طرح تمہارے پاؤں چوم رہا تھا - اس روز ہمارے اور تمہارے گھر کے سبھی افراد نہر پر پکنک کی غرض سے آئے ہوئے تھے - آم ٹھنڈے کرنے کے لئے نہر میں ڈال دیئے گئے تھے اور جب تک وہ ٹھنڈے ہوں، میں تمہیں سائیکل سکھانے کے بہانے نہر کے کنارے کنارے ذرا دور لے آیا تھا - نہر کی دوسری طرف دور کوئی اور پارٹی آئی ہوئی تھی - سائیکل کا تو محض بہانہ تھا اور اگر بہانہ نہ ہوتا تو میں ایسی سواری کی تمہیں کبھی تلقین نہ کرتا - لوہے کا ایک ڈھانچہ نسوانیت اور نزاکت سے مبرا - بالکل بے ہنگم - ایسے ہی بیٹھے بیٹھے ٹانگیں چلاتے جاؤ - اچھا بھلا آدمی سائیکل پر بیٹھ کر کچھ اور ہی معلوم ہونے لگتا ہے یہاں بھی دفتر میں چند ایک لڑکیاں خاکی وردی میں ملبوس سائیکل پر بیٹھ کر آیا کرتی ہیں - سائیکل ان کے نیچے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے عشق پیچاں کی بیل کے نیچے لوہے کا ڈھانچہ جو بیل کو اوپر اٹھانے کی جگہ الٹا اپنے گرد لپیٹ لیتا ہے اور اس کی تمام خوبصورتی

شعریت اور نزاکت تباہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس روز ہم دونوں دیر تک سارے پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے رہے۔ مستقبل سے بے نیاز، جیسے یونہی بیٹھے رہیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ تم اپنی سہیلی لیلیٰ کی باتیں کرتی رہیں۔ اس کا کھانے کا پروگرام کئی ایک ڈاکٹروں اور ماہرین خوراک کی متفقہ تجویزوں سے بنا تھا۔ جس میں کمی ہو سکتی تھی لیکن بیشی نہیں۔ کس طرح اس نے بیمار ہو کر اپنا جسم نازک سا بنا لیا تھا۔ مہارانی پدمنی جیسا۔ اگر کسی مہینے میں دو چار روز کے لئے بیمار نہ ہوتی تو اداس رہنے لگتی اور سوچتی کہ اس کے جسم پر چربی کی تہ چڑھ آئی ہے، اس کا جسم بھدا اور کرخت ہونا شروع ہو گیا ہے اور اب اس کا جسم بالی وڈ کی ایکٹرسوں کی طرح متناسب اور نازک نہیں رہے گا۔ اسے ہمیشہ ان چیزوں کی تلاش رہتی جو اسے نازک بنا سکیں۔ ہوا میں اڑنے کے قابل۔ بس عمر خیام کی رباعی۔ اتنے میں تم نے خود محسوس کیا کہ ہمیں کافی دیر ہو چکی ہے۔ اور میں نے چلتے وقت سائیکل کے پچھلے پہیے میں سے ہوا نکال دی تھی۔ تاکہ دیر کا جواز پیش کر سکوں۔

اور ہم اسی طرح چلتے چلاتے، اٹھلاتے بہتے ہوئے پانی کی رفتار کے ساتھ مقابلہ کرتے واپس پل پر پہنچ گئے۔ ٹھنڈے کئے ہوئے آم سب مزے سے کھا رہے تھے اور جو آم بھی کھٹا نکلتا۔ بالکل ایک اور اسی طرح کا نکال کر تم اس کی نسل، قسم اور لذت بیان کرتی ہوئی میری طرف بڑھا دیتیں اور میں جھنجھلا کر جب اسے پھینک دیتا تو ایک قہقہہ بلند ہوتا۔ جیسے ہوا پانی کی سطح پر سے اٹھاتی ہوئی دور لے جاتی۔ آموں سے زیادہ تو وہ تمہاری بے اختیار مسکراہٹ شیریں تھی۔ لیکن اس روز تم نے بھی تو زیادہ آم نہیں کھائے تھے۔ شاید تمہیں بھی نازک بننے کا خیال آ گیا تھا۔ وہ تمہارا چھوٹا سا بھائی گیارہ کلیوں کے بعد بارہواں پھول اس کے کتنے لاڈ ہو رہے تھے۔ کتنا پیار، کتنے چونچلے، لیکن اس کے باوجود وہ کسی درخت کا آخری پھل معلوم ہو رہا تھا۔ اس درخت کا جو پھل دے دے کر اکتا گیا ہو۔ تھک گیا ہو۔ حتیٰ کہ اس کے پھلوں میں وہ رونق اور توانائی نہ رہی ہو، جو اس کی خصوصیت تھی۔ اور یہ آخری پھل۔ زرد سوکھا سا، ناتوان اور کمزور۔ لیکن اس پر بھی وہ سب کی آنکھ کا تارا تھا۔ کنبہ کی امیدوں کا مرکز۔ سبھی اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔

اس کے بعد میں لاہور آ گیا۔ یا یوں کہو کہ حادثات کے ایک جھونکے نے مجھے لاہور لا پھینکا اور تم اچانک ایک رات آ دھمکیں تمہارے ساتھ تمہاری سہیلی لیلیٰ بھی تھی۔ وہی نازک سی لیلیٰ، چنچل، چنبیلی کی ایک ٹہنی۔ واقعی عمر خیام کی رباعی۔ چغتائی کے آرٹ کا زندہ نمونہ۔ تم دونوں نے اس رات آ کر میری پریشانی کو دور کر دیا تھا جو مالک مکان کی طرف سے مجھے ہو رہی تھی۔ میں نے وہ مکان اپنے آپ کو شادی شدہ بتا کر لیا تھا۔ کنواروں کو تو کوئی مکانوں کی بو بھی سونگھنے نہیں دیتا۔ اور تمہاری آمد سے پہلے میں مالک مکان کو یقین دلا چکا تھا کہ آج کل میں بس ان کی آمد آمد ہے۔

اس روز جب ہم سینما دیکھ کر لوٹے تو تم دونوں نے گھر پہنچ کر سادھنا بوس جیسا ناچ ناچا تھا۔ اور میرا کمرہ ٹھمکوں، تیوریوں اور گھنگھروؤں کی مدھم سی صداؤں سے گونج اٹھا تھا۔ اور میں سوچتا تھا کہ اب اس مکان کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ کیونکہ تمہارے قدموں سے اب وہ معطر ہو چکا تھا اور چھوڑتا بھی کیسے، مالک مکان پر تو اب میرا سکہ جم ہی چکا تھا۔ اور اپنے بیان کی تصدیق میں ایک چھوڑ میں نے دو لڑکیاں پیش کر دی تھیں اور اس لئے میں نے تم دونوں کو ہمسایوں کے گھر بھی بھیجا تھا تاکہ میری شرافت کا پوری طرح رعب جم جائے۔ تم دونوں کے چلے جانے کے بعد کیا بتاؤں کہ کیسے کیسے لذیذ کھانوں سے میری تواضع کرتے رہے اور ہمیشہ ہی ایسے کھانوں کے کتنے خوشگوار وعدے ہوتے رہے۔

اس روز دریا پر جب ہم بوٹنگ کے لئے گئے تھے تو چوکیدار جو مجھے کالج کے زمانے سے جانتا تھا تمہیں ساتھ دیکھ کر

[illegible] رہا تھا ۔ مجھ اس کا انجام آتا تھا ۔ بار خاطر ہوا جا رہا تھا ۔ تمہارے ساتھ ہوتے [illegible] شادی کر لی ہے ۔ ہمارے ملک میں لڑکی کا ساتھ ہونا یا تو شادی کی علامت ہے اور یا پھر عیاشی کی ۔ [illegible] سیاہ [illegible] میں ملبوس تم بالکل طوفان میل کے ڈاکو کی طرح معلوم ہو رہی تھیں ۔ وہ نظم " اُف ری جوانی ہائے زمانے " مجھے اب بھی یاد آ رہی ہے جو اس رات چاندنی میں لیلیٰ نے مدھم سُروں میں گائی تھی ۔ کیا سماں بندھ گیا تھا ۔

اور پھر لارنس باغ میں میگنولیا ، آئس کریم ، خبر نہیں لوگ کیسے کھاتے تھے ۔ چاکلیٹ میں لپٹی ہوئی ۔ اوپر سے میٹھی لیکن اندر سے تلخ ۔ کسی انگریز افسر کی طرح ، بس وہی کافی والا حال تھا لوگ اسے نہیں پسند کرنے لیکن پھر بھی پیتے ہیں ۔ فیشن کے طور پر ۔ باغ میں پہاڑی کی گود میں وہ چھوٹا سا ریسٹورنٹ جہاں ملٹے کارس اور دودھ پینے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوہ قاف کی کسی کنج میں بیٹھے ہوں ۔ اس روز کوئی پناہ گاہ نہ ملنے کی وجہ سے بارش میں ہم بالکل بھیگ ہی تو گئے تھے ۔ تانگہ بھی کوئی نہ ملا اور گھر تک پیدل آنا پڑا تھا ۔ بھیگے ہوئے کپڑوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ تمہارے کپڑے جسم سے بالکل چپک گئے تھے اور اس کی گلابی رنگوں شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی تھیں ۔

اس کے بعد ——— یہ سارا طلسم ٹوٹ گیا ۔ اور اپنے بہت سے بھائیوں کی طرح جن کے پاس طاقت ہو لیکن اس کا صحیح مصرف معلوم نہ ہو ، میں فوج میں بھرتی ہو گیا ۔ اوروں کی طرح دو چمکتے ہوئے ستارے میرے کندھوں پر بھی مسکراتے رہے یہ اپنی ہی بے بسی اور مجبوری پر ۔ مجھے یاد ہے کہ یہاں میدان جنگ میں آتے وقت تم اور لیلیٰ دونوں مجھے الوداع کہنے کے لئے سٹیشن تک آئی تھیں ۔ ایک انگریز فوجی افسر گاڑی کے ڈبے کا دروازہ روکے کھڑا تھا اور اندر جگہ ہونے کے باوجود کسی کو داخل نہ ہونے دیتا تھا ۔ تمہاری آنکھیں اس وقت میری طرف تھیں ، گویا کہہ رہی ہوں کہ تم تو ایسے نہ ہو جاؤ گے ۔ تمہاری آنکھوں میں ان دیکھی اور ان سنی حکایات کا عکس تھا ۔ اور التجا بھی ۔ اور میرے ذہن میں اس وقت یہ مصرع کہ " تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی " بار بار گھوم رہا تھا ۔ لیلیٰ اس وقت سفید قمیص اور شلوار میں کچھ زیادہ ہی نازک دکھائی دے رہی تھی ۔ تمہاری آنکھیں تمہارے دل کی غمازی کر رہی تھیں ۔ مجھے یاد پڑتا ہے جیسے وہ کہہ رہی تھیں کہ ہم پھر نہ ملیں گے ۔ کبھی نہ ملیں گے شاید ۔ میں تمہاری ڈھارس بندھا رہا تھا لیکن میرا اپنا دل بھی تو بیٹھا جا رہا تھا ۔ خبر نہیں کیوں ؟ وہ پھولوں کا ہار جو تم اور لیلیٰ نے میرے لئے گوندھا تھا اب بھی میری جیب میں موجود ہے اور تم سے وابستہ یہی ایک چیز ہے جو آخری وقت تک میرا ساتھ دے گی ۔

درد پھر زیادہ ہو گیا ہے اور ران کے زخم سے تو خون بند ہی نہیں ہوتا ۔ اردگرد کا دھواں کچھ کم ہو گیا ہے ۔ جس طرف نظر دوڑاتا ہوں لاشیں ہی لاشیں نظر آتی ہیں ۔ انسانی لاشیں کچلی ہوئی پچکی ہوئی ۔ کچھ عجیب سماں ہے ، کسی کا دھڑ ہے تو سر کا پتہ نہیں کسی کی صرف ٹانگیں ہی بچی ہیں ۔ بموں کی وجہ سے چند ایک کا چہرہ کچھ ایسا بگڑا ہے کہ بیان سے باہر ہے ۔ خون کے دریا کے متعلق اب تک سُن ہی رکھا تھا ، یہاں یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہے ۔ ایک کی شاہ رگ کچھ اس طرح کٹی ہے کہ اس کے گرم خون کا فوارہ دُور لاشوں پر چھینٹے اُڑا رہا ہے ۔ مکھیاں اور چیلیں باقاعدہ قطار اندر قطار حملہ آور ہو رہی ہیں اور خون کا یہ دریا نیچے پہاڑی کی طرف رواں ہے ۔ کئی ہزار انسان اس کے اردگرد مرے پڑے ہیں ۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے یہ لوگ کیسے جوانمرد تھے ۔ کتنے کڑیل ، کتنا دم تھا ان میں ۔ کتنے تُند تھے یہ ۔ لیکن لاجونتی کے پودے کی طرح موت کی دیوی کے لمس نے ان کا اس دنیا میں آنا نہ آنا برابر کر دیا ہے گاجر مولی کی طرح کاٹنا بھی ایک مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے ۔ اس سے بھی جلدی یہ لوگ کٹ گئے ۔ ان لوگوں کے ساتھ ان کے گھر والوں کی کیا کیا اُمیدیں نہ وابستہ ہوں گی ۔ کتنی جوان بیویاں اب تک ان کی راہ تک رہی ہوں گی ۔ کتنے بچے اب تک ان کے پیار بھر

ہاتھوں کا مزا لے رہے ہوں گے - کتنی بوڑھی ماؤں کی زندگی کا چراغ بھی ان کے ساتھ ہی بجھ گیا ہوگا - میری اپنی کمپنی کے بہت سے جوان میرے ارد گرد کٹے پڑے ہیں - بھاگ سنگھ - ہریا - نند وا اور غلام نبی سب کے سب چھوڑ گئے - لیکن آخر دم تک ڈٹے رہے - جب تک ان کی جان میں جان رہی، مجھے بچاتے رہے حتیٰ کہ خود گر گئے - ان چار برس میں کتنی دفعہ ہم نے موت کا مقابلہ کیا تھا - اور کتنی ہی دفعہ اُس کے سرد چنگل سے نجات پائی تھی -

تپتے ہوئے صحراؤں میں، آگ اور ریت کے بگولوں میں، بارش اور کیچڑ کی لامتناہی طاقتوں، خلاف اور خون کو منجمد کر دینے والی برفانی ہواؤں میں کیسے کیسے کٹھن اور تکلیف دہ لمحات کا ہم سب نے اکٹھا مقابلہ کیا تھا - کیسی کیسی پُر پیچ اور پہلوان وادیوں کو ہم عبور کر چکے تھے - کیسی کیسی ناامیدیوں اور شکستوں کے احساس پر ہم سب نے مل کر فتح پائی تھی - لیکن اب سب بے بس پڑے ہیں، ضرورت سے بے نیاز، ایک دوسرے کے دکھ درد سے لاپروا - افسر اور سپاہی، کالے اور گورے - ہندوستانی اور نیوزی لینڈ... سب یکساں پڑے ہیں - موت کے سرد ہاتھ نے ان سب کو یکجا کر دیا ہے، جو اپنی زندگی میں کبھی یہ نہ ہو سکتے - میرے جسم پر گننے لگو تو کئی زخم ہوں گے لیکن ان سب میں سے یہ ران کا زخم کاری ثابت ہو رہا ہے - میرا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا ہے - تم دیکھ پاؤ تو شاید ڈر کے مارے چیخ اٹھو - اکثر زخم میرے جسم کے سامنے حصہ پر ہیں - پشت پر نہیں، یہ نہ سمجھ لینا کہ میں نے پیچھے بھاگتے ہوئے یہ زخم کھائے ہیں - ہم غلام سہی لیکن بزدل نہیں ہیں - ہمارے گورکھے سپاہیوں کو دیکھ کر دشمن کا خون خشک ہو جاتا ہے -

پیاس محسوس ہو رہی ہے - بوتل کمبخت کہاں گئی - اور ڈونگا وہ تو دور پڑا ہے - اتنی ہمت نہیں ہے کہ اسے اٹھا لاؤں! مجھے یاد ہے کہ اس ڈونگے کے کناروں سے میں نے ایک دفعہ تمہارے لب ملائے تھے - بوتل میں بھی چھید ہو گیا ہے - یہ کمبخت بھی آخری وقت میں دغا دے گئی - میرا بھی وقت قریب ہے - ریڈ کراس کے آدمی زخمیوں کو اٹھانے کے لئے آئیں گے - لیکن میں انھیں اپنے اٹھانے کی تکلیف نہ دوں گا - اس سے پہلے ہی میں کسی اور دنیا میں پہنچ جاؤں گا - جہاں انسان ایک دوسرے کے شکاری نہ ہوں - جہاں وہ ایک دوسرے کے خون سے ہولی نہ کھیلتے ہوں - جہاں تمام نفع بخش ذرائع ان کے اپنے ہی نقصان کی طرف نہ موڑ دیئے جائیں - جہاں نہ بم ہوں، نہ گولیاں، نہ ٹینک اور نہ آسمان سے برستی ہوئی یہ آگ، بس سکھ اور سکون، موت کا ابدی سکون پھیلتا جا رہا ہے اور مجھے بھی خاموش ہونے پر مجبور کر رہا ہے - دھم دھما دم، موت کی دیوی کا رقص اب تک جاری ہے، اور اس طلائی گھنگھروؤں والی حسینہ کے رقص کی آواز دور ——— دور ہوتی جا رہی ہے -

(حلقہ ارباب ذوق لاہور میں پڑھا گیا) — یزدانی ملک

"طلسم زندگی"

اس کتاب کی تعریف میں صرف دو لفظ کہوں گا - "خوبصورت و نیک سیرت" - سالِ اشاعت کی جستجو ہو تو یہ ہے -

۱۳۶۵ھ

"طلسم زندگی" از جناب میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر

۱۹ ۶ ۴۳

——— کریم کتابی (ہوشیارپوری)

پاگل کوّے

پاگل کوّے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

مجھ سے تو خفا ہے سارا جہاں، ہے کون یہاں آنے والا

بری دیوار پہ تو بیٹھا کیوں پاپی شور مچاتا ہے،
مت بول یہاں سے اب اُڑ جا کیوں دل کو اور دکھاتا ہے،

دل کانوں کو جھٹلاتا ہے کیوں نظروں کو بہکاتا ہے
سینے کی دبی چنگاری کو کیوں دے کے ہوا بھڑکاتا ہے

اُٹھتا ہے مرے سینے سے دھواں، ہے کون یہاں آنے والا

پاگل کوّے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

لے کوّے! سُن بات مری گھبرا کے ڈگر کیا بھول گیا
کچھ غور تو کر کچھ سوچ تو لے جلدی میں نگر کیا بھول گیا

ں کے گھر تجھ کو جانا تھا، تو اُس کا گھر کیا بھول گیا
کیا نقشہ تجھ کو یاد نہیں، دیوار و در کیا بھول گیا

سچ مان نہیں ہے یہ وہ مکاں، ہے کون یہاں آنے والا

پاگل کوّے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

ے پیارا باپ تھا جس کی ہے اس باغ میں تربت برسوں سے
اک بڈھی ماں ہے گاؤں میں جس کو ہے نقاہت برسوں سے

ے بھائی کہیں پردیس میں ہے جس سے ہے عداوت برسوں سے
کچھ ہیں اہلِ رشتہ جن سے ہے ترکِ محبت برسوں سے

پھر سوچ سہی تو بھی ناداں، ہے کون یہاں آنے والا

پاگل کوتے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

بھولے کوتے! میرا ہے یہاں، اپنا اور بیگانہ دشمن
جو پہلے راز کے محرم تھے، اب وہ ہیں در پردہ دشمن
دشمن ہے وطن میں ہمسایہ، پردیس میں ہم پیشہ دشمن
بس اور زیادہ کون کہے۔ خود اپنا ہے سایہ دشمن

پھر کس کے آنے کا ہو گماں، ہے کون یہاں آنے والا

پاگل کوتے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

تیری بولی سے اے پنچھی! اک پچھلی چوٹ ابھر آئی
ہائے وہ زمانہ چلتی تھی جب ٹھنڈی ٹھنڈی پروائی
جب دھان کی مینڈھ پہ بجتی تھی الفت کی سریلی شہنائی
جب وہ باتیں کرتے کرتے لیتی تھی پیار کی انگڑائی

اب وہ بھی خفا ہے جانِ جہاں، ہے کون یہاں آنے والا

پاگل کوتے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

جھوٹے کوتے! اب اُڑ بھی جا، یاں آون ہار کوئی نہیں
اب میں نہ کسی کا پیارا ہوں، اب میرا پیارا کوئی نہیں
ساتھی ہے سلامؔ اپنا ہی دم، بس اور سہارا کوئی نہیں
گرداب، سمندر، تاریکی، طوفان، کنارا کوئی نہیں

منجدھار میں اک کشتی ہے رواں، ہے کون یہاں آنے والا

پاگل کوتے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

سلام سندیلوی

ایمفی تھیٹر اور گلیڈی ایٹر

ایمفی تھیٹر دو یونانی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ ایک "ایمفی" ہے جس کے معنی "دونوں طرف" کے ہیں اور دوسرا تھیٹر دوں "تھیٹر" جس کے معنی "تھیٹر" یا "تیاتر" کے ہیں۔ اس طرح اگر ہم "ایمفی تھیٹر" کے معنی پر غور کریں تو اس کے معنی "دوطرفہ تھیٹر" کے ہوئے۔ مگر تھیٹر کی اصطلاح میں ایمفی تھیٹر سے مراد وہ نشست گاہ ہوتی ہے جو کہ تھیٹر کے ایک بلند مقام پر صرف چند لوگوں کے بیٹھنے کے لئے بنائی جاتی ہے۔ آج کل اس کو "باکس" کہتے ہیں۔ بعض حضرات "ایمفی تھیٹر" سے مراد بگچر تھیٹر" لیتے ہیں۔ قدیم رومی "ایمفی تھیٹر" ایک ایسی عمارت کو کہا کرتے تھے۔ جو کہ بیضاوی شکل کی ہوتی تھی اور جس میں "گلیڈی ایٹروں" کو لڑنے اور انسانی خون بہانے کے لئے اُتارا جاتا تھا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ بے بس انسانوں کو خوفناک درندوں کے مقابلہ کے لئے تنہا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ درندے کئی کئی دن بھوکے رکھے جاتے تھے۔ تاکہ جب وہ اکھاڑے یا "ارینا" میں آئیں تو وہ اپنے شکار کو سامنے کھڑا دیکھ کر ٹوٹ پڑیں۔ اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے آتش شکم کو ٹھنڈا کریں۔ ان وحشیانہ حرکتوں کے علاوہ دوسرے تفریحی کھیل اور تماشے بھی انھیں مقامات پر کئے جاتے تھے۔ ان عمارتوں کے اندرونی حصّوں میں تماشائی اس طرح بٹھائے جاتے تھے کہ ان کی نشست سے خود بخود ایک "نصف دائرہ" بن جاتا تھا۔

سب سے پہلا ایمفی تھیٹر درحقیقت دوطرفہ تھیٹر تھا۔ یہ تھیٹر چوب کا بنایا گیا تھا۔ اس کی بنیاد اس طرح چولوں پر رکھی گئی تھی کہ وہ بآسانی دو حصّوں میں منقسم کر دیا جاتا تھا۔ اور ہر نصف حصّہ ایک "نصف دائرہ" بناتا تھا۔ اس کی ساخت کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ یہ دونوں نصف حصّے ایک دوسرے کے پیچھے بھی لے آئے جا سکتے تھے۔ اس طرح اگر ضرورت ہوتی تھی تو ان دونوں حصّوں سے دو تھیٹروں کا کام بھی لیا جا سکتا تھا۔ ایسے چوبی "ایمفری تھیٹر" زیادہ کامیاب نہ ہوئے۔ اس وجہ سے اس کی پختہ عمارت تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آگسٹس (Augustus) کے عہد حکومت میں اسٹیٹی لیس ٹارس (Statilus Taurus) نے ایک پختہ "ایمفی تھیٹر" تیار کرایا۔ جس میں بہترین پتھر استعمال کیا گیا۔ مغربی مصنفین نے اس عمارت کی بہت زیادہ تعریف کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس میں پتھر کے علاوہ اور کوئی چیز استعمال نہیں کی گئی۔ انھوں نے یہ تحریر نہیں کیا کہ اس میں "چوب" سے بھی کام لیا گیا تھا یا نہیں۔ مگر روم کے ایک واقعہ کے ظہور پذیر ہونے سے ہم کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت صرف پتھر ہی کی نہیں بنائی گئی تھی۔ بلکہ اس کا کچھ حصّہ ایسا بھی تھا۔ جس میں لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ شہر کے چپہ چپہ میں لوگوں نے آگ لگا دی۔ اس ہنگامہ میں یہ تھیٹر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اس کا ایک حصّہ جل کر بالکل برباد ہو گیا اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس تھیٹر میں صرف پتھر ہی استعمال نہ کیا گیا تھا بلکہ اس کی تعمیر میں لکڑی یا اسی طرح کی کسی اور چیز سے بھی کام لیا گیا تھا۔

ویسپیسین (Vespasian) کے عہد حکومت تک لکڑی اور پتھر کے ایمفی تھیٹروں کا سلسلہ تعمیر جاری رہا ان میں سے کچھ تو ایک مدت تک قائم رہے اور کچھ اپنی چند روزہ بہار دکھا کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ اسی بادشاہ کے دورِ حکومت میں ایک زبردست ایمفی تھیٹر کی عمارت "ایمفی تھیٹرم فلاویم" (Amphi Theatrum Flavium) کے نام

یم ہوئی۔ مگر اس کی حیات میں یہ تھیٹر پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ ۸۰ء میں ٹیٹس (Titus) کے عہدِ حکومت میں اس کی
میل ہوئی۔ یہ عمارت روم کے بہترین پرفضا مقام پر بنائی گئی تھی جو روم کے سات پہاڑوں کے درمیان تھا۔ یہ عظیم الشان
ارت اہلِ روم کے فنِ تعمیر کے منتہائے کمال کی مظہر دیتی ہے۔ آج بھی اس کے کھنڈرات دیکھ کر لوگوں کی زبان تعریف کئے بغیر
ہیں رہ سکتی۔ جس وقت اس عمارت کا افتتاح ہوا اس وقت پانچ ہزار جانوروں کی قربانی کی گئی۔ یہ تھیٹر بیضاوی شکل کا بنا ہوا
تھا۔ اس کی لمبائی پانچسو چوہتر فٹ تھی اور چوڑائی چارسو سڑسٹھ فٹ۔ اس کی بنیاد اسی ڈاٹوں پر رکھی گئی تھی۔ ...تعمیر
ن انہی ڈاٹوں پر کثیر تعداد میں محرابیں تیار کرائی گئی تھیں۔ اس تھیٹر کا بیرونی حصہ سنگِ مرمر کا بنایا گیا تھا۔ اس کی خوبصورتی
خیال خاص طور پر رکھا گیا تھا اور اس کو خوشنما بنانے کے لئے جابجا بُت نصب کئے گئے تھے۔ اس کے اندرونی حصوں میں سنگ
مر کی نشست گاہیں بنائی گئی تھیں جن پر نرم نرم گدے لگائے گئے تھے۔

یہ نشست گاہیں باقاعدہ درجوں پر مشتمل تھیں۔ ان میں باقاعدہ چبوترے بنے ہوئے تھے۔ اس تھیٹر کی جو بہترین جگہ تھی۔
درجہ اوّل "کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ وہ "بادشاہ وقت" کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ اور وہاں پر "شاہی تخت" رکھا جاتا تھا۔ وزرا
و امرا بھی حسب مراتب جگہ پاتے تھے۔ ننس (Nuns) یا اُن کنواری گوشہ نشین لڑکیوں کو بھی اسی چبوترہ پر جگہ دی جاتی
تی۔ جو دنیاوی جھگڑوں سے دُور رہ کر اپنی زندگی یادِ خدا میں گزارتی تھیں۔ کیونکہ اوّل تو اس جنگ کے مناظر اس قدر خوفناک
ہوتے تھے کہ وہ رقیق القلب ہونے کی وجہ سے بیہوش ہو جاتی تھیں۔ دوسرے دورانِ جنگ میں مرد بالکل برہنہ بھی ہو جاتے
تھے۔ نیچے کے چبوتروں پر عوام کو جگہ دی جاتی تھی۔

اس ایمفی تھیٹر میں اسی ہزار تماشائی بیک وقت ایک تماشے سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ اس کے دروازے وومیٹوریز
(Vomitories) کہلاتے تھے۔ بہت بلند اور عظیم الشان تھے۔ یہ دروازے اس انداز سے بنائے گئے تھے جس سے کسی طبقہ کے
لوگوں کو تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اُمرا، رؤسا، اور عوام سب اپنے اپنے مخصوص دروازوں میں سے گزر کر اپنی اپنی جگہوں پر انتہائی
آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔ کسی قسم کی گڑبڑ پیدا نہ ہوتی تھی۔ غرض اس تھیٹر کی تعمیر میں تماشائیوں کو ہر ممکن آرام پہنچانے کا
خیال رکھا گیا تھا۔ دھوپ اور بارش سے بھی تماشائیوں کی حفاظت کا باقاعدہ انتظام تھا۔ چھت گیریاں اور شامیانے ایسے موقعوں
پر استعمال کرتے تھے۔ اکثر موقعوں پر فوارے بھی چلتے تھے۔

اس تھیٹر کے وسط میں "ارینا" یا اکھاڑہ "بنا ہوا تھا جس میں بہترین ریت بچھوائی گئی تھی۔ جب اس میں پانی کی ضرورت ہوتی
تو زمین دوز نلوں سے پانی دیا جاتا تھا۔ جب کسی موقع پر نہروں اور جھیلوں کے دکھانے کی ضرورت ہوتی تھی تو ذرا سی دیر میں وہی
کھلا میدان ایک زبردست جھیل اور متعدد نہروں کی صورت میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔

حکومتِ وقت اس کی سرپرستی کرتی تھی۔ بادشاہ وقت ہر ممکن مالی امداد کیا کرتا تھا۔ ان کو ہر زیبا اور نازیبا حرکت کرنے کی
بھی پوری اجازت تھی۔ حکومت کی سرپرستی کا اندازہ اس سے بخوبی ہو جائے گا کہ بعض اوقات ایمفی تھیٹروں میں تمام سامان سونے
اور چاندی کا ہوا کرتا تھا۔ جو حکومت کی طرف سے عطا کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ درندوں سے حفاظت کے لئے جو تار اکھاڑے کے
گرد لگائے جاتے تھے اکثر سونے کے ہوتے تھے۔ اس کے بیرونی حصوں میں محراب دار راستے ہر منزل پر بنے ہوئے تھے۔ یہ راستے سپاٹ
تھے بلکہ ان میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہر منزل کے بیرونی حصے میں برآمدے بھی تھے جو تھیٹر کے چاروں طرف ایک ہی طرز کے بنے
ہوئے تھے۔ ان برآمدوں کی وجہ سے ایک آسانی یہ تھی کہ ضرورت کے وقت اس تھیٹر کے ہر حصہ میں ہر انسان بغیر کسی تکلیف کے

پہنچ جاتا تھا۔ اس کے بیرونی اور اندرونی حصوں کے درمیان بھی برآمدوں کا ایک سلسلہ [illegible] ہوئے
ہوئے تھے۔ اس عمارت کے چار راستے سب سے زیادہ بلند اور چوڑے تھے جو کہ چوڑے راستوں کے ذریعے [illegible] ملے
ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ راستے چھوٹے بھی بنے ہوئے تھے جن سے بادشاہ وقت اور امراء وغیرہ گزر کر اپنی اپنی نشستوں پر پہنچ جایا کرتے
تھے۔ "ارینا" میں داخل ہونے کے لئے دو بڑے محراب دار دروازے تھے جو کہ "گلیڈی ایٹروں" اور درندوں کی آمد کے لئے مخصوص تھے۔ یہ لوگ
جلوس کی شکل میں آراستہ ہو کر "ارینا" میں داخل ہوتے تھے۔ ویرونا (Verona) اور پیسٹم Paestum ایمفی تھیٹروں کے یہ
دروازے اب تک موجود ہیں۔ ان راستوں کے علاوہ عوام کے آنے کے راستے علیحدہ تھے۔ نسمیز Nimes ایمفی تھیٹر
دو منزلہ تھا۔ اس میں متعدد محراب دار راستے تھے۔ اس تھیٹر کی پہلی منزل بہت زیادہ بلند تھی۔ اس میں بہت بلند اور تنگ محرابیں
بنی ہوئی تھیں۔ اس تھیٹر نے زمانے کے عجیب عجیب انقلابات دیکھے۔ مگر حیرت یہ ہے کہ اس کا وجود آج بھی ہے۔ [illegible]ء میں ویسی
گوتھس Visi Goths نے اس تھیٹر کا قلعہ بنا لیا۔ [illegible]ء میں سراسینس Saracens اس پر قابض ہو گیا اور
۷۳۷ء تک اس کا قبضہ رہا۔ مگر اسی سال چارلس مارٹل نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہ قلعہ پروونس Provence کے
رؤسا کے قبضہ میں آ گیا۔ جنھوں نے اس کے "ارینا" پر ایک شاندار محل اور ایک گرجا بنوا لیا۔ متعدد بار اس قلعہ پر یورش ہوئی۔ مگر اس کی
عمارت کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ ۱۵۳۳ء میں فرانسیس اول نے اس کی صفائی اور مرمت کرائی۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں یہ کچھ ایسے
لوگوں کے قبضہ میں آ گیا جنھوں نے اس میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں اور منڈیاں بنوائیں جو زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکیں۔ نسمیز
کے موجودہ باشندے اس ارینا کو بیلوں کی لڑائی میں استعمال کرتے ہیں۔ رومی ایمفی تھیٹر کا اثر یورپ پر بہت زیادہ پڑا۔ انگلستان
میں بھی اس تھیٹر کے کچھ نقوش پائے جاتے ہیں۔ سینڈوچ Sandwich کے نزدیک کینٹ Kent میں ایک بیضائی
شکل کی عمارت نکلی ہے۔ جس میں رومی تھیٹر کی طرح کے چبوترے بنے ہوئے ہیں۔ مانماؤتھ شائر میں بھی کارلین کے قریب ایسی ہی ایک
عمارت ملی ہے جو کہ رومی ایمفی تھیٹر سے بہت زیادہ مشابہ تھی۔

اس سلسلہ میں ایمفی تھیٹر کی اس رسم پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جس کے لئے یہ ایمفی تھیٹر تیار کئے گئے تھے۔ ایمفی تھیٹر رومیوں
کی سیر و تفریح کی جگہ تھی۔ یہاں پر گلیڈی ایٹر لڑنے کے لئے آتے تھے۔ اور اپنے فن کا اظہار کرتے تھے۔ "گلیڈی ایٹر" لاطینی زبان کا لفظ ہے۔
زمانہ قدیم میں یہ ان لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو "رومی ارینا" میں آ کر لڑتے تھے۔ اور اہل روم کی تفریح کا باعث بنتے تھے۔ کچھ
حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ خونریز جنگ ابتداءً ایشیا میں ہوتی تھی اہل روم نے اس کو ایشیا والوں سے حاصل کیا۔ مگر بعض حضرات یہ
کہتے ہیں کہ اس کی ابتداء روم ہی میں ہوئی۔ اس کی وجہ بتائی جاتی ہے کہ اہل روم اپنے ملک اور اپنی قوم میں کوئی ایسا بزدل اور کمزور
انسان دیکھنا نہیں چاہتے تھے جو ان کی قوم اور ان کے ملک کے لئے باعث ننگ و عار ہو۔ اس وجہ سے وہ اپنے نوجوانوں کی
ہمت بڑھانے کے لئے اس وحشیانہ فعل کو روا رکھتے تھے تاکہ وہ نڈر ہو کر ہر وقت موت اور دوسرے خطروں کا مقابلہ کرنے کے لئے
تیار رہیں۔ اس ابتداء کی ایک اور وجہ بھی بتائی جاتی ہے اور وہ کسی قدر قرین قیاس بھی ہے۔ قدیم زمانہ کی لڑائیوں میں فاتح مفتوح
قوم کی نہ صرف دولت لوٹ لیتے تھے۔ بلکہ اس قوم کے افراد کو بھی قید کر کے اپنا غلام بنا لیتے تھے اور پھر ان کو اپنی قوم کے ان مشاہیر
کی روح کو خوش کرنے کے لئے قتل کر دیتے تھے جو جنگ میں مارے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایلیڈ Iliad میں اکیلیز
Achilles ایک درجن ٹروجن پیٹروکلس Patroclus کی روح کو خوش کرنے کے لئے قربان کرتا ہے۔ قربانی کا یہ سلسلہ
بعد میں ترقی کرتا گیا اور ایک وہ دن آیا کہ ہر مشہور شخص کے جنازہ کے پاس غلام قربان کئے جانے لگے۔ یہاں [illegible]

ندجانات کی انتہا تھی۔ جب خود ان لوگوں میں احساس پیدا ہوا اور ان کو اس طرح غلاموں کا قتل کرنا بے سود معلوم ہوا تو انھوں نے ان
جانیں ضائع کرنے کا ایک اور ذریعہ نکال لیا۔ یہ مشاہیر کے جنازہ کے پاس ان غلاموں کو لڑایا کرتے تھے۔ تاکہ ان میں سے کوئی اپنی
نی جان دے کر اس مردہ شخص کی روح کو خوش کر دے۔ یہ تدبیر ان لوگوں کو بہت زیادہ مرغوب ہوئی۔ کیونکہ اس طرح ان کو ایک
بلف تماشہ مفت دیکھنے کے لئے مل جاتا تھا۔ غلاموں کو بھی کسی قدر اطمینان رہتا تھا۔ ان کو یہ خیال قوت پہنچاتا تھا کہ اگر ہم میں طاقت
ر قوت ہے تو ہم خود کو موت کے پنجے سے نکال سکتے ہیں۔

اس طرح کی لڑائیاں دیکھتے دیکھتے اہل روم کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے۔ وہ اس طرح ایک انسان کو دوسرے کا خون بہاتے
یکھ کر بہت زیادہ محظوظ ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اکثر لوگوں نے اس کو اپنا پیشہ بنا لیا اور اس کو ایک فن
صورت دے دی۔ اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ اہل روم ان پر فخر کرنے لگے۔ ان ماہرین فن کو رومی لینسٹو Lanistae کہا
جاتا تھا۔ یہ لوگ غلاموں کو خرید کر یہ فن سکھاتے تھے۔ اور پھر ان کو ایمفی تھیٹر کے مالکان کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتے تھے اور سرکس اور تھیٹر میں وہ لڑ
ر اپنی جانیں دے دیتے تھے۔ اس سفاکانہ تماشے کی پسندیدگی کا اظہار اس سے بخوبی ہو جائے کہ نہ صرف ہر وہ شخص جو دولتمند ہوتا تھا
وہ بھی جو کہ اپنے باپ دادا کی جائداد پر قابض ہوتا تھا خوش ہو کر اہل روم کی تفریح کے لئے اس طرح کی خونریز جنگ کراتا۔ لوگ اس قسم کے
ون کے منتظر رہا کرتے تھے۔ وقت معینہ تک روم کا ایک ایک فرد مقررہ تھیٹر پر پہنچ جاتا تھا۔ اکثر اوقات عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے
امرا اور دیگر حکام بھی اس قسم کے تماشے کرا دیتے تھے۔ ٹیٹس Titus نے ایک مرتبہ ایک کھیل کرایا تھا۔ جس میں گھمبیری ایڈرل"
دن اور جہازوں کی جنگ کے مناظر یک صد ایام تک دکھائے گئے۔ اس جنگ میں انسانی خون کے دریا بہ گئے۔ اسی طرح کی ایک اور مذہبی رسم
بن کی ادائیگی ایک مرتبہ ایک سو تیئیس "۱۲۳" دن تک برابر جاری رہی۔ جس میں اتنی گلیڈی ایٹروں کی پانچ ہزار جوڑیاں لڑائی گئیں۔
ہزاروں گلیڈی ایٹر مارے گئے۔

رفتہ رفتہ اُمرا اور روسا نے بھی اس فن کو اختیار کرنا شروع کیا۔ اور ایک وہ زمانہ آیا جبکہ ہر امیر و غریب کے دل میں گلیڈی ایٹر بننے
اہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ آگسٹس نے یہ دیکھا تو وہ ایک قانون بنانے پر مجبور ہو گیا۔ جس کی رُو سے اُمرا "گلیڈی ایٹر" نہیں بن سکتے
۔ اس قانون کے بن جانے سے یہ وبا اُمرا میں نہ پھیل سکی۔ مگر عوام اس کے شکار ہوتے رہے۔ کچھ دنوں بعد ہی ایک متعدی مرض کی طرح
پھیل گیا۔ اور ہر شخص گلیڈی ایٹر بن گیا۔ "کونسٹن ٹائن" نے جب یہ حالت دیکھی تو مجبور ہو کر ایک فرمان جاری کر دیا جس کی رُو سے
قسم کے تماشے قطعی بند ہو گئے۔ صرف تفریح گاہوں میں کبھی "ہونو ریس" کے زمانے میں ہو جایا کرتے تھے۔ اس فرمان نے اس وبا
ادیں کمزور کر دیں اور لوگوں کا وہ بڑھتا ہوا جذبہ ٹھنڈا کر دیا۔ جس سے تمام ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔

ان وحشیانہ کھیلوں اور تماشوں کو اس لئے بند نہیں کیا گیا کہ ان میں انسانوں کی جانیں ضائع ہوتی تھیں۔ بلکہ اس لئے کہ
ی ایٹروں کی تعداد بڑھنے سے ملک کو بھی ان کی طرف سے خطرہ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اکثر مواقع ایسے بھی آئے جبکہ خود اہل روم
ل میں پھنس گئے تھے۔ یہاں پر ۷۳ قبل مسیح کا ایک واقعہ بیان کرنا کسی قدر دلچسپ ہوگا۔ "کیپوا" میں ۷۴ گلیڈی ایٹر ایک
ہو کر اپنے مالک سے باغی ہو گئے اور پہاڑوں میں جا چھپے۔ ان باغی گلیڈی ایٹروں کا سردار "اسپارٹیکس" تھا۔ ان پہاڑی مقامات
ہ غلام بھی ان کے شریک ہو گئے جو اپنے مالکوں کے مظالم سے پریشان ہو کر بھاگ آئے تھے۔ غریب کوہستانی کسانوں نے جب
یا کہ گلیڈی ایٹروں کی قوت زیادہ ہے تو وہ بھی ان کے شریک ہو گئے۔ ان کو یہ خوف تھا کہ انھوں نے مخالفت کی تو وہ مارے جائیں گے
تعداد روز بروز بڑھتی رہی اور انھوں نے لوگوں سے انتقام لینا شروع کیا۔ ملک کے گوشہ گوشہ پر ہیبت طاری تھی۔ اس وقت

سب سے زیادہ خطرہ اہل روم کو تھا۔ یہ حالت ایک یا دو دن نہ رہی بلکہ متواتر تین برس جاری رہی۔ جب ان وحشیوں کا سردار "کراسس" نامی ایک شخص کے ہاتھوں مارا گیا۔ تب یہ ہیبت اور یہ خوف دور ہوا۔

گلیڈی ایٹر بھی کئی جماعتوں میں منقسم ہوتے تھے۔ یہ تقسیم ان کے اوزار اور ان کے جنگ کے اطوار پر کی جاتی تھی۔ یہ جماعت "آرڈینیری" کہی جاتی تھی۔ اس جماعت کے دو افراد ایک وقت میں ایک دوسرے سے لڑا کرتے تھے۔ "کیٹروبری" جماعت گلیڈی ایٹر کئی کئی ایک ساتھ لڑا کرتے تھے۔ "ایکوٹیٹز" گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک دوسرے سے جنگ کرتے تھے۔ "ریٹیاری" بڑے بڑے کانٹے اور جال استعمال کرتے تھے۔ اس جال سے وہ اپنے مخالف کو پھانس کر کانٹے سے اس کا کام تمام کر دیا کرتے تھے۔ ان کا مخالف ایک چھوٹی سی تیز تلوار اور ایک ڈھال لئے رہتا تھا۔ تاکہ وہ اپنے دشمن کے حملوں کو ڈھال سے روکے اور موقع پاتے ہی تلوار سے اس کا کام تمام کر دے۔ "اینڈابیٹو" آنکھیں بند کر کے لڑا کرتے تھے۔ یہ لوگ خود پہن لیا کرتے تھے جس میں کہیں بھی سوراخ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی جنگ میں تماشائیوں کو بہت زیادہ لطف آتا تھا۔ کیونکہ یہ دونوں بالکل اندھوں کی طرح اپنے مخالف پر حملہ کیا کرتے تھے۔ ان کی حرکات پر زبردست قہقہے لگا کرتے تھے۔ "ہیلپومچی" وہ گلیڈی ایٹر ہوتے تھے جو زرہ بکتر پہن کر اکھاڑے میں آتے تھے۔ یہ لوگ باقاعدہ آلات سے آراستہ ہوتے تھے۔ "پیٹیرائی" صرف درندوں سے روپیہ پیدا کرنے کی غرض سے لڑا کرتے تھے۔

جب کوئی گلیڈی ایٹر زخمی ہو کر زمین پر گر جاتا تھا تو اس وقت اس کا مخالف ایک فاتح کی طرح اس کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا اور اس کو انتہائی ذلیل نظروں سے دیکھتا۔ جب وہ مجمع کی طرف نظر اٹھاتا تھا تو اس کے چہرے پر فتح اور کامرانی کے آثار نظر آتے۔ وہ مجمع کی طرف اس وقت تک دیکھتا رہتا۔ جب تک کہ اس کو مجمع کی طرف سے اس زخمی کے قتل کرنے یا زندہ چھوڑنے کی اجازت نہ مل جاتی۔ اگر دوران جنگ میں وہ زخم خوردہ انسان اپنی شجاعت اور مردانگی کا اظہار کرتا اور اپنی دلیری سے عوام کو خوش کر دیتا تو وہ اپنے انگوٹھے کو زمین کی جانب جھکا دیتے تھے، جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس کو قتل نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کی جان بخش دی جائے۔ اگر بدقسمتی سے دوران جنگ میں زخمی نہ اپنی مردانگی دکھلا سکا اور نہ اپنی شجاعت سے عوام کو خوش کر سکا تو تماشائی اپنے انگوٹھے کو آسمان کی طرف اٹھا دیتے تھے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس شخص کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ وہ بزدل اور کمزور ہے اس وجہ سے اسے دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ فاتح کو انعامات دیئے جاتے تھے۔

جو "گلیڈی ایٹر" اس فن میں کمال حاصل کر لیتا تھا۔ اور کسی وجہ سے اس زندگی کو ترک کرتا تھا تو اس کو "چوبی تلوار" عطا کی جاتی تھی۔ سنگ تراشوں نے بھی "گلیڈی ایٹروں" سے فائدہ اٹھایا۔ وہ ان کے بت بناتے تھے۔ کبھی ان کو لڑتے ہوئے اور کبھی مرتے ہوئے دکھاتے تھے۔ اس طرح روم میں سنگ تراشی نے بھی ترقی کی۔ کیونکہ روسا گلیڈی ایٹروں کے بت خریدتے تھے اور عمارتوں میں نصب کراتے تھے۔ اکثر مکانات میں بھی رکھتے تھے۔

ادریس احمد ادیب

ترجمانِ حقیقت کی یاد

ہوئے اقبال جب دنیا سے رخصت
کہا میں نے۔ "غریقِ بحرِ وحدت"!
۱۹۳۸ء

(غیر مطبوعہ)

رَاحِل

؎ عنوان میں بھی اقبال آسمان خیال کا سال وصال (۱۳۵۷ھ) مضمر ہے۔

کچّی دیوار

بارش کے بعد ذرا دھوپ لگتی تو فیضو کی کوٹھری کی عقبی دیوار دانت نکال دیتی - جا بجا شگاف پڑ جاتے اور ایسے دکھائی
لگتی جیسے بیسوں بڑے بڑے کیکڑے رینگ رہے ہوں، اگر راجو کا دم نہ ہوتا تو شاید کب کی گر چکی ہوتی، مگر راجو جونہی دراڑ دیکھتی
بھوسہ ملا، بانس کی سیڑھی پر چڑھ کر ساری کی ساری دیوار کو لیپ دیتی اور پھر سے نئی کی نئی بنا دیتی - راجو کو دیوار لیپتے دیکھ کر یو
فیضو یوں محسوس کرتا کہ راجو اس کی چٹختی ہوئی ہڈیوں اور روز بروز تحلیل ہوتے ہوئے جسم کو دوبارہ زندگی دینے کی کوشش کر
دیوار کو پھر سے نئی دیکھ کر نا معلوم مگر محسوس طور پر اس کے کمزور جسم میں زندگی آ جاتی - بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جاتا - اور وہ ایک
پھر روشنی اور گرمی دینا شروع کر دیتا - راجو کو دن رات پھرتی سے کام کرتے دیکھ کر بڑھاپے کے تفکرات دور ہو جاتے - "راجو نہ
کیا ہو؟" وہ سوچتا -

چار سوکھی سڑی گائیں، ایک ادھ موئی بھینس، پانچ چھدرے چھدرے کھیت اور کوٹھری کی بار بار دانت نکال دینے وا
دیوار ---- یہ تھی فیضو کی جائیداد جس کی خبرداری کے لئے اس کی بیٹی راجو دن رات میلی کچیلی شلوار پہنے گھٹنوں تک چڑھائے
رہتی - اس کے علاوہ فیضو کا حقہ اور ہانڈی روٹی بھی تھی - مگر راجو جیسی محنتی چھوکری ان کو دن بھر کے کام کاج میں گنتی ہی نہ کرتی - ڈھور
چرانے جانا اور سر شام لوٹا لانا اور کھیتوں کی دیکھ بھال بھی کوئی ایسا تکلیف دہ کام نہ تھا - مگر جونہی دیوار پر کیکڑے رینگتے دیکھتی اس کی
لگ جاتی - ماتھے پر بل پڑ جاتے اور وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے گارے میں بھوسہ ملانا شروع کر دیتی - فیضو دیوار پر جھلتی سی نگاہ ڈالتا
گڑگڑاتے ہوئے بانس کی سیڑھی دیوار سے ہٹا کر واپس کھاٹ پر آ بیٹھتا اور سمجھتا کہ اس نے اپنا فرض انجام دے لیا ہے باقی راجو جانے ا
حقہ کی گڑگڑاہٹ عموماً اسے سوچ میں ڈال دیتی، راجو نہ ہو تو کیا ہو؟ کام کرتے تھکتی نہیں، کیا مجال کہ ماتھے پر بل پڑ جائے
رات کام کرتی ہے مگر کیا مجال کہ لب پر حرف شکایت لائے - کام کے معاملے میں اپنی ماں سے کم نہیں وہ بیچاری بھی کام ہی کرتے کرتے چل
اور راجو کے لئے ورثہ میں کام ہی چھوڑ گئی تھی - وہ اپنے آپ کو راجو کے بغیر کسی قابل نہ پاتا وہی اس کی زندگی تھی جس کے دم قدم سے د
پھر رہا تھا - جس کی وجہ سے گاؤں بھر میں اس کی عزت و آبرو تھی - راجو نہ ہو تو اس کے منہ میں پانی ٹپکانے والا کوئی نہ ہو - وہ اسی طرح سوچتا
حتی کہ یا تو نے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی یا چلم بجھ جاتی اور وہ سر پھیر کر بڑے پیار کے لہجہ میں پکارتا - "راجو بیٹی! ---- ذرا حقہ بھ

جب فیضو کا بڑا لڑکا مرا تھا - تو اس کو بے حد غم ہوا تھا - اگرچہ بھائی کی زندگی میں راجو بھی ہاتھ بٹاتی رہتی تھی، مگر گھر بار کے
کلج کا زیادہ تر بوجھ اسی کے کندھوں پر تھا اور یوں بھی بوڑھے باپ کے لئے جوان بیٹے کی موجودگی بڑی بات تھی - اس کے ہوتے ہو
فیضو کو اپنے بڑھاپے کا احساس اور بیوی کی موت کا غم بھول گیا تھا - اور جب لڑکا داغ مفارقت دے گیا تو اگرچہ راجو کی موجودگ
بجائے ڈھارس بندھانے کے کمر ہمت توڑ دی - لڑکی پرایا مال ہوتا ہے - آج ہے تو کل نہیں - دوسرے راجو لڑکی ہونے کی حیثیت سے گھر
کلم کہاں تک سنبھال سکتی ہے - مگر جب راجو نے ہوشیاری اور تندہی سے اپنے مرحوم بھائی کی جگہ لے لی اور فیضو کے عظیم الشان نقصا
تلافی کر دی تو فیضو کی ٹوٹی ہوئی ہمت پھر سے بندھ گئی - وہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ راجو دس بیٹوں سی ایک بیٹی ہے - وہ باپ کی کس

فرمانبردار بیٹی تھی۔ اس کے اشاروں پر چلتی تھی اور اپنے آرام و آسائش کو ٹھکرا کر اس کی خدمتگزاری میں لگی رہتی تھی۔ ایسی بیٹی کے عوض وہ دس بیٹے بھی قبول نہ کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ راجو کی عمر بیس سال ہونے کے باوجود اسے کہیں بیاہ نہ رہا تھا۔ میں لڑکیوں کو چھوٹی ہی عمر میں بیاہ دینے کا رواج تھا۔ اگرچہ گاؤں والوں کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی مگر فیضو کو اس بات کی پرواہ نہ تھی۔ وہ کون ہوتے تھے اس کے گھریلو معاملات پر نکتہ چینی کرنے والے۔ راجو کی شرافت اور سعادت مندی پر اس کو پورا پورا بھروسہ تھا۔ اس کو کیا پڑی تھی کہ اسے ابھی سے بیاہ کر اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارے۔ اس کا کوئی سر تو نہ پھرا تھا کہ راجو کو گنوا کر اپنے کھیتوں اور ڈھوروں کی بربادی کرے۔ وہ اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں کے سامنے جائیداد تباہ ہوتی نہ دیکھے گا۔

اور راجو نہ صرف ان تھک کام کرنے والی لڑکی تھی۔ بلکہ گھر بھر کی رکھوالی بھی تھی۔ کیا مجال کہ کسی کا ڈھور کھیت میں گھس کر فصل پر منہ مارے۔ وہ تو دونوں ہاتھوں سے ڈھور کا جبڑہ کھول کر بھی اس کے حلق سے اپنی چیز نکال لینے سے نہ چوکتی۔ کولہوں پہ ہاتھ رکھ سامنے کھڑے ہو کر گاؤں کے چھوکروں کو کھیتوں سے الگ رہنے کو پکارتی تو کسی کا حوصلہ نہ پڑتا کہ اس کی بات پھیر دے۔ یہاں تک کہ اس کی آواز سے گاؤں کے ڈھور بھی ڈرنے لگے تھے۔ کھیتوں کا نقصان ہوتے دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو جاتی اور لاٹھی اٹھا کر ڈھوروں کو بُری طرح سے پیٹ ڈالتی، ان کے مالکوں پر پل پڑتی۔ ایک دفعہ کسی سے تُو تُو مَیں مَیں ہو جاتی تو زندگی بھر کے لئے اس کی دشمن بن جاتی گاؤں والے اس کی سختی کی شکایتیں فیضو سے کرتے تو فیضو ہمیشہ اپنی بیٹی کا ساتھ دیتا۔ وہ اس کے خلاف قطعاً کوئی بات قبول نہ کرتا یہاں تک کہ لڑ جاتا اور مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ راجو کے خلاف اس کے سامنے منہ کھولے۔ وہ راجو کی ان حرکتوں کو نظر تحسین سے دیکھتا۔ اگر راجو ایسا نہ کرے تو دو دن میں اس کے کھیتوں کی خاک اُڑ جائے۔

ایک دن سہ پہر کو راجو دیوار پر لیپ رہی تھی کہ اس نے اپنے کھیتوں کے پاس لالو کو گائیں چراتے دیکھا، اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے کوئی تین ماہ ہوئے لالو سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ تب سے اس نے اسے مُنہ نہ لگایا تھا۔ حالانکہ دونوں کے باپ میں گہری دوستی تھی اور لالو فیضو کو چاچا کہہ کر پکارا کرتا تھا اور راجو بھی لالو کے باپ کو چاچا ہی کہتی تھی۔ لالو درخت کی چھاؤں میں کھڑا لٹھ پر ٹھوڑی ٹکائے نہ جانے کس خیال میں ڈوبا کھڑا تھا۔ ایک گائے نے کھیت کا رخ کیا تو راجو لیپتے لیپتے رک گئی اور کبھی کھیت کی جانب بڑھتی ہوئی گائے کو اور کبھی بے خبر لالو کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ماتھے کی تیوریاں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ نہ ہی گائے کی حرکت کو پسند کر رہی ہے اور نہ ہی لالو کی بے دھیانی کو۔ اس کے ہونٹ کھلے اور بند ہو گئے۔ جیسے لالو کو مخاطب نہ کرنا چاہتی ہو کیونکہ وہ اصولاً جس سے ایک دفعہ ناراض ہو جاتی۔ حتی الوسع اس سے بات نہ کرتی۔ مگر جب گائے کنارے کی فصل پر مُنہ مارنے لگی تو خاموش نہ رہ سکی۔

"او تیرا مالک مر جائے" اس کی زہر میں بجھی ہوئی آواز گونجی۔ "یہ تمہارے باپ کا کھیت نہیں" جب اس پر بھی لالو متوجہ نہ ہوا تو للکار کر لالو کو آواز دی۔ "او لالو کے بچے! سنبھال اس باپ کی لاڈلی کو، اندھے ہو گئے ہو" لالو نے چونک کر سر گھمایا تو راجو کہہ رہی تھی۔ "اللہ مرگی پڑے تمہارے ڈھوروں کو ان کو ایک دفعہ زہر کیوں نہیں دے دیتے کہ چرنے کی حاجت نہ رہے" یہ کہہ کر لاٹھی اٹھا کر گائے کی جانب دوڑی۔ اگرچہ اتنے میں گائے کو ہٹا چکا تھا، مگر راجو کے لئے تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ گائے ابھی تک جبڑہ ہلا ہلا کر اس کے کھیت کی سبزی چبا رہی تھی، دونوں ہاتھوں سے ڈھور کا جبڑہ کھول کر اپنی چیز نکال لینے والی راجو شیرنی کی طرح بپھری ہوئی آئی اور دو چار لاٹھیاں گائے کے جما دیں اور جب لالو نے دبی زبان میں اتنا سا کہا کہ "بے زبان گائے کا کیا قصور ہے، کچھ ہوش کرو" تو گویا جلتی پر تیل گرا دیا۔ بپکی اُس کی جانب گئی اور جو جی میں آیا کہہ سنایا۔ یہ بھی شکر ہوا کہ لالو نے پھیر کر بات نہ کی ورنہ خون خرابہ ہو جاتا۔

راجو اگر کبھی ٹھنڈے دل سے غور کرتی تو لالو سے اس قدر شدید دشمنی کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ [illegible] اور اس دفعہ بھی لالو نے اس کی صلواتیں سُن کر کان لپیٹ لئے تھے۔ حالانکہ لالو کا گاؤں بھر میں دبدبہ تھا۔ کسی جوان کی جرأت نہ تھی کہ اس کے مُنہ آئے۔ مگر راجو کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا۔ شاید اس خیال سے چپ رہتا ہو کہ عورت ذات ہے۔ کیا عیب تول لے۔ یا شاید اس لئے کہ وہ اس کے باپ کو چاچا کہا کرتا تھا۔

ایک دن راجو دیوار لیپ رہی تھی اور فیضو دھوپ میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا کہ لالو کا باپ آیا۔ اور فیضو سے کہنے لگا "یہ دیوار گرا کر نئی کیوں نہیں بنوا لیتے۔ آئے دن راجو کو مصیبت کرنی پڑتی ہے۔" راجو کو لالو کے باپ کی یہ ہمدردی اچھی نہ لگی۔ ممکن ہے وہ کسی اور بات میں اس کی ہمدردی کرتا تو شکور ہوتی۔ مگر دیوار لیپنا اُسے خود پسند تھا' اس لئے ہمدردی بھی چبھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس کے صاف شفاف ماتھے پر ننھے ننھے کیڑے رینگنے لگے۔ جب فیضو نے جواب دیا کہ "راجو جب وقت پڑنے پہ لیپ لیتی ہے تو نئی دیوار پر خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" تو راجو کی دکھتی ہوئی کمر اور بھی دکھنے لگی۔ اُس کا جی چاہا کہ دیوار ابھی گر جائے اور کنجوس بڈھے کو زمین میں گاڑے ہوئے روپے نکال کر خرچ کرنے پڑیں۔ مگر جب فیضو کہنے لگا کہ "راجو میری بیٹی بڑی اچھی ہے۔ سَو بیٹوں سی ایک بیٹی ہے اللہ اس کو خوش رکھے۔" تو راجو کو محسوس ہوا کہ فیضو کے لفظوں نے اس کے دل کے شگاف پر لیپ کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فیضو کے پیار کے لفظ واقعی راجو کے لئے تسکین بخش ثابت ہوتے تھے۔ کبھی کبھی اسے خیال گزرتا کہ دن رات کی محنت شاقہ کی وجہ سے دیوار کی طرح اس کے دل میں بھی شگاف پڑ گئے ہیں۔ مگر جونہی فیضو کے دو محبت کے بول کان میں پڑتے تو چھیتوں کی تکان دُور ہو جاتی۔ اور ایک دفعہ پھر کل کی طرح کام کرنا شروع کر دیتی۔ عموماً کام کاج میں اس کا دل لگا رہتا۔ کبھی کبھی نامعلوم طور پہ کام پھیکا پھیکا معلوم ہونے لگتا۔ طبیعت اچاٹ ہو جاتی، لیکن ہمیشہ فیضو کے الفاظ اس کی طبیعت میں شوق اور کام میں رنگینی بھر دیتے۔

مگر جب اُس نے سُنا کہ فیضو اُس کو گاؤں کے رسم و رواج کے مطابق جہاں سے روپے زیادہ ملیں اس جگہ بیاہنا چاہتا ہے، تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں سچ مچ کیڑے رینگنے لگے ہیں' اور جا بجا شگاف پڑ گئے ہیں. اس کو بیاہے جانے پہ تو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر اس طرح بکنے پہ ضرور اعتراض تھا۔ کیا وہ اتنی ہی سستی تھی کہ بیچی جائے ؟ یہ خیال اس کو بےحد ستاتا حالانکہ گاؤں والے اپنی لڑکیوں کے زیادہ قیمت پر اٹھنے پہ فخر کیا کرتے تھے۔ مگر راجو اپنے دل کا کیا کرے جو اس خیال سے بغاوت کر رہا تھا۔

ان خیالات کے باوجود راجو میلی شلوار کو گھٹنوں تک چڑھائے، سڈول اور سفید جھانکتی ہوئی پنڈلیوں کے ساتھ' کام کرتی رہی۔ کھیت میں مُنہ مارنے والے ڈھوروں کو پیٹتی رہی۔ اور ان کے مالکوں کو گز بھر لمبی زبان سے کوستی رہی —— دیوار لیپتی رہی اور فیضو کی کھرکھراتی ہوئی آواز کے جواب میں حقہ بھرتی رہی —— مگر یہ مصروفیت اگلی سی بے خیال مصروفیت نہ تھی. بلکہ کسی خیال میں ڈوبی ڈوبی کھوئی کھوئی مصروفیت تھی۔

ایک دن راجو گھر میں اکیلی بیٹھی ٹکوے سے چارہ کتر رہی تھی کہ لالو آیا۔ اُس نے اُس کی جانب نگاہ تک نہ اُٹھائی' اور ٹکوہ زور زور سے چلاتی رہی۔ لالو نے کوٹھری کی جانب مُنہ کرکے آواز دی "چاچا —— چاچا فیضو!" مگر چاچا بھلا وہاں کہاں تھا جو جواب دیتا۔ اور راجو کون سی ایسی نیچ ذات تھی کہ اسے بتا ہی دیتی کہ "وہ گھر میں نہیں ہے۔" لالو نے راجو کی جانب دیکھا اور کچھ دیر توقف کے بعد پوچھا۔ "چاچا کہاں ہے؟" راجو کے پسینے سے گیلے ماتھے پر ایک ہلکا سا آتی شکن پڑ گیا۔ اور اُس نے چارے سے نگاہیں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "مجھے کیا معلوم کہاں ہے؟" لالو نے جاتے ہوئے قدرے مغموم آواز میں کہا۔ "اچھا وہ گھر آئے تو کہہ دینا کہ لالے کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔" راجو کا ٹکوے والا ہاتھ ہوا میں رُک گیا۔ اور وہ جاتے ہوئے لالو کو دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لاّلو کے باپ کا جنازہ اٹھتے وقت اس کا بڑا ہی جی چاہا کہ لاّلو سے اظہارِ ہمدردی کرے۔ مگر جونہی دور سے لاّلو کی گائے کو
میں مُنہ مارتے دیکھا دوڑی دوڑی گئی اور اُسے لاتوں اور گھونسوں سے پیٹ ڈالا۔ کئی تیز تیکھی باتیں لاّلو کو بھی کہہ گئی۔ا
فیقو نے گھر آکر بتایا کہ لاّلو کے باپ کے ذمہ بنیئے کا اتنا قرض نکلا ہے کہ سب کچھ بیچ کر بھی نہ چکے گا تو وہ یہ سوچ کر بڑی خوش ہو
کہ نہ ڈھور رہیں گے، نہ کھیت میں مُنہ ماریں گے۔

جب فیقو نے راجو کو بتایا کہ وہ اس کی شادی کر رہا ہے تو اس کے دل کی دیوار میں ایسے شگاف پڑ گئے کہ جنھیں فیقو کے
بھرے الفاظ کا گارا بھی نہ بند کر سکتا تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا گیا، دل کے دراڑ مُنہ کھولتے گئے۔ اور جب صرف چا
رہ گئے تو فیقو نے اسے دیوار کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ اُسے لیپ ... ہے۔ مگر اس نے پروا نہ کی، جب
دن رہ گئے اور دھوپ چمک کر لگی تو دیوار کے دراڑ جمائیاں لینے لگے۔ بچاسوں کیکڑے جا بجا رینگنے لگے۔ فیقو نے پھر کہا تو پھ
گئی۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ راجو کے دل کی دیوار اونگھنے لگی ہے۔ وہ اس کے دل کی دیوار کے شگاف دیکھتا تو ان شگاف
کو بھول جاتا۔

فیقو چونکہ کپڑا لتّا بنوانے میں مصروف تھا اس لئے لگ کر کہہ بھی نہ سکتا تھا، اس کا خیال تھا کہ اُسے خود ہی دھیان ہو
مگر جب آخری دن بھی راجو نے پروا نہ کی تو بڈھا برس پڑا۔ اور ایسی بے تکی سنائی کہ راجو کو اپنی زبان مُنہ میں سکڑتی ہوئی مح
ہوئی۔ فیقو واہی تواہی سنا کر چلا گیا تو راجو گٹھری بن کر کھاٹ پر گر گئی۔ اُس نے تہیّہ کر لیا تھا کہ دیوار گرتی گر جائے مگر ا
ہاتھ نہ لگائے گی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھی اور مُنہ پر پانی کا چھینٹا مار کر باہر آئی۔ نگاہ اٹھائی تو لاّلو کی گائے کو اپنے کھیت میں مُن
مارتے دیکھا، لاّلو اس روز کی طرح چھاؤں میں کھڑا، لٹھ پر ٹھوڑی ٹکائے کسی خیال میں مگن کھڑا تھا۔ راجو نے سوچا کہ اب
ان کھیتوں کی کیا پروا تھی۔ وہ تو کل کسی دوسرے گھر کے ڈھوروں، کھیتوں اور کچی دیواروں کی خبرگیری کے لئے جا رہی تھی۔ اس
طرف سے ان کھیتوں میں آگ لگ جائے ٹڈی چاٹ جائے۔ اُس کی بلا سے، مگر پھر جیسے یکایک کسی خیال نے دل سے اُبھر کر ایک
کرخت تیوری کی صورت اختیار کر لی۔ وہ تھرّائی ہوئی آواز میں چلائی۔ "او لاّلو اس ماں کو کھیت سے باہر نکال"۔ جب لاّلو نے کو
حرکت نہ کی تو اور بھی طیش آگیا۔ لاٹھی اٹھا کر گائے کی خبر لینے دوڑی۔ دو چار جما کر لاّلو کو سنا کر کہنے لگی۔ "مر جائے تیرا مالکا
جو تجھیں کھلا چھوڑ کر کہیں سو رہتا ہے"۔ اس بات کا اثر دیکھنے کے لئے اس نے لاّلو کو کنکھیوں سے دیکھا تو لالو بڑے اطمینا
سے بھاگتی ہوئی گائے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

راجو کو اس کی مسکراہٹ زہر کا چھینٹا معلوم ہوئی۔ تیزی سے اس کی جانب لپکی۔ اور اپنے مُنہ اور زبان کو ڈھیل...
جب اس پر بھی وہ مسکراتا ہی گیا تو آپے سے باہر ہو گئی۔ لاٹھی سے وار کیا۔ لاّلو نے سر پر آتی ہوئی لاٹھی کو اپنے مضبوط چوڑے چ
ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور ایک ہی جھٹکے سے چھڑا کر پاس ہی بہتے ہوئے نالے میں پھینک دی۔ جب اس نے قہقہہ لگایا تو راجو کو م
مغلظ گالی سے بھی بدتر معلوم ہوا۔ اس نے سخت ہتک محسوس کی، اور گالیاں بکنے لگی۔ لاّلو نے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے مُنہ
اس طرح رکھ دیا کہ کوشش کے باوجود راجو کی آواز نہ نکل سکی۔ اسی طرح ایک ہاتھ اس کے مُنہ پر رکھتے لالو دوسرے ہاتھ سے ا
اس کو اوٹ میں لے گیا۔ راجو کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں، وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے جتنا زور لگا رہی
لاّلو کی گرفت اسی قدر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ کاٹ لینا چاہا۔ مگر وہ کہاں کاٹنے دیتا تھا۔ لالو کے ہونٹوں

مضبوط شکنجے بازوؤں میں گاڑ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی، مگر لالو اس کو نہ چھوڑ رہا تھا۔

پھر یکایک لالو نے ہاتھ ہٹالیا، ایک چیختی ہوئی بے معنی آواز گونجی اور خاموش ہو گئی۔ لالو نے ذرا سانس کی فرصت دے کر پھر سے ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا تھا۔ اس نے دو تین بار ایسا ہی کیا۔ راجو کو محسوس ہوا کہ لالو اسے بار بار موت کے دروازے تک لے جا کر لوٹا رہا ہے۔ حتیٰ کہ راجو کی مدافعت کا زور ٹوٹ گیا۔ ہاتھ پاؤں سے سکت چلی گئی اور قریباً نیم بیہوش ہو گئی۔ وہ زمین پر بے حس و حرکت لیٹی، نیم وا سرخ سرخ ڈوروں والی آنکھوں سے پتھر پر بیٹھے ہوئے لالو کی جانب تک رہی تھی اور لالو اپنی شربتی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی معصوم مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ اس وقت اُسے راجو کی آنکھوں میں مجبوری [illegible] ہمدردی کرتا تو مشکو[illegible]ئی۔ لالو نے ہمیشہ اس کی آنکھوں کو شوخی شرارت اور غصے کی حالت میں دیکھا تھا۔ آج زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے انھیں آنکھوں میں ایک نیم گرم ٹھہراؤ اور نیم بیہوشی کی مجبوری محسوس کی تھی۔ راجو اسے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں نہ مخالفت کا رنگ تھا نہ موافقت کا، جیسے کسی بُت کی جانب دیکھ رہی ہو ——— !

آخر لالو نے چمکیلے سفید دانت دکھاتے ہوئے کہا ——— "راجو! جاؤ اب گھر ——— چاچا راہ دیکھتا ہو گا۔ کل کی تیاری کرنا ہو گی۔"

مگر یہ الفاظ اس نے کچھ اس طرح کہے جیسے صرف مُنہ کہہ رہا ہو دل نہ ساتھ دے رہا ہو۔ راجو خاموشی سے اٹھی۔ اور میلے کچیلے کپڑے جھاڑ کر گھر کو چل دی۔ جاتے ہوئے اُس نے مڑ کر دیکھا تو لالو اسی طرح کچھ آنکھوں سے اور کچھ ہونٹوں سے کہتا ہوا اس کی جانب دیکھ رہا تھا ——— اور جب اس نے لالو کی گائے کو پھر کھیت میں چرتے دیکھا تو اس کی نگاہیں گائے کے ملائم جسم سے پھسلتی ہوئی دور افق پر ڈوبتے ہوئے سورج پر جا ٹکیں۔ سورج کس قدر دور تھا، مگر اس وقت کس قدر نزدیک دکھائی دے رہا تھا۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے فیضو کھاٹ پر لیٹا آنکھیں بند کئے سوچ رہا تھا۔

"..... بہت اچھا ہوا بات رہ گئی، بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ سو بیٹوں سی ایک بیٹی کو کم داموں پر بیاہتا پھروں۔" میری بیٹی راجو، عمر کا آخری سہارا، ماں کی نشانی، باپ کے لئے خون پسینہ ایک کرنے والی، بہت اچھا ہوا، ورنہ گھر بار کی دیکھ بھال کون کرتا، ...... اُسے بہت افسوس ہوا کہ اس نے کل راجو کو بُری بھلی سنائی تھیں، وہ راجو کو صبح ہی شادی کے کپڑے دے کر خوش کرے گا۔ جن کو پہن کر وہ دلھن معلوم ہو گی۔ دیوار لیپتے وقت نئی ریشمی شلوار خراب بھی ہو جائے گی تو کیا پروا ہے، میرا کیا ہے، سب اسی کا ہے۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ کوئی دولت اس کے ہاتھ سے جاتے جاتے ایک دم بچ گئی ہے اور دل اطمینان سے بھر گیا ہے۔

اس نے کروٹ بدل کر چاہا کہ راجو کو حقہ بھرنے کو کہے کہ دھڑام کی آواز آئی اور صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی سلونی روشنی ایک دم کوٹھری میں پھیل گئی۔ بوکھلا کر اُٹھا تو دیکھا کہ دیوار زمین کے برابر ہو چکی ہے۔ اُس نے گھبرا کر راجو کو آواز دی۔ مگر راجو وہاں کہاں تھی، وہ تو اپنے سورج کو اس کے قریب ترین مقام پر خیر مقدم کہنے چلی گئی تھی۔

مسعود شاہد

ضروری اعلان

ہمایوں کے خریداروں اور ایجنٹوں کی خدمت میں

ہمایوں کا آئندہ شمارہ "جوبلی نمبر" ہوگا۔ ہم پرچہ نہ ملنے کی شکایت پر جو ہر ماہ کی پندرہ تاریخ سے پہلے ہمیں
وصول ہوجاتی ہیں دوبارہ پرچہ روانہ کردیتے ہیں۔ لیکن چونکہ کاغذ کے موجودہ حالات کے پیش نظر یہ
اص نمبر بہت محدود تعداد میں شائع ہوگا، اس لئے ایسی تمام شکایات سے محفوظ رہنے کے لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے
، خریدار حضرات ہمیں اس نمبر کی محفوظ ترسیل کے لئے چار آنے کے ٹکٹ بھیج دیں تاکہ یہ نمبر پرچوں
لے ڈاکوؤں کی زد سے محفوظ رہے۔ اور ہمیں دوبارہ بھیجنے کے خسارے اور مصیبت سے نجات
ل جائے۔ جن حضرات کے ٹکٹ موصول نہیں ہوں گے اُن کی خدمت میں یہ نمبر نہیں بھیجا جائیگا۔

ایجنٹ حضرات سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے آرڈر پیشگی بھیج دیں تاکہ بعد میں
دم تعمیل کی شکایت نہ رہے۔ یہ نمبر تمام ایجنٹوں کے پاس بذریعہ وی۔پی ارسال ہوگا۔ جن صاحبان
ے ابھی تک اپنا حساب نہیں چکایا انھیں اطلاع رہے کہ یہ نمبر اُنھیں صرف اسی صورت میں ملے گا
، وہ اپنا بقایا حساب صاف کردیں۔

مشتہر حضرات کے لئے اس نمبر کی شرحِ اشتہارات درج ذیل ہے۔

پورا صفحہ ... ... ۷۵/-/- پچھتر روپے

نصف صفحہ ... ... ۴۰/-/- چالیس روپے

مینجر

Beautiful LAK

The wide, green valley, studded wit lakes, embedded i the lofty ranges of th Himalayas, gives t the poet, painter an philosopher back ground, inspiration repose.

VISIT

KASHMI

K7

نئی کتابیں!

رُوس انقلاب کے بعد
از م، م، جوہر

زندگی کا مادی فلسفہ جب مذہب اور اخلاق کے ضابطوں سے آزاد ہو جائے تو وہ کتنا خونخوار اور سفاک ہو جاتا ہے اور انسانیت پر اس کے ہاتھوں کیا گزرتی ہے اس کو پوری تفصیل سے جناب م م جوہر نے اس کتاب میں پیش کیا ہے رُوس میں انقلاب کے بعد کیا ہوا سٹالن نے اپنے مخالفوں کو کس بیدردی سے تہس نہس کیا۔ اور دیو استبداد مزدوروں کی قبا میں کس طرح سرگرم کار ہے۔ یہ سب حقائق جن کو رُوس کے حامی سختی سے ظاہر نہیں ہونے دیتے اور آج جنھیں جاننے کی اشد ترین ضرورت ہے اس کتاب میں اُن پر سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

لینن
از م، م، جوہر

رُوس کے اشتراکی انقلاب کی روح رواں دراصل لینن کی شخصیت تھی۔ لینن نے اس انقلاب کا منصوبہ سوچا اس کا پرچار کیا، اس کے لئے ساتھی ڈھونڈے اور آخر میں اس انقلاب کو کامیاب کر کے روس میں اشتراکی نظام قائم کیا۔ دنیا کی تاریخ میں روسیوں کا یہ کارنامہ آپ اپنی مثال ہے اور اس انقلاب میں لینن نے جو کچھ کیا وہ انسان کے یقین محکم عمل پیہم اور بے پناہ محبت کا ایک ایسا نمونہ ہے جس پر انسانیت جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ یہ کتاب اس بے نظیر انقلابی کا ایک اجمالی مرقع ہے۔ مصنف کو انقلاب روس پر محض عبور نہیں بلکہ اس سے صد درجہ خلوص بھی ہے اور وہ دل و جان سے چاہتے ہیں کہ دنیا اس انقلاب کی لازوال خصوصیت کو سمجھے اور اس کی قدر پہچانے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے

مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر
مرتبہ پروفیسر محمد سرور

مولانا مرحوم چھ بار یورپ تشریف لے گئے تھے۔ یہ کتاب ان کے اپنے لکھے ہوئے حالات سفر کا مجموعہ ہے اس میں کہیں جہاز کے ساتھیوں کا تعارف ہے کہیں مصر سے گزرتے ہوئے وہاں کی سیاسی تاریخ پر تبصرہ کر جاتے ہیں۔ دیار غیر میں خود کو تنہا پاتے ہیں تو اہلِ وطن کی بے مہریاں یاد آجاتی ہیں اور قلم سے خونِ دل کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں۔ لندن کی آزاد فضا میں اپنے ملک کی غلامی اور خود اپنی بیکسی ستاتی ہے تو دل میں ہوک سی اٹھتی ہے اور اپنا درد سنائے بغیر نہیں رہتے۔ یورپی زندگی کے رنگین مناظر دیکھتے ہیں تو ان کی تصویر کشی میں بھی مطلق باک نہیں ہوتا۔ سادہ زبان، برجستہ فقرے، دلکش طرز بیان اور پھر مضمون میں اتنا تنوع۔ ان چیزوں نے اس سفرنامے کو نہایت دلچسپ ادبی مرقع بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

سوشلزم اور اسلام
مرتبہ عبداللطیف اعظمی بی۔ اے

سوشلزم اور اسلام میں کون کون سی باتیں آپس میں ملتی ہیں۔ مسلمانوں کو کیوں سوشلزم کی طرف آنا چاہیئے؟ سوشلزم اسلام کا منافی ہے؟ ان مسائل پر مشہور اہل قلم کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ

اشتراکیات قومی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں عہ آدمی اور مشین ترجمہ محمد عاقل ایم۔ اے عہ مشین اور مزدور ... عہ
ہندوستان کا مستقبل ڈاکٹر راجندر پرشاد ہر ہندوستان میں اجنبی راج پنڈت سندر لال ہر ہندوستان کا مستقبل پنڈت سندر لال ہر
لندن میں لینن کے ساتھ میکسم گورکی ... مہ مارکس اور ہندوستان کارل مارکس مہ اجرتی محنت اور سرمایہ کارل مارکس ۲

سندھ ساگر اکادمی۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر [illegible]

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔
مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی جوبیت کی پہلی شرط ہے۔

۳ - دلِ آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۴ - جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع
یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا نہایت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفترِ "ہمایوں"
خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے۔

۵ - "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ
جانی چاہئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتاً مل سکتا ہے۔

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے
اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنے۔

مینیجر "ہمایوں"

۳۶۔ لارنس روڈ۔ لاہور